جملہ حقوق محفوظ
اکتوبر ۱۹۰۷ء
جلد ۱۴
نمبر (۱)
ایڈیٹر
شیخ عبدالقادر
شیخ محمد اکرام
مخزن
اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ
پشاور
کشمیر
لاہور
دہلی
لکھنؤ
کانپور
الہ آباد
بنارس
پٹنہ
کلکتہ
کراچی
بمبئی
حیدر آباد دکن
بنگلور
مدراس
تصویر
سید سجاد حیدر۔ بی۔ اے
ہماری اسپرانٹو۔ شیخ عبدالقادر ۱
حکایۂ لیلےٰ و مجنوں۔ سید سجاد حیدر بی۔ اے (از بغداد) ۹
کالر ٹائی۔ شیخ محمد اکرام ۲۴
دیباچۂ مقصود۔ مولوی محمد عبدالرشید صاحب الخیری دہلوی ۳۱
اکانومی۔ ز۔ فیضی صاحبہ (از بمبئی) ۵۱
ڈیلیا۔ افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی ۵۳
گل مزار۔ منشی درگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی ۵۵
درد فرقت مرزا اعجاز حسین صاحب بی۔ اے وکیل ۵۶
ترانۂ محبت سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔ اے ۵۷
گرہ دار چھڑی۔ حافظ سید فضل حق آزاد عظیم آبادی ۵۸
تزک قیصری۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی ۶۰
داد روا۔ سید علمدار حسین صاحب واسطی ہنوڑی ۶۳
کوہستان آرہ۔ خان احمد حسین خاں صاحب بی۔ اے ۶۶
دلی کا ایک مشاعرہ
تازہ غزلیں
بیس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں
ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے □ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے
مخزن پریس دلی میں چھپکر شائع ہوا
قیمت سالانہ معہ محصول ڈاک

سید سجاد حیدر بی۔ اے
Yours most sincerely
Baghdad
15/6/1907

ہماری "اسپرانٹو"

یورپ میں آج کل ایک نئی زبان کا بہت چرچا ہے۔ جسے "اسپرانٹو" کہتے ہیں۔ شاید دُنیا میں یہ پہلی مصنوعی زبان ہے۔ جو کامیاب ہوتی نظر آتی ہے۔ گو زبانوں کی جڑ کو دیکھیں تو سب زبانیں کم و بیش مصنوعی ہیں۔ ان کی ابتدائی حالت میں چند انسانوں نے ضرور یہ قرار دیا ہوگا کہ زبان و لب کی فلاں حرکات سے فلاں معنے لئے جائیں۔ مگر یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ کونسی زبان کس زمانے میں اس حالتِ ابتدائی میں تھی۔ بلکہ عام طور پر ہر قوم کی زبان اس قوم کی زندگی کے ساتھ وابستہ معلوم ہوتی ہے۔ جب سے اُس قوم کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ اُسی وقت سے اُس کی زبان اُس کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ حالات کے تغیّر کے ساتھ تغیّر پاتی ہوئی بہ تدریج بڑھتی جاتی ہے۔ اور اہلِ بصیرت کے لئے اس قوم کی زندہ تاریخ ہوتی ہے۔ مگر ایسا کم سُننے میں آیا ہے کہ کوئی ایک شخص ایک زبان ایجاد کرے یا چند آدمی مل کر ایک زبان گھڑ لیں۔ اور اس کے قواعد منضبط کریں اور اس کے بعد اس کی اشاعت کی کوشش کریں۔ اور یہ بنائی ہُوئی زبان مقبول ہو جائے۔ اختلافِ السنہ سے جو مشکلات سیر و سیاحت اور تجارت کے راستے میں پیش آتی ہیں۔ اُن سے بچنے کے لئے ایک مشترکہ زبان ایجاد کرنے کی کوشش کئی مرتبہ یورپ میں ہو چکی ہے۔ مگر ناکام رہی۔ یہ آخری کوشش

جو ”اسپرانٹو“ کے نام سے مشہور ہے - ایک روسی عالم کی محنت کا نتیجہ ہے - علّامہ موصوف نے روسی، اور فرانسیسی - انگریزی - جرمن اور اطالین زبانوں کی آمیزش سے یہ زبان پیدا کی ہے اور اس کے صرف و نحو کو بالکل باقاعدہ اور آسان بنا دیا ہے - کوئی استثنائی قواعد اس میں داخل نہیں کئے جن سے طالب زبان کو دقّت ہو - اور اس کا ”اسپرانٹو“ نام رکھا ہے - یہ اطالین زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنے ہیں ”امّید“ - چونکہ اس کے بانی اور اس کے معاونوں کے نزدیک اس سے یہ اُمید بندھتی ہے کہ یہ یورپ کی مشترکہ زبان ہونے میں کامیاب ہو گی - اس لئے اس کا یہ نام رکھا گیا - اس کے ساتھ ایک رعایت اس نام میں اور رکھی ہے اور وہ یہ کہ اس زبان میں یہ قاعدہ کلّیہ ہے کہ سب اسمار حرف واؤ پر ختم ہوں - اور اس لئے اس نام سے زبان کی ماہیّت پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے -

جب یہ زبان پہلے پہل ایجاد ہوئی تو اکثر لوگ اس کی ہنسی اُڑاتے تھے اور کہتے تھے کبھی اس طرح بھی زبانیں بنتی ہیں اور پھیلی ہیں - قدرتی طور پر بنتی اور قدرتی اسباب سے بڑھتی ہیں - مگر آفرین ہے اس کے بانی اور اس کے ہمراہیوں کی ہمّت اور تدبیر پر - اُنہوں نے ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے - اور اب یورپ کے ہر بڑے شہر میں ”اسپرانٹو“ والوں کی ایک کثیر تعداد پیدا ہو گئی ہے - اور برلن پیرس اور لندن کی بڑی بڑی دوکانوں پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ یہاں ”اسپرانٹو“ بولی جاتی ہے - اس کے بانیوں کا یہ منشا نہیں کہ یہ موجودہ زبانوں کی جگہ چھین لے وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں - کہ ہر قوم اپنے گھر میں اپنی زبان اور اپنے علم ادب کو ہی ترجیح دے گی - اور اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنی زبان چھوڑ کر اس مشترکہ زبان کو اختیار کرلے گی - بے سود ہے - مگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ یہ مشترکہ زباں اُن سب مختلف زبانوں والی قوموں میں ایک مفید واسطہ بن جائے - اور خصوصًا تجارتی

کاروبار میں سہولت کا باعث ہو۔ تاکہ "اسپرانٹو" جاننے والا یورپ کے ہر حصّے میں
اپنا کام نکال لے۔ علمِ لسان کے چند عُلما کے علاوہ پہلے جس طبقے نے اس زبان
کی طرف توجّہ کی وُہ تجارت پیشہ لوگ تھے۔ کیونکہ انہیں اس کے اختیار کرنے
اور اس کی اشاعت کرنے میں صریح فائدہ نظر آیا۔ اس کے بعد اُن کی مثال کے
اثر اور اُن کی شبانہ روز سعی کی بدولت اور لوگ بھی ماننے لگے۔ کہ اس زبان کو
پھیلانا چاہیئے۔ اب اُن لوگوں کو یہاں تک کامیابی ہوگئی ہے کہ لندن اور پیرس
کے اکثر مدارس میں یہ زبان داخلِ درس ہوگئی ہے۔ اور اُن لڑکوں کو جو تجارتی
کاروبار میں پڑنا چاہتے ہیں۔ تاکید ہے کہ وُہ یہ زبان ضرور سیکھیں۔ علاوہ ازیں
اس کے حامی ہر برس ایک عظیم الشان کانفرنس یورپ کے کسی نہ کسی مشہور مقام
میں کرتے ہیں اور وہاں ہر ملک کے رہنے والے جمع ہوتے ہیں۔ اُس جلسے کی
کارروائی سب اسی زبان میں ہوتی ہے اور اراکین ایک دُوسرے سے "اسپرانٹو"
میں باتیں کرتے ہیں۔ مَیں جب شمالی فرانس میں بولون میں مقیم تھا۔ تو مجھے ان کا
سالانہ مجمع دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس برس کیمبرج میں "اسپرانٹو" والوں کا جلسہ
سالانہ ہوا ہے۔ اور کیمبرج جیسے علمی مرکز کی طرف سے اس جلسے کی اجازت اور
تائید گویا اس زبان کے لئے انگلستان کی طرف سے فرمانِ منظوری اور اس کی
کامیابی کے لئے ایک نیک فال ہے۔ اب اگر اس کے حامی اسی سرگرمی سے
کام کرتے رہے جو آج تک اُن کا شعار رہی ہے تو وُہ ضرور کامیاب ہونگے اور
اُسے آخر یورپ کی زبانِ عمومی بنا کے چھوڑینگے۔

"اسپرانٹو" والوں نے کئی وسائل اس زبان کے مقبول بنانے کے لئے استعمال
کیئے ہیں۔ جا بجا "اسپرانٹو" کی انجمنیں قائم کی ہیں۔ اُن انجمنوں کے جلسے وقتاً فوقتاً ہوتے
رہتے ہیں۔ اور اُن میں اسپرانٹو کی مشق ہوتی ہے۔ اور اس کے ذریعے مختلف اللسان

لوگ آپس میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں - سارے یورپ کی زبانوں کی مشہور اور مقبول ترین کتابوں کا اس زبان میں ترجمہ ہونا شروع ہو گیا ہے - کیونکہ یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ لطیف سے لطیف خیالات بھی اس میں ادا ہو سکتے ہیں - ہر دلعزیز گیتوں کا ترجمہ بھی اسپرانٹو میں کیا گیا ہے اور موسیقی کے بعض استادان فن اپنی دل کش آواز سے ان گیتوں کی دلچسپی بڑھاتے ہیں - کئی رسالے "اسپرانٹو" میں نکلنے لگے ہیں - اور "اسپرانٹو" کے ہوا خواہ بعض اخبارات میں اپنے تجارتی اشتہارات اس زبان میں چھپواتے ہیں - تاکہ لوگوں کی نگاہیں اس کے الفاظ سے آشنا ہو جائیں - اور بیگانگی دُور ہو جائے - اسپرانٹو کے معاونوں کی سرگرمی کا یہ حال ہے - کہ سفر میں ہوں یا حضر میں - جہاں کسی نئے شخص سے مُلاقات ہُوئی - پہلا سوال یہ کرتے ہیں - آپ "اسپرانٹو" جانتے ہیں - اگر اُس نے "اسپرانٹو" کا نام سُنا ہی تو اُس کے متعلق باتیں شروع ہو جاتی ہیں اور اگر نہیں سُنا تو مختصر سا حال اس کے آغاز اور اُس کی ترقی کا سُنا کر اُسے اُس کی طرف توجہ کرنے کا شوق دلاتے ہیں - "اسپرانٹو" پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے گئے ہیں وُہ ان لوگوں کے پاس اکثر موجود رہتے ہیں - اور نئے شائقین میں بانٹے جاتے ہیں -

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ اُن کوششوں کا جو یورپ کی مختلف اللّسان قوموں میں رابطۂ اتّحاد اور سہولتِ تجارت پیدا کرنے کے لئے ہو رہی ہیں - اور باوجودیکہ ایک نئی زبان کا عدم سے وجود میں لانا ایک کٹھن کام ہے - "اسپرانٹو" کے حامی کمرِ ہمت باندھے ہُوئے مصروفِ سعی ہیں - اور کامیابی کے اُمّیدوار - یہاں تک کہ اُنہوں نے اس نئی زبان کا نام ہی "زبانِ اُمّید" رکھا ہے - اس خاکِ پاکِ ہند میں بھی جو ہمارا وطن ہے ایک زبانِ امّید موجُود ہے - جو یورپ کی "اسپرانٹو" سے بہت سی باتوں میں ملتی اور بعض اعتبارات سے فضیلت رکھتی ہے - مگر افسوس ہی کہ ہم اس سے غافل

ہیں - اور اُن امکانات سے بیخبر ہیں جو اُس کی ترقّی میں پنہاں ہیں -

ہماری "اسپرانٹو" وہی پیاری زبان ہے جسے کوئی اُردو - کوئی ہندی اور کوئی ہندوستانی زبان کہتا ہے - ہم نام کے پابند نہیں - ہمیں کام سے کام ہے - جو نام کسی کو بھلا معلوم ہو - اس نام سے اُسے یاد کرے - مگر اس کوشش میں رہے - کہ چار دانگ عالم میں ہندوستان کی اس "خداداد اسپرانٹو" کا چرچا ہو جائے -

اُردو کو میں "خداداد اسپرانٹو" اِس لیے کہتا ہوں - کہ اپنی یورپین بہن کی طرح یہ ایک تازہ انسانی ایجاد نہیں ہے - بلکہ صدیوں میں اُن قدرتی اسباب کے جمع ہونے سے پیدا ہوئی ہے - جن سے دُنیا بھر کی زبانیں پیدا ہوئی اور بڑھی ہیں - اور یہی سب سے بڑی فضیلت ہے - جو "ہماری اسپرانٹو" کو یورپ کی اسپرانٹو پر حاصل ہے اسی لیے اردو کے پھیلانے کا کام بہ نسبت اسپرانٹو کے زیادہ آسان ہے - کیونکہ ابھی کل کی بات ہے کہ اسپرانٹو بولنے والوں کا وجود ہی نہ تھا - اور ہندوستانی بولنے والے ہمارے مُلک میں صدیوں سے چلے آتے ہیں - یورپ میں "اسپرانٹو" کا فقط اس کی ذاتی کامیابی کی توقع کے سبب "اُمید" نام رکھا گیا ہے - مگر ہندوستان میں ہندوستانی زبان کی کامیابی ملک کی کامیابی ہے اور ملک کی بہتری اور اہل ملک کے اتحاد کی اُمّید کا صرف یہی ایک پہلو ہے - کہ کم از کم سب ہم زبان تو ہوں - اختلافات مذہبی تو کسی کے مٹائے مٹنے والے نہیں - مگر ایک مُلک میں ایک حکومت کے زیر سایہ رہتے ہوئے اور نقل و حرکت کے ذرائع کی کثرت کے باوجود ملکی زبان کا ایک نہ ہو سکتا اور اس کی اشاعت میں کوتاہیاں نہایت قابلِ افسوس ہیں -

کئی زبانوں کا مجموعہ مرکب ہونے میں اُردو کو اسپرانٹو کے ساتھ پُوری بہت مشابہت ہے - اور بڑی خوبی یہ ہے کہ ابھی اَور الفاظ کی آمیزش کی گنجائش اس میں موجود ہے - ہندوستان کے مختلف زبانوں کی موجودہ بولیاں جو اپنی اپنی جگہ قائم رہنے

کے قابل اور قائم رہنے والی ہیں۔ ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔ اور خصوصاً ہندوستانی کے الفاظ اُن میں بہت سے شامل ہیں۔ جو انگریزی الفاظ اب ہندوستان کی زبانوں میں مل کر جزوِ زبان بن گئے ہیں۔ اُن سے یہ مشترک حصہ ان سب بانوں کا اور بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں اردو کا عام رواج پا جانا سب کی آسانی کا باعث ہے اور بغیر بہت غیر معمولی تردّد کے ممکن ہے۔ اگر لوگ اس طرف مائل ہوں۔ یورپ جس کے لئے ایک زبان پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے دس بارہ مختلف دُوَل کا مجموعہ ہے۔ جہاں ہر حکومت میں زبان جُدا۔ طرزِ حکومت جُدا۔ اور قانون جدا ہے۔ ایک حکومت کے باشندوں کی اغراض اکثر اوقات دوسری حکومت کے باشندوں کی اغراض کے خلاف ہیں۔ اور ایک سلطنت اور دوسری سلطنت میں رقابت موجود ہے۔ مگر اُن لوگوں کی وسعتِ خیال اور روشن دماغی دیکھئے۔ کہ ایسے بڑے اختلافات کو بھی مٹانے یا اُن کے دبانے کے لئے ایک نیا رشتۂ یگانگت پیدا کرنے کی فکر میں ہیں اور ہماری کوتاہ اندیشی کو دیکھئے کہ ایک مُلک۔ ایک حکومت اور مشترکہ ضروریات اور اغراض کے باوجود فکرِ ہم زبانی سے غافل ہیں۔ حالانکہ ہمارے راستے میں وُہ مشکلات بھی نہیں جو اُنکے راستے میں ہیں۔ کیسا عمدہ موقعہ ہے جو ہم کھو رہے ہیں۔ ؎

اَے دِل بہ کوئے دوست گذارے نہ کردہ　　فرصت ز دست دادہ و کارے نہ کردہ
میداں فراخ دیدہ و گوئے نہ بُردہ　　شاہیں بدست و عزمِ شکارے نہ کردہ

میرے خیال میں اب وُہ وقت نہیں رہا۔ کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ کہ ہماری زبان میں اگر قوّتِ نمو ہے تو خود بخود بڑھے گی۔ اِس میں شک نہیں کہ ہماری زبان میں ترقی کی طاقت موجود ہے اور وُہ ہماری کوشش کے بغیر یا بے دلی کی کوشش سے بھی کچھ نہ کچھ بڑھ رہی ہے۔ اُس کا ذخیرۂ ادب

بھی روز افزوں ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی رہتی ہے اور ملک کے دُور دراز گوشوں میں بلکہ دنیا کے دوسرے حصّوں میں بھی اس کی آواز پہنچنے لگی ہے۔ لیکن یہ جو کچھ ہو رہا ہے کافی نہیں ہے۔ اس ترقی کی رفتار بہت زیادہ تیز ہو سکتی ہے۔ اگر ہم اس کی خاطر کچھ تکلیف گوارا کرنے لگیں۔

ہمیں اپنے سب بڑے بڑے شہروں میں اپنی زبان اُمیّد کی انجمنیں قائم کرنی چاہئیں جنمیں اس کے شائقین۔ اسکے دلدادہ۔ اس کے ہواخواہ۔ بلا قیدِ ملّت و مذہب جمع ہوں اور اپنی اپنی محنت کے نتائج سے دوسروں کو مستفید کریں۔ اسکے علمی اور ادبی ذخیروں کو بڑھائیں۔ ہمعصروں سے داد پائیں اور آئندہ نسلوں کو ممنونِ منّت کریں۔ وقتاً فوقتاً کوئی کانفرنس یا بڑا جلسہ بھی ہونا چاہئیے جس میں ملک کے ہر گوشہ سے اس زبان کے مصنّف۔ مؤلّف۔ مترجم۔ اخبار نویس سب جمع ہوں۔ یہ پہلا کام ہوگا جس میں نامور اہل قلم بلا لحاظ مذہب ایک مشترک مقصد کے لئے جمع ہونگے۔

اُن صوبجاتِ ہند میں جہاں اُردو مادری زبان نہیں۔ ایک اَور طریقِ عمل بہت مفید ہو سکتا ہے۔ مَیں نے انگلستان میں دیکھا کہ فرانسیسی زبان کے طالب علم فرانسیسی میں مہارت پیدا کرنے کے لئے۔ اور فرانس میں انگریزی پڑھنے والے انگریزی کے لئے یہ تدبیر استعمال کرتے ہیں کہ کئی آدمی یکجا جمع ہو کر مشہور کتابوں کے انتخاب پڑھتے ہیں اَور لوگ سُننے آتے ہیں۔ اس سے تلفّظ بسہولت کرنے کی عادت ہوتی ہے اور روزمرّہ درست ہو جاتا ہے۔ فرانس میں تو مَیں نے فرانسیسی لوگوں کو اپنی زبان کی مشق کے لئے اسی طریق سے فائدہ اُٹھاتے دیکھا ہے۔ جن صوبجاتِ ہند میں اُردو کا رواج نسبتاً کم ہے۔ مثلاً بنگال۔ مدراس اور بمبئی۔ وہاں اس قسم کی اُردو انجمنوں کی ضرورت ہے۔ ایسی ہی مجالس "اسپرانٹو" کے حامیوں نے یورپ میں قائم کی ہیں۔ ان انجمنوں میں کچھ لوگ تو ایسے ہوں جو بے تکلّف اُردو بول سکتے ہیں اور وُہ اپنے گرد جمع کریں ایسے لوگوں کو جو اُردو کے فوائد تمدّنی۔ تجارتی اور

سیاسی کو مدِ نظر رکھ کر اسے سیکھنا چاہتے ہیں۔ جلسے کی کارروائی اُردو میں ہو۔ ضابطہ
کی کارروائی کے علاوہ میل ملاپ اور بات چیت کے موقعے پیدا کئے جائیں۔ تاکہ سب
اراکین کو تکلم کی مشق ہو۔ اور جلسے کی دلچسپی بڑھانے کے لئے اُردو نظم و نثر کی مقبول
کتابوں کے انتخابات وہاں پڑھے جائیں اور اردو کے مشہور گیت بھی کبھی کبھی گائے جائیں
پڑھنا بھی ایک خاص فن ہے۔ ہمارے مُلک میں بھی مروّج رہا ہے اور اب ایک دُوسرے رنگ
میں یورپ میں مروّج ہے۔ اچھا پڑھنے والا عمدہ کلام میں ایک نئی رُوح پھونک دیتا ہے اور
وُہی انتخاب جو کتاب میں چھپا ہوا صرف چند اہلِ نظر کو گرویدہ کرتا۔ ہوشیار پڑھنے والے
کی زبان اور فن کی تاثیر سے خاص و عام کو قائل کر لیتا ہے۔ ایسے مشاق پڑھنے
والے آجکل ہمارے ہاں بہت کم ہیں۔ ان کی تعداد کو بڑھانا اور انکی حوصلہ افزائی
کرنا بھی ایک مفید ذریعہ ترقی زبان کا ہے۔ اور اگر ہم اُن سب ذرائع سے جو اس ہر دلعزیز
زبان کی اشاعت کے ہمارے پاس موجود ہیں۔ کام لیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری
"اسپرانٹو" ایک نصف صدی میں ہندوستان بھر کی زبانِ عمومی نہ بن جائے۔ اگر
"اسپرانٹو" کے چند مددگار چند سال میں کئی سو سے کئی ہزار اور کئی ہزار سے کئی لاکھ
بن سکتے ہیں۔ تو کیا "ہماری اسپرانٹو" کے کئی کروڑ بولنے والے اَور کئی کروڑ آدمی
اپنے ساتھ نہیں ملا سکتے۔ ہمت کریں تو منزل بہت دُور نہیں اور ہمت ہار بیٹھیں
تو اس سے دشوار تر منزل کوئی ہو نہیں سکتی +

عبد القادر

ایک سے ایک کو عبرت ہو یہ ممکن ہی نہیں — کون ہے وہ نہ جو دل دیکے پشیماں نہ ہوا
ذکرِ تاثیر پہ کب آہ بلب آہ نہ تھی — نالہ کب بے اثری سے مرا نالاں نہ ہوا
ہار دی ایک نہیں سُننے ہی ہمت تونے — کیا ہوا شوق سے تجھے دست بداماں نہ ہوا
میرے حرماں کا نہیں اُن کی حیا پر الزام — شوق تو ضبط سے کیوں دستِ گریباں نہ ہوا
اُف تری آئینہ رُوئی کی تحیّر زائی — کون آئینہ صفت دیکھ کے حیراں نہ ہوا

نیرنگ

حکایۂ لیلےٰ و مجنوںؔ

(۱)

قیس، کمرے میں نہایت غمگین حالت میں بیٹھا تھا؛ میز پر سے ایک کاغذ کو اُٹھاتا تھا، اُسے پڑھتا تھا، پھر رکھدیتا تھا، پڑھتا تھا، ٹھنڈا سانس بھرتا تھا، پھر رکھدیتا تھا۔

یہ لیلےٰ کا مارکونیگرام (بغیر تار کی تار برقی) تھا، جو ابھی ابھی اُسے ملا تھا: "میں کل موٹر کار پر سیر و سیاحت کی غرض سے ایک ہفتہ کے لئے جاؤں گی؛ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ جنگل کی خشک ہوا، میری صحت کے لئے مفید ہوگی۔ خدا حافظ، تمہاری لیلےٰ۔"

بات یہ تھی کہ قدرت نے۔ اس ستم ظریف، مرحمت ناشناس قدرت نے جو ہم سب کو اپنا بازیچہ بنائے ہوئے ہے۔ بیچارے قیس علیٰ کو پھر نجد میں لا بٹھایا تھا۔ مگر کس نجد میں؟ اُس نجد میں نہیں جو قیس۔ بھولے، سچے قیس۔ کے زمانہ سے لیکر ۱۹۰۷ء تک تھا، اُس نجد میں نہیں جس میں آجتک قیس کی رُوح شاداں و فرحاں پھرتی ہے، کیونکہ وُہ اب تک نجد، میں اپنے زمانے کے صحرا، اپنے زمانے کے ٹیلے، اپنے زمانے کے غزال، اپنے زمانے کی صبا، اپنے زمانے کی ناقہ، اپنے زمانے کے ساربان پاتی ہے، بلکہ اُس نجد میں جس میں اب ریل تھی، تار تھا، موٹر کار تھی، ٹراموے تھی، ترقیاں تھیں، مصیبتیں تھیں۔

اس نجد میں۔ اس تبدیل شدہ جولانگاہِ وحشت میں۔ جس میں اُس نے اپنے عشق اور جنون یا بہ الفاظِ دیگر عشق یعنی جنون، یا جنون یعنی عشق کے دن کس آزادی سے کاٹے تھے، اب وُہ پھر پیدا ہوا تھا، اور وُہ ہی اکیلا پیدا نہیں

ہؤا تھا، قضا و قدر کو اپنا مذاق پُورا کرنا تھا، اس لیے عین اس زمانہ میں لیلےٰ بھی پیدا ہُوئی تھی۔

جن صحراؤں میں وُہ غزالوں کو پکڑ پکڑ کے اُنکی آنکھیں چُوما کرتا تھا، کیونکہ وُہ لیلےٰ کی آنکھوں سے مشابہ تھیں، اُن صحراؤں میں اب وُہ عفریت جو آگ کھاتا ہے اور دُھوآں اُگلتا ہے، پھنکاریں مارتا ہؤا اور بل کھاتا ہؤا، رات دن پھرتا تھا، اور ان بھیلی لیلےٰ صفت غزالوں کو پریشان کئے ہُوئے تھا، اور اب وُہ مجنوں کے پاس آنا کیسا، انسان کی صُورت سے بھڑکتے تھے اور اس کی کلفت بار زلفوں کی نشانیوں سے بھاگتے پھرتے تھے۔

قیس کو قضا و قدر کی طرف سے کبھی کبھی یہ علم ملجاتا تھا کہ وُہ وُہی پُرانا قیس ہے، اور اُس وقت وُہ اس زمانہ کو یاد کرتا تھا کہ ناقے کے پیچھے دوڑا دوڑا جا رہا ہے محمل میں لیلےٰ ہے! نہیں بھی ہے تو یہی خیال اُس کے دل کو خوش کر رہا ہے کہ شاید اس کے اندر لیلےٰ ہے۔ یا اب! اب لیلےٰ کا یہ تار ہے کہ اُس کی خرمن صبر پر بجلی گرا رہا ہے "دیکھیے، اچھا بہانہ کرکے چلدیں۔ جانتیں ہیں، کہ میں تعاقب نہیں کرسکتا! یا اللہ تو نے حسینوں کو ظالم بنایا تھا، تو عاشقوں کے ستانے کے لیے نئی نئی ایجادیں تو نہ کرائی ہوتیں! مجھ خستہ جان کے لئے تیز رفتار ناقہ ہی کیا کم تھا، کہ اب تو نے موٹر کار ایجاد کرا دیا۔ صبح وُہ چلدینگی، اور میں اس شہر میں پڑا سڑا کرونگا! او ستم ایجاد لیلےٰ! او عاشق کش لیلے! ریل میں تو بیٹھ کے نہیں گئی کہ میں اُسی ٹرین میں بیٹھ جاتا"، یہ کہا اور پھر ہاتھوں میں اپنا مُنہہ چھپا کے سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ایکدم اُٹھ کھڑا ہؤا، اور میز پر جا کے نوکر کو بلانے کے لیئے برقی گھنٹی بجائی؛ دس سیکنڈ گذرے ہونگے کہ دوسری مرتبہ اور زور سے

گھنٹی بجائی۔

نوکر بڑبڑاتا ہوا: "خدا خیر کرے، اب تو بہت بوقت گھنٹیاں بجاتے ہیں! یہ آدھی رات، سب سو رہے ہیں، دن بھر تو یُوں ہی مجھے ناچ نچاتے رہے، رات کو ذرا کی ذرا آنکھ لگی تھی، کہ پیچھے پھر یہ گھنٹوں کا تار بندھ گیا۔ مَیں باز آیا، اس نوکری سے، اگر ایک ہفتہ اور رہا تو مَیں بیمار پڑ جاؤنگا۔ سُبحان اللہ اچھا عشق ہے کہ نہ خود چین لیتے ہیں نہ کسی کو چین لینے دیتے ہیں"، کمرے میں داخل ہوا اور کہا: "حضور کیا ارشاد ہے!"

"ارشاد کیا ہے۔ گھنٹیاں بجاتا بجاتا عاجز ہو گیا، تم سُنتے ہی نہیں، کان میں رُوئی ٹھوس لی ہے یا کیا؟"

"خداوند غلام قصوروار ہے، مگر حضور ہی دیکھیں یہ گھڑی لگی ہُوئی ہے! ایک بج کے بیس منٹ آئے ہیں، اسوقت مَیں نے ہزار چاہا کہ آنکھ کھُلی رکھوں مگر جھپک ہی گئی!"

"اچھا، بہت باتیں نہ بناؤ، حاجی جاسم داخوانہ کی دُکان پر جاؤ میری طرف سے بہت بہت سلام کہنا اور یہ کہنا کہ ۲۵ گھوڑوں کی طاقت والی موٹر کار، ایک ہفتہ کے لئے کرایہ پر چاہتا ہوں۔ ذرا سیر کے لئے جانا ہے۔ فی الحال تو کرایہ میرے پاس نہیں، واپسی پر انشاءاللہ آن کا کرایہ فوراً ادا کر دونگا"

"حضور! اس وقت دُکان کہاں، حاجی جاسم کبھی کے گھر میں جا کر سو رہے ہونگے"

"حاجی جاسم نہیں تو قنبر علی موٹر کا ہم کے ہاں جاؤ"

"حضور، ناراض نہوں! یہ اس قسم کی دکانوں کے کھُلے رہنے کا وقت نہیں ہے! شاید حلوائیوں کی دُکانیں اور ایک آدھ قہوہ خانے اسوقت کھُلے ہوں تو کھُلے ہوں، ورنہ ساری دُنیا سو رہی ہے"

"جا نالائق، دُور ہو جا، مجھے جواب دیتا ہے! عقل سکھاتا ہے بے ادب کہیں کا"،
نوکر خلاصی پانے کی ترکیب سوچ ہی رہا تھا، اس ناراضی سے دل میں نہایت خوش ہوا،
چپکے سے باہر آ گیا، اور اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر تو قیس کل نوکروں کی جنس پر اُن کی بیخ و بنیاد پر لعنت بھیجتے
رہے: "ایک بھی نوکر ڈھنگ سر کا نہیں ملتا، جس کام کو کہو، میم میخ نکالینگے
جو حکم دو، اُس سے بچنے کے لئے بہانہ ڈھونڈھ لینگے" پھر کچھ غصہ فرو ہوا تو خود
خیال آیا: "نہیں تو، بلال کا کہنا ٹھیک تھا، اس وقت بھلا کون دُکان کھلی
ہوگی؟ اور کھلی بھی ہوئی تو کیا فائدہ۔ والد کی سختی کے طفیل میں کوئی دوکاندار
قرض دیتا نہیں، اور اگر میں خود اُن سے یہ خواہش کروں کہ موٹر کار خرید دیجئے
تو وہ کیا اس خواہش کو پوری کرنے کے روادار ہونگے، ہرگز نہیں، کس مشکل
سے تو اُنھوں نے بائسکل خرید کے دی تھی۔ اب کس مُنہ سے موٹر کار کی فرمائش
کروں۔ لیکن ہائے میری قسمت! میں نے بائسکل خریدی تو لیلے نے موٹر کار پر توجہ
کی۔ میں کسی طرح بھی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا! وہ اتنے بڑے گھرانے کی،
ایسے نازوں کی پلی کہ جس کے ایک اشارے پر سینکڑوں مامائیں، خادمائیں
دوڑی آتی ہیں، بھلا مجھے کب خاطر میں لا سکتی ہے! یہاں نصیب میں ایک بلال
ہے وہ بھی بڈھا، سُست۔ یہ بھی ہم بکتی کے حقوق کا خیال ہو، جو وہ مجھ تمت کے
مارے پر اتنی توجہ، توجہ کیسی، اتنی عنایت، میں عنایت کا کب سے مستحق ہو گیا
اتنا رحم کرتی ہے، کہ کبھی کبھی ایک نگاہِ غلط انداز سے مجھے دیکھ لیتی ہے۔
آہ لیلا! میں تیرا شکریہ ادا نہیں کر سکتا، تو نے مجھے تار بھیج کے اپنے ارادے
سے اطلاع تو دی، اگر بغیر اطلاع دیئے ہی چلی جاتی تو میں کیا کر لیتا۔ موٹر کار
کی آرزو، افسوس! میں بھی کیسا بیوقوف ہوں،" آج وہ موٹر کار پر سوار ہو کر

جاتی ہے تو میں موٹر کار کے لئے مر رہا ہوں۔ اچھا اگر کہیں کسی ضرورت سے اُس نے کل اسپیشل ٹرین چھڑا دی تو میں اسپیشل ٹرین کہاں سے لاؤنگا۔ کیوں جناب قیس صاحب! اب آپ سمجھیے، آپ زیادہ ریس نہ کیجئے۔ ایاز قدرِ خود بشناس۔

اس طرح قیس اپنے دل کو سمجھاتا تھا؛ تھوڑی دیر تو وہ ساکن بیٹھا لیکن پھر بیٹھا نہ گیا۔ آدھی رات، گھر بھر میں سناٹا (قیس کے والد نے ایک مختصر سا گھر، اپنے گھر سے ملا ہوا قیس کو دے رکھا تھا) مگر قیس کوٹھے سے اُتر کے نیچے آیا، اور ایک کمرے میں جو کباڑ خانہ تھا، جا کر چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرنے لگا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی محنت کے بعد، اپنی بائیسکل کو تیل وغیرہ ڈال کے درست کیا؛ اور نہایت بیتابی سے صبح کا انتظار کرنے لگا۔ پو پھٹی اور قیس بائسکل پر سوار گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

(۲)

قیس بائسکل پر سوار گھر سے نکل کھڑا تو ہوا، لیکن شہر سے باہر پہنچتے ہی سوچنے لگا "کدھر جاؤں" مختلف سڑکیں مختلف سمتوں کو جا رہی تھیں۔ کدھر جانا چاہیے؟ یہ ظاہر ہے کہ اُدھر جانا چاہیے جدھر لیلے گئی ہے، مگر خود لیلے کس طرف گئی ہے؟ اس کا کس طریقہ سے پتہ لگائیے؛ لیلے کے گھر جا کر دریافت کرے؟ مگر وہاں تو اس کی پذیرائی خاص طور پر ممنوع ہے۔ یہی تعجب ہے کہ وہ کس طرح تار بھیج سکی؛ پرسوں ہی تو وہ خط جو اُس نے، اُس کے نام بھیجا تھا، واپس آگیا تھا، اور اُس پر لیلے کے والد کے ہات کا یہ لکھا ہوا تھا: "قیس کو معلوم ہو کہ باوجود منع کرنے کے، خط بھیجے جانا، اُس کے حق میں مفید نہیں ہوگا، وہ متنبہ کیا جاتا ہے کہ اس قسم کی بے سود اور غیر شریفانہ کوششوں سے باز آئے"۔ باوجودیکہ اُس نے لفافے پر اپنا نام نہیں لکھا تھا، نہ اندر اپنا نام لکھا تھا؛ لیکن لیلے کا باپ؛ اور اس کا خاندان

نہایت ہوشیار تھا، اور اس کا خط پہچان لیا جاتا تھا۔ آہ! اس خط کے پکڑے جانے پر، معلوم بیچاری لیلےٰ پر کیا کیا ستم نہ ڈھائے گئے ہونگے۔ مگر واہ ری عاشق نواز لیلےٰ! تونے پھر بھی جادۂ وفا سے قدم نہ ہٹایا، اور نہ معلوم کن خطروں میں پڑ کر، اور خدا ہی جانتا ہے کہ کن مصیبتوں کا سامنا کرکے وُہ تار بھیجا۔
"لیکن جہاں اتنی عنایت کی تھی کہ اپنی روانگی سے اطلاع دی تھی، وہاں سمتِ سفر سے بھی اگر مطلع کر دیتیں، تو بندۂ احسان اور احسانمند ہوتا۔ ہاں مگر وُہ تو خود نہیں چاہتی کہ میں تعاقب کروں، کیونکہ اس تعاقب کا نتیجہ میرے لئے اور اس کے لئے بھی اچھا نہیں۔ کچھ ہو، مگر مجھ سے تو اب گھر میں بیٹھا نہیں جاتا۔ میں جاؤنگا ضرور، چاہے اس سے کوسوں دُور ہوں، تاہم پھر وُہی سوال ہے، جاؤں کس طرف کو؟"
اس کشمکش میں، اس بیقراری میں، کبھی اس طرف کو دیکھتا تھا، کبھی اُس طرف کو، کہ بادِ صبا۔ جو زمانِ سابق میں لیلےٰ کی زلفِ عنبریں سے شمیم جانفزا لایا کرتی تھی۔ اپنے ایک جھونکے میں مٹی کے تیل کی بُو لائی۔ قیس مارے خوشی کے اُچھل پڑا۔ "اہا پتہ لگ گیا، اسی طرف سے گئی ہیں، پٹرول کی بُو صاف کہے دیتی ہے۔ اب ایک منٹ ٹھہرنے کا وقت نہیں ہے" اور یہ کہہ کے اپنی پُوری طاقت سے بائسکل چلانی شروع کردی۔
مگر جس طرح پیادہ پا قیس، ناقہ سوار، محمل نشیں لیلےٰ کے ساتھ نہیں چل سکتا تھا اسی طرح بائسکل سوار قیس، موٹر کار سوار لیلےٰ کی گرد تک کو نہ پہنچ سکا۔
لیکن تھکن کیا شے ہے، نا اُمیدی کیا چیز ہے، اسے نہ جاننے والے قیس کے لئے یہ کوئی ہمت بٹھا دینے والی بات نہ تھی۔ وُہ برابر جا رہا تھا۔ موانع کی وُہ پروانہ کرتا تھا، ایک جگہ راستہ درست کیا جا رہا تھا، سڑک

پر پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، پتھر کوٹنے کا انجن، اپنی بھاری بھرکم چال سے، اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر پھر پھر کر، آہستہ خرام بلکہ محزام - زیرِ قدمت ہزار سنگ ہست کی تفسیر کر رہا تھا۔ "راستہ تعمیر کے لئے بند" کا تختہ لگا ہوا تھا مگر قیس پگڈنڈی ہی پر سے اپنی بائسکل لے گیا۔ تھوڑی دُور گیا ہوگا، کہ بائسکل کی گھنٹی بگڑ گئی، اُسکو پریشانی تھی کہ بغیر گھنٹی کے کس طرح گذارا ہوگا۔ سڑک پر چھکڑے، اونٹ، گائے، بھینس قطار در قطار ملتے تھے، اگر گھنٹی یا بلوانگ ہورن[1] نہ ہوا تو بائسکل چلانا قطعاً غیر ممکن ہوگا، کہ اتنے میں ایک گاؤں والا نظر پڑا جو ٹوکرے میں چند بطخوں کو رکھے لئے جا رہا تھا۔ بطخوں کی "قیں، قاں" سے کان پڑی آواز نہ سُنائی دیتی تھی۔ دیوانہ بکارِ خویش ہشیار۔ قیس کو فوراً ایک ترکیب سُوجھی، گاؤں والے کو آواز دیکر ٹھہرالیا اور اُس سے بطخوں کا ٹوکرا خرید کر، ہینڈل پر باندھ لیا۔

قیں، قاں، قیں قاں، قیں، قیں قیں، راستہ میلوں تک صاف تھا!

سڑک چکر کھاتی ہوئی دور تک جا رہی تھی، صبح کا، نجد کی صبح کا، (لندن یا کلکتے کی گلا گھونٹنے والی صبح کا نہیں) سُہانا وقت تھا، اور ریگستان کی خشک اور ٹھنڈی ہُوا۔ وُہ ہَوا، جو اپنی صفائی کے لحاظ سے، ان مرطوب بادلوں والی ممالک معتدلہ وبارِدہ کی ہواؤں پر ہنستی ہے، وُہ ہوا جو عاشق مزاج، شاعر طبیعت، زن دوست، موت سے نڈر آدمی، اور شرف بخش حیوانیت یعنی اصیل اور شریف گھوڑے پالتی ہے؛ وُہ ہَوا جو راجپوتانہ میں راجپوت جیسی غیور، اور حجاز اور نجد میں عرب جیسی شجیع ملت پیدا کرتی ہے۔ سائیں، سائیں چل رہی تھی۔ نسیمِ صبح، قیس کے پُرانے دوست ببولوں کو (جو سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے تھے) بلا رہی تھی۔ ببول، راستہ

[1] بگل کی صورت کی چیز جو بائسکل پر لگی ہوتی ہے۔ اور جسے دبا کر بائسکل سوار لوگوں کو متنبہ کرتے ہیں ۱۲

ہیں، قیس کے شرف میں، اپنے پرانے دوست قیس کے اعزاز میں پھول بچھا رہے تھے۔ قیس کی بائیسکل اس زور سے جا رہی تھی، پہلے اس تیزی سے چکر لگا رہے تھے کہ پہیوں کی تیلیاں نظر نہ آتی تھیں، بلکہ ایک مسطح دائرہ گھومتا نظر آتا تھا۔

سڑک پر سناٹا تھا؛ بس کہیں کہیں بیچ سڑک میں، گلہری اپنے اگلے پنجوں میں کوئی بیج لئے کترتی نظر آتی تھی، لیکن اس بائسکل سوار عاشق کو دیکھ کر "چک، چک،" گویا "جائیے اپنے محبوب کی تلاش میں جائیے مگر مجھے تو نہ ستائیے" کہتی ہوئی، ببول کے درختوں پر چڑھ جاتی تھی۔ یہ جان بخش ہوا، یہ سماقیس کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہا۔

سواری کی ریاضت سے خون رگوں میں تیزی کے ساتھ دوڑ رہا تھا، چہرے پر سرخی تھی اور دل بے اختیار کچھ گانے کو چاہ رہا تھا؛ تھوڑی دیر تک تو قیس، سیٹی بجا بجا کے، دل کی خواہش پوری کرتے رہے، پھر یکایک پوری آواز سے الاپنے لگے؛

دست از طلب ندارم تا کام من برآید　　یا تن رسد بجاناں یا جان ز تن برآید

کہ وہیں رفت ۔

قیس کے قدیمی دشمن نے اپنا کام کیا: خارِ مغیلاں نے بائسکل کے ربڑ میں سوراخ کر دیا، اور اس طرح اپنے پرانے فرض کو بہ احسن طریق انجام دیا۔

قیس کے تلوے نہ ملنے پر، یہ اسکا انتقام تھا۔ قیس کی کہنی اکھڑ گئی تھی، اور بائسکل ٹوٹ گئی تھی۔

(۳)

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس　　آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

یہ شعر تو نہیں، مگر اس شعر کے ہم معنی خیالات کا ہجوم قیس کے دل و دماغ پر ہو رہا تھا۔

کیونکہ یہی مصیبت کیا کم تھی کہ لیلےٰ کی محبت اُسے چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھی، اُس پر مصیبت مزید یہ کہ کبھی کبھی اُسے اس کا علم ہوجاتا تھا، کہ وُہ اپنی پچھلی زندگی کی تکرار کررہا ہے، اس پُرانے زمانے کو نئی شکل میں دُہرا رہا ہے۔ اُس کے آئینہ قلب پر، ہزار برس قبل کے نجد، اور اُس قدیم نجد میں، اُس کی قدیم زندگی کا انعکاس ہوتا تھا؛ اور یہی نہیں ہر مشرقی ملک کے لٹریچر میں فسانوں میں، نظم میں، نثر میں وُہ اپنے تئیں جلوہ گر پاتا تھا، کہیں اس کے ساتھ استہزا کیا جاتا تھا، کہیں ہمدردی ظاہر کی جاتی تھی، کہیں اُسے جھوٹا قرار دیا جاتا تھا، کہیں کچھ، کہیں کچھ۔ وُہ ان سب کو پڑھتا تھا، اور خون کے گھونٹ پی پی کر رہ جاتا تھا۔

یُوں تو اکثر اس کے دِل پر چوٹ لگانے کے لئے کوئی نہ کوئی چیز موجود ہوجاتی تھی، لیکن آج ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کل دُنیا نے اسے ستانے کی سازش کرلی تھی۔

دہلی کے سول ملٹری ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا؛ بہار کا موسم تھا یعنی جاڑا جاچکا تھا، اور ابھی گرمی کی گرما گرمی شروع نہ ہوئی تھی۔ یہ موسم ہندوستان کی سیر کے لئے بہت مناسب ہے۔ قیس اس سے اچھی طرح واقف تھا، کیونکہ اس سے قبل کئی مرتبہ، اپنی خواہش سے، اقربا کے اصرار سے، ڈاکٹروں کی رائے سے وُہ ہندوستان اور دُوسرے مُلکوں کی سیاحت کرچکا تھا۔ اس دفعہ وُہ ڈاکٹروں کے حکم سے۔ جنھوں نے اس کی بائسکل کی چوٹ کی وجہ سے لیلےٰ کے تعاقب نہ کرسکنے سے جو مزاج میں حد درجہ کی وحشت پیدا ہوگئی تھی اس کے علاج کے لئے سفرِ ہندوستان تجویز کیا تھا۔ وُہ یہاں آیا ہُوا تھا۔ یہ موسم دُنیا بھر میں دلکش ہوتا ہے، ہر جگہ زینت بخشِ عالم ہوتا ہے، پھر

کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان - خدا کے دیئے ہوئے رُوح پرور مناظر، اُس کی عطا کردہ پُرنعم نباتات وجمادات کی نعمتوں کے علاوہ ہرخوبی کو اپنے ہاتھوں کھو دینے والے ہندوستان - میں نیچر کے چہرہ پر غازۂ حُسن نہ پھیردے -

تیسرا پہر تھا، قیس ہوٹل میں اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے بیٹھا ہوا، اخباروں کو پڑھ رہا تھا، اور تھوڑی دیر میں اخباروں کو میز پر رکھ کر سڑک پر آنے جانے والوں کی سیر کر رہا تھا - پائنیر کو پڑھ چکا، تو اُس نے پیسہ اخبار اُٹھایا اور پڑھنا شروع کیا:

"ہم اس کے کہنے میں ذرا سا بھی تامّل نہیں کرتے کہ . . . . . صاحب کا زمانہ اپنے پیشرو کے زمانہ سے انشاء اللہ بہتر ہوگا . وُہ پچھلی غلطیاں، وُہ ہماری قوم کو تہ وبالا کر دینے والی غلطیاں، وُہ شاید، ہمیں امید کرنا چاہیئے کہ یقیناً اُنکے زمانہ میں سرزد نہ ہونگی . قوم کی سرداری آسان کام نہیں، لیکن اس مشکل کام کو . . . . صاحب انشاء اللہ اچھی طرح انجام دینگے .

دورِ مجنوں گذشت و نوبتِ ماست
ہر کسے پنج روز نوبتِ اوست"

قیس آگے نہ پڑھ سکا؛ اس شعر نے اُس کے قلب، اُس کے جگر گاہ تک جاکر اُس کے حسیات خفتہ کو جو اس سفر میں اُسے اسقدر نہ ستا رہے تھے پھر جگا دیا. یہ عُمر میں پہلی دفعہ نہ تھی کہ اُس نے یہ شعر پڑھا ہو، لیکن اُس پر ان دو مصرعوں کا اثر کچھ اور ہی ہوا، کیونکہ آج اُسے پھر یہ علم ہوا تھا کہ وُہ وُہی پرانا قیس ہے . اور اُس نے کہنا شروع کیا: "کہتا ہے' ہر کسے پنج روز نوبت اوست'، یہ نہیں سمجھتا کہ جس مجنوں کے زمانہ کو وُہ ختم سمجھتا ہے، وُہ بدنصیب اپنی زندگی، اپنی مصیبت بھری زندگی پھر کاٹنے پر مجبور کیا جا رہا ہے، اور اس دفعہ کسی کو یقین بھی نہیں آتا کہ یہ وُہی پرانا

قیس ہے۔ اس لئے کوئی اس سے ہمدردی نہیں، کوئی اس کے حالات پر توجہ نہیں کرتا۔ ہر کسے پنج روز نوبتِ اوست ابجا ہے۔ میں تو جس کی نوبت ختم ہو گئی تھی۔ سینکڑوں برس کے بعد، پھر اسی سلسلۂ زلف کا اسیر، اِنہی بیڑیوں کا قیدی کر دیا گیا۔"

قیس کے دماغ میں یہ خیالات گذر رہے تھے کہ اس کے کان میں ایک آواز ایک پتلی آواز جو صاف بتا رہی تھی کہ یا لڑکے کی ہے یا کسی عورت کی۔ پہنچی، اور اور اس نے سڑک پر نظر ڈالی۔ دیکھا کہ ایک تیرہ چودہ برس کا لڑکا، معمولی نوکروں کے کپڑے پہنے، ایک ہاتھ سے گیند اچھال اچھال کر دوسرے ہاتھ میں لیتے ہوئے، اپنے آقا کے کسی کام پر یا کوئی پیغام، یا پیغام کا جواب لئے جا رہا ہے اور نہایت مزے کے سروں میں گا رہا ہے:

داستاں میری سنو قصّۂ مجنوں نہ سنو

وہ بھی کیا قصّہ کہ جس کی کوئی بنیاد نہ ہو

قیس ایک دم، پاؤں زمین پر مار کے اٹھ کھڑا ہوا، اور کمرے میں ٹہلنے لگا اور اپنے دل سے نہایت غصّہ میں باتیں کرنے لگا: "اور لیجئے 'وہ بھی کیا قصّہ کہ جس کی کوئی بنیاد نہ ہو' تو یہ کربِ مفارقت، یہ صحرا نوردیاں، یہ آہیں، یہ نالے جو میں نے وہاں کئے یہ سب فرضی ہی تھے؛ گویا میرے پاؤں میں چھالے پڑے ہی نہیں، گویا ان چھالوں کو کبھی کسی کانٹے نے چھوڑا ہی نہیں۔ ہاں، ہاں یہ سب غلط، اور یہ صاحبزادے، ان کا قصّہ صحیح۔ بیشک آپکا قصّہ صحیح۔ اس میں شبہہ کی گنجائش نہیں، بیشک صحیح ہے کہ کل آپ کی پتنگ کٹ گئی تھی، اور اس کے ساتھ آپ کے مانجھے کی ڈوری بہت سی چلی گئی، جس کا آپ کو بہت قلق ہے۔ بیشک صحیح ہے کہ کل گولیاں کھیلنے میں آپ ہار گئے، اور آپ کے رفیق سے آپکی

خوب لڑائی ہوئی اور اُس نے آپ کو دھپیایا، جس سے آپ آدھ گھنٹہ رویا کئے. اور جب اپنے آقا کے پاس آئے تو اُسنے بھی اتنی غیر حاضری پر آپ کو خوب سا مارا. بیشک آپ کا قصّہ ترحم انگیز ہے، اور میری کہانی مہمل اور بے معنی ہے. کسی کے سُننے کے لائق نہیں. سُننے کے لائق کب ہو، بے اصل ہے بے بنیاد ہے.

نہیں، نہیں، تم تو بے سمجھے الاپ رہے ہو، اصل مصنّف صاحب کی خدمت میں عرض کرنی چاہیئے کہ بیشک آپ نے جو فرمایا درست ہے؛ کوئی شک نہیں کہ آپکا قصّہ صحیح کہ گھر میں کل رات سالن ذرا سا جل گیا تھا، وہ آپ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے سارا کھانا زمین پر پھینک دیا، اور اپنی بیوی کی اچھی طرح خبر لی، وُہ بیچاری سسک سسک کے روتی رہی، آپ اپنی جیب میں پرچہ غزل ڈال کر مشاعرہ میں تشریف لائے، اور نہایت فخر سے غزل پڑھی؛ چاروں طرف سے واہ وا کے طوفانِ شور افزا میں آپ اور آپ کی غزل غرق ہو گئی -

اس شعر پر آپ نے خاص طور پر داد طلب کی اور آپ کو حسب الامر، حسب المطلب خاص طور پر داد ملی:

داستان میری سنو قصّہ مجنوں نہ سُنو
وُہ بھی کیا قصّہ کہ جس کی کوئی بنیاد نہ ہو

آج تمام دُنیا نے اُسے ستانے کی سازش کر لی تھی؛ آج کا دن اُن لمحوں میں سے تھا جب ظالم قضا و قدر اُسے اس بات کا علم دیدیتی تھی کہ وُہ وہی پُرانا قیس ہے؛ اور پھر۔ آہ! پھر۔ چو رگ زن کہ جرّاح و مرہم نہ است، یہ علم اُس سے چھین لیتی تھی؛ قضا و قدر کی یہ آنکھمیایاں تھیں، وہ ایک ہاتھ سے خنجر کھبوتی تھی، دُوسرے ہاتھ سے اُس پر مرہم رکھدیتی تھی.

آج خنجر کھبونیکا دن تھا. آج اُس کے آئینۂ دِل پر، اُسکی پُرانی زندگی کا-

وُہ ہزاروں برس قبل والی زندگی کا ۔ انعکاس ہو رہا تھا ، اور عین جس وقت اُس کے قلب پر اُس کی زندگی کا انعکاس ہو رہا تھا ، دُنیا کی ہر شے اُس کے دل پر جان جان کر چوٹیں لگا رہی تھی ۔ وُہ لڑکے کے شعر سے ہی جھنایا ہوا تھا ، اور ہوٹل کے کمرے میں ٹہل ٹہل کے یہ باتیں کر رہا تھا کہ ایک اَور آواز سنائی دی ۔

ایک یکہ والا ، گھوڑے کو شڑاق ، شڑاق ہنٹر مارتا ، بے تحاشا بھگاتا ، گویا اپنے تئیں یار کی دیوار سے جس قدر جلد اور جس قدر دُور ہو سکے لیجانے کی کوشش کرتا ہوا ، یہ گا رہا تھا :

ہم تو مرینگے یار کی دیوار کے تلے
مجنوں کو تھا جنوں جو بیاباں میں رگیا ۔

اس شعر نے ، قیس کے خیالات کی رَو کو دفعتاً اَور طرف لیجانا شروع کر دیا : ارادہ نہایت عمدہ ہے ، خدا اُس کے ارادے میں برکت دے ، اور اُسے یار کی دیوار کے تلے مرنا نصیب ہو ، لیکن خود وُہ (قیس) بھلا اس خوش نصیبی کی کب توقع کر سکتا تھا ۔ اُس وقت بھی ۔ اُس ہزاروں برس قبل والے زمانے میں بھی ۔ دیوار کے تلے مرنا کیسا ، سایہ دیوار میں بیٹھنے کی اجازت تک نہ دی جاتی تھی ۔ اور اب تو حالت اس زمانہ سے بدرجہا بدتر تھی ۔ پہلے تو صرف اہلِ خانہ مانع ہوتے تھے ، اب اہلِ خانہ مانع نہ بھی ہوں تو میونسپلٹی نہ اُسے بیٹھنے دیگی ، نہ وہاں بستر بچھانے دیگی "ہم تو مرینگے یار کی دیوار کے تلے" ! دیوار کے تلے ، بیٹھ کر ، دم توڑ دینا ، شاید ہندوستان میں ممکن ہو تو ہو ، متمدن ، میونسپلٹی ۔ ظالم ، پابند قانون میونسپلٹی والے نجد میں تو ممکن نہیں صرف ایک طریقہ مرنے کا اَور ہے ، لیکن وُہ خود اختیاری نہیں ، وہ دیوار کی عنایت پر منحصر ہے ، یعنی جب وُہ یار کی دیوار کے تلے سے گذرتا ہوتا ہو ، تو وُہ (یعنی یار کی دیوار) لطفاً و مرحمتاً اُس پر گر پڑے ؛ اور اس طرح وُہ

دیوار کے نیچے دب کر مر جائے۔ لیکن یہاں بھی وہی ظالم میونسپلٹی کا پاؤں اڑا ہوا ہے۔ اوّل تو اہلِ خانہ خدا کے فضل سے ہمیشہ مکان کی مرمّت کراتے رہتے ہیں بالفرض وُہ بھُول بھی جائیں تو میونسپلٹی، اگر کسی دیوار کو خطرہ کی حالت میں دیکھتی ہے تو وُہ اُسے گروا کے نئی اور مضبوط دیوار بنوا دیتی ہے۔

اس طرح بکّہ والے کے طعن نے جو اُس کے دِل پر برچھی لگائی تھی اس کی چُبھن کو گھٹانے کی، لڑکے نے جو چرکے لگائے تھے، اُنکی سوزش کو کم کرنے کی، منطق اور دلائل سے کوشش کر رہا تھا؛ اس ہجوم طعنہائے شعرا کے مقابلہ میں جو اُس نے اپنی قوت صرف کی تھی، اُس سے وُہ تھکا ہُوا معلوم ہوتا تھا؛ آخر کمرے میں نہ ٹہلا گیا، کُرسی میں گر پڑا؛ اور اس طرح بے حِس و حرکت گر پڑا گویا اُس کے اعضا کی تمام طاقت مسلوب ہو گئی ہے؛ اور اس وقت نہ صرف اعضا بے حرکت تھے بلکہ دماغ بھی ساکن تھا؛ دماغ جو اس قدر پُر شدّت خیالات کا جَولانگاہ رہا تھا، اس وقت اپنے میں کسی خیال کو جگہ دینے سے انکار کر رہا تھا۔

حِس اور جسم کی اس عطالت نے اُس پر اپنا جاں بخش اثر کیا۔ اور تھوڑی دیر میں وُہ تازہ دم ہو کے اُٹھ بیٹھا۔ خالی کس سے بیٹھا جاتا ہے۔ پھر پاس کی میز سے ایک اخبار اُٹھایا۔ یہ "مخزن" تھا۔ یُوں ہی بغیر کسی مقصد کے ورق اُلٹ رہا تھا کہ اس کی نظر کو آخری صفحوں پر غزل کے لفظ نے اپنی طرف مائل کیا۔

یہ نیرنگ کی ایک غزل تھی مقطع تھا،

پھر ہُوئی لیلےٰ و مجنوں کی حکایت تازہ

اُن کا عالم وُہی، نیرنگ کا نقشہ ہو وُہی

مقطع کو پڑھ کے اس کی طبیعت بہت خوش ہوئی ۔

"پھر ہوئی لیلےٰ و مجنوں کی حکایت تازہ ! خُدا بھلا کرے تیرا نیرنگ ۔ اگر کسی شخص نے دُنیا میں حقیقت کو بیان کیا ہے، یا زیادہ صحیح یہ کہ کتمانِ حقیقت سے گریز کیا ہے تو وُہ نیرنگ ہے ۔ جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ ۔ دُوسرا مصرع مَیں نہیں کہتا کہ غلط ہوگا، ممکن ہے کہ نیرنگ کا نقشہ میرے ہی نقشہ کی طرح ہو، اس لئے مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں ۔ مَیں تو صرف پہلے مصرع کے لئے اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں":

قدر، برچھیاں کھبونے سے فارغ ہوکر، اب مرہم رکھنا چاہتی تھی، ورنہ کیا وجہ ہے کہ اس شعر نے قیس کو خوش کیا ۔

تھوڑی دیر میں قیس، وہی سادہ قیس تھا، اور اُسے پچھلے واقعات کا ذرا سا بھی علم نہ تھا ۔

اب قیس کی طبیعت اس قدر بشاش تھی کہ اُس سے کمرے میں یوُں تنہا نہ بیٹھا گیا ۔

فلالین کا سُوٹ پہن کے، اور ٹینس بیٹ ہاتھ میں لیکر، قیس باہر آیا اور مغرب تک ٹینس کھیلتا رہا ۔

(باقی آئندہ)

سجّاد حیدر از بغداد

سید سجاد حیدر صاحب بی ۔ اے جنکی تصویر اس مرتبہ شائع ہوتی ہے علیگڈہ کالج کے اُن طلبہ میں سے ہیں جنکی قابلیت پہ کالج جس قدر ناز کرے بجا ہے ۔ مخزن میں جیسے دلچسپ اور اچھوتے مضمون وہ بغداد سے بھیجتے رہے ہیں ۔ اور جو قبولیت اُن مضامین کو حاصل ہوئی ہے ۔ اس کے اعتبار سے اُنکی تصویر اب سے بہت پہلے نکلنی چاہئے تھی ۔ مگر سید صاحب شہرت کے استحقاق کے باوجود شہرت سے اس قدر گریزاں ہیں ۔ کہ اتنی دیر کے اصرار کے بعد بہ مشکل اُنہوں نے اپنی تصویر ہمیں بھیجی ہے ۔

کالر ٹائی

ایک بزرگ جو انگریزی لباس کے مخالف تھے۔ اس کی مذمت کرتے ہُوئے ایک دن فرمانے لگے "صاحب! اور سب باتیں تو پھر بھی کچھ سمجھ میں آئیں مگر نہ آئی تو یہ کالر ٹائی۔ ایک پٹہ سا گلے میں باندھ لیا اور ایک رنگین چیتھڑا اس کے اوپر لپیٹ لیا۔ اور لگے اترا اترا کے چلنے۔ کونسی خوبی اس میں ہے کہ انسان ہر وقت کا ایک عذاب مول لے۔ ہم اگر یہ پٹہ پہنیں تو ہماری گردن اکڑ جائے۔ اوّل تو اس میں خوبصورتی ہی کونسی ہے اور اگر ہو بھی تو ایسی خوبصورتی کو کیا کریں جو وبال جان بن جائے"

نئی وضع کے چند حامی بھی پاس بیٹھے تھے اُنہوں نے مقابلے میں آستینیں چڑھائیں اور کالر ٹائی کی خوبیاں گنوانے لگے۔ معترض ایک تھے اور جواب دینے والے تین چار۔ مگر بوڑھوں کی ہمت کا کیا کہنا۔ بڑے میاں سب کا برابر جواب دیتے رہے اور آخر اگر جیت کر نہیں اُٹھے تو ہار کر بھی نہیں نکلے۔ برابر کا جوڑ رہا اور وُہ خود تو یہی کہتے ہُوئے گئے کہ یہ بھگوڑے ہمارے سامنے کیا ٹھہرینگے۔ ان کے اچھوں کو بھی بھگا کے چھوڑیں۔ بڑے آئے وہاں سے کالر باز ٹائی باز بن کے۔ میں ان کو کیا گانٹھتا ہُوں اب بھی کچھ نہیں بگڑا اگر یہ اپنی حرکات سے باز آجائیں ورنہ وہ ذلیل کرونگا کہ یاد رکھیں۔

بڑے میاں اور ان نوجوانوں کا مُباحثہ بہت دلچسپ تھا۔ اِس لئے جتنا یاد رہ گیا قلم بند کر لیا گیا۔ ممکن ہے کسی زمانہ میں جب کالر اور ٹائی بحث کی حد سے نکل چکیں اور ہندوستانی انہیں رویا قبول کر چکے لوگ اس کو شوق سے پڑھیں

چونکہ بڑے میاں وضع قدیم کی حمایت کرتے تھے اور نوجوان طرزِ جدید کے طرفدار تھے اس لئے سہولت کے لئے ہم ایک فریق کو قدیم اور دوسرے کو جدید کہینگے۔ بڑے میاں کے مُنہہ سے کالر کے لئے پٹہ کا لفظ نکلنا ہی تھا کہ طرزِ نو کے دلدادہ بول اُٹھے۔

جدید۔ ذرا تہذیب سے گفتگو کیجیے۔ ہم آپ کو بزرگ سمجھ کر آپ کا لحاظ کرتے ہیں اور آپ کی وضع قطع پر اعتراض نہیں کرتے۔ واللہ دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ آپ کے لباس کے ہر حصے پر سو سو پھبتیاں ہو سکتی ہیں۔

قدیم۔ آپ کے ہاں خدا جانے تہذیب کسے کہتے ہیں۔ مَیں تو آپ کی تہذیب کا قائل نہیں۔ مَیں نے تو ایک بجا اعتراض کیا ہے۔ یہ جو سفید سا پٹہ آپ پہنے ہُوئے ہیں اسے پٹہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔ مَیں تو صاف سچا آدمی ہوں جو آنکھ سے دیکھتا ہوں سو زبان سے کہتا ہوں۔

جدید۔ تو آپ نے کالر فرما دیا ہوتا۔ اسے پٹہ کہنا تو لڑائی مول لینا ہے۔

قدیم۔ مجھے اوّل تو آپ کے انگریزی الفاظ آتے کم ہیں دُوسرے مجھے ان سے نفرت ہے۔ میری زبان تو وہی زبان ہے جو میرے باپ دادا کی تھی آپ کی طرح نہیں کہ زبان تک بھی آمیزشِ غیر سے پاک نہیں۔ آپ ہی فرمائیے کہ مَیں نے کیا بُرا کیا۔ اگر کالر کی بجائے اپنی زبان کا لفظ بول دیا جب آپ پٹے کے پہننے سے نہیں گھبراتے تو اُس کا نام سُننے سے کیوں گھبراتے ہیں۔

جدید۔ دیکھئے پھر وہی بات۔ آپ کی چھیڑ کی عادت نہیں جاتی۔ ہم کچھ کہہ بیٹھے تو بُرے بنیں گے۔ پٹہ کتوں کے گلے میں ہوتا ہے کہ انسانوں کے۔ چُونکہ یہ لفظ عام طور پر انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اِس لئے اس مفید اور کار آمد چیز کو جو مہذب انسانوں کے لباس کا جزو بن گئی ہے۔ اُردو میں بھی کالر ہی کہتے ہیں۔ جہاں ریل ٹکٹ لمپ کمپ وغیرہ سینکڑوں الفاظ انگریزی

سے آکر اُردو میں شامل ہو گئے ہیں۔ اسی طرح یہ ہے۔ معمولی سے معمولی دوکاندار بھی جانتا ہے کہ کالر کسے کہتے ہیں اور پڑھے لکھے آدمی تو سب سمجھتے ہیں ایک آپ ہیں کہ جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہیں۔

قدیم۔ مَیں تو جان کر انجان نہیں بنتا۔ نہیں جانتا جبھی تو پُوچھتا ہوں کہ اس "پٹہ" آپ خفا نہ ہوجیے "کالر" کے پہننے سے کیا فائدہ ہے۔

جدید۔ ہاں یہ ہم آپ کو بتا سکتے ہیں آپ ذرا غور کریں تو آپ کو خود ہی معلوم ہوجائے کہ کالر کیسی کام کی چیز ہے۔ اس کے پہننے سے کوٹ کی حفاظت مقصود ہے۔ آپ اپنے چوغے کو تو دیکھئے گلے کے قریب کیسا میلا ہو رہا ہے اور کتنا بدنما بنگیا ہے۔ ہمارے کوٹ کالر کی بدولت صاف رہتے ہیں۔ علاوہ اس کے کتنا خوشنما ہوتا ہے اور چہرے کو کس قدر رُعب دار بناتا ہے۔

قدیم۔ رعب کی بھی ایک ہی کہی۔ رُعب جیسا ہمارے اپنے لباس میں ہے۔ وُہ آپ کے لباس میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ ایک دلیل کوٹ کو صاف رکھنے کی آپ نے دی ہے۔ اس کے جواب میں مَیں کئی دلائل خلاف دیسکتا ہُوں۔ (۱) پہننے میں تکلیف۔ مَیں نے دیکھا ہے کہ آپ لوگ اکثر آئینے کے سامنے کھڑے دیر تک "کالر" سے کُشتی لڑا کرتے ہیں۔ (۲) کالر ہر روز یا دُوسرے دن بدلنے میں زاید مصارف کا بوجھ پڑتا ہے۔ (۳) گلے کے گرد ایک طوق سا باندھے رہنا اپنے آپ کو خواہ مخواہ سزا دینا ہے۔

جدید۔ دیکھئے! آپ کی زبان پھر بے لگام ہُوئی۔ آپ سے کوئی شریف آدمی کیا بحث کرسکتا ہے۔ آپ بغیر بُرے استعاروں کے بیجا استعمال کرنے کے بات ہی نہیں کرسکتے۔ "طوق" کہنے والے آپ کون ہوتے ہیں طوق ہوگا آپ کے گلے میں۔

قدیم - خدا جانے آجکل کے صاحبزادے نازک مزاج کتنے ہو گئے ہیں - ذرا سی بات پر جامے سے باہر ہوئے جاتے ہیں - مَیں نے تو اب دانستہ چھیڑ نہ کی تھی - یونہی بیساختہ طوق کا لفظ منہ سے نکل گیا - میرا مطلب طوقِ لعنت سے تو تھا نہیں جو آپ نے سمجھ لیا ہے مگر اب جو تم کہلواتے ہو تو صاف کیوں نہ کہدوں - مَیں اسے طوقِ غلامی تو ضرور سمجھتا ہوں -

جدید - خدا کی شان - آپ بھی ہمیں غلامی کے طعنے دینے کے لائق ہو گئے آپ کی عمر غلامی میں گذری - پہلے آپ ایک ریاست کی غلامی کرتے رہے اب وہاں سے آئے تو ہر حاکم کی غلامی کرتے ہیں - اس پر آپ کی بسر اوقات ہے - صبح ہوئی اور آپ کسی نہ کسی حاکم کے دروازے پر موجود اسکو وسیلۂ عزت و آبرو بنا رکھا ہے اس پر یہ حوصلہ کہ ہم جیسے آزاد منش لوگوں کو غلام کہو - ہم نے جو تعلیم پائی ہے وُہ غلامی کی نہیں آزادی کی تعلیم ہے - ہم نہ کسی حاکم کے ہاں جاتے ہیں نہ محکوم کے ہاں - ہم نے اسی لئے سرکاری ملازمت کا ارادہ ترک کر دیا ہے - کہ اس میں آپ کی طرح غلامی نہ کرنی پڑے - ہم تو یہ جانتے ہیں آزادی ہاتھ سے نہ جائے - چاہے کھانے کو ساری کی جگہ آدھی ہی ملے -

قدیم - زیادہ شیخی نہ بگھاریئے - مجھے آپ کی حقیقت خوب معلوم ہے جسے آپ نے آزادی سمجھ رکھا ہے وُہ تو ناتجربہ کاروں کی آزادی ہے - جو شیخی میں آ کر اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آزاد ہیں حالانکہ سخت پابند ہیں - کالر یُوں ہو اور ٹائی یُوں - دُوسروں کے رسم و رواج کی یہ پابندی اور اس پر آزادی کے دعوے - آزاد ہم ہیں کہ خوشامد سے کام بھی نکال لیتے ہیں اور اس پر طرزِ بود و باش میں اور خیالات ہی میں غیروں کے محکوم اور پیرو نہیں

آپ لوگ آزادی کے جھوٹے دعویدار ہیں اور ہم فی الحقیقت آزاد۔

جدید۔ اِس پابندی کا کیا ہے ہم اگر نئے رواج کے پابند ہیں تو آپ پُرانے کے۔ بلکہ ہم نے آزادی سے کام لیا پُرانے رواج کو بدل لیا۔ آپ اس کے اسقدر محکوم ہیں کہ آپ کو جرأت نہیں کہ کوئی نئی چیز اختیار کریں۔ مگر یہ سب بحث تو دُور از کار ہے۔ ہم نے آپ کو کالر کے استعمال کے فوائد بتائے۔ آپ سے جب جواب بن نہ پڑا تو آپ گالیاں دینے لگے۔

قدیم۔ گالیاں دینا اپنا تو دستور نہیں آپ کا ہو تو ہو یہاں دب کے کبھی کسی سے رہے نہیں۔ جواب تُرکی بہ تُرکی دینا جانتے ہیں۔ کج بحثی تو آپ نے شروع کی کہ کالر کے فوائد سے غلامی اور آزادی کی بحث میں جا پڑے۔ مگر یہ فرمائیے کہ کالر کا تو کچھ فائدہ آپ بتا بھی سکے اس ٹائی کا کیا جواب پیدا کروگے۔

جدید۔ اِس کا نہایت معقول جواب ہمارے پاس ہے۔ بشرطیکہ آپ اسے سمجھ سکیں دُنیا میں ایک چیز ہے۔ جسے "حُسن" کہتے ہیں۔ فطرتِ انسان اس کی ہر جگہ متلاشی رہتی ہے۔ آپ اسے نہایت محدود معنوں میں لیتے ہیں۔ ہم نہایت وسیع معنوں میں۔ ٹائی کالر کا حُسن دوبالا کرتی ہے۔ کالر کے بٹن کو چھپاتی اور سارے لباس کی زینت کا باعث ہوتی ہے۔ کالر ہو اور گلے پر سے کھُلا ہوا کوٹ ہو تو ٹائی پہننا ضرور ہے۔

قدیم۔ گویا آپ اسے ایک بے ضرورت چیز مانتے ہیں جو صرف زینت کے لئے لگائی جاتی ہے۔ اوّل تو مردوں کو زینت سے کیا کام۔ یہ تو عورتوں کا حصّہ ہے اور دُوسرے کس قدر صرف بیجا اس پر کیا جاتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ گلے سے کھُلے ہُوئے کوٹ کے واسطے ٹائی ضروری ہے۔ مَیں کہتا ہُوں ٹائی کی خاطر گلے سے کھُلا ہُوا کوٹ ایجاد کیا گیا ہے ورنہ ہر طرح سے اس کا

بند رہنا مفید تھا - اہلِ یورپ یُوں تو مردانہ لباس میں سادگی کے دعویدار ہیں لیکن اگر غور سے دیکھیں تو اُنہوں نے اس میں کتنے تکلفات بڑھائے ہیں اور اسراف کے اس قدر دروازے کھول دیئے ہیں کہ کوئی حد نہیں - میرے خیال میں کالر ٹائی سب فضول خرچی اور تضیع اوقات کے بہانے ہیں - آپ نے کہا ہے کالر کوٹ کو بچانے کے لئے پہنا جاتا ہے اور ٹائی کالر کا بٹن چھپانے کو - میرا خیال ہے کہ کالر کوٹ کو بچانے کے لئے پہننا فقط ایک بہانہ ہے بلکہ مَیں نے اکثر دیکھا ہے کہ کالر انگریزی لباس اختیار کرنے کا پیش خیمہ ہوتا ہے - پہلے کالر پہننا اور بند گلے کا کوٹ - اس کے بعد دوسروں کے کوٹ کھُلے گلے کے دیکھ کر ایک ویسا ہی کوٹ بنوا لیا - اب ٹائی کی راہ نکلی - جب یہ سب ہو لیا تو کسی نے کہا ان کے ساتھ پتلون زیب دیتی ہے - چلئے پتلون بنگئی - اس کے بعد ٹوپی کی کسر رہگئی - سو ہیٹ صاحب پہننے لگے ہیں - ارے میاں اتنے بہانے کیوں کرتے ہو - کہدو کہ ہم انگریز بنے بغیر نہیں رہ سکتے - مگر یہ ملحوظ رہے کہ وُہ مُنہہ بھی لگاتے ہیں یا نہیں -

جدید - حضرت اُن کے مُنہہ لگنے کی یہاں کسے غرض پڑی ہے - یہاں تو یہ اصُول ہے کہ اچھّی بات ہو وُہ جہاں ہو اخذ کر لو - ایک انگریزوں پر کیا حصر ہے - اسوقت مہذّب دنیا کی سب قوموں کے لباس میں یہ چیز موجود ہے - ہم نہیں چاہتے کہ ہم کسی سے پیچھے سمجھے جائیں - محض اس لئے کہ ہمارا لباس ان کے لباس کی خوبی کو نہیں پہنچتا - کالر کے فوائد آپ سُن چکے ہیں - یہ ایسی چیز ہے کہ جو لوگ انگریزی لباس بھی نہیں پہنتے وُہ بھی اسے اختیار کرتے جاتے ہیں - بمبئی کے سیٹھوں کو دیکھو

کالر کے اُوپر پُرانی وضع کا بند گلے کا کوٹ یا چوغہ پہنتے ہیں جس سے کوٹ محفوظ رہتا ہے۔ ٹائی کو اگر محض سببِ زینت بھی مان لیا جائے تو بھی جائز چیز ہے۔ یہ مسئلہ درست نہیں کہ مرد زینت سے بالکل مستغنی ہے۔ مرد عورت دونوں ایک دُوسرے کو خوش کرنے کے لئے ایک دُوسرے پر اچھا اثر ڈالنے کے لئے بناؤ سنگار کے محتاج ہیں۔ صرف کم و بیش کا فرق ہے۔ مردوں کے سادہ لباس میں شوخ ٹائی کی زینت بادلوں میں قوس قزح کا رنگ ہوتا ہے۔ آپ ناحق ان چیزوں کی مذمت کرتے ہیں۔ زمانہ ان کے موافق ہے۔ آپ کیا مقابلہ کریں گے۔ اپنے ہی ننھے سے صاحبزادے سے پُوچھئے تو ٹائی کی فرمائش کرے گا۔ اُس وقت محبتِ پدری کے تقاضے سے فرمائش پوری کرنی پڑے گی۔ اور اُس کے بعد اپنی ہی نگاہ سے بنظرِ انصاف پوچھئے گا کہ ٹائی کالر پر بندھی ہُوئی بھلی معلوم ہوتی ہے یا نہیں؟ ویسے بُرا کہنے کو کیا ہے۔ کالر ٹائی تو کیا آپ سارے جہان کو بُرا کہیں۔ ع

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

قدیم۔ آپ کی اس تقریر سے ہمارے خیالات تو بدل سکتے نہیں۔ ہم دلیل کے قائل ہیں۔ مگر آپ جس مدرسے میں پڑھتے ہیں۔ وہاں معلوم ہوتا ہے کہ دلائل کی جگہ زبان درازی کی تعلیم ہوتی ہے۔

محمد اکرام

رؤیائے مقصود

تمہید

مان لیا کہ سید مقصود قیودِ مذہب سے قطعی آزاد اور احکام الٰہی سے بالکل غافل تھا مگر اس کا جواب کیا ہوگا کہ ایک ایسی ماں کے دُودھ سے پلا اور گود میں پلا جو عذابِ الٰہی کے نام سے تھرّا اُٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گو لندن کے قیام نے اس کے اسلام پر پانی پھیر دیا مگر پھر بھی جب افکارِ دُنیوی سے فرصت اور ضروری کاروبار سے فراغت پاتا مسئلہ عبودیت پر غور کرنے بیٹھ جاتا۔ ورنہ معتزلہ کالج کا طالب علم کیمبرج یونیورسٹی کا بی۔ اے۔ سول سروس کا ممبر۔ آٹھ ساڑھے آٹھ سو روپیہ کا معزز عُہدہ دار مقصود سے اور خدا سے واسطہ کیا؟

ہم کو اس سے بحث نہیں کہ وُہ ولائت کیوں گیا ایل ایل ایم کی ڈگری چشمِ ما روشن دلِ ما شاد مگر یہ شراب کا پچھلا کیسا پیچھے لگا لایا! گھر چھُٹا بار چھُٹا مگر یہی مُردار نہ چھُٹی!!

ابتدائی تعلیم کو جانے دو صرف ماں کے خیالات کا اثر اب بھی اتنا کافی تھا کہ اگر فرانس کے دربار گڑے نہ پڑتے تو وہ رنگ اُترنے والا نہ تھا۔ اور اگر مقصود زیادہ نہیں دو برس ماں کے پاس اور رہ جائے تو وُہی پردے کی بیٹھنے والی اور چار دیواری کی گھٹنے والی اُس کو انسان بنا دیتی۔ مگر افسوس ہے اُس کمبخت باپ پر جس نے نہ اِدھر کا رکھا نہ اُدھر کا اور اُدھر میں لٹکا دیا!! نو برس کی عمر سے جو جُدا ہُوا تو پھر دو مہینہ لگ

بھی ماں کے پاس رہنا نصیب نہ ہُوا! نہیں تو یہی مقصود جس کے واسطے آج تمام حیات آباد چھان مارا اور ایک متنفس ایسا نہ ملا جو اس کے دو سجدوں کی شہادت دیدیتا۔ اس ماں کے پاس سے ایسی طبیعت اور مزاج لیکر نکلتا کہ فرانس کیا اگر کوہ قاف تک ہو آتا تو خدا کی عظمت کو ہاتھ سے نہ دیتا۔

خُدا کو جان دینی ہے۔ مقصود کے معاملہ میں ماں بالکل بے گناہ ہو ذمہ وار ہے تو باپ کہ نہ آپ خدا کو خُدا سمجھا نہ بیٹے کو سمجھنے دیا نو برس کی جان کو جو کالج میں لے جا کر چھوڑا تو پھر پلٹ کر نہ دیکھا کہ یہ کمبخت کر کیا رہا ہے نتیجہ یہ ہوا اور ہونا چاہیے تھا کہ ماں کے عقائد جو کچھ تھوڑے بہت ساتھ لیکر گیا تھا ختم ہونے شروع ہُوئے! باپ نے کی لا پروائی۔ ماں کے پاس رہنے کا موقعہ ملا نہیں۔ مشفق شفیق ناصح صلاح کار جو کچھ تھے یا میاں نوکر سردار یا کالج کے در و دیوار صحبت ملی تو اُنکی جو نمازی کو کہیں گنہگار ایماندار کو کہیں بیوقوف دوست بنے تو وُہ لڑکے جو انتہا کے خود غرض اور پرلے درجہ کے فیلسوف اپنا رنگ یہ کچھ ساتھیوں کے ڈھنگ وُہ کچھ اب مقصود کو مردود بنانے کے واسطے فرشتہ تو آنے سے رہے۔

اگرچہ ان باتوں کو اب پچاس پچاس برس ہو گئے مگر آج بھی اُس وقت کی دیکھنے والی صُورتیں موجُود ہیں۔ جب مقصود ولایت روانہ ہُوا ہے دیندار ماں ڈیوڑھی میں کھڑی تھی۔ سلام کو جھکا تو کلیجہ سے لگا کر روئی۔ چپکے چپکے آیتہ الکرسی پڑھکر دم کی اور بآوازِ بلند کہا۔

"مقصود خُدا تیرا نگہبان جان اور ایمان کی سلامتی میں واپس آنا نصیب ہو"

وُہ اگر کامیابی امتحان کی متمنی تھی تو سلامتی ایمان کی دُعا گو درازیٔ عمر کی خواستگار تھی تو برکتِ اسلام کی طلبگار مگر والد بزرگوار کی تمام تمناؤں اور دُعاؤں کا

دار مدار صرف ایک ڈگری پر تھا۔ خاندان پر حرف آیا تو آیا باپ دادا کی عزت گئی تو گئی مگر بیٹا تو ایل ایل ایم کہلایا۔

کاش ناعاقبت اندیش باپ کے دل میں جہاں دُنیوی ترقی کی اس قدر خواہشیں تھیں ذرّہ بھر رُوحانی ترقی کا بھی خیال ہوتا !!! ہمارا یقین تو یہ ہے اگر مقصود مذہب کو سمجھ کر ولایت جاتا تو اُس کا یہ سفر سونے پر سہاگہ ہوتا اور وُہی مقصود جو آج ایسا بدنام ہوا کہ ساری دُنیا تھُڑی تھُڑی کر رہی ہے ایسا متقی پرہیزگار بنکر آتا کہ تمام جہان واہ واہ کرتا :-

بازار

مرزا - مسٹر مقصود کے خاندان کا قدیمی نوکر

شریف - مرزا کا دوست

(۱)

شریف - ہاں بھائی مرزا اب کیوں آنکھ مِلانے لگے اب تو خبط صاب نے نوکر ہو

مرزا - ابے یار بس بیٹھا بھی رہ ! بڑے میر صاب نے جد کہا مرزا جی ہی کہا - اللہ بخشے منجھلے میاں کا مرزا جی ہی کہتے کہتے مُنہہ خشک ہوتا تھا۔ "یہ ٹانگ برابر کا لمڈا بغیر دل کے بات ہی نہیں کرتا - قسم ہے اللہ کی جان اجیرن ہو گئی بڑھاپے میں مٹی پلیت ہونی تھی ہو رہی ہے (مُنہہ پر ہاتھ پھیر کر) خُدا اس سفید داڑھی کی شرم رکھ لے۔

شریف - یہ منجھلے میاں کو سوجھی کیا ! بیٹھے بٹھائے لمڈے کو وِلات بھیجکر کرنسٹان بنوا دیا ! خُدا کا وُہ نہیں رسُول کا وُہ نہیں دین کا وُہ نہیں دُنیا کا وُہ نہیں رات دن شراب ہے اور وُہ ہے ! پی ہم نے بھی ہے

اور تم سے کیا چھپائیں اب بھی عذر نہیں مگر بھائی یہ تھوڑی ہے کہ ہر وقت دُھت بنے ہوئے ہیں۔

مرزا۔ شریف یار تو ہے بڑا ذلیل ابے اپنی تو کہہ تو نے عمر بھر میں کے دفعہ نماز پڑھی ہے وہ تو امیر کا بچہ ہے اللہ نے اوپر سے وسکو حکومت دی جو نہ کرے وہ تھوڑا۔

شریف۔ ایک تو ہوتا ہے اُلّو اور تو جو ہے تو اُلّو بھی نہیں اُلّو کا پٹھا ہے مرزا جی یار بُرا نہ ماننا ابے ہمارا کیا ہے! جو بیس برس جُمّہ مسجد کے نیچے وہی بڑے بیچے مگر کس مردود کو یہ بھی خبر ہو گی کہ حوض کدھر ہے، مگر بھائی ہم لاکھ نماز نہ پڑھیں اللہ کو اللہ تو سمجھتے ہیں وہ تو سر سے اللہ ہی سے پھرا ہوا ہے پھر دیکھ لو کیا پھٹکار برس رہی ہے۔ خدا کی قسم بات کرتے دے ڈر لگتا ہے رحیم بیچارا لینے میں نہ دینے میں پر سولی مارے چابکوں کے کھال اُدھیڑ دی۔

مرزا۔ سچ اس کا تو کچھ ولایت جا کر رُخ ہی بدل گیا۔ یہ وہی مقصود ہے جس کے ہاتھوں ہم نے چاندی رولی ہے۔ اب تو بھائی اگر پوری تنخواہ بھی پٹ جائے تو غنیمت ہے۔ دو دن بخار آ گیا تھا چٹ سات آنے کاٹ لئے۔ کوئی بھی تو خوش نہیں۔ کوچوان ہے وہ جھیک رہا ہے۔ سئیس ہے وہ پیٹ رہا ہے بھائی صمد چلے ہی گئے ایک حسّو رہ گیا ہے صبح شام وہ بھی چلا۔ مصیبت تو بھائی میری ہے اب بتاؤ اس بڑھاپے میں کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتا پھروں کئی دفعہ جی میں آئی کہ لعنت بھیجوں مگر پھر یہ ہی سوچ کر چُپ ہو گیا کہاں مارا مارا پھروں گا اور تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گذار دوں۔ تم اپنی کہو آجکل کیا کر رہے ہو۔

شریف- کیا خاک کر رہا ہوں روٹی جُڑتی ہے تو کپڑا نہیں اور روٹی نہیں! عید سر پر آگئی کوڑی پاس نہیں گھر والی- دن سے ایک حشر مچا رکھا تھا چاہے چوری کرو چاہے ڈاکہ کو جُوتی پہنا کر لاؤ خانصاب سے جا کر دو روپیہ لایا (جُوتی دکھا کر) آپنے یہ ہی کھلے رکھے وِسکو ڈیڑھ کی جُوتی پہنائی دوپہر کو جُوتی پہنا کر لایا ہوں چار گھڑی دن رہے جو آکر دیکھتا ہُوں تو دروزے میں کھڑا رو رہا ہے اب بہتیرا پُوچھتا ہُوں ابے بھائی ہوا کیا - مجال نہیں کہ ٹس سے مس ہوجائے روئے تو جاتا ہے مگر بولتا نہیں لڑکی نے آکر کہا ابا یہ تو ایک جُوتی چوبچے میں پھینک آیا لیجئے اب وُہ ایک پَیر رہ گیا ہے چاہے اوڑھو چاہو بچھاؤ نہ اُس پھینکنے والے کا کچھ گیا نہ اُس منگوانے والی کا کچھ بگڑا مجھ پر مُفت میں ڈیڑھ کی ٹُھک گئی! بڑے پیر صاب زندہ تھے تو اُڑے نھڑے وخت بے وخت پیسہ دھیلے سے سلوک تو کر دیتے تھے اب تمہارے خبٹ صاب کے دروزے پر تو سُنا ہے فقیر تک کے جانے کا حُکم نہیں-

مسٹر مقصود کا بنگلہ

ہاں ہاں مَیں کہہ چکی مجھے معاف کرو

(۲)

مقصود- مجھ کو افسوس ہے کہ تم نہایت بدنصیب عورت ہو جس جگہ مَیں تُم کو لیجانا چاہتا ہُوں وُہ ایسی جگہ ہے کہ شاید تم نے کیا تمہارے خاندان بھر نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی! اگر تم کو ایسی سوسائٹی سے

انکار ہے تو میں متیقن ہوں کہ تم بدنصیب ہونے کے علاوہ بیوقوف بھی ہو! مِس فلپ اور مسز خونر دونوں وہاں ہونگی اگر تم کو ناچتے ہوئے شرم آتی ہے تو صرف ڈنر میں شریک ہو جانا مجھ کو امّید ہے کہ تم چھ بجکر بیس منٹ پر کلب گھر چلنے کے واسطے تیّار ہو گی۔

بیوی۔ نوج! میں تیّار ہوں! خدا مجھ کو اُس وقت زمین کا پیوند کر دے جب میں وہاں چلکر کھانا کھاؤں! ناچیں گی وُہی جنکے ہاں ہوتی آئی ہو! مجھ سے تم ایسی باتیں نہ کیا کرو میں ایسی عنایت سے باز آئی میرا دل تم سے بات کرنے کو نہیں چاہتا۔

مقصود۔(گھڑی دیکھ کر) چار بجنے میں دس منٹ ہیں ٹھیک پانچ بجے مجھ کو ٹینس میں پہنچنا ہے میں چاہتا ہوں تم اس معاملہ میں مجھ سے قطعی گفتگو کرلو اور وُہ بھی صرف اِس وجہ سے کہ میں مسز ہاربرٹ کو لکھ چکا ہوں کہ مسز مقصود ضرور شریک ہونگی۔

کیوں تم کو ایسی لیڈیز کی صُحبت میں شریک ہونے سے انکار ہے جن کا شمار اعلیٰ طبقہ میں کیا جا سکتا ہے؟

بیوی۔ ہاں ہاں میں کہہ چکی مجھے معاف کرو! خُدا معلوم تم کیوں مجھ سے ایسی باتیں کیا کرتے ہو! مِس فلپ جیسی اعلیٰ طبقہ کی ہیں مجھ کو خوب معلوم ہے ایسی عورتوں سے مِلنا تم کو ہی مبارک ہو۔

مقصود۔ کیا تم نے انکے چال چلن کی بابت کبھی کوئی لفظ خلافِ تہذیب سُنا۔

بیوی۔ تم میرا مُنہہ نہ کھلواؤ مجھ کو سب معلوم ہے تم کو اختیار ہے تم اُنکو جو چاہے سمجھو میں تم کو تو منع نہیں کرتی۔

مقصود۔ تم کو ایک کواری ایک پاکدامن لڑکی کی نسبت ایسے الفاظ کہنے میں سخت

احتیاط کرنی چاہیئے!!!

بیوی - (ہنسکر) وُہ گواری سہی پاکدامن سہی بلکہ اس سے بھی زیادہ سہی پھر مجھے کیا!

مقصود - بہرحال تم کو بہ حیثیت بیوی ہونے کے میرے حکم کی تعمیل کرنی پڑیگی -

بیوی - اگر حکم قابل تعمیل ہو تو سر آنکھوں سے! تم نے اُس دن میرا تین سو روپیہ کا چندن ہار اُنکو دیدیا میں نے اُف تک نہ کی - خدا کی قسم اگر تم اپنے ہاتھ سے تمام زیور لٹا دو تو تم پر سے قربان کردوں مگر مرے ہُوئے باپ دادا کی لاج بزرگوں کی عزت چاہے تم بگڑو چاہے سنورو جب تک جان میں جان ہے یہ ہاتھ سے نہ دونگی -

مقصود - کیا تم قیدیوں کی طرح اپنی زندگی گذارنی پسند کرتی ہو! مہذب بننے کی کوشش کرو اور ذرا اس احاطے سے باہر نکلکر دیکھو دُنیا میں کیا ہو رہا ہے!

بیوی - تم جس کو قید کہتے ہو میں اسکو جوہر شرافت خیال کرتی ہُوں اور نعمت سمجھتی ہوں اگر میں بد تہذیب ہوں تو کیا تم کسی مہذب عورت سے یہ اُمید رکھتے ہو کہ وُہ آدھی آدھی رات اور پچھلے پچھلے پہر تمہارے واسطے کھانا گرم کریگی اور پکائے گی -

مقصود - اس کا میں احسانمند ہوں!

بیوی - مَیں تو اس کو ہمیشہ اپنا فرض سمجھتی ہُوں خدا وُہ دن نہ دکھائے کہ میں اسکو احسان سمجھکر کروں -

مقصود - اگر تم علم سے محروم نہ ہوتیں تو ضرور بلا تامل تم میرے ساتھ چلتیں -

بیوی - خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جتنی تمہاری مس فلپ انگریزی جانتی ہیں اُتنی میں اُردو جانتی ہوں - جس قدر وُہ اپنے مذہب سے واقف ہونگی میں اُن سے زیادہ اپنے مذہب سے واقف ہُوں البتہ ایک فرق ہے اُن کی

نگاہ سے صبح سے شام تک سینکڑوں مرد گذرتے ہیں۔ مجھ کو یہ اتفاق کبھی نہیں ہوتا۔

مقصود۔ سب سے بڑا فرق تو تم تہذیب و خُلق کا دیکھ سکتی ہو جس کا تم میں پتہ نہیں!

بیوی۔ سُبحان اللہ! خُلق و تہذیب کا نمونہ تو ایک تم ہی بیٹھے ہو۔ چاہے کوئی مرتے مرجائے مگر تمہاری بلا سے! میری بڑھیا کی نواسی کو پرسوں بخار ہو گیا تھا دن بھر میں نے اپنے ہاتھ سے دوا پلائی ہے! اب میں جاتی ہُوں میری عصر کی نماز قضا ہو رہی ہے۔

(۳)

حیات آباد شہر تو کچھ ایسا بڑا نہ تھا مگر چھاؤنی کی وجہ سے عجیب رونق پر تھا مقصود کو چھٹی پر آئے تیسرا مہینہ ہوگا کہ نُو نمبر کے رسالے میں کالے بگڑے جب تک گوروں کی فوج سرکوبی کو آئے کالوں نے تو حیات آباد کو سر پر اُٹھا لیا دوپہر تک تو نشان گمان بھی نہ تھا بارہ بجے کی توپ خاصی اچھی طرح چھُوٹی۔ تین بجتے بجتے تو گلی کوچوں میں خون کی تلّیاں بہہ رہی تھیں کیسا مُصیبت ناک وقت تھا۔ بکروں کی طرح آدمی ذبح ہو رہے تھے۔ بڑے بڑے مالدار چار چار پیسوں کے واسطے موت کا شکار ہو گئے۔ کہیں دو بجے رات کے گوروں کی فوج پہنچی تو وُہ زور کم ہوا! فتنہ فرو ہو چکا تو تحقیقات شروع ہُوئی کہ باغیوں میں کون کون شریک تھا۔

حیات آباد کی سرحد سے ملا ہوُا موضع حسن پور ۲۰ بسوے کا گاؤں تھا جس پر دونو بہن بھائی مقصود کے ماموں اور ماں نصف و چوتھائی کے حصہ دار تھے ماں کے دم تک تو مقصود خون کے سے گھونٹ پی پی کر چُپکا بیٹھا رہا مگر ماں کے

مرتے ہی ظالم اِس فکر میں پڑ گیا کہ کسی طرح حسن پور سالم میرے قبضہ میں آجائے سینکڑوں تدبیریں ہزاروں کوششیں لاکھوں جتن سب ہی کچھ کر ڈالا مگر ایک تھیلی کے چٹّے بٹّے ماموں ممانی بھی ایسے بچّے نہ تھے کہ اُس کے پھندے میں پھنس جاتے لیکن اب مقصود چُوکنے والے بندے نہ تھے! سفّاک بیرحم ایک عرصہ سے تاک میں تھا۔ غدر کو نعمت اور تحقیقات کو غنیمت سمجھ کر سازش کا تمام الزام ماموں کے سر تھوپ غریب کو جسِ دوام بعبورِ دریائے شور اور ممانی کو عمر بھر کے واسطے زندہ در گور کر دیا۔

وُہ نہایت دردانگیز وقت تھا جب آخر پیشی کے روز ممانی اپنے آٹھ برس کے بچّے محمود کا ہاتھ پکڑے ہُوئے مقصود کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔ آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔

"بیٹا مقصود ہم پر رحم کر! میں نے تجھ کو دُودھ پلایا ہے: لِلّٰہ ترس کھا سارا گاؤں لے دونو مکان لے مگر اتنی زیادتی نہ کر۔"

مقصود۔ یہ الفاظ آپ کی زبان سے بہت دیر میں نکلے اب اِن کا وقت نہیں رہا۔ کیونکہ اب میں کچھ کرنا پسند نہ کرونگا البتّہ اِتنا کر سکتا ہوں کہ اپنی اٹھارہ سو روپیہ کی ڈگری کا اجرا چار روز کے واسطے ملتوی کر دوں۔ ماموجان غالبًا کل شام کو کالے پانی بھیجدیئے جائیں اِس کے بعد تین روز نہایت کافی وقت ہے کہ آپ ان کا اخر زائل کریں۔

چاہیئے کہ مقصود حقیقی ماموں کو برباد اور ممانی کو تاراج کر کے چین سے بیٹھ جاتا!! ناممکن! اُس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا اصُول صرف ضرر رسانی قرار دیا تھا خواہ ماموں ہوں یا ممانی! میاں کے جلاوطن ہونے پر بیوی اور بچّہ دونو اس کی جان کو دُعائیں دے رہے تھے! اتّفاق سے ایک روز

دوپہر کے وقت بچہ ایک تصویر ہاتھ میں لئے ہوئے ما کے پاس آ بیٹھا!

یہ ایک حسرت نصیب عورت کی تصویر تھی جو سمندر کے کنارے کھڑی تھی اوراس کا خاوند سفر کر رہا تھا کچھ دیر تک تو وہ پانی کی موجوں کو غور سے دیکھتی رہی لیکن جس وقت جہاز روانہ ہوا اور میاں بیوی کی چار آنکھیں ہوئیں۔ فرطِ محبت سے بیچین ہو کر کہنے لگی۔

آہ یہ سفر ہمیشہ کے لئے نہ ہو۔

مُصیبت زدہ بیوی نے محمود کے ہاتھ سے لیکر اس تصویر کو دیکھا! اپنے بیگناہ خاوند کی مسکینی اور غربت کا خیال آتا تھا کہ طبیعت کی بے چینی اور زیادہ ہوئی! سوچنے لگی! اے اللہ مجھ سے بڑھ کر بدنصیب اور کون ہوگا جس کے ساتھ عمر بسر کرنی تھی وہ کالے کوسوں پہنچ گیا اور میں بے حیا اب تک زندہ ہوں! بچے کی بہار کے دن آئے تو وہ چمن ہی اُجاڑ ہو گیا! یہ پہاڑ سی زندگی کیونکر کاٹوں میں مظلوم یہ معصوم کروں تو کیا کروں! ہائے میرے اللہ میں تو قصور بھی نہ معاف کروا سکی! کلیجہ کے ٹکڑے پہلے ہی اُڑ رہے تھے معافی قصور کا خیال آتا تھا بالکل ہی بے اختیار ہو گئی اور بے اوسانی میں چلّا اُٹھی۔

"میں لونڈی ہوں میرا قصور معاف کر دینا"

ما کی آواز سُنتے ہی بچہ دَوڑ کر لپٹ گیا اور گلے میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگا

امّاں بی کس کی لونڈی ہو۔

بچہ کا کلیجہ سے لگنا تھا اور زیادہ جی بھر آیا خوب روئی ما کو روتا دیکھ کر بچّہ بھی رونے لگا۔ رو چکی تو دوپٹّہ کے کونے سے آنسو پونچھے بچّے کو پیار کیا اور کہا:۔

"میرے چاند میں صدقے تو کیوں روتا ہے"

ماں بیٹے ابھی رو ہی رہے تھے جو کسی نے کُنڈی کھٹکھٹائی ماما کو بھیجکر دریافت کیا تو معلوم ہُوا میاں مقصُود کچہری کے دو آدمیوں کو لیکر آتے ہیں یا اٹھارہ سو روپیہ دو نہیں تو پردہ کر لو۔

بدنصیب بی بی کچھ دیر تک تو سوچتی رہی اور پھر یہ کہتی ہُوئی صحنچی میں چلی گئی کس کا روپیہ اور کیسا روپیہ۔

دو چپڑاسی ایک قُرق امین اور مسٹر مقصود اندر داخل ہو گئے! امیر کا گھر برسوں کا بنا ہُوا گھر ایک ایک چیز مُنہہ سے بول رہی تھی! آناً فاناً تمام چیزیں سمٹ سمٹ باہر کھنچنی شروع ہُوئیں! کلیجہ کٹ جانے والا وقت وُہ تھا جب مقصود کے اشارے سے قرق امین نے ولائتی پنجرا اُٹھایا جس میں بچے کا طوطا تھا! پنجرا اُٹھاتے ہی بچہ بلک گیا اور ہاتھ جوڑ کر مقصُود سے کہنے لگا:۔

"اچھے بھائی جان میرا مٹھو نہ لو"

وُہ کیسا دردناک وقت تھا جب محمود ہاتھ جوڑے مقصود کے قدموں میں کھڑا کہہ رہا تھا اور گردن اُونچی کئے اس اُمّید پر اُس کا منہہ تک رہا تھا کہ شاید پنجرا رکھوا لے! جب سنگدل مقصُود نے جھڑک دیا تو روتا ہُوا ماں کے پاس گیا اور کہنے لگا:۔

"اے بی اّماں میرا مٹھو بھی لے گئے"

(۴)

مقصود۔ لیکن مسٹر فلپ دیوارز سپیشل وسکی اور ایسی نیز! میرے تجربہ میں گرین سیل سب سے بہتر چیز ثابت ہُوئی ہے۔

فلپ۔ مسٹر کوک نے اس کی سفارش کی تھی (کچھ دیر سکوت کے بعد) ویل مسٹر مقصود!

آپ نے اپنی بیوی کی بابت کیا فیصلہ کیا۔

مقصود۔ وُہ کچھ قدرتی طور پر نہایت ضدّن عورت واقع ہُوئی ہے اور چُونکہ ایک سخت مذہبی باپ کی بیٹی ہے۔ اِس لئے ہر وقت اور ہر معاملہ میں اپنے خدا کو ضرور شامل رکھتی ہے! مگر سچ یہ ہے مَیں نے توحید وتثلیث دونوں پر بارہا غور کیا میری سمجھ میں یہ سب ڈھکوسلا ہے! قہقہہ! سُنتا ہُوں اُسکا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں مگر مَیں تو شب و روز ایسے واقعات دیکھتا ہُوں جن میں کوئی مصلحت نظر نہیں آتی۔ قحط سے سینکڑوں جانیں بلاضرورت ضائع ہوتی ہیں۔ وَبا سے ہزاروں آدمی بے خطا مر جاتے ہیں! کیا یہ فعل اُس شخص کے ہو سکتے ہیں جو رحمدل سمجھا جائے! (پی کر) عورت کے معاملہ میں تو مُسلمانوں نے واقعی ہٹ دھرمی کر رکھی ہے تعلقاتِ باہمی میں اُس کے حقوق بالکل نظر انداز کر دیئے۔

فلپ۔ مَیں دیکھتا ہُوں کہ بیوی کی طرف سے آپ بہت پریشان ہیں! آپ اِس باقی گلاس کو ختم کیجیے۔

مقصود۔ (پی چکنے کے بعد) مَیں اب جانا چاہتا ہُوں! میری طبیعت خراب ہوگئی۔

مقصود کو شراب پینے کا آج پہلا اتفاق تو تھا ہی نہیں ماشاءاللہ عُمر اِسی میں گذری تھی مگر خدا معلوم فلپ نے کیا ستم کیا کہ ایک ہی پیگ میں حواس باختہ ہو گیا! چکّر آئے جی متلایا قے ہُوئی نشہ تھا کہ اَور زیادہ ہوا! جانے لگا تو برآمدہ میں سپوٹ (بلڈاگ) راتب کھا رہا تھا! ویل ویل کہتا ہوا جو اُس پر جُھکا تو دھڑام سے اوپر گر پڑا! اِتنا تو ہم بھی جانتے ہیں کہ کتّا بلڈاگ تھا مگر یہ خدا ہی جانے کہ بلڈوگیت کی وجہ سے یا یہ سمجھ کر کہ مقصُود میرے راتب میں حصہ بٹائے گا سپوٹ بگڑ گیا! وُہ

تو یہ خیر ہوئی کہ مسٹر فلپ ساتھ تھے کہتے کو سمجھا بجھا کر الگ کیا اور مقصود کو اُٹھا اُٹھو کر گاڑی ہیں لائے ورنہ شراب کا پورا ہی مزا آجاتا۔

اتفاق یہ کہ ہولی کا تھا دن اور مقصود کا کوچوان پورب کا منہی! وہ بھی نشہ میں چور تھا مسٹر فلپ سے کیا کہتا ہے :-

بس تو بابو جی! جات ہے۔

فلپ۔ یو سوئر ہم بابو ہے۔

کوچوان۔ اجی نہیں ہم تو اپنا بابو سے پوچھت ہے۔

فلپ۔ وُہ بھی بابو نہیں ہے۔

کوچوان۔ اجی...... ہمکا تو سب بابو ہیں...... یا گھوڑا او بابو ہے...... لال...... ٹینٹو بابو ہے یا کوٹھیو بابو ہے!

فلپ۔ ہنسکر اچھا جاؤ مگر بہت ہوشیاری سے جاؤ۔

اِدھر آقا اُدھر کوچوان دونوں بیہوش اب گاڑی گھوڑے کا اللہ ہی نگھبان تھا! بندر کی بلا طویلہ کے سر۔ منہی کو جو نشہ میں کچھ ترنگ سُوجھی تو ہنٹر لیکر گھوڑے کو سُوت دیا! گھوڑا غریب سٹ پٹا گیا کہ یہ آفت کیا آئی چل رہا ہوں بھاگ رہا ہوں اور ہنٹر پہ ہنٹر پڑ رہا ہے! جانور تھا تو بلا سے جان تو رکھتا ہی تھا کب تک پٹتا اور کیوں پٹتا گاڑی سمیت نالی میں جا پڑا! خیریت یہ ہوئی کہ مقصود الگ جا کر پڑا مگر کوچوان کی بائیں ٹانگ تو بم کے نیچے ایسی دبی کہ بہتیرا تڑپا مگر ٹانگ نہ نکلنی تھی اور نہ نکلی الیکن کیا پابند وضع آدمی تھا اُسی طرح ہنٹر پٹخارتا رہا اور یہ ہی کہتا رہا! واہ بے گھوڑے واہ!

ظاہری وقعت کے اعتبار سے میاں مقصود کے خوشامدی کتنے ہی کیوں نہوں

مگر دلی خیر خواہ تو بستی بھر میں ایک اللہ کا بندہ بھی مشکل سے ہو گا! اگر کہیں مقصود گاڑی کے نیچے دب جائے تو انشاء اللہ تڑپ ہی تڑپ کر مرے اور دیکھنے والے مُنہہ پھیر کر چلدیں! تقدیر کا زبر دست تھا گرا بھی تو بال بال بچا گاڑی تو ضرور چُور چُور ہو گئی لیکن وُہ خود اپنے کپڑے جھاڑ جھوڑ اُٹھہ کھڑا ہوا - گھر آیا تو محلّہ کی مسجد میں وعظ ہو رہا تھا اور مولوی صاحب جھوم جھوم کر فرما رہے تھے :-

آج وُہ رات ہے کہ آسمانِ اوّل پر باری تعالیٰ نزول فرما کر کہتا ہے (رو کر) ہے کوئی جو مجھ سے مغفرت طلب کرے اور مَیں دُوں -

مقصود کو اس فقرے پر بے اختیار ہنسی آئی قہقہہ لگاتا ہوا گھر آیا پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ دُنیا بھر کے بھید کھُلے مگر نہ کھُلا تو خُدا کا! اسی خیال میں تھا کہ نیند آگئی! اب ایک اَور ہی سماں آنکھہ کے سامنے تھا :-

(۵)

خواب

ایک جنگل بیابان ہے جہاں کوسوں انسان کا پتہ نہیں! برسات کا موسم پچھلا پہر دُھواں دھار گھٹا مہین مہین پھوار کالے کالے بادل اودی اودی بجلی! مگر کچھہ ایسا سُنسان کہ الامان الحفیظ! ہر چند آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا لیکن ایک ہو کا میدان تھا آدمی نہ آدم زاد جہانتک نظر جاتی تھی اور جس طرف دیکھتا تھا جنگل ہی جنگل تھا! دفعتہً ایک ایسی ہیبت ناک آواز کان میں آئی کہ کلیجہ چار چار ہاتھہ اُچھلنے لگا ہاتھہ پاؤں لرزنے لگے بدن میں تھرتھری پڑ گئی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا!! بھاگا دَوڑا! چلتے چلتے پاؤں تھم ہو گئے گھُورتے گھُورتے آنکھیں پتھرا گئیں مگر

کسی طرح چھٹکارا نہ ہُوا! سوچ رہا تھا کیا کروں کہاں جاؤں کس کو بلاؤں ایک طرف سے اذان کی آواز آئی اُسی طرف چلا پاس جا کر دیکھا تو کیکر کے درخت میں سے آواز نکل رہی تھی یہ دیکھتے ہی جان نکل گئی ڈر کر بھاگا تو ایک اژدھے نے اِس زور سے پھنکار ماری کہ جنگل بھر گونج اُٹھا آگے بڑھا تو برابر سے چبڑ چبڑ کی آواز آئی غور سے دیکھا تو ایک چیتے کی سی صُورت تھی جو کسی کو دبوچے تھا! رنگ فق ہو گیا چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اب مقصُود کو یقین ہو گیا کہ جان بچنی مشکل ہے جدھر جاتا تھا راہِ نجات مسدود تھی خدا خدا کر کے ایک چار دیواری دکھائی دی سنگ مرمر کا عالیشان دروازہ تھا تشکر کرتا ہُوا اُدھر چلا اور لپک کے اندر گھُس گیا دیکھتا ہے تو ایک خوبصورت بارہ دری ہے۔ پٹاپٹی کے پردے پڑے ہُوئے ہیں کافوری شمعیں روشن ہیں! نواری پلنگ بچھے ہُوئے اجلی اجلی چادریں کسی ہُوئی مذہن کرُسیاں غالیچے قالین فرش فروش ایک سے ایک بیش قیمت کورے کورے مٹکے سوندھی سوندھی صُراحیاں قلعی دار کٹورے! یہ سب کچھ ہے مگر نہ انسان نہ حیوان! مقصُود کی تو یہ سامان دیکھ کر جان میں جان آگئی جھٹ ایک آرام کرُسی پر جا لیٹا! دو چار لمحہ سکون کے گذرے ہونگے کہ ایک پیر مرد سپید ڈاڑھی سر پر عمامہ ہاتھ میں تسبیح اندر تشریف لائے! مقصُود تعظیم کو اُٹھا اور نہایت عاجزی سے کہا "سلام عُلیکُم" ابھی سلام ختم نہ ہُوا تھا کہ پیر مرد نے ایک تھپّڑ مُنہہ پر اس زور سے دیا کہ چہرہ پھر گیا۔

مقصود۔ بیشک مَیں بلا اجازت اندر آ گیا مگر جس وقت جناب! میرے واقعات سُنینگے مجھ کو پُورا یقین ہے ہمدردی فرمائینگے۔

پیر مرد نے یہ سُنکر ایک تھپّڑ دُوسری طرف بھی دیا۔

مقصود۔ مگر مجھ کو اتنی اجازت دیجیے کہ اپنی حالت کا اظہار جناب پر کر دوں۔

اِتنا سُننے ہی پیر مرد اُچک کر مقصود کی پیٹھ پر سوار ہو گئے۔

مقصود۔ جناب کا اسم گرامی ؟

پیر مرد۔ فرشتہ کہتے ہیں۔

مقصود۔ مجھ کو جناب کے شیطان یقین کرنے میں بھی شبہہ ہے۔

اِتنا کہنا تھا کہ پیر مرد نے پیٹھ پر سے اُتر مقصود کے دونوں کان پکڑے اور چک پھیری پھرانی شروع کی۔

مقصود۔ حضور آپ فرشتہ نہیں خدا سہی مگر میرے کان ٹوٹے غریب پرور میری جان نکلی۔

پیر مرد نے مقصود کو چھوڑا مگر چھوڑتے ہی اس زور سے کلّے میں کاٹا کہ چلّتا پڑ گیا

مقصود۔ او بدتمیز بدتہذیب یہ کیا کرتا ہے۔

اب **پیر مرد** نے فٹ بال کی طرح مقصود پر ٹکیں اُڑانی شروع کیں۔ کبھی اِدھر اُچھالا کبھی اُدھر اُچھالا۔

مقصود۔ آپ پہلے شخص ہیں کہ تمام عمر میں ایسے بدتہذیب آدمی سے مجھ کو سابقہ پڑا۔

پیر مرد۔ مگر اَے ملعون تو مجھ سے بہت زیادہ بدتہذیب ہے۔

مجبوراً **مقصود** دروازے کی طرف یہ کہہ کر چلے مَیں پولیس کو بلاتا ہوں

پیر مرد۔ گردن پکڑ کے ! اِدھر آؤ میری جان چلے کہاں۔

مقصود۔ او نالائق کوئی وجہ نہیں کہ مَیں تیری زحمتیں بھگتوں۔

پیر مرد۔ اچھا آپ مہربانی فرما کر ذرا جھک کر گھوڑا بن جائیے ! اب تو تہذیب سے کہہ رہا ہوں۔

مقصود۔ مجھ کو اس قدر تکلیف دیکر آپ کو کیا مزا آرہا ہے۔

پیر مرد۔ دھکا دیکر پیٹھ پر سوار ہونے کے بعد! میاں تو ہمارا مہمان ہے تکلف نہ کر۔
مقصود۔ بدمعاش کمبخت۔
پیر مرد۔ اچھا اب تو اکیس چکر اس کمرے کے کاٹ مگر شرط یہ ہے کہ سانس نہ ٹوٹے۔
مقصود۔ میری رائے میں تو ہرگز انسان نہیں ہے! بے ایمان۔
پیر مرد۔ (مقصود کی ناک زور سے بھینچکر) اچھا تُو جانور سہی۔
مقصود۔ او ملعون میری ناک چھوڑ ابے چھوڑ خدا کے واسطے چھوڑ اجی حضرت چھوڑیئے قبلہ للہ چھوڑ دیجئے۔
پیر مرد۔ ابھی سے۔
مقصود۔ مجھ کو چھینک آرہی ہے ممکن ہے کہ جناب کا ہاتھ خراب ہو جائے۔
پیر مرد۔ میرے ہاتھ میں کھجلی ہو رہی ہے ممکن ہو کہ جناب کی ناک ٹوٹ جائے (ایک ہنٹر لگا کر) آہا ہا بھئی قسم ہے خدا کی کیا آواز ہوئی ہے مزا آگیا۔
مقصود۔ (بلبلا کر) اجی بندہ نواز ابے اُلو کے پٹھے اُتر بے ایمان تو ہے کون؟
پیر مرد۔ (مقصود کی گردن اپنی ٹانگوں میں بھینچ کر) اچھا تم پہلے زور کر لو پھر دیکھی جائیگی۔
مقصود۔ یا اللہ میں کس مصیبت میں آپھنسا۔
پیر مرد۔ اللہ کا شکر ہے کیا وضعدار مہمان دیا ہے کولر بھی نکٹائی بھی۔
مقصود۔ بیرر چپڑاسی مرزا حسنو اجی بڑے صاحب گردن چھوڑ دو! خدارا یہ تو فرمائیے آپ ہیں کون صاحب؟
پیر مرد۔ الگ ہٹا کر۔

میں تیرے اُس ماموں کی رُوح ہوں جس نے آج علی الصباح جزائر انڈمن میں اپنے فانی جسم کو الوداع کہا! تو نے جیسا سنگدلی کا برتاؤ میرے اور میرے بیوی بچے کے ساتھ کیا اس کو میرا ہی دل جانتا ہے۔ اے شقیِ ازلی تو نے محض

اپنے ذاتی فائدہ کی غرض سے ایک ایسے میاں بیوی کو برباد کر دیا جو نہایت اطمینان سے اپنی زندگی بسر کر رہے تھے! دُنیا کی تمام راحتیں اُنکو میسّر تھیں اور محبت جو سب سے بڑی نعمت ہے اُنکے ساتھ تھی! اَے بے رحم وُہ دو انسان جن کی تمام خوشیاں جنکے تمام ارمان ایک دُوسرے سے متعلق تھے تو نے قبل از وقت اُن کا خاتمہ کر دیا!! وُہ مرد عورت جو تمام عُمر کے واسطے ایک دُوسرے کے رنج و راحت میں شریک تھے تیرے ہاتھوں اور صرف تیرے ہاتھوں ایسے جُدا ہُوئے کہ پھر نہ مل سکے!! آہ! جو عُمر بھر کے واسطے تابعدار ہو چکی تھی جسکی زندگی کا مقصد صرف فرمانبرداری تھا اَے مقصُود تیری بدولت اپنا کوئی حق ادا نہ کر سکی۔ اَے جفاکار آنکھ سامنے کر! جس کی شرمگین نگاہوں نے گھونگھٹ میں وفاداری کا اقرار کیا تھا تیری وجہ سے ہاں ہاں تیری وجہ سے مُردے پر بھی نہ آسکی! وُہ بھولی صُورت وُہ قابلِ رحم مخلوق جو اپنے جیتے جاگتے عزیز اقارب چھوڑ چھاڑ ایک غیر شخص کے پلّے آ کر پڑی! جس نے اپنی عزت اپنی عصمت اپنی زندگی غرض ہر چیز کا دارومدار ایک اجنبی دم پر منحصر کر دیا افسوس افسوس افسوس مقصُود اسکی آنکھیں ترستی رہیں اور کامیاب نہ ہوئیں! اَے بے رحم ایک وارث والی کو بے وارث کر دیا۔

اِسی دُنیائے ناپائدار میں بہت سی متبرک صُورتیں اور ہزاروں اللہ کے بندے ایسے دِکھائی دینگے جو رانڈوں دُکھیاروں مُصیبت کی ماریوں پر اپنا عیش و آرام قربان کر دیتے ہیں خود زیر بار ہوتے ہیں تکلیف اُٹھاتے ہیں اور اُن کی دلجوئی کرتے ہیں!! تو اُس دادا کا پوتا ہے جو ظُہر کی نماز پڑھ کر محلّہ بھر کی رانڈوں اور بے وارثیوں کا گوشت ترکاری پوٹ کی پوٹ کندھے پر رکھ کر لاتے تھے۔ مگر اَے اِنسان کی صُورت میں حیوان اَے مقصود بے وفا مقصود

بے ایمان مقصود ! حقیقی ممانی ماسے زیادہ چاہنے والی ممانی دُودھ پلانیوالی ممانی اپنے بچے کا پیٹ کاٹ کر اُسوقت تیرا پیٹ بھرنے والی ممانی جب تو کسی قابل نہ تھا تیرے ہاتھ سے شوہر دار بیوہ ہوگئی -

مقصود ! ہو نبح حسن پُور نہ سدا میرے پاس رہا نہ تیرے پاس رہیگا مگر یہ بدنما دھبہ یہ سیاہ داغ یہ کلنک کا ٹیکا چودھویں رات کے چاند کی طرح تیرے نام پر روشن رہیگا -

انڈمن پہنچتے ہی جب میرے سامنے برابر کی مٹی ملی ہُوئی جو کی روٹی آئی اور حلق سے نہ اُتر سکی مَیں نے روکر کہا اَے خالق الموجودات ان آفات سے اب نجات دے - اکیس روز کی مصیبتیں بھگت لینے کے بعد یہ دُعا مقبول ہُوئی مگر ہائے ستم شعار ! محمُود آہ محمُود میرا چھوٹا سا محمُود وُہ محمود جو کبھی دم بھر آنکھ سے اوجھل نہ ہوا تھا ہمیشہ کو جُدا ہوگیا ! اَے مقصود دم واپسیں سینہ میں تھا اور آنکھیں اُس پیارے بچہ کو چاروں طرف ڈھونڈھ رہی تھیں -

اَے ظالم تو نے اُس عورت کی آہ لی ہے جو بیگم بنکر آئی اور لونڈی بنکر رہی ! چوبیس برس کا ساتھ اَے فتنہ پرداز فقط تیری وجہ سے چھُوٹا -

یتیموں کی نازبرداری شیوہ انسانیت ہے مگر تو نے اپنی زندگی میں ایک ایسا کارنمایاں کیا جو صفحہ ہستی پر ہمیشہ یادگار رہیگا -

وُہ جسدِ خاکی جس نے کئی گھنٹہ تڑپ تڑپ کر مجھ سے مفارقت کی - جزائر انڈمن میں جیلخانہ کی پُشت پر کھیکوار کے پاس ایک گڑھے میں دبا دیا گیا -

جا اپنا کام کر ! مگر اتنا یاد رکھیو آج ایک بیگناہ کے جلاوطن کرنے میں مسٹر ٹکر کے اجلاس سے تجھ کو کامیابی ہُوئی مگر کل ایک وقت ایسا آئیگا اور ضرور آئے گا کہ تیرا بُڈھا ماموں تیری مظلوم ممانی اور ایک آٹھ برس کا

معصوم بچہ ایک سچے دربار میں ایک اچھے دربار میں تیرے ظلم کی فریاد کرکے عادلِ حقیقی سے انصاف کے طلبگار ہونگے!

مقصود! وہ نہایت نازک وقت ہوگا اور وہ عدالت ایسی عدالت ہوگی جس کا فیصلہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگا۔

راشد الخیری

دُرّۃُ التّاج

کتاب دُرّہ نادرہ فارسی کی مشہور دقیق کتاب ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات فضیلتِ السنہ شرقیہ میں بھی یہ کتاب داخل ہے۔ اس کتاب کی ایک نہایت مستند شرح جناب مولانا مولوی سید احمد شاہ صاحب مرحوم جالندھری نے لکھی تھی جو حال میں طبع ہوکر شائع ہوئی ہے۔ یہ شرح فی الواقع نہایت قابلِ قدر ہے۔ اوّل کل مشکل الفاظ کا اشتقاق اور مختلف معانی فارسی ہیں سلیس اور واضح طور سے لکھے گئے ہیں۔ بعد میں کل فقرہ متعلقہ کا ترجمہ اردو میں کردیا گیا ہے۔ اس طریقے سے قابل مصنف نے اس مشکل کتاب کے مطالب اور معانی کے سمجھنے میں کوئی دقت طالب العلم کے لئے باقی نہیں چھوڑی۔ یہ شرح اس قابل ہے کہ دُرّہ نادرہ کے ہر ایک متعلم کے ہاتھ میں ہو۔

سید محمد شاہ صاحب منشی فاضل (برادرِ حقیقی مصنف مرحوم) محلہ حضرت سید کبیر شہر جالندھر سے مل سکتی ہے قیمت دو روپے (عہ)

اکانومی

رسکن کے ایک مضمون کا یہ ترجمہ ایک تعلیم یافتہ مسلمان خاتون نے عنایت کیا ہے۔ لفظ "اکانومی" کا ترجمہ اُنہوں نے "کفایت شعاری" کیا تھا۔ مگر ہم نے انگریزی لفظ بجنسہٖ لکھنا مناسب جانا۔ تاکہ اس کے مختلف معنوں سے اردو خوان ناظرین آگاہ ہو جائیں۔ ہمارے خیال میں لفظ "نظام" سے اِس کا مفہوم ادا ہو سکتا ہے۔

اکانومی خواہ ملکی ہو۔ خاندانی یا شخصی۔ حسن انتظام محنت پر منحصر ہوتی ہے۔ قانون الٰہی سے دُنیا کا بندوبست اس طرح کیا گیا ہے کہ ایک شخص کی سرتوڑ محنت نہ فقط اُس کی تمام زندگی میں ہمیشہ اس کی کل ضروریات اور عیش و عشرت کے بہت سارے خوشنما سامان بہم پہنچانے کے لئے کافی و وافی ہے بلکہ اس کی صحت بخش آسائش اور کار آمد فرصت کے لئے بہت سا وقت پیدا کرتی ہے۔ اور اسی طرح ایک قوم کی جانفشانی محنت نہ فقط اُس مُلک کی تمام آبادی کو اچھی غذا اور آسائش دِہ مسکن مہیا کرنے کے لئے کافی ہے۔ بلکہ عمدہ تعلیم۔ سامان عیش و عشرت اور خزانہائے فنون جیسے کہ تم اپنے اِردگرد پاتے ہو بہم پہنچاتی ہے۔ لیکن اسی قانون الٰہی سے اگر قوم یا شخص کی محنت کا بیجا اِستعمال کیا جائے یا محنت ناکافی ہو۔ اگر قوم یا شخص کاہل اور نادان ہو تو اس کی کاہلی۔ کوتاہ اندیشی محنت سے جی چُرانا اور بیجا استعمالِ محنت کی نسبت سے مصیبت اور محتاجی اس کا نتیجہ ہوگا۔ اس دُنیا میں اپنے اِردگرد جہاں کہیں تم حاجت مُصیبت یا تنزل دیکھتے ہو وہاں یقیناً جانو کہ یا تو محنت کی کمی تھی یا غلطی۔ یہ کوئی حادثہ نہیں ہے۔ یہ کوئی آسمانی بلا نہیں ہے یہ کوئی اصلی اور انسانی طبیعت کی ناگزیر بُرائی نہیں ہے جو تمہارے راستوں کو

غم سے اور قبروں کو شکار سے بھرتی ہے۔

یہ صرف یہ بات ہے کہ جہاں کفایت شعاری کی ضرورت تھی وہاں فضول خرچی سے کام لیا گیا جہاں محنت کی اشد ضرورت تھی وہاں عیاشی اختیار کی گئی اور جہاں اطاعت کی ضرورت تھی وہاں آزادی اختیار کی گئی۔

حال میں ہم نے اپنی انگریزی زبان میں "اکانومی" کے معنے کو اس قدر بدل دیا ہے کہ جس کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ عام استعمال میں ہمیشہ اس کے معنے صرف کفایت شعاری یا جزرسی کے ہوتے ہیں۔ پیسوں کی کفایت شعاری یعنی پیسوں کو بچانا۔ وقت کی کفایت شعاری یعنی وقت کو بچانا اور علیٰ ہذالقیاس لیکن یہ تو اس لفظ کا سراسر ناموزون استعمال کرنا ہے۔

اکانومی سے پیسے بچانے کے اُتنے ہی معنے ہو سکتے ہیں جتنے کہ پیسے خرچ کرنے کے۔ اصل میں اِس سے مُراد ہے اِنتظام۔ اب چاہے گھر کا انتظام ہو۔ خواہ مال کا خواہ وقت کا۔ غرض ہر چیز کو اس طرح سے صرف کرنا یا بچانا کہ اُس سے بہترین فائدہ حاصل ہو۔

اکانومی کی خواہ وُہ عام ہو یا خاص نہایت ہی سہل اور آسان تعریف ہے:۔ "محنت کا عقلمندی سے اِنتظام کرنا" اور جو اس تعریف کو اپنے ہر کام میں ملحوظ رکھے گا۔ وہ سب سے بہتر پابند اکانومی کا ہے۔ اور اس کی کامیابی متیقن ہے +

ز۔ فیضی

ڈیلیا

یہ پھول جس کی داد زبانِ شاعر سے بے اختیار نکلی ہے - جناب آغا شاعر صاحب نے دارجیلنگ میں دیکھا تھا - اور وہیں یہ دل کش نظم ہوئی - جدتِ انداز قابلِ داد ہے

اک نیا پھول ڈیلیا دیکھا صدقے اُترے ہزار میں لالا
لب معشوق پنکھڑی پہ فدا خانے خانے میں جسکے شہد بھرا
اللہ اللہ عجیب گل پھولا
ڈیلیا تو نے دل کو لے ہی لیا

لچھوئی پتیاں دوچند سہ چند شاخ در شاخ نت نئے پیوند
اوس کے موتیوں سے دولتمند کیا تنگو فے ہیں کچھ کھلے کچھ بند
بھا گئی تیری ایک ایک ادا
ڈیلیا تو نے دل کو لے ہی لیا

زرد آبی گلابی سرخ و سفید مٹھیاں بند ہیں کھلے کیا بھید
پتیاں خول ننھے ننھے چھید شہد کوزے میں ہیں مکھیوں کو نوید
میں بھی لب بستہ ہوں کہوں گا کیا
ڈیلیا تو نے دل کو لے ہی لیا

رستہ چلتے جو سر اٹھاتے ہیں کیسے گچھے سے لہلہاتے ہیں
آنکھ پڑتے ہی مسکرا لیتے ہیں سو اشاروں سے یہ بلاتے ہیں
اپنے ہمجنسوں کی دکھا کے ادا
ڈیلیا تو نے دل کو لے ہی لیا

دیکھ لے جو وہ دیکھتا ہی رہے یہ ہری ٹہنیاں ہرے پتے
سرخیوں میں سفیدیاں ہر ہی! سب سے اونچی چٹان پر قبضے
اس پہ رہ رہ کے جھومنا تیرا
ڈیلیا تو نے دل کو لے ہی لیا

جھٹ پٹا وقت یہ بلند مقام دھویا دھایا یہ چرخ نیلی فام
بادل اڑتے ہوئے ہوا پہ تمام انکے سایہ میں اے سمن اندام
مجھ کو خود رفتہ کر دیا گویا
ڈیلیا! تو نے دل کو لے ہی لیا

تجھ کو دیکھوں جو تو اجازت دے تجھ کو چاہوں جو تو اجازت دے
تجھ کو سونگھوں جو تو اجازت دے پیار کر لوں جو تو اجازت دے
ڈر یہ ہے - ہو ورق ورق نہ جدا
ڈیلیا تو نے دل کو لے ہی لیا

جتنے معشوق ہیں انہیں اعزاز ظلم و جور و جفا و سوز و گداز
جانِ عاشق کے واسطے سو ناز تو سراپا کرم غریب نواز
تجھ سے نسبت بھلا کسی کو کیا
ڈیلیا تو نے دل کو لے ہی لیا

رنگِ رخ کیوں نہ ہوگا اور سوا او کسیجن کا ہر طرف ہے دور
دم عیسے نفس نفس کا طور مردہ آئے تو جی اٹھے فی الفور
مایۂ زیست ہے یہاں کی ہوا
ڈیلیا تو نے دل کو لے ہی لیا

ہائے فرصت نہ دی زمانہ نے جان لے لی ہو آنے جانے نے

پھر اُڑا یا کسی نشانے نے پھر کشش کی ہو آب و دانے نے
اُٹھ کے شاعر چلا یہ کہتا ہوا
دُلبیا تو نے دل کو لے ہی لیا

آغا شاعر قزلباش دہلوی

گُلِ مزار

دشتِ غربت میں ہُوں مَیں وُہ خانہ برباد چمن سینکڑوں فرسنگ ہو آنکھوں سے بنیادِ چمن
اِک حسیں کی قبر پر ہوں میں گلِ طاقِ مزار پُوچھتی ہو اے صبا! کیا مجھ سے رُودادِ چمن
اب کہاں! اِی انقلابِ آسمانِ دُوں پرست! ساتھ کے کھیلے ہوئے وُہ سرو و شمشادِ چمن
بہنے آنکھوں سے ٹپک جائے نہ خُونِ آرزو چٹکیاں دل میں لے اَے نشترِ یادِ چمن
ہائے! وُہ دن! دستِ گلچیں مجھ پہ جب ٹوٹا نہ تھا ہائے! وُہ راتیں! نہ تھا صحرا میں نشادِ چمن

ہلکی ہلکی مجھ پہ پڑتی تھی قمر کی روشنی
دل کی ٹھنڈک تھی طباشیرِ سحر کی روشنی

کچھ عجب دلکش تھا میرا عالمِ حُسنِ شباب منہہ پہ نازک پتیوں کی ہلکی ہلکی تھی نقاب
لوریاں دیکر مجھے شب کو سُلاتی تھی نسیم دیکھتا تھا پیار کی نظروں سے دن کو آفتاب
موجِ تحریکِ صبا بھی تھی نزاکت سے گراں دل کو بادِ تُند کے جھونکوں سے تھا اک اضطراب
ہائے! وُہ میری نگاہِ سُرمگیں چھپنی ہوئی وُہ گلوں کے قہقہے۔ وُہ میرا اندازِ حجاب
وُہ کنارِ آبجو نظارۂ عکسِ شفق وُہ سکوتِ شام میں کیفیتِ سیلانِ آب

صُبح کو وُہ طائرانِ خوشنوا کے زمزمے
میری شاخوں پر وُہ مُرغانِ ہوا کے زمزمے

کالی کالی وہ گھٹائیں! اور وہ بگلوں کی قطار　　ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں بھینی بھینی وہ پھوار

آہ! وہ ساون کے جھالے۔ اور وہ لطفِ برشگال　　ہائے! وہ پانی کے جھرنے۔ اور وہ کنجِ خوشگوار

وہ فضائے لالۂ رنگیں ادا۔ وہ جوشِ گل　　ہائے! وہ پھولوں کے تختے۔ وہ سہانا سبزہ زار

آہ! وہ کوئل کی کوکو۔ وہ پپیہے کی الاپ　　وہ شگوفوں کا چٹکنا۔ اور وہ گلبانگِ ہزار

ہائے! اک دلکش صدا سے وہ ہم آہنگی کے ساتھ　　چھاؤں میں تاروں کی گانا چھوٹی چڑیوں کا ملار

آہ! وہ ترتیبِ بزمِ عیشِ یارانِ چمن
ہائے! وہ جوشِ بہارِ سرو ریحانِ چمن

مجھ سے چھوٹا آہ! کیا میرا وطن او آسماں　　وادیٔ غربت میں لائی کھینچ کر قسمت کہاں

اب نہ رعنائی رہی مجھ میں نہ وہ رنگِ قبول　　اک گلِ پژمردہ ہوں صحرا میں اب میں خستہ جاں

اب کہاں وہ کنجِ دلکش۔ اب کہاں وہ ہمنشیں　　پھر رہا ہے آہ! آنکھوں میں وہ اگلا سماں

توڑتا ہوں آہ! ویرانے میں دم میں غم نصیب　　ہو شریکِ نالہ اب کوئی۔ نہ کوئی نوحہ خواں

گھل رہا ہوں۔ گل رہا ہوں۔ مل رہا ہوں خاک میں　　منتشر ہیں آہ! میری نرم و نازک پتیاں

"ہو نہ محوِ حسنِ ظاہر۔ دیدۂ صورت پرست"
"عیشِ دنیا را بقائے نیست دنیا ہیچ است"

سرور جہان آبادی

دردِ فرقت

ڈاکٹر بھگت رام صاحب انبالہ کے مشہور اور ہردلعزیز طبیب جنہوں نے ماہ اگست امرتسر میں انتقال فرمایا جو خاکسار کے عنایت فرما اور مخلص دوست تھے۔ خدا نے دستِ شفا اور دلِ دردمند بخشا تھا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ خاکسار آنجہانی کا خاص طور پر مرہونِ منت ہے۔ پچیس برس تک ازراہِ محبت خاکسار اور خاکسار کے

خاندان کے معالج رہے - آج دردِ فرقت سے بیتاب ہوں - علاج کون کرے۔
خود ہی علاج کرتا ہوں - اشعارِ مندرجہ ذیل مرحوم کی یادگار میں لکھے ہیں۔
شاید دلِ مہجور و قلبِ مضطرب کی تسکین کا باعث ہوں - اعجاز

آج محتاجِ شفا ہے حالتِ زارِ شفا
گرم بازارِ اجل ہے سرد بازارِ شفا

وائے قسمت دم کے دم میں خشک ہو جائے وہ نہر
جس میں رہتا تھا چھلکتا جامِ سرشارِ شفا

جنس کاسد تو لئے بیٹھے ہیں لاکھوں مدعی
پر تجھی کو ڈھونڈھتا ہے ہر خریدارِ شفا

تیرا نسخہ کیا ملا اکسیر گویا مل گئی
تھا مریضوں کو ترا دیدار دیدارِ شفا

زندگی اک شرحِ آئینِ مرنجان و مرنج
فن ترا اک آفتابِ فیضِ انوارِ شفا

دوستوں کا دوست تھا تو اور طبیبوں کا طبیب
قلزمِ مہر و وفا دریائے ذخارِ شفا

سرمۂ چشمِ محبت - مرہمِ زخمِ جگر
راحتِ جانِ بشر - ابرِ گہربارِ شفا

کچھ بتا تو جلد یوں باندھا ہے کیوں رختِ سفر
ہر جرح چارم پرہیز کیا کوئی طلبگارِ شفا

تیرے مٹنے سے مٹا نام و نشانِ دوستی
تو ہوا آخر کہ آخر ہو گیا کارِ شفا

نکہتِ فردوسِ اخلاص و محبت تھی وہ روح
وہ نفس بادِ نسیمِ صحنِ گلزارِ شفا

جا رہے ہیں دوست اے اعجاز مثلِ بوئے گل
اور تو اب تک رہینِ شوقِ آزارِ شفا

مرزا اعجاز حسین

ترانۂ محبت

ایک مختصر سی انگریزی نظم کا یہ ترجمہ ہمارے قدیم کرم فرما مولوی فضل الحسن صاحب حسرت موہانی ایڈیٹر "اردوئے معلّٰے" نے عنایت کیا ہے - عرصہ کے بعد ناظرینِ مخزن کا اپنے ہمدمِ دیرینہ سے ملنا باعثِ مسرت ہو۔ "اردوئے معلّٰے" کے جاری ہونے

سے پہلے آپ اکثر مضامینِ نظم و نثر سے ہمیں ممنون فرماتے تھے۔ پھر اپنے کام کی کثرت سے مجبور ہو گئے اور مخزن کے لئے کچھ نہ لکھ سکے۔ لیکن اب اُنہوں نے پھر وقتاً فوقتاً اپنا کلام بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے :۔

وادیٔ کوہ میں وُہ برف پہ چمکا جس دم ماہِ روشن کو نکلتے ہُوئے دیکھا میں نے
اور کس قصد سے اُس وقت اُٹھاتے تھے قدم اپنے آہو سے بھی یہ راز چھپایا میں نے

آگیا پاس مرے دوڑ کے کیونکر آخر ہوگیا قصد مرا کیسے ہرن پر روشن
میری وارفتگیٔ شوق سے واقف تھا مگر آگیا کوچۂ جاناں میں جبھی تو یہ ہرن

مہرِ تابندہ سے جب گرم زمیں ہوتی ہے بھید لی جوشِ مسرّت سے بدل جاتی ہو
یادِ تکلیفِ جفا کاریٔ سرما دل سے آمدِ موسمِ گرما سے نکل جاتی ہو

مہرِ اُلفت سے تری جب سے ہوا دل روشن نہ رہا نام و نشاں رنج و الم کا باقی
مہر سے بڑھ کے ہو خورشیدِ محبت کا چلن اب نکل کر سوئے مغرب یہ نجائے گا کبھی

حسرت موہانی

گرہ دار چھڑی

ایک نے پوچھا زراہِ التفات آپ کے دستِ مبارک میں چھڑی
کیوں ہے کیا مطلب ہے کچھ فرمائیے اس میں گرہیں کیوں ہیں اتنی آپڑی
اوّلاً میں نے کہا میں پیر ہوں ہے عصائے پیر یہ میری چھڑی
یہ چھڑی تکیہ سہارا ہے مرا قد میں چھوٹی اور کار آمد بڑی
بولے تکیہ چاہئے اللہ پر تکیہ اس ناچیز کا کیا۔ کے گھڑی
مُدعا یہ تھا کہ ہیں صوفی منش ہے چڑھی کچے گھڑے کی ہر گھڑی

الحق الحق یُوں ہی ہے مَیں نے کہا لیکن اَے حضرت یہ منزل ہے کڑی
تکیہ گاہِ دل ہے وُہ ربِّ غفور ہات کا تکیہ سہارا ہے چھڑی
ثانیاً گُتّے یہاں ہیں بے شمار اِس سے گرماتی ہے اُن کی کھوپڑی
مدّعا یہ تھا کہ بس چُپ بھی رہو تم کو کیا اتنی چھڑی کی ہے پڑی
اپنے حملے سے نہ باز آئے مگر دانت کھٹّے تھے زباں ہی چل پڑی
فخر سے بولے مگر دب کر ذرا زینہ[۵۱] دوزخ ہے ملٹن کی چھڑی
اور گرہوں کا نہیں ہوتا جواب اِس میں حضرت کی طبیعت کیا لڑی
عاجز آ کر یُوں کیا مَیں نے خطاب یہ نکالی بھی مگر کب کی گڑی
دوزخی کو زینۂ دوزخ ہے شرط کیوں بہشتی طبع ہو ایسی سڑی
ہمسفر ہمراہ ہمدم ہمرکاب ہے رفیق و مونس و رہبر چھڑی
کیجئے گر اس کی گرہوں پر نظر دل کی گرہوں کی ہے گویا پھلجھڑی
ہے سراپا دیدۂ عبرت نگر آنکھیں ہی آنکھیں ہیں سرتا سر لڑی
آرزو کی شاخ بے نشو و نما مُشتِ حسرت ہے سراپا یہ چھڑی
سُن کے یہ توجیہہ کچھ راضی ہُوئے رُوحِ انشا بھی پکاری وا چھڑی
دیکھتے جاتے بھی تھے میری طرف تھیں نگاہیں بھی نگاہوں سے لڑی
سر گھٹا تھا اتفاقاً آپ کا ایک چُرکی[۵۲] بھی فقط تھی پیچھے پڑی
مَیں نے پوچھا گر اجازت ہو جناب وُہ گرہ کھولوں جو دل میں ہے پڑی
ایک چٹکی یہ لگا رکھی ہے کیوں اِس میں ہے کیا مصلحت ایسی بڑی
سٹپٹائے سُنکے یہ میرا سوال رہ گئے مُنہ بیکے کچھ ایسی پڑی

[۵۱] واللہ اعلم ملٹن نے کس موقع پر کیا کہا ہے۔ میرے کرم فرما نے جس طرح کہا اس طرح باندھا گیا ۱۲

[۵۲] چُرکی۔ سر کی بھونری کے بال جن کی لٹ بڑھانے اور ہلکی سی گرہ ڈال کر پیچھے چھوڑ دیتے ہیں "

جب نہ بات آئی کوئی معقول بات — اک سوسائٹی[۵۱] کی چھائی جھوپڑی
اُس میں دیکھی نہ جب جائے پناہ — دل میں پھر پیدا ہوئی اک ہڑبڑی
کیا بنائے سے کوئی بگڑی بنے — دے صدا کیا خاک پھوٹی تومڑی
ایک اشارہ کر کے اوپر کی طرف — بولے اِس سے یاد اُس کی ہر گھڑی
لیکن آئے مشفق وہیں میں نے کہا — یادِ حق کی قدر کی تم نے بڑی
کیوں پس پُشت اس کو ڈالا کہئے تو — کس لئے آگے سے پیچھے جا پڑی
سُنکے یہ کچھ ایسے کھوئے سے گئے — یوں نہ بھولا ہو ہرن کی چوکڑی
دیکھ کر یہ حال دل میں تھا کہ بس — رکھ ہی دوں اِک پُشتِ کافر[۵۲] پر چھڑی

غُل ہوا آزاد ہاں ہاں کیا مجال
شیر سے آنکھیں لڑائے لومڑی[۵۳]

مرزا عظیم بیگ آبادی

توزک قیصری

ذیل کے چند بند جناب پنڈت برج موہن صاحب دتا تریہ کیفی کی کتاب منظوم موسوم بہ "توزک قیصری" سے بہ اجازتِ مصنف نقل کئے جاتے ہیں۔ پنڈت صاحب نے حال ہی میں اسے نظم کیا ہے اور عنقریب شائع کرینگے۔ اس میں ہندوستان کی گذشتہ حالت کا موجودہ حالت سے مقابلہ کیا گیا ہے اور انگریزی حکومت کی بعض مسلمہ خوبیوں کی طرف اہل ملک کو توجہ دلائی گئی ہے۔ اندنوں اس قسم

---

۵۱ سوسائٹی کی تقلید کا عذر کیا۔ لیکن اندھی تقلید کو پھر چڑھی ہی ضرورت تھی۔ بھاگتے ہی بنی
۵۲ کافر یہاں اِک پیار کا خطاب ہے ۱۲ ۵۳ لومڑی صرف برعایت قافیہ ذرا سی کی رعایت کیلئے ورنہ نہ شیر نہ لومڑی
صرف چند بیتیں برائے یادگار ہیں۔ باقی ہوس آزاد ۱۲

کی کتاب خاص دلچسپی رکھتی ہے۔ کیونکہ کچھ عرصے سے انگریزی عملداری کی خوبیاں اور برائیاں زیر بحث ہیں اور ملک میں دو رائیں اس مسئلہ پر موجود ہیں۔ ہم نے جو بند انتخاب کئے ہیں۔ اُن میں پہلا بند ہندوستان کی تعریف میں ہے۔ دُوسرے میں بیان ہے کہ مسلمانوں کا کیا اثر ہندی تمدن اور تہذیب پر پڑا۔ تیسرے میں دلّی کی صفت ہے۔ اور اس لئے وُہ اس مہینے کے رسالے کے لئے خاص طور پر موزون ہے۔ چوتھے بند میں ضابطہ کی حکومت کی خوبیاں لکھی ہیں۔ اور پانچویں میں اہلِ ملک کو نہایت ہی کار آمد مشورہ دیا گیا ہے جناب کیفی کی یہ کوشش قابلِ داد ہے:۔

زُبدۂ اقطاعِ عالم کشورِ ہندوستاں — کائناتِ دہر میں تو ہے عجائب بوستاں
جو ترا سرچشمہ ہے سرجیون ہے کوثر کی مثال — تیری نہروں سے سدا گنگا کا نرمل جل رواں
تیرے گُل بوٹوں کی آب و تاب رنگ و بو کو دیکھ — کیا عجب گر چھوڑ دے رضواں بھی گلزارِ جناں
باشی اندراسن کے بھی نرگس صفت حیراں ہیں — تیرے سبزانِ چمن کی دیکھ کر چھب تختیاں
تجھ میں جو ہم کو نظر آتے ہیں اپنے ہیں سبھی — سبزۂ بیگانہ کا ڈھونڈھے نہیں ملتا نشاں
غیر اور بیگانے بھی آئے جو تیری سیر کو — لے گئے بھر کر زرِ گل سے وُہ اپنی جھولیاں

ایک دن وُہ تھا خزاں کا کچھ ضرر تجھ کو نہ تھا
خوف گلچیں کا نہ تھا صرصر کا ڈر تجھ کو نہ تھا

قاعدہ ہے ملتی ہیں آپس میں دو قومیں جہاں — خُلق اور تہذیب دونو کے سموتے ہیں وہاں
جس کی تدوین فارس اور خلفائے عبّاسیہ کی — پھیلی وُہ شائستگی بغداد سے آکر یہاں
ہند ہے مشکور اُن کے واسطے اسلام کا — ہیں نفاست اور لطافت بھی جو کوئی خوبیاں
تھا عرب کا رنگ جو تہذیب میں اسلام کی — حُبِّ قومی اور نفی جمہوریت لک جسکی نشاں
اس کی ترتیب اور ترقی پھر یہاں ہونے لگی — مُدّتوں سے تھا جسے بھولا ہوا ہندوستاں

خلق حسن کا ہوا دونوں کے باہم میل جول
اک نئی تہذیب ہندی ہوگئی پیدا یہاں

خوبیوں کے معترف ہیں جسکی سب اہلِ فرنگ
اب تلک باقی ہے مغلی زندگی میں جسکا رنگ

اوج پر تھی سن ستتر میں جونکو اختری
ہند میں برپا ہوا ملکہ کا جشن قیصری

شہر دہلی جو کہ روحِ جسمِ ہندوستان ہے
شہر کوئی جس کی کرسکتا نہیں ہے ہمسری

جس نے پانڈونکی حکومت کا علم سر پر رکھا
تازہ ہے آنکھوں میں جسکی شوکتِ جو دستری

راج دھانی وہ ہوا شاہ عالیشان کی
تیج اور جوتی میں کم تھا جس سے شاہِ خاوری

ماہتابی جشن ہے شاہ جہاں کا جس کو یاد
جشن جمشیدی کی جس نے محو کی یادآوری

گو کبھی بزمِ محمد شہ کی ہوچکی ہے جہاں
ہے مرہٹوں کی جسے یاد ابتلک وہ داوری

قیصری دربار واں ایسا ہوا ہے پُرجلال
جس کی عظمت کی نہیں تاریخ پیشیں میں مثال

دورِ اکبر اور تھا قیصر کا دوراں اور ہے
ضابطہ کچھ اور ہے اور شخصی فرماں اور ہے

ہے فقط اک ذات سے وابستہ شخصی سلطنت
کانسٹی ٹیوشن کی پابندی کا ساماں اور ہے

پہلے شاہی حکم تھا حکمِ خدا کا ہم ردیف
ملک میں اب حکم شاہنشہ کی بُرہاں اور ہے

ملک کے قانون اور حکام کے ہر حکم پر
نکتہ چینی کا ہے اب طرز اور عنواں اور ہے

حکمِ حاکم اب نہیں مرگِ مفاجات اس جگہ
اب یہاں تنقیدِ جمہوری کا الحاں اور ہے

اب فرائض کو وجوبِ بادشاہی پر ہے فوق
اور اصولِ سلطنت میں۔ شانِ سلطاں اور ہے

ہے رعایا صدقِ دل سے بادشہ کی جاں نثار
جانتا ہے شاہ اُس کا آپ کو خدمت گزار

کون کہتا ہے کہ ہے یہ عہد نقصوں سے بری
اور نہیں ہے نام کو نقص اور قصور اس میں ذری

سچ ہے" نسیاں اور خطا سے ہے مرکب آدمی
ہے حکومت بسکہ نازک کام مشکل افسری

نقص حاکم کا جتانا فرض ہے محکوم کا ۔۔۔ پر نہ یُوں جس سے کہ ٹپکے سرکشی او خود سری

ہموطن میرے ذرا یہ بھی تو سوچیں بیٹھ کر ۔۔۔ ہم میں خود کیا کیا خرابی اور بھری ہی ابتری

مذہبی حالت ہماری اور سوشل زندگی ۔۔۔ کس قدر نقص اور معائب سی سراسر ہی بھری

برہمن نے شودر کو ۔ خاوند نے خاتون کو ۔۔۔ دے رکھا ہی کون سے درجے میں حق ہمسری

اپنی اپنی ذیل میں ہندو مُسلمان کا سلوک ۔۔۔ اور باہم دو نو کے پھر اُلفت ہی کیا دلمیں بھری

اک اسامی پر تو تم اسطرح لڑتے ہو باہم ۔۔۔ جیسے ہو دو بلیوں کے بیچ اِک بوٹی دھری

رات دِن تخریب قومی کی لگن ہی آپ کو

اس پہ دعویٰ ترقیٔ وطن ہے آپ کو

پنڈت برج موہن [illegible]

دادروا

(ایک شب غربت کے تصور میں)

مینڈک من حیث الحسن ایسی چیز نہیں جسپر کوئی نظم لکھی جاکر کسی علمی رسالے میں پیشکش ناظرین کیجاتی ۔ اُسکے گھنانے بدن کے تصور سے جس پر لیسدار اور بساہندے کساہندے لعاب کا پوڈر پھرا ہوتا ہی ۔ جھرجھریاں اور پھریریاں سی آنے لگتی ہیں ۔ اسکے بھدے پن پر پُھدکنے اور بعض اوقات لمبی لمبی چھلانگیں مارنیمیں بھی کوئی حُسن نہیں نکلتا ۔ اُسکا سراپا کچھ ایسا بے ڈھنگا واقع ہوا ہی ۔ کہ خواہ مخواہ بھیانک سا معلوم ہوتا ہی ۔ لیکن آجکل کے شعراء کے دماغ "چڑیا گھر" سے بہت مشابہ ہوگئے ہیں متقدمین نے تو صرف ایک "بُلبل" چُن لیا تھا ۔ اسی سے حُسن و عشق ۔ ناز و نیاز ۔ ہجر و وصل کی باتیں کرکے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے تھے ۔ مگر ان حضرات نے "مکھی" تک کو نہیں چھوڑا اور اگر تلاش کا یہی عالم رہا ۔ تو حشرات الارض اور خوردبین سے نظر آنیوالے کیڑے بھی انکے پنجۂ تخیل سے نہ بچ سکینگے ۔ اور ہمارے شعراء کی نئی تانتی کے مقابلے میں امریکہ کے مشہور

مُوچھوں کو چھپنا پڑیگا۔ یہی وجہ سمجھئے۔ یا سفلی خیالات کے سیلاب کا زور۔ کہ ہمیں بھی جناب "مینڈک" کی خدمت میں نیاز حاصل کرنیکا موقع ملا۔ کیوں نہ ہو آخر وُہ بھی ایک مخلوق ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ موسم کی چیز فصل کا میوہ ہے۔

موسم برسات میں آبادی سے ذرا باہر نکل کر دیکھو۔ اگر "باصرہ" کے لئے سبزے نے فرش زمردین بچھا رکھا ہوگا۔ تو "سامعہ" کی خدمت میں "مینڈک ڈیپوٹیشن" خیر مقدم کا ایڈریس پیش کر رہا ہوگا۔ جن احباب کو برسات کی راتیں گاؤں میں بسر کرنیکا اتفاق ہوا ہے وہ اس کیفیت سے زیادہ باخبر ہوتے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔ پھوار پڑ رہی ہے۔ ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے گویا تھپکیاں دے دیکر سُلانیکی کوشش کر رہے ہیں۔ آنکھوں میں نیند ہے۔ اور دل میں تصور۔ ایک سکون سکوت اور خاموشی کا عالم ہے۔ کہ یکایک بڑے زور سے آواز آئی "عائیں۔ عائیں۔ عائیں" اور ایک نہیں دس بیس نے ملکر ایک سا نغمہ ٹرانا شروع کیا (جیسے کوئی آگ لگنے سے دُہائی دے اُٹھتا ہو) اور دفعۃً آنکھ کھل گئی!

ایسے وقت میں جو خیالات کسی مجبور کے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس کا ایک سیدھا سادہ خاکہ ذیل کی نظم سے پیش کش احباب کیا جاتا ہے:۔ (علمدار حسین)

سُن او شوریدہ حال سودائی — بند کر اپنی اب یہ شہنائی
مَیں نے مانا ہے آج کل برسات — لُطف میں کٹتے ہیں ترے دن رات
تیری فصلِ بہار ہے بے شک — تجھ کو یہ سازگار ہے بے شک
پر مجھے کیوں ستا رہا ہے تو — مفت کیوں غُل مچا رہا ہے تو
صدقہ اس اپنی خوش گلوئی کا — واسطہ اپنی خوب رُوئی کا
صدقہ اس مینگنی سی آنکھوں کا — واسطہ بھدّے بھدّے ہاتھوں کا
تجھ کو سوگند تیری صُورت کی — اس گھنانی ڈرانی مُورت کی
تجھ کو جوہڑ کا واسطہ اے دوست — وجہِ غوغا مجھے بتا اے دوست!

کیا ترا نالۂ فراق ہے یہ؟ یا صدائے پُر اشتیاق ہے یہ؟
کیا کسی سے ہے دل لگا تیرا؟ تجھ سے محبوب چھُٹ گیا تیرا؟
تو بھی تیرِ نظر کا گھائل ہے؟ کیا ترا دل بھی کوئی بسمل ہے؟
تو بھی مذبوحِ تیغ فرقت ہے؟ کیا یہ تیری بھی شامِ غربت ہے؟
کس لئے تو نے غل مچایا ہے؟ آسماں سر پہ کیوں اُٹھایا ہے؟
رات بھر سُن چکے تری "ٹر ٹر" نیند بھر سونا ہو گیا دوبھر
کوئی حد بھی ہے تیری اس ٹر کی انتہا کوئی تیری اس ٹر کی؟
جھُٹ پٹے سے لگا تھا "ٹرانے" صبح ہونے کو آئی دیوانے
سُن چکے تیرے ٹپّے اور دُھرپت راگ کی تو نے خوب کی درگت
دیکھ تو آدھی بج چکی کب کی رہ گئیں چند ساعتیں شب کی
ارے ظالم خموش ہو۔ بس کر تاکجا "عائیں عائیں" اور "ٹر ٹر"

توڑ مت سلسلہ تصور کا وقت غربت کے ہے "تاثر" کا
گو مسافر ہوں اجنبی ہوں میں لیکن آخر تو آدمی ہوں میں
یہ ہوا! یہ گھٹا! بہار کی رات میں اکیلا نہ کوئی سنگ نہ سات!!
ہیں ہزاروں خیال اک دل میں لاکھ ارماں اِس ایک منزل میں!
رشک ہے مجھ کو تیری قسمت پہ اور افسوس اپنی حالت پر
تجھ کو حاصل ہے صحبتِ احباب میں ہوں بے تاب صورتِ سیماب
حلقۂ بندگی سے تو آزاد ہمہ تن قید سے ہوں میں فریاد
تجھ کو غربت وطن برابر ہے یہاں سودا ہے لاکھ اک سر ہے
تو سدا گھر میں وطن سے دُور بُلبلِ خوش نوا چمن سے دُور!
ذکرِ ماضی۔ نہ فکرِ مستقبل تو ہے اور ہیں یہ تیرے آب و گل

فکر رہتی ہے یاں یہی دن رات
کس طرح سے کٹے گی قید حیات

تجھ پہ ہم جنس کا نہیں احساں
میں ہوں مرہونِ منتِ انساں

تجھ کو اک دن نہ مانگتے دیکھا
یاں ہمیشہ لبِ سوال ہے وا!

تیرا باقی نہیں رہا کوئی
میرا نکلا نہ مدعا کوئی!!!

الغرض تیرا بول ہے بالا
"نے غم دزد نے غم کالا"

رخصت اب اے ہم دغم آلام
میری ہستی ہے مائل آرام

صدمۂ درد سہہ چکا برسوں
قیدئ زیست رہ چکا برسوں

دیکھ ڈالے ہیں انقلاب بہت
اپنی مٹی ہوئی خراب بہت

بزم ہستی سے اب گذرنے دو
اے تمناؤ! مجھ کو مرنے دو

سید علمدار حسین واسطی

کوہسار آڑہ

جناب منشی احمد حسین خاں صاحب بی۔ اے نے ان دلچسپ اشعار میں اس وقت کی کیفیت کو بیان کیا ہے جب وہ پہاڑ پر سشن جج صاحب کے ہمراہ دورہ میں تھے۔ انہوں نے اپنے جذباتِ دل کا اظہار اس صفائی سے کیا ہے۔ کہ پڑھنے والے کو خود بخود ان سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے:-

پر توفگن ہے آڑہ پہ عبد الغفور خاں
ہے ہمرکاب احمد بیمار و نیم جاں

اے کوہسار آج تری سیرگاہ میں
قسمت سے ہیں یہ خادم مخدوم میہماں

مخدوم رنگِ عزت و حرمت سے سرخرو
خادم ہے مثلِ برگِ خزاں رنگِ زعفراں

خادم غریقِ قلزمِ افکار و یاس ہے
مخدوم مثلِ مہر منور ہے زرفشاں

آقا کے سر پہ تاجِ مسرت ہے جلوہ گر
خادم شہیدِ ناوکِ اندوہِ جاں ستاں

خادم تو غم سے پیر ہے عہدِ شباب میں
آقا ہے رشکِ سرو سہی اور نوجواں

آقا لباسِ عیش میں ہو رشکِ نوبہار
خادم ہے دردِ چشم سے بیتاب و نیم جاں

وُہ ہے اگر کمال تو عین الکمال یہ
خادم اگر زمین تو آقا ہے آسماں

اُے کوہ تیرے سبزے میں بیگانگی نہیں
اِسواسطے سناتا ہوں اپنی مَیں داستاں

باغِ جہاں میں بلبلِ شوریدہ بخت ہوں
صحنِ چمن سے دُور ہوں محرومِ بوستاں

آتی صدا جرس کی برابر ہے کان میں
لیکن دکھائی دیتا نہیں مجھ کو کارواں

ہوں گلستانِ دہر میں وہ نخلِ بدنصیب
بیتاب جس پہ گرنے کو رہتی ہیں بجلیاں

پہلو میں میرے دل تھا مگر اب بجائے دل
حیرت کا ہے مقام کہ غربال ہے نہاں

اِس فکر میں مَیں صورتِ پروانہ جل گیا
وُہ شمعِ انبساط خدا جانے ہے کہاں

مَیں کیا کروں کہ روز میرے آشیانے کو
صیّاد بنکے ہائے گراتی ہیں آندھیاں

وُہ ناؤ جس پہ ناز تھا گردابِ دہر میں
اب دیکھتا ہوں ٹوٹ چلے اُسکے بادباں

مونس ہی میرا کوئی نہ ہمدم نہ آشنا
ڈھونڈا بہت وفا کا نہ پایا کہیں نشاں

اک درد ہے جو رات کو کروٹ بدلتا ہو
ہاں یہ ہی اک رفیق ہو اور یہ ہی مہرباں

تو کوہ مَیں نے فرض کیا سنگلاخ ہے
پر غم کا بار تجھ سے بھی دہ چند ہو گراں

اُے کوہ میرے سینہ میں فرقت کا داغ ہو
ہر دم ہیں جس سے چُبھتی کلیجہ میں برچھیاں

یہ داغ وُہ نہیں کہ جو زیور ہے لالہ کا
یا شب کو ماہتاب میں ہوتا ہے جو عیاں

یہ داغ ہائے روگ ہے عہدِ شباب کا
یا یُوں کہو کہ مرگِ جوانی ہے الاماں

کب تک اے کوہ روؤں میں رونا فراق کا
ڈر ہے کہ بہ نہ جائیں کہیں تیری گھاٹیاں

اَے کوہسار کس لئے یُوں گم بخود ہے تو
کیا تجھ کو تنگی ہے کہ نہ ہوں کی صدا نہ ہاں

دُنیا نہیں ہے نالۂ بسمل کا کچھ جواب
مَیں کوہکن نہیں ہوں خدا جانتا ہو ہاں

مجنوں ہوں اور دامِ محبت میں ہوں اسیر
ہیں میرے دونوں پاؤں میں سونے کی بیڑیاں

او بے زبان آنکھیں ہیں تیری تو دیکھ لے
مَیں موسمِ بہار میں ہوں صورتِ خزاں

جی چاہتا ہے لیٹ رہوں سب کو چھوڑ کے تھوڑی سی گر زمیں مجھے دیدیں یہ جھاڑیاں
اَے کوہ تجھ پہ آئے کئی اور کئی گئے ہاں مجھ کو یاد رکھنا کہ آیا تھا میں یہاں
شاید تو مجھ کو بھول گیا کیوں خموش ہو ہاں سُن لے پھر بتاتا ہوں مَیں نام اور نشاں
مَیں بے نوا جہاں میں اک بے نظیر ہوں ہے نام عُرفِ عام میں احمد حسین خاں

دِلّی کا ایک مشاعِرہ

اللہ اللہ ایک وقت تھا۔ کہ دِلّی کے مشاعِروں کی دُھوم تھی۔ باکمال مل بیٹھتے تھے۔ اور دادِ سخنوری دیتے تھے۔ اب زمانہ بدل گیا۔ وُہ لوگ چل بسے۔ کچھ صاحبانِ فن جو باقی تھے منتشر ہوگئے۔ اب وہ صحبتیں ہیں نہ وُہ جلسے۔ مدّت سے دِلّی میں کوئی بڑا مشاعرہ ہی نہیں ہوا۔ کچھ دنوں سے خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمۃ کی درگاہ پر وہاں کے پیرزادہ صاحب کے ہاں ایک مختصر سی صحبت ہوتی ہے جو اس زمانے میں مغتنم ہے۔ ہر پنجشنبہ کی شام کو وہاں کچھ احباب جمع ہوجاتے ہیں۔ خان بہادر مولوی عبدالحامد صاحب جو ایک علم دوست بزرگ ہیں۔ اس بزم سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور اکثر وہاں تشریف لیجاتے ہیں۔ ماہ ستمبر کے آخر میں اس میں شریک ہونے کا مجھے بھی موقع ملا۔ لُطف کی صحبت رہی۔ مصرعِ طرح جناب شاد عظیم آبادی کی غزل سے جو اگست کے مخزن میں شائع ہوئی تھی لیا گیا تھا۔ اُس زمین میں عاشقانہ رنگ کی غزل لکھنا آسان نہ تھا۔ مگر جناب نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل اور سید وحید الدین صاحب بیخود نے خوب خوب شعر نکالے ہیں۔ دونوں غزلیں ہدیۂ ناظرین ہیں۔ (عبدالقادر)

انوکھی آن پیدا کر نرالی شان پیدا کر دلِ پُر آرزو میں اور بھی ارمان پیدا کر
فدائی کوئی پہلے مجھ سا میری جان پیدا کر پھر اُس کے دِل میں اتنی حسرتیں ارمان پیدا کر
پریشانی کو دل سے کھو کے اطمینان پیدا کر اگر کچھ کام کرنا ہے تجھے اوسان پیدا کر
عدو کی خصلتوں کا کوئی تو درمان پیدا کر فریبی پُر دغا مکّار بے ایمان پیدا کر
پڑھاتا ہوں سبق دل کو نہ ہو بدخواہِ دشمن تو مزے کی کوئی حسرت لُطف کا ارمان پیدا کر

جفائیں تیری سہتے ہیں دعائیں تجھ کو دیتے ہیں — کوئی تو اس سے بڑھکر اور تو احسان پیدا کر
تمیز گریۂ معشوق و عاشق چشم تر یوں ہو — کہیں موتی لڑھکتے ہوں کہیں طوفان پیدا کر
عدو کو چاہتا ہے تو یہ میرے منہہ سے نکلے گا — کوئی بہتان گھڑ مجھ پر کوئی طوفان پیدا کر
تمیز نیک و بد کیونکر ہو کیا ہوا و بت کمسن — ابھی کچھ ہوش آنے دے ابھی اوسان پیدا کر
نگہ کو حکم دے چل پھر کے بازار محبت میں — جہاں جنس وفا بکتی ہو وہ دوکان پیدا کر
دکھا کر جلوۂ رخسار پھڑکا دے دل عاشق — بہت سی آرزوئیں حسرتیں ارمان پیدا کر
نگہبانی کو میرے دیدۂ بیدار ہی رکھ لے — نہیں تو اس طرح کے ایک دو دربان پیدا کر
ہٹے جاتا ہے کیوں تو حور جنت پر عبث زاہد — حسینوں کی پرکھ معشوق کی پہچان پیدا کر
ادائیں دیکھ جب اپنی عدو کا درد دل جب سن — ہماری آنکھ پیدا کر ہمارے کان پیدا کر
مزے کی شوخیاں درکار ہیں اشعار میں سائلؔ — سخن میں طرز و رنگ داغ تا امکان پیدا کر

سائلؔ دہلوی

جہاں دل ہے وہیں اس شوخ کا ارمان پیدا کر — میرے سینے میں یارب اور بھی اک جان پیدا کر
جوانی اُن کی کہتی ہے نئی اک شان پیدا کر — نگاہ شرم میں بھی تیر کا پیکان پیدا کر
میری محرومی قسمت سے تو واقف ہے تو یارب — وہیں پامال کر دے دل میں جو ارمان پیدا کر
عدو کا حال کہتے ہیں پھر اس پر ہیں تاکیدیں — ہماری بات سننے کے لئے تو کان پیدا کر
لب معشوق ہو کر رہ گیا ہے تیر پہلو میں — نگاہ ناز میں یہ بات میری جان پیدا کر
بگڑنا منہہ بنانا روٹھ جانا اس سے کیا حاصل — ادا دل چھین لینے کی کوئی نادان پیدا کر
دکھانا ہے تجھے ای دل اگر نیرنگ الفت کا — نرالا ساری دنیا سے کوئی ارمان پیدا کر
حیا غماز ہے راز محبت کھول دیتی ہے — نگاہ شرم میں شوخی تیرے قربان پیدا کر
الٰہی فصل گل پر بھی خزاں کا حکم جاری ہے — چمن میں پھول پیدا کر تو نافرمان پیدا کر
کھٹکتی ہے مرے سینے میں یارب آرزو اسکی — نکل جائے یہ دل کی پھانس وہ سامان پیدا کر

نہو جامے سے باہر واعظِ خودبیں سو کہدینا
بناہے جسکی صورت پر اُسی کی شان پیدا کر

بُتوں کو جب کیا تھا اُس نے پیدا ہمکو کہنا تھا
بنا دے آدمی انکو انہیں انسان پیدا کر

تری اُلفت میں ہم نے کر دیا برباد اپنے کو
ستمگر ابتو کچھ انصاف کچھ ایمان پیدا کر

کسی کے حُسن کی ہر آن دل کو چھین لیتی ہے
نیا پہلو میں یارب ایک دل ہر آن پیدا کر

مِلا کیوں اس سے آیدل کیوں گیا تو اسکو کوچہ میں
کہا تھا کس نے تجھ سے مَوت کا سامان پیدا کر

لگی میں دل کی لو میں شمع کی بیحد تفاوت ہے
تمیزِ عشق پروانہ سے اَے نادان پیدا کر

ہمارا دِل ترا گھر ہے اسے آباد رکھ یارب
یہ لڑتی ہے بُتوں سے آنکھ میں ارمان پیدا کر

وُہ آجائیں دِل مشتاق میری جان بچ جائے
کوئی تدبیر ایسی سوچ کر آسان پیدا کر

کہاں ہیرا کہاں پتھر کجا بیخود کجا دشمن
جواہر کی پرکھ انسان کی پہچان پیدا کر

زباں اُستاد کی بیخود تو ہو مضمون مومن کا
بیاں غالب کا ہو اشعار کی یہ شان پیدا کر

بیخود دہلوی

تازہ غزلیں

دروادیٔ سلوک زخود دُور بودہ ایم
یعنی کہ مستِ بادۂ منصور بودہ ایم

ہر جلوہ مرا نتواند فریب داد
پروانۂ چراغِ سرِ طور بودہ ایم

نومیدیم ز دولتِ وصلت ہم از من است
تو بس قریب بودی و ما دُور بودہ ایم

مارا بہ نُقل و بادہ و مے احتیاج نیست
ما از نگاہِ مستِ تو مخمور بودہ ایم

از ما تواں گرفت طریقِ ریا کہ ما
عُمرے دراز زاہد و مستور بودہ ایم

معذورم ار بہ فہم نیاید حدیثِ دوست
در بزمِ راز ازو قدرے دُور بودہ ایم

شبلی مباش منکرِ رفتارِ ما کہ ما
مست از مے شبانۂ پُر زور بودہ ایم

شبلی نعمانی

مُبارک اور گُلچیں ہو کوئی تیرے گلستاں کو ۔۔۔ کہ ہم تو یاں سے چُن کر لے چلے گُلہائے حرماں کو
مسرت سے جو رقصاں دیکھتا ہوں تیری مژگاں کو ۔۔۔ کہیں بیدرد نے چھیڑا نہ ہو میری رگِ جاں کو
مرا تو اُس کے نظارے سے ایماں تازہ ہوتا ہے ۔۔۔ خُدا رکھے سلامت اُس عدوئے دین و ایماں کو
مجھے بیتاب رکھتا ہے یہاں خود ذوقِ بربادی ۔۔۔ تمہیں سمجھاؤ کچھ اپنی نگاہِ فتنہ ساماں کو
ترے آنے سے خونِ لالہ و گل جوش میں آیا ۔۔۔ لگا دی آگ تیرے حُسن نے گویا گلستاں کو
یہی مطلب کی دشواری ہے خود تمہیدِ آسانی ۔۔۔ صباحِ وصل کی ہے جُستجو شبہائے ہجراں کو
جو کی ہے اک نظر تو دُوسری بھی بندہ پرور ہو ۔۔۔ نکالا دل جو سینے سے تو کیوں رہنے دو ارماں کو
یہ حُسنِ دلنواز اُس پر یہ طرزِ میرزایانہ ۔۔۔ کوئی دیکھے ذرا اُس بادشاہِ کجکلاہاں کو
مری احوال پُرسی کو ہے ہر تار اک زباں گویا ۔۔۔ دُعا دیتا ہے ہر موئے تن اُس زلفِ پریشاں کو
حریفِ نالہ ہو گر نغمہ نے تیری محفل میں ۔۔۔ شرارِ آہ سے میں پھونک دوں سارے نیستاں کو
کہوں کیا سجدہ ہائے شوق کی ہنگامہ آرائی ۔۔۔ وہ طوفاں یاد ہے اب تک زمینِ کوئے جاناں کو
قیامت ہے ہمارے کلبۂ احزاں کی تاریکی ۔۔۔ جمالِ یار نے روشن کیا کس کے شبستاں کو
ہوائے زخم میں بیتاب ہوں۔ یارب مُبارک ہو ۔۔۔ خلش میرے جگر کو اور درازی اسکی مژگاں کو
بھلا اس وحشت آباد جہاں میں دل لگے کیونکر ۔۔۔ پریشاں دیکھتا ہوں ہر طرف خاکِ عزیزاں کو

کلامِ میر پڑھ پڑھ کر ہوا ہُوں نکتہ ور وحشت
تلمذ ہے اُسی اُستاد سے طبعِ سخنداں کو

رضا علی وحشت از کلکتہ

محبت میں مزے ہیں انتہا کے اور مصیبت بھی ۔۔۔ یہ وہ میوہ ہے جس میں تلخیاں بھی ہیں حلاوت بھی
مرض بھی ہے مگر انساں کو دل کی ہے یہ صحت بھی ۔۔۔ خدا دل دے تو دل کے ساتھ دے دردِ محبت بھی
ابھی اُس قامتِ رعنا نے کچھ فتنے اُٹھائے ہیں ۔۔۔ یہ لچھن ہیں تو اک دن آ ہی جائے گی قیامت بھی
لگاوٹ میں رکاوٹ ہے رکاوٹ میں لگاوٹ ہے ۔۔۔ عجب انداز ہے عاشق سے نفرت بھی ہے رغبت بھی

علاج دردِ اُلفت ترکِ اُلفت تو نے سمجھا ہے　　　مگر اَے چارہ گر خود اِک مرض ہے ترکِ اُلفت بھی
اُدھر تیغِ نگاہِ ناز ہے بیتاب برق آسا　　　اِدھر بیچین ہے اپنی تمنّائے شہادت بھی
یہ مانا شانِ نازِ حُسن ہے جور و جفا کرنا　　　ستم کی انتہا بھی ہے؟ ظلم کی کوئی نہایت بھی؟
نہو اَے آرزو بیدل بُتوں کی سرد مہری سے　　　کبھی تو ہو ہی جائے گی اِدھر چشمِ عنایت بھی
گلِ گلشن کی رعنائی ہے ہر خارِ بیاباں میں　　　مگر چشمِ تماشائی میں ہو نورِ بصیرت بھی
وطن جس کا جہاں ہو نوعِ انساں جس کا کُنبہ ہو　　　اُسے صبحِ وطن سے کم نہیں ہے شامِ غُربت بھی

مزا تو جب ہے اَے نیرنگ اگر طرزِ تکلّم میں
نمک بھی ہو سلاست بھی ہو رفعت بھی ہو جدّت بھی

میر نیرنگ بی۔ اے

مُصحفِ روئے کتابی سے کتاب اچھی ہے　　　مَے گلگوں سے تخیّل کی شراب اچھی ہے
اب کہ ہے ساقیِ نوخیز نہ وُہ بزمِ کہُن　　　مَے دیرینہ سے پارینہ کتاب اچھی ہے
شمع خاموش ہے اور ساغرِ صہبا خالی　　　اب دلِ خوں شدہ و چشمِ پُر آب اچھی ہے
بسکہ پامالِ خزاں ہے چمنستانِ حیات　　　یادِ ایّامِ بہارانِ شباب اچھی ہے
شوخ چشمی نے کیا دُخترِ رز کو بدنام　　　یہ نہو اس میں تو یہ خانہ خراب اچھی ہے
جس کے نشہ میں خمار اور نہ مستی میں اُتار　　　ایسی مِلجائے کہیں سے تو شراب اچھی ہے
ہستیِ بحرِ حوادث ہے فنا کی تعلیم　　　زندگی تھوڑی ہی اے طفلِ حباب اچھی ہے
نہ جہاں روک نہ ٹوک اور نہ جہاں شرم و حجاب　　　سب حجابوں سے مجھے تیری جناب اچھی ہے
غیر سے بزم تہی شکوہ سے دل ہو خالی　　　اِس فراغت سے ملے تو مَے ناب اچھی ہے
دل کا کیا کیجے کہ ہے خوگرِ بیداد و ستم　　　مہربانی تری بیحد و حساب اچھی ہے

زندگی صورتِ صحرا ہے جوانی ہے سراب
صادق اس دشت میں یہ موجِ سراب اچھی ہے

[illegible]

ناول خواب ہستی

مصنفہ مرزا محمد سعید صاحب دہلوی ایم اے پروفیسر محمڈن کالج علیگڈھ جسمیں ہندوستانکی مقبول و مشترکہ زبان کو فسانہ طرازی کے معاملہ میں السنہ غربیہ کا ہم پلہ بنالیا ہے۔ کہنے کو تو ناول ہے مگر یقیناً ہندی طرز معاشرت کا سچا مرقع۔ ملکی رسم و رواج کا آئینہ اور طلبا کی تعلیمی خانگی اور خلوتی زندگی کا بائسکوپ ہے۔ جسمیں روزمرہ کے واقعات وکوائف کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ پختہ کار وںمیں "یاد آیام" کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ تو نوجوانوں کے معاملات کا ہو بہو نقشہ اُتارتا ہے انگریزی تعلیم یافتونکی زندگی اُس پوشیدہ مگر ضروری پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ جسکے حل کرنیمیں اب تک ملک کے سارے مدبریں قاصر رہے ہیں۔

اس ناول کی لکھائی چھپائی ترتیب وغیرہ میں بھی بڑی محنت ولاگت سے وہ بات پیدا کی گئی ہے جو اب تک کسی ناول کو نصیب نہیں ہوئی ہے اس کا سُنہری سرورق بجائے ایک تختہ گلشن ہے اور دیباچہ اپنی رنگینی کے اعتبار سے صحن چمن ان سب پر طرہ

تین ہاف ٹون عکسی تصاویر

ہیں حسینوں نے اسکے صفحات میں اہل بینش کے لئے ایک جنت نگاہ مہیا کی ہے اور دلادیزی نظر فریبی کی شان بہت کچھ بڑھا دی ہے۔ ہر تصویر گویا مُنہ سے بول کر صاحبان نظر سے داد طلب ہے! باین ہمہ اوصاف قیمت صرف عہ علاوہ محصولڈاک۔

منیجر مخزن دلی سے طلب فرمائیے

اُردو زبان کے مربی شمس العلماء مولینا آزاد کی تصویر کیا آپ اس قابل نہیں سمجھتے۔ کہ آپ کے کتب خانہ کے لئے زینت نہ ہو مولینا آزاد کی گھر بیٹھے زیارت کیا آپ کو ۶۰ر آنہ میں گران رہیگی۔ اور پھر بھی تصویر ہی نہیں بلکہ اُن کے خطوط کا مجموعہ بھی ایک نہایت دلاویز اور خوشنما سرورق میں محفوظ ہو کر اسی قیمت میں آپ کو ملتا ہے۔ تصویریں اب تیار ہو کر آگئی ہیں۔ آپ جلد طلب فرمائیں کم از کم مخزن کے ہر خریدار کے پاس اس علمی تبرک کا ہونا ضروری ہے قیمت ۶۰ر علاوہ محصولڈاک +

سید غلام بھیک بی اے نیرنگ کا تمام کلام جو مخزن میں چھپتا رہا ہے اُس کو جمع کر کے نہائت خوشنما ایڈیشن چھاپ دیا ہے۔ اس مجموعے میں مفصلہ ذیل نظمون کے علاوہ اور بہت سی غزلیات ہیں۔ مُرجھایا ہوا پھُول۔ خواب یتیم راحت یاس ایک آنسو سے دو دو باتیں خواب ناز حسن و عشق کسی کا دھیان بادل۔ انسان کی فریاد۔ نیرنگ شفق رنگ خار محبت۔ کوہستان کا نظارہ۔ سودائے خام تلاش محبت بھنور اجان شیرین وغیرہ وغیرہ نہایت دلچسپ معنی خیز نظمیں ہیں قیمت ۶ر آنہ +

یعنی **مخزن** کی گذشتہ نو جلدوں میں سے تمام چوٹی کے مضامین نظمونکے انتخاب کا مجموعہ جن شائقین کو مخزن کے پہلے نمبر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اُن کے لئے یہ کتاب بہت ضروری ہے مختصراً یہ نادر کتاب بعض یگانہ روزگار مشہور اہل قلم اور شعرا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مغربی مشرقی خیالات کا لب لباب ہے۔ اس مجموعے کیساتھ انجمن اُردو کے اراکین عالیجناب ڈاکٹر نذیر احمد شمس العلماء مولینا شبلی مولینا حالی نواب محسن الملک نواب وقارالملک اور مسٹر آرنلڈ کی ولایتی چھپی ہوئی تصویریں ہیں۔ ان انمول کتاب کی قیمت صرف عہ ۸ ر ہے لیکن مخزن کے خریداروں سے صرف ۸ ر علاوہ محصولڈاک +

آزمائش کیلئے مفت

ہیضہ- اسہال پیچش کی مجرّب دوائی

بھیم یعنے کافور

عوام الناس کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ

فوراً دوائی دافعہ ہیضہ ہم سے منگواکر بطور حفظ ماتقدم گھر میں اپنے پاس موجود رکھیں اِس دوائی سے ابتک سیکڑوں مواضع میں ہزاروں مریض ہیضہ وغیرہ امراض سے بالکل شفایاب ہوچکے ہیں۔

اور لطف یہ ہے کہ۔

صرف آٹھ آنہ میں ایک انسان کی جان بچ سکتی ہے۔

پس اپنی اور اپنے پیاروں کی عزیز جانیں جو کہ لاکھوں کروڑوں روپیوں خرچ سے بھی پیدا نہیں ہوسکتی - اُنکی بچانیمیں ذرا بھی توقف و تامل کرنا ہرگز ہرگز مناسب نہیں ہے جو لوگ فی سبیل اللہ غریب مریضوں کو دوائی دینا چاہیں انکے ساتھ خاص رعائت کیجائیگی اور حضرت پیرزادگان وسجادہ نشینان ومولویان واماماں مساجد وپنڈتان وپوجاریاں ٹھاکردوارہ ودہرم سالہ وواعظاں واسلامی وہنود ومسیحی ودیگر اصحاب مثل پٹواریاں دیہہ وگرداوروں جنکا تعلق پبلک سے ہو- انکو بطور نمونہ ایک شیشی صرف ۲ر ٹکٹ برائے محصول ارسال کرنے پر مفت نذر کیجائیگی۔

اصل قیمت فی شیشی صرف آٹھ آنہ نصف درجن دو روپے (عہ) بارہ آنہ درجن سپانچ روپیہ

مہتمم شفاخانہ ڈاکٹر حکیم غلام نبی زبدۃ الحکماء لاہور پنجاب

حکیم ڈاکٹر چراغدین جوہر ایل ایم ایس
امرتسر پنجاب

دیش اپکارک اوشدھالیہ میں ادویات کی سریع التاثیری کے بھروسے پر نمونہ بھی دیا جاتا ہے۔ فہرست طلب کرکے ملاحظہ فرماویں

یہ ممکن ہے کہ ایک ہی دوائی کل امراض کا حکمی علاج ہو صرف ایک چھوٹی سی شیشی ہر وقت ہر جگہ پر رکھی جا سکتی ہے فہرست منگواویں

دیش اپکارک طبی اخبار ہندوستان بھر میں ایک ہی ہفتہ وار طبی اخبار ہے طرفہ یہ کہ چھپتا بھی سب سے زیادہ ہے۔ "نمونہ مفت"

اسکے سلسلہ میں ایک رسالہ ہر دوسرے مہینے نکلتا ہے ایسے طبی مضامین لکھے جاتے ہیں جنکے جاننے کی ہر شخص کو ضرورت ہے۔ فہرست منگواویں

ہم شستریہ علاج بھی کرتے ہیں جو صاحب ہمارے پاس آویں ان کو جگہ مفت رہنے کو دیتے ہیں اور دوائی بھی اگر چاہیں تو مفت

امرت کی دھارا سچ مچ لاثانی دوائی ہے۔ جو ایک دفعہ منگواتا ہے ہمیشہ کے لئے اس کو اپنا یار بنا لیتا ہے +

ہم ان کل امراض کا علاج خاص طور پر کرتے ہیں جو عام طور پر لاعلاج کہی جاتی ہیں مفصل حالات لکھنے چاہئیں +

ٹھاکر دت شرما وید مالک دیش اپکارک اوشدھالیہ ایڈیٹر دیش اپکارک و فیملی ڈاکٹر و مصنف رسالجات طبی لاہور چوک متی

ملنے کا پتہ۔ ایس۔ اے۔ بی۔ بخشی۔ اینڈ کو۔ کوٹھی نمبر ۱۲۔ ہالیڈے اسٹریٹ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۲۔ کلکتہ

شربت اکسیر — شربت اکسیر

اگر صحت مین فرق ہے تو زندگی بیکار ہے

شربت اکسیر

صحت کا بیمہ — صحت کا بیمہ

آجکل اشتہاری طبیب اور اشتہاری دوا فروشون
کی جھوٹی عبارت آرائی اور جھوٹی تعریفون سے پبلک مین جسقدر بدگمانی پھیلی ہی
ہوا ہے دیکھکر مجھے جرأت نہین ہوتی کہ کسی دوا کا اشتہار آپ کے سامنے پیش کرون مگر یہ بھی سخت
غلطی ہو کہ کوئی چیز جو عام طور سے مفید ثابت ہو چکی ہو پبلک سے پوشیدہ رکھی جاوے۔ **سنیے جناب**
یہ شربت اکسیر جسکا اشتہار آپکے زیر نظر ہے اسکا نسخہ مجھے ایک مشہور امریکن ڈاکٹر سے ملا ہے اور شربت اکسیر کا اشتہار
دینے کے قبل صدہا مریضون پر اسکا امتحان کیا گیا اور خدا کے فضل سے امید سے زیادہ کامیابی ہوئی
جب شربت اکسیر پر مجھے کامل اطمینان ہو گیا تو آج اسکا اشتہار آپکے سامنے پیش کیا جاتا ہے اگر میری
تحریر کو آپ لغو نہ سمجھین تو ایک بوتل شربت اکسیر منگا کر استعمال فرماوین۔ میری تحریر کی صداقت
آپکو فوراً ہو جاوے گی مندرجہ ذیل امراض کے لیے شربت اکسیر واقعی اکسیر ثابت ہوا ہے۔

درد کمر - درد سر کا
برابر رہنا - سستی اور کاہلی اور چہرہ پر بالکل بے رونقی خون کا بدن مین نہ پیدا ہونا
ان تمام مہلک امراض کے لیے نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ مقوی دل و دماغ ہو
ایسا ہے کہ شاید ہی اسکے مقابلے کی کوئی دوسری دوسری دوا ہو۔ ہاضم اسقدر
ہو کہ آپ ایک ہفتہ کے استعمال کرنیکے بعد دونی غذا نوش فرمانے لگینگے پھر مین
انکو دیکھیگا آپ سے بڑا آدمی ہو جاوینگا - اور آپ غریب آدمی ہو جاوینگے
اگر اس تحریر پر بھی شربت اکسیر کا آپ تجربہ نہ کرین تو سخت ہے۔ ایک بوتل
آٹھ دن کے لیے کافی ہوتی ہے پرچہ ترکیب استعمال شیشی کے ہمراہ روانہ
ہوگا۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ۔ محصول علاوہ فی شیشی چھ آنے دینا ہوگا۔

تازہ شہادت جناب رگھوبر دیال صاحب

ریاست بھرتپور سے تحریر فرماتے کہ شربت اکسیر مجھے بو تین منگا چکا ہون
براہ مہربانی فی الفور دو بوتل اور بھی ارسال فرمادین۔ ۷ اگست [illegible]

جناب کا سچا خادم ایس۔ اے۔ بی۔ بخشی۔ اینڈ کو۔ کوٹھی نمبر ۱۲ ہالیڈے اسٹریٹ پوسٹ
بکس نمبر ۱۱۲۔ کلکتہ۔

ذیل کی حمایل یکم رمضان المبارک سے آخر شوال تک آدھی قیمت پر دیجائیگی

مترجمہ شمس العلما مولنا مولوی حافظ محمد نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی جناب
مولوی صاحب کے ترجمے کی (بلحاظ سلاست زبان و نادرہ بحیثیت اظہار
مطالب) شہرت و مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ۳۸ ہزار
قرآن مجید و حمائل حمید مترجم ہدیہ ہو چکیں ہیں اور پھر بھی اہل اسلام کی خواہش
کم نہیں ہوتی چونکہ گرانی قیمت کی وجہ سے اب تک امرار و متوسط الحال ہی
بہرہ مند ہوئے اور غربا محروم رہے لہذا ہم نے بغرض استفادہ غربا ایک سفری
مترجم حمائل کی مولنا صاحب سے درخواست کی جو منظور ہوگئی اس حمائل نادرہ
کی اسلئے کہ اول تو کلام الٰہی ہے۔ دوسرے ترجمہ مولوی صاحب موصوف کا
اور مولوی صاحب ہی کی نگرانی و اہتمام میں بہزار صفائی و لطافت عمدہ کاغذ پر
طبع ہوئی کچھ تعریف ہو نہیں سکتی اب ہم نے حصول برکات کے لئے اس حمائل
بلا جلد کی قیمت نصف ۱۲ار او مجلد عہ ر یکم رمضان المبارک شوال ۱۳۲۵ھ
تک ہدیۃً مقرر کردی تاکہ غربا بھی متمتع ہوسکیں جہاں تک ممکن ہو درخواست
جلد بھیجنی چاہیئے ورنہ بعد شوال المکرم کے پوری قیمت عہر لی جائیگی۔
دس جلد کے خریدار کو ایک جلد مفت دیجائیگی۔

ممیرے کا سرمہ

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل ایگزامینر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں میڈیکل کالج کے پروفیسروں نامور ڈاکٹروں والیان ریاست اور ولایت کی یونیورسٹی کے سند یافتہ ڈاکٹروں نے بعد تجربہ اس سُرمہ کی تصدیق فرمائی ہے۔ کہ یہ سُرمہ امراض ذیل کے لئے اکسیر ہے ضعف بصارت۔ تاریکی چشم۔ دھند جالا۔ پڑوال۔ غبار۔ پھولا۔ سیلان سُرخی۔ ابتدائی موتیا بند۔ ناخنہ [illegible] جانا۔ خارش وغیرہ معزز ڈاکٹر اور حکیم بجائے اور ادویہ کے آنکھوں کے مریضوں پر اس سرمہ کا استعمال کرتے ہیں۔ چند روز کے استعمال سے بینائی بہت بڑھ جاتی ہے۔ اور عینک کی بھی حاجت نہیں رہتی۔ بچہ سے لیکر بوڑھے تک کو یہ سُرمہ یکساں مفید ہے۔ قیمت اس لئے کم رکھی ہے کہ خاص و عام اس سُرمہ سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ قیمت فی تولہ جو سال بھر کے لئے کافی ہے۔ عہ۔ ممیرے کا سفید سرمہ اعلیٰ قسم فی تولہ ہے۔ خالص ممیرہ فی ماشہ عسہ مصری سُرمہ فی تولہ ہ خرچ ڈاک ذمہ خریدار۔ درخواست کے وقت اخبار کا حوالہ ضرور دیں۔ **المشتہر** پروفیسر میا سنگھ اہلووالیہ مقام بٹالہ ضلع گورداسپور

اس سے بڑھکر اور کیا معتبر شہادت ہو سکتی ہے

(۱) میں بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ ممیرے کا سُرمہ جو سردار میا سنگھ اہلووالیہ نے ایجاد کیا ہے۔ بڑی بیش قیمت اور مفید دوا ہے بالخصوص مفصلہ ذیل امراض کے لئے بمنزلہ اکسیر ہے۔ آنکھوں سے پانی کا بہت جانا۔ دھند۔ سوزش۔ ہر قسم جسکو آنکھ آنا کہتے ہیں۔ جلن اور کمزوری نظر۔ ناخنہ۔ باہر اور اندر کی جھلی کا زخم اور ان سے پیپ کا گرنا۔ چونکہ اس سرمہ میں کوئی مضر کیمیاوی شے نہیں ہے۔ اس لئے ہر کسی کے لئے اس کا استعمال مفید ہے۔ مفصلات میں جہاں لائق ڈاکٹروں کا ملنا مشکل ہے وہاں ایسی مفید دوا کو ضرور پاس رکھنا چاہیئے۔ اس لئے میں بلاشک و شبہ کہتا ہوں کہ مذکورہ بالا امراض کیلئے ممیرے کا سرمہ ضروری ہے مفید ہے۔ **راقم** ڈاکٹر ایم۔ بی سانگلی صاحب بہادر ایم ڈی ایم ایس سند یافتہ یونیورسٹی ایڈنبرگ انگلینڈ امرتسر۔

(۲) جناب سردار صاحب تسلیم میں نے آپکا ممیرے کا سرمہ استعمال کیا میں تصدیق کرتا ہوں۔ کہ بیشک یہ سرمہ کمزوری چشم کیلئے بہت مفید ہے۔ میری آنکھیں بالکل کمزور تھیں۔ لگاتار ایک پہر کام کرنے سے معذور ہو جاتا تھا۔ اب میری یہ کیفیت ہے۔ کہ صرف ہفتوں کے استعمال سے تین تین پہر بلکہ تمام دن اچھی طرح کام کر سکتا ہوں۔ راقم میا خورشید محمد خاں خلف نواب حسین محمد خاں صاحب بہادر رئیس اعظم ریاست بھوپال

پانچ ہزار روپیہ انعام — اگر کوئی شخص ممیرے کے سرمہ کی سندات میں سے جو قریب بیس ہزار کے ہیں ایک کو بھی فرضی ثابت کردے اسکو مبلغ پانچہزار روپیہ انعام دیا جائیگا۔ جو لاہور کے بنک میں اسی مطلب کے لئے مارچ سنہ ۱۹۰۶ء سے جمع کیا گیا ہے+

مخزن الجیسی کا دوسرا ناول

ابو مسلم خراسانی

یعنی مشہور مصری رسالہ الہلال کے فاضل اڈیٹر جرجی زیدان (ممبر رائل ایشیاٹک سوسائٹی لنڈن) کے مقبول ناول ابو مسلم خراسانی کا نہایت بامحاورہ سلیس اردو ترجمہ از مولوی محمد حلیم صاحب انصاری مولوی جنکی ترجمہ کتابیں مثل تمدن اسلام۔ ارمانوسہ فتاۃ غسان وغیرہ ملک میں نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی ہیں +

اس ناول میں

قرون وسطی کی تدبیر ملکداری سلطنت بنی امیہ کی تباہی اور حکومت عباسیہ کی بنیاد۔ ابو مسلم کی کارگذاریاں۔ ابو مسلم کون ہے۔ وہ نامور مسلمان پالیٹشن اور بے مثل مدبر جس نے ایک صدی تک زور و شور کیساتھ حکمران رہنے والے خاندان بنی امیہ کو غارت کر کے بنی عباس کی خلافت قائم کر دی۔ افسوس ایسے نامور مدبر کی اردو زبان میں کوئی ایسی مکمل سوانح عمری نہیں جس سے اسکے اخلاق و عادات و تدبیر ملکداری کا پورا پتہ چل سکے +

علامہ مصری نے احسان کیا ہے کہ ابو مسلم کی سوانح عمری حسن و عشق کے نمک کے ساتھ اس غور و تعمق کیساتھ تحریر کی۔ کہ قرون وسطی کے حالات کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی خلافت بنی امیہ کی کمزوریاں خلافت عباسیہ کے ثبات کے اصلی راز سچے دل سچی زبان سے برسوں اسلامی تاریخ پر نظر ڈالنے کے بعد بتائے +

فاضل مترجم نے اس ترجمہ کو اس پاکیزہ ادا کے ساتھ اپنی زبان اردو میں لیا ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ دلچسپی کا یہ عالم کہ ایک صفحہ دیکھنے کے بعد بغیر کتاب ختم کیے ہوئے ہاتھوں سے نہیں چھوڑ سکتے ناول کا حجم قریب ۴۰۰ صفحہ کے لکھائی چھپائی صاف سرورق خوشنما باوجود ان تمام باتوں کے قیمت صرف (عہ) علاوہ محصول +

مینجر مخزن الجیسی دہلی سے مل سکتا ہے

نومبر ۱۹۰۷ء
جلد ۱۴
نمبر ۱

ایڈیٹر
شیخ عبدالقادر
شیخ محمد اکرام

مخزن

پشاور
کشمیر
لاہور
دہلی
لکھنو
کانپور
الہ آباد
بنارس
پٹنہ
کلکتہ
کراچی
بمبئی
حیدرآباد دکن
بنگلور
مدراس

اُردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ماہواری مجموعہ

تصویر جناب مولوی نجم الدین صاحب ثاقب بدایونی
کلیہ کیمبرج - شیخ عبدالقادر - - ۱
دعوکا - جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی المخاطب بہ افسر الشعرا - - - - ۹
علامی فضل خان - منشی سعید احمد مارہروی ۲۲
سومنات - ایک زائر - - - ۱۹
تاریخ عرب - شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی - ایم - اے ۲۸
فلسفہ جمال - مولوی ضیاء الحسن علوی
اطمینان قلب - منشی عبداللہ خاں
از خورجہ -
فراق نل دمینتی کی بیقراری - بابو درگا سہائے سرور جہان آبادی ۵۵
دلی کا مہمان - مولوی نجم الدین ثاقب بدایونی ۵۷
تصویر جاناں لالہ تلوک چند محروم - ۶۴
ہندوستان کی عرضداشت - سید محمد محسن صاحب وفا سیتاپوری ۶۵
اخوت منشی صادق علیخاں صادق از سری نگر ۶۶
تازہ غزلیں حبیب کنتوری - شاد عظیم آبادی - وحشت - عزیز لکھنوی - ثاقب بدایونی - حفیظ جونپوری

دس کروڑ ہندوستانی اُردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اُردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اُردو مادری زبان ہے ▢ ان شہروں میں اُردو مروج ہے ⊙ ان شہروں میں اُردو سمجھی جاتی ہے

باہتمام حاجی مظہر علیم مخزن پریس دہلی سے
چھپکر شایع ہوا

مردوں کی سنجیدہ متمیں کی اپیل
عورتوں میں تمام بیماریوں کی جڑ ایام ماہواری کا بگاڑ ہے
افسوس کہ ۱۰۰ میں سے ۸۰ عورتوں میں یہ بیماری پائی جاتی
ہے اسلئے وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بیماری میں ضرور مبتلا رہتی ہیں۔ ایام ماہواری
(استری ماسک دھرم) کا بیقاعدہ یا بند ہونا۔ درد کے ساتھ آنا کم یا زیادہ آنا۔
سفید رطوبت کا جانا۔ جسمانی کمزوری۔ بائوگولہ۔ قبض۔ کمی خون۔ دمہ۔ مرگی۔
سر اور کمر کا درد پیلا رنگ ہونا۔ بدہضمی۔ اولاد کا نہ ہونا۔ بشرطیکہ عورت بانجھ
نہ ہو اور عمر چالیس سال سے زیادہ نہ ہو۔ ان سب بیماریوں کے لئے یہ دوائی
نہایت مجرب ہے۔ عورتوں کے واسطے اس سے بہتر کوئی دوا نہیں قیمت (عہ) دو روپے۔
سارٹیفکیٹ
مائی ڈیر مدن گوپال صاحب! آپ کی دوائی مستورات کے ایام معمولہ کی بیقاعدگی رفع کرنیوالی میں نے ایک
رشتہ دار مریضہ کے لئے آپ سے منگائی تھی جس کے ایام بیقاعدہ تھے۔ وقت معلوم سے پہلے درد شدید ۲ گھنٹہ
تک رہتا تھا اس کے علاوہ مہینہ بیس روز تک شدت سے سر درد کا دورہ رہا کرتا تھا خوراک بہت کم ہو گئی تھی۔ اس دوائی کے
بعد خدا کے فضل سے یہ تمام شکایات رفع ہو کر مریضہ بالکل تندرست ہو گئی ہے اور کوئی شکایت باقی نہیں رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
میں ہر شخص سے جو اس مرض میں مبتلا ہو آپ کی تیر بہدف دوائی کی سفارش کرتا ہوں اور آپ کو اس کامیابی کے لئے دل
سے مبارکباد دیتا ہوں۔ راقم۔ بندہ عبدالعزیز منیجر کارخانہ پیسہ اخبار لاہور ۱۳۔ نومبر ۱۹۰۶ء
پلیگ کی دوائی
امرت جیون۔ پلیگ سے محفوظ رکھنے والی دوائی فی بکس (عہ) چار بکس ۱۰ روپے
اکسیر پلیگ۔ طاعون کی بیماری کا علاج فی بکس (سے) چار بکس ۵ روپے
للعہ چار روپے
جو ایسی سریع التاثیر اور مجرب ہے کہ دوائی کیساتھ بنک کا چیک دیا جاتا ہے
اگر آرام نہ ہو تو اپنا روپیہ پیپلز بنک لاہور سے واپس منگالو۔
سارٹیفکیٹ
حیرت انگیز ترقی کر رہی ہے (کرپارام ڈسٹرکٹ انجنیر دہلی لکھتے ہیں) ۲۵۰ آدمی بچگئے (لسناسنگھ کا مناگنج)
میں نے اشتہاری طبیبوں سے صرف ایک کو اصل پایا (علم الدین ازڈرنگ امرت سر)
(علاوہ ازیں اور بھی سارٹیفکیٹ موجود ہیں بوجہ عدم گنجائش درج نہیں ہوئے)
مدن گوپال اینڈ کمپنی لاہور

چھپ کر تیار ہے

مقام خلافت یعنی شیخ عبدالقادر صاحب بی اے بیرسٹر ایٹ لا ایڈیٹر مخزن
کا سفرنامۂ استنبول

جسمیں اُنہوں نے حالات و مشاہدات سفر ایک نئے پیرایہ میں لکھے ہیں۔ شیخ صاحب نے جو خطوط استنبول سے لکھے تھے اور جو اخبارات میں [illegible] کی نگاہ سے دیکھے گئے تھے وہ اس کتاب کا محض ضمیمہ ہیں۔ اصل کتاب عجیب عجیب معلومات سے پُر ہے جو اس پیرایے میں اور اس تفصیل کے ساتھ پہلے اُردو خواں دنیا کے سامنے آجتک کبھی پیش نہیں کی گئیں اسکی ترتیب میں جسقدر محنت شیخ صاحب نے کی ہے مطبع نے اسیقدر توجہ اسکی چھپائی لکھائی پر کی ہے۔

اس لئے یہ کتاب ہر اعتبار سے دیدنی ہے جسمیں ۲۶ ہاف ٹون عکسی تصویریں مقام خلافت کے مشہور مناظر کا نقشہ پیش نظر کرتی ہیں۔

کتاب کے سرورق دو ہیں اور دونو منشی فضل الٰہی مرغوب رقم کی صناعی اور فن لیتھوگرافی کا اعلےٰ نمونہ ہیں۔

ضخامت کتاب معہ تصاویر تین سو صفحے سے زیادہ ہے اور اعلےٰ درجے کے چکنے ولایتی کاغذ پر چھپی ہے قیمت معہ محصول ڈاک ؎ ہے

ہاں یہ امر بھی قابل گذارش ہے کہ اس اشتہار کی اشاعت سے پیشتر کئی سو درخواستیں اُن اصحاب کی جو پہلے ہی سے اس سفرنامے کے مشتاق ہو رہے ہیں دفتر میں آچکی ہیں۔ شایقین درخواستیں جلد ارسال فرمائیں۔ ورنہ شاید طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑے۔

مینجر مخزن دہلی

مولوی سید نجم الدین صاحب ثاقب بدایونی

فہرست مضامین رسالہ مخزن جلد تیرہ ۱۳

اپریل ۱۹۰۷ء لغایت ستمبر ۱۹۰۷ء

تصاویر — شہزادہ میرزا عبدالغنی ارشد مرحوم۔ میر مہدی مجروح مرحوم۔ آنریبل مسٹر جسٹس محمد شاہ دین خانصاحب پیرزادہ محمد حسین ایم۔ اے۔ منشی ونانک پرشاد طالب بناری۔

نثر

مضمون	نام مضمون نگار	ماہ	صفحہ
طلسم اعضائے انسانی	شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی	اپریل ۱۹۰۷ء	۱
ارشد کی یادیں	شیخ عبدالقادر	اپریل	۱۶
چڑیا چڑے کی کہانی	سید سجاد حیدر بی۔ اے		۲۷
عصمت و حسن	مولوی عبدالراشد دہلوی	اپریل و مئی	۳۷ و ۱۰
فیضی کا مدفن	منشی سعید احمد	اپریل	۴۵
دنیا	پنڈت شیو نراین شمیم	"	۵۵
جنوب فرانس میں سرما	شیخ عبدالقادر	مئی	۱
قبور دہلی کی سرگذشت	شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ	مئی جون اگست	۲۶ و ۲۶ و [illegible]
حسن کا فرمان	خواجہ سید حسن نظامی	مئی	۳۸
تولہ بھر ریڈیم	نقاش از دکن	"	۴۱
میر مجروح	منشی وجاہت حسین	"	۶۰
تین سال بعد	شیخ عبدالقادر	جون	۱

مضمون	نام مضمون نگار	ماہ	صفحہ
اخلاق	پنڈت شیونراین شمیم	جون	۵
افادات وان کریمر	ایم مہدی حسن	″	۹
نکاح ثانی	سید سجاد حیدر بی۔اے	″	۲۲
کلیہ کیمبرج	شیخ عبدالقادر	جولائی ستمبر	۱
تاریخ عرب	شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی	جولائی اگست ستمبر	۹-۱-۴۲
سیل زمانہ	یلدرم - از بغداد	جولائی	۲۱
کتاب	مرزا اعجاز حسین	جولائی	۲۳
چینیوں کا مذہب	منشی نیاز احمد مرحوم	″	۳۱
قدیم و جدید شاعری	محمد عبدالمجید شرر	″	۴۱
ایک پھول کی سرگذشت	منشی محمد احمد خدنگ	اگست	۲۷
دل ہی تو ہے	شیخ عبدالقادر	اگست	۳۴
نئی اور پرانی تعلیم	مولوی فاضل مولوی محمود علی	اگست	۴۰
دارا شکوہ کے احسانات	خان بہادر سید علی محمد شاد	ستمبر	۹
شاعر کا دل	مولوی سید مقبول احمد	ستمبر	۲۱
فانوس خیال	مشتاق احمد زاہدی بی۔اے	″	۳۶
ایک عرب خاندان کی عورتوں سے ایک انگلش لیڈی کی ملاقات	سید محمد ضامن کنتوری	″	۵۱

نظم

مضمون	نام مضمون نگار	ماہ	صفحہ
طائر دل	مرزا غالب مرحوم	اپریل	۶۰
پیاری باتیں	حضرت محسن کاکوری	"	۶۰
کلام اکبر	خان بہادر سید اکبر حسین جج	"	۶۴
رومال	حافظ سید فضل حق آزاد عظیم آبادی	"	۶۵
عروس حب وطن	منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی	"	۶۶
شباب	مولوی سید محمد فاروق	"	۶۷
سندرہ کو پیغام	لالہ تلوک چند محروم	"	۶۵
عشق	اعجاز دہلوی	مئی	۶۶
اشک حسرت	سید نذیر حسین بی اے	"	۶۶
عمر رفتہ	منشی وجاہت حسین	"	۶۸
ساقی	مولانا سید نظیر شاہ	"	۶۵
قطعات و رباعیات	مرزا محمد ہادی عزیز	"	۷۰
طلبائے علیگڈھ کالج کے نام	شیخ محمد اقبال ایم۔اے	جون	۵۷
علیگڈھ کالج سے رخصت	مسٹر محمد علی بی اے اکسفورڈ	"	۵۸
ماتا	مرزا محمد ہادی عزیز	"	۶۰
فرقت کی رات	منشی احمد حسین خان بی اے	"	۶۱
گھر سے نکال کے دیکھو	نسیم ابو العلائی	"	۶۲
کلام ثاقب	مولوی نجم الدین ثاقب	"	۶۳
راز ہستی	منشی محمود حسن بی اے	"	۶۶
خوشی کا اظہار	خواجہ دل محمد ایم اے	"	۶

مضمون	نام مضمون نگار	ماہ	صفحہ
فریادِ دیرہ	لالہ بالک رام شاد	جون	۶۶
شاعر کا دل	منشی صادق علیخاں	״	״
برقِ کلیسا	خان بہادر سید اکبر حسین	جولائی	۵۷
کنجِ لحد	واصف اکبرآبادی	״	۵۹
سرورِ قناعت	منشی محمد نواب خاں	״	۶۵
دھوپ چھاؤں	ڈپٹی لال نگم بی۔ اے	״	۶۸
ماتمِ عزیز	منشی صادق علیخان صادق	״	۷۰
اشکِ حسرت	سید علمدار حسین واسطی	״	۷۱
کیوپڈ سے خطاب	سید ابوالحسن ناطق	اگست	۵۷
فنا	منشی نادر علیخان نادر کاکوری	״	۵۸
عروسِ بہار	منشی صادق علیخان صادق	״	۵۹
ماں کی جہالت	منشی ونائک پرشاد طالب	״	۶۱
مجنوں اور مجنوں کی ساس	مولوی عبدالقدوس قدسی	״	۶۴
بادۂ گلرنگ	منشی متصدی لال میرٹھی	״	۶۶
قصیدہ مدحیہ	حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی	ستمبر	۵۷
آفتابِ علم	منشی ونائک پرشاد طالب بنارسی	״	۶۳
نوحۂ غم	مرزا اعجاز حسین	״	۶۵
علیگڈھ کالج کی یاد	منشی فخرالدین	״	۶۶
مل کے روئیں	لالہ تلوک چند محروم	״	۶۷
غفلت و ہوشیاری	منشی ولاور شاہ فصیح	״	۶۸
غزل نعتیہ	حضرت بیان	״	۷۰
تازہ غزلیں	. . . .	. . . .	۰

مرثیہ نواب محسن الملک مرحوم

حاضر جلوس میں ہے صف بستہ قوم ساری — شملہ سے آن پہونچی نواب کی سواری

ہر برگ کی زباں نے گلشن میں شور اٹھا — جب لاش باغباں کی گلزار میں اُتاری

صرصر اڑا کے جسکو گل لے گئی چمن سے — آتا ہے پھر خراماں وہ سرو جوئباری

جس بزم دلکشا میں کل عیش کا سماں تھا — آج اوس پہ چھا رہی ہے کیسی یہ سوگواری

کیا شور ہا و ہو ہے کہرام سو بسو ہے — ہر آنکھ اشکجو ہے ہر لب پہ آہ و زاری

بزم عزا کی حالت جی دیکھکر بھر آیا — ہر سر میں شور شیون ہر دل پہ یاس طاری

اے قوم کے دلارے خواب گراں سے جاگو — ہے تمکو نیند پیاری یا اپنی قوم پیاری

جانِ جہاں نہ دیتے تمکو جہاں کے بدلے — ہجر و وصالِ جاناں ہوتا جو اختیاری

مہدی کی زندگی سے ہمدرد قوم سیکھیں — رسم وفا شعاری آئین جاں سپاری

ہر راہرو کو اکدن اس رہ سے ہے گذرنا — احمد کی کل تھی نوبت مہدی کی آج باری

اب خوابِ ناز میں ہیں ہمکو جگانے والے
خلوت میں جا گزیں ہیں جلوے دکھانیوالے

پھر مدتوں کے بچھڑے ملتے ہیں یار دونو — پھر ہمنشیں پُرانے ہیں ہمکنار دونو

کرتی رہینگی روحیں کالج کی پاسبانی — گو جسم سو رہے ہیں زیر مزار دونو

اُمت کا درد و غم تھا جبتک کہ دم میں دم تھا — کنجِ لحد میں بھی ہیں اب بیقرار دونو

چھوڑا نہ بعد مردن گلشن کا آشیانہ — اس بزم گل پہ عاشق تھے مثل ہزار دونو

نہ قوم کے دلارے ہندوستاں کے پیارے — تھے فخر شہر دونو فخر دیار دونو

تھے ارجمند سب میں اور سربلند سب میں | درویش وش تھے لیکن اور خاکسار دونو
شان اوسکی تھی جلالی اسکی روش جمالی | پُرداغ درد سے تھے دل لالہ زار دونو
آسیں بندھانیوالے پیاسیں بجھانیوالے | پیغام یار دونوا بر بہار دونو
آلِ رسول دونو ابنِ بتول دونو | عالی مقام دونو والا تبار دونو
وہ طرز خوش بیانی تھی دجلہ کی روانی | معجز بیاں تھے دونو جادو نگار دونو

افسوس ہم سے چھینے ہمیری قضا نے
وہ علم کے دفینے وہ عقل کے خزانے

وہ قوم کے گدا تھے اور تاجدار دونو | مخدوم تھے وہ دونو خدمتگزار دونو
تھے بزم آخریں کے چشم و چراغ دونو | اور وضع باستاں کے تھے پاسدار دونو
پُرنور وہ جبینیں پُرآرزو وہ سینے | شام خزاں میں بھی تھے صبح بہار دونو
فوارے نور کے وہ صبح کے ستارے | تھے رہنما ہمارے اور رہسپار دونو
الفت کی اک نظر سے خامونکو پختہ کرتے | تھے پختہ مغز ایسے اور پختہ کار دونو
مطلع پہ آسماں کے گرد یکھتے کدورت | کر دیتے قافلہ کو جھٹ ہوشیار دونو
ہر سمت وہ چلالیں ہر گت پہ وہ نچالیں | وہ خوب جانتے تھے رگ رگ کے تار دونو
وہ بزم کے ہیں ساقی جبتک ہے بزم باقی | مستو نکیں گو نہ ہونگے وہ ہوشیار دونو
وہ درد کی صدائیں گونجیں گی شش جہت میں | رٹتے رہینگے اونکو لیل و نہار دونو
ناظر ابھی نظر میں وہ پھر رہی ہیں آنکھیں | تھے دونو پیر و مرشد آموز گار دونو

ان سیدوں کا یارب فردوس میں مکاں ہو
واں طور کی تجلی اور نور کا سماں ہو

چودھری خوشی محمد بی اے

مہتمم بندوبست وزیر وزارت۔ اداغ

کلیۂ کیمبرج

(۳)

"ٹرنٹی" کالج کی بنا کے متعلق جو کچھ بیان ہوا اس سے دو باتیں نکلتی ہیں۔ ایک یہ کہ کیمبرج کے بڑے بڑے کالج عموماً انگلستان کے امرا کی ذاتی فیاضی کی یادگاریں ہیں اور دوسرے یہ کہ مذہب کی محبت کسی نہ کسی صورت میں اُن کی بنا اور اُن کی تکمیل کا باعث ہوئی ہے۔ بلکہ بعض تو خالص مذہبی عمارات کی بدلی ہوئی صورت ہیں۔ سنٹ جان کالج اور کرائسٹ کالج دونو لیڈی مارگرٹ بوفرٹ علم دوست ہونے کے سبب وجود میں آئے۔ یہ نیک دل بیگم ہنری ہفتم شاہ انگلستان کی ماں تھی۔ اس نے سنہ ۱۵۱۱ء میں سینٹ جان کالج کی بنا ڈالی اسی مقام پر ایک ہسپتال سنہ ۱۱۳۵ء سے چلا آتا تھا۔ جسے سینٹ جان کے معتقدوں نے قایم کیا تھا اور اسی سے اس کالج نے یہ نام پایا۔ کرائسٹ کالج کی بنیاد اسی نیک نہاد عورت کے ہاتھوں سنہ ۱۵۰۵ء میں رکھی جا چکی تھی۔ جس جگہ یہ کالج بنا وہاں پہلے ایک مذہبی عمارت سنہ ۱۴۴۲ء سے قایم تھی۔ جسے "گوڈز ہوس" یعنی "خانۂ خدا" کہتے تھے۔ کرائسٹ کالج کے عقب میں ایک وسیع اور خوبصورت باغ ہے۔ جس میں یہ خصوصیت ہے کہ ایک معقول حد

تک اپنی دیرینہ حالت پر قائم ہے اور دیگر کالجوں کے باغوں کی طرح تغیر و تبدل کا شکار نہیں ہوا۔ اسی لئے اس میں کئی نہایت پرانے درخت موجود ہیں۔ چنانچہ ایک درخت شہتوت کا ایسا ہے جسکی نسبت روایت ہے کہ انگلستان کے نامور شاعر ملٹن نے اسے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ اس درخت کو ملٹن کا درخت کہتے ہیں اور کیمبرج کی سیر کرنے والے اس درخت کو ضرور دیکھنے آتے ہیں۔ ملٹن ۱۶۲۵ء میں اس کالج میں داخل ہوا تھا۔ اس حساب سے اس درخت کی عمر قریب تین سو برس کے ہوگی۔ اکثر محققوں کا خیال ہے کہ یہ درخت ۱۶۰۹ء کے درختوں میں سے بچی ہوئی ایک نشانی ہے۔ جب شاہ جیمس اول نے ملک میں شہتوت کے درختوں کی کاشت کو رواج دینے کے لئے بہت سے درخت لگوائے تھے۔ بہر حال خواہ یہ درخت ملٹن نے اپنے ہاتھ سے لگایا یا نہیں۔ یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ اسکی شاخوں کے سایہ میں وہ بیٹھا ہے اور اوس کے مداحوں اور اُس کے کلام کے دلدادوں کے لئے اسی قدر کافی ہے۔ علاوہ ازیں جو درخت تین صدیوں سے گرم و سرد زمانہ دیکھ چکا ہو اور جسکے کھڑے کھڑے ہزارہا رعنا جوانِ سرو قد پیوند خاک ہو چکے ہوں۔ وہ محض بلحاظ قدامت بھی قابلِ زیارت ہو جاتا اگر ملٹن کے نام کے ساتھ نہ بھی منسوب ہوتا۔ اب اس نسبت کے سبب اُسکی جو قدر دانی ہو کم ہے۔

"ایمونویل" کالج اور "سڈنی سکس" کیمبرج کے کالجوں میں اس قسم کی مثالیں ہیں جو خانقاہوں اور معبدوں کی صورت بدل کر کالج بنے۔ جس زمانے میں مذہب کیتھولک کی جگہ پراٹسٹنٹ مذہب کا رواج ہوا۔ اُس زمانے کو تاریخ انگلستان میں "عہد اصلاح" کہتے ہیں۔ یہ کالج عہد اصلاح کا نتیجہ ہیں۔ موخر الذکر کالج لیڈی سڈنی سکس کی وصیت کے مطابق قائم ہوا۔ یہاں پہلے راہبانِ طریق فرانسسکن کی خانقاہ تھی۔

۱۵۳۸ء میں ہنری ہشتم نے اسے اُن راہبوں سے چھین لیا۔ ۱۵۳۸ء میں یونیورسٹی نے کوشش کی کہ مکان اسے مل جاوے۔ مگر یہ کوشش ناکام رہی لیکن ۱۵۴۶ء میں ٹرنٹی کالج کو یہ مکان مل گیا۔ اور کالج والوں نے اسکے پتھر کھود کر اور عمارت بنائی اور یہ کھنڈر سارہ گیا۔ آخر ۱۵۸۹ء میں اسکی سنی گئی اور مرقومہ بالا وصیت سے اسکی تعمیر ۱۵۸۹ء میں ختم ہوئی۔

"سڈنی سسکس" نے گو ایک مذہبی خانقاہ کی جگہ لی۔ لیکن اس کی عمارت نئی بنی۔ مگر "جیسس" یعنی یسوع کالج میں یہ خوبی ہے۔ کہ اسکی پرانی مذہبی تعمیر کا بہت سا حصہ ابتک باقی ہے۔ یہ تعمیر کسی زمانہ میں طبقہ "بنیڈکٹائن" کی تارک الدنیا عورتوں کے رہنے کی جگہ تھی۔ مگر لاٹ پادری نے ان عورتوں کی بداطواری کے حالات معلوم کرکے اُن کو اس سے نکال دیا۔ اور اسی مکان میں ایک کالج قائم کیا۔ اور اسے "یسوع" کے کالج کے نام سے موسوم کیا۔ اسی لئے طرز تعمیر میں یہ کالج سب کالجوں سے جدا ہے۔ اور مذہبی رنگ اس کی تعمیر میں بہت غالب ہے۔

سب کالجوں کی تعمیرات اور ان کے بانیوں کے شوق علم و ہمت کے تفصیلی حالات لکھنے کے لئے تو ایک مستقل کتاب چاہئے۔ محض نمونہ کے طور پر ایک کالج کا حال کسی قدر مفصل اور دو چار کا مجمل طور پر لکھدیا گیا ہے۔

لیکن یہ کالج اور ان کی قدیم و جدید عمارتیں آخر کیا ہیں۔ ایک ڈھانچ ہیں۔ ایک کالبد بے جان۔ کیمبرج کی جان وہاں کے طلبہ ہیں۔ جب "ٹرم" کا وقت نہیں ہوتا اور طالب علم اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ تو کیمبرج بالکل ویران معلوم ہوتا ہے۔ اور اسکے گلی کوچوں میں سکوت کا عالم ہوتا ہے۔ ایک دفعہ مجھے وہاں تعطیل کے دنوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مگر کیمبرج وہ کیمبرج ہی نہ تھا۔ جسے

میں "ڈرم" کے زمانہ میں دیکھ چکا تھا۔ ہاں یہ قول بہت مشہور ہے کہ کیمبرج کو دیکھنا ایسے وقت جب طلبہ غیر حاضر ہوں ایسا ہی ہے جیسے "ہیملٹ"[۵] کا کھیل دیکھنا جب ہیملٹ ہی موجود نہ ہو۔ طالب علموں کی زندگی ایک انداز خاص رکھتی ہے جو یقیناً دلاویز ہے۔ اول تو رنگ تکلف سے وہ بالکل آزاد ہے۔ ایک دوست دوسرے دوست کے ہاں جاتا ہے تو نہ ہاتھ ملاتا ہے نہ مزاج پرسی کرتا ہے۔ روزمرہ کی ملاقات ٹھہری اپنا آسان طریق اختیار کر لیا ہے۔ اسی طرح لباس میں اب رفتہ رفتہ ٹوپی کو استعفا دیتے جاتے ہیں۔ موسم گرما میں کیمبرج کی گلیوں میں جوق جوق طالبعلم ننگے سر پھرتے نظر آتے ہیں۔ "فراک کوٹ" جو انگلستان میں تکلف کا لباس سمجھا جاتا ہے اور جسے لندن میں قریب قریب ہر معزز آدمی پہنتا ہے۔ کیمبرج میں نہیں پوچھا جاتا۔ طالب علم کیا اور استاد کیا سب اس سے بری ہیں۔ اسی کے ساتھ اُس اونچی چمکیلی سیاہ ٹوپی سے جسے "ٹوپ ہیٹ" کہتے ہیں کیمبرج والوں کو نجات ہے۔ بلکہ اگر کوئی اسے وہاں پہنے تو اسکی ہنسی اُڑاتے ہیں۔ اس خیال سے کہ طالب علموں کو اپنی عادات سپاہیانہ رکھنی چاہییں۔ یہ رواج وہاں پیدا ہوا ہے کہ طلبہ چھتری نہ لگائیں۔ چنانچہ بارش کے وقت بھی طلبہ دوڑتے ادھر سے ادھر چلے جاتے ہیں۔ اور چھتری نہیں استعمال کرتے۔

صبح کا وقت تو ان سب کا سبقوں کی تیاری میں گذرتا ہے اور دوپہر کا وقت

---

۵ شکسپیر کا مشہور و معروف ناٹک جس کا اُردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔ ملک ڈنمارک کا شاہزادہ ہملٹ نامی اس ناٹک کی روح رواں ہے۔ شاہ ڈنمارک کو اسکی ملکہ نے بادشاہ کے بھائی کی سازش سے زہر دیدیا تھا۔ ہملٹ اسوقت بچہ ہی تھا۔ جب جوان ہوا اور اسے اپنی ماں کی بیوفائی اور چچا کی غداری کا حال معلوم ہوا تو اُسنے انتقام کا ارادہ کیا۔ شکسپیر نے اس دلچسپ قصہ کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے اور تمام کتاب میں ہملٹ کے کیرکٹر کو بہت بڑھا کر لکھا ہے۔ اسی لئے اس کتاب میں سب سے ضروری کیرکٹر وہی سمجھا جاتا ہے،

اساتذہ کے لکچر سنتے ہیں۔ مگر دوپہر کے بعد سے کھیل کود اور تفریح کا وقت شمار ہوتا ہے
طالب علم اپنی اپنی جماعتوں سے فارغ ہوتے ہی اپنی اپنی مرغوب ورزشوں کا سامان
لے کر نکل پڑتے ہیں۔ کوئی کرکٹ کو جا رہا ہے۔ کوئی فٹ بال کو۔ کسی نے ہاکی
کی تیاری کی ہے تو کوئی "ٹینس" کی راہ لیتا ہے۔ بیشتر دریا کی طرف جاتے ہیں۔
ہر کالج کی اپنی اپنی کشتیاں ہیں اور اس کالج کے طالب علم دو دو چار چار مل کر دریا پر
کشتیاں چلاتے ہیں۔ سب اپنے اپنے کالج کے رنگ کی وردیاں پہنے ہوئے
ہوتے ہیں۔ اور ان وردی پوشوں کی کثیر تعداد جب کشتیوں میں جا رہی ہو۔ تو کنار دریا
سے بہت خوشنما نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ دو گھنٹے میں ہوا خوری اور ورزش سے
فارغ ہو کر اپنے اپنے کمروں پر واپس آتے ہیں۔ یہ وقت میل ملاپ کا ہے۔ کیا
بتقاضائے سن اور کیا بہ مقتضائے رواج سوشل میل جول کی طرف یہاں سب
مائل ہیں۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ کوئی طالب علم چار پانچ بجے اپنے کمرے پر اکیلا چار پی
رہا ہو۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ چار چار پانچ پانچ کسی ایک دوست کے کمرے پر جمع ہو کر
چار پیتے ہیں۔ اور اسی طرح ہر شخص اپنی اپنی باری سے دوسروں کو چار وغیرہ کی
دعوت دیتا ہے۔ اُسوقت کی گفتگو ہر طبقے میں اس طبقے کے مذاق کے موافق
ہوتی ہے۔ جہاں ورزش اور کھیل کود کے شائق زیادہ جمع ہیں وہاں اس صیغے
کے واقعات روزمرہ پر گفتگو رہتی ہے۔ لیکن جہاں زیادہ علم دوست طالب علم جمع
ہوتے ہیں۔ وہاں اچھے اچھے علمی۔ تمدنی اور سیاسی مباحث درمیان آتے ہیں
اور اُن پر لطیف گفتگوئیں ہوتی ہیں۔ اور اسی قسم کے طلبہ کے دم سے کیمبرج کی
شہرت قائم ہے۔ شام ہوئی اور طالب علموں نے گون اور کیپ سنبھال کر اپنے
اپنے کالج کے ہال کا راستہ لیا۔ وہاں اپنے ہم مکتبوں کے ساتھ مل کر ایک میز پر
کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد دس گیارہ بجے تک پڑھنے والے طالب علم پھر اپنی

کتابوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اور اسکے بعد سو جاتے ہیں۔ خصوصاً وہ طالب علم جو کالجوں کے کمروں میں رہتے ہیں مجبور ہیں کہ دس گیارہ بجے سو جائیں۔ کیونکہ اول تو جن گھروں میں انہیں رہنے کی اجازت ہے اُن کی نسبت یونیورسٹی کا حکم ہے کہ دس بجے کے بعد ان کے دروازے بند ہو جائیں۔ اور دروازہ بند ہونے پر کسی شخص کو اندر آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اسلئے اُن کے دوست دس بجے کے بعد ان کے ہاں نہیں آسکتے اور وہ اکیلے بیٹھے جب پڑھنے سے فارغ ہوئے سو جاتے ہیں۔ علاوہ اسکے اگر ایک گھر میں دو تین طالب علم ہوں اور وہ مل کر رت جگا کرنے کی ٹھہرائیں۔ تو گھر کے دوسرے رہنے والے انہیں روکیں گے۔ کیونکہ اُن کی نیند میں خلل پڑتا ہے۔ مگر وہ طالب علم جو کالجوں کے کمروں میں رہتے ہیں کبھی کبھی رات کو دیر تک جاگتے رہتے ہیں۔ اگر کبھی اتفاق سے چند مل کر ایک جگہ اکٹھے ہو گئے تو شام ہی سے دھما چوکڑی رہتی ہے۔ ورنہ یہ ہوتا ہے کہ گیارہ بجے کے قریب پاس پاس کے کمروں والے چند طالب علم اپنی کتابوں سے فارغ ہو چکتے ہیں تو کسی ایک کے کمرے میں ہو بیٹھے۔ اور وہاں گنجفہ شروع ہو گیا۔ اور اسی میں صبح کے قریب تک وقت کٹ گیا۔ بار یا قہوہ خود ہی اپنے کمرے میں "سپرٹ لیمپ" سے تیار کر لیتے ہیں اور بسکٹ کھاتے اور قہوہ پیتے رہتے ہیں۔ زیادہ امیر یا شوقین ہوئے تو شراب کی بوتل کھول لی۔ اور ساتھ ساتھ اسکا شغل کرتے رہے۔

کیمبرج اور اکسفورڈ کے طالب علم اگر اپنی معقولیت کا ثبوت دینا چاہیں تو معقول بھی اعلےٰ درجے کے ہیں۔ لیکن اگر کبھی آمادہ شرارت ہوں تو شرارتوں کے بھی ایسے موجد ہیں کہ دنیا میں کہیں ایسے نہ ہونگے۔ اگر اُن کی معقولیت کا نقشہ دیکھنا منظور ہو تو کسی ایسے دن انہیں دیکھنا چاہئے جب اُن کی "یونین" میں کوئی عمدہ مباحثہ پیش ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ مدبروں کی پارلیمنٹ ہے۔ جو سمجھتی ہے کہ مضمون زیر بحث

پر جو رائے قرار پائے گی - اُس قرار داد پر ملک کی ہستی اور نیستی کا مدار ہے - مسئلہ
کے موافق اور مخالف جماعتیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہیں - سکرٹری اور
پریزیڈنٹ اور وائس پریزیڈنٹ جو ہمیشہ ممتاز طالب علم ہوتے ہیں اور طلبہ کے انتخاب
سے مقرر ہوتے ہیں - نہایت وقار اور شان سے اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھتے ہیں اور
نہایت رعب کے ساتھ جلسے کی کارروائی کو باقاعدہ رکھتے ہیں - کوئی صاحب تقریر
میں اگر اپنی حد سے متجاوز ہوئے تو پریزیڈنٹ فوراً ٹوک دیتا ہے اور وہ اسکے فیصلے
کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں - ہر شخص اپنے فرائض کی پابندی کرتا ہے -
اور بحث عموماً بہت خوش اسلوبی سے ختم ہوتی ہے - باہر سے معززین مباحثہ سننے
آتے ہیں - انہیں نہایت احترام کے ساتھ گیلری میں بٹھایا جاتا ہے - اور وہ ان
کی کارگذاری سے اطمینان حاصل کرتے ہیں - لیکن انہی طلبہ کو کبھی آپ دیکھیں
جب ان پر جوانی کا جن سوار ہو - اسوقت عجب شرارتیں کرتے ہیں - کیمبرج کے
رہنے والے ان کی شوخیوں سے پناہ مانگتے اور خائف رہتے ہیں اور اساتذہ تک
کو کئی دفعہ اغماض سے کام لینا پڑتا ہے - جو شرارتیں کبھی کبھی ایجاد ہوتی ہیں انکا
ایک قابلِ ذکر نمونہ میرے قیام انگلستان کے زمانے میں نظر آیا تھا چند طالبعلموں
کو یہ شرارت سوجھی کہ لندن سے کیمبرج میں جھوٹے موٹ تار دیدیا - کہ سلطان زنجبار
یونیورسٹی دیکھنے کو آتے ہیں - جلدی جلدی ان کے استقبال کا انتظام کیا گیا
یہ لڑکے بھیس بدل کر اور اپنے چہروں کو نہایت احتیاط سے سیاہ رنگ کر ایسے کامیاب
بہروپئے نکلے کہ کیمبرج آئے - کالجوں میں پھرے اور واپس چلے گئے اور کوئی
نہ پہچان سکا کہ سلطان زنجبار نہ تھے - بلکہ چند انگریز طلبہ نے روپ بھرا تھا - بعد کو جب
یہ معلوم ہوا کہ سلطان زنجبار اُس دن لندن سے باہر نہیں گئے تو یونیورسٹی کے افسر
بہت جھینپے کہ طالب علموں نے انہیں خوب بنایا - اور طرفہ یہ ہوا کہ کچھ پتہ نہ چل سکا -

کہ وہ طالب علم کون تھے۔ لیکن ان خاص شرارتوں کے سوا جو کبھی کبھی اختراع کی جاتی ہیں۔ بعض عام شرارتیں ہیں جو کیمبرج کے طلبہ نسلاً بعد نسلٍ کرتے آتے ہیں۔ اور ختم نہیں ہوتیں۔ اُن کی مثال ہے کہ نئے طالب علموں سے دل لگی اور نہیں تو کسی نئے کو لیکر کپڑوں سمیت نہلا ہی دیا۔ اور دوڑ گئے۔ یہ نئے چند دنوں میں پرانے ہو جاتے ہیں۔ وہ اوروں سے بدلا لیتے ہیں۔ مدت سے اسی طرح چلی آئی ہے اور شاید جب تک فطرتِ انسانی ایسی ہے۔ اسی طرح چلی جاے گی۔ طلبہ کی اس قسم کی شرارتیں ضرب المثل ہو گئی ہیں۔ اور کیمبرج میں جو تصاویر مناظر اور عمارات کی بکتی ہیں۔ اُن کے ساتھ وہاں کی زندگی کے شرارت آمیز پہلو کی تصویریں بھی دکانوں پر موجود رہتی ہیں۔ نوجوان لڑکے شرارتیں تو دنیا بھر میں کرتے ہیں۔ مگر کیمبرج والوں کی شرارتوں میں یہ امتیاز ہے۔ کہ اکثر اُنکی شرارتیں وہیں ختم ہو جاتی ہیں اور وہاں سے نکلتے ہیں تو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس لیکر نکلتے ہیں۔ اور عموماً کارآمد اور کامیاب آدمی ثابت ہوتے ہیں۔ اور ان میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو اپنا سارا وقت حصول علم میں صرف کرتے ہیں اور علوم کے آب صافی کے اُس سرچشمے سے جو وہاں صدیوں کی کوشش سے لب تشنگانِ علم کے لئے مہیا ہو گیا ہے۔ پوری طرح شادکام اور سیراب ہو کر اس کا فیض دور دور تک لیجاتے ہیں

عبدالقادر

برق عشق کہ مرا بر دل و بر تن زدہ بود — این ہمان است کہ بر وادیِ ایمن زدہ بود
تا قدم رنجہ نمائی بہ تماشاے چمن — ابر بہر تو سراپردہ بہ گلشن زدہ بود
روزگارے شد و آن نشۂ ہنوزم بسر است — یک دو ساغر بہ من آن دلبرِ پرفن زدہ بود
دیدی اے دوست کہ تا دامن ایمان برسید — عشق آن چاک کہ در جامۂ دامن زدہ بود
ہر زمان باز سرے تازہ برون داد چو شمع — ہر کرا تیغ غم عشق تو گردن زدہ بود
شبلی امروز بہ سجادۂ تقویٰ بنشست — آن کہ صد سال رہ شیخ و برہمن زدہ بود

شبلی نعمانی

دھوکا

یادش بخیر! میں ایک ایسے چمن کی سیر کیا کرتا تھا جسمیں ہر سانس تازہ بہار لاتا تھا اور ہر ہوا کا جھونکا عیشِ جاودانی کا ہلکا سرور۔ انقلاب تبدل۔ دن رات ثوابت وسیارا اِن چیزوں کا میں نے کبھی نام بھی نہیں سُنا تھا۔ میں اپنی نیند سوتا اور اپنی نیند اُٹھتا بلکہ یہ کہدینا بیجا نہیں کہ پرندوں کے پیارے بول سنتے سنتے میری آنکھیں بند ہو جاتی تھیں اور کلیوں کے چٹکنے کی آواز مجھے جگا دیتی تھی۔ میں ان پڑھ تھا بھولا تھا۔ گیگلا تھا۔ سیدھا سیدھا وہ رکھتا تھا اور ایک وقت سے دوسرے وقت تک جسکو میں اپنے دل کی بھول سمجھتا ہوں کسی بڑے چمکیلے حجاب میں رہا کرتا تھا۔ ہائے میں نور کے دریاؤں میں غرق تھا میں بنانے والے کے ظہور میں پنہاں تھا میں کسی کے جلوؤں میں چھپ جایا کرتا تھا اور واقعی اُس وقت مجھے کسی ہست وبود کی پروا نہیں تھی۔ جس چیز سے میں سب کچھ دیکھتا تھا وہی سب بے معلوم تیر (نظر) نشانے پر پڑکر میرے دل میں یہ بھی پرو دیتا تھا کہ دیکھنے کے بعد کبھی کوئی شے اَن دیکھی نہیں ہو سکتی، مزے کر چین اُڑا۔ یہ باغ یہ بہار۔ یہ شادمانی ہمیشہ تیرے ہی لئے ہے اور تو ہی ایک اکیلا وہ خوش نصیب ہے جسکے لئے واضع نے اسے وضع کیا ہے۔ پھر بھلا ایسی شے پاکر میں آپے میں رہ سکتا تھا۔ سرور سے نشا۔ نشے سے بدمست ہوکر آخر بالکل ہی اندھا ہو گیا۔ خوشیاں مجھپر چھا گئیں بدمستیاں مجھپر ٹوٹ پڑیں اور میں اپنے رنگ میں رنگا ہوا اتراتا پھرنے لگا۔ اب بھلا

مجھ سا راجہ کون ؟ ڈالی ڈالی پتہ پتہ چھان مارا ۔ جس بیل سے چاہا لپٹ گیا ۔ جس سرو کو چاہا گلے لگا لیا ، جس پھول پر طبیعت آئی تڑاق سے موںھ چوم لیا ۔ جہاں چاہا بیٹھ گیا اور جس وقت موج آئی پھر لالہ و گل روندنے شروع کر دیئے ۔ ہاں خوب یاد آیا ! وہاں جب میں سبز مخمل (سبزہ) پر لیٹتا تھا تو اک چاندی کے ہنسرے جیسی چمکتی ہوئی لمبی لہکاری مگر بل کھاتی ہوئی پٹی (نہر) میرے قدموں میں بہا کرتی تھی ۔ جسمیں چھوٹے چھوٹے حباب نور کی ٹوپیاں پہنے لہروں کا تکیہ لگائے ۔ میٹھی نیند سوتے تیرتے چلے جاتے تھے ۔ سنگریزے وہاں کے لعل و مروارید ۔ ذرے اُس زمین کے آنکھوں کو روشنی دینے والے ۔ اور بیچوں بیچ میں اک خوشگوار چشمہ یا حوض تھا جس کا پانی شاید برف کی چادریں چھن کر ہر وقت چھلکا کرتا تھا ۔ خواہش کسے کہتے ہیں ۔ فکر و ضرورت کا لفظ کس فرہنگ میں ہے اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں تھا ۔ میرا مایۂ زیست اسی حوض کا شیریں اور تسکین بخش عرق تھا ۔ جسے میں جب جی چاہتا پی لیتا تھا ۔ وہ میوے جنکی خوشبو دو تیں کے بیماروں کی تسکین کا باعث ہو ۔ میرے ارادے سے مجھ تک پہونچتے تھے ۔ ڈالیاں بڑھتی تھیں ۔ پھل ٹوٹتے تھے اور میری گود میں آپڑتے تھے ۔ میں کافر تھا یا مشرک ۔ عیسائی تھا یا محمدیؐ ، مجھے اس کی کچھ خبر نہیں ۔ لیکن ہاں اک بتائے ہوئے رستے پر چلتا تھا اور ایسے پہاڑوں میں چلتا تھا کہ وہاں کی زمین گویا میرے پاؤں کو لگی ہوئی تھی کہ جس وقت روپ کی لی اور حضور کے سامنے ۔

آہ اُس دائمی عیش ، آزادانہ مشاغل اور ایسے گلابی موسم میں اچانک مجھے اپنے اکیلے پن کا خیال آ گیا ۔ خیال آتے ہی میں گھبرایا اور اک ہم جنس کی تمنا بھی کر بیٹھا اور بس یہیں مجھ کمبخت نے سب سے پہلا دہوکا کھایا ۔ ہاں ! یہ تو کہنا میں بھول

ہی گیا۔ حضور یا وہ ہزار ہزار نور بھرا حجاب۔ جسکے سامنے کبھی میری آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی اور جسکے دامن میں لپٹ لپٹ کر میں اُس صاحبِ حجاب کی بزرگی اور طاقت کی اپنی زبان میں تعریف کیا کرتا تھا۔ اسمیں سے اکثر کسی کے بولنے کی آواز بھی آتی تھی اور وہی اک دوسراہٹ تھی جو اِس تنہائی میں میری وحشتوں کو کم کیا کرتی تھی۔ وہ آواز نہایت رحم بھری۔ بہت ہی شیریں اور دلکش ہوتی تھی اور اسی لئے میں اکثر اپنے حضور کے سامنے حاضر رہنے کا عادی تھا۔ مجھے کیلی کا کھٹکا بھی نہ تھا۔ مگر میں نے دھوکا کھایا۔ ہائے افسوس! یہ ہی وہ پہلی خواہش تھی جو مجھ بد نصیب نے سب سے پہلی دفعہ ظاہر کی۔ یہی پہلا نقصان تھا جو مینے اُس بنکری۔ بادشاہت اور سچی خوشی بھری زندگی میں بیٹھے بٹھائے اپنے ہاتھوں مول لیا۔ مینے نہایت بے وفا بنکر ایک سے دوسرے کی خواہش ظاہر کی۔ اس آواز کو قبولیت تو حاصل ہوگئی مگر منظور کرنے والے نے کچھ اس لہجے میں منظوری دی کہ ایک تکلیف دہ نمی میرے ماتھے پر پیدا ہوگئی اور یہ گویا پہلی ندامت کا پسینہ تھا۔ مجھے سرکار کے لفظ اس قدر کھٹکے۔ مجھپر اسدرجہ غیر معمولی اثر ہوا کہ میرا دل بَہل سا گیا میرے زبردست اعضا جو فولاد سے بھی زیادہ سخت تھے بید کی طرح خوف کے مارے کانپنے لگے۔ ابھی میں اس حرکت سے بہت کچھ پشیمان ہوتا جو ایکا ایکی مجھپر ایک غنودگی سی چھائی اور میں اِک بڑے درخت کے نیچے گرکر بیہوش تھا۔ اُستاد مرحوم ؎

گر پڑا ہوں نگہ مست سے چکر کھا کر
ساقیا پہلے اوٹھا تو مجھے پیمانہ سے

لیکن یہ بیہوشی تھوڑی دیر کے بعد عالمِ بیداری تھا۔ اب جو آنکھ کُھلتی ہے تو ہراس و بے چینی کا تو نشان بھی نہیں مگر ہاں ایک ہلکا سا زخم میری بائیں پسلی میں

تازہ پیدا ہوا نظر آتا ہے۔ میں اُسے دیکھ بھال کر اُٹھنا ہی چاہتا تھا جو دفعتاً
میرے پہلو میں ایک نئی پُتلی پیدا ہوئی اور دوبارہ خوف کی صورتیں میرے حواسوں
پر حاکم تھیں۔ میں پھر ڈرا۔ گھبرایا اور اُس کے پاس سے اُٹھکر کھڑا ہوا۔ وہ بھی
جھجک کر میرے پاس سے دور چلی گئی اور پھر دور سے دونوں ایک دوسرے
کو حیرت سے تکنے لگے۔ کچھ دیر بعد جب مینے غور کیا تو اُس شکل کے بھی میرے
ہی سے ہاتھ پاؤں۔ میری ہی سی شکل وشباہت اور میرا ہی سا حجاب اُسے بھی
گھیرے تھا۔ خدا خدا کر کے میری وحشت کم ہوئی۔ اوسکو بھی سکون ہوا۔ اور پھر
مینے اک دفعہ اور توجہ سے اُس صورت کو دیکھا۔ ابکے وہ چہرہ مجھے بہت ہی بھایا
دلمیں اک غیر معمولی حرکت سی پیدا ہوئی اور مجھے بے ساختہ اُس پتلی پر پیار آنے لگا
میں جرات کر کے اوسکی طرف بڑھا اور پھر بڑھا یہانتک کہ ہم دونوں قریب تھے۔ خدا
کی شان اب ہم ایک سے دو ہوگئے۔ جہاں کی لے لگنی۔ جدہر کی لہر آتی
ہنستے کھیلتے نکل جاتے۔ میری خوبصورت پتلی میرے ساتھ ہوتی جہاں میں
جاتا اور جدہر میرا قصد ہوتا وہیں اُسکا نازک سا یہ بھی بجلیاں گراتا۔ اللہ اللہ! لوگو! میں
اُس وقت کی خوشی کو کس طرح بیان کروں جو مجھے اپنے ہم جنس کے ساتھ ساتھ
ہر وقت رہنے میں پیدا ہوگئی تھی۔ واقعی میں اپنی پہلی زندگی کو اُسکے مقابلے میں
بالکل ہیچ اور اکارت جانتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس للک میں اپنے آپ کو ایسا بھولا کہ
ایک سے دو سمجھنے لگا۔ دوئی اور پیدا کی پھر اُسکی لے بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھی
کہ میں اپنی پتلی ہی کا دیوانہ ہوگیا۔ اُف! باغ کی بہار مجھے اُسی کے دم سے تھی
نہر کا لطف مجھے اُسی کے ساتھ گلگشت میں ملتا تھا۔ حوض کا چھلکنا۔ میں اُسی
کی آنکھ سے دیکھتا تھا۔ غرض کمبخت سودائی آخر اس نشے میں اتنا بہکا اور یہانتک
چور ہوا کہ بارگاہِ حضور میں حاضری کے نمبر بھی گھٹانے شروع کر دیئے۔ وہ تو

میری پتلی کو وہاں خود روزانہ جانا پڑتا تھا جس کے طفیل میں میں بھی جا کھڑا ہوتا تھا ورنہ پھلی ہی خواہش پر صفر تھا، افسوس! صد افسوس - ہائے رے میری بھول خیریوں بھی اک زمانہ گذر گیا - اور اس عرصے میں ہم دونوں بڑے چین سے تھے بڑے مزے سے گذرتی تھی - لمبی بیلوں پر جھولوں میں جھولتے - نہر میں چھینٹے اڑاتے - حوض پر کھیلتے - میوے سونگتے - مخملوں پر لوٹتے - اور کبھی کبھی جوش مسرت میں ایک دوسرے کا موںھ چوم چوم لیتے - گو ہم بہت کم بولتے تھے مگر اظہار خیالات کے لئے ہم نے اکثر اشارے قایم کر لئے تھے اسلئے کبھی حضور انور کی قدرتوں - اپنے حجاب کی حالتوں - باغ کی رہایش اور اُسکی تمام اَن گنت نعمتوں پر ضرور کچھ نہ کچھ کہہ سن لیا کرتے تھے - میری پتلی کے دل خیالات خواہ کچھ ہی ہوں مگر میں تو اپنی کہتا ہوں، میں تو اُس زمانے کو آجتک نہیں بھولا - ہائے اُس سے بہتر دور تو میری زندگی کا نہ کبھی شروع ہوا ہے نہ ہو گا - آخر میری نظر بھر مجھے لگی اک نیا ہچکولہ کھایا کشتی عمر پھر ڈگمگائی اور پھر اک طوفان عظیم تقدیر میں تھا - وہ یہ کہ ایک دن بے خبر پڑا سو رہا تھا جو میری پتلی دوڑی دوڑی آئی اور مجھے ایک سیب کی خوشبو سنگھا کر جگا دیا - میں آنکھیں ملتا اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ہنستا چہرہ مجھے سیر کے لئے چلنے کو اشارہ کر رہا ہے میں فوراً اٹھا اور اُسکے ساتھ ہو لیا - کچھ دور جا کر وہ مجھسے اُنہیں الفاظ میں جو ہم دونوں نے اپنا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے گڑھ لئے تھے اس بات کا ارادہ کرنے لگی کہ آج میںنے ایک نازک اور نیا درخت دیکھا ہے - چلو اُسکا پھل کھائیں - میں کمبخت پریم کے نشے میں چور - محبت کا دیوانہ ہوا و ہوس کا بندہ عقل و ہوش تو پہلے ہی نذر کر چکا تھا بے سوچے سمجھے راضی ہو گیا اور اُس زہر کے بیج کو زہر مار کر لیا - جسکے کھانے کو میرے حضور نے مجھے سختی کیساتھ منع کر دیا تھا - ہائے میری بدبختی اُن تھوڑے سے دانوں کا جو ہم دونوں نے ملکر کھائے

اور اک زبردست بھکانے والے ملعون کے اغوا سے کھلائے گئے، حلق سے اُترنا تھا کہ فوراً ہی دل و دماغ میں ایک نئی شورش پیدا ہو گئی بار بار چھینکیں آنے لگیں۔ باغ کی فضا بدلنی شروع ہوئی تند و تیز ہوائیں چلیں غبار بلند ہوئے اور آناً فاناً میں ہم قہر حضوری میں گھر چکے تھے۔ اُف اُف اُس وقت مرے جسم پر بہت سی نوکیں (رونگٹے) کھڑی ہو گئیں۔ میرا نورانی لباس گر پڑا۔ اور ہائے افسوس میں بے حجاب ننگا رہ گیا۔ ہکا بکا ہو کر ابھی اپنے چوطرف تغیرات کو دیکھ ہی رہا تھا جو میرے قدم وہاں کی زمین نے پکڑ لئے۔ میں بُت ہو کر رہ گیا اور اسی بدحواسی کے عالم میں میری بلی مجھسے دور دُبک کر لپٹنے ہی کو تھی جو کسی زبردست طاقت نے اُسے فوراً مجھسے جدا کر دیا اور اک ہولناک آواز ان الفاظ کو ادا کرتی سنائی دی۔ کہ "او بھولے انسان! آخر تو نے دوسرا دھوکا کھایا، او کافر نعمت! تو ان دلچسپیوں اور فارغ البالی سے بھی خوش نرہ سکا ہمنے تجھے صرف ایک پھل کے کھانے سے روکا تھا مگر تو نے ہمارا حکم نہ مانا۔ اچھا جا دور ہو یہاں سے، اب تو اس باغ اور دائمی خوشی میں رہنے کے قابل نہیں رہا۔ تو خواہشوں کا بندہ ہے اور ہمنے آیندہ کے لئے خواہشوں ہی کا تیری زندگی پر جال ڈالدیا۔ جا تیرا نورانی لباس بھی تجھسے چھین لیا گیا جا۔ جا اپنی اُسی ہم جنس کی تلاش کر جسکی تو نے ہمسے خواہش کی اور جس کو تو نے نہایت بے وفائی سے ہماری یاد میں شریک کر لیا۔

اب جو جاگا ہوا تو نہ وہ باغ ہے نہ بہار۔ نہ نشا ہے نہ اُسکا خمار۔ نہ مونس ہے نہ غمگسار۔ نہ وہ نورانی حجاب ہے اور نہ وہ دھیمی روشنی بلکہ اُسکے بدلے اک بڑا شعلہ (سورج) میرے سر پر دہر دہر جل رہا ہے جسکی تمازت سے میرے ننگے زردے اور اچھوتے بدن پر قریب ہے کہ آبلے پڑ جائیں۔ جنگل بیابان۔ سخت پتھر سی زمین گرم ہوائیں۔ چوپاؤں کا غول آس پاس۔ نہ چشمہ نہ نہر نہ میوے۔ فولاد کا اک بڑا

اونچا ڈھیر (پہاڑ) سر ٹکرانے کو۔ کف افسوس ملنے کو۔ ہونٹ چبانے کو اور لق و دق میدان کی خاک اُڑانے کو موجود تھی۔

پہلے تو مجھے شرم دامنگیر ہوئی اسلئے کہ میں بالکل برہنہ تھا میں نے جلدی سے دوڑ کر درختوں کے پتے نوچ نوچ کھسوٹے۔ شاخوں کی رسیاں بٹیں۔ اور کسی نہ کسی طرح سب سے پہلے اپنا ستر ڈھانکا۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا اور میری تِتلی مجھے نہ دکھائی دی۔ میرے باغ کی ہوا بھی مجھ تک نہ آئی تو آخر میرے حواس جاتے رہے اور میں کوہ و بیابان میں نعرے کرتا۔ سر ٹکراتا آنکھوں سے دریا بہاتا ہائے حضور ہائے حضور کی صدائیں لگاتا، سر بصحرا ہوا۔ یہانتک کہ اس مبتلائے فراق کو اسی طرح صدیاں گذارنی پڑیں۔ سالہا سال پاپڑ بیلے۔ دل کے دھووں سے آسمان بنائے۔ آنکھوں سے لاکھ لاکھ طوفان اُٹھائے۔ ہزاروں برس نماک چھانی، مدتوں ناک رگڑی، توبہ استغفار کرتے کرتے زبان گھس گئی، ہونٹ سن ہو گئے اور تو کون سنتا آخر اُسی کریم و رحیم نے سُنا، خطا معاف ہوئی۔ میری تِتلی مجھے پھر ایک دفعہ ملی اور پھر تو اُس کا ایسا فضل شامل حال ہوا کہ میرے تو گھر بس گئے۔

یہ زمانہ بھی صدیوں چھوڑ قرنوں رہا، لیکن اسکے بعد میں اک ایسے دور میں پہونچا جہاں کا زمین و آسمان ہی نرالا تھا۔ حرص و ہوا کے بندے یہاں رہتے تھے، جعل فریب یہاں کے حاکم تھے۔ لوٹ مار تھی۔ آپا دھاپی تھی، دھوکا دھڑی تھی، اور جس طرف نظر جاتی تھی دنیا تھی بلکہ بائیسکوپ کی تصویریں تھیں جو ایک وقت میں سب کی سب متحرک نظر آتی تھیں۔ اب میں مہذب مانا جاتا تھا، اب مجھکو تکلفات سے دلچسپی تھی، اب میں کھانے، پینے، پہننے، کھیل، تماشے، سونے اور کام کرنے کے لئے وقت بنا چکا تھا۔ میں اپنے آپ کو بڑا بھاری عقلمند سمجھتا تھا،

میں ہو جد کی کاریگری میں بھی میں سیکھ نکالنے کو تیار تھا، میں بال کی کھال پیدا کرنے کو آندھی تھا۔ میں گھنٹوں تقریروں کے پُل باندھ دیتا تھا، میں غرض اعضا کی بناوٹ اور حرکت سے نیا فائدہ اُٹھا کر اپنے الفاظ کو دوسروں کے دلوں میں نقش کر سکتا تھا۔ میں بادشاہ تھا۔ فقیر تھا۔ ولی تھا۔ انجنیر تھا۔ مورخ تھا۔ ڈاکٹر تھا۔ بیرسٹر تھا۔ چور تھا۔ اُٹھائی گیرا تھا۔ مہاجن تھا۔ سیٹھ تھا۔ غرض دنیوی معاملات جس قدر ترقی کر گئے تھے میں سب میں اُستاد کامل تھا یا یوں سمجھئے کہ یہ سب میرے بھروپ تھے اور میں ہر رنگ میں اپنے آپ کو قابل ثابت کرنے کی دُھن میں تھا۔ آسمانوں کی خبر بیان کرنی۔ زمینوں کی پیداوار جانچنی۔ پانیوں کو روک دینا۔ کاٹ دینا۔ ہواؤں کے رُخ بدلنے۔ بارش، برق و باد کو قبضے میں کرنا بیجان سواریاں۔ جان داروں سے زیادہ دوڑانی۔ ایک بات کو کچھ سانس کے بعد دوسرے جہان میں پھونچا دینا۔ دولت۔ علم۔ سیاست۔ حکم۔ اقبال و جاہ و جلال، غرض ہر صفت میں ترقی کر گیا۔ ایجاد میں نے کئے اختراع میں نے ثابت کر دکھائے۔ ناممکنات کو میں ممکن کہنے لگا۔ یہانتک کہ میرے کارنامے اگر پہلے زمانے والے دیکھتے تو اعجاز مانتے اعجاز۔ مگر افسوس باایںہمہ میں اسقدر بھولا تھا کہ صدہا دہوکے کھاتا اور مجھے اپنی کمزوری کا ذرا خیال نہ آتا تھا۔ میں پھر بنا اور پھر بنا۔ چلنے پھرنے لگا۔ بڑا ہوا باتیں کرنی سیکھی۔ لیکن یہ بھی محض دہوکا۔ کیونکہ بننا مٹنے کے لئے ہے۔ چلنا پھرنا۔ حرکت ختم ہوتے ہی ساکت ہو جانے کا نشان تھا۔ اور باتیں کرنی حقیقت میں خاموشی تک پہونچانے والی تھیں۔ شادی ہوئی۔ بیاہ رچا۔ ماں۔ باپ۔ عزیز و اقارب جو مجھپر جان چھڑکتے تھے۔ بیوی جو میری زندہ پرستار کہلاتی تھی مگر افسوس تجربے نے بعد مدت یہ بتا دیا کہ یہ سب دہوکے بازار میں دہوکا کھانے والا۔ اک خوشی کے بعد دوسرا رنج اور ایک رنج کے بعد

خوشی کا لازمی دورہ تھا۔ یہاں کے جتنے سامان تھے سب ظاہری تھے اور تعلقات سب کچے دہاگے۔ میری ظاہری شان و شوکت کچھ بھی نہ تھی میں چلتا تھا تو اک گندگی کا گھڑا لیے کر چلتا تھا کہ جسکے ٹوٹنے کا قدم قدم پر خیال تھا۔

ہائے یوں بھی اک عمر کٹ گئی۔ اور جہانتک غور کیا ہر ظاہری چیز کا باطن کچھ اور تھا۔ دہوکا! دہوکا محض دہوکا۔ یہانتک میں کمزور ہوگیا۔ مرضوں نے مجھپر حملہ کیا بچپن نے جوانی اور جوانی نے بڑہاپے کے سپرد کرکے موت سے بچا نہ لیا۔ بیماریاں بڑہیں اور بلا کی طرح لپٹ گئیں اور آخر مجھے تصویر ہیجان کیطرح نہالی پر ڈالدیا۔ ہائے اُس کرب میں جو مجھے اُٹھانا پڑا اسکا میرے سوا کوئی شریک نہوا۔ ماں باپ بھائی دوست احباب ایار وعزیز اولاد سب تندرستی تک تھے۔ دکھوں میں میرے ایک بھی کام نہ آیا بلکہ میری پیاری بیوی تک اُس سے الگ تھی۔ گویا وہ سارا پیار اخلاص و مروّت نرا دہوکا ہی دہوکا تھا۔ ہائے میں دکھ اُٹھاتا تھا اور وہ میرے پاس بیٹھے ہوئے خالی دہوکے کا رونا روتے تھے۔ مجھپر صدموں کی بوچھاڑ تھی، ہزار یا وار ہوتے تھے مگر کبھی کوئی ایسا جان نثار پیدا نہوا جو سکھ کے وقت میرے پیچھے رہتا اور دکھ کے وقت ڈہال کیطرح سے میرے آڑے آجاتا۔ یہانتک کہ میں مرگیا۔

وہی لوگ جو ہزارہا طرح کے ناز اُٹھاتے تھے مجھے پہولوں کی سیجیں چھوڑ اپنی آنکھیں بچھانے کو تیار تھے وہی ایسے سنگدل ہوگئے کہ اُنھوں نے چھپر کھٹ سے کھینچ مجھے زمین پر پھینکدیا۔ ایک طرف تو کچھ لوگ دہوکے کا رونا رونے بیٹھ گئے اور دوسری طرف اُسی وقت میرے جلاوطن کر دینے کی تجویزیں ہونے لگیں بھٹکا بھی نہ لگا تھا جو مجھے غسل دیا جارہا تھا۔ میرے لیے کفن قطع ہورہا تھا جنازہ اُٹھانے کو احباب جمع ہورہے تھے اور ہائے میں یہ سب کچھ اپنی بند آنکھوں سے

دیکھ رہا تھا لیکن افسوس کوئی اتنا نہیں تھا جو مجھے ایک گھنٹے کے لئے اور روک لے
دھوکا سخت دھوکا۔ تھوڑی دیر بعد میں قبرستان میں تھا۔ قبر کھودی گئی۔ اور مجھے
میرے اونھیں دوستوں نے جو سچی محبت کے دعویدار تھے اوسوقت خاک کو سونپ
دیا۔ ہائے! میں نہلایا دھویا اُجلی اور ستھری پوشاک پہنے عطر و کافور میں بسا ہوا
قبر میں لیٹا تھا اور وہ منوں مٹی کے نیچے دبائے چلے جا رہے تھے۔ ہائے
میں اوسیوقت تڑپکر اُٹھ بیٹھتا اگر میرے چھوٹے دوست اعضا میرا حکم مانتے۔
میں کچھ نہ کچھ ضرور بول اُٹھتا اگر میری زبان یاری دیتی۔ وہ قبر کو بند کرتے تھے میرا
دم گھٹا جاتا تھا۔ وہ تختے پاٹ رہے تھے اور میں اُس ہاتھ کو ہاتھ نہ سمجھائی دینے
والے اندھیرے میں اُسی خاموشی سے برابر یہ کہ رہا تھا کہ خدا کے لئے مجھے اِس
دنیا کی ہوا سے محروم نہ رکھو۔ میں تمھارا ہوں! میں تمھارا فرزند ہوں مجھے کیڑوں کے
کھلانے کے لئے نہ چھوڑے جاؤ مگر افسوس کسی نے ایک بھی نہ سنی۔ دھوکا۔
غضب کا دھوکا۔ کھلا ہوا دھوکا۔

میرے بھائیو میں تمھارا پیارا بھائی ہوں کیا تم کبھی پیار سے میرا موںھ نہیں چومتے
تھے۔ آج مجھی کو خاک میں ملاتے ہو۔ میرے پیارے باپ تو بھی کتنا کٹر ہو گیا
ہے، دیکھ مجھے تیرے ہی سامنے گور کے موںھ میں جھونکے جاتے ہیں اور تو
خاموش بیٹھا ہے۔ اے میری پیاری ماں تو ہی نے مجھے گھر کے دروازے
سے نہ نکلنے دیا ہوتا۔

اماں! کیا تیری کوک میرے بغیر ٹھنڈی رہ سکتی ہے اُف کیا تیری محبت بھی جھوٹی تھی
نہیں نہیں اماں قبر کا ساتھی کوئی نہیں اور یہاں سب دھوکا ہی دھوکا ہے۔

ہستی ہے میری نیستیوں سے متشکل
اس فکر میں رہتا ہوں کہ دھوکا تو نہیں میں

ابو الاعلیٰ مودودی

سومنات

(پٹن - سومنات کا قدیمی مندر - اصلی مورت کا استھان - تاریک حجرہ)

۴- اکتوبر ۱۹۰۸ء ۴ بجے سہ پہر

بے اختیار جی چاہتا ہے کہ خاموش آواز میں آپ کو موجودہ حالت کا نظارہ کراؤں میرے قدم اس مقام پر ہیں جہاں سومنات کی مورت نصب تھی - وہی جگہ جہاں ہندوستان کے بہادر سر جھکاتے تھے اور حسین نازک پیشانیاں خاک میں گھِسی جاتی تھیں -

ہے تو آٹھ قدم مربع حجرہ - مگر کروڑوں آدمی سمائے ہوئے ہیں - میں دیوانہ نہیں ہوں - پر اس وقت مجذوبوں سے بڑھ کر ہوں - سومنات کی مورت زر اور سونے کی تھی - میرا کرتہ بھی زرد ہے تو کیا میں بھی سومنات ہوں - میرے ہی سامنے راجے سجدے کرتے ہیں - میرے ہی آگے پیارے پیارے ہاتھ جوڑے جاتے ہیں - کیا میرے درشنوں کی خاطر ہزاروں کوس کا سفر کیا جاتا ہے - کیا مجھ ہی سے پریم اور محبت طلب کی جاتی ہے - اور آہا کیا یہ حضرت بوڑھے شیخ سعدی بھی میرے دیدار کو شیراز سے آئے ہیں -

ہاں یہی معلوم ہوتا ہے - تو بس میری شان کیا اعلیٰ شان ہے - میری شان محمود نے بگاڑ دی - مگر میں نے ایاز کو دیکھا - وہ بھی اس اندھیرے گھر میں آیا - ایاز تو نے دیکھا! میری خاطر لاکھوں انسان قربان ہو گئے - سومنات کی دیواروں کے نیچے خون کے نالے بہ گئے -

ابابیل اس تاریک حجرہ کی چھت میں ایکساں بولے جاتی ہے اور سکوت کی

آخری منزل تک نہیں جانے دیتی - سمندر کا جوش خروش بھی ہوا کے سناٹے میں ملکر خاموشی میں خلل ڈالتا ہے - کتنا عظیم الشان تاریخی حجرہ ہے جہاں میں ہوں یہاں کیا تھا اور کیا ہوگیا - کیسے عجیب گردش کے ایام اس مقام نے دیکھے - ان کالے کالے پتھروں کے سایہ میں اسی آٹھ قدم کے ٹکڑہ پر تاریخ دنیا کا کتنا بڑا ورق لکھا گیا - اب یہ موہوم شکل، یہ پرانی شکل - یہ رونے اور رُلانے والی شکل - وہ شکل جو کفر و اسلام کی قدآدم شکلیں دیکھ چکی ہے - مٹنے والی ہے - پردہ کی دیوار جس پہ بڑا سہارا تھا گر پڑی -

میں لارڈ کرزن ہوتا میں جوناگڈہ کا نواب ہوتا - یا کم سے کم عباس علی بیگ دیوان جوناگڈہ ہوتا، تو اس دم توڑنے والی عمارت کو آب حیات سے اتنا زندہ کر دیتا کہ مردہ نہ کہی جاسے -

یہ مندر کیسا خوبصورت ہوگا - جسکی موجودہ شان میں بھی ایک ادا پائی جاتی ہے - موقع کیسا دلفریب ہے کوسوں تک نظر آنے والا سمندر دیوار کے نیچے - اگر لیٹ بھی جائیں تو دریائی دید سامنے ہے - مندر باہر سے چالیس قدم طویل اور پچیس قدم عریض ہے مندر کی آخری بلندی سے عجیب حسرت خیز منظر نظر آتا ہے - پٹن کے دروازوں پر اسلامی فتوحات کے کتبے لگے ہوئے ہیں - اور فصیل کے باہر میلوں شہدا کا قبرستان ہے - پردیس میں کیسے بے غل وغش سوتے ہیں - اب انکی اولاد اس میٹھی نیند کو ترستی ہے اور رسول کا وہ قول صادق آتا ہے کہ آخر زمانہ میں جب لوگ قبرستان میں جائیں گے تو آرزو کرینگے کہ کاش ہم مر جاتے اور ان قبروں میں ہوتے -

میں کب تک بجھ تاریک مقام میں بیٹھا رہوں - شام قریب ہے سورج بھی غروب ہوتا ہے آخری نگاہ سے اور دیکھ لوں - کیونکر دیکھوں - اور کیونکر اس مشہور جگہ کی اصلی عظمت کو ذہن نشین کروں - تجھکو کوئی نہیں دیکھتا - جسنے تجھے نہیں دیکھا اسنے کچھ نہیں دیکھا

یہ پورے ڈیرہ قدم لمبی چوکھٹ جسپر قدم رکھکر باہر نکلتا ہوں ذرا جھک کر دیکھ لوں۔ بس یہی جگہ ہے جہاں سر بھی رکھے گئے اور پاؤں بھی۔ دروازہ کی ہوا تو پرانی نہیں بدلتی رہتی ہے۔ البتہ چوکھٹ کے بازو اور چھت قدیمی ہے۔ محمود نے اسی جگہ کھڑے ہو کر گرز اُٹھایا ہوگا۔ حسن میمندی خبر نہیں کس رخ کھڑا ہوگا۔ اور وہ وفادار لمبے بالوں والا غلام آیاز۔ سلطان کی پشت پر باہر ہوگا یا حجرہ کے اندر مورت کے قریب اور ہاں وہ بیچارے غمگین بخاری جو مورتی کی شفاعت کرتے تھے کس طرف ہاتھ جوڑے کھڑے ہونگے۔ کیا کوئی ذریعہ ایسا ہے کہ وہ تماشہ نظر آجاے۔ اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ مگر اتنی جلدی۔ جو لوگ پہلے گئے۔ کیا وہ بھی تجھ سے جدا ہوتے وقت افسردہ تھے اور رجانا چاہتے تھے۔؟

ایک زائر

تنقید

(حکمت عملی مصنفہ محمد سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی)

مولوی محمد سجاد مرزا بیگ صاحب کی تصنیف کا موضوع اسقدر وسیع ہے کہ اُسپر کسی مفصل بحث کی اس مختصر تنقید میں بالکل گنجایش نہیں۔ مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حکمت عملی جیسی مفید کتاب اُردو زبان میں کم دستیاب ہوگی جسقدر اسکا مضمون اہم اور جامع ہے اسی قدر خوش اسلوبی سے لایق مصنف نے اُسے ترتیب دیا ہے۔ حکمت عملی وہ حکمت ہے کہ جس سے انسان اپنے افعال کو بوجہ احسن سرانجام دیتا ہے اور رفتہ رفتہ ترقی کے اعلیٰ مدارج کو طے کر کے اُس کمالیت کو حاصل کر لیتا ہے جو بحیثیت اشرف المخلوقات ہونیکے انسان کیلیے مختص ہے اسی حکمت کے ذریعہ سے انسان میں نیک و بد کی تمیز پیدا ہوتی ہے اور اُسپر یہ بات منکشف ہو جاتی ہے کہ دنیا میں سلامت روی سے زندگی بسر کرنیکے لئے اُسے اپنے افعال کو کس طریقے سے ترتیب دینا چاہیے۔ ناظرین حکمت عملی کی اس تعریف سے خود قیاس کر سکتے ہیں کہ اس کتاب میں اُن تمام مضامین سے بحث کی گئی ہے جو نہ صرف انسان کی ذاتی اخلاق سے علاقہ رکھتے ہیں۔ بلکہ جنکا مطالبہ اسپر نسل انسانی کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے واجب ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دقیق فلسفیانہ مسائل پر نہایت عام فہم اور سلیس پیرایہ میں بحث کی گئی ہے مصنف نے فلسفہ کی خیالی دنیا سے قطع نظر کر کے اصل واقعات کو مشاہدہ کیا ہے۔ اور انسے فلسفیانہ نتائج مرتب کیے ہیں۔ اس قسم کی کتابوں میں مغلق عربی الفاظ کا استعمال تقریبًا ناگذیر ہے۔ اور اسلیے ہم مصنف کو بعض ایسے عربی استعمال کے لئے قابل معافی خیال کرتے ہیں۔ جنکی معانی کسی معمولی لیاقت کے شخص کی فہم سے بالاتر ہیں۔ تاہم بحیثیت مجموعی کتاب کا طرز عبارت صاف و سلیس ہے گو اسمیں وہ شگفتگی و رنگینی نہیں پائی جاتی جسکی ہم "دلفگار" کے مصنف سے توقع کر سکتے تھے۔ کتاب کی لکھائی چھپائی و کاغذ قابلِ اطمینان ہے۔ اور اس لحاظ سے کہ حجم ۲۰×۲۶/۸ تقطیع کے ۱۲۱ صفحے ہیں تین روپے قیمت کچھ چنداں گراں نہیں مصنف سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ پتہ سلطان پورہ حیدرآباد دکن)

سعید

علامی افضل خان شیرازی

سلاطین تیموریہ میں اکبر کے بعد شاہجہاں کا عہد سلطنت علوم و فنون کے شوق اور کمال پروری اور قدر دانی کے جوش میں بے نظیر سمجھا جاتا ہے۔ علما فضلا کے علاوہ ہر فن کے صاحب کمال اُس کے دربار عالی میں موجود تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی چھ سات سو برس کی سلطنت میں جن تین فضلا نے قوم سے علامی کا خطاب پایا اُن میں دو سلطنتِ شاہجہانی کے سب سے بڑے رکن یعنی معزز عہدے وزیر اعظم پر سرفراز تھے۔

سب سے پہلے جس شخص نے اپنے آپ کو اس باوقعت خطاب کا مستحق ثابت کیا وہ اکبری عہد کا مشہور انشاپرداز اور نامور مورخ علامی ابوالفضل تھا جس کا نام نامی آجتک ہندوستان میں مشہور اور بچے بچے کی زبان پر ہے۔ اُس نے اپنے حالات زندگی خود قلمبند کئے ہیں اور اُردو زبان میں بھی کئی مرتبہ مختلف طور پر اُس کی سوانح عمری شایع ہو چکی ہے۔ ابوالفضل کے بعد شاہجہان کا پہلا وزیر افضل خان اور اُسکے بعد اُس کا وزیر سعد اللہ خان اس خطاب سے موصوف ہوا۔ سعد اللہ خان کی مختصر سوانح عمری بھی لکھی جا چکی ہے، اور اب مزید تحقیقات سے اُس کی چند تصانیف کا بھی جس سے قطعی لاعلمی تھی پتہ لگا ہے، لیکن جہانتک میرا خیال ہے علامی افضل خان کے حالات اُردو زبان میں اس وقت تک قلمبند نہیں ہوئے لہٰذا اس وقت جو حالات علامی موصوف کے سرسری تلاش سے دستیاب ہوئے اُردو کے ہردلعزیز رسالہ مخزن میں شایع کئے جاتے ہیں۔

افضل خان کا اصلی نام ملا شکر اللہ تھا۔ شیخ سعدی اور خواجہ حافظ کے ہموطن یعنی

شیراز کے رہنے والے تھے ابتدائی حالات معلوم نہیں۔ تعلیم کی نسبت صرف اسقدر علم ہے کہ دارالعلوم شیراز کے مشہور فضلا میر ابراہیم ہمدانی اور میر تقی الدین محمد نسابہ شیرازی سے علم و فضل حاصل کیا۔ اس کے بعد مدت تک اپنے فضل سے طلبا کو سیراب کرتے رہے۔ جہانگیر کے عہد میں بطور سیاحی سمندر کے راستہ ہندوستان بہشت نشان میں تشریف لائے اُس زمانہ میں سورت سب سے بڑا بندرگاہ اور شل بمبئی کے ممالک غیر کی تجارت کا مرکز تھا۔ ملا صامن سورت میں جہاز سے اُترے اور سیر کرتے ہوئے برہان پور میں جو مغلیہ گورنر کا دارالحکومت تھا پہنچے۔ حسن اتفاق سے خانخانان عبدالرحیم خان اُسوقت برہان پور میں تھے اور اُن کے مصاحبت میں اہل کمال کا وہ مجمع تھا جو سلطان حسین مرزا اور میر علی شیر کے عہد میں گذرا ہے۔ ملا صاحب اُنسے بھی ملے۔ خانخانان تو اہل کمال کے عاشق تھے پہلی ہی ملاقات میں فریفتہ ہوگئے اور اپنے حسن اخلاق اور جود و کرم سے ملا صامن کو ایسا گرویدہ کرلیا کہ وہ آگے نہ بڑھ سکے چند مدت خانخانان کی مصاحبت میں رہے۔ اسکے بعد شاہزادہ شاہجہاں نے اپنی سرکار میں مقرر کرکے لشکر کا میر عدل بنا دیا۔ مہم رانا امرسنگھ میں یہ شاہزادہ کے ساتھ تھے انہی کے صلاح و مشورہ اور کوشش سے رانا سے مصالحت قرار پائی۔ جہانگیر اِس حسن خدمت سے بہت خوش ہوا اور افضل خان کے خطاب سے موصوف کیا۔ روز بروز شاہزادہ کی خدمت میں عزت و اعتبار بڑھتا گیا۔ یہانتک کہ میر عدل سے دیوان ہوگئے۔

مہم دکن میں شاہزادہ کی طرف سے بیجاپور کی سفارت پر گئے اور سفارت کا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا اور عادل شاہ والیِ بیجاپور سے عمدہ پیشکش لے کر واپس ہوئے۔

جہانگیر کے عہد میں نورجہان بیگم کل سلطنت کی مالک تھیں صرف خطبہ میں تو بیگم کا نام

نہ تھا۔ سکہ پر ضرب اور فرمانوں پر مہر تک بیگم کی ہونے لگی تھی۔ شاہجہاں۔ جہانگیر کا نہایت رشید اور سعادت مند بیٹا تھا۔ جہانگیر اس کے کارناموں سے خوش اور اپنی جانشینی کے لایق سمجھتا تھا۔ شاہجہاں کو خطاب کے ساتھ تمام شاہانہ رتبے دئے تھے۔ ممتاز محل شاہجہاں کی پیاری بیگم آصف خاں برادر نورجہاں کی بیٹی تھی اس رشتہ داری کیوجہ سے بیگم بھی شاہزادہ کی طرفدار تھی۔ جب ۱۰۳۰ھ میں بیگم نے اپنی اس بیٹی کی شادی جو شیر افگن خاں پہلے شوہر سے تھی جہانگیر کے چھوٹے بیٹے شہریار سے کر دی تو بقول شخصے

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

شاہجہاں کے خلاف ہو کر شہریار کی سلطنت کی بنیادیں ڈالنے لگی۔ پہلا وار یہ تھا کہ ۱۰۳۱ھ میں شاہجہاں دربار میں طلب ہو کر مہم قندھار پر مامور ہوئے۔ ابھی روانگی نہ ہوئی تھی کہ پرگنہ دھولپور کی جاگیر پر شاہجہاں اور شہریار کے امیروں میں تلوار چل گئی۔ بیگم نے بادشاہ کو شاہجہاں کی طرف سے برافروختہ کیا۔ شاہجہاں نے یہ حال سنکر افضل خاں کو باپ کے پاس بھیجا اور نہایت عجز و انکسار کے پیغام کہلا بھیجے اور عرضی لکھکر عفو تقصیر کی التجا کی جہانگیر کے دل کی بیگم مالک تھیں۔ افضل خاں کی کوشش کامیاب نہ ہوئی بلکہ الٹا انہیں قید کر لیا گیا۔ آخر کار ایسی آگ بھڑکی کہ شاہجہان کی گرفتاری کے واسطے شاہی فوج روانہ ہوئی اور شاہجہاں جیسے سعادت مند اور فرمانبردار بیٹے کو مجبوراً باغی ہونا پڑا۔

چند روز کے بعد جہانگیر نے افضل خان کو شاہجہاں کے پاس واپس کر دیا۔ شاہجہان نے افضل خاں کو کچھ ساز و سامان کے واسطے بیجاپور روانہ کیا۔ اسی عرصہ میں شاہی فوج تعاقب میں آن پہونچی اور شاہجہان نے براہ تلنگانہ بنگالہ کی راہ لی۔ راستہ میں بہت سے ملازموں نے بیوفائی اختیار کی افضل خاں کا اکلوتا بیٹا مرزا محمد بھی معہ

اہل و عیال کے لشکر کے ساتھ تھا وہ بھی بھاگا شاہزادہ نے ہرچند اُسکی واپسی کی کوشش کی مگر وہ واپس نہ آیا اور سید جعفر خاں سے لڑکر مارا گیا۔ شاہزادہ کو اُسکے مارے جانے کا بہت رنج ہوا۔

بنگالہ سے واپسی کے وقت ۱۰۳۵ھ میں شاہجہاں نے افضل خاں کو پھر باپ کے پاس بھیجا لیکن بیگم کے مقابلہ میں کچھ دال نہ گلی۔ جہانگیر نے افضل خان کو اپنے پاس رکھ لیا اور خدمتِ خانسامانی پر مامور کیا۔

سنہ ۲۲ جلوس میں جب بادشاہ لاہور سے گلگشت کشمیر کو چلے افضل خان کو لاہور میں چھوڑ دیا کہ واپسی تک وہیں مقیم رہیں۔ کشمیر سے واپسی کے وقت جہانگیر کا انتقال ہوا۔ شہریار چھوٹا بیٹا لاہور میں موجود تھا اُس نے افضل خان کو وکیل مطلق مقرر کرکے تاج شاہی کا اپنے سر پر رکھا۔ افضل خان شاہجہاں کے ہواخواہ تھے۔ انھوں نے حکمت عملی سے شہریار کو قلعہ بند کرا دیا اور خود شاہجہاں کی خدمت میں آگرہ جا پہنچے۔ شاہجہاں نے منصب چہار ہزاری پر سرفراز کرکے عہدہ جلیلہ میر سامانی سے مفتخر فرمایا۔ دوسرے سال منصب پنجہزاری عطا فرماکر وزیر اعظم مقرر کر لیا وزارت کی تاریخ کسی نے خوب لکھی ہے ؎

شد فلاطوں وزیر اسکندر
۱۰۳۸ھ

سنہ ۱۱ جلوس شاہجہانی میں منصب ہفت ہزاری ملا۔ سنہ ۱۲ جلوس میں کوئی عارضہ جسمانی طاری ہوا جس سے روز بروز ضعف بڑھتا گیا۔ ۹ رمضان ۱۰۴۸ھ کو بادشاہ خود عیادت کے واسطے مکان پر آئے۔ ۱۲ رمضان ۱۰۴۸ھ کو بمقام لاہور ۷۰ برس کی عمر میں اس دار ناپائدار سے سفر آخرت اختیار کیا ؎

زخوبی بر و گوئے نیک نامی
۱۰۴۸ھ

او رعلامی از دہر رفت ۔ وفات کی تاریخ ہے۔
۱۰۴۸ھ

شاہجہاں کو اپنے وزیر باتدبیر کی وفات کا سخت افسوس ہوا کئی مرتبہ فرمایا کہ افضل خان نے اپنی اٹھائیس سالہ ملازمت میں کسی شخص کی برائی ہم سے نہیں کی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ علامی موصوف فصاحت و بلاغت میں سب بے نظیر اور حسان وقت تھا۔ ہیئت و ہندسہ اور حساب میں کافی مہارت رکھتا تھا۔ بادشاہ نامہ ملا عبدالحمید لاہوری میں اُس کے لکھے ہوئے چند مراسلے اور فرمان موجود ہیں جو بادشاہ کی طرف سے سلاطین ایران اور فرمانروایانِ دکن کو لکھے تھے اُن سے اُس کے پرزور قلم کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ تصنیف و تالیف کے حال پر اس وقت تک سیاہ چادر پڑی ہوئی ہے۔

علامی افضل خاں نے لاہور اور آگرہ میں نہایت عالیشان حویلیاں تعمیر کرائی تھیں حویلی آگرہ کی تاریخ تعمیر منزل افضل ہے۔ (۱۰۳۰ھ) اس حویلی میں ۶ ذالحجہ سنہ ۱۰۴۲ھ کو نہایت دھوم دھام سے بادشاہ کی دعوت تھی ساز و سامان اور آرایش کا اندازہ اس سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ قلعہ معلی سے حویلی تک پچیس جریب کا فاصلہ تھا۔ علاوہ دیگر آرایش کے تمام راستہ میں نہایت قیمتی اور مختلف اقسام کے ریشمی اور زردوزی کے تھان بچھے ہوئے تھے جو بادشاہ کے گذرنے پر فوراً نثار کر دیئے گئے۔ اعلیٰ درجہ کے جواہرات اور مرصع آلات اور نفیس تحفہ جات پیشکش کئے گئے جن میں ایک لاکھ روپے قیمت کے جواہرات اور آلات قبول کئے گئے۔ کشمیر میں ڈل کے پہلو میں شمال رویہ ایک نہایت عمدہ باغ آراستہ کیا تھا جو باغ افضل آباد کے نام سے موسوم اور کشمیر کے خاص باغات میں شمار ہوتا ہے۔

علامی افضل خاں کا مقبرہ آگرہ میں جمنا کے اُس پار روضۂ اعتمادالدولہ کے قریب واقع اور بوجہ اپنے چینی کے کام کی نفاست اور خوبصورتی کے چینی کے روضہ کے نام سے موسوم ہے، یہ اُس زمانہ کی اعلیٰ درجہ کی صنعت کا نمونہ خیال کیا جاتا ہے چونکہ صدیوں سے ویران پڑا تھا لہذا اس کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی اور غالباً کبھی

کے صدمہ سے کچھ حصہ گر بھی گیا تھا۔ اب لارڈ کرزن کے عہد میں اسکی مرمت ہوئی ہے، اور مختصر سا چمن بھی لگایا گیا ہے۔ قرب وجوار میں بہت سی منہدمہ عمارتوں کے آثار اس کی گذشتہ عظمت کی یادگاریں موجود ہیں۔

عبدالحق شیرازی جوامانت خان کے خطاب سے موصوف اور روضۂ ممتاز محل کے اُن نفیس اور پاکیزہ کتبوں کا جن کے نظارہ سے کسی طرح سیری نہیں ہوتی کاتب اور صناع ہے، علامی موصوف کا سگا بھائی تھا۔ اُسکے بیٹے عنایت اللہ کو افضل خان نے اپنا متبنیٰ کیا تھا۔ شاہجہان نے علامی کے انتقال کے بعد عنایت اللہ کو خطاب عاقل خان سے مفتخر فرما کر دیوان بیوتات مقرر کیا اُس نے منصب سہ ہزاری تک ترقی پائی ۱۰۵۶ھ میں بمقام کابل انتقال کیا۔

سعید احمد مارہروی

حریفِ دیدۂ دیدار جو کیا ہو حجاب اوس کا
نگاہ آشنا سے ہے مجکو ہر تار نقاب اُس کا

غضب ساقی کی مستی ستم جوشِ شباب اُس کا
چھلک پڑتا ہی اسکے ہاتھ سی جامِ شراب اُس کا

ہزاروں اسکے قدموں پر تھے مشاقِ گرفتاری
مرے ہی دل کو چھانٹا دیکھنا تو انتخاب اُس کا

مجسم مہر ہے ہر چند مجھ اسکی بلا نکلی
تری چشمِ حیا پرور کہ عالم ہے خراب اُس کا

ہزاراں اسقدر دیدار جاناں ہم نہ مانیں گے
زلیخا کیا سناتی ہی خیال اُسکا ہی خواب اُس کا

نگہ نے تیری بیچینی نے مارا مجھکو اے ظالم
مرے دلمیں سما کر پھر رہا ہی اضطراب اُس کا

کرم کی ہی نظر افتادگانِ خاک پر اکثر
محافظ ہے دلوں کا طرۂ عالیجناب اُس کا

وہ زلفِ خم بخم کب ہاتھ اُٹھاتی ہے مری سر سے
گرہ ہو کر رہا ہے میری دلمیں پیچ وتاب اُس کا

کلام عرفیٔ شیراز ہے تقلید کے قابل
ہمارے ریختے میں دیکھ لے وحشت جواب اُس کا

مولوی رضا علی۔ وحشت

تاریخ عرب

گذشتہ اشاعت سے آگے

عراق اور الجزیرہ[۱] کے عرب قبائل ۲۷۰ء سے حیرہ اور انبار کی حکومت قبول کر چکے تھے اور اسی زمانہ میں شام کے قبائل ملوک غسّان کے فرمان بردار رہے تھے ۱۱۸ء قریب قبائل آزد والے جو اصل میں یمن سے آئے تھے مکہ کے قریب بیت میں سکونت اختیار کی تھی اس کے سو برس بعد یہ قبائل منتشر ہو گئے اور حجاز کی سرحدات پر غسان کے چشمہ کے قریب ٹھہرے۔ اور اسی وجہ سے ان کا نام تاریخ میں خاندانِ غسّانی ہوا۔ یہ قبائل غسان لڑتے بھڑتے اور کبھی فتح پاتے اور کبھی شکست کھاتے ہوئے بالآخر یزہ تک پہونچے اور ۲۹۲ء میں ان کے شیخ ثعلبہ نے رومیوں کے ہاتھ سے فائی لارک کا درجہ پایا۔ اس کے جانشین جفنہ اول نے اس خاندان میں حکومت کی بنا ڈالی جو ۶۳۷ء عیسوی تک قائم رہا یعنی وہ زمانہ جب کہ جبلہ ششم اخیر بادشاہِ غسان مشرف باسلام ہوا اس زمانہ دراز تک ملوک غسان ایرانیوں کے مقابل میں قسطنطنیہ کے شاہنشاہوں کی مدد کرتے رہے چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں انھوں نے عیسائی مذہب اختیار کیا۔ ملوک حیرہ اور ان میں لڑائیوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ قائم رہا لیکن ان لڑائیوں کا کوئی صریح اور بین نتیجہ نہوا۔ حرث پنجم نے جو ابو شمر کا بیٹا تھا اور عرج کے نام سے مشہور تھا جسٹینن سے امیر اور بادشاہ کا خطاب حاصل کیا۔ حرث کا لی نیک کی لڑائی

---

[۱] الجزیرہ اس ملک کو کہتے ہیں جو فرات اور دجلہ کے بیچ میں واقع ہوا ہے۔

مترجم

میں جو ۵۳۱ء میں ہوئی اور جس میں بیلی سارس[۵] نے شکست پائی بذات خود موجود تھا۔ ۵۳۹ء میں حیرہ کے منذر سوم نے اسے شکست دی لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اس نے اپنی حالت درست کرلی اور خیبر کے یہودیوں پر کامیابی کے ساتھ حملہ کیا۔ حرث نے ۵۶۲ء میں قسطنطنیہ کا سفر کیا اور ۵۷۲ء میں مرگیا۔ روایات عرب و یونان میں دو نہایت مشہور غسان کی شہزادیوں کا بھی ذکر ہے۔ ان میں سے ایک ماویہ تھی جس نے ۳۷۷ء میں شہنشاہ ولینس کی بیوہ کو اُس وقت مدد دی ہے جب اسے وسی گاتھوں نے دارالسلطنت میں محصور کرلیا تھا اور دوسری ماریہ ذوقرطین یعنی بُندوں والی تھی جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ عیسائی ہوتے وقت اُس نے مکہ کے معبد میں دو نہایت بیش بہا موتی چڑھائے تھے۔

غسّانیوں نے شہنشاہ مورس (۵۸۴-۵۸۸ء) اور شہنشاہ ہرقل (۶۱۱-۶۴۱ء) کا ساتھ دیا اور ان دونوں کی فتوحات میں مدد کی ۶۲۹ء میں موتھ کی جنگ بھی لڑے اور ۶۳۴ء میں ہرقل نے مقام یرموک پر جو شکست کھائی اوسمیں غسانی بھی شریک تھے اور اس لڑائی کے تین سال بعد انہوں نے خلفا کی حکومت کو قبول کیا۔

پس گویا ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں عربستان کا شمالی حصہ ایرانیوں اور یونانیوں میں بٹا ہوا تھا جو مصر اور فلسطین اور جزیرہ نماے سینا کے مالک تھے۔ ان کے سوا دو باج گذار حکومتیں تھیں ایک قسطنطنیہ کی اور دوسری طیسفون کی جو صحراے شام اور عراق اور الجزیرہ پر سلطنت کرتی تھیں۔

عربستان کا جنوبی حصہ جزیرۃ العرب کا جنوبی حصہ مدتِ دراز تک کسی غیر حکومت کا

[۵] بیلی سارس سلطنت مشرقی کا ایک نہایت مشہور سپہ سالار ہے اسنے ایرانیوں اور افریقہ کے ونڈلوں پر نہایت نمایاں فتحیں پائیں اور بے انتہا لوٹ کا مال قسطنطنیہ میں لایا۔ بالآخر شہنشاہ جسٹی نین کو اسکا رشک ہونیلگا اور اسکا اخیر وقت نہایت بے عزتی اور مصیبت میں کٹا۔ سالِ ولادت ۵۰۵ء سالِ وفات ۵۶۵ء مترجم

تبابعہ یمن - حبشی سنہ ۱۶۷ قبل مسیح سے سنہ ۵۹۷ء تک	ماتحت رہا - خاندان سابئین کے بعد جنہوں نے مارب اور ظفار اور عدن اور نجران کی بنا ڈالی تھی یقطانیوں نے

اور بہت سے شہر قایم کئے - حال کے قیاسات کے بموجب جن کو پوری طرح تسلیم کرنا محال معلوم ہوتا ہے ان شہروں کا زمانہ سنہ ۹۴ قبل مسیح بیان کیا جاتا ہے حمیریوں نے جو اسی خاندان سے تھے صرف سنہ ۱۶۷ء میں تبابعہ کا خاندان شاہی قایم کیا جو بالآخر سنہ ۵۶۵ء میں حبشیوں کے ہات سے مغلوب ہوا - حرث الرائش تبابعہ کے پہلے بادشاہ نے جنوب عربستان کی ساری حکومت اپنے ہات میں لے لی اور حضرموت اور مہرہ اور عمان سب اسکے تحت حکومت رہے -

تبابعہ کی حکومت میں یمن کے باشندوں نے زراعت و تجارت کی طرف توجہ کی - بہت بڑے بڑے ذرایع آب پاشی کے بنائے گئے جن کے ذریعہ سے پانی کل ملک میں پہنچایا گیا - لوبان اور اور قسم کے عطریات جو ملک سے باہر جاتے تھے بہت بڑے ذرایع دولت کے تھے - مسعودی لکھتا ہے "ملک کی رعایا کو ہر قسم کا لطف زندگانی حاصل تھا - مایحتاج زندگی بکثرت موجود تھیں - زمین سیر حاصل ہوا صاف آسمان شفاف - پانی کے چشمے بکثرت - حکومت عالی شان سلطنت مستقیم اور قوی"

مقریزی لکھتا ہے کہ قدیم حمیری خط کے حروف جنہیں مسند کہتے ہیں بالکل علیحدہ ہوتے تھے - ویلسٹید - کرینٹن ڈیں اور ہالوی نے جو پرانے کتبے اس ملک میں پائے ہیں وہ اس خط کے نمونے ہیں - اگرچہ ابھی تک علمانے پوری تحقیق اس کی نہیں کی ہے -

تقریباً سنہ ۱۲۰ء میں ایک ایسا واقعہ ہوا جو بظاہر خفیف معلوم ہوتا تھا - لیکن اس نے حمیریوں کی حکومت پر ایک نہایت دردناک اثر ڈالا - مارب کے قریب ایک عظیم الشان بند تھا جو دو پہاڑوں کے بیچ میں بنایا گیا تھا اور ان میں جسقدر پانی بارش کا جمع ہوتا تھا

وہ بند کے ذریعے سے روک لیا گیا تھا پس گویا اس بند کی وجہ سے ایک بہت ہی بڑا ذخیرہ پانی کا تیار ہو گیا تھا جو زراعت کے کام میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اتفاق سے اس بند میں دراڑ پڑ گئی اور دفعتہً وہ ٹوٹ گیا اور جو پانی اسکی وجہ سے رکا ہوا تھا نشیب کی زمینوں پر پھیل گیا اور جو چیز سامنے آئی اُسے بہا لے گیا۔ یہ واقعہ اس قسم کا تھا کہ اگر یمن کے باشندے اس بند کو دوبارہ تیار کر لیتے تو اُس کے ٹوٹ جانے سے کوئی برا نتیجہ ظہور میں نہ آتا لیکن وہ محنت سے پس پا ہو گئے اور انہیں یہ بھی خوف ہوا کہ دوبارہ ایسا ہی کوئی واقعہ ہوا اور انھوں نے اسے غضب الہی اور آفت آسمانی سمجھ لیا اور فی الواقع اس بند کے ٹوٹنے نے اُن کی ساری تاریخ بدل دی۔ کیونکہ اُن کی اس کاہلی کی وجہ سے ہر سال سیلاب نے ملک کو خراب کرنا شروع کیا اور اکثر باشندوں نے یمن کے خطہ ہی کو چھوڑ دیا اور ایک فرقہ نے حیرہ کی سلطنت اور دوسرے نے غسان کی حکومت قائم کی۔ خاندان تبابعہ کے سلاطین نے اس واقعہ کے بہت بعد کچھ کوشش کی کہ اپنی عظمت و شان کو قائم رکھیں لیکن بعوض اسکے کہ وہ عربستان سے آگے بڑھیں اُنہیں خود اپنی سرحدات کا بچانا مشکل پڑ گیا۔ اور بالآخر جب چھٹی صدی عیسوی میں غیر اقوام نے یمن پر حملہ کیا تو کوئی قوت انھیں روکنے والی باقی نہ رہی۔ انھوں نے ملک کو ایک دردناک بدعملی اور تباہی کی حالت میں پایا کیونکہ کل کاشتکار ملک کو چھوڑ چھوڑ کر جا چکے تھے اور ان نئے فاتحین نے بڑا وقت تسلط کر لیا۔ وہ عیسوی سنہ پانسو چھپن تھا جبکہ تبابعہ کی قومی حکومت یمن سے اُٹھ گئی اور اس کی جگہ حبشیوں اور ایرانیوں کے ظلم نے لے لی۔ ان تبابعہ کی حکومت میں بھی بڑے بڑے زمانے عروج کے گذر چکے تھے اور اگر عرب مورخین کے بیانات پر رسوخ کیا جائے تو ان کی حکومت عظیم الشان سلطنتوں کے مماثل تھی۔ ان ہی بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا کا ایک حصہ بھی ان کے قبضہ میں تھا۔

تبالعہ نے ہندوستان کو فتح کر لیا تھا۔ چین پر حملہ کیا تھا اور بعض نے افریقیا کے شمالی پر سواحل اٹلانٹک تک قبضہ کر لیا تھا۔ بعض سلاطین نے اسکندر کی فتوحات کی تجدید کی تھی۔ لیکن جسوقت ہم اِن بیانات کو دوسرے اقوام مشرق کی تواریخ سے ملاتے ہیں تو مطلق مطابقت نہیں پائی جاتی پس گویا ان بیانات کو قصہ کہانی کے طور پر سمجھنا چاہیئے اور اسی قدر رکھنا چاہیئے کہ یمن میں قدیم الایام سے ایک باقاعدہ حکومت قائم تھی۔ اس قسم کی حکایات کا اختراع کیا جانا بہت آسانی سے سمجھ میں آتا ہے کیوں کہ فی الواقع عربوں کی تواریخ نویسی کی ابتدا آنحضرتؐ کے بعد ہوئی ہے۔ یعنی اس زمانہ میں جو کہ اُن کی اعلیٰ ترقی اور عروج کا زمانہ ہے۔ پس اس حیرت انگیز ملک گیری اور ترقی نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے کو مشہور ملک گیروں کی اولاد ثابت کریں اور اسی وجہ سے اس ایک خطہ کی تاریخ کو جس کا کچھ تھوڑا بہت احوال معلوم تھا انہوں نے نہایت مبالغے کے ساتھ لکھدیا۔ پس اسی رنگ آمیزی کا نتیجہ تھا کہ تبابعہ میں بھی ایک ذوالقرنین ہوا جو گویا اسکندر کا ہم پلہ تھا اِن میں بھی ایک افریقوش ہوا جس نے بربر یوں کو فتح کیا (سنہ ۵۰ قبل مسیح) ان میں بھی بلقیس تھی جس نے افریقوش کے بہت دنوں بعد سلطنت کی اور جسے عرب سبا کی شہزادی اور حضرت سلیمانؑ کی ہم عصر بلقیس سے التباس کرتے ہیں۔ اِن ہی میں شمر تھا جس نے سمرقند کی بنا ڈالی اور مثل اُن کے اور واقعات۔ ان تبابعہ کی طرف بڑی بڑی فتوحات منسوب کی جاتی ہیں۔ حالانکہ اِن بیچاروں نے عربستان سے قدم باہر بھی نہ نکالا تھا اور چونکہ اُنکی اندرونی تاریخ آپس کی خانہ جنگیوں اور حکومت کے غضب سے بھری ہوئی ہے اس لئے اُنکی طرف انواع واقسام کے عجیب وغریب اور خیالی واقعات منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ اُن واقعات کی نسبت بھی جو سیل عرم اور حبشیوں کی فوج کشی کے بیچ میں واقع ہوئے ہیں مورخین کا اتفاق نہیں ہے لیکن ہم یہاں اُنہی واقعات کا ذکر کریں گے جو زیادہ

معتبر ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سنہ ۲۰۶ء کے قریب تبع ابو کرب نے ایران پر چڑہائی کی اور بہت سا مال غنیمت لے آیا اسکے بعد اُسنے حجاز کو فتح کیا اور یثرب کا جو باغی ہو گیا تھا محاصرہ کیا اس نے کعبہ کی زیارت کی اور وہاں مذہب یہود کو اختیار کیا اور اس مذہب کو یمن میں جاری کیا۔ اس کے بعد یعنی تقریباً سنہ ۳۴۳ء میں شہنشاہ قسطنطین نے تھیوفیلس[۱] کو بھیجا جس نے یمن میں مذہب عیسوی کی اشاعت کی۔ لیکن ملک کا عام مذہب اخیر تک بت پرستی ہی رہا۔ ابو نواس نے جو پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں یمن کا بادشاہ ہوا دین یہود اختیار کیا اور سنہ ۵۲۴ء میں اس نے نجران کے عیسائیوں کو جنہوں نے اپنا مذہب بدلنے سے انکار کیا قتل کروا ڈالا۔ جسٹینین اول کو جب اس واقعہ کی خبر پہنچی تو اس نے نجاشی حبشی کو خود عیسائی تھا ابو نواس سے انتقام لینے پر آمادہ کیا اور ستر ہزار فوج نے یمن پر چڑہائی کی۔ اریاط نے جو اس فوج کا سپہ سالار تھا ایک ایسی قوم کو جو خانہ جنگیوں کی بدولت ضعیف ہو چکی تھی بآسانی فتح کر لیا۔ ابو نواس شکست کھانے کے بعد سمندر میں گر کر مر گیا (سنہ ۵۲۵ء) اور اس کے جانشین علی ذو الیزن کے مرنیکے بعد جو اخیر حمیری بادشاہ تھا اریاط نجاشی کے نام سے حکومت کرنے لگا اس کے ایک افسر نے جس کا نام ابرہہ الاشرم تھا حسد سے اُسے مار ڈالا اور کل لشکر حبش کا سپہ سالار بنکر اپنے کو نائب السلطنت کا خطاب دیا۔ ابرہہ کو اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے بہت کچھ لڑنا پڑا لیکن وہ ہر لڑائی میں کامیاب رہا۔ اسی کے حکم سے گری گینٹس ظفار کے اسقف نے ایک دستور العمل مرتب کیا جس کا اصلی یونانی زبان میں وئینا کے کتب خانہ شاہی میں موجود ہے۔ صنعا میں نہایت پُر شان و شوکت ایک کلیسہ اس غرض سے بنایا گیا کہ وہ کعبہ کا مقابلہ کرے۔ لیکن ابرہہ کی

[۱] تھیوفیلس اسکندریہ کا بطریق تھا۔ اسکا زمانہ سنہ ۳۸۵ء کا ہے اور اس نے سنہ ۴۱۲ء میں وفات پائی۔ مترجم

ساری کوششیں جو اُس نے عربستان میں عیسائی مذہب پھیلانے میں کیں ناکام رہیں۔ مکہ پر حملہ کرتے وقت اُس نے شکست پائی اور چند روز بعد مر گیا اور اس کے بیٹوں نے اس قدر ظلم و زیادتی شروع کی کہ رعیت حبشیوں کے جور و تعدی کی برداشت نہ کر سکی۔ چونکہ یمن کے باشندوں میں خود اس قدر قوت نہ تھی کہ وہ اپنے کو آزاد کریں انھوں نے باہر سے مدد چاہی۔ شہنشاہ قسطنطنیہ بت پرستوں کا ساتھ نہ دے سکتا تھا اور اس نے انکار کر دیا لیکن خسرو پرویز سے جب استدعا کی گئی تو اس نے منظور کیا اور ۵۷۵ء میں اُس نے عدن کو ایک بحری جہازوں کی بھیجی جس نے فوج کو ملک میں اتار دیا۔ ۵۹۷ء کے قریب حبشی بالکل یمن سے نکال دیے گئے لیکن یمنیوں کی حالت یکساں رہی جسطرح وہ حبشیوں کی اطاعت کرتے تھے اُسی طرح وہ ایرانیوں کے فرمان بردار بن گئے۔ فرق اسی قدر تھا کہ انہیں مذہب کی آزادی تھی۔ ایرانی والیوں نے یمن کی حکومت پر قناعت نہ کی اور حضرموت و عمان و بحرین تک تسلط کر لیا۔

عربستان وسطی ۶۰۰ء سے ۶۲۲ء تک مکہ و یثرب قریش کی قوت و شوکت

ساتویں صدی عیسوی میں عربستان کی بہت ہی خطرناک حالت تھی۔ دو قوی ہمسائے اُسکی سرحدوں پر موجود تھے اور ملک کا حصہ کر چکے تھے ایک ان میں سے یعنی شہنشاہ قسطنطنیہ ایک صوبہ کاٹ کر اپنی سلطنت میں ملا چکا تھا۔ دوسرا ہمسایہ یعنی شاہ ایران سب سے شاداب خطہ پر قابض ہو گیا تھا۔ البتہ نجد اور حجاز ہر قسم کے بیرونی تسلط سے بچے ہوئے تھے اور یہی وہ صوبے تھے جہاں عربوں کی قومی خصوصیات نے پناہ لی تھی اور یہیں سے وہ ایک دن ملک کے باہر اپنا جلوہ دکھانے والی تھیں۔ ان دونوں صوبوں میں تبابعہ کی سی کوئی باقاعدہ سلطنت نہ تھی۔ زمانہ قدیم سے اس وقت تک حکومت خود مختار قبائل کے ہاتھ میں تھی جنہیں غیر کی اطاعت مطلق گوارا نہ تھی اور جو اپنی آزادی

سے کے مقابل میں ہر ایک چیز کو کھو بیٹھنے کے لئے تیار تھے۔ سنین دراز سے نہ ان کی
صورت ظاہری میں فرق آیا تھا نہ ان کی تاریخ میں۔ وہی چھوٹے چھوٹے قبائل تھے جو
رسوم و رواج اور خصائص میں ایک دوسرے کے بالکل مماثل تھے۔ لیکن سیاسی
حکومت میں علیحدہ۔ اس وقت بھی وہی قدیم داستان خانہ جنگیوں اور باہمی رقابت
کی سنی جاتی تھی۔ کسی ایک قبیلہ نے دوسروں کے مقابل میں کوئی اعلیٰ مرتبہ حاصل
نہیں کیا تھا اور سب کی قوتیں اور سب کے وسائل زندگانی قریب قریب برابر تھے۔ دولت
بھی جو اکثر قسمت سے ہاتھ لگتی ہے، ان میں قریب قریب برابر تقسیم ہوئی تھی۔ البتہ
بعض قبائل تجارت کے ذریعے سے متمول ہو گئے تھے لیکن اون کے بیرونی تعلقات
نے نئی ضرورتیں پیدا کر دی تھیں جن کی وجہ سے وہ اپنے بھائی بندوں کے برابر ہو گئے
تھے۔ پہلا درجہ اُن قبائل کا تھا جو حجاز کے دونوں بڑے شہروں یعنی مکہ اور یثرب میں
حاکم تھے۔ خانۂ کعبہ کی حفاظت مدت دراز سے بنو جرہم کے حصہ میں تھی جو یمن سے
آئے ہوئے تھے اور جن کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ نے قرابت کی تھی
اوائل ہی میں خدائے ابراہیم کی پرستش کے ساتھ بت پرستی شامل ہو گئی تھی اور بنو جرہم
کے کفر نے انھیں سنہ ۲۰۶ء کے قریب مکہ سے نکلوایا تھا۔ مختلف قبائل یقطان مختلف
اوقات میں حجاز میں ایسے تھے مثلاً بنو قضاعہ اُن پہاڑی حصوں میں تھے جو یثرب
کے شمال میں واقع ہوئے ہیں انبو ازد نے سنہ ۱۸۰ء کے قریب بحرین اور عراق میں سکونت
اختیار کرنے سے پہلے بطن مر میں ایک آبادی قایم کی تھی انہیں بنو ازد کی ایک
شاخ یعنی بنو خزاعہ سنہ ۲۰۶ء میں بنو جرہم کی جگہ کعبہ کے محافظ ہو گئے اور انھوں نے نئی
قسم کی پرستش اور رسوم جاری کیں جنہیں سے ہبل کی پرستش تھی اور اس وقت کعبہ
عربستان کے کل خداؤں کا مستقر ٹھہر گیا۔ وہ تین سو ساٹھ بت جو کعبہ میں رکھے گئے
تھے گویا چھوٹے درجہ کے معبود اور اللہ اور مخلوق کے بیچ میں واسطہ تھے سنہ ۵ء

میں قضاعہ کو اپنے قومی رقیب یعنی قریش سے جو اولاد اسمٰعیل سے تھے مقابلہ کرنا پڑا۔ سنہ ۴۴۰ع میں قصی جو قریش کا شیخ تھا خانہ کعبہ پر قابض ہو گیا اور بنو خزاعہ بھاگ کر بطن مر چلے گئے۔ قصی نے کل قبائل قریش کو اپنے پاس پاس جمع کر لیا اور اس کی کوششوں سے مکہ ایک باوقعت شہر بن گیا اور حکومت چند منتخب اشخاص کے ہاتھ میں ہو گئی۔ کعبہ کی حفاظت سے متعلق جو کئی خدمات تھیں وہ قریش کی مختلف خاندانوں میں تقسیم ہو گئیں۔ ان میں سے دو بڑی خدمتیں یعنی رفادہ اور سقایہ پہلے ہاشم کو ملیں جس کی زیادہ شہرت اس وجہ سے ہے کہ وہ ہر روز ثریثہ یعنی ایک قسم کا شوربہ تقسیم کیا کرتا تھا۔ ہاشم کے بعد یہ دونوں خدمتیں مطلب کو اور ان کے بعد عبدالمطلب آنحضرت کے دادا کو ملیں۔ کہتے ہیں کہ عبدالمطلب نے سنہ ۵۴۰ع میں چاہ زمزم کی از سر نو تعمیر کی۔

یثرب جو روایات قدیمہ کی رو سے عمالقہ کا بسایا ہوا تھا اخیر میں یہودیوں کے ہاتھ میں آ گیا جن میں سے بنو نضیر اور بنو قریظہ اور بنو قینقاع وغیرہ مشہور قبائل تھے۔ سنہ ۳۰۰ع کے قریب بنو ازد کے دو قبیلوں یعنی اوس اور خزرج نے ان کی سرحد میں سکونت اختیار کی اور سنہ ۴۹۲ع میں یثرب پر قابض ہو گئے پہلے تو انہوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ یمن کے تبابعہ کا مقابلہ کیا لیکن بالآخر آپس کی پھوٹ اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے کمزور ہو گئے (سنہ ۴۶۰ع و سنہ ۵۲۰ع و سنہ ۵۸۳ع و سنہ ۶۱۵ع) پانچ سال بعد ان میں باہم صلح ہو گئی اور پھر یہ آنحضرتؐ کے پیرو بن گئے۔

قبائل یہود نے نہایت مستعدی کے ساتھ کاروانوں کے ذریعے سے تجارت کا کاروبار پھیلایا اور دولت و ثروت میں یثرب مکہ کا مد مقابل بن گیا۔ مکہ خود ایک بہت ہی بڑی آفت سے بچ گیا تھا اس شہر مقدس پر جو کعبہ کی وجہ سے کل عربوں کی نظروں میں محترم تھا حبشیوں نے جنگی غرض و دین مسیحی کی اشاعت تھی حملہ کیا۔ ابرہۃ الاشرم

نے چالیس ہزار فوج کے ساتھ حجاز پر چڑھائی کی اور طائف اور تبالہ کو فتح کر لیا لیکن مکہ کو قریش نے بالکل توقع کے خلاف نہایت بہادری کے ساتھ بچا لیا۔ نجات کی امید اس قدر کم تھی کہ مکہ کا بچ جانا بتوں کی نظر توجہ کی طرف منسوب کیا گیا اور اس وجہ سے مکہ کی قدر و منزلت اور بھی زیادہ ہو گئی اور اس کے بعد سے یہ فی الواقع عربستان کا دارالحکومت بن گیا۔ تاہم نجد اور حجاز کے عرب قریش کی حکومت کو نہیں مانتے تھے اور اپنے شیوخ کے ماتحت تھے اور انہیں کسی قسم کا خیال عام قومی منافع و مضار کا نہ تھا مگر اب انہیں بھی ابرہہ کے واقعہ نے کسی قدر خواب غفلت سے جگایا اور جس وقت انہوں نے بنطیوں اور حمیریوں کے انجام پر نظر ڈالی تو انہیں معلوم ہوا کہ بجز اتحاد قومی کے بیرونی خطروں سے بچنے کی کوئی اور صورت نہیں ہے۔

عربستان کا رجحان اتحاد سیاسی کی طرف عکاظ کا میلا اور شاعری کے جلسے

اس اتحاد قومی کے اور بھی بہت سے اسباب تھے اولاً کل قوم عرب متحد الاصل تھی اسمعیلیوں اور بعطانیوں کی باہمی رقابتیں دور ہو چکی تھیں اور نجاشی کی چڑھائی نے ان دونوں خاندانوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا تھا اور تھوڑی ہی سی کسر باقی تھی کہ یہ دونوں ایک ہی پرچم کے نیچے جمع ہو جائیں۔ ثانیاً ان کل قبائل کے رسوم و عادات بھی متحد و تھے۔ باستثنا چند قبائل نصاریٰ اور یہود کے ساری قوم اسی قدیم بت پرستی اور انہی قدیم رواجوں کی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھی۔ ختنہ کی رسم عام تھی اور عورتوں کی حالت بمقابل مردوں کے نہایت ابتر۔ عورت فی الواقع لونڈی تھی تعدد ازدواج حد سے زیادہ تھا اور باپ اس خوف سے کہ اس کی لڑکی کی بے حرمتی نہو پیدا ہوتے ہی اُسے زندہ دفن کر دیا کرتا تھا کل قوم میں شدت کا زور تھا اور اُس کے ساتھ ہی نہایت مبالغہ کے ساتھ عزت و آبرو کا خیال۔

(باقی آئندہ)

فلسفۂ جمال

انسان، حیوان، شجر، حجر، یہ نیلگوں آسمان، یہ چمکتے ہوئے ستارے، اور تمام ہمارے گرد و پیش کی اشیاء میں سے کونسی ایسی چیز ہے جو حسین اور جمیل نہیں ہے اور وہ کونسی ایسی چیز ہے جسکو ہم خوبصورتی سے نہیں متصف کرتے ہماری طبیعت جو اس حسن حقیقی کا ایک پرتو ہے اور جو ازل سے حسن بینی اور حسن شناسی کا مذاق لیکر اس عالم کی سیر کو آئی ہے۔ جسکی پرورش و پرداخت محض حسن کے ہاتھوں ہوتی ہے اور جسکو خدا نے حسن یا فلسفہ جمال کے موضوع حقیقی نے خود اپنے دست خاص سے بنایا ہے ہر شے کو جمیل و حسین دیکھنا چاہتی ہے۔

جب ہم اس جمیل لذاتہ کے صنایع و بدایع پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمکو ہر جگہ حسن و جمال کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اللہ جمیل و یحب الجمال کے اصول کو پیش نظر رکھکر ہمارے روحانی مقتداؤں نے معرفتِ باری کا طریقہ محض عجائبات عالم اور اسکے صنائع بدائع پر نظر رکھنا تعلیم کیا ہے۔ اور ہمارے مادی مقتدا جس قدر عالم کی چھان بنان کرتے ہیں اور اس کے اجزاء کی تحقیق کرتے ہیں اسی قدر ان کو حسن و جمال کے زیادہ جلوے نظر آتے ہیں۔

حسن کی پرستش دنیا میں لوگوں نے بہت کی ہے۔ کسی نے اسکو رب النوع قرار دیا ہے اور کسی نے اسکو دیوی دیوتا مانا ہے اور کوئی اسکو "گاڈز" کہتا ہے مگر حیرت جو ہے وہ یہ ہے کہ گو اس لفظ مشترک کا استعمال دنیا بھر کے لئے کیا جاتا ہے۔ اور اس کا عمل مختلف الاقسام والماہیت اشیاء پر ہوتا ہے تاہم اسکی تعریف حقیقی ایک مدت تک نہو سکی۔

ابتدا سے لیکر اس وقت تک حکمار و فلاسفر نے اس مسئلہ پر بہت کچھ غور و فکر کیا مگر انکی عقلیں حسن کی حد سے باہر اور اسکی تشریح سے قاصر رہیں چنانچہ حسن کی منطقی جامع و مانع تعریف اسوقت تک کوئی موجود نہیں ہے اور جو موجود ہے وہ اعتراضات سے خالی نہیں یا تو اسمیں اسقدر تعمیم ہے کہ انمیں حسن کے علاوہ اور دوسری چیزیں اگر شریک شامل ہو جاتی ہیں اور یا اسقدر تخصیص ہے کہ اسکو پہنانے کی شے خود حسن کی قطع و برید کرنے کی نوبت آتی۔ اور ایسا ہونا بالکل اصول عقلی کے مطابق اور موافق ہے کیونکہ اگر حسن اضافی کی تعریف کرنا مدنظر ہے (جس سے میری مراد کوئی خاص صفت یا نوع حسن ہے) تو یہ کسیقدر آسان تھا۔ مثلاً۔ عورت مرد۔ گھوڑے، شیر، کبوتر کے حسن کی تعریف علیحدہ علیحدہ کرنا آسان ہے مگر جب ہم لفظ حسن پر ایک مجموعی نظر ڈالتے ہیں اور اس حسن کلی کی تعریف کرنا چاہتے ہیں یا اسکی حیثیت سے اس مسئلہ پر نظر ڈالتے ہیں توہم اس عظیم الشان سمندر کے آگے کھڑے ہو کر صرف اپنے خط حافظ کی استقامت تو دیکھتے ہیں لیکن اسکا پتہ نہیں چلتا کہ اس قلم شعاع کے انکسار کے بعد اس خط عمودی سے آگے کیا ہے۔

خصوصاً اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ اس محمول۔ کے موضوع جستہ رہیں سب کی تاثیر نفس پر ایک ہوتی ہے اور اگر اختلاف ہونا بھی ہے تو وہ محض کم ہماری حیرت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے لیکن ہم ان سب حیرتوں اور کسل عقلی کو نظر انداز کرکے اپنی عقل رسا کے گھوڑے کو تازہ دم کرکے پھر میدان غور میں گرم سیر کرتے ہیں توہم کو اپنی منزل مقصود کی روشنی دور سے دکھائی دیتی ہے اور ہم کو رفتہ رفتہ آثار منزل نظر آنے لگتے ہیں اور ہم اپنی منزل تک پہنچ جانیمیں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اور اپنی ان تھک محنت کا نتیجہ ہم کو ملجاتا ہے۔

حکمار اور فلسفیوں کا حسن و جمال کے متعلق نہایت سخت اختلاف ہے اور یہ اختلاف آرا

کثرتِ آرا کا باعث ہو گیا ہے لیکن تاہم اگر ہم اسراف میں اقتصاد کو کام میں لائیں اور
تعدد کو وحدانیت یا اس سے قریب کرنا چاہیں تو یہ سب مذاہب مختلفہ کے مذہبوں کی
تحت میں آجاتی ہیں انمیں سے ایک تو وہ ہے جو جمال کو محض ذات مدرک (دیکھنے
والے) تک محدود رکھتا ہے اور ان اشیاء سے جو خارجی ہیں یا قوت ادراکیہ کا معقول ہیں
اس خوبی کو سلب کر لیتا ہے۔ دوسرا مذہب وہ ہے جو یہ مانتا ہے کہ نہیں جمال وحسن
کا قیام ذات مدرک میں نہیں ہے بلکہ کسی کا حسین وجمیل ہونا خود اسی شے میں قابلِ
اعتبار ہے اور اشیاء خارجی ہی خود حسین ہوتی ہیں اسکو دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ پہلے
مذہب والے یہ کہتے ہیں کہ جمال نہ تو ان اشیاء میں ہے جنکو ہم دیکھتے ہیں اور نہ ان
باتوں میں جنکو ہم سنتے ہیں بلکہ یہ صفت خود ہماری ذات میں ہے اور ہم جس چیز
کی طرف چاہتے ہیں اسکو منسوب کر دیتے ہیں۔ دوسرے مذہب کے پیرو یہ بیان کرتے
ہیں کہ نہیں جمال ایک خارجی شے ہے انتزاع ذہنی نہیں بلکہ جن چیزوں کو ہم دیکھتے ہیں
اور جن باتوں کو ہم سنتے ہیں انمیں جمال خود موجود ہے۔

پہلے مذہب کے ماننے والے تین اسکول ہیں جنمیں اس امر پر تو اتفاق ہے کہ
کہ حسن مدرک میں ایک شے ہے بلکہ اسکی ماہیت وحقیقت میں اختلاف ہے
پہلا اسکول تو یہ کہتا ہے کہ جمال ایک لذیذ انفعال نفسانی کا نام ہے جسکو ہر شخص
اس وقت محسوس کرتا ہے جبکہ اسکے سامنے اس انفعال کو ہیجان میں لانے والی
کوئی چیز آجاتی ہے اس مذہب کو مثال میں یوں سمجھو کہ ان لوگوں کے نزدیک جمال
کی حالت بالکل رنگ یا مزہ کی سی ہے، ذائقہ کی کئی قسمیں ہیں۔ ترش، میٹھا۔ پھیکا۔ یہ
مزے خود چیزوں میں علیحدہ مستقلاً موجود نہیں ہیں بلکہ مثلاً جب کوئی امرتی کھاتا ہے
تو اس سے زبان کے اعصاب متاثر ہوتے ہیں اور یہ تاثیر دماغ کیطرف رجوع
کرتی ہے اسی تاثیر کا نتیجہ ہے کہ مزہ شیریں محسوس ہوتا ہے اور جب یہ شعور واحساس

نفس کو حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اسکو امر تی کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ پس یہ معلوم ہوا
کہ شیرینی اس قوت کا نام نہیں ہے جو قوت ذائقہ کو متاثر کرتی ہے بلکہ اس احساس
کو کہتے ہیں۔ اسیطرح رنگ کوئی مستقل چیز نہیں ہے بلکہ وہ اس روشنی کا نتیجہ ہے
جو ان اجسام ذی اللون سے منعکس ہوتی ہے بعینہ یہی حال جمال کا بھی ہے
جب ہم کسی شے کو حسین یا خوبصورت کہتے ہیں تو اس شے میں خود کوئی جمال نہیں
ہوتا بلکہ نفس کو لذت آمیز انفعال اسکے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے اسی کا نام ہے جمال
پھر ہم اس جمال کو اس شے کی طرف منسوب کر دیتے ہیں جیسا کہ ابھی ہم لکھ آئے
ہیں کہ شیرینی ایک خاص قسم کے احساس کا نام ہے جسکو ہم شے خارجی کی طرف
منسوب کر دیتے ہیں لہذا جمال وہ قوت نہیں ہے جو یہ انفعال پیدا کرتی ہے
بلکہ خود اس انفعال کو جمال کہتے ہیں اسی وجہ سے جمال کا تعلق مدرک سے ہوگا
نہ (شے خارجی) سے۔

دوسرا اسکول اسی گروہ کا یہ کہتا ہے کہ جمال نام ہے چند انسانی خیالات کے
مجموعہ کا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نفس انسانی بعض چیزوں کے دیکھنے
اور سننے سے خوش ہوتا ہے اور جب وہ ان دیکھی یا سنی ہوئی چیزوں کا اعادہ کرتا ہے
تو یہی پہلا انفعال پھر عود کرتا ہے یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض چیزوں کو بیشتر دیکھا تھا
اور اسنے طبیعت منفعل ہوئی تھی اور اسکے بعد ایسی چیزوں کو دیکھا کہ انمیں اور پہلی
چیزوں میں مخالفۃ یا مشابہۃ ہے تو یہ مخالفۃ یا مشابہۃ پہلی چیزوں کو یاد دلاتی ہے اور
وہ پہلی چیز ایک انفعال لذیذ پیدا کرتی ہے۔

مثلاً ایک شخص نے ایک پارک دیکھا جس میں سبزہ لہلہا رہا ہے۔ جا بجا کیاریاں
پھلوں سے بھری ہوئی ہیں اور نفیس نفیس چھوٹے چھوٹے پودے ایک
متناسب بعد پر ایک ترتیب سے قائم ہیں اور کہیں کہیں دو دو ر پر سایہ دار درخت جھوم

رہے ہیں۔ فوارہ اپنی پھوار چھوڑکر نیا منظر پیش کر رہا ہے تو یہ سینزری یا نظارہ مختلف دوسری صورتیں اور دوسرے انفصالات پیدا کریگا جنسے اور زیادہ مسرت انگیز انفصال پیدا ہوں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دل و دماغ اِن انفصالات جمال سے پر ہو جائیگا۔ پس جمال اس فرقے کے نزدیک مدرک کے ایتلاف افکار اور اسکے انفصالات کی ترکیب کا نام ہے۔ جو مدرک میں پایا جاتا ہے نہ شئے خارجی میں۔

اسی گروہ کا ایک تیسرا اسکول جمال کے متعلق یہ "تھیوری" قائم کرتا ہے کہ جمال نام ہے دل خوش کن اوصاف کا مثلاً اگر کسی خط کو دیکھو کہ وہ منحنی کھینچا گیا ہے اور اسکی رفتار بالکل دریا کی موج بنائی گئی ہے تو وہ خط مجکو خوبصورت معلوم ہوگا وہ خط اس وجہ سے خوبصورت نہیں ہے کہ اسمیں جمال وحسن پایا جاتا ہے بلکہ اسوجہ سے وہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اسمیں ہنرمندی اور لطافت پائی جاتی ہے جو ہی کی صفات عقلیہ میں سے ہیں جنسے نفس انسانی خوش ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس خط میں جمال وحسن پایا جاتا ہے لہذا جمال کوئی خارجی شئے نہیں ہوئی بلکہ خود ذات مدرک میں ہے۔

گو انمیں سے ہر ایک اسکول کے دلائل نہایت کمزور ہیں اور فرداً فرداً ہر ایک پر تنقید کرنا مشکل امر نہیں ہے لیکن ہم اسی مسئلہ پر نظر کرتے ہیں کہ حسن وجمال ذات مدرک میں پایا جاتا ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ حسن وجمال کا وجود خارجی نہیں ہے بلکہ جب مدرک کے وجود کا اشتعار ہو جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے حسن کے وجود کا اشتعار بھی ہو جائے اگر کوئی دیکھنے والا موجود نہو تو کوئی شئے جمیل نہو مثلاً موتی جب دریا میں سیپی کے اندر ہو تو وہ اس بنا پر خوبصورت اور قابل قدر شئے نہوگا کہ اسکو کوئی دیکھنے والا نہیں ہے یہ ایک نہایت مہمل بات ہے۔ جسکو عقل سلیم جائز نہیں رکھتی۔

اب ہم اس گروہ کے مذاہب کی تحقیق کرتے ہیں کہ حسن شئے خارجی میں پایا جاتا ہے

اسکا انحصار ذات مدرک تک نہیں اس گروہ کے بھی کئی اسکول ہیں ایک تو یہ کہتا ہے کہ جمال نام ہے جدت و غرابت کا جو اس مشہور مقولہ کے موافق ہے کل جدید لہ بہجۃ۔ لیکن یہ مذہب بالکل غلط ہے اور اسپر صاف طور سے یہ اعتراض ہوتا ہے کیونکہ یہ ضرورت نہیں ہے کہ ہر جدید و غریب شئے حسین و جمیل ہی ہو مثلاً جب کوئی پہلے پہل اونٹ کو دیکھتا ہے باوجودیکہ وہ نئی چیز ہوتی ہے گو اُسے دیکھکر استعجاب ہوتا ہے تاہم اسکے بدنوار ہونے کا خیال فوراً ہی ذہن میں آجاتا ہے۔ اور اسکی صورت مکروہ نظر آتی ہے۔

ایک دوسرا اسکول یہ مانتا ہے کہ ہر جمیل و حسین شئے مفید و نافع ہوتی ہے لہذا جمال نام ہے نفع اور فائدہ کا لیکن یہ مذہب بھی میری رائے میں مخدوش ہے کیونکہ اسکا عکس یہ ہوگا بعض مفید اشیا جمیل ہوتی ہیں جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض مفید ایسی چیزیں ہیں جو جمیل ہیں نفع اور جمال میں کوئی تلازم نہیں ہے۔ مثلاً گدھے کو دیکھو کہ کسقدر بدصورت ہے مگر پھر اسی کے ساتھ نہایت مفید ہے۔ اسی کے ساتھ مور پر نظر ڈالو دیکھو کسقدر خوبصورت ہے مگر گدہے کے مقابلہ میں کچھ بھی مفید نہیں ہے۔

ایک اور اسکول یہ خیال کرتا ہے کہ جمال نام ہے وحدۃ تعدد کا اسکی وجہ یہ ہے کہ عقل انسانی کا یہ مقتضا ہے کہ اشیاء کے مختلف اجزا کو مجتمع اور وحدانیت کی صورت میں دیکھنا چاہتی ہے یہی وجہ ہے کہ مختلف نغمے ایک سُر یا لحن کی صورت میں جب جمع کر دیئے جاتے ہیں تو بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ بچ رنگی چیز نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر تعدد کو وحدت کی صورت میں نہ جمع کریں تو یہ خوبی و جمال مفقود ہو جاوے۔ اگر کسی لحن میں صرف ایک ہی نغمہ ہو تو اسکا بار بار اعادہ ناگوار خاطر ہوتا ہے مگر یہ بات بالکل غلط ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ بعض ایک رنگ ہی کی چیزیں عمدہ ہوتی ہیں۔ مثلاً آفتاب کے غروب کے بعد جو آسمان کا رنگ ہوتا ہے وہ نہایت درجہ بھلا معلوم ہوتا ہے مگر اسمیں وحدت تعدد نہیں ہے حالانکہ اس کے

حسین اور خوبصورت ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے۔

ایک اسکول اسی گروہ کا یہ بھی مانتا ہے کہ جمال نام ہے ترتیب اور تناسب کا ترتیب کا مطلب یہ ہے کہ شے مرکب کے اجزا اس ترتیب سے ہوں کہ جس مقصود کے لئے وہ لائے گئے ہیں اسکو پورا کرتے ہیں۔ مثلاً آنکھ آگے کے رخ کے لئے نہایت موزوں ہے۔ اگر گردن کی طرف ہوتی تو یہ اپنا مقصد نہ پورا کر سکتی، لہذا ترتیب نہ پائی جاتی جسکا نام جمال ہے تناسب سے یہ مقصود ہے کہ کسی شے کے بعض اجزا کو بعض کے ساتھ مناسبت ہو خواہ زمانی اور خواہ مکانی اسطرح پر کہ انکے وجود کا جو مقصود ہے وہ پورا ہوتا ہو۔ مثلاً گھوڑے کے پیر انکا تناسب اسکے جسامت اور جثہ کے لحاظ سے اگر اسی کی ہاتھ پاؤں کے بجائے کتے کے ہاتھ پاؤں اسکو دیئے جاتے تو وہ اس بوجھ کو نہ اٹھا سکتے اور تناسب نہوتا جس کا نام جمال ہے۔ یہ مذہب سب مذاہب میں زیادہ مضبوط اور عمدہ ہے گو اسپر بھی یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ بعض قبیح چیزوں میں بھی تناسب پایا جاتا ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ وہ قبیح اس وجہ سے ہے کہ آپس میں پورا پورا تناسب نہیں پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایک ہی قطع کی چیز ایک قوم پسند کرتی ہے اور دوسری قوم اس سے نفرت کرتی ہے اسکا کیا سبب ہے اگر وہ حسین ہے تو ہر حالت میں حسین رہنا چاہیے اسکا جواب یہ ہے کہ اس کا انحصار اختلاف مذاق پر ہے جسکے متعلق پھر بحث کرینگے۔

ضیاء الحسن علوی

رباعی

کالج کو تھی مثل صبح شام مہدی　　اعجاز مسیحا تھا کلام مہدی
مُردُوں کے یہ کہتے ہیں ٹرسٹی واللہ　　مہدی تھا علیگڈھ کا امام مہدی

مولوی عبدالقدوس قدسی

اطمینانِ قلب

عین اسوقت جبکہ گارشگوف گھٹاٹوپ اندھیرے میں قدم مارے بڑھا چلا جا رہا تھا
سینٹ پیٹرسبرگ کے بڑے گرجے کے گھنٹے نے دو بجائے۔ قرب کی وجہ سے
گارشکوف کے کان میں خوب زور سے آواز پہونچی لیکن عالمِ تفکر میں اوسے معلوم
نہوا کہ کیا بجا ہے وہ اسی طرح سراسیمہ قدم بڑھائے آبادی کے کنارے پر پہونچگیا۔
یہاں آن کے اوسے کسی قدر اطمینان ہوا اور وہ بڑبڑا کے کہنے لگا۔ "وہ آہ میںنے
اس دنیا میں بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ بڑی مایوسیاں سہی ہیں۔ اب تو برداشت
کی بالکل طاقت نہیں ہے لیکن میں اِن پچھلے جگرخراش واقعات کو یاد کرکے اپنا
قیمتی وقت کیوں ضایع کر رہا ہوں مجھے تو اپنی مشن پوری کرکے ہمیشہ کے لئے آرام
وآسایش حاصل کرنی چاہیئے" اِن الفاظ کو ادا کرنے کے بعد گارشکوف نے
اپنے کوٹ کی جیب سے پستول نکالا اور اسکے گھوڑے کو ایک پایہ پر چڑھا کر
دوسرے پر چڑھا ہی چاہتا تھا کہ دفعتہً کسی نے پیچھے سے آنکر تیزی سے پستول اسکے
ہات سے نکال لیا۔ یہ کام ایک چشم زدن کا تھا جسکے انصرام کو گارشکوف نے نہایت
حیرت سے دیکھا اور اجنبی سے اسطرح مخاطب ہوا (گارشکوف) جناب جان بچانے
کے لئے مجھے آپ کا ممنون ہونا چاہیئے تھا لیکن صورتِ حال اسکے خلاف ہے
کیونکہ آپنے دیکھ لیا ہے کہ میں جان کے دیدینے میں اپنا فائدہ سمجھتا ہوں۔
(اجنبی) افسردہ خاطر دوست یہ صرف آپ کا خیال ہی خیال ہے آپ میری نصیحت
پر عمل کیجیے اور پھر دیکھیے کہ آپ کی تمام کلفت ورنج ہمیشہ کے لئے معدوم اور خوشی
وانبساط ہمیشہ کیلیے آپکے دل میں جاگزین ہو جاتا ہے یا نہیں۔

گارشکوف (اجنبی کے الفاظ سے تسکین پاکر) جناب من میں نے مشرق کا مشہور قصہ چہار درویش پڑھا ہے۔ چنانچہ میں آپ کو اس وقت خواجہ خضر سے تشبیہہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(اجنبی) اس حسن ظن کے لئے جسکے بیان کرنے میں آپنے مشرقی مبالغے سے کام لیا ہے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں چونکہ مجھے بہت کم فرصت ہے لہذا مختصر الفاظ میں جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ عرض کئے دیتا ہوں پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ خلق اللہ کو فائدہ پھونچانے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہا کریں دوم میں آپ کو ایک خط دیتا ہوں جس میں اوس چیز کا نام درج ہے جو آپ کو تمام تفکرات سے نجات دیسکتی اور آپکے دل کو خوش و مسرور رکھ سکتی ہے یہ واضح رہے کہ یہ ایک عزیز الوجو اور بڑی بیش بہا شے ہے پس آپ کو یہ خط ایک ایسے انسان کو دینا ہو جو آپکے خیال اور رائے میں ایک ایسی چیز رکھ سکتا ہے اس کے بعد فوراً ہی وہ چیز آپ کو مل جائے گی لیکن جس شخص کے ہاتھ میں یہ خط دیا جاے اوسکی نہایت اطمینان اور احتیاط سے جانچ کر لی جاے یہ چیز خدا کے خاص خاص بندوں کے پاس ہوتی ہے۔ اسلیئے بڑی بیش بہا اور انمول ہے تاہم اگر آپ نے احتیاط اور دانائی سے کام لیا تو ضرور عنقریب ہی مدعا حاصل ہو جائیگا اور اگر ایسا نہو تو آپ کو اختیار ہوگا کہ خودکشی کرلیں مجھے صرف اتنا کہنا اور باقی ہے کہ کبھی میرا پتہ دریافت کرنے کی کوشش نکرنا ورنہ خوف ہے کہ آپ کا مقصد حاصل نہو یہ لو اپنا خط و پستول اور خدا حافظ" اسکے بعد اجنبی نے جلدی سے ایک سربمہر لفافہ اور پستول گارشکوف کے حوالہ کیا اور بلا انتظار جواب اندھیرے میں غائب ہو گیا گارشکوف جو عالم تحیر میں ڈوبا ہوا تھا جب تھوڑی بعد ہوش میں آیا تو اوسنے اجنبی کی حرکات و سکنات اور گفتگو کی نسبت غور کرنا شروع کیا لیکن وہ سواے اسکے اجنبی ایک نیک نہاد اور

شریف آدمی تھا اور کسی قسم کی رائے اِس سربستہ راز کی نسبت قائم نہ کرسکا جسکو صرف چند لمحہ کی ایک اجنبی کی ملاقات نے پیدا کردیا تھا تھوڑی دیر کے لئے اِس کے دل میں خیال آیا کہ لفافے کو پھاڑکر مضمون خط سے آگاہی حاصل کرے لیکن اوسی فوراً ہی خیال آیا کہ اجنبی ایک شریف اور نیک نہاد انسان ہے اسلئے اِس کی نصیحت پر عمل کرنا میرے لئے ضرور سودمند ثابت ہوگا پس اوسنے لفافے کو جیب میں ہی رہنے دیا اور آیندہ اجنبی کی مجوزہ اسکیم پر عمل کرنے کے خیالات کو دماغ میں لئے ہوئے روانہ ہوا۔

تخمیناً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد گارشکوف ایک تنگ گلی میں داخل ہوا جس میں لالٹین کی مدہم روشنی کے ذریعہ چند آدمی کشمکش کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ گارشکوف کو آگے بڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ چار آدمی ایک شخص کو دبائے بیٹھے ہیں اور اِس سے فرمائش کر رہے ہیں کہ جلد گھڑی انگشتری و نقدی وغیرہ اون کے حوالے کردے گارشکوف کو یہ حالت دیکھکر اجنبی کی نصیحت یاد آئی اور اوسنے للکار کر کہا بدمعاشو اِس جنٹلمین کو چھوڑ دو ورنہ تمہاری خیر نہیں جواب کی بجائے ایک لیٹرے نے پستول سر کیا گولی گارشکوف کے کان سے کوئی دو انچہ کے فاصلہ پر گذر گئی اسی اثنا میں گارشکوف نے وہ پستول جسکو اپنے ہلاک کرنے کے لئے بھر اتھا داغدیا۔ گولی ایک قزاق کے سر میں جالگی وہ فوراً ہی مردہ ہوگیا دوسرا قزاق اسوقت بھی اپنی پستول کو استعمال کیا ہی چاہتا تھا کہ گارشکوف نے دوسرا فیر کیا اسوقت بھی گولی نشانہ پر جالگی اور اِس قزاق نے اپنے مردہ ساتھی کا عدم آباد تک ساتھ دیا اس وقت جنٹلمین نے زور کرکے تیسرے قزاق کو چت کرلیا چوتھا یہ حال دیکھکر بھاگ گیا گارشکوف جنٹلمین کے قریب آکر کہنے لگے جناب آپ کو اِن بدمعاشوں نے کسی قسم کا نقصان تو نہیں پہونچایا۔

(جنٹلمین) میں آپ کا بیحد مشکور ہوں کہ آپ نے عین وقت پر پہونچکر میری امداد کی ورنہ معلوم یہ بدمعاش میرے ساتھ کس طرح کا سلوک روا رکھتے (بدمعاش کی طرف مخاطب ہو کر جس کے سینہ پر وہ چڑھا بیٹھا تھا) اب تم کو چاہئے کہ زار پر حملہ کرنے کی سزا میں سائیبریا کے سونے جنگل کی ہوا کھانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

گارشکوف (خوشی اور تعجب سے بھری ہوئی آواز میں) تب تو مینے آج اپنے بادشاہ کی خدمت کرنے کا فخر حاصل کیا ہے۔

زار (جسنے اپنا بھیس بدلدیا تھا) او میرے عزیز دوست میں تمہیں اپنا خاص مصاحب مقرر کرتا ہوں۔

رات کے دس بجے کا وقت ہے۔ زار اپنے پرائیوٹ کمرے میں گارشکوف کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ کمرے کی خوبصورتی اور سجاوٹ کا کیا بیان ہوسکتا ہے مشرق و مغرب کے بادشاہ کا خاص کمرہ جسکی خود مختارانہ حکومت روئے زمین کے ۱/۲ حصے پر ہے جس قسم کے عمدہ قسم کے سامان سے مزین ہو وہ کم ہے۔ سرخ موٹی اور اعلےٰ درجے کی بانات کے پردے دروازوں اور کھڑکیوں پر پڑے ہوئے سرد ہوا کو روک رہے ہیں کمرے کے بیچ میں ایک نہایت خوشنما میز پر سامان تفریح مثل سگار چار وغیرہ کے رکھا ہوا ہے کمرے کی دیواروں میں چاروں طرف زار کے خاندان کے ممبروں کی تصویریں آویزاں ہیں اونی قالین جو اس قدر دبیز ہیں کہ چلنے میں پیر دھنسے جاتے ہیں کرسیوں کے پاس قرینے سے بچھائے گئے فرنیچر لارڈ کرزن کے ہاتھی دانت کے فرنیچر کو بھی مات کر رہا ہے غرض کہ کمرہ اس طرح کا سجا ہوا ہے کہ گویا فردوس بریں کا ایک کمرہ معلوم ہو رہا ہے اس قسم کے کمرے میں زار اور گارشکوف چپ چاپ بیٹھے ہوئے اپنے اپنے خیالات میں مبہوت ہو رہے ہیں دفعتہً زار نے سر اوٹھا کر غور سے گارشکوف کے

چہرہ پر نظر جمائی اور اس طرح مخاطب ہوا "میرے عزیز دوست خدائے تعالیٰ نے عین ضرورت کی حالت میں ایک ایسے شخص کو بھیجدیا ہے جو ہر طرح قابلِ اعتبار ہے اور جسکو میں اپنی مشکلوں اور تکلیفوں میں شریک کرکے اپنے دلکا بوجھ ہلکا کرسکتا ہوں

گارشکوف (چونک کر) کیا حضور کو بھی کوئی رنج پہونچ سکتا ہے؟ کیا ایسے زبردست بادشاہ کو جسکے یہاں ہن برستے ہوں اور جو بالکل مقتدر حاکم اپنی بیشمار رعایا کا ہو کسی قسم کی تکلیف ہوسکتی ہے۔

زار (بیچین ہوکر) جو شخص میری اندرونی حالت سے واقف نہیں ہے وہ کیونکر معلوم کرسکتا ہے کہ میں کتنی تکلیفوں اور مصیبتوں کا شکار ہورہا ہوں دیکھئے اس رپورٹ میں جو ابھی آئی ہے لکھا ہوا ہے کہ تمام بالٹک بیڑہ نیست ونابود کردیا گیا ہے شہر میں بم کے گولوں سے میرے خاندان کے کئی ممبروں کی جانیں تلف کردی گئی ہیں مجھے اپنی جان اپنی بیوی اور بچوں کی جانوں کا دن رات خطرہ لگا رہتا ہے۔ اگر تخت چھوڑ دوں تو ناقابلیت کا دھبہ لگ جائے جو تا قیام دنیا صفحاتِ تاریخ پر باقی رہے گا (یہاں پہونچکر زار کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے) صرف یہی مصائب نہیں ہیں جنکا میں شکار ہورہا ہوں اور دردناک واقعات بھی ہیں جو سینے کے صندوق میں پوشیدہ .... زار آگے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اوسے سخت گلوگیر پھندہ لگا اور وہ سانپ کی طرح پیچ وتاب کھانے لگا۔

گارشکوف (زیادہ پریشان ہوکر) "میں نہایت افسوس کرتا ہوں کہ سرکار والا کو میری حاضری خدمت سے اس وقت افسردہ خاطر ہونا پڑا اجازت ہو تو میں اپنے کمرے میں جاؤں۔ حضور آرام فرمائیں اور اس گفتگو کو کسی اور وقت کیلئے رہنے دیں"

زار (جسکی آواز سے ضعف وحرمان عیاں تھا) "مناسب ہے۔ خدا حافظ"

گارشکوف "میں بھی حضور کی سلامتی کی دعا کرتا ہوں اور خدا حافظ عرض کرتا ہوں"

گار شکوف ۔جب اپنے کمرے میں پہونچا تو اوسوقت اوسکا دماغ مختلف خیالات کا
شکار ہو رہا تھا اوسنے کمرے میں پہونچتے ہی کھڑکی کھولی اور اوسکے قریب ایک
آرام کرسی پر لیٹ گیا ۔ باغ کی ٹھنڈی اور معطر ہوا سے جب اوسکو کسی قدر سکون ہوا تو
واقعات گذشتہ سلسلے وار غور کرنا شروع کیا سب سے پہلا خیال جو اُسکے دماغ میں
بجلی کی تیزی سے گردش کرتا گیا وہ اسکی گذشتہ افسوسناک حالت تھی اسکے بعد
اجنبی کی ملاقات اور صرف ایک راستہ کی مساعدت بخت سے عروج و دولت کے
پانے کا خیال آیا بعد ازاں اوسے خیال ہوا کہ دنیا کی چیزیں کسقدر جلد
بدلنے والی اور تغیر پذیر ہیں ۔ لیکن یہ خیال بھی جلد ہی رفو چکر ہوا اور اب وہ سوچنے
لگا کہ زار کے پاس وہ چیز نہیں ہے جسے اجنبی ملاقاتی نے حاصل کرنے کی مجھے
رائے دی ہے ۔ کیونکہ اگر زار کے پاس یہ چیز ہوتی تو وہ اس حالت میں نہوتا جو
میں نے ابھی ابھی دیکھی ۔ گار شکوف کو کامل امید تھی کہ زار جو روئے زمین کے ۱/۶
حصے کا پوری پوری خود مختارانہ قوتوں کے ساتھ حکمراں ہے اُسے وہ شے مذکور
عطا کر دے گا ۔ لیکن موجودہ حالت نے اس امید کو بالکل ضایع کر دیا تھا اب تو
اسکے دل میں اس بیش بہا شے کے حاصل کرنے کا خیال اور زیادہ شوق سے
منقش ہو گیا ۔ اسلئے کہ وہ سمجھنے لگا تھا کہ اس سے بہتر کوئی شے نہیں ہے جو زار
کو بھی میسر نہیں اس مضمون پر وہ دیر تک غور کرتا رہا لیکن جب گھڑی نے بارہ بجائے
تو چونک کر آرام کرسی سے اُٹھ بیٹھا اور کپڑے بدل کر گھنٹی بجائی جب نوکر کمرے
میں داخل ہوا تو گار شکوف نے اوسکو گاڑی تیار کروانے کا حکم دیا ۔

نواح نیویارک کے ایک کاٹج میں امریکہ کا مشہور کروڑپتی راک فیلر آرام کرسی پر لیٹا ہوا
سگار پی رہا ہے ۔ راک فیلر کے مُنہ سے جسطرح پیچدار دھواں نکل رہا ہے اوسی طرح
پیچدار خیالات اوسکے دل میں لہریں لے رہے ہیں ۔ پاس کی میز پر اخبارات

و رسائل رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ اُسنے اِس وقت محفوظ ہونا پسند نہیں کرتا۔
یکایک دروازہ کھلا اور ایک حبشی نوکر جسے راک فیلر نے چند ہی روز ہوئے ملازم رکھا تھا کمرے میں داخل ہوا اور اطلاع کی کہ کروڑپتی کا پرایویٹ سکرٹری ملاقات کے لئے حاضر ہے۔
راک فیلر۔ (حبشی سے مخاطب ہوکر) میں ملاقات کے لئے تیار ہوں اونھیں لے آؤ
چنانچہ پانچ منٹ میں سکرٹری کمرے میں داخل ہوگیا۔
راک فیلر (کسی قدر اضطراب سے) کہئے کیا خبریں ہیں؟
سکرٹری۔ جناب آپ کے نام حاضری عدالت کا سمن جاری ہوگیا ہے اب تو آپ کو اسٹینڈرڈ آئل کمپنی کے مقدمے میں ضرور شہادت دینی ہوگی۔ میری اور آپ کی وہ کُل کوششیں جو اجرا سمن کے خلاف کی گئی تھیں بیکار ثابت ہوئی ہیں۔
راک فیلر (اُچھل کر گویا اوسے گولی لگی ہے) مایوسی۔ ناکامی اور مصیبت۔ اسے میرے خدا کیا دنیا بھر کی رنج و تکلیف کا مجھی پر خاتمہ ہوگا؟ کیا میں جو دنیا بھر میں سب سے زیادہ دولتمند ہوں اسقدر ذلت برداشت کرسکتا ہوں کہ عدالت کے کمروں میں ادنیٰ پیادے مجھے کشاں کشاں لئے پھریں۔ لعنت بکار مسٹر روزولٹ جسنے کروڑپتیوں کے خلاف جہاد عظیم کر رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ رعایا اُن کے خون کی پیاسی ہورہی ہے۔ چنانچہ دیکھئے مینے سوسائٹی سے بالکل قطع تعلق کردیا ہے۔ مجھے اپنی جان کا خوف ہر وقت دامنگیر رہتا ہے اسی لئے سوسائٹی سے الگ ہوگیا ہوں آہ میری حالت وطن میں جلا وطنی سے بدتر ہے۔ باوجود اس قدر دولت کے بہت سی باتوں میں مفلسوں سے بدتر ہوں .... غرض اسیطرح کے افسوسناک خیالات کا دریا اُمنڈا چلا آرہا تھا جسے راک فیلر اپنی زبان سے تیزی سے ادا کررہا تھا۔ حبشی نوکر جو پاس کے کمرے میں چھپا بیٹھا تھا اور اسکی گفتگو کو بڑے

زور سے سن رہا تھا یکایک کھڑا ہو گیا اور اسنے اپنے کمرے میں جاکر دروازہ بند کر کے سفیدیات کو خوب زور زور سے مل کر دھویا اور ایک قیمتی سوٹ جو جدید ترین فیشن میں داخل تھا ٹرنک سے نکال کر زیب تن کیا ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد آئینہ میں جب روشنی کے قریب آکر اپنے چہرے پر نظر دوڑائی تو بجائے حبشی نوکر کے زار کے خاص مصاحب گارشکوف کا چہرہ دکھائی دیا۔

گارشکوف یروشلم کی جانب کوئی بیس یا پچیس میل کے فاصلہ پر ایک گاڑی میں چلا جا رہا ہے اوسکے دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے ہیں راک فیلر کے یہاں نوکری تبدیل لباس و وضع کر کے اسلئے کی تھی کہ اس سے وہ شئے حاصل کرے جسکی اسے تلاش تھی لیکن جب اوسنے راک فیلر کو بھی محتاج مسرت پایا تو اوسکے مکان سے فوراً نکل کھڑا ہوا اور یروشلم (بیت المقدس) کا ارادہ کیا تاکہ وہاں کے کسی راہب اور خدا رسیدہ سے حصول مدعا میں کامیاب ہو۔ اب جبکہ اسنے دنیا کے دو بہت بڑے دولتمندوں سے اپنے حصول مدعا کا ذریعہ نہ پایا تو تارک الدنیا لوگوں سے رجوع کرنے کا ارادہ کیا اب وہ خوب سمجھ گیا تھا کہ دنیا کی کوئی حالت ہرگز ہرگز قابل اعتبار نہیں ہے زار اور راک فیلر کی اندرونی حالات کے مشاہدوں نے اوسکے دلمیں دائمی مسرت کا ذریعہ حاصل کرنے کا شوق حد سے زیادہ پیدا کر دیا تھا الغرض وہ توہمات کے ساتھ ساتھ یروشلم کی سڑک پر سفر کرتا رہا۔ جب سورج پوری تیزی سے چمکنے لگا تو گاڑیبان نے لب سڑک درختوں کے جھنڈ میں گھوڑی کھولدی اور اون کے اور اپنے ستانے کا انتظام کرنے لگا۔ گارشکوف ابھی گاڑی سے اُترنے نہ پایا تھا کہ قریب ہی سے بانسری کی آواز سنائی دی جو نہایت سُریلی اور شیریں تھی کھڑکی سے اوسنے سر نکال کر نواز ندہ کو دیکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ایک گڈریا لڑکا درخت سے تکیہ لگائے بیٹھا ہے اور مضمون ذیل بانسری سے ادا کر رہا ہے۔ لوگ

کہتے ہیں کہ میں مفلس بے پناہ ہوں مصائب نے مجھے اپنا شکار کر لیا ہے لیکن مجھ یہ باتیں ہیچ معلوم نہیں ہوتیں کیونکہ میں ہر وقت خوش رہتا ہوں جن لوگوں کی صحت اچھی نہیں ہے یا جنکے اعضا میں فتور ہے اونہیں دیکھ کر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں اور اپنی تندرستی پر بیحد مسرور رہتا ہوں پیٹ بھر روٹی نہ ملے یا کڑکڑاتے جاڑوں میں کافی کپڑا جسم ڈھکنے کے لئے نہ ملے تو بھی مجھے کچھ پرواہ نہیں ہاتھ میں بانسری لئے حمدیہ اشعار گاتا ہوا جنگل کی جانب گلہ کے ساتھ چلا جاتا ہوں. صحرائی میوے کچھ کچے اور کچھ پکے اور جھاڑیوں میں دوڑنے والا آب مصفا میری بھوک اور پیاس کی بڑی کشادہ دلی سے دعوت کرتے ہیں۔ جاڑوں میں آگ تاپ کر جسم کو گرم کر لیتا ہوں گرمیوں میں سارے بدن کو ڈھکنے کی چنداں پرواہ نہیں . . . .

گارشکوف (گاڑی سے اُترکر اور لڑکے کے پاس آکر) اگر تم منظور کرو تو سو اشرفیاں تمہاری نذر کروں تاکہ تم اونھیں اپنے کام میں لاسکو۔

(لڑکا) (بے پروائی سے) جناب مجھے اس رقم کی ضرورت نہیں جو لوگ ناقص الاعضا اور مفلوک ہیں اونہیں دیدیجیے یہ کہکر لڑکے نے پھر بانسری بجانی شروع کر دی اور مضمون ذیل کو دلکش نظم میں ادا کیا " قضا و قدر کا جو کام میری مرضی کے مطابق نہیں ہوتا ہے بس اوس سے کبھی ملول نہیں ہوتا قطعہ

بجز رضا بہ قضائے خدا منی شاید بغیر صبر بوقتِ بلا منی شاید
ازانچہ رفت قلم سرکش و گریہ بیا بروں رواز خط او گر تر امنی شاید

اپنے پر پورا بھروسہ اور کامل اطمینان اوسکی محبت دن رات آگ کی طرح میرے سینہ میں روشن رہتی ہے اسی لئے مجھے اطمینانِ قلب اور اس کے ذریعے سے دائمی مسرت حاصل ہے . . . . . . اب تو گارشکوف سے رہا نہ گیا اپنا بانہ کل حال اقدامِ خودکشی سے موجودہ ملاقات تک لڑکے کو منفصل سنا دیا اور اوس لفافے کو

جسے اجنبی نے دیا تھا لڑکے کے حوالہ کیا اور کہا میرے خیال میں کوئی شخص تم سے بہتر اس بیش بہا چیز کے دینے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔

لڑکا۔ اگر میرے اختیار میں ہو تو میں ضرور دیدونگا لیکن میں پڑھنا نہیں جانتا ہوں اس خط کے مضمون سے آپ ہی مجھے آگاہ کر دیجئے۔

گارشکوف نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافے کو چاک کیا تو اندر سے ایک نہایت سفید کاغذ نکلا جسپر طلائی روشنائی سے جلی حروف میں "اطمینانِ قلب" لکھا ہوا تھا۔ گارشکوف نے اس لفظ کو آواز بلند پڑھا۔

لڑکا۔ جو علمی سبق آپ نے آجتک پڑھا ہے اُس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کو شروع ہی سے کامیابی ہو رہی تھی جسکو آج میری ملاقات نے اختتام پر پہونچا دیا۔

گارشکوف (خوشی سے بھری ہوئی آواز میں) پیارے لڑکے تمہارا خیال ٹھیک ہے اور اپنے تئیں تمام عمر تمہارا ممنون رہونگا۔

محمد عبداللہ خاں

چرخ، کیں فتنہ گر ہیاسے تو آغاز گرفت　　مگر ایں شیوہ از اں چشم فسوں ساز گرفت

ہر کہ یک بار نظر برخ خوبِ تو کشاد　　بایدش دیدہ ز دیدارِ جہاں باز گرفت

خبر ش نیست زداماں تر خلوتیاں　　آن کہ اُو خردہ بہ رندانِ نظر باز گرفت

ماجرائے منِ رسوا شدہ ہر جا فاش است　　ابلہ آن بود کہ ایں واقعہ را راز گرفت

روزگار ے است کس ایں قصہ بپایاں نرسا　　گرچہ صد بار فرو خواند و زسر باز گرفت

من بہ انجام رہِ عشق گرفتم در پیش　　ای خوش آن کس کہ خود ایں شیوہ ز آغاز گرفت

ابلہی بود کہ مرغِ دلِ من، رم دادی　　ایں ہماں بود کہ از دستِ تو پرواز گرفت

مژدہ گوئید بہ رنداں می آشام کہ باز　　صحبتِ محتسبِ شہر بہ من ساز گرفت

بزم را دید کہ از نغمۂ دوشینہ تہی است
شبلی آن زمزمہ را باز ز آغاز گرفت

فراقِ نل میں دمن کی بیقراری

ہائے! یہ جوشِ جوانی - اور یہ دردِ انتظار
یہ سوادِ شامِ غم - یہ ظلمتِ شبہائے تار

یہ کفِ پائے حنائی - یہ بیاباں گردیاں
اُف رے نیرنگی تری اے گردشِ لیل و نہار

میں کہاں - یہ خار خارِ دشت پیمائی کہاں
تیری چالیں ہیں مگر او آسمانِ دوں شعار

رحم کر - اے پنجۂ بیدادِ وحشت - رحم کر
چاک ہے ہاتھوں سے تیرے دامنِ صبر و قرار

المدد! اے سیلِ اشکِ دیدۂ خونابہ ریز
مجھکو رو لینے دے جی بھر کر - کہ خالی ہو کنار

بیکسی میں موت بھی آتی نہیں کمبخت پاس
اے اجل مرنے پہ بھی اب تو نہیں ہے اختیار

پھٹ پڑا بیکس سمجھ کر ہائے! مجھ پر آسماں
دشتِ غربت میں چھُٹا کیا ہاتھ سے دامانِ یار

پوچھ! اے بادِ صبا! ہم دشت گردوں کا نہ حال
پنڈلیاں گھائل ہیں خستہ ایڑیاں تلوے فگار

تم سے کانٹو! دل کو تھا لطفِ خلش شوہر کے ساتھ
تم میں اک دلکش ادا تھی - تم میں اک دلکش بہار

کس قیامت کے تھے وہ صحرا نوردی کے مزے
آبلے جب پائے نازک کے تھے تم سے ہمکنار

ہر قدم پر ہائے! وہ جوشِ بہارِ نقشِ پا
خون میں ڈوبی ہوئی اک اک زبانِ نوکِ خار

خون آلودہ اُدھر گل سا گریباں چاک چاک
دوشِ نازک پر ادھر سبزہ سا آنچل تار تار

دل میں عالم آہ! اجزای پریشاں کا ادھر
موجِ صرصر سے ادھر گیسو پریشاں روزگار

عیشِ رفتہ کا وہ ماتم - یادِ ایامِ نشاط
چپکے چپکے وہ زباں پر شکوۂ لیل و نہار

آسماں سے ہائے! وہ اپنی تباہی کا گلہ
وہ سکوتِ شب میں لب پر نالۂ بے اختیار

وہ زمیں جھلسی ہوئی وہ جنبشِ بادِ سموم
وہ بگولے آہ! جنمیں عالمِ رقصِ شرار

وہ پیادہ پائیاں وہ آبلہ فرسائیاں
وہ عزمِ صحرا نوردی اور وہ ایذائے خار

تشنگی سے ہائے! لب پر وہ صدائے العطش
دوپہر کی دھوپ میں وہ جستجوئے آبشار

بھوک کی شدت۔ کڑاکے کے وہ فاقے الامان
کچے میوے ہای! وہ صحرا میں کرنا زہر مار

تھی گراں مجکو اگرچہ شب کی شبنم۔ دن کی دھوپ
تیری خاطر کی مگر ہاں نوردی اختیار

چلدیا تو مجھکو تنہا چھوڑ کر صحرا میں آہ!
مجھسے او وعدہ شکن تھے کیا یہی قول و قرار

تجھکو پیمان محبت کی قسم! او بے وفا!
یک بیک کیوں دل میں آیا میری جانب سے غبار

دشت پیمائی کی ایذا تھی اگرچہ جاں گسل
میں رہی سو جاں سے قدموں پر ترے ہو کر نثار

پائے نازک میں نہ چبھ جائے ترے کانٹا کوئی
میں نے جھاڑا مدتوں صحرا کا پلکوں سے غبار

جب بڑھا درد جگر جب لگی بیتابی بڑھی
کر لیا سینہ پہ رکھکر ہاتھ تجھکو ہمکنار

سر ترا صحرا میں وقف بالش زانو رہا
اور رہی شب بھر نگہباں دیدۂ اختر شمار

مجھکو کب تھا تیری خدمت تیری طاعت سے دریغ
مجھسے توڑا کیوں تعلق ہای! او غفلت شعار

حیف! اتنا تو دم رخصت کیا ہوتا خیال
کون اس صحرا میں اس بیکس کا ہوگا غمگسار

شیر و اژدر ہیں کمیں میں اور بیاباں ہولناک
کیسے کاٹیگی اکیلی ہاے! یہ شبہاے تار

شاق ہے بیدرد! دل پر صدمۂ درد فراق
آ! لگا لے مجھکو سینے سے کہ ہوں میں بیقرار

تیرے صدقے! تجھکو انداز تغافل کی قسم
پیچھے پھر کر دیکھ لے او جانیوالے ایکبار

تو نے بھی دامن نہ پکڑا اسکے اے درد فراق!
اٹھ گیا پہلو سے میرے اک رفیق غمگسار

کر چکی میں تیرا اے جذب محبت امتحاں
دیکھ لی تیری کشش اے جذبۂ اختیار

ہو گیا نظروں سے پنہاں آہ! غربت میں کوئی
اب تو آنکھوں سے اترا او خواب نوشیں کے خمار

آ رہی ہے کیا چمن سے آہ! ہنستی کھیلتی
میرے گل کی بھی خبر لائی ہے کچھ باد بہار

وحشت افزا تیرا منظر ہے نگاہ یاس میں
ہے مرا آہوے رم خوردہ کدھر۔ اے سبزہ زار

اے پپیہے! تیرے لب پر "پی کہاں" کی ہر صدا
تو بھی کیا میری طرح ہے "پی" کے غم میں بیقرار

میں غم شوہر میں روؤں۔ تو فراق گل میں رو
اپنا اپنا روئیں دکھڑا۔ عندلیب کوہسار

میرا پردیسی اڑاتا خاک ہے جس بن میں آہ!
تو برس جا کر وہیں۔ او میرے اشکوں کی پھوار

مرتے مرتے بھی نہ کیا نکلیگا ارمانِ نظر
تو کھلی رہجائیگی کیا یونہی چشمِ انتظار

تنگ آئے دہر سے ہوں آہ! گھبرائی ہوئی
مجھکو بھی تھوڑی جگہ۔ ای خلوتِ کنجِ مزار

ہی دماغِ سیرِ گل اسے لالۂ صحرا کسے
ہوں میں خوں گشتہ تمناؤنکی غم میں سوگوار

گرمیِ سوز دروں کی سرد مہری سی ہوں تنگ
کوئی چنگاری ادھر بھی آتشِ شاخِ چنار

اسے درند و دشت کی اہی تم سے یہی التجا
جب فراقِ یار میں قالب سے نکلے جانِ زار

کھا یو چن چن کر میری شوق سی سب استخواں
گرچہ کھانے کے نہیں قابل ہے یہ جسمِ نزار

چھوڑ دینا میری آنکھوں کو مگر بعدِ فنا
انتظارِ یار ہے۔ اور حسرتِ دیدارِ یار

سرورؔ۔ جہان آبادی

دِلّی کا مہمان

ہمارے کرمفرما مولوی نجم الدین صاحب ثاقب بدایونی نے اس نظم کے ذریعہ اس لی عنایت کا ثبوت دیا ہے جو وہ مخزن کے حال پر ہمیشہ فرماتے رہے ہیں۔ اگر اکتوبر کا پرچہ تیار ہونے سے پیشتر یہ نظم پہونچ جاتی تو اسکے لئے نہایت موزوں تھی۔ تاہم ہم اسے نومبر کے پرچے میں شایع کر کے جناب ثاقب کا پیغام اہل دلّی تک پہونچا دیتے ہیں۔

نغمۂ شادی سے بدلی پھر فغانِ عندلیب
دامنِ گلچیں بنا پھر آشیانِ عندلیب

ہمصفیرانِ چمن نے پھر مچائے چہچہے
پھر لبِ قمری پہ حق حق ہے بیانِ عندلیب

طوطیوں کی زمزمہ سنجی نے گل کے روبرو
کر دیا آئینہ پھر رازِ نہانِ عندلیب

کلیوں کلیوں میں ہم ہونے لگیں سرگوشیاں
تختے تختے میں چھڑی پھر داستانِ عندلیب

پھر بہار آئی گلوں میں قہقہے اڑنے لگے
پھر کھلی باچھوں میں کشتِ زعفرانِ عندلیب

ہر روش بولے نہ کیوں طوطی پھر اسکا باغ میں
باغباں۔ صیاد۔ گلچیں۔ ہمزبانِ عندلیب

دور دورے سے ہیں خدائی میں خدا کا شکر ہے
بج رہا ہے آج دنیا بھر میں ڈنکا شکر ہے

ہر روش بادِ صبا پھرتی ہے اترائی ہوئی
ہے مگر پیغامِ وصلِ دلربا لائی ہوئی

گوشِ گل غنچوں کی چٹکی پر لگے ہیں شاخ شاخ
چشمِ نرگس گوشے گوشے میں ہے گھبرائی ہوئی

تالیاں پتے بجاتے ہیں خوشی کا جوش ہے
خیر مقدم کہہ رہی ہر گھاس لہرائی ہوئی

آئینہ خانہ گلستاں کیاری کیاری آئینہ
حوض جل تھل سرو کی رفتار اٹھلائی ہوئی

نونہالانِ چمن ہر سمت ہیں سرگرم ہیں
زلفِ سنبل کی نظر آتی ہے بل کھائی ہوئی

کس گلِ رعنا کی صورت دیکھتی ہے یک بیک
بلبلِ تصویر بھی ہے محو گویائی ہوئی

ہر ادا مستانہ سر سے پانو تک چھائی ہوئی
اُف تری اُٹھتی جوانی جوش پر آئی ہوئی

او نہالِ سبزہ آغاز او جوانِ سبزہ رنگ
نو بہارِ سبزہ خط سرو چمانِ سبزہ رنگ

تیری خاطر رنگ رلیاں مچ رہی ہیں جا بجا
مل کے گاتی ہیں ملھاریں لولیانِ سبزہ رنگ

ہیں کہیں کاہی کہیں دھانی زمیں کی پوششیں
رنگ میں ڈوبا ہے تیرے آسمانِ سبزہ رنگ

سر کے بل تیری ہوا شوق میں اے گلبدن
آئے ہیں کشمیر سے کچھ گلرخانِ سبزہ رنگ

پانو لنکا سے بڑھا کر تیرے درشن کیلئے
ڈبکیاں کھا کھا کے پہنچے ہیں بتانِ سبزہ رنگ

اڑتے ہی نظر میں تری ہنستی ہوئی تصویر سے
وجد میں یوں نغمہ زن ہیں طوطیانِ سبزہ رنگ

ملتے ہی بیباک تھی وہ آنکھ شرمائی ہوئی
پھر گئی پچھتا کے پلکوں تک حیا آئی ہوئی

عید کی ہیں اک جانب سے مبارکبادیاں
سال نو کی دوسری جانب رچی ہیں شادیاں

وضع کے پابند بھی جامے سے باہر ہو چلے
بوئے گل کی طرح پھیلیں سر بسر آزادیاں

بڑھ کے چمکا ماہِ نو بھی حسرتِ دیدار میں
عیدیاں بٹنے لگیں چلنے لگیں اُستادیاں

ماہِ نو کیا سال نو کی بھی ہوا چلنے لگی ۔۔۔ آشیانوں میں پرندوں کے بڑھیں آبادیاں
تاک میں ساقی کی، خوشئہ گل پہ بلبل کی نظر ۔۔۔ صیدِ دور افتادہ بھی کرنے لگے صیادیاں
صنعتیں تازہ دکھاتے ہیں جوانانِ چمن ۔۔۔ ہو رہی ہیں آج رنگا رنگ نو ایجادیاں

میزباں آتے ہیں ملنے کے لئے مہمان سے
کچھ تو ہیں جانے ہوئے اور کچھ انجان سے

ہر زباں پر ہیں بپا پے نعرہائے مرحبا ۔۔۔ کان میں رہ رہ کے آتی ہے صدائے مرحبا
ہے جہان آباد میں نوبت مبارکباد کی ۔۔۔ چل رہی ہے باغِ عالم میں ہوائے مرحبا
وہ جہان آباد جو ہے آج تیرا میزباں ۔۔۔ ڈھلکے تیرے پاس آیا ہے برائے مرحبا
وہ جہان آباد جو مصروف ہے خاطر میں آج ۔۔۔ لا رہا ہے تازہ تحفے بھی سوائے مرحبا
وہ جہان آباد جس کا آج تو مہمان ہے ۔۔۔ کان تک جس کے نہ تھے کل آشنائے مرحبا
وہ جہان آباد جو اب دل بڑھاتا ہے ترا ۔۔۔ جس کے ساز و میں نہ تھی باقی نوائے مرحبا

وہ جہان آباد جو شاہِ جہان آباد تھا
ہند کیسا اُس کے سائے میں جہان آباد تھا

اے جہان آباد اب تیرے وہ فاضل کیا ہوئے ۔۔۔ تیرے سایے کیا ہوئے تیرے وہ عامل کیا ہوئے
جو نہ رکھتے تھے کسی فن میں کہیں اپنا جواب ۔۔۔ اے جہان آباد اب تیرے وہ کامل کیا ہوئے
سیر ہوتے تھے جہاں آ کر جہان کے تشنہ کام ۔۔۔ اے جہان آباد جمنا کے وہ ساحل کیا ہوئے
اے جہان آباد تیرے وہ خزانے بیشمار ۔۔۔ جمع ہوتا تھا جہاں کا جنمیں حاصل کیا ہوئے
اے جہان آباد جنکے حکم میں تھا اک جہاں ۔۔۔ وہ حکم اب کیا ہوئے تیرے وہ عادل کیا ہوئے
جنکا طوطی بولتا تھا آمل و شیراز تک ۔۔۔ اے جہان آباد وہ تیرے عنادل کیا ہوئے

اے جہان آباد تو سرمایۂ ادراک تھا
آنکھ کھلتے ہی جو دیکھا لاکھ کا گھر خاک تھا

کیا کہئے وہ حافظ و مُلا وہ قاری کیا ہوئے | وہ محدث کیا ہوئے آخر وہ مفتی کیا ہوئے

سیڑھیوں پر بھی تیری جامع کی جا ملتی نہ تھی | وہ مصلے اب کہاں ہیں وہ مصلی کیا ہوئے

تیری گلیوں میں نظر آتے نہیں رمال تک | وہ جفرداں کس طرف ہیں وہ نجومی کیا ہوئے

فلسفے ۔ معقول ۔ ہیئت ۔ کا نشاں ملتا نہیں | وہ مقرر کیا ہوئے تو نے وہ منشی کیا ہوئے

لعل نرخ از لنگ یابد چوں نماند جوہری

قدر گوہر شاہ داند ۔ یا بداند جوہری

اہل جوہر ہوں تو کیا وہ قدر دانی اب کہاں | تشنگی کیونکر بجھے جمنا میں پانی اب کہاں

ہو تو کیں سے ہو امید کامیابی ہائے ہائے | قدر دانوں کو بھی حاصل کامرانی اب کہاں

سر اُٹھا کر قطب مینار آہ سوئے آسماں | ڈھونڈتا ہے اگلے وقتوں کی نشانی اب کہاں

بحر خوبی کون اب آتا ہے سجدوں کے لئے | موتی مسجد میں تیری گوہر فشانی اب کہاں

جنکی نوبت کی صدائیں ہیں ابھی تک کان میں | لال قلعے کے وہ برج آسمانی اب کہاں

ہو گئے اہل دول محتاج بندوں میں شمار | وہ خدا صاحب کی اگلی مہربانی اب کہاں

منتظر دیوان خاص و عام باقی رہ گیا

وہ بھی سچ پوچھو تو خالی نام باقی رہ گیا

واہ کیا کہنا ترا اے انقلاب روزگار | شہر بھی چھانٹا تو چھانٹا انتخاب روزگار

ہائے وہ گھر تو نے چن چنکر تہ و بالا کئے | جنمیں تھا اک اک مکیں لب لباب روزگار

وہ دفاتر مدتوں سے بند آتے ہیں نظر | روز کھلتی تھی جہاں فرد حساب روزگار

ہو گئی لب بند اب وہ نہر اسے دار العلوم | جس کی ہر ہر موج تھی لوح کتاب روزگار

جسکی گلیوں میں زباں دانی کی بٹتی تھی سند | موجد اس دو تھے جنکے شیخ و شاب روزگار

ہائے دہلی وائے دہلی کہکے جیبِ روز لگا | یوں ملا آخر جواب لاجواب روزگار

چل بسے اہل جنوں خالی بیاباں رہ گیا

جا بجا الجھا ہوا کانٹوں میں داماں رہ گیا

اب بھی مل جلکر سمیٹو سب تو کچھ مشکل نہیں
کام کچھ ایسا کٹھن اتنی کڑی منزل نہیں

متفق ہوکر بڑھاؤ ہاتھ چن لو تار تار
جھاڑیاں کانٹوں بھری کچھ ہر قدم حائل نہیں

جسطرف چاہو چلو ہیں شاہراہیں صاف صاف
رہگزر ہموار ہیں سب اونچ نیچ اک تل نہیں

بیچ میں دیوار روئیں ہے نہ راہِ ہفتخواں
سدِ اسکندر نہیں آڑے جو حائل نہیں

اور اس تحصیل حاصل کا بھی آخر کیا مآل
کونسی شے ہے جو گھر بیٹھے ہوئی حاصل نہیں

نظم گھر کی نثر گھر کی اور گھر کی ہے زباں
ہاں نہیں تو اک طبیعت اسطرف مائل نہیں

دیر کیا لگتی ہے اسکی باگ اپنے ہاتھ ہے
اپنے گھر کی ہے جو یہ مایہ وہ تو اپنے ساتھ ہے

کون کہتا ہے خدا ناکردہ تم مجبور ہو
تم اگر مجبور ہو ہندوستاں معذور ہو

کاملین فن کا اب بھی تم میں کچھ گھاٹا نہیں
عام اس سے کوئی کم کوئی سوا مشہور ہو

اگلی پچھلی یادگاریں تم میں باقی ہیں ابھی
قافلے سے لاکھ بچھڑے ہو مگر کیا دور ہو

لو شبیہ ماہ کنعاں آگئی بازار میں
مول لاؤ شوق سے قیمت مگر بھرپور ہو

میز کمرے کی سجاؤ خواہ طاق اس سے بھرو
یا د کچھ ہر دلعزیزی کا اگر منظور ہو

دعوتیں دو اپنے اپنے گھر جماؤ محفلیں
اور بھی مہماں نوازی کا جو کچھ دستور ہو

تم کو تھی محسوس جس شے کی ضرورت آگئی
آگیا لاہور سے **مخزن** کہ دولت آگئی

سال گذرے کوئی سکہ وقت کا جاری نہ تھا
ہر خزانے میں ضرورت آج جسکی تھی نہ تھا

شمع کافوری سے روشن تھیں تمہاری محفلیں
لمپ بھی تھے جابجا لیکن کوئی برقی نہ تھا

چین سے ماچین تک پھیلی ہو جسکی روشنی
آہ ایسا آفتاب علم کوئی بھی نہ تھا

جو سکھائے خلق کو تازہ تمدن کے چلن
خلق پرور شہر میں پرچہ وہ اخلاقی نہ تھا

کر سکے احساس جو اپنی قوم اپنے ملک پر — کوئی دکھ سکھ کا شریک اتنا بھی آدمی نہ تھا

جسکی نظم و نثر میں عالم کے ہوں نظم و نسق — دار انشا میں ادیب اس رنگ کا کوئی نہ تھا

کہنے والے کہہ گئے جو بات وہ جھوٹی نہیں

وقت کے سب یار ہیں بیوقت کا کوئی نہیں

میزبانو تمکو اسکی قدر دانی چاہئے — قدر دانو تم کو اسکی میہمانی چاہئے

یہ تمہارے کام کا ہے تم ہو اسکے کام کے — اسکو تم سے تمکو اس سے لگے بڑائی چاہئے

یہ تمہارا ہند سے انگلینڈ تک ہوگا وکیل — اسکی خاطر کچھ تمہیں بھی جانفشانی چاہئے

تم میں آیا ہے وطن اہل وطن سب چھوڑ کر — دل بڑھانا چاہئے ہمت بندھانی چاہئے

کام غیروں کے بنا دیتے ہیں عالی حوصلہ — ہے یہ اپنا تم کو بات اسکی بنانی چاہئے

گر خدا کی مہربانی چاہتے ہو اہل قوم — اپنے اوپر آپ تم کو مہربانی چاہئے

تم میں جسدن ہو گیا اپنے کا اپنا قدر داں

خود بخود ہو جائے گا اپنا پرایا قدر داں

لو مبارک جسم میں پھر جان امرود آگئی — مشک کی پھر وادی تاتار میں بو آگئی

پھر اٹھا نکلی شگوفے باغ میں موج نسیم — پھر جوانی پھر بہار حسن گلرو آگئی

بلبلوں کو پھر نظر آیا وہی اگلا سماں — پھر گلوں کے چھیڑنے کو اے صبا تو آگئی

شوخی مضمون و بندش پر نظر پڑنی ہی تھی — منچلوں کے دل میں یاد چشم جادو آگئی

نثر سے اسکی ولائی یاد نثر میرزا — رہتے رہتے اسمیں بھی آزاد کی خو آگئی

نظم میں ہے سبع سیارہ کے دم کی روشنی — چاندنی گویا سمٹ کر پھر لب جو آگئی

نام کا مخزن نہیں گنجینۂ اسرار ہے

دیکھنے کو دیدۂ حق بیں مگر درکار ہے

خواب غفلت میں بہت اے سونیوالو سو چکے — سوتے سوتے رات گزری جاگو جاگو سو چکے

آسماں بدلا زمیں بدلی نہ بدلے ایک تم — اٹھو اٹھو دیکھو دیکھو سو چکے لو سو چکے

نیند کے ماتو خدائی ہو چکی اب ہوشیار — تم پہ بیٹھی نیند کیسی سو رہے ہو سو چکے

لوگے کروٹ بھی کہیں آخر زمانے کیطرح — طالع خفتہ کی صورت عمر بھر تو سو چکے

یہ مبارک وقت یہ پیاری ہوا یہ صبح عید — وقت کی چھیڑو کوئی للہ اٹھو سو چکے

مہر نوروز آ چلا سر پر دوگانے کو چلو — آؤ جھٹ پٹ غسل کر لو کپڑے پہنو سو چکے

سنکے خطبہ پہلے چلکر عبد قادر سے ملو

اور اُن کے ساتھ ہی تازہ مسافر سے ملو

آج اُنکے گھر پہ چھائی دوہری دوہری ہے خوشی — عید کی بھی ہے خوشی نوروز کی بھی ہے خوشی

لو مبارک اہل دہلی نے قدم رنجہ کیا — جنکی ہنستی ہنستی شکلو نپر خوشی سی برسے خوشی

تھا خوشی پر صاحب مخزن کو ابتک ہمکو ناز — دہلی والوں کو جو دیکھا اُنسے دونی ہے خوشی

عید نوروز۔ آمد مخزن۔ ملاقات رفیق — چار خوشیاں ایکدم ایسی بھی دیکھی ہے خوشی

خازن مخزن بھی اب نکلنے ہیں ملنے کیلیے — صورت ابر کرم جنپر برستی ہے خوشی

تم ہیں سی کرلو ثاقب مہربانوں کو سلام

میہمانوں۔ میزبانوں۔ قدر دانوں کو سلام

تصویر جاناں

موجد فوٹوگرافی! صدقے اس ایجاد کے — اُڑ گئے خاکے نقوش مانی و بہزاد کے

بند شیشونمیں ترے جادو سی پریاں ہو گئیں — وہ پرانی داستانیں صرف نسیاں ہو گئیں

شاکر احساں ہیں ترے عاشقان بینوا — گو نہیں کچھ پاس پر دیتے ہیں وہ تجھکو دعا

اپنے اپنے یار کی تصویر سب کو مل گئی

یا ترے دربار سے جا گیر سب کو ملگئی

میں بھی زانجملہ ترے احسانمند و نمیں ہوں ایک
ہوں ترا مدحت سرا اور تیری بندہ نمیں ہوں ایک

آرزو مدت سے تھی تمثال جاناں کی مجھے
واہ میں اور میری قسمت! تو نے وہ دیدی مجھے

ہیں وہی انداز دلکش - ہے قد رعنا وہی!
بھولی بھالی - پیاری پیاری صورت زیبا وہی

ہے وہی زلف دوتا - اور ہے خم گیسو وہی!
ہے وہی ماہ جبیں اور چشم پر جادو وہی

ہے دہن کا نقطہ موہوم بھی ظاہر یہاں
ہے کمر کا نقشہ معدوم بھی ظاہر یہاں

انکھڑیوں میں ہے وہی مستی شراب ناز کی
غمزہائے جانفزا میں گفتگو ہے راز کی

ناز کا پتلا وہی اور اس پہ ہے جوبن وہی
دست و بازو ہیں وہی - سینہ وہی - گردن وہی

مست آنکھیں ہیں وہی ہیں ساغر جم کی قسم!
ہیں لب جاں بخش وہ ہی - ابن مریم کی قسم

کیا ہوا محروم گر عارض کی رنگت اور ہے
سامنا عاشق کا ہے - اسوقت حالت اور ہے

دیکھتی ہے کسطرح ہای چشم ظاہر بیں مجھے؟
کیا کہوں کس نے سکھائے وہ کیے ہیں مجھے!

طعنہ زن ہیں کیوں نظر بازی پہ میری بیخبر
دیکھنے والا ہوں میں بھی - واہ ای اہل نظر!

کس کو بتلائیں یہاں کوئی نہیں - ہوتا کوئی!
محرم راز نہاں کوئی نہیں - ہوتا کوئی!

تو تو اے تصویر تھی آئینہ دل میں نہاں
عکس تیرا پڑ گیا کاغذ کے ٹکڑے پر کہاں

حیف اے کاغذ کے ٹکڑے! مجھکو تجھ سے عار ہے
تجھکو تاب شعلہ نار عذار یار ہے۔

آہ اے کاغذ کے ٹکڑے! مجھکو تجھ سے پیار ہے
تو مرے پہلو میں ہے - پہلو میں تیرے یار ہے

ہو اجازت گر تو سینے سے لگا لوں میں تجھے
نقش جو دل میں ہے آ اس سے ملا لوں میں تجھے

کس لئے بولیگی ہم سے! یار کی تصویر ہے
یہ بہانا خوب ہے - بے طاقت تقریر ہے

دیکھ تو بیٹھا ہوں تیرے سامنے کیا سرنگوں

تو مرے قابو میں کب ہے میں ترے قابو میں ہوں

مجکو پہچانا بھی تو نے؟ میں وہی محروم ہوں! ہوں وہی شیدا وہی دلدادہ مغموم ہوں!
ہوں وہی ناکام قسمت! ہوں وہی ہاں نصیب بے وطن۔ بیار و بیکس۔ بے عزیز و بے حبیب!
بد نصیبی کی سناکر تجکو اپنی داستاں یہ نہیں اچھا۔ کروں غمگیں تجھے او جانِ جاں
کچھ سناتا قصۂ شبہائے ہجراں میں تجھے تیری زلفوں کیطرح کرتا پریشاں میں تجھے
سوزشِ دل سے میں سرگرمِ فغاں ہوتا ذرا سردمہری کا تری بھی امتحاں ہوتا ذرا

یہ مرا اک وہم ہے ان الجھنوں سے کیا تجھے
کوئی روئے۔ کوئی تڑپے۔ کچھ نہیں پروا تجھے

تلوک چند محروم

ہندوستان کی عرضداشت

اسمیں کچھ شک نہیں انگلینڈ کیا تو نے کمال زندہ قوموں میں ترقی پہ ہے تیرا اقبال
تو نے بے شبہ مجھے فتح کیا مردجری تو نہیں رکھتا سیاست میں کوئی اپنی مثال
تیرا دعویٰ ہے کہ تو اپنی رعایا کے لئے رحم و انصاف کا ہے تاج بحسنِ اجمال
مہرباں ایسا ہی منصف ہے وہ تیرا قانون رنگ و روغن کی بھی تفریق نہیں ہے فی الحال
سلطنت کرتا ہے بیٹھا ہوا کالے کوسوں اس جزیرے میں جہاں جا نہیں سکتا ہے خیال
ایک چوتھائی جو دنیا ہے وہ تیری محکوم تیرا جھنڈا ہے جو مس کرنیکو ہے چرخ کی ڈھال
اسلئے عرض ہے یہ خاک سیہ کی تجھسے تیرِ چشمی سے ذرا مجھپہ نظر کرنی محال
مینے مانا کہ نہیں اٹھنے کی مجھ میں طاقت ترکتازانِ جہاں کر گئے مجھکو پامال
پھر بھی ہے تیری عنایت سے توقع مجھکو کیا عجب ہے کہ نکل آئے مرا کوئی مآل

رفتہ رفتہ میری سب وحشتیں کم ہو جائیں
جستہ جستہ میں ترقی کروں اے نیک خصال

شبہے سب میرے نکل جائیں میں خوش ہو جاؤں
ضیق جاتا رہے میرا میں بنوں فارغ بال

پھر کہیں درجہ بدرجہ ہو ترقی میری
پھر نئے رنگ میں چمکے کہیں یہ حسن زوال

دل کو پتھر نہ بنا دوسرے کا درد بھی سن
دیکھ پھیلائے ہوں کب سے میں دست سوال

دیکھ تو مونکی ترازو میں برابر مجھے تول
میں وفادار ترا بھائی ہوں اسکا ہو خیال

مجھسے ہمدردی کریگا تو پھلے پھولیگا
تیری تعریف اور عزت کا میں گاؤں کا خیال

دل میں یہ جان لے ہاں دیکھ خدا ہے اوپر
تو بھی اک جان ہے میری ہی سی اسکا ہو خیال

سب سے یکساں ہو محبت کہ برابر ہیں یہ سب
سب پہ یکسان ہو حکومت کہ ہیں اک ہی حال

وفا سیتاپوری

اخوت

ہے نظم تو وہی پر اسمیں پارینہ شکایت ہے
ہے کچھ اورونکا شکوہ اور کچھ اپنی شکایت ہے

رہیگی قوم وہ جہد البقا میں کسطرح زندہ
نہ جسکے پاس علم و فن نہ جسکے پاس دولت ہے

جو ہوں قلاش و مفلس وہ گذاریں زندگی کیونکر
کہ اب علم و ہنر بھی تو غلام مال و دولت ہے

گئے وہ دن کہ نفس علم سے ہوتی تھی عزت
ہنر کی اب ہے باری مال اور دولت کی عزت ہے

نہ ہے سرکار میں منصب نہ ہے دربار میں پرسش
نہ میراثی وراثت ہے نہ پدری جاہ و حشمت ہے

نہ اس بازار ناپرساں میں اب پرساں ہنر کا
نہ بے علم و لیاقت کے کوئی قدر نجابت ہے

یہ سب سچ ہے کہ علم و فہم سے بڑھتی نہیں روزی
جہالت ہے اندھیرا علم پھر نور ہدایت ہے

ہیں کچھ قانون قدرت جنکی یہ ماتحت ہے گویا
زراعت ہے تجارت ہے کہ صنعت ہے کہ حرفت ہے

ہیں قفل ابجدی قانون یہ اور علم انکی کنجی ہے
یہاں بے فائدہ کوشش ہے اور بیکار حکمت ہے

سے ہے کوسوں بھاگتا ہمسایہ ہمسائے کے سایہ سے
برادر کو برادر دیکھتا ہے چشم نفرت سے

کوئی خونِ برادر پی کے اپنی حرص میں خوش ہے
نہیں دل اسکا شرماتا مگر اپنوں کی غیبت سے

حقوقِ غیر کی پروا نہ اپنے فرض کی اصلاح
نہ کچھ عزت سے ہے مطلب نہ کچھ افسوس ذلت سے

نہیں ممکن کسی کی بہتری کچھ ہو سکے اس سے
جو بیچارہ کہ خود فارغ نہیں فکرِ معیشت سے

نہ یہ ممکن ہے یاور جسکی توفیق مددگاری
اُٹھے اور اُٹھ کے کچھ کر ڈالے اپنے دستِ ہمت سے

نہیں پڑتی ہے دل میں آگ کچھ حقیاق واعظ سے
نہیں جوں رینگتی کانوں پہ ناصح کی نصیحت سے

خلوصِ دل مریدوں میں نہ ہے صوفی میں کر زنگر
حقیقت سے انہیں مطلب کا م انکو ہدایت سے

جگہ تو دین کی دل تھی مگر شیخِ طریقت نے
اسے پیوند کر ڈالا مصلائے امامت سے

. . . .

مریضِ قوم کا درماں جو کچھ ہے تو اخوت ہے
یہی دنیا کی جڑ ہے اور یہی دیں کی حقیقت ہے

کوئی اسلام کی پوچھے اگر مجھ سے تو میں کہہ دوں
اخوت ہے۔ اخوت ہے۔ اخوت ہے اخوت ہے

ہے اصل اتحاد و ارتباطِ ملتِ بیضا
اسی میں رازِ ہمت اور زورِ دستِ قدرت ہے

اسی کو چھوڑ کر بگڑا تھا قومیت کا شیرازہ
اسے حاصل کرو تو پھر وہی پہلی سی عزت ہے

یہ حبل اللہ ہے تھامو اسی کو سب کے سب ملکر
یہی نورِ ہدایت ہے یہی راہِ طریقت ہے

تعجب ہے بنالیں شہد باہم مکھیاں ہوکر
بٹاؤ ہاتھ کچھ تم میں اگر قومی حمیت ہے

کہ ناحق مارے پھرتے ہو ٹانگیں توڑے حضرت
جو تم بھولے ہوئے ہو وہ فقط لفظِ محبت ہے

خدا نے شہد میں رکھی ہے کیسی لذتِ شیریں
محبت سے کیے پیدا کہ یہ رازِ اخوت ہے

صادق از کشمیر

تازہ غزلیں

(از ملفوظات حضرتِ حبیب کنتوری۔ مرحوم)

آفتِ جاں ہجر میں وحشت کی سرتابی رہی — دل کو بیتابی رہی آنکھوں کو بیخوابی رہی
عمر بھر حالتِ دلِ مضطر کی سیمابی رہی — چشم دریا بار گردش تیری دولابی رہی
برق کشتِ آرزو ہے گرمیِ بازارِ حسن — جنسِ الفت کی ہمیشہ اسمیں نایابی رہی
سالہا یادِ لبِ نگیں میں رویا اشکِ خوں — مدتوں رنگت مری آنکھونکی عنابی رہی
کب چھٹا اشکِ ندامت سے سیہ کاری کا رنگ — صاف ہوکر بھی مری فردِ عمل آبی رہی
وہ دیار تن لٹا اے شیب جس میں مدتوں — عشق کی شاہی رہی وحشت کی نوابی رہی
دبگیا آخر ہماری معصیت کاری کا شور — ہر طرح بالا اُسیکی شانِ توابی رہی
مختصر یہ ہے اگر پوچھے کوئی رودادِ عشق — دل گیا جانِ حزیں کیساتھ بیتابی رہی
مردمِ دیدہ پہ تھا تاریک فرقت میں یہاں — عمر بھر اس سرزمیں کی شکل گردابی رہی
اک جہاں اُنسے جُھکا جب سے وہ جھکگر ملے — محترم بن کر ادا کی تیغ محرابی رہی

خاک میں ہمکو ملا کر کچھ نہ ہاتھ آیا حبیب
گلشنِ عارض پر اُنکے کب وہ شادابی رہی

ہزاروں آرزوئیں ساتھ ہیں اُسپر اکیلی ہے — ہماری روح سے بوجھی ہوئی اب تک پہیلی ہے
بڑھا پاہو تو ہو اس ربط میں کیونکر خلل آئے — مری یاس و تمنا بچپنے سے ساتھ کھیلی ہے
اجل بھی ٹل گئی دیکھی گئی حالت نہ آنکھوں سے — شبِ غم میں مصیبت سی مصیبت مینے جھیلی ہے

عدم کا تھا سفر جب اور کچھ توشہ نہ ہاتھ آیا
بہت سی آرزو چلتے چلاتے ساتھ لی ہے

ہم اور گل دونوں باغ جہاں کے بھول ہیں لیکن
وہاں مٹھی میں زر ہے اور یہاں خالی ہتھیلی ہے

ذرا دیکھو تو ان اترے ہوئے چہروں کو پھولوں کے
معاذ اللہ جھونکا ہے خزاں کا یا کہ سیلی ہے

کبھی جمنے نہ دی بیخودی خاطر پہ نقش انکا
بمشکل مٹنے یہ تصویر اسی عیار سے لی ہے

نہ پوچھو شاد ویرانی کو دل کی کیا بتاؤں میں
تمنا جا چکی حسرت غریب اسمیں اکیلی ہے

حضرت شاد عظیم آبادی

چمن سے کون نکلا پائمال باغباں ہوکر
کہ بوئے گل چلی ہے کارواں درکارواں ہوکر

مرقع درد کا بن کر الم کی داستاں ہوکر
رہا یکچند میں بھی عبرت صاحبدلاں ہوکر

نہیں میں عندلیب بیمروت باغ الفت میں
کہ چھوڑوں گلستاں کو خستہ جور خزاں ہوکر

میرا ابر آتش نفس صیاد کے ہاتھوں سے کیا چھوٹوں
نگاہ اسکی جو پڑتی ہے تو برق آشیاں ہوکر

زمانے کا تعلق دشمن جمعیت دل ہے
لگی آخر ٹھکانے خاک میری بے نشاں ہوکر

تہ دل کی خبر لاتا ہے ہر تیر نگاہ اس کا
قیامت ہی تو ڈھائے گی کرنے لگا وہ مہرباں ہوکر

بسان دیدۂ بسمل نیاز نگاہ حسرت ہوں
مری ہر ہر نگہ فریاد کرتی ہے زباں ہوکر

انہیں کچھ ربط غیروں سے نہ تھا پر اب کیا پیدا
بگاڑا آپ میں نے کام اپنا بدگماں ہوکر

خدا جانے کدھر کا جذبہ لیجائے کہاں مجکو
چلا ہوں میں تو کعبے کو مگر کوئے بتاں ہوکر

نہ نکلا ایک دل شایان اندوہ گرفتاری
رہا ہوں محفلوں میں تیرے غم کی داستاں ہوکر

مجھے یہ مصرعہ اکمل پسند آیا بہت وحشت
ستم کرنا نہ دو دن کے لئے تم مہرباں ہوکر

رضا علی وحشت (از کلکتہ)

شرح جنون سلسلہ جنباں کئے ہوئے
بیٹھا ہوں چاک چاک گریباں کئے ہوئے

نکلی ہے خون میں ڈوب کے دل سے تری نگاہ
نقش و نگار خانۂ ارماں کئے ہوئے

بیٹھا ہے کوئی دیر سے اے حسرت شباب
مشق تصور مہ کنعاں کئے ہوئے

بیکاری جنوں میں رہا کچھ نہ امتیاز
خود اپنے گھر کو بیٹھے ہیں ویراں کئے ہوئے

جاتا ہوں کس طرف کو یہ میں سوچتا ہوا
دل میں ہزار طرح کے ساماں کئے ہوئے

جی چاہتا ہے پھر وہی آزادی جنوں
مدت ہوئی ہے سیر بیاباں کئے ہوئے

ہر آہ میرے دل میں نہاں ہے بقدر جوش
افشائے راز ضبط کا ساماں کئے ہوئے

دکھلائینگے جہان کے سفید و سیاہ کو
آئے ہیں رخ پہ زلف پریشاں کئے ہوئے

دید و نگہ سے داد فقط آکے نزع میں
سب مشکلیں ہم آپ ہیں آساں کئے ہوئے

کیا تھا جو برق طور کو آہی گئی ہنسی
موسیٰ جو آئے دید کا ارماں کئے ہوئے

پھر دیکھتا ہوں بخیۂ زخم جگر کو میں
عزم خیال جنبش مژگاں کئے ہوئے

اب کیا ہے اونہیں جنکو محافظ رہا کریں
چپکے کھڑے ہیں وا در زنداں کئے ہوئے

دیکھو عزیز قوت اعجاز عشق کو
بیٹھے ہیں ہم بسر شب ہجراں کئے ہوئے

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

تمہارا بول بالا ہے جگہ اللہ والوں میں
یہی ہو حق حرم میں ہے یہی جپ تپ شوالوں میں

کہانتک شوخیاں بھر دی ہیں ان حسنا جمالوں میں
ابھی آئی نگاہوں میں ابھی گزری خیالوں میں

صبا کہنا کہ ہلچل مچ رہی ہے پائمالوں میں
جو وہ سرو رواں ملجائے تیرے نونہالوں میں

ورق الٹے زمین و آسماں کے کیا قیامت ہے
ہمارے دل کے افسانے لکھے تھے ان رسالوں میں

انھیں کی سوندھی سوندھی بو سے آنکھیں کھل گئیں آخر
طلسم ساغر جم ہے مرے کوری پیالوں میں

بچی جاں اور لاکھوں پائی تیری فاقہ مستوں نے
خبر کیا تھی بھرا ہے زہر سونے کے نوالوں میں

خدا رکھے نہ رکھا فرق کچھ بھی درد پنہاں نے
تمہاری منہ کی باتوں میں ہمارے دل سے نکلے نالوں میں

یہاں توکل کی وعدے کی بنادی آج ہی دم پر — سمائی تھی کہاں کی لنترانی سُننے والوں میں

لکھا اُس نکتہ چیں نے میرے دفتر کا جواب اُلٹا — تجھی میں جب نہیں دم جان کیا تیری سلوں میں

ہمارے ناتواں لپر خدائی بھر کی آنکھیں ہیں — کھٹکتا ہے یہی تو ایک کانٹا لاکھ چھالوں میں

تلے رہتے ہیں خونریزی پہ بھولے بھالے دنیا کے — یہ گُن اور اِن فرشتہ صورتوں آدم خصالوں میں

نصیبِ دشمناں ہیں اور بارِ خاطرِ نازک — وہ کیوں گننے لگے میری ملالوں کو ملالوں میں

وہ دشمن اور یہ اپنا بنا رکھتے ہیں دشمن کو — کمالِ مفلسی کیونکر نہو صاحب کمالوں میں

بتوں کی راہ میں ثاقب خدائی چلتی پھرتی ہے
کوئی کیوں جان لے تم ہو کسی پر مرنے والوں میں

ایضاً

پہنسیں کیوں بند لوگوں کی گئے گذری خیالوں میں — بہت کچھ اُڑتی چڑیاں ہمنے بھی پھانسی ہیں جالوں میں

فسانہ ایک قیس و کوہکن کا سو رسالوں میں — یہ ناہموار ٹکڑی ہیں انہیں دو کی قبالوں میں

ترے قربان اے حیرت بنادی مجھکو آئینہ — یہی اک منہ دکھانیکی ہے صورت خوش جمالوں میں

نظر ہم ناتوانوں پر وگرنہ یوں تو ہونے کو — تمہارا نقش پا بھی ہے تمہارے پائمالوں میں

تھمے آنسو نہ دم بھر عمر بھی ٹی جھو نکتے گذری — یہ دل ہے میکدہ آنکھیں ہیں ساقی ہم کلالوں میں

بلائے شام وعدہ ۔ مجھسے اتنی بدمزہ کیوں ہو — مرا حصہ بھی ہے ظالم ترے منہ کی نوالوں میں

سنور لو ۔ ایسی جلدی کیا ہے ۔ جانا بزمِ دشمن میں — پریشاں خاطری ہیں او ابھی بکھرے بالوں میں

وہ سب بے دیکھے سنے میرے پیامی سر یہ لکھتی ہیر — نہ ایسا حال حالوں میں نہ ایسا قال قالوں میں

کہو نادان ناصح کو نہ وحشت میں کھلے بند وں — لگاؤ بھی مگر لپٹی ہوئی کچھ کچھ دو شالوں میں

کہاں کے خال و خط یہ کیسی تہمت سادہ رویوں پر — لگا رکھے ہیں کیوں پیوند کمل کی دو شالوں میں

خدا لگتی کہو ۔ دیکھو ۔ سنو کچھ کام آجاؤ — گذار دگے کہاں تک عمر کے دن ٹالوں بالوں میں

اِدھر آؤ ۔ نہ شرماؤ ۔ دکھاؤ تو سہی آخر — اُلجھکر رہگئیں زلفیں پریشاں تیری بالوں میں

سناتے ہیں وہی ناصح وہی ہم فرق ہے اتنا — وہ غیروں کی مثالوں میں ہم اپنوں کے خیالوں میں

یہ کیا۔ لیلیٰ بمکتب رفت و مجنوں (د۔ف) خواند — کچھ آپ بیتی بھی ہے ان حسن و الفت کے رسالوں میں

وہ بے پر کی اڑائی آج منبر پر کہ سنتے ہیں — فضیحت ہو گئی واعظ نصیحت سننے والوں میں

کمال و نقص تو قسمت سے ہے ثاقب مگر اب تک
خدا کا شکر ہے گذرے جو دن صاحب کمالوں میں

ثاقب بدایونی

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے — ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

نہیں مرتے ہیں تو ایذا نہیں جھیلی جاتی — اور مرتے ہیں تو پیماں شکنی ہوتی ہے

دن کو اک نور برستا ہے مری تربت پر — رات کو چادر مہتاب تنی ہوتی ہے

تم بچھڑتے ہو جو اب کرب نہ ہو وہ کم ہے — دم نکلتا ہے تو اعضا شکنی ہوتی ہے

زندہ درگور ہم ایسے جو ہیں مرنے والے — جیتے جی ان کے گلے میں کفنی ہوتی ہے

رت بدلتے ہی بدل جاتی ہے نیت میری — جب بہار آتی ہے توبہ شکنی ہوتی ہے

غیر کے بس میں تمہیں سن کے یہ کہہ اٹھتا ہوں — ایسی تقدیر بھی اللہ غنی ہوتی ہے

نہ بڑھے بات اگر بات کریں وہ کھل کر — باعث طول سخن کم سخنی ہوتی ہے

لٹ گیا وہ ترے کوچے میں دھرا جس نے قدم — اس طرح کی بھی کہیں راہزنی ہوتی ہے

حسن والوں کو ضد آ جائے خدا یہ نہ کرے — کر گذرتے ہیں جو کچھ جی میں ٹھنی ہوتی ہے

ہجر میں زہر ہے ساغر کا لگانا منہ سے — مے کی جو بوند ہے ہیرے کی کنی ہوتی ہے

میکشوں کو نہ کبھی فکر کم و بیش رہی — ایسے لوگوں کی طبیعت بھی غنی ہوتی ہے

ہوک اٹھتی ہے اگر ضبط فغاں کرتا ہوں — سانس رکتی ہے تو برچھی کی انی ہوتی ہے

عکس کی آئینہ نظر آئینے پر اون کی نگاہ — دو کمانداروں میں ناوک فگنی ہوتی ہے

پی لو دو گھونٹ کہ ساقی کی رہے بات حفیظ — صاف انکار میں خاطر شکنی ہوتی ہے

حفیظ جونپوری

دسمبر ۱۹۰۷ء
جلد ۱۴ نمبر ۳

ایڈیٹر
شیخ عبدالقادر
شیخ محمد اکرام

مخزن

اُردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک باتصویر مجموعہ

تصویر - مولوی محمد عبدالراشد صاحب الخیری دہلوی
نت نئے نظارے - شیخ عبدالقادر - - - ۱
اگر میں صحرانشین ہوتا - سید سجاد حیدر بی اے
نابینا بیوی - سلطان حیدر صاحب جوشؔ
امنگ اور لالچ - مرزا سلطان احمد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ۲۴
فلسفہ کا دربار - - - - - ۲۸
بلوچستان کی زیارت - پنڈت شیو نراین شمیم وکیل چیف کورٹ پنجاب - ۳۰
طبیعی مذہب - خواجہ لطیف احمد بی اے پانی پتی ۴۰
شیو جی کا مندر - خواجہ سید حسن نظامی - - ۴۶
ریشم کا کیڑا - منشی نادر علی صاحب نادر کاکوروی ۵۶
شیخ مرزا حکیم عبدالحی صاحب ۵۸
شب آخر - مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی ۵۹
رباعی مرحومہ - حضرت شاہ تقی پاشا ہلوی / مولوی عبدالقدوس صاحب ۶۰
فسانۂ غم - منشی حامد حسن صاحب قادری - ۶۱
صدائے گنبد - مولوی بدرالدین سیواری ۶۴
حال زمانہ - سید نجم الدین احمد صاحب انجم - ۶۴
فکر صبحگاہی - نواب سراج الدین احمد خان صاحب سائل ۶۷
تازہ غزلیں - شاعر - خیال - نادر - حسرت موہانی - صادق - ثاقب بدایونی - - - - ۶۹

دس کروڑ ہندوستانی اُردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اُردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اُردو مادری زبان ہے ☐ ان شہروں میں اُردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اُردو سمجھی جاتی ہے

باہتمام حاجی مظہر علیم مخزن پریس دہلی میں چھپکر شایع ہوا۔

قیمت سالانہ محصولڈاک قسم اول ۵ روپے فی پرچہ ۸ آنہ

نت نئے نظارے

(۱)

یورپ کے بعض قابل دید مقامات جو میں نے گزشتہ سال دیکھے۔ اُن کے نظارے چشم تصور میں اب تک جاگزیں ہیں۔ حالات سفر کا وہ حصہ جو استانبول سے متعلق تھا۔ علیحدہ کتاب کی صورت میں "مقام خلافت" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ استانبول میں چونکہ بہت دن قیام رہا وہاں کے حالات کا علیحدہ چھپنا ضروری تھا۔ باقی مقامات کے مشاہدات باقساط درج مخزن کیے جائیں گے۔ آج قسط اول ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس میں یورپ کے مشہور خوش منظر مقام لوسرن کے سفر کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ کئی ہفتے ایسے گزرے کہ روز کسی نئے مقام کی سیر ہوتی تھی اور نئے نظارے۔ اسی لئے اس سلسلے کا نام "نت نئے نظارے" رکھا ہوا۔

عبدالقادر

کیسا ہی دلچسپ مقام کیوں نہ ہو۔ آدمی ایک جگہ رہتے رہتے اکتا جاتا ہے۔ لندن اس وقت مرجع انام ہے۔ لیکن چہارشنبہ ۱۰ جولائی سنہ ۱۹۰۵ء کے دن کوئی ہمارے جی سے پوچھتا۔ کہ لندن سے جانے کی کس زور سے آرزو تھی۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ دو بجنے کو تھے کہ ہم[*] ریل پر پہنچے۔ چند دوست ہمیں وداع کرنے آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہم قابلِ رشک ہیں کہ سوئٹزرلینڈ کی سیر کو جاتے ہیں۔ ہم بیتاب تھے کہ گاڑی چلے۔ دو بجکر بیس منٹ گزرے اور گاڑی چلی۔ لندن سے فوکسٹن تک دو گھنٹے کا رستہ تھا۔ بارہا دیکھا ہوا تھا اِسکے ہرے ہرے مرغزاروں سے انگلستان میں رہتے رہتے نگاہ کافی آشنا ہو چکی تھی۔ مگر اُس دن میں خدا جانے کیا جادو کی تاثیر تھی کہ وہ رستہ بھی غیر معمولی طور پر دلچسپ معلوم ہوتا تھا اور وہ اونچے نیچے کھیت جن میں بھیڑوں کے گلّے چرتے پھرتے تھے نہایت دلفریب نظر آتے تھے۔

[*] اس سفر میں میرے دوست شیخ مشیر حسین صاحب قدوئی میرے ہمراہ تھے اور اسی لئے جابجا لفظ "ہم" استعمال ہوگا۔

وہ تو کیا بدل ہی گئے ہونگے - ہماری نگاہ بدلی ہوئی تھی - یہ آنے والے مناظر انگلستان کی

ناہموار مگر سرسبز زمین پر اپنا سایہ ڈال رہے تھے -

فوکسٹن پہنچکر ہم جہاز میں بیٹھے - حسن اتفاق سے دریا میں تموج کم تھا - ہنستے کھیلتے کھاتے پیتے گھنٹہ بھر میں ہمنے بولون ساحل فرانس کو جالیا - مسٹر کی جگہ موسیو! موسیو! کا شور ہے فرانسیسی حمال اسباب اٹھانے کو دوڑے آتے ہیں - بات بات میں سر سے لیکر پانو تک حرکت کرتے ہیں - کچھ پوچھو تو وہ نو شانے ہلاکر اس طرح "ژونہ سے پا" کہتے ہیں کہ نیچے کا ہونٹ علامت انکار کے طور پر خود بخود آگے بڑھ جاتا ہے - بھویں اوپر کو کھنچ جاتی ہیں - اور پیشانی پر دو تین شکن پڑ جاتے ہیں - ہم اُن کی بات سمجھیں یا نہ سمجھیں وہ اپنا مطلب کی خوب سمجھتے ہیں - اسباب اٹھا کر یہ جا وہ جا - بہت عنایت کی تو اشارے سے بتاتے جاتے ہیں کہ اِدھر آؤ اُدھر آؤ - کوئی جانے ریل پر سوار کرانے لئے جا رہے ہیں - مگر نہیں - وہ آن کا فقرہ پہلے ور پیش ہے - فرانس میں تمباکو پر بہت محصول ہے اور زیادہ تر اسی کی پرسش ہوتی ہے - کہ تمہیں اسباب میں تمباکو تو نہیں - بعض وقت اسباب کھول کر دیکھتے ہیں - بعض دفعہ صرف پوچھتے ہیں - کوئی چیز چونگی کے قابل تو نہیں؟ اور اعتبار کر لیتے ہیں - اسکے بعد ریل تیار ملتی ہے - اور حمال اسباب لاکر گاڑی میں رکھ دیتے ہیں -

ہم جہاز سے اترنے کو تھے - کہ ایک انگریز ہم سے مخاطب ہوا - اور پوچھنے لگا "کیا آپ مالٹا کے رہنے والے ہیں"؟ ہم نے کہا "نہیں ہم ہندوستانی ہیں" وہ ہنسا اور کہنے لگا "عجیب بات ہے - ابھی جہاز میں دو اور شخص ہیں بالکل آپ کے ہم رنگ میں نے اُنسے پوچھا کہ آپ ہندوستان سے آتے ہیں - انہوں نے کہا نہیں ہم مالٹا کے باشندے ہیں - اب میں نے سمجھا کہ آپ بھی اُن کے ساتھ ہوں گے

ملہ میں نہیں جانتا (فرانسیسی) سلہ چونگی خانہ (فرانسیسی)

اور آپ سے پوچھا تو آپ ہندوستانی نکلے۔ ہمنے آج دو دفعہ غلطی کھائی۔ مگر میرا کیا قصور ہے۔ آپ کے رنگ اس قدر ملتے ہیں۔" ہم پوچھنے ہی کو تھے۔ کہ وہ مالٹا کے آدمی کہاں ہیں۔ کہ وہ سامنے آ گئے۔ اُس انگریز سے اور اُن سے باتیں ہو چکی تھیں۔ اُسنے ہمیں اُن سے ملا دیا۔ جب ہم سب وُوان سے فارغ ہو کر ریل میں سوار ہوئے تو اتفاق سے ہم اور ہمارے ہم رنگ مالٹی ایک ہی کمرے میں تھے۔ ہم نے اُن سے پوچھا "آپ کہاں جاتے ہیں"۔ اُنہوں نے کہا۔ لوسرن! پھر کیا تھا۔ ہم اُچھل پڑے۔ کہ راستے بھر کے لئے رہبر خدا نے بھیج دیئے۔ مُشیر نے برمحل یہ شعر پڑھا ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

ہم چلتے وقت اس خیال سے کسی قدر متردد تھے۔ کہ سوئٹزرلینڈ میں زبان نہ جاننے سے ہمیں دقت ہوگی۔ لیکن ان مالٹی حضرات کے مل جانے سے وہ تردد رفع ہو گیا۔ یہ یورپ کی کئی زبانیں جانتے تھے اور لوسرن کی سیر پہلے بھی کر چکے تھے۔

ہمارے دو ہم سفروں میں ایک نوجوان تھا۔ ایک بوڑھا۔ نوجوان چرٹ اور سگرٹ کی تجارت کرتا تھا اور بوڑھا مالٹا کے ایک مدرسے کا معلم تھا۔ دونو متوسط حالت کے آدمی تھے۔ مگر محض شوقِ سیر سے نکلے تھے۔ شمالی افریقہ کی سیر کرتے ہوئے ہسپانیہ پہنچے۔ وہاں سے انگلستان آئے۔ چند روز لندن میں رہکر اب سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے راستے گھر جا رہے تھے۔ ہم نے اُن کی ہمت کی تعریف کی۔ اُنہوں نے کہا یورپ میں سیر و سیاحت معمولی زندگی کا ایک ضروری حصہ ہے۔ ہم لوگ سال بھر محنت سے اپنا کام کرتے ہیں۔ مگر ایک دو مہینے ہر برس آرام اور تفریح کے لئے بھی چاہئیں۔ اس سے آدمی تندرست رہتا ہے اور باقی مہینوں میں کام اچھی طرح کر سکتا

ہے۔ آرام کے دنوں میں گھر پڑے رہنے کی نسبت تبدیل آب وہوا اور طرح طرح کے نظارے دیکھنا زیادہ مفید ہے۔ خصوصاً سیر سے انسان کے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اور گھر گھسنے پن کی جو تنگ خیالی ہوتی ہے۔ رفع ہوجاتی ہے۔ ادھر اُدھر کی چند اور باتیں کرنیکے بعد وہ آپس میں اپنی زبان میں باتیں کرنے لگے اور ہم اپنی زبان میں۔ ایک دفعہ مینے جو ذرا کان لگایا۔ تو ان کی گفتگو میں کئی الفاظ عربی معلوم ہوئے مینے پوچھا "آپ عربی بول رہے ہیں" اُنھوں نے جواب دیا۔ نہیں۔ یہ مالٹی ہے عربی اور اطالین کی ترکیب سے بنی ہے۔ اور اس میں بکثرت عربی الفاظ ابتک موجود ہیں۔ ایک عرصہ تک عربوں کا جزیرہ مالٹا میں عمل دخل رہا ہے اور مالٹی زبان کی ترکیب اُس زمانے کا ایک پائدار نقش ہے۔

بولون سے جب گاڑی چلی ہے تو چھ بجے تھے آمین پہنچے۔ تو رات ہولی تھی۔ سٹیشن کے قریب آتے ہی دریچے سے سر نکال کر ہمنے بہت چاہا کہ شہر کے نقشے کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ مگر سوائے اسکے کہ چراغوں کی روشنی یہ بتائے کہ خاصا بڑا شہر ہے۔ کچھ زیادہ پتہ نہ چلا۔ ہاں تھوڑی دیر سٹیشن کی سیر کی۔ اور پھر گاڑی میں آبیٹھے۔ ہمراہیوں نے سونے کی تیاری شروع کی۔ مگر مجھے نیند کیونکر آتی۔ سوئٹزرلینڈ کو دیکھنے اور ایشیا کے سوئٹزرلینڈ (کشمیر) سے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے میں ہمہ تن انتظار تھا اور گنتا تھا کہ کب صبح ہوگی۔ مشکل یہ کہ رات کو باغ وراغ کا نظارہ بھی ممکن نہ تھا۔ اور تو کچھ نہو سکا "سٹیشن شماری" جاری رہی۔ اگلے وقتوں کے لوگ انتظار میں اختر شماری کیا کرتے تھے اب وہ ترکیب پُرانی ہو گئی۔ ریل کے سفر میں رات کے وقت سٹیشن گننا نئے زمانے کی ایجاد ہے۔ سچ ہے ہر زمانے کی ضرورتیں جدا ہیں اور ایجاد ضرورت کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔ یا جیسا انگریزی والے کہتے ہیں "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" چنانچہ

ریل کے سفر میں بیتاب طبیعتوں کے واسطے انتظار کی مشکل گھڑیاں آسان کرنے کے لیے "سٹیشن شماری" ایجاد ہوئی۔ اگر کسی نے تجربہ نہ کیا ہو تو میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ نسخہ آزمانے کے قابل ہے۔ اختر شماری سے کم دلچسپ نہیں اور طبیعت اس سے تھکتی کم ہے۔ نئی سواریوں کی بیقراری کہ گاڑی میں جگہ ملے۔ اُترنے والوں کی بیتابی کہ جلد اُتریں۔ ریل کے اہلکاروں کا اِدھر اُدھر یوں ٹہلنا جیسے اس چھوٹے سے قطعۂ زمین کے خود مختار بادشاہ ہیں۔ سٹیشن پر روشنی کا زور سٹیشن کے باہر دور اندھیرے میں سُرخ و سبز لالٹینوں کی رنگا رنگی۔ اگر کوئی کہے کہ یہ تماشا عجیب نہیں تو اُس کا نام صاحبانِ مذاقِ سلیم کی فہرست سے خارج کر دینا چاہیے۔ میں ہر سٹیشن کو اُٹھ کر دیکھتا تھا اور اس کا نام پڑھ کر پنسل سے اپنی یادداشت کی کتاب میں ٹانک لیتا تھا۔ پہلے دو سٹیشن ذرا جلد جلد آئے پھر دیر دیر سے آنے لگے۔ لاوان۔ ریم۔ شالون۔ شومان۔ ورسو۔ بلفورٹ کی تو رسید دے سکتا ہوں۔ اسکے بعد چشمِ انتظار کو بھی خواب نے آلیا۔ رات آخر رات ہے قدرت کا زبردست نظام اپنے احکام کی تعمیل کرائے بغیر کسے چھوڑتا ہے صبح کے قریب ذرا سی دیر کے لیے آنکھ لگ گئی۔ اور انتظار کا خاتمہ ہوگیا۔ آنکھ کھلی تو مُول ہاوزن سٹیشن پر گاڑی کھڑی تھی۔ یہاں سے گویا سوٹزرلینڈ کا علاقہ اور جرمن زبان کا دور شروع ہوا۔ اشتہارات جرمن میں۔ مکانوں کے نام جرمن میں۔ کثرت جرمن بولنے والے لوگ آکر شریک راہ ہونے لگے۔

مگر یہاں اُن کی کسے فکر تھی۔ صبح صادق کا سہانا سماں سوئزرلینڈ کا خوبصورت ملک۔ ریل کے دونو طرف سبزہ ہی سبزہ اور سبزہ پر شبنم کے موتی بہار دے رہے تھے۔ میں کوٹ پہن کر بیٹھ گیا اور علاقہ کی سیر کرنے لگا۔ اتنے میں سورج نے سنہرا درختوں کے پتوں کا ماہ جولائی کا گاڑھا سبز رنگ آغاز بہار کے ہلکے دھانی رنگ کی

جھلک دکھانے لگا - مقام بال پر گاڑی رکی تو وہاں کی آبادی کو دیکھکر جی خوش ہوگیا اور سب سے زیادہ خوشی یہ تھی کہ گھڑی دو گھڑی میں لوسرن پہنچیں گے - صبح کے سات بجے گاڑی ایک عالیشان سٹیشن پر تھمی - ایک پرفضا جھیل اسکے کنارے درختوں کی قطار - اور درختوں کے پیچھے بلند اور شاندار عمارتیں - یہی لوسرن تھا - دیکھتے ہی رات کی کلفت بھول گئی

لوسرن - سٹیشن نہایت عمدہ موقعہ پر واقع ہے - نکلتے ہی سامنے جھیل کا وسیع تختہ آب ہے دائیں ہاتھ عجائب خانہ کی عمارت اور بائیں ہاتھ بڑے بڑے ہوٹل - یہاں کسی نے نہیں پوچھا کہ اسباب میں کیا ہے - یہاں کے لوگ مسافروں کو ہر طرح خوش کرنا چاہتے ہیں - کیونکہ اُن کی روزی مسافروں کی کثرت آمد و رفت سے ہے ہم اپنے مالٹی دوستوں کے ساتھ ایک ہوٹل میں گئے - جہاں وہ پہلے ٹھہر چکے تھے اُنہوں نے ہمیں کہا کہ ذرا ستالیں دوپہر کو جہاز پر سوار ہو کر جھیل کی سیر کو چلیں گے - ہم نے کہا بہت خوب - لیکن ستانے کا وقت ہمارے پاس کہاں تھا - ہمیں دوسری صبح کے لئے کسی نئے نظارے کی فکر تھی - اور لوسرن میں جو کچھ دیکھنا تھا - اُسکے لئے یہی دن تھا - بس ہوٹل میں اسباب رکھتے ہی منہ ہاتھ دھو کر ہم باہر نکلے کہ بارہ بجے تک نزدیک نزدیک کی چیزیں دیکھ آئیں -

سوٹزرلینڈ کا ہر حصہ ویسے تو حُسنِ قدرت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے - مگر لوسرن اور اسکے قرب و جوار کو یہاں کی سینری[۵۱] کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں - حکومت کا صدر مقام اگر برن ہے - تو مناظرِ قدرت کا مرکز لوسرن ہے - کوہ الپس برف سے ڈھپی ہوئی

[۵۱] مناظر کے لئے انگریزی لفظ ہے " سین " انگریزی میں منظر کو کہتے ہیں - ناٹک کے تماشے کے مختلف پردوں کو بھی سین کہتے ہیں - ناٹک والوں کے ذریعہ سے لفظ اُردو میں مروّج اور بعض نامور مصنفین اُردو کی بدولت مستند ہوگیا ہے -

چوٹیوں کے دیدار اور اُسکے شفاف چشموں کی زیارت کے لئے اس سے عمدہ موقع مشکل ہے۔ کوہستان کے ہر قابل دید حصے میں یہاں سے پہنچ سکتے ہیں مناظر قدرت کے شیدائی دنیا کے ہر حصے سے یہاں آتے ہیں۔ اور محبوبہ بہار کو بہ صد رعنائی جلوہ گر پاتے ہیں۔ موسم گرما بسر کرنے کے لئے اس سے زیادہ مزے کی جگہ کیا ہو گی۔ جنہیں دولت اور فراغت دو نو میسر ہیں وہ تو یہاں اگر مہینوں جانے کا نام نہیں لیتے۔ اس کو مرکز قرار دے کر گردو نواح کی سیر کرآتے ہیں اور پھر یہیں آجاتے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر سال بہار کے آغاز اور گرما کے اختتام کے درمیان یعنے اپریل کے شروع سے ستمبر کے اخیر تک کوئی تین لاکھ آدمی دوسرے مقامات سے یہاں آتے ہیں۔ ان میں آدھے اگر راہ رو فرض کئے جائیں جو آتے جاتے تھوڑی دیر کے لئے اس پُر فضا مقام کی سیر کرتے ہیں۔ تو آدھے ایسے ہیں جو یہاں معقول عرصہ کے لئے قیام کرتے ہیں۔ انہی آنے جانے والوں سے یہاں کے کثیر التعداد ہوٹل اور دیگر مہمان خانے آباد ہیں۔ اور انہی کے طفیل سیر و سفر کے لئے ہر طرح کی آسائشیں یہاں مہیا ہیں۔ الپس کی کئی چوٹیوں تک ہلکی ریل جاتی ہے۔ اس کی سڑک کو دور سے دیکھیں تو سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی قلۂ کوہ تک چلی گئی ہے۔ گاڑی کو اس ڈھلوان سڑک پر لیجانے کے لئے اسکے انجن اور گاڑیوں کی ساخت میں ایسی کلیں لگائی گئی ہیں۔ جن سے گاڑی قابو میں رہے اور نیچے کو لڑھک نہ جائے۔ جھیل کی سیر کے لئے ہر وقت دخانی جہاز چلتے ہیں جو مختلف قابل سیر موقعوں پر ٹھہرتے ہوئے جاتے ہیں اور ہر جگہ کچھ لوگ اُتر کر آگے تھوڑی دور پیدل سیر تماشا کے لئے چلے جاتے ہیں۔ اس کے سوا گاڑیاں ہیں۔ گھوڑے ہیں۔ ہاتھ سے چلانے کی کشتیاں ہیں۔ جس مذاق کا

کوئی آدمی ہو۔ اپنی پسند کی سواری ڈھونڈھ لے اور سیر کرتا پھرے۔ سبزہ و گل اور کوہ و دریا کے تماشے کے ساتھ شہروں کی زندگی کے مزے ملانا چاہے تو جھیل کے کنارے گھنے سایہ دار درختوں کی دوہری قطار ہے۔ وہاں کرسیاں اور بنچیں رکھی ہیں۔ لوگوں کا جماؤ رہتا ہے۔ بیٹھ جائے اور تماشا دیکھا کرے شام کے قریب باجا بجتا ہے۔ شام کے بعد ناٹک وغیرہ کے تماشے شروع ہوتے ہیں۔ جھیل کے کنارے روشنی ہی روشنی نظر آتی ہے اور مکانوں کے لمپ اور سڑک کی لالٹینیں اپنا عکس پانی میں ڈالتی ہیں اور عجیب بہار دیتی ہیں لیکن اگر کوئی شہروں کی ان معمولی دلچسپیوں سے گھبرا کر یہاں آیا ہو۔ اور گوشۂ تنہائی کا متلاشی ہو تو وہ آبادی سے کچھ دور نکل جائے۔ چاروں طرف مناظر قدرت اسکے مونس و ہمدم ہوں گے۔ درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں ہوگی اور برف پوش پہاڑوں کی دل لبھانے والی ہوا۔ وہ ہوگا اور اس کے خیالات۔ نہ کوئی روکنے والا نہ ٹوکنے والا۔ نہ اس تخلیے میں خلل ڈالنے والا۔ اگر کہیں اسی شوق کا مارا اسی کا ہم خیال کوئی اور آ بھی نکلا تو وہ اس گوشے کو آباد پاکر خود بھی اور گوشہ ڈھونڈھ لے گا۔

ہماری سیر ان دو نو قسموں سے علیحدہ تھی۔ ہمارا اس پر عمل تھا کہ جی بھر کر دیکھنا میسر نہ ہو تو نہ ہونے سے ایک جھلک بھی بہتر ہے۔ جیسے تیتری باغ کی سیر کرتی ہے۔ ایک پھول سے دوسرے پر۔ ؏

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

اسی طرح ہم تھے کہ ہر چیز کا تھوڑا تھوڑا نمونہ دیکھتے پھرتے تھے۔ ہر نئے مقام کو ابھی پہلا سلام۔ ابھی آخری سلام۔ جانتے تھے کہ یہی ایک نظر ہے جسکی اجازت ہے پھر کہاں ہم اور کہاں یہ حسن قدرت و صنعت کے جلوے۔ عبد القادر

باقی آئندہ

اگر میں صحرا نشین ہوتا

اگر میں صحرا نشین ہوتا، تو طلوع و غروب آفتاب کے نظارے سے ہر روز متاثر ہو جاتا۔ چاندنی رات کو میں دیکھتا کہ چاند اور ستارے زمین کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں؛ اندھیری رات میں تمام عالم کی تاریکی اور ہر چیز کی خاموشی مجھ پر اثر کرتی اور میں اپنے دل میں عمیق حسیات محسوس کرتا۔ میں کسی وادی میں گذر رہا ہوتا، پر فضا گھاٹی کے پھول، اور ان پھولوں کو دیکھ دیکھ کر رنگین اور لطیف گانے والی بلبل، ہلکی آواز سے گرنے والے آبشار مجھے گھنٹوں حیرت زدہ رکھتے اور میں پُر مسرت زندگی بسر کرتا۔

مگر شہر نشین ہوں، اور کیا دیکھتا ہوں؟ ایک غریب مزدور کا لڑکا سڑک سے گذر رہا ہے، ایک عالیشان محل کے سامنے (جس میں عیش و تنعم و گناہ کے سوا کچھ نہیں) کھڑا ہو جاتا ہے؛ کھڑکیوں کو کھڑا گن رہا ہے اور یوں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ آگے، ایک بڑی پُر رونق دوکان کے سامنے کھڑا، حسرت سے منھ اور آنکھیں کھولے، دیکھ رہا ہے، مٹھائیوں کو دیکھ دیکھ کے اُسکے مُونھ میں پانی بھر بھر آتا ہے، لیکن وہ خرید نہیں سکتا۔

ایک بے والی، وارث لڑکی کو دیکھتا ہوں، اور سوچتا ہوں کہ اُسکا تبسم معصوم، ایک بوسۂ ناجائز پر (جسکے ساتھ اسکا پیٹ بھرنے کے لئے کچھ پیسے دیئے جائیں گے) قربان ہو جائے گا۔

پھر ایک شرابی سامنے سے گذرتا ہے، جسکی قوت معنویہ سب محو ہو چکی ہے؛ جو جان جان کر زہر پی رہا ہے۔

پھر ایک چور پر نظر پڑتی ہے جسے فلاکت و حاجت کے کوڑے نے چوری پر مجبور کیا، اور جسے اوروں کو عبرت دلانے، اور اوسے آیندہ چوری سے باز رکھنے کے لئے، زندان کو لئے جارہے ہیں! گویا فلاکت و حاجت زندان سے ڈرتی ہے!

ایک متعفن اور گھنی بیماری میں مبتلا فقیر کو دیکھتا ہوں، اور دیکھتا ہوں کہ ایک فٹن، بھڑک دار فٹن میں بیٹھا ہوا امیر اُدھر سے گذرتا ہے اور اس فقیر کو دیکھکر تنفر سے موتھ پھیر لیتا ہے۔

آہ! شہر نشین ہوں، روتا ہوں اور کہتا ہوں:

اے مایوس دلو! اے مدفن سرور، مزار! تمہارا خیال مجھے رُلاتا ہے، تمہیں سوچتا ہوں اور پتھر دل کرڑھاتا ہوں۔ جیسا میرا مایوس دل ہے ایسے کتنے ہوچکے ہیں، اور کتنے اس وقت ہیں! شاید پہلے اتنے دل خون نہ ہوتے ہونگے، مگر اب ہا اب تو مجھے ہر جگہ سینہ چاکی، دل شکستگی نظر آتی ہے۔

دھڑک، دھڑک اے قلبِ یاس بنیاد! اپنے لئے، اپنے جیسے لاکھوں مصیبت زدہ دلوں کے لئے دھڑک، ٹکڑے ٹکڑے ہوجا، جا، جا دور ہوجا، تیرا وجود میرے لئے بارگراں ہے، تو مزار ہے۔

سجاد حیدر (از بغداد)

انکے پہلو سے ہم جو رو کے اُٹھے	بولی تقدیر خوش تو ہو کے اُٹھے
زلف برہم خمار مستی چشم	اِس ادا سے وہ آج سو کے اُٹھے
اپنے پہلو میں کیوں بٹھاتے ہو	اس سے حاصل ہی کیا جو رو کے اُٹھے
اُٹھئے دیر و حرم سے حضرتِ دل	کیا ملیگا جو بات کھو کے اُٹھے
ہے ہر اک سے خفا نگاہ ستم	چشم بد دور یوں وہ سو کے اُٹھے
دل کو محشر دعائیں دیکے چلے	خوب دنیا سے شاد ہو کے اُٹھے - د و -

نواب دانشمند خان

اس صاحب کمال کا نام شاہجہاں اور اورنگ زیب کے عہد کے اُن باکمال اور ممتاز ترین لوگوں کی فہرست میں سُنہرے حروف سے لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ جو اُسوقت اس سلطنت میں علم و فضل کے لئے مشہور تھے اور باوجود امارت کے ہمیشہ علمی خدمت کرتے اور علمی معاملات سے دلچسپی لیتے رہے۔ یہ ایرانی فاضل شہر یزد کا رہنے والا تھا۔ اور مُلّا شفیعائی یزدی کے نام سے مشہور تھا۔ مدت تک ایران کے مختلف شہروں میں طالبعلمی کر کے فضائل و کمالات حاصل کئے۔ شاہجہاں کے عہد میں تجارت کی تقریب سے ہندوستان میں آیا، اکبر آباد سے لاہور اور وہاں سے کابل تک شاہی لشکر کے ساتھ تجارت میں مشغول رہا۔ جب شاہی کابل سے لوٹے یہ وطن کی واپسی کے ارادے سے بندر سورت کو روانہ ہوا۔ ایک دن کسی تقریب سے بادشاہ کے روبرو اس کے کمالات علمی کا ذکر ہوا۔ قدردان کمال پرور بادشاہ کو اُس سے ملاقات نہ ہونے کا سخت افسوس ہوا اور اس شوق نے ایسا بیقرار کیا کہ اسی وقت متصدیان بندر سورت کے نام فرمان لکھا گیا کہ اس فاضل روزگار کو عزت و احترام کے ساتھ دربار میں بھیجدیں۔ غرضکہ بادشاہ کی کشش اور کوشش نے انہیں سورت سے کھینچ بُلایا۔ اور ۹ ذی الحجہ ۱۰۶۰ھ کو یہ دربار شاہی میں پہنچ گئے۔ بادشاہ نے ان کے علم و فضل کو امتحان لینے کی غرض سے مُلّا عبدالحکیم سیالکوٹی سے جو اُس عہد کا بے نظیر عالم تھا علمی مباحثہ کرایا۔ علامی سعد اللہ خان حَکَم مقرر کئے گئے۔ دونوں میں خوب مناظرے ہوئے۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین۔ کی واؤ عطف پر

مدت تک بحث ہوتی رہی۔ آخرکار سعد اللہ خان نے باوجود اس کے کہ عبد الحکیم سیالکوٹی کا ہم مکتب اور دوست تھا انصاف سے دونوں کو برابر قرار دیا۔ فضیلت پرور دانا نواز بادشاہ نے منصب ہزاری سے مفتخر کر کے ملازمت شاہی میں داخل کیا۔ پانچویں سال یعنی ۲۹ سنہ جلوس میں دانشمند خاں خطاب۔ دو ہزاری منصب اور خدمت بخشی گری دوم پر سرفرازی ہوئی۔ ۳۱ سنہ جلوس میں سہ ہزاری منصب کے ساتھ میر بخشی گری کے عہدہ جلیلہ پر ترقی پائی۔

جب شاہجہاں بیمار ہوا اور بیٹوں نے حصول سلطنت کے واسطے منصوبے باندھنے اور چالیں چلنا شروع کیں تو دربار میں اُن کے طرفدار اُمرا کی جُدا جُدا دھڑے بندیاں ہونے لگیں۔ دانشمند خاں نے یہ حالت دیکھ کر میر بخشی کے عہدے پر لات ماری اور استعفیٰ دے کر خانہ نشین ہو گئے۔ جب اورنگ زیب دارا شکوہ کو شکست دیکر اُس کے تعاقب میں اکبرآباد سے دہلی پہونچا تو ان کے پاس فرمان طلب بھیجا۔ خضرآباد کے مقام پر جو پرانی دہلی کے پاس تھا یہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اورنگ زیب مردم شناسی میں بے نظیر تھا۔ اُس نے سمجھایا بجھایا اور ملازمت پر راضی کر کے منصب چہارہزاری سے سرفراز کیا۔ اور بدستور سابق میر بخشی گری کا عہدہ مرحمت ہوا۔ سنہ جلوس میں منصب پنجہزاری[1] ملا۔ سنہ جلوس میں دارالخلافت دہلی کی صوبہ داری اور قلعداری پر تعیناتی ہوئی

[1] پنجہزاری منصبدار کی تنخواہ علاوہ تنخواہ فوج کے جوائش کو رکھنی پڑتی تھی آئین اکبری کے بموجب تیس ہزار روپیہ ماہوار تھی۔ ڈاکٹر برنیر کی تحریر کے مطابق دانشمند خان کو گھوڑوں وغیرہ کی تنخواہ ادا کرنے کے بعد جو رکھنا لازمی تھے ساڑھے بارہ ہزار روپے ماہوار بچتے تھے۔

سنہ جلوس میں قلمدان مرصع مرحمت ہو کر پھر عہدہ میر بخشی کا کام سپرد ہوا۔
سنہ ۱۲ جلوس میں عہدہ میر بخشی کے ساتھ نظامت اور قلعداری دہلی کی خدمت
سپرد ہوئی۔ سنہ ۱۳ جلوس میں ۱۰ ربیع الاول ۱۰۸۱ھ کو دہلی میں وفات پائی اور خاکِ پاک
دہلی کے آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو گئے۔

دانشمند خاں نے امارت کے زمانہ میں بھی باوجود کثرت کار متعلقہ کے درس
تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ صبح کے وقت تو علی العموم وہ اپنے کار منصبی میں
مشغول رہتا تھا۔ لیکن شام اور رات کیواسطے اُس نے بادشاہ سے اجازت
لے رکھی تھی اُس وقت وہ ہمیشہ درس و تدریس میں مشغول رہتا تھا۔ مشہور فرانسیسی
سیّاح ڈاکٹر برنیر تین سو روپیہ ماہوار اس کی سرکار سے پاتا تھا۔ وہ اپنے سفرنامہ
میں لکھتا ہے۔ "میں نے طبیبوں کے ذیل میں سرکار شاہی کی نوکری اختیار
کرلی تھی پھر تھوڑی مدت بعد دانشمند خاں کی سرکار سے میرا تعلق ہوگیا۔ جو اوّل
میر بخشی کے عہدہ پر مامور تھا اور نہایت ذی اقتدار اور ممتاز ترین امرائے دربار
سے تھا اور ممالک ایشیا میں ایک بہت بڑا عالم فاضل تھا۔" دوسری جگہ لکھا ہے
"میرا آقا نواب دانشمند خان جو وزیر معاملات متعلق ممالک غیر اور سواروں کی فوج
کا میر بخشی ہے اُس کو اپنے منصب کے اہم کاموں سے صبح کے وقت تو
فرصت نہیں ملتی لیکن شام کا وقت اُس نے کتب حکمیہ کے مطالعہ کے واسطے
مختص کرلیا ہے، جسے وہ کبھی ضائع نہیں کرتا۔ اُس کو علم ہیئت اور جغرافیہ اور تشریح
کا خاص شوق ہے اور وہ گیسنڈی اور ڈے کاٹ کی تصنیفات کو بڑے
شوق سے پڑھتا ہے۔"

فاضل مذکور علم فلسفہ ہیئت اور ہندسہ میں بہ تخصیص مشہور تھا اُس نے فرانسیسی
اور انگریزی زبان بھی بقدر ضرورت سیکھ لی تھی۔ گیسنڈی اور ڈے کارٹ کے

کتب فلسفہ کا ترجمہ فارسی زبان میں کرایا تھا۔ ڈاکٹر بیگوٹ اور ڈاکٹر بارو سے علم تشریح کے معلومات جدیدہ کا حال روزانہ ڈاکٹر برنیر سے سُنتا اور اُس پر بحث و مباحثہ کیا کرتا تھا۔

باوجود مذہبی عالم ہونے کے تعصب نام کو نہ تھا اُس کی علم دوستی بے تعصبی کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اُس نے مذہب ہنود کے علمی خزانوں سے واقفیت حاصل کرنے کے واسطے بنارس کے ایک مشہور پنڈت کو جو پہلے داراشکوہ کی سرکار میں ملازم تھا بیش قرار مشاہرہ پر نوکر رکھا تھا اور نہایت سنجیدگی سے روزانہ اُس کی علمی بحث سنا کرتا تھا۔ اُس کے علمی شوق نے مدت تک چاروں مکمل ویدوں کی تلاش کی مگر وہ اُس زمانہ میں ایسے نایاب تھے کہ باوجود بے انتہا تلاش کے خریداری کے واسطے ایک کتاب بھی دستیاب نہ ہو سکی۔ اُس کا میر منشی بھی ہندی داس نام ایک ہندو تھا جسکے مرنے کے بعد اُس کے دو خردسال بیٹوں کا وظیفہ اُس نے مقرر کر دیا تھا۔

جدید معلومات حاصل کرنے کا بڑا شایق تھا کوئی سفیر ممالک غیر کا ایسا نہ ہوتا جس کے وہ ہجوم دہام سے دعوت نہ کرتا ہو۔ اس دعوت کی اصل غرض یہ ہوتی تھی کہ اُس کے ملک کی حالت اور حکومت کی وضع سے واقفیت حاصل ہو نعمت خان عالی سا فاضل شخص اس علامۂ دہر کا شاگرد تھا۔

سعید احمد (از آگرہ)

خفیہ غیروں کو پیار کرتے ہو | آنکھ جب مجھ سے دوچار کرتے ہو
کہتے ہیں فتنوں کی ایک کہی | ایک کیا تم ہزار کرتے ہو
پوچھتے ہیں کہ کِس پہ ہو مائل بڑ | جان کس پر نثار کرتے ہو
سیدھی باتوں سے کر دیا بسمل | ترچھی نظروں سے وار کرتے ہو
ٹیڑھی ترچھی نگاہیں آفت ہیں | تیر سینے کے پار کرتے ہو
کس ادا سے وہ کہتے ہیں اے آہ | کچھ کہو کس کو پیار کرتے ہو

(ابوالنصر آہ حکیم)

نابینا بیوی

(ایک شریف خاندان کی سچی داستان)

کہتے ہیں حقیقت بعض اوقات فسانہ کو بھی مات کرتی ہے۔ یہ سچا واقعہ جو ذیل میں مندرج ہے۔
اس قول کا مصداق ہے۔ شریف مزاج شوہر نے اپنی مروت اور رحمدلی سے بیوی کی
نابینائی پر پردہ ڈالا۔ خدا نے اسے اسکے صبر کا اجر اس دنیا میں بھی دیا اور آئندہ بھی دیگا
اس خود غرضی اور نفسا نفسی کے زمانہ میں بھی دنیا نیک بندوں سے خالی نہیں۔

میرے گھر کے برابر - دیوار بیچ - ایک قاضی صاحب کا مکان تھا - یہ بیچارے ایک زمانے میں بڑے متمول آدمی تھے - مگر ریاست کی زندگی اور خصوصاً ملازمت انقلاب کی تصویر ہوا کرتی ہے - ذرا راجہ صاحب کے کان بھرے اور بے قصور آفت برپا ہو گئی - اسیطرح ان شریف قاضی صاحب کے تموّل نے افلاس کا پہلو بدلا اور فقط پچاس - ساٹھ روپیہ ماہوار کی قلیل رقم بہ ہزار دقت بچ بچا کر رہ گئی - اسی پر یہ صبر شکر کیساتھ قانع تھے اور اپنا اپنی بیوی اور بیٹی کا پیٹ پالتے تھے - عربی اور فارسی کی قابلیت کے لحاظ سے دور دور انکا شہرہ تھا - اور باہر سے اکثر ایسے اشخاص مشکل مسئلے حل کرنے آیا کرتے تھے -

قاضی صاحب کی صاحبزادی کی شادی کی تقریب جب ہوئی تو نکاح میں مجھے بھی مدعو کیا گیا - مگر چند در چند ضروریات کی وجہ سے میں شامل نہ ہو سکا - مگر ہمسایہ تھا جو واقعات برات کے روز پیش آئے اُن کی خبر برابر ملی گئی - معلوم ہوا کہ حسب معمول دولہا صاحب کو پہلے سے اس لڑکی کی نسبت جس سے اب انکی قسمت وابستہ ہونیوالی تھی کچھ بھی معلوم نہ تھا اور عین نکاح کے وقت نہ معلوم کسی بات کے

علم پر۔ اُن نئی روشنی کے شیدا۔ انگریزی تعلیم یافتہ دولھا صاحب نے شادی سے قطعی انکار کر دیا۔ طرفین کی بڑی بدنامی ہوئی۔ اور آخرکار برات یوں ہی سے واپس گئی۔ اِسکے بعد خود دولھا صاحب سے میری راہ و رسم ہو گئی اور اس شادی سے انکار کرنے کی وجہ اُنھوں نے اُس غریب لڑکی کی بدچلنی ظاہر کی۔ یہ بات سُنکر میرے خیالات بھی قاضی صاحب کی طرف سے خراب ہونے لگے۔ اور میں نے اُن سے ملنا جُلنا کم کر دیا۔ کبھی کبھار وہ اگر مجھ سے ملتے تو شکایت کرتے مگر میں ٹالے بالے بتا کر پیچھا چھڑا لیتا۔ اور راستہ میں بھی ملتے کترا کر نکلجاتا۔ وہ دراصل مجھ سے محبت کرتے تھے اور میرے والد بزرگوار کے بڑے سچّے دوست تھے۔

اِسی طرح تقریباً چھ مہینے گذر گئے اور اب گرمی کا موسم آپہنچا۔ میری والدہ ضعیفہ تو صحن میں ہی سویا کرتی تھیں، مگر میں اکیلا چھت پر لیٹا کرتا۔ ایک دفعہ مجھے خوب یاد ہے۔ جمعہ کا دن تھا۔ چلچلاتی گرمی تھی۔ اور پہر بھر دن رہے سے ہی ہوا بند ہو گئی تھی۔ دونوں وقت ملتے ہی مارا مار کرکے میں نے کھانا کھایا۔ اور حقہ لے کر سیدھا کوٹھے پر جا پڑا۔ چاروں طرف اُجلی اور شفّاف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اور تارے اِکّا دُکّا نظر آتے تھے۔ ٹھہر ٹھہر کر ایک آدھ جھونکا ہوا کا آہستہ آہستہ آتا اور پسینے میں نہائے ہوئے بدن کو ٹھنڈا کر جاتا۔ دماغ میں عجیب فرحت پیدا ہوتی اور تھوڑی دیر کے لئے میں پنکھا ہاتھ سے رکھ کر حقّے کا ایک آدھ گھونٹ پی لیتا۔ دو تین گھنٹے یونہی کروٹیں بدلتے اور ہاتھ پاؤں مارتے کٹے۔ خدا خدا کرکے ۱۱ بجے۔ ہوا ذرا سرسرائی۔ اور کچھ جان میں جان آئی۔ چونکہ پہلے سے ہی آنکھیں بند کرکے زبردستی نیند کو بلا رہا تھا۔ فوراً غنودگی آنے لگی۔ سنّاٹے کی وجہ سے اِدھر اُدھر کی آوازیں بھی رہ رہ کر آجاتی تھیں۔ یکایک مجھے یہ معلوم ہوا کہ کوئی

میرے سرہانے بول رہا ہے۔ اور میں فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف گھورا مگر آدمی تو آدمی۔ پرچھائیں تک نظر نہ آئی۔ تاہم پھر بھی میں اُسی طرف متوجہ رہا۔ کہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ ہی ایک درد بھری آواز آئی۔ اور مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ آواز قاضی صاحب کی مکان کی چھت پر سے آ رہی ہے۔ اب میں سنبھلکر بیٹھ گیا اور سننے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے خیال کے موافق ہوا کے ساتھ آواز آئی۔ "خدا جانے۔ لوگ باگ کیا سمجھیں؟ اور کیونکر ہر جگہ میری بدنامی ہوتی ہو؟ مگر خیر۔ وہی ربّ العالمین خوب جانتا ہے۔ مجھے اور کسی سے غرض ہی کیا؟ مگر پھر بھی دُنیا میں بُرا نام نکل جانا بہت ... (آواز تھوڑی دیر کے لئے جاتی رہی اور پھر ہوا کے ساتھ آئی) "پاک بے نیاز! ربّ العالمین میرے اوپر رحم کر۔ میری مشکل کو آسان کر دے۔ تیرا خوف ہر ہر لحظے بُری حالت کئے دیتا ہے۔ اور یہ شیطان مردود ہر دم کیسے کیسے بھلاوے دیتا ہے۔ غریبوں کی مدد کرنے والے! اب سوائے تیرے اور کس کا سہارا ہے۔ میں تجھ ؟ ..." (سکوت طاری ہو جاتا ہے اور پھر ہوا کے ساتھ آواز آنی شروع ہوتی ہے) "... اور یہ بھی سچ ہے۔ مگر پاک پروردگار! میں یہ نہیں چاہتی کہ میری شادی ہو جائے کیونکہ مجھے دُکھیاری۔ اندھی کو کون قبول کریگا؟ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ میں پاک ہوں اور باعصمت ہوں۔ اور اب سے میں یہ چاہتی ہوں کہ میری بدنامی نہ ہو۔ اور بُرا کہنے والوں اور مجھ پر الزام لگانے والوں کا مُنھ تو بند کر دے۔ ارحم الراحمین! تو خود دیکھتا ہے کہ میں آجتک کس قدر نیک اور پاک ہوں" (ہوا رُک جانے کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتی ہے اور پھر یہ الفاظ سنے جاتے ہیں) "... بیشک سچ ہے۔ آخر کو میں بھی جوان ہوں۔ اپنی ہمجولیوں کی باتیں سُنتی ہوں تو ضرور رشک ہوتا ہے۔ مگر پاک بے نیاز! میں اس بات کی

کی شکایت نہیں کرتی کہ تو نے مجھے اندھا کیوں پیدا کیا؟ اور ہر ایک مجھ سے شادی کرتے کیوں کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے۔ میں ہر طرح تیری رضا پر راضی ہوں۔ اور ہر حالت میں تیرا ہزار ہزار شکر کرتی ہوں۔ البتہ صرف ایک بات چاہتی ہوں کہ یا تو تو جوانی کی اُمنگ اور جوش کو ملیامیٹ کر دے کہ میری زندگی آرام سے بسر ہو۔ اور نہیں تو پھر عزت و آبرو کے ساتھ میرا پردہ ڈھانک لے۔ مجھے اس جھوٹی اور مکّار دُنیا سے باعصمت اُٹھا لے" ان آخری درد بھرے جملوں کے بعد پھر کوئی آواز قطعی نہ آئی اور بڑی دیر تک کچھ زیادہ سننے کی کوشش کر کے آخر کار میں لیٹ گیا۔ وہ الفاظ میرے چوٹ کھائے ہوئے دل کے ساتھ نمک کا کام کرتے رہے۔ اور مجھے ساری رات آنکھ نہیں لگی۔

صبح ہوتے ہی میں نے جناب والدہ صاحبہ کی اجازت پر اپنے ایک دوست کے ذریعہ سے پیغام بھیجا۔ اور قاضی صاحب کی غلامی میں اپنے آپ کو دینا چاہا مگر اُن سچے اور پاکباز قاضی صاحب نے اُسکے جواب میں آبدیدہ ہو کر کہدیا "اُن سے یہ کہدینا ابھی صاحبزادہ ہو۔ ناتجربہ کار ہو۔ کیوں اپنی زندگی تلخ کرتے ہو۔ وہ بدنصیب لڑکی اندھی ہے۔ اور میں تمہارے مرحوم بزرگوار کا سچا نیازمند ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری لڑکی کی وجہ سے تمہیں مصیبت اُٹھانی پڑے۔ اگر تمہیں اسکی وجہ سے کوئی تکلیف پہونچی تو میں قیامت کے دن تمہارے والد مرحوم کو کیا مُنھ دکھاؤنگا" اس جواب نے میرے درد بھرے دل نے تھوڑی دیر کے لئے مجھے بالکل سکتے میں کر دیا۔ مصیبت اور مایوسی کی زندہ تصویر میرے سامنے تھی اور اُس نے میرے دل پر اسقدر زیادہ اثر کیا تھا کہ میری آنکھ سے ایک بھی آنسو نہ نکلتا تھا۔ بمشکل تمام میں نے قاضی صاحب کو کئی دنوں میں مجبور کر لیا اور اُس مصیبت زدہ نابینا لڑکی کے ساتھ چپ چپاتے ہی شادی کر لی۔ اب وہ کم نصیب لڑکی میری

گھر میں آئی۔ اور میری بیوی بنکر رہنے لگی۔ اُنکے ذاتی خصائل کی نسبت میں بلا
مُبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ صبر۔ قناعت۔ سچائی۔ ہمدردی۔ محبت اور پاکبازی
کی مجسم تصویر تھی۔ اور اکثر اوقات پچھلی رات کبھی میری آنکھ کھل جاتی تو میں ایک
عجیب موثر نظارہ دیکھتا۔ وہ پلنگ پر لیٹے لیٹے نہایت عاجزی اور منت وزاری
کے ساتھ دعا میں مشغول ہوتی اور ہزار ہزار طرح سے پھر دل میری ترقی۔ آرام
اور آسائش کی دعائیں پھڑک پھڑک کر دل سے مانگا کرتی۔ حتی الامکان میں بھی
اُسکی خوشی کا خیال ازحد رکھتا اور کبھی اُسکی طرف سے غافل ہوتا۔ جب تک
میری والدہ ضعیفہ زندہ تھیں میری نابینا بیوی کو میرے حاضر و غائب کسی قسم
کی تکلیف نہیں پہونچی۔ مگر انہوں نے بھی ایک دن اس دارفانی کو الوداع کہا۔
اور اُنکے صدمے نے اور زیادہ میری ہمت پست کردی۔ اب گھر میں صرف ایک
خادمہ تھی اور ڈیوڑھی پر فقط ایک نوکر۔ والدہ صاحبہ مرحومہ کی آنکھیں بند ہوتے ہی
خادمہ نے اُسے تکلیف پونہچانی شروع کی۔ مگر میں سچ عرض کرتا ہوں کہ کبھی بھولکر
بھی اُسنے خادمہ کی شکایت مجھ سے نہیں کی۔ اور مجھے اس بات کی قطعی اطلاع
نہیں ہوئی۔

ایک روز میں اتفاقیہ۔ خلاف معمول دوپہر کو گھر میں واپس آیا جبکہ میری بیوی
کھانا کھا رہی تھی اور خادمہ دسترخوان کے پاس بیٹھی تھی۔ سالن وغیرہ دیکھکر میری
آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اور میں اُس ماما کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ کیونکہ پورے طور پر
بھی کھانا بہت خراب تھا۔ اور اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف مجھے اچھا کھلاتی
تھی۔ اور میری غریب نابینا بیوی کے سامنے روکھی سوکھی روٹیاں اور بچا کھچا سالن
رکھدیتی تھی۔ اور باقی سب اچھا اچھا تیر کردیتی تھی۔ اُسی دن سے میں صبح کو جبتک
کہ میری قابلِ رحم بیوی ضروریات اور نماز سے فارغ نہ ہولیتی تھی باہر نہ جاتا۔ اور دوپہر سے

پہلے واپس آکر کھانا اُسی کے ساتھ کھاتا - پھر شام سے ہی گھر میں آپڑتا - اور تمام
رات کہیں نہ نکلتا - اُسکی سچی محبت اور راستبازی نے اسقدر میرے دل میں
گھر کر لیا تھا کہ اکثر ماما کے نہ ہونے پر میں خود کام کرتا - اور اُسکے لئے وضو وغیرہ کے
واسطے پانی لانے میں مجھے کچھ عار نہ آتی - اس طرح گھر میں گھسے رہنے کی
وجہ سے دوست احباب مجھ پر فقرے کسنے لگے اور ہر جگہ میرے ہم عمر میرا مضحکہ اُڑانے
لگے - مگر اس کا خیال میں نے کچھ بھی نہ کیا - اور میرے معمول میں ذرہ برابر بھی
فرق نہ آیا - اُسی اثنا میں اُن سنئے تعلیم یافتہ نوجوان کی شادی جنہوں نے میری
نابینا بیوی پر بد چلنی کا جھوٹا الزام لگایا تھا - بڑی دھوم دھام سے ہوئی - اور وہ
بہت خوشی کے ساتھ ایک متموّل لڑکی کو اپنے گھر لائے - مشکل سے ایک برس
گذرا ہوگا کہ شکر رنجی ہوئی اور بڑھتے بڑھتے خانہ جنگیوں کی نوبت آئی - اگرچہ میں
تواب بھی ایک معزز آدمی کی بیٹی کیطرف ایسی باتیں منسوب کرنی لغو سمجھتا ہوں -
تاہم تمام شہر میں یہ ہی افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ اُن کی بیوی آوارہ اور بد چلن ہے -
اُنہوں نے اُسے نکال دیا - اُس نے اپنے میکے پہنچتے ہی نان نفقہ اور مہر کی
نالش ٹھونک دی اور تعلیم یافتہ نوجوان کو جھٹی کا کھایا ہوا یاد آگیا - غرض خوب عرضی
پرزہ ہوتا رہا اور آخر اُن کی بیوی کی ڈگری ہوگئی - اب انہوں نے خاندان کے
بزرگوں کے سامنے منت سماجت کی اور بہ مشکل تمام وہ معاملہ رفع دفع ہوا - مگر ان
کی بیوی پھر انکے گھر میں آگئیں - اور تھوڑے عرصہ کے بعد پھر وہی تھکا فضیحتی
شروع ہوگئی - بہرحال اب اُس ڈگری کا خوف اُنکا غصہ دباتا تھا - اور یہ ہمیشہ اپنی بیوی
سے جوتیاں کھاتے رہتے تھے -

اس دار ناپائیدار کے قانون کے موافق مجھ بدنصیب پر ایک اور مصیبت
نازل ہوئی - اور میری نابینا بیوی کو بخار آنے لگا - میں نے ڈاکٹر حکیم بُلائے -

سیانے ۔ دوا ۔ ٹھنڈائی ۔ گنڈا تعویذ غرض کچھ نہ چھوڑا ۔ مگر بخار میں کمی نہ ہونی تھی نہ ہوئی
وہ دن بھر اس مرض کی شدت میں ہلملاتی رہتی ۔ اور اُسکے حواسوں پر بنی رہتی ۔ میں نے
بالکل ہر جگہہ کا آنا جانا چھوڑ دیا ۔ اور ہر وقت گھر میں ہی رہنے لگا ۔ وہ برابر چھ مہینے تک
بیمار رہی ۔ اور اس عرصے میں ہر قسم کی خدمت میں نے ہی کی ۔ یہانتک کہ چوکی پر
لیجانا ۔ دوا ٹھنڈائی پلانی وغیرہ میرا روزانہ معمول تھا ۔ چونکہ اُسے آخر دنوں میں ڈاک
بھی لگ گئی تھی ۔ اس لئے اگالدان یا سیلپچی لاکر بھی اُسکے سامنے میں ہی رکھا کرتا تھا
اور اکثر قے کی جلدی اور گھبراہٹ میں ایسا بھی ہوا ہے کہ میرے اگالدان اُٹھاتے
اُٹھاتے اُبکائی آئی اور جوں ہی میں نے اگالدان سامنے کیا کہ اُسنے ڈالنا شروع
کیا ۔ جس سے میرے ہاتھ بھی بھر گئے ۔ اگرچہ میں تمام شہر میں ابتک نہایت
نازک مزاج مشہور ہوں ۔ مگر بخدا کبھی مجھے ہاتھ یا آستین بھرنے سے ایسی کراہت
نہیں آئی کہ اُسکی محبت پر غالب آکر مجھے اُس خدمت سے باز رکھتی ۔ خدا خدا کر کے
یہ زمین دیکھنے گئی تو غشی نے آدبایا ۔ جب دیکھو آنکھ بند ۔ ایک دن اُس نے متواتر
۱۲ گھنٹے آنکھ نہ کھولی اور مجھے ازحد تشویش ہوئی ۔ رات کو تقریباً نو بجے جبکہ اُسکا سر میرے
زانو پر تھا ۔ اُسے ہوش آیا ۔ اور چھوٹتے ہی اُسنے مجھ سے کہا ۔ "تم اس قدر کیوں
تکلیف اُٹھاتے ہو ۔ کیوں مجھے شرمندہ کئے جاتے ہو ۔ اول تو ماما موجود ہے
تمہاری ہر وقت گھر میں رہنے کی بھی ضرورت نہیں ۔ اور اگر خیر تم نہیں مانتے تو خود
ہر ایک کام کرنا بھی ٹھیک نہیں ۔ میں تمہارے ان احسانات سے کیونکر سبکدوش
ہوسکتی ہوں ۔ ایک غریب ماں باپ کی لڑکی ۔ کم مایہ ۔ اندھی ۔ بیکار ۔ لاچار خود دوسروں
کی محتاج ۔ خدا کے لئے مجھے اسقدر محجوب نہ کرو کہ میں اس شرمندگی سے مر جاؤں
اس پر بھی تمہیں ماما کا اعتبار نہو تو اچھا یہ ہی کرو کہ اپنی شادی کسی سے کرلو ۔ وہ تمام
گھر بار کا انتظام خود کرے گی ۔ اور تمہیں اسقدر زیادہ دوسری نہیں کرنی پڑے گی

یہ نہ سمجھنا کہ مجھے سوکن کا کچھ خیال ہوگا کبھی نہیں ہرگز نہیں بخدا میں تو صرف ایک اسی
احسان کا کہ تم نے میرا سرتاج بننا پسند کیا۔ تمام عمر کسی طرح بدلا نہیں دے سکتی۔ اور یہ
بھی سن لو کہ سوکناپے کے پاجیانہ خیالات اسوقت آتے ہیں جبکہ ایک دوسری
کی کسی بات پر قبضہ کرنا چاہے۔ مجھے روپیہ پیسہ۔ حکومت۔ برابری۔ مرتبہ وغیرہ
کا قطعی خیال نہیں ہے اور نہ ہوگا۔ پھر ایسی حالت میں میں ایک کونے میں
پڑی رہونگی اور وہیں دو روٹیاں کھا کر تمہاری بہبودی اور ترقی کی دعا میں بقیہ عمر
گذار دونگی۔ اس طرح رہنے سے اُسے بھی مجھ سے کسی قسم کی پرخاش
نہیں ہوسکتی۔ جب میں اُسے اور تمہیں ہنستے بولتے سُنونگی تو بخدا میری طبیعت
بے انتہا خوش ہوگی۔ کیونکہ واقعی میرے ساتھ شادی کرکے تم نے اپنے اوپر
ایک بڑا ظلم کیا ہے۔ میں سمجھونگی کہ خدا نے میرے اوپر مہربانیوں اور احسانات
کا معاوضہ میرے سامنے دیا۔ سچ کہتی ہوں کہ جہانتک ہوسکے گا میں اوسکی طبیعت
پر میل تک نہ آنے دونگی"۔ کچھ نہ پوچھیے کہ ان الفاظ نے میرے ساتھ کیا کیا۔ :
میرے خون میں چکر آیا۔ آنکھوں اور کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔ اور میں نے
دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا۔ حالت روز بروز خراب ہوتی گئی اور چونکہ قاضی صاحب
بھی اس عرصہ میں دنیائے فانی سے رخصت ہوچکے تھے۔ اُس نے ایک دن
اپنی والدہ کو بلایا اور اُنکے اور میرے سامنے نہایت درد بھرے الفاظ کے ساتھ
مہر معاف کردیا۔ اُدھر میں روتے روتے بیہوش ہوگیا۔ اُسی دن سے اُسے ہچکی
لگ گئی۔ اور پانچ روز تک ہچکیوں میں مبتلا رہی۔ پانچویں دن صبح کو اُس نے نہایت
رُک رُک کر نہ معلوم مجھ سے کیا کیا کہا۔ مگر آواز کی کمی اور ہچکیوں کے تار نے قطعی نہ
سننے دیا۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ البتہ بڑی کوشش کے بعد صرف یہ جملہ سمجھ میں آیا۔
"اگر تمہیں تکلیف ہوئی تو میری روح کو صدمہ ہوگا" اُسدن ۸ گھنٹے برابر میری آنکھوں سے

قسم کھانے کو بھی آنسو نہ تھا۔ شام ہوتے ہی وہ نیک اور راست باز نا بینا مجھ کم نصیب کو آخری دم تک دعائیں دیتی راہی بقا ہوئی۔ اور میں دنیا کی تکلیفیں اٹھانے کے لئے اکیلا رہ گیا۔ میں نے گھر سے نکلنا قطعی چھوڑ دیا اور ہر وقت تنہائی میں اسکی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو رویا کرتا۔ راقم (ا۔ح)

اس صبر کا اجر یہ ملا۔ کہ ا۔ح۔ کی شادی اس واقعہ کے ایک سال بعد ریاست کے ایک معزز عہدہ دار کی لڑکی سے ہوگئی اور وہ زیادہ تر ا۔ح کی کہانی ہی سنکر متاثر ہوئے۔ اب انہوں نے اڑہائی سو روپیہ ماہوار کی آمدنی کی جائداد ا۔ح۔ کے نام کر دی ہے۔ اور لڑکی جس سے اب شادی ہوئی ہے۔ پڑھی لکھی۔ با ہنر اور حسن و وفا کی پتلی ہے۔ یہ اجر دنیا میں ملا اور آخرت کا حساب کون لگا سکتا ہے۔

سلطان حیدر۔ جوش (دہلوی)

مقام مسرت ہے کہ آج ہم تصویر کے ذریعے ناظرین مخزن کو مولوی محمد عبدالراشد صاحب دہلوی سے روشناس کرتے ہیں۔ اُن کے مضامین کے بیشمار مداحوں کو جس قدر اشتیاق انکے دیکھنے کا ہے وہ اس سے ظاہر ہو سکتا ہے۔ کہ بہت سے خطوط اطراف ہند سے دفتر مخزن میں آئے ہیں جن میں یہ تقاضا تھا کہ مولوی صاحب کی تصویر جلد شایع کی جائے علاوہ لطف زبان کے جو آپ کی تحریر کا حصہ ہے آپ کے مضامین میں یہ بڑی خوبی ہے کہ عموماً ہندوستانی گھروں کی روزمرہ زندگی کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ طرز بیان میں آپ جناب مولینا نذیر احمد صاحب کا تتبع کرتے ہیں۔ اور سچ یہ ہے کہ اکثر جگہ ان کا رنگ اُن سے اس درجہ ملتا ہے۔ کہ امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ مولینا ممدوح کے اعزہ میں سے ہیں اور ان کے وجود سے یہ تسلی ہوگئی ہے کہ مولینا ممدوح کا انداز خاص اُن کے بعد بھی قائم رہے گا۔ مولوی عبدالراشد صاحب کی دو نتیجہ خیز اور دلچسپ کتابیں یعنی "صالحات" اور "منازل السائرہ" چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں اور اردو کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ "منازل السائرہ" اول مرتبہ جس قدر چھپی فوراً فروخت ہوگئی۔ اب دوبارہ مخزن پریس میں زیر طبع ہے

اُمنگ اور لالچ

ہر انسان کی طبیعت میں جذب منفعت اور جلب سود کے متعلق دو قسم کی خواہشیں پائی جاتی ہیں۔ اُمنگ اور لالچ۔ اِن دونوں جذبات میں عموماً فرق نہیں کیا جاتا کبھی دونوں خاصیتیں بُری سمجھی جاتی ہیں۔ اور کبھی ان دونوں کو خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ یہ اِس قسم کا متشابہ ہے۔ کہ جس سے یا تو انسانی ترقیات میں دن بدن تنزل آتا جاتا ہے۔ اور بہت سی شخصی ہستیاں بری طرح سے اُن کا شکار ہوتی رہتی ہیں۔ اور یا شخصی ترقیات کا سلسلہ سوسائٹی اور قوم کے حق میں سخت مضر ثابت ہوتا ہے۔ فطرت انسانی کا یہ ایک خاصہ ہے کہ انسان جائز طریقوں اور جائز مسالک سے اپنی ذاتی ترقی اور عروج کا خواہاں ہے اِس کا دوسرا نام اُمنگ یا حوصلہ یا عالی ہمتی ہے۔

جس میں اُمنگ نہیں وہ گویا اعلیٰ جذبات سے خالی ہے اور انسانی مراتب کے بہت نچلے حصوں میں ہے۔ اور اسکی شخصیت خود اپنے لئے اور اپنی سوسائٹی اور قوم کے لئے اصلی معنوں میں مفید نہیں ہو سکتی۔

اُمنگ کے مقابلہ میں باعتبار جلب منفعت کے دوسرا خاصہ وہ ہے جسمیں انسان ناجائز طریقوں اور ناجائز ذرایع یا وسائل سے استحصال کرتا یا ایسی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ جو سوسائٹی یا قوم کے واسطے ایک شرمناک اور تکلیف دہ عمل یا روش ہے۔

ایسے عمل سے صرف ایک شخصیت ہی معتوب نہیں ہوتی بلکہ اُسکی وجہ سے سوسائٹی اور قوم بھی بدنام ہوتی ہے۔ بے شک چند شخصیتوں کا ذاتی عمل

ساری سوسائٹی یا ساری قوم کے لئے مہلک اور موجب رسوائی نہیں۔ لیکن اگر تقریباً سب شخصیتیں ایسی ہی رفتہ رفتہ ہوتی جاویں۔ تو آخر کار ایک قوم کا حال کیا کچھ ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔ اس دوسرے طریق کا نام لالچ ہے اور جو اس کا متبع اور عادی ہے وہ لالچی۔

عدم امتیاز کی وجہ سے ان دونوں عملوں میں اکثر اوقات بہت کم فرق کیا جاتا ہے بعض دفعہ وہ عمل بھی لالچ کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ جو کوئی شخص محض اُمنگ یا عالی ہمتی کے اصول سے کرتا ہے اور بعض دفعہ لالچ اُمنگ کے مفہوم میں لیکر ایک سخت غلطی میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ ان دونوں کے ملا دینے سے گویا جائز ناجائز اور ناجائز جائز ہو جاتا ہے۔ اور اصل غرض سے لوگ دور ہٹتے جاتے ہیں۔

بہت سے لوگ جو اُمنگ کی وجہ سے آگے بڑھتے اور اپنے کمالات طبعی کے دکھانے کے ولولے رکھتے ہیں۔ وہ لوگوں کی مزاحمت اور حملوں سے عموماً رک جاتے ہیں۔ اور اُن مراتب یا اُن منازل تک پہنچنے سے رہ جاتے ہیں جو اُن کے پیش نظر ہوتی ہیں۔ مختلف لوگوں کی سوانح عمریاں اور بعض تاریخی یا روایتی واقعات ہمیں سناتے ہیں۔ کہ ایسی مزاحمتوں اور روکوں سے بڑی بڑی شخصی طاقتیں معدوم ہو گئیں

جو شخص صحیح اُمنگ اور عالی ہمتی سے یہ ولولہ اور یہ جوش رکھتا ہے۔ کہ وہ بتدامابہ اپنے اور ابنائے جنس کے بعض امور میں ترقی کرتا چلا جاوے۔ یا ایک خاص درجہ تک بڑھ سکے۔ وہ دراصل نہ تو لالچ کرتا ہے اور نہ ہی دوسروں کے واسطے کوئی سدِ راہ ہوتا ہے۔ بلکہ صحیح معنوں میں اور بڑھنے والوں کے ساتھ ساتھ وہ بھی آگے نکلتا اور بڑھتا ہے۔ جو ہستی ایک طاقت اور جوش رکھتی ہے۔ اُسکا حق ہے کہ وہ:-

" اپنی محنت سے آگے بڑھے
" یا اپنی ہمت آزمائی کرے
" جو آگے جا رہے ہیں۔ اُن تک پہنچے۔
" جائز طریقوں اور کھلی کھلی راہوں سے۔ اپنا راستہ آپ نکالے
" ہر کسی کے واسطے یہ حق قدرتی ہے کہ وہ ترقی کی دوڑ میں جائز راہوں سے آگے نکل جاوے۔

ہوا بجلی اور رعد کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ نہ تو کوند اور نہ کڑک اور بجلی ہوا کے جھونکے نہیں روک سکتے ہاں اگر جائز طریقے استعمال نہ کئے جائیں تو پھر ایسا عمل اعتراض اور نفرین کے قابل ہے۔

اُمنگ جسے انگریزی میں "ایمبیشن" کہتے ہیں ہر حالت میں ہر ہستی کا ایک جائز اور قدرتی حصہ ہے۔ ایک ہستی دوسری ہستی کو اس سے بند نہیں کر سکتی۔ اور ایک بامذاق اور پر جوش ہستی اس سے رُک نہیں سکتی۔

محض عالی ہمتی کے اصول سے ترقی مدارج کی سعی میں لگے رہنا اور آگے نکلنا ایسا عمل ہے۔ جس سے شخصی ترقیاں اپنی سوسائٹی اور قوم کی نیکنامی اور ترقی کا باعث ثابت ہوتی ہیں۔

ہاں اسکے مقابلے میں لالچ جسے انگریزی میں "ایویریس" کہتے ہیں۔ بیشک مذموم اور مہلک چیز ہے۔ اس سے طبایع کا محفوظ رکھنا لازمی ہے۔ لالچی اس واسطے بڑھتا ہے۔ کہ دوسروں کے حقوق غصب کرکے اپنے قابو میں لاوے اُمنگ میں عالی ظرف ہونا لازمی ہے۔ خلاف اسکے لالچ میں حوصلہ برائے نام بھی نہ ہوتا۔ عالی ظرف آدمی دوسروں کے حقوق محفوظ رکھکر خالصتاً کوشش اور اپنی ہمت کا امتحان کرتا ہے۔ لیکن لالچی سب سے اوّل براہِ حسد یا دیگر ابنائے

جنس کی ترقیوں یا نعمتوں کا اتلاف مدنظر رکھکر سعی کرتا اور آگے بڑھتا ہے۔

اپنی ترقی چاہنا ایک اور بات ہے اور دوسروں کی ترقی کو بری نگاہ سے دیکھنا ایک اور صورت ہے۔ سکول کے لڑکے ایک اُمنگ اور صادق جوش میں امتحان میں بڑھتے اور کامیاب ہونیکی کوشش میں رہتے ہیں یہ جائز طریقہ ہے لیکن لالچی دوسرے کی دولت اور ثروت اس نظر سے تاکتا ہے کہ اس میں میرا حصہ کیوں نہوا۔ اور میں بھی اس میں سے کچھ لے لوں یہ ناجائز اور مذموم ہے۔ دونوں طریق عمل میں سے بے شک بعض اوقات ایک باریک سا فرق رہجاتا ہے۔ لیکن ہوتا ضرور ہے۔

گو لالچی آدمی بھی بہت کچھ کرتا اور آگے بڑھتا جاتا ہے۔ مگر اس کا بڑھنا اور کچھ حاصل کرنا صرف اپنی ضرورت کے واسطے ہوتا ہے۔ اور قوم یا سوسائٹی کے حق میں اسکا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مگر جو شخص جوش یا اُمنگ اور بلند ہمتی سے آگے نکلتا اور کامیاب ہوتا ہے۔ وہ سوسائٹی میں ایک عمدہ نظیر قائم کرتا ہے اسکی نیک نیتی اور صحیح کوشش اسکی کامیابی میں ایک درخشاں پہلو اختیار کرتی ہے لالچی لوگ بدظن ہوتے اور کڑھتے ہیں۔ مگر عالی ہمت شخص کی ہمت سے دلوں میں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔

"اے انسانی نسل تو ایک دوسرے سے آگے بڑھتی جا۔ لالچ سے نہیں بلکہ محض عالی ہمتی اور طبعی اُمنگ سے زندگی کی دوڑ میں نیک نیتی سے دوڑ اور ایک دوسرے سے آگے نکلتی جا۔ اسی طرح سوسائٹی چمکتی اور قوم ترقی پاتی ہے۔"

سلطان احمد (میانوی۔ پنجاب)

فلسفہ کا دربار

(ایک حکیم کا خواب)

تخیل کے قدردان اس مضمون کی داد دینگے - یہ ہمیں اتفاق سے ایک دوست کے پُرانے مسودات میں مل گیا ہے - اور اسکے چھاپنے کی اجازت اس شرط سے ملی ہے کہ بے نام شایع ہو - ہمارے فاضل دوست کو یونانی فلسفیوں اور ایرانی زرتشتیوں کی کتابوں سے ایک خاص لگاؤ رہا ہے اور اس کا اثر اس مضمون میں نظر آرہا ہے - ہم تو جانتے ہیں کہ اُنھوں نے میدانِ خیال میں ہی گھوڑے دوڑائے ہیں - گو ممکن ہے کہ کوئی ہندی فلسفی انکے پیش نظر بھی ہو - بہرحال حکمارِ قدیم کے دربار اور اُن کی عدالت میں ہندی فلسفی کے جرم کی تحقیقات کی تصویر دلچسپ ہے اور خوبی یہ ہے کہ مناسب الفاظ میں کھینچی گئی ہے:-

کل دحمنہ شاپور کا مُغ اردبیل کے پہاڑوں سے اُتر عالم رویا میں میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ " اے پُرانی جنس کے پرکھنے والے تجکو کچھ خبر ہے کہ سرزمین ہند کا وہ فلسفی کیا ہوا جسکو رب الشمس ابولوس کے مندر کے یونان کی دیبیوں نے اس بھارت ورش میں بھیجا تھا کہ تزکیہ نفس و ریاضت علمیہ میں مصروف ہو تا آنکہ اپنے کالبد خاکی کو مومیائی میں تبدیل کرکے اور مصر قدیمہ کے کسی تنگ و تاریک تہخانہ میں اوسکو بطور یادگار کے محفوظ کیا جاوے -

اَب سُن کہ ایک رات پچھلے پہر سے جبکہ آتشکدہ اردبیل سے شعلہ زردشت ہر دشت و جبل میں دور و نزدیک پیدا تھا میں تجلّیٔ خالق کا مظہر بنکر اہرمن کے طبقہ ظلمت میں نور کے ذرّے اُڑاتا لبنان کے پہاڑوں کی طرف چلا اور جب

اوسکی ایک شاداب وادی سے گذرا تو دیکھا کہ بیت اللحم کا ایک بخار اور آیلیا کے چند لکڑہارے لبنان کے اشجار کہن سال کو جنکی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں وادی‌نہ دیہی سکے آہوان پشیم چرا کرتے تھے تیشہ و تبر سے کاٹتے تھے۔

استنے میں آفتاب کہ خالق لیل و نہار ہے افق مشرق سے بلند ہوکر کوہسار پر چمکا اور میں نے دیکھا کہ قریب ہی یونان کا صناع ارشمیدس نامی کہ جزیرہ صقلیہ میں دفن تھا۔ بیرم و شاقول لئے فکرمند کھڑا ہے اور حکیم اقلیدس تذنیل کا مشہور مساح مسطر و پرکار لگا سے ارشمیدس سے کچھ کہتا ہے مجکو حیرت ہوئی کہ ایلیا کے لکڑہارے درختوں کو گراتے ہیں۔ بیت اللحم کا نجار تختے نکالتا ہے۔ اقلیدس وارشمیدس صنعت میں مصروف ہیں۔ حیران تھا کہ یہ اعمال ریاضیہ کو موجب "ارمغان" ہیں کیوں ان اساتذہ مقتدمین سے بعنوان مہرمندی اجرا پائے ہیں۔ اس تجس سے عمدہ بر آنہوا تھا کہ درختوں کی اوٹ سے ایک تیر کے فاصلہ پر بیرسبع کے چرواہے کہ جرار کی وادی میں اسحاق کے چرواہوں سے تکرار کر چکے تھے شاعر اومیرس کے مینڈھے کو کہ زرین پشم مشہور تھا لئے آتے ہیں۔ اور بیت اللحم کے نجار نے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کیا اور ایلیا کے لکڑہاروں نے بیرسبع کے چرواہوں کو دیکھکر نعرے بلند کئے اور انکے نعرے لبنان کی گھاٹیوں میں گونج اوٹھے۔ اور بیرسبع کے چرواہے ایلیا والوں کے پاس پہونچے۔

ارشمیدس صقلیہ کے مدفون نے جیب کفن سے مقراض نکالی اور اقلیدس نے میش اومیرس کی پشت سے اون کاٹی اور جب اندوختہ کافی ہوا تو سب نے ملکر ایک رسی بٹی۔ اور استنے میں شامیوں نے ایک تختہ تیار کیا کہ ہمشکل اسطرلاب تھا مگر فعل اسکا عمل اسطرلاب سے فرق رکھتا تھا۔ اور یہ ختم نہ ہوا تھا کہ مغرب کے بندرگاہوں سے کلدانی ملاحوں کا ایک گروہ آیا اور سب نے تختہ اٹھا کر سر پر رکھا اور دریا

کی طرف چلے۔ جیکہ صقلیہ کا ارشمیدس۔ مصر قدیمہ کا اقلیدس۔ بیت اللحم کا نجار اور ایلیا کے لکڑہارے۔ آدمیرس کا بینڈھا۔ اور بیر سبع کے چرواہے کہ جرار کی وادی میں اسحاق کے چرواہوں سے ارچکے تھے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ اور یہ سب صقمونیہ میں پہونچے کہ لب بحر واقع تھا۔ اور یہاں کلدانیوں کا جہاز تھا کہ ارغوصہ کو مال بھرتا تھا اور اس جہاز پر یہ سب معہ ساماں کے سوار ہوئے۔

شب تار نے ارض و سما پر ظلمت شایع کی تھی۔ برج عقرب سنبلہ سے حد مشرق میں ۱۹ دقیقہ خارج ہوا تھا اور زحل کا اقتران عطارد سے مرتبہ کمال کو نہ پہونچا تھا کہ ناخدا نے لنگر اٹھایا۔ ارشمیدس دریا کے سفر سے پہلے ہی خستہ تھا سو گیا۔ اقلیدس فکر مساحت میں اختر شمار ہوا۔ بیت اللحم کے نجار کی آنکھ بھی جھپک گئی ایلیا کے لکڑہارے خراٹے لے رہے ہیں۔ اُمیرس کا بینڈھا ایرس کے کلام پر جگالی کرتا ہے۔ تاریک موجوں پر چمکتے تارے کا عکس ہے۔ بحر اسود کے ہوا کے جھونکے آتے ہیں اور بادبانوں میں "غلغلہ" ڈالتے ہیں۔ کلدانی ملاح ہلکے ہلکے گیت گاتے ہیں اور کشتی مگس نیم جان کی طرح سیاہی میں پڑی اپنے نحیف پروں کی حرکت سے شناور ظلمت ہے۔

اے شخص! تو حیرت کریگا کہ میں دخمہ شاپور کا شمع اس منظر عجیبہ کا تماشائی کس عنوان ہوا۔ سُن کہ وادی لبنان سے جب یہ قافلہ ساحل پر پہونچا تو زمین پر تاریکی تھی اور فلک ارباب ضیا کی جلوہ گاہ بنا ہوا تھا۔ میں کہ پرستندۂ نور ہوں برج جدی میں پہونچا اور ایک انجم کی شعاع پر سوار ہو کر جہاز کے ساتھ ارغوصہ کو چلا۔

صبح کا ستارہ کہ نقیب آفتاب ہے طلوع ہو کر آسمان پر قدرے مرتفع ہوا تھا کہ شعلہ اعظم کی ضیا نے مشرق سے اوٹھکر اوسکے نور مستعار کا خاتمہ کیا اور

کلدانی جہاز یونان کے پانی میں ارغوصہ کے سامنے لنگرانداز ہوا۔ اور اثینا کے شہر والوں نے جوق جوق اوسکا تماشا کیا۔

اے نشیمنِ رویا کے تکیہ نشین مطلع ہو کہ دوسرے ہی دن ثیبس سے ایک سفینہ ارغوصہ میں پہونچا اور ثیلیس کا قدیم بلدہ نیل کے دہانہ سے دور نہ تھا۔ اور اِس سفینہ میں وہ کارواں تھا جو شرق کی سرزمین ہند سے چلکر عمان، عرب واحمر کے سمندروں کو طے کرتا ہوا موسوی زمین یعنی ارضِ موعود کہلائی گئی۔ اُترا تھا اور خشک و تر راستوں سے ثیبس میں پہونچکر ارغوصہ کو اوسنے جہاز لیا تھا۔ اور اسی سفینہ میں مشرق کا وہ حکیم و شیدائے حکمت "شایق اسطرلاب" تھا جسکو بتخانہ ابولوس کی دیبیوں نے طرح طرح کے الزام لگا کر بغرض عدالت اثینا میں طلب کیا تھا۔

یونان قدیمہ کا دارالحکومت ایک فرسنگ پر ہے اور حصار اثینا کے سنگین کنگورے نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ بتخانہ دلفائی کے سامنے جسکو زمانہ نے شرف قدامت اور عناصر نے خلعتِ بوسیدگی دیا ہے یونانِ قدیمہ کے اہل کمال ہر طبقہ و درجہ کے جمع ہیں۔ عوام الناس بھی ہیں۔ کہیں حکمار کا جرگہ علیحدہ ہے۔ باہمی سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ ثالیس حکیم اپنے مونس اناثیمانوس سے کے افکار فلسفیہ پر معترض ہے۔ دیوجانس کہ ابالونیہ کا باشندہ ہے، ہرقلاطیس سے مجادلہ کرتا ہے کہ نار اور صرف نار وہ ذات ہے جسمیں صفات باری پوشیدہ ہیں۔ اناثیغورس موجودات میں انقلاب کا قائل تھا اور فیثا غورث سے سائل ہے کہ عدد جوہر بالذات کیوں ہوا۔ سقراط برہنہ سر کمبل کی کفنی گلے میں ننگے پاؤں ایک طرف کھڑا ہے۔ جوانانِ اثینا ہیں کہ حلقہ کیے ہیں مگر استاد کی جرح سے

سب کے حواس باختہ ہیں۔ فلاطو بھی ہے۔ مگر ارسطو کی طرف نگاہ غضب رکھتا ہے۔ ارسطو بھی اُستاد سے شرمندہ ہے اور دفع الوقتی کے لئے برقلس سے سکندر اعظم کا حال پوچھنے لگتا ہے۔ بطلیموس و جالینوس ہاتھ میں ہاتھ دیئے کھڑے ہیں مگر چہروں پر غصہ ہے کہ استنے میں ارشمیدس کو دیکھکر اکثر اہل کمال تعظیم کو بڑھے۔ سرگوشیاں بند ہوئیں اور سب کے بشرہ سے انتظار کی بیچینی ظاہر ہونے لگی کہ دور سے ایک غبار نظر آیا دیکھا تو شہر کے دروازوں سے ایک گروہ آتا ہے جس میں سب سے آگے اسپارطہ کے سپاہی زرہ و خود لگائے مغفر نیچے کئے ہاتھوں میں نیزے لئے ایک عجیب الخلقت ذی حیات کو حراست میں لاتے ہیں اور پیچھے پیچھے بیت اللحم کا نجار ہے کہ تیشہ و تبر دوش پر ہے اور کلدانی ملاحوں کے ساتھ ایلیا کے لکڑہارے ہیں کہ کندھوں پر تختہ اٹھائے ہیں۔ اور ان کے پیچھے بیر سبع کے چرواہے ہیں کہ ادمیرس شاعر کے مینڈھے کو رسّی میں باندھے لاتے ہیں۔ اور یہ کل گروہ معہ اس سامان کے بت خانہ ولفائی کے سامنے پہونچ گیا۔

بیت اللحم کے نجار نے کلدانیوں کی مدد سے تختہ کھڑا کیا اور بیر سبع کے چرواہوں نے ادمیرس سے اجازت لیکر اوسمیں رسّی باندھی اور ایلیا کے کاریگروں نے تختہ کے ایک طرف سیڑھی لگائی۔

یہ جبر ثقیل ختم نہ ہوا تھا کہ ولفائی کے ویرانے میں یونان کے سب باکمال اپنا اپنا پوستین پہنکر پتھروں پر ہو بیٹھے اور فوراً ایک مجلس شوریٰ قائم کی۔

متقدمین کو خود داری نے معذور رکھا اسلئے ارسطاطالیس حکیم صدر انجمن قرار پایا۔ برقلس نے کہ رزمیہ اوصاف کے ساتھ رزمیہ خصائص بھی رکھتا تھا۔ فیلسوف ہندی کو حراست سے علیحدہ کر کے مجلس کے سامنے پیش کیا۔ صدر انجمن د

حاضرین کے متوجہ ہونے ہی ارسطوقوس حکیم اپنے پتھر پر سے اٹھا اور با بیرس کا قرطاس جیب سے نکالکر اُن تمام الزامات متعلق بہ تخریب علوم قدیمہ کو پڑھا جنکی پاداش میں یہ حکیم ہندی آج اساتذہ یونان کے روبرو حاضر کیا گیا تھا۔

اے واہمہ کے خیالی پتلے اگر تو ان الزامات کو سامعہ سے حاصل کرنا چاہتا ہے تو ذرا حکیم ارسطوقوس کی تقریر سُن۔

ارسطوقوس :- اے دولت فلسفیہ کے اعیان واراکین میں علما رانو لیفیہ یعنی خطہ یونان اور اونکے مخترع وطبعزاد علوم وفنون کی طرف سے وکیل ہوکر اس مجلس عدالت میں جہاں طبقہ علم وحکمت کے اکثر باکمال جمع ہیں اس ہندی کے مقابلہ میں وہ شکایات پیش کرتا ہوں۔ جنہوں نے ہماری ہزار ہا برس کی نیند کو اُچاٹ کردیا ہے۔ ہمارے علوم وفنون کے ساتھ جنکو ہم نے مثل اپنی اولاد کے اس دنیا میں چھوڑا تھا۔ اس حکیم نے غفلت کے ساتھ بدسلوکیاں کیں حتیٰ کہ آج تدارک کے لئے ہم کو اپنی خاک سے اُٹھنا پڑا۔ وہ حکما اس مجلس میں موجود ہیں جنکو خاص خاص شکایات ہیں۔ اوّلاً حکمائے اقلیدس۔ ارشمیدس۔ بطلیموس وجالینوس ہیں۔ جو علوم ہندسہ۔ ہیئت۔ طبیعات وطب کے حامی وشفیع بنکر دادرسی چاہتے ہیں ثانیاً۔ فلسفیان متقدمین سے ثالیس حکیم مع اناثیمانوس۔ ہرقلاطیس اور انائیغورس کے سائل ہیں کہ علوم الٰہی۔ فلسفہ۔ منطق اور ادب پر جس جس طریقہ سے اس ہندی حکیم نے دست تطاول دراز کیا ہے اوسکی مکافات ہو۔ ثالثاً۔ ارسطاطالیس صدر انجمن خود ہے جو اپنے افکار طبعزاد مثلاً۔ علوم ریطوریقا۔ سوفسطیقا۔ بوطیقا۔ اور قاطیغوریاس کی طرف سے فریادی ہے۔ رابعاً۔ حکیم فیثاغورس فضار عالم کا بین کار۔ آسمانوں کا سرنگینیا فن موسیقی کی بے قدری کا شاکی ہے کہ کبھی اثر نغمہ افلاک سے یہ حکیم متاثر نہ ہوا۔ اور یونان کا باشندہ اومیرس صبح آفرینش کا شاعر

فنِ شعر کی طرف سے فغان برلب ہے کہ اس فلسفی سے اسلوب کلام کی کبھی داد نہ ملی۔
اور آخر میں خطۂ یونان کے جملہ بت تراش ماہران حسن ظاہر ہیں کہ حکیم کی شکل و
ساخت ظاہری پر سخت معترض ہیں۔ بالخصوص اوسکی ریش مخروطی پر جو زنخندان
سے خارج ہو کر بدنما زاویہ اختیار کرتی ہے اور دہن کے محاذ میں قوس معکوس
پیدا کرتی ہے۔ نیز کاسہ سر میں احساس اربعہ کے لئے جو آلات برعایت ترتیب
اعضا و حسن قوی نصب کئے گئے تھے انکو بھی کثرتِ استعمال اور یہ خود ساختہ سے
بے کار و مضمحل و بدنما کر لیا ہے۔

پس ہیں ارسطو قوس ان جملہ ارباب کمال کی طرف سے جنہیں متقدمین و
متوسطین و متاخرین سب شامل ہیں اس دربار عالی وقار میں کہ محل عدالت
ہے مستدعی ہوں کہ اس مخرب علوم و فنون کا ایسے پایۂ عزت کے شایاں
کہ وہ ہمارا مقابل بنا کوئی تدارک کیا جاوے۔ اور چونکہ اوسکی نسبت دلفائی کے
کاہنہ نے ثبوت سے پہلے ہی سزا تجویز کر کے قلوب اہل اتھینا کو روشن کر رکھا ہے
اسلئے تفصیل الزامات بغرض ثبوت غیر ضروری ہے محض حکم سزا کافی ہے۔
بس اے حکمائے یونان اب آپ سمجھے کہ یہ حکیم کون ہے۔ یہ ہندوستان
کا وہ مصنوعی فلسفی ہے جو از روئے جفر دلفائی یہ ہزار آفات بری و بحری و مصائب
ارضی و سماوی اس دربار علم میں جہاں قلم و حکمت کے شاہان ذوی القدر رونق
بزم عدل ہیں حاضر کیا گیا ہے تاکہ اپنی ہستی ناپائدار کی صفات متنوعہ و شیون
مختلفہ میں جو جو شدائد اوس سے ظاہر ہوئے ہیں اور سوفسطایان بھنگ نوش
کی صحبت سے متاثر ہو کر علم و حکمت کے شیشۂ ناب میں زندقہ و اطارقہ کی افیون
جس جس طریقہ سے اسنے گھولی ہے اوسکی سزا پاوے اور بالآخر اوس کے
کالبد خاکی پر جسکا وہ مالک ہو عذاب حادث کیا جاوے۔

ارسطوقوس اس قدر تقریر کے بعد بیٹھ گیا۔ کسی حکیم پر اوسکی جادو بیانی کا مطلق اثر نہ ہوا۔ لیکن مشورہ کے لئے دلفائی کے بت خانہ میں سب چلے گئے اور مشورہ کے بعد پھر اپنے اپنے پتھروں پر آبیٹھے۔ جب کسی قدر خاموشی ہوئی تو صدر انجمن ارسطاطالیس اپنے اونچے پتھر پر سے اوٹھا اور بولا۔

" ارسطوقوس اور اے حکمتِ یونان کے ستارو پر دو حکیمو! - اس مقدمہ میں متقدمین و متاخرین دونوں نے باہمی فیصلہ کرکے بذریعہ اناثیغورس حکیم کے اپنی رائے سے مجھکو آگاہ کیا ہے اور میں مجبور ہوں کہ اس ہندی حکیم کے حق میں وہ فیصلہ سناؤں باطن میں جسکا علم پہلے سے موجود ہے۔ لیکن ارسطوقوس نے خاتمۂ تقریر پر حکماے یونان کی طرف سے استدعا کی ہے کہ اس حکیم ہندی کے کالبد خاکی پر کہ جسکا وہ مالک ہو عذاب حادث کیا جاوے۔ اسکو ہم منظور کرتے ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہین آتا کہ اوسکی روح پاک پر بھی جو جزو غالب اوسکی ہستی کا ہے ایسا ہی کوئی عمل ہو۔ پس حکم آخر یہ ہے کہ اس حکیم کو جسکو ارسطوقوس نے بعض مواقع پر ہندی فیلسوف بھی کہا ہے اوس تخت کے ذریعے سے جسکو ایلیا کے لوگوں اور بیت اللحم کے نجارنے جبل لبنان کے اشجار سے تیار کیا ہے اور یہ بیل اوس رسن سے کہ جسکو بیرسبع کے چرواہوں نے میش او میرس کی سنہری اون سے بٹا ہے طبقۂ فنا میں فوراً معلق کر دیا جائے تاوقتیکہ اوسکا کالبد خاکی روح سے پاک ہو۔ اور آخر میں ارسطاطالیس ان صدر نشینان بزم کی خدمت میں بعوض اوس شکریہ خدمت کے جو صدر انجمن کی وجہ سے مجکو ملنے والا ہے مستدعی ہوں کہ اس حکیم ہندی کی روح کو جب وہ قید عناصر سے آزاد ہو حکیم فلاطون اپنے مخترع عالم امثال میں لیجاوے تاکہ اوسکو کچھ زمانے کے لئے سکون ہو اور کسی قالب عجیب کو جلد وہ اختیار نہ کرے۔ اور نیز اساتذۂ متقدمین سے

درخواست ہے کہ عناصر اربعہ جو عنصر جس حکیم کا علت العلل ہوا وسمیں اس حکیم کے اجزا ر باقیہ جسمانی کو جذب کرلے۔

ارسطا طالیس کا فیصلہ منظور ہوا۔ اثینا کے تماشائیوں کا ہجوم ہوا اور دیو جانس کلبی جلاد ی کے لئے تم محصت سر پر رکھے گئے کی رسی کمر میں باندہے آیا اور تختہ کی طرف گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اے عالم رویا کے تماشائی سمجھ لے کہ وہ پھر ہی ہوا جسکو رب الشمس ابولس کی دیبیوں نے چاہا تھا۔ اور سرزمین ہند کا فلسفی بصلاح حکمائے عالم طبقۂ فنا میں معلق ہوگیا۔ اور حکیم افلاطون اوسکی روح کو عالم امثال میں لے گیا۔ لیکن عناصر نے اوسکے اجزا کو نہ لیا اور حکیم کی مومیائی ثیبس کے بت خانہ میں دنیا کی یادگار بنی۔

اور پھر سب دیسی بدیسی اپنے اپنے ٹھکانوں کو چلے گئے۔ ارشمیدس صقلیہ پھونچکر اپنی لحد مستطیل میں جا سویا۔ اقلیدس ساحل نیل پر روپوش ہوا۔ یونان والے اپنے اپنے ویرانوں میں جا چھپے۔ کلدانی اپنا جہاز ارغوصے سے لیکر شام کے بندرگاہوں میں آئے۔ بیت اللحم کا نجار بیت اللحم کو اور ایلیا کے لکڑہارے ایلیا کو گئے۔ او میرس کا مینڈھا جرجان کے پہاڑوں میں چھوٹ گیا۔ بیر سبع کے چرواہے کہ اسحاق کے چرواہوں سے لڑے تھے اسمٰعیل کے گلے چرانے لگے۔ اور میں آتشکدہ شاپور کا مغ اردبیل کے پہاڑوں کو واپس آیا۔ پس جو کچھ تو نے سُنا اوسپر حیرت کر!

زیارت بلوچستان

گذشتہ تعطیلوں میں ہم کو بلوچستان کی سیر کا موقعہ ملا - اور وہاں ہمنے ایک پہاڑی مقام زیارت نامی کی زیارت کی جو نہایت سرد ہے اور آٹھ ہزار فٹ سطح سمندر سے اونچا ہے - شاید بلوچستان بھر میں یہ ایک ہی مقام سرسبز ہے ورنہ زیادہ تر حصہ بلوچستان کا خشک اور بے برگ ہے - یہاں ایک وادی میں سبزہ کی وہ بہار دیکھی کہ یاد رہے گی - اس حصہ کو انگریز "فرن تنگی" کہتے ہیں - زبان بلوچ میں "تنگی" اوس دشوار گذار تنگ راستہ کو کہتے ہیں جو دو رویہ سلسلۂ کوہ کے درمیان ہو - وادی اور تنگی میں یہ فرق ہے کہ وادی ایک دور دراز میدان کی طرح مابین دو سلسلہ پہاڑوں کے ہوتی ہے "مگر تنگی" کی چوڑائی ۳۰ یا ۴۰ فٹ ہوتی ہے - انگریزی زبان میں شاید لفظ "ڈیل" "تنگی" کے قریب قریب معنے رکھتا ہے -

کوہ شملہ - مری - ہماگسو وغیرہ پہاڑوں میں ہمکو "تنگی" نظر نہیں آئی - زیارت میں کئی تنگیاں ہیں - مثلاً ایک تنگی وہاں کے ایک ایجنٹ صاحب کے نام سے بیبیط تنگی کہلاتی ہے - دوسری تنگی سر رابرٹ سنڈیمن کے نام سے سنیڈمن تنگی کہلاتی ہے - لیکن سب تنگیوں سے خوشنما فرن تنگی ہے - اوس کے اختتام پر ایک مقام نہایت خوشنما آتا ہے جہاں فرن یعنی پرسیاوشان کی کثرت ہے - اس سبزہ کے لحاظ سے یہ حصہ اس نام سے نامزد کیا گیا ہے -

زیارت ایک پہاڑی اسٹیشن مانند ایک چھوٹی سی چھاونی کے ہے - جہاں ایک ڈاک بنگلہ اور دو تین دوکانیں ہیں اور باقی عمارات کلارکوں کے رہنے کی مختصر سی

اور خام بنی ہوئی ہیں - البتہ ایجنٹ صاحب کی کوٹھی نہایت نفیس ہے - دوستوں نے کہا کہ چلو فزن تنگی کی سیر کریں - چنانچہ ہم روانہ ہوئے - چار میل سڑک سرکاری کی مسافت گاڑی پر طے ہوئی بعد ازاں ایک ہیبت ناک غار نظر آیا - جسکے دونوں جانب نہایت بلند پہاڑ تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی شخص نے پہاڑ کو چیر کر اوسمیں سے راستہ بنایا ہے اگر ہم جن بھوت کے ماننے والے ہوتے تو یہ یقین کرتے کہ جنّات کا کام ہے - اوسمیں داخل ہوئے تو ہر وقت خوف اس امر کا کہ کہیں کوئی بڑا پتھر سر پر نہ آن پڑے - راستہ ایسا خراب کہ بہت مشکل سے چل سکیں - اتنے بڑے بڑے پتھر راستہ میں حائل کہ اونکے اوپر سے چڑھکر آگے چلنا دشوار تھا - بعض مقاموں پر پتھر ماہی پشت اس طرح سے واقع کہ ان پر کہیں جگہہ نہ تھی کہ پاؤں کو سہارا مل سکے - وہاں حکومت نے عارضی سیڑھیاں لگادی ہیں اور اوپر چھوٹے چھوٹے پتھر بچھا دیئے ہیں - اُفتاں و خیزاں بصد دقت راستہ طے ہوا - لیکن جب اس تنگی کے آخیر حصے پر پھونچے - تو سب تکلیفیں بھول گئے - خطرناک و دشوار گذار خشک بے آب و برگ راستہ کی سب مشکلیں گویا کبھی اُٹھائی ہی نہ تھیں - ایک نظارہ ایسا نظر آیا کہ آنکھیں کھُل گئیں - کیا دیکھا کہ پہاڑ کے دور و یہ بلندی تک ایسے سبز مخمل نما فزن جمے ہوئے ہیں کہ گویا زمرد کا فرش بچھا ہوا ہے - مجھے خیال آیا کہ جس شخص نے پہلے مخمل بنائی ہوگی اوسنے ایسے ہی کسی مقام سے یہ خیال لیا ہوگا - بعض چٹانوں میں بڑے بڑے طاق اور طاقچے بنے ہوئے اور انمیں کاہی اُگی ہوئی جیسے کسی نے مصنوعی بنا کر گوند سے چپکائی ہو - اور جس مقام پر دونوں طرف کی بلند پہاڑ ملے وہاں ایک قدرتی حوض برف سے سوا سرد پانی کا تھا - اسے اس فردوس دنیا کا حوض کوثر کہئے تو بجا ہے یہ کیفیت معمولی بات سے بہت اور مقاموں پر بھی دیکھنے میں آئی ہے - لیکن

بالخصوص جس کیفیت سے ہمارے دل کھینچے وہ آبشار کا گرنا تھا۔ اکثر آبشاروں سے پانی تقاطر کے طریق سے نکلتا ہے۔ یا بعض اوقات چادر آب کی طرح سے اوپر سے نیچے گرتا ہے۔ لیکن یہاں کیفیت یہ تھی کہ پانی گویا چھلنی سے نکلتا ہے جیسے کسی سوراخ سے دہار نکلتی ہو اور لگاتار نکلتی رہے۔ دور سے ایک سہرا معلوم ہوتا تھا۔ اور اگر مشابہت مبالغہ آمیز نہ سمجھی جاوے تو اوسکو پانی کی چلمن تصور کرنا چاہیئے۔

علاوہ برین نرالی بات یہ تھی یہ آب رواں کی تیلیاں حوض میں گرتی ہوئیں ایک موسیقی آواز پیدا کرتی تھیں۔ جو بوجہ گونج کے دوبالا ہوجاتی تھی۔ کسی کسی مقام سے پانی کی بوندیں ٹپکتی تھیں اوسکی کیفیت بجنسہ مثل موتیوں کی بارش کے معلوم ہوتی تھی۔ مقامی احباب بیان کرتے تھے کہ یہ کیفیت ہر موسم میں یکساں رہتی ہے نہ کمی ہوتی ہے نہ زیادتی۔ غالبًا یہ بات صحیح ہوگی کیونکہ اون اطراف میں برساتی بارش نہیں ہوتی۔ البتہ برف سرما میں پڑتی ہے قیاس یہ ہے کہ اس پانی کا منبع کسی برفستانی مقام پر یکساں رہتا ہے۔

اُس حوض کے کناروں پر پانی کی تہ کا رنگ کاسنی نظر آتا ہے جو بوجہ کسی نباتات کے معلوم ہوتا تھا۔ شائد فولاد کے کیمیاوی مرکب کی وجہ سے ہو جو وہاں اکثر مقامات پر پایا گیا۔ پانی حوض کا شیریں اور خنک اور ہمیں اوسوقت آبحیات معلوم ہوتا تھا۔ چند گھنٹے ہم لوگ نیچر کے اس عجیب منظر کے قریب بیٹھے رہے آخر شام کے قریب ہم نے اس چشمۂ کوثر کو الوداع کہا۔ اور پھر اُسی دشوار گذار راستہ سے اپنے استھان پر پہونچے۔

شمیم

طبیعی مذہب

لفظ "انسان" کا اطلاق جیسا کہ عموماً کیا جاتا ہے اُس مرکب پر ہے جو جسم اور روح دو اجزا کا مجموعہ ہے۔ اگر ہم اِن دونوں میں سے کسی ایک کو علیحدہ علیحدہ اِس نام سے تعبیر کریں تو وہ صحیح نہیں ہوتا۔ موت کے بعد جب یہ دونوں اجزا جدا ہوتے ہیں تو ہم اول الذکر کی نسبت جب کبھی کچھ کہنا چاہتے ہیں تو اوسکو اِس جملہ سے ظاہر کرتے ہیں کہ "یہ فلاں انسان کا جسم ہے" اور دوسرا جزو جس کا وجود زیادہ تر ذہنی ہے "فلاں انسان کی روح کہلاتا ہے" بہرحال انسان مراد جسم اور روح دونوں کے مرکب سے ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اِن دونوں میں سے انسانیت میں کس کا حصہ زیادہ ہے۔ بلکہ ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ دونوں اجزا اِس نسبت سے مشترک ہیں کہ کسی ایک کی ذرا سی کمی ہمیں انسانیت سے گرا دیتی ہے۔

پس ایک کامل انسان کے معنی وہ ذات ہوگی جس میں یہ دونوں اجزا جسم اور روح پوری حالت صحت میں ہوں۔ اور ایسی حالتِ صحت کا حصول انسانی زندگی کا مقصد ہونا چاہئے۔ سالہا سال سے ہمنے یہ ایک مسلمہ اصول اپنی زندگی کا قرار دے رکھا ہے کہ۔ روحانی صحت کو جسمانی صحت پر نہ صرف مقدم سمجھتے ہیں۔ بلکہ اول الذکر کے حصول میں دوسرے کو قربان کر دینا قابلِ فخر خیال کرتے ہیں اور برخلاف اِسکے وہ شخص جو جسمانی صحت میں کامیاب ہوتا ہے حقارت اور ذلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ شب بیدار عابد جس نے اپنے آپ کو تمام دنیاوی لذایذ سے محروم کر رکھا ہے۔ جسکا جسم نہایت کمزور جس کے اعضا مضمحل اور جسکا چہرہ زرد ہے۔ نہایت عظمت اور توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ صرف

اس لئے کہ روحانی صحت کے حصول کے لئے اُسنے تمام جسمانی ضروریات سے غفلت اختیار کر رکھی ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں ہم نہایت فخر یہ یوں کہیں گے کہ "وہ اُسنے اپنے نفس کو مٹا دیا ہے" گویا جسمانی صحت منافی ہے روحانی صحت کی۔ اور موخرالذکر کا حصول پہلی کی قربانی ہے۔

برخلاف اسکے وہ پہلوان جو اپنی جسمانی صحت کی فکر میں رہتا ہے۔ نہایت حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ سکولوں اور کالجوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ طالبعلم جسنے کوئی امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کرنیکے لئے اپنی جسمانی صحت برباد کر دی ہے۔ جسکی آنکھیں کمزور جس کے چہرہ کی ہڈیاں نمودار اور جسکو بدہضمی کی شکایت ہمیشہ رہتی ہے۔ نہایت وقعت اور عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے صرف اس لئے کہ اُسنے اپنی جسمانی صحت کو اپنی دماغی ترقی پر (دماغی اور اخلاقی ترقی بھی روحانی صحت میں شامل ہیں) قربان کر دیا ہے۔ برخلاف اسکے وہ لڑکا جسنے جمناسٹک میں ترقی کی ہے یا جو فٹ بال اور کرکٹ کا نہایت عمدہ کھیلنے والا ہے کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔

غرض دنیا کا رجحان جس قدر روحانیت کی طرف ہے اسی قدر جسمانیت (مادیت) سے استغنا اور بے پروائی برتی جاتی ہے۔ قرنہا قرن سے یہ خیال سوسائٹی میں سرایت کر گیا ہے کہ مادیت سے نفرت اور روحانیت سے الفت برتی جاوے۔ اگر ہم انصاف اور غور سے دیکھیں تو ہمیں صاف معلوم ہو جائیگا کہ یہ خیال صحیح نہیں۔ نہ صرف اس لئے کہ ہمیں اپنے قرار داد مقصد زندگی کے مطابق جسم اور روح دونوں کی صحت مد نظر رکھنی چاہیئے۔ بلکہ زیادہ تر اسلئے کہ ایک کی صحت دوسرے سے اسقدر مضبوطی سے وابستہ ہے کہ ہم ایک کی صحت کو دوسرے کی صحت کے لئے لازمی دیکھیں گے۔ تا وقتیکہ جسمانی ضروریات

کو واجبی طور پر پورا کرکے جسمانی صحت کو قائم نہ رکھا جائے۔ یہ بات ناممکن ہے کہ ہماری روحانی صحت اچھی رہ سکے۔ وہ طالب علم جو اپنی جسمانی صحت سے غافل ہے بہت جلد دیکھیگا کہ اُسکا دماغ نکما ہوجائے گا۔ اور اسکی دماغی ترقی رُک جائیگی۔

ہم سب کا یہ مقدم فرض ہے کہ ہم جسمانی صحت کو دماغی صحت اور ترقی سے کمتر نہ جانیں۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جسقدر گناہ کے مرتکب ہم کسی روحانی اصول کے توڑنے سے ہوتے ہیں۔ اسیقدر گنہگار ہم جسمانی اصول کے توڑنے سے نہوں۔ طبیعی مذہب کا یہ سب سے پہلا اصول ہے کہ "جسم اسیقدر قابل وقعت ہے جسقدر روح۔ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا قدرت کی سچائی کو مٹانا ہے۔ اور ایک کو دوسرے پر غیر معمولی فوقیت دیکر ان کے تناسب کو زائل کرنا بجز گناہ ہے"۔ اگر کوئی شخص جسمانی صحت کی پروا نہیں کرتا تو وہ یقیناً ایسا ہی گنہگار ہے جیسا وہ شخص جسنے اپنی دماغی قویٰ کو غفلت کے سبب زنگ لگا دیا ہے۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ قوی الجسم شخص نہایت عمدہ اخلاق کا منبع ہوتا ہے جس آدمی کے بدن میں طاقت ہوتی ہے اسکی قوت ارادی مضبوط۔ اور اسکا عزم مستقل ہوتا ہے۔ غم و غصہ کو ضبط کرنے کی قابلیت اور مزاج میں تحمل نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ہمت ہوتی ہے۔ اور جو کام کرتا ہے حوصلہ کے ساتھ کرتا ہے۔ اکثر وہ رحمدل ہوتا ہے اور ہمدردی کا ثبوت عملی طور پر دیتا ہے۔ برخلاف اسکے اگر ہم کسی نحیف آدمی کی طرف نظر ڈالیں تو ہم ان تمام عمدہ اخلاقی اوصاف کی نفی پائیں گے۔ بلکہ ایسی خلاقی برائیاں دیکھی جائینگی جو اسکو انسانیت سے گرا دینگی۔ اور بلاشبہ یہ برائیاں اسکے جسمانی کمزوری سے پیدا ہوئی ہیں۔ پس اگر کسی مذہبی تعلیم کا مقصد عمدہ اخلاق پیدا کرنا ہے تو یہ لازمی

سے ہے کہ عمدہ صحتِ جسمانی کی طرف سب سے پہلے توجہ کیجائے۔ کیونکہ عمدہ اخلاق اور جسمانی صحت ایکدوسرے سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور جسمانی خوبصورتی کا پیدا کرنا یقیناً ایسا ہی نیک مقصد ہے جیسا حُسنِ اخلاق کا حاصل کرنا۔

جس قدر اموات قبل از وقت واقعہ ہوتے ہیں۔ وہ طبعی مذہب سے مطابق ہمارے اُن گناہوں کا نتیجہ ہیں جو جسمانی صحت کے اصولوں کے خلاف ہم سے سرزد ہوتے ہیں۔ اور کسی شخص کا طبعی عمر کو نہ پہنچنا یقیناً اُسکے اُس غفلت کی جو جسمانی قسمت سے اُسنے برتی ہے کافی سزا ہے۔ اگر اس نظر سے ہم دیکھیں تو طبیعی مذہب کے مطابق وہ تمام لوگ جو قبل از وقت مرتے ہیں نیچر کے گنہگار ہوتے ہیں۔ اور وہ شخص جو خودکشی کا مرتکب ہوا ہے طبیعی مذہب میں سے بڑا مجرم سمجھا جاتا ہے۔ اور نہایت قابلِ نفریں خیال کیا جاتا ہے۔ اسکا سبب یہ ہے کہ ہم "انسان کی صحیح زندگی" کا مفہوم نہیں سمجھتے۔ اور اپنے زندگی کے مطلق قدر و عظمت نہیں جانتے۔ بلکہ خودکشی کی حالتوں میں اسکو ایک مصیبت اور وبال سمجھتے ہیں۔ سوا اسکے بعض مذاہب کے بعض فرقوں میں دنیاوی زندگی کی اسدرجہ تحقیر کی گئی ہے کہ موت حصول مرام کا زینہ سمجھی جاتی ہے۔ اور ایسا اعتقاد رکھنے والا ہر شخص موجودہ زندگی کو نہایت بدمزگی سے بسر کرتا ہے اور ہر وقت موت کو یاد کرتا ہے۔ جو خیال بلاشبہ ہماری تمام حرکات کا روکنے والا ہے۔ اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کی قوتِ فعلی بالکل معطل ہو جاتی ہے۔ انکی زندگی نہ صرف اِن پر دوبھر بلکہ دوسروں پر ایک بار ہوتی ہے۔

دنیا اور دنیا کی جائز لذائذ کو نظرِ حقارت سے دیکھنا اور اُنسے پرہیز کرنا یقیناً کفرانِ نعمت ہے۔ اور وہ شخص جو خدائی نعمتوں سے احتراز کرتا ہے اور اِن کی مذمت کرتا ہے بلاشبہ حقیقی نیکی سے بہت دور ہے۔

طبیعی مذہب ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ہم اپنے جسم کی قدر کریں۔ ایک حصہ جسم کو

یکساں قدر کی نگاہ سے دیکھیں۔

اس مذہب میں [illegible] غفلت کرنا یا اسکو چھپانا جرم ہے۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض امراض [illegible] پوشیدہ رکھا جاتا ہے اور اس پوشیدہ رکھنے کا نام شرم وحیا رکھا گیا ہے۔ یقیناً بہت زیادہ نقصان انسانی سوسائٹی کو ایسی جھوٹی شرم سے پہنچتا ہے اور اگر یہ جھوٹی شرم ہماری سوسائٹی سے دور ہوجاوے۔ تو بہت سے ایسے امراض اور برائیاں ناپید ہوجائیں جنہوں نے انسانی سوسائٹی کے بیج کو گھن لگا رکھا ہے۔

اس جھوٹی شرم کے دور کرنیکا صرف ایک ذریعہ یہ ہے کہ "علم تشریح" کی تعلیم عام کردی جاوے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ علم تشریح کی تعلیم کی صرف اس شخص کو ضرورت ہے جو پیشہ طبابت اختیار کرے۔ لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوجائیگا۔ کہ ہمارے تعلیمی کورس میں بہت سے ایسے مضامین شامل ہیں جنکے مقابلہ میں علم تشریح نہایت ہی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ایک گریجوئٹ فرانس کی تواریخ سے خوب واقف ہوتا ہے۔ اور نہایت قابلیت سے اُن انقلابات کو جو اس ملک کے طرزِ حکومت میں ہوتے رہے ہیں بیان کرسکتا ہے اور جمہوری اور شخصی سلطنتوں کے فوائد ونقائص پر نہایت گہری نظر ڈال سکتا ہے۔ مگر جب کبھی اُسکے پیٹ یا سینہ میں ذراسا درد ہوتا ہے تو اُسے اپنی جہالت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ہمارا اس سے یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص حکیم یا ڈاکٹر بن جاوے۔ مگر علم تشریح سے اسقدر واقفیت ضرور پیدا کرے۔ جو اسکی صحت جسمانی کی نگہداشت کے لئے ضروری ہو۔ علم تشریح بلاشبہ طبیعی مذہب میں وہی درجہ رکھتا ہے جو "علم اخلاق" روحانی مذہب میں۔ اور جس طرح اخلاق پیدا کرنے کے لئے جیسا اُسکا جاننا ضروری ہے بالکل ویسے ہی حسنِ صورت پیدا کرنے کے لئے علم تشریح کا جاننا ضروری ہے

پس طبیعی مذہب کے اصولوں کی صحیح پابندی کے لئے علم تشریح کی تعلیم ضروری ہے ۔ بلاشبہ موجودہ طریقۂ تعلیم میں کسی قسم کی ترمیم کرانا ایک دشوار امر ہے ۔ مگر یقیناً ایک وقت ایسا ضرور آنیوالا ہے کہ علم تشریح کو وہ رتبہ دیا جائیگا ۔ اور اسکی اہمیت کو تسلیم کیا جائیگا جسکا وہ قدرتاً مستحق ہے ۔

لطیف احمد (از پانی پت)

غزل شبلی

صوفی آن سرِ حقیقت کہ ہویدا میکرد — ہر حدیثے کہ بما کرد ہم از ما میکرد

پیکر آرائے ازل خلعت زیبائے ترا — نقش می بست وہم از ذوق تماشا میکرد

بہ مسیحا نفسی آں لب اعجاز نمائے — مردہ را زندہ ہمی کرد و بدعوی میکرد

پیچ و تابے کہ دل غمزدہ در پنہاں داشت — شکن طرۂ گیسوئے تو پیدا میکرد

دوش رفتیم و بدیدیم کہ طوطی بہ چمن — داستانہا ز لبِ لعل شکرخا میکرد

آں گرہ ہا ہمہ در کارِ حریفاں انداخت — کہ زِ پیچاکِ سرِ طرۂ خود وا میکرد

مایۂ برہمیِ ہر دو جہاں گشت آخر — فتنہ ہائے کہ قد و زلف تو برپا میکرد

ساقیِ مصطبۂ عشق ہر آں نکتہ کہ گفت — از رہ گوش ہمی رفت و بدل جا میکرد

برگذر گاہِ چمن عطر فروشِ سحری — بوئے زلف تو بہ کف داشت کہ سودا میکرد

ساقی آں می بہ قدح ریخت کہ از فرِ خروش — ہر نفس دام ہمی کرد و بہ مینا میکرد

فلسفی سرِ حقیقت نتوانست کشاد — گشت رازِ دگر آن راز کہ افشا میکرد

شبلی از قامتِ زیبائے تو میکرد سخن
یا تو گوئی سخن از عالمِ بالا میکرد

شیوجی کے مندر

اگرچہ ہندو لوگ شیوجی کو تین صفات کا مجموعہ خیال کرتے ہیں - یعنے ست۔ رج - تم - (پیدائش - پرورش - فنا) کا مظہر شیو کی ذات کو سمجھتے ہیں - اور اسی لئے شیو کے پوجنے والے اپنی پیشانی پر صندل کی تین لنبی لکیروں کا تلک لگاتے ہیں۔ لیکن عموماً ان تینوں صفتوں کی علیحدہ علیحدہ پرستش ہوتی ہے - اور ہر صفت کے جداگانہ مندر بنائے جاتے ہیں۔ خاصکر وشنو جسکا پرورش وحفاظت وتدبیر سے تعلق ہے اسپنے دس اوتاروں کے سبب بہت زیادہ ہر دل عزیز ہے۔

سری رامچندر جی اور سری کرشن جی وشنو کے نہایت مشہور اوتار گذرے ہیں۔ لوگوں میں ان کی ماننا اس کثرت سے ہے کہ شاید اتنی برہما مہیش وغیرہ سب مجموعہ صفات کو بھی حاصل نہیں۔

اسی حافظ وناصر وشنو کا آخری ظہور شنبل نگری (عرب) میں مکہ کے مشہور برہمن خاندان میں کرشن جی کی پیشین گوئی کے موافق ہوا۔

وشنو یس پتا (حضرت عبداللہ) اور اشتی ماتا (حضرت آمنہ) کے گھر میں وہ جوت چمکی جس کے دیدار کے لئے آسمان زمین کے دیوتا منتظر تھے۔

جسطرح سری رام چندر جی نے راون کو اور سری کرشن جی نے کنس کو مار کر دنیا کو ظلم کے پاپ سے نجات دی۔ سری محمدؐ جی نے ابوجہل کو فنا کیا۔ اور خدائی علم کے اسرار تمام عالم کو سنائے۔

ہم یہاں شیوجی کے ان مندروں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو کہیں تو تمام اوصاف

کا مجموعہ خیال کئے جاتے ہیں اور کمیں صرف صفت واحد کا۔ لیکن جب صفت واحد کا۔ لیکن جب صفت واحد سے کوئی مندر نامزد ہوتا ہے تو عموماً اسمیں وشنو کی صفت۔ پرورش۔ حفاظت۔ و تدبیر وغیرہ کا ضرور یقین ہوتا ہے۔

غالباً شیو کا سب سے پرانا مندر ست بندرامیشور ہے۔ جو سیلون کے قریب ہے۔ جس زمانہ میں سری رام چندر جی نے راون کے ملک لنکا پر چڑھائی کی اور دریا کا ست بند پل باندھا تو حملہ سے پہلے شیوجی کے مندر میں خدا کی عبادت اور فتح کی دعا مانگی۔

اس دن سے اس مندر کا نام رامیشور ہوگیا۔ اور لاکھوں آدمی اسکی زیارت کو اس خیال سے جاتے ہیں کہ شب جی کا مندر ہے۔ اور لاکھوں کو یہ کشش بھی لیجاتی ہے کہ وشنو کے بہت بڑے اوتار نے وہاں عبادت کی تھی۔ کاشی بنارس جو تمام ہندوستان میں ہندوں کی نہایت قدیم درگاہ ہے۔ اس مندر کو بشیشر ناتھ کہا جاتا ہے۔ جسکے اصل معنی مالک الدنیا سمجھنے چاہئیں۔ شیو کا تیسرا مندر پشوپتی ناتھ نامی نیپال میں ہے۔ پشو کے معنی جانوروں کے ہیں۔ یعنی جانوروں کا محافظ۔ ایسا ہی کوہ منصوری کے قریب کدارناتھ ہے جو شیوجی کا مندر ہے۔ اور پہاڑ پر ہونے کے سبب کدارناتھ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سومناتھ بھی جسکا مجمل ذکر نومبر کے مخزن میں ناظرین نے پڑھا ہوگا شیوجی کا مندر تھا۔ ہم نہیں جان سکتے کہ سومناتھ کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سوم چاند کو کہتے ہیں اور چونکہ یہ مندر چاند سے منسوب تھا اسلئے سومناتھ نام رکھا گیا[۵]۔ اور بعض کچھ اور وجوہات بیان کرتے ہیں۔ بہرحال یہ امر مسلم ہے کہ سومناتھ جی

---

[۵] فرشتہ کہتا ہے کہ چاند گرہن اور سورج گرہن کے موقع پر سومنات کے مندر میں دو تین لاکھ جاتری جمع ہو جاتے تھے اس سے ایک گونہ اس بیان کو تقویت ہوتی ہے کہ سومناتھ کا تعلق چاند سے تھا۔

شیوجی کا مندر تھا۔

شیوجی کے بعض مندروں میں صرف پتھر کا ایک گول ٹکڑا رکھا ہوتا ہے اور دروازہ پر شب جی کی سواری کا بیل بنا ہوتا ہے۔ چنانچہ کاشی بنارس میں ہمنے جسقدر مندروں کو دیکھا عموماً سب میں یہی تھا۔ لیکن سومناتھ میں مورت کا ہونا تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ ابتدا میں سونے کی مورت تھی جسکو سلطان محمود غزنوی نے شکستہ کردیا تھا۔ اسکے بعد کسی ایسے سفید پتھر کی بنائی گئی جو ہاتھی دانت کے ہمشکل تھا۔ چنانچہ شیخ سعدی نے جن ایام میں اس مندر کو دیکھا تھا تو وہ بوستاں میں لکھتے ہیں کہ ہاتھی دانت کی مورت تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آخر زمانہ میں دکن۔ گجرات۔ سندہ کاٹھیاواڑ وغیرہ میں سومناتھ کی عالمگیر عقیدت تھی۔ اور باوجودیکہ کرشن جی کا آخری مقام دوارکا جی سومناتھ کے نہایت قریب تھا مگر لوگوں میں زیادہ اثر سومناتھ[۵۱] کا تھا۔ جس کی وجہ سے سومنات میں کروروں روپیہ کی حشمت جمع ہوگئی تھی[۵۲]۔

ہمکو مدت سے ہندوں کے مشہور مذہبی مقامات دیکھنے کا شوق تھا۔ متھرا۔ گوکل۔ بندرابن۔ اجودھیا۔ کاشی۔ گیا۔ وغیرہ پہلے دیکھ چکے تھے۔ بمبئی جاکر سومناتھ کی دید کا شوق پیدا ہوا اسلئے جہاز کے راستہ سے سومناتھ دیکھنے روانہ ہوئے سومناتھ تک ریل کا راستہ بھی ہے۔ جو جوناگڈھ کاٹھیاواڑ سے بلاول بندر (وراول) پر گیا ہے۔ بلاول کاٹھیاواڑ میں نہایت عمدہ اور پولیٹکل اعتبار سے بہت باموقع بندر ہے۔ ابتک ریاست جوناگڈھ کے قبضہ میں تھا مگر سنا جاتا ہے کہ اپنی کارآمد

---

[۵۱] فرشتہ کے قول کے موافق سومنات بھی کرشن جی کے عہد میں بنایا گیا تھا۔

[۵۲] دو ہزار گانوں اخراجات کے لئے وقف تھے۔ دو ہزار برہمن پوجاری تھے۔ جواہرات اور طلائی اشیاء لاتعداد تھیں۔ بت کے اشنان کے لئے روزانہ گنگا جل لایا جاتا تھا۔ جسکا فاصلہ چھ سو کوس تھا۔ علاوہ مفرور جاگیر کے لاکھوں روپیہ چڑھاوے کا آتا تھا۔

پوزیشن کے سبب انگریزی تحت میں جانے والا ہے۔ ہمارا جہاز دن کو بارہ بجے بمبئی سے چلکر دوسرے دن کے دس بجے بلاول بندر پر لنگر انداز ہوا کشتی میں سوار ہوکر خشکی پر گئے۔ سمندر طوفانی تھا اور ہماری پرانے زمانہ کی کشتی ساحل کے قریب چکراتی پھرتی تھی۔ اسوقت سومنات کے کھنڈر دور سے نظر آتے تھے اور دل پر عجیب قسم کے خیالات کا ہجوم تھا۔

بلاول سے پٹن جہاں مندر ہے صرف ۴ میل شمال میں واقع ہے۔ پٹن تک پختہ سڑک ہے بلاول میں بگیاں کرایہ کو ملجاتی ہیں چنانچہ ہمنے بھی ایک بگھی لے لی اور پٹن پر حملہ کردیا۔ ہمارا گاڑیبان ایک جاہل مسلمان تھا۔ مگر جگہ کی تاثیر سے نہایت جوشیلا تھا۔ قدم قدم پر ایسی باتیں کرتا تھا گویا محمودی لشکر کا ایک جوشیلا سپاہی ہے۔

تھوڑی دور چلکر شرق میں ایک مندر ملتا ہے۔ جو شیو جی کا ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ اسکی چھت پر ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے۔ پجاری نے بیان کیا کہ یہ مندر کئی بار بنا اور گر پڑا آخر ایک نجومی نے بتایا کہ اس صورت کی عمارت اسکی چھت پر بنائی جائے تو عمارت قائم رہے گی۔ چنانچہ جب یہ عمارت بنائی گئی تو مندر قائم رہا۔ اسکے مقابلہ میں ہمارے گاڑیبان نے کہا کہ وہ نجومی ایک مسلمان درویش تھے ان کی کرامت سے مندر گر پڑتا تھا۔ لیکن جب مسجد بن گئی تو مندر قائم رہا۔

یہ دیکھکر آگے بڑھے تو ایک بڑی خانقاہ ملی جسمیں کچھ نئی عمارتیں ہیں اور کچھ پرانی۔ عالیشان اور آراستہ مقبرہ میں کسی بزرگ کا مزار ہے روضہ کی طرز بالکل مندروں کی سی ہے۔ لوح مزار بھی ہے مگر ترکی رسم الخط کے سبب صاف نہ پڑھی گئی۔ صرف ابوالحسن محمد علی العراقی غرہ ربیع الآخر ۶۹۷ھ پڑھا جا سکا۔

مجاوروں نے کہا کہ خواجہ ابوالحسن خرقانی کا مزار ہے۔ مگر اسکا یہ بیان قابل یقین نہیں۔ حضرت خرقانی یہاں کہاں[۵۱]۔

اس خانقاہ کے متصل ایک اور چھوٹا سا مقبرہ ہے جو بالکل مندر کی طرز پر بنایا گیا ہے اور نہایت خوبصورت ہے۔ اسمیں مائی پڑی نامی کسی تیلن کی قبر ہے۔ کہتے ہیں ہندوؤں نے اسکے جوان لڑکے کو سومنات پر قربانی چڑھائی تھی۔ غریب بڑھیا روتی ہوئی حضرت شاہ صاحب کے پاس آئی۔ شاہ صاحب نے ایک خط بادشاہ کو لکھا اور سومنات پر حملہ کرنے کے لئے بلایا۔ یہ خط بڑھیا لے کر گئی اور بادشاہ کو لیکر آئی۔ پھر ہوا جو ہوا[۵۲]۔

اس روایت کو معتبر مانا جائے تو بادشاہ غالباً علاءالدین خلجی ہوگا۔ کیونکہ اس نے ۶۹۷ھ میں سومنات پر حملہ کیا تھا۔ اور یہی ۶۹۷ھ شاہ صاحب کے مزار پر کندہ ہیں۔

---

۵۱ حضرت خواجہ ابوالحسن خرقانی کو سلطان محمود غزنوی نے بلایا تھا مگر آپ تشریف نہ لیگئے۔ تو سلطان خود خرقان حاضر ہوا۔ حضرت نے اپنا خرقہ سلطان کو عطا فرمایا۔ چنانچہ معرکہ سومناتھ کے چوتھے روز جب ہندوؤں کا پلہ بھاری ہوگیا اور مسلمان سخت خطرہ میں پڑ گئے تو سلطان نے اس خرقہ کو سامنے رکھکر خدا سے دعا مانگی اور اسی وقت فتح پائی۔
غالباً اس دعا کے مقام پر کسی بزرگ نے مقبول جگہ سمجھکر اپنی خانقاہ بنالی اور حضرت خرقانی کے نام زد اسکا چرچا ہوگیا۔

۵۲ یہ وجہ شاید بعد کے حملوں کی ہوگی۔ محمود کے حملہ کی وجہ فرشتہ نے یہ لکھی ہے کہ جب سلطان نے ہندوستان کے بعض بت خانوں کو توڑا تو ہندوؤں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ چونکہ سومنات ان بتوں سے ناراض تھا اسلئے انکے توڑنے سے محمود کا کچھ نقصان نہوا۔ ورنہ اسمیں وہ طاقت ہے کہ محمود کو آن کی آن میں فنا کر سکتا ہے۔ نیز یہ بھی مشہور تھا کہ سمندر کا مد و جزر سومنات کے قدم چومنے کے لئے ہوتا ہے اور سومنات ہی اپنی مرضی کے موافق اجسام کو روحیں تقسیم کرتا ہے۔

مالی پڑی کے فرار سے آگے بڑھکر شہدا کا قبرستان شروع ہوتا ہے۔ جو کم از کم دو میل رقبے میں ہوگا[۵۱]۔ قبریں سب سنگین ہیں۔ پانچ پتھروں سے بنائی گئی ہیں۔ انہی قبروں میں گھوڑوں کی قبریں ہیں جو میدان میں کام آئے تھے۔ گھوڑوں کی قبروں پر پتھر کے چہرے بنائے گئے ہیں۔ گورستان شہدا میں ایک چار دیواری پر جھنڈا نصب ہے دریافت سے معلوم ہوا کہ جعفر مظفر کی درگاہ ہے۔ جنکے نام پر سومنات کے بیرونی میدان کی فتح ہوئی تھی۔ اس حاطہ میں دو قبریں ہیں اور پہلو کی دیوار میں کتبہ لگا ہوا ہے۔ کتبہ صاف پڑھا نہیں گیا۔ لیکن جعفر مظفر کا نام اور ان کی شجاعت اور جہاد کا ذکر سمجھ میں آتا ہے۔

اب لوگ ان قبروں سے مرادیں مانگتے ہیں اور فتح و کشایش کی برکت حاصل کرنے یہاں آتے ہیں۔ خاصکر ہندوں کو ان مزاروں سے بہت عقیدت ہے اور وہ یہاں آکر ناریل چڑھاتے ہیں۔

یہ سب عبرت خیز گنج شہدا دیکھتے ہوئے پٹن کے دروازہ پر پہنچے۔ بہت مستحکم اور عالیشان دروازہ ہے۔ دروازہ کے جنوب میں سید ادریس نامی کسی بزرگ کی درگاہ ہے۔ اور عین پھاٹک کے نیچے دس بارہ قبریں ہیں کہا گیا یہ وہ لوگ ہیں جو سب سے پہلے قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے اور اسلامی علم بلند کر کے تکبیر کہی مگر برہمنوں کی نوکوں سے چھد کر نیچے آن پڑے۔ فتح کے بعد سلطان نے ان بہادروں کی قبریں فصیل کی جڑ میں بنا دیں۔

انہیں خاص سرداروں کی قبریں زرد پتھر کی ہیں۔ فصیل میں دو کتبے زرد پتھر

---

۵۱ صرف محمود کے حملے میں دو تین ہزار مسلمان اور پچاس ہزار ہندو کام آئے تھے۔ اس کے بعد علاء الدین خلجی اور مظفر خان گجراتی کے ۶۹۷ھ اور ۸۰۰ھ اور ۸۰۴ھ میں متواتر حملے ہوئے اور سخت خونریزیاں ہوئیں۔

پر لگے ہوئے ہیں۔ ایک عربی میں ہے اور دوسرا سنسکرت میں۔ عربی کتبہ میں فتح کے کارنامے اور شہیدوں کے نام کندہ ہیں۔ لیکن پوری عبارت سمجھ میں نہیں آتی۔

اس پھاٹک میں داخل ہونے کے بعد دوسرا پھاٹک اور آتا ہے۔ اسپر بھی زرد پتھر کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ اور اسمیں علاءالدین خلجی کا فتح نامہ مفصل کندہ ہے اس پھاٹک کے اندر داخل ہوئے تو جنوبی دیواریں دو سیاہ پتھروں پر سنسکرت کے بڑے بڑے کتبے لگے ہوئے نظر آئے۔ یہاں ہندو آخری بار جان توڑکر ایسی خونریز لڑائی لڑے کہ قریب قریب سبکا خاتمہ ہوگیا۔ لوگوں نے بیان کیا کہ بادشاہ نے سنسکرت زبان میں اس موقع پر یہ دو کتبے لگا دیئے۔

ایک میں مسلمانوں کے کارنامے اور دوسرے میں ہندوں کی دلیری کے افسانے ہیں۔

یہ دیکھکر آگے بڑھے اور ایسی تنگ گلیاں اور بازار نظر آئے جیسے ہندوں کے اکثر پرانے شہروں میں ہوتے ہیں۔ تمام بازار اور پٹن کی آبادی طے کرکے جدید سومنات پر پہنچے۔ یہ راجہ بڑودہ نے بنا دیا ہے شیوجی کا بیل اور پنڈی رکھی ہے۔ بہت معمولی اور بھدّا مندر ہے۔

اس سے آگے وہ قدیمی تاریخی مندر ملا جسکی سیر کی آرزو برسوں سے تھی۔ ایک بڑے احاطہ کا آہنی دروازہ کھول کر ہماری بگی اندر داخل ہوئی۔ دیکھا کہ ایک عجیب چاپ کھنڈر کے دروازے پر دو کالے کوتے چونچیں آمنے سامنے کئے بیٹھے ہیں اور دہیمی آواز میں کچھ بول رہے ہیں۔ یہ سماں دیکھکر جی بھر آیا۔ دروازہ کے سامنے گھوڑوں۔ شیروں۔ بیلوں اور چند عجیب صورت جانوروں کے بت ٹوٹے پڑے ہیں۔

دروازے کے شروع میں دو رخی صحنچیاں ہونگی مگر اب صرف ٹوٹے پھوٹے

آثار باقی ہیں۔ دروازہ پونے چار قدم چوڑا ہے۔ وسط میں ہشت پہل چوک ہے۔ اور ہر پہل پر چھ چھ ستون ہیں۔ چوک کے اوپر برج ہوگا مگر اب کھلا ہوا ہے۔ بالائی حصہ میں اور ستونوں پر نہایت نفیس کام کیا ہوا ہے۔ اور شکستہ بت بھی نظر آتے ہیں۔ بیچ میں ڈہائی گز مدور ایک پتھر رکھا ہے جو اہرام مصری کی طرز پر پانچ سیڑھی کا ہے اس پتھر پر بہت اچھی گلکاری[۵۱] ہے۔ بڑے چوک کو ختم کر کے دوسرا چھوٹا چوک آتا ہے جسمیں چمکدار سنگ سیاہ کا فرش ہے۔ یہ چوک طے ہوا تو سیاہ بغیئی سیڑھی آئی۔ غالباً یہ سیڑھی وہ ہوگی جہاں پہلی بار بت کے سامنے سر جھکایا جاتا تھا۔ اس اس سیڑھی کے بعد دو سفید زینے چڑھکر مورت کے اصلی استھان میں داخل ہوئے یہ حجرہ آٹھ قدم مربع ہے۔ ابتدائی حصہ میں دو دو طاق بنے ہوئے ہیں اور آخری حصہ میں ایک ایک طاقوں پر نہایت خوبصورت نقش و نگار اور شکستہ بت نظر آتے ہیں۔ کمر برج میں ایک مچان بھی ہے۔ برج کی چھت قائم ہے مگر اب سوراخ ہو چلا ہے۔ مرمت نہوئی تو یہ بھی گر پڑے گا۔ جیسے اس حجرہ کے دائیں بائیں دو حجرہ اور ہیں۔ ایک کو تیغا لگا ہوا ہے اور ایک کھلا ہوا ہے برج میں ابابیلوں نے گھر بنائے ہیں چنانچہ اس وقت کے پر وحشت سناٹے میں یا تو سمندر کا غل شور مسموع ہوتا ہے۔ یا ان ابابیلوں کے حسرت افزا چہچہے حجرہ میں سیلی ہوئی خاک کا فرش ہے۔ بظاہر تو کوئی دلچسپی کا سامان نہ تھا مگر ہم اسی تودہ خاک پر بیٹھ گئے۔ اور دو گھنٹہ کامل بیٹھے رہے۔ لیکن جب بھی جی چاہتا تھا کہ اس باعظمت مقام کو اور دیکھیں۔ اور باہر

---

[۵۱] محمودی حملے کے وقت وہ مرصع ستونوں کے وسط میں مورت کا ہونا بیان کیا گیا ہے اس اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخروطی شکل کا پتھر اس بت کی کرسی ہوگی۔ لیکن عمارت کے انداز اور طرز سے مورت کا مقام حجرہ میں ثابت ہوتا ہے۔ یہاں شاید بت کی سواری کے جانور یا کچھ پوجا پاٹ کے سامان ہونگے۔

نہ نکلیں۔

اسی وقت اور اسی موقع پر اپنے دوست شیخ عبدالقادر صاحب اور مولوی سعید احمد صاحب کو خط لکھے۔ اور بادل ناخواستہ باہر آ گئے۔

ستونوں وغیرہ پر سیاہی جمی ہوئی ہے جو قدرتی طور پر ایسی نم ہے کہ ہاتھ لگانے سے چھٹتی ہے۔ حجرہ کے سامنے چھوٹے چوک کے پہلے ستون پر سنسکرت میں ایک کتبہ ہے۔ جسکے حروف کچھ مٹ گئے ہیں۔ غالباً یہ کتبہ مسلمانوں نے بطور یادگار فتح کندہ کیا ہوگا کیونکہ عمارت میں اوپری اوپری اور بے موقع معلوم ہوتا ہے۔

مندر کا بیرونی حصہ چالیس قدم طویل اور پچیس قدم عریض ہے۔ پھولوں اور جالدار بیلوں کی روش میں تمام بیرونی حصہ پر بت بنے ہوئے ہیں۔ بعض بت قد آدم ہیں مگر سب شکستہ۔ گلکاری باوجود تباہی و بربادی اسقدر نفیس اور عمدہ ہے کہ اگلے وقت کے ہندوستانی کی صنعت پر آفریں کہنی پڑتی ہے مندر کی پس پشت مسجد کی طرز پر ایک سہ دری ٹوٹی پڑی ہے۔ غالباً مسلمانوں نے مسجد

ہم اپنے کرم فرما جناب لالہ چندولال صاحب دہلوی اور جناب مولوی سعید احمد صاحب مارہروی اور جناب مولوی رضی الحق صاحب صفوانی احمدآبادی کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اول الذکر صاحب سے بعض مندروں کی کیفیت معلوم ہوئی اور دوسرے حضرت نے اپنی وسیع تاریخی معلومات سے جسکا تعلق سومنات سے تھا مدد دی۔ تیسرے بزرگ کی قلمی تاریخ بڑا فائدہ پہنچایا جو مراۃ سکندری کے نام سے گجرات کی نہایت سچی تاریخ مانی جاتی ہے۔ اور جسکا اردو ترجمہ مولانا موصوف نے ابھی حال میں کیا ہے۔ اس تاریخ کے پانچ حصے ہیں۔ پہلا حصہ چھپ کر شایع ہوگیا ہے۔ لیکن تمام تاریخ کی جان مقدمہ ہے جس میں گجرات کے تمام مذہبی فرقوں۔ مندروں مسجدوں خانقاہوں اور بزرگوں کا مفصل تذکرہ ہے۔ بڑا افسوس کہ ابتک شایع نہیں ہوا۔

حسن نظامی

بنائی ہو گی جو توڑ ڈالی گئی۔ اسکے علاوہ دور تک وسیع میدان میں ٹیلے نظر آتے ہیں جہاں غالباً اور عمارتیں بھی ہونگی۔ مستحکم فصیل کے نیچے سمندر لگا ہوا ہے اور کوسوں تک اچھلتا کودتا نظر آتا ہے۔ یہ علاقہ نواب جوناگڈھ کے قبضہ میں ہے پٹن میں تقریباً چار ہزار آدمی رہتے ہیں جنمیں ہندو مسلمان دونوں قومیں ہیں مگر آپس میں سخت عناد رکھتے ہیں اور ہمیشہ خون ریز جھگڑے برپا رکھتے ہیں۔ مسلمان زمینداری اور تجارت کے سبب ہندؤں سے آگے بڑھے ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر کام میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہتا ہے۔

حسن نظامی

بس گئے ہیں کسی بت کے رخ و گیسو دلمیں
رنگ لالے کا ہے اور مشک کی خوشبو دلمیں

کروٹیں سیکڑوں لیں سیکڑوں پہلو بدلے
چین سے ورنہ بیٹھا کسی پہلو دلمیں

کسکو دوں دلمیں جگہ کس کو نکالوں دل سے
تیری حسرت مرے دلمیں رہنے یا تو دلمیں

معجزہ ہوتے ہیں شیریں دہنوں کے غمزے
بن گیا میٹھی چھری خنجر ابرو دلمیں

سولی کعبے میں کھڑی ہے کہ ارم میں طوبیٰ
سرو گلشن میں ہے یا وہ قد دلجو دلمیں

ضبط گریہ نے مرا خون کیا ہے اے چشم
تیر بن بن کے پلٹ آئے ہیں آنسو دلمیں

اب نگہ کون ملا سکتا ہے دیوانوں سے
اتر آیا ہے تری آنکھ کا جادو دلمیں

تیری تصویر تو خاموش ہے بوسہ دے کر
کوستا ہوگا مگر تو بت بدخو دل میں

راسخ مرحوم

ریشم کا کیڑا

عجب حالت ہے اے ریشم کے کیڑے تیری حالت ہی　　کفن اپنا لئے پھرتا ہے اور تابوت میت بھی

ترا علم و ہنر ہی ہو گیا زنجیر پا تجھکو　　سلاسل بھی قفس بھی قید بھی زندان وحشت بھی

ترا چشم جہاں سے چھپ کے مرجانا عجب کیا ہے　　کہ فرمان شریعت بھی ہوا احکام طریقت بھی

عجب کیا دیکھنے والا ہو تو اسرار قدرت کا　　کھلی ہو تجھ پہ شاید کنز مخفی کی حقیقت بھی

عجب کیا ہے کہ ہو انوارِ حق کا تو تماشائی　　ترے چھوٹے سے ماتھے پر ہو وہ چشم بصیرت بھی

تجھے جسمیں جھلا کر مادر قدرت نے پالا تھا　　وہی گہوارہ تجھکو ہو گیا تابوت میت بھی

بہت اچھا رہا جو تو بچا عشق و محبت سے　　محبت ہے کوئی یہ اہل دنیا کی محبت بھی

رسم تجہیز و تکفین سب دکھانے کے یہ آنسو ہیں　　دلوں میں ہے یہ کہ ہو جائے کہیں جلدی فراغت بھی

بناتا ہے عظیم الشان سنگیں مقبرے انساں　　کہ اپنا نام بھی مشہور ہو اور شان و شوکت بھی

یہ خواہش بھی ہے کس درجہ ذلیل انسان فانی کی　　کہ نام اسکا رہے دنیا میں باقی بعد میت بھی

فنا جب ہو گئے بحر حوادث میں تو ہم کو کیا　　کنارے پر اگر کچھ ہڈیاں پہونچیں سلامت بھی

شمع مزار

محال عقدہ کشائی وا بستہ کار ہوں میں　　شہید ناز کی شمع تہ مزار ہوں میں

امید ذوق محبت، حریف صبر و شکیب　　برنگ دیدۂ پروانہ بیقرار ہوں میں

متاع عمر گراں مایہ صرف سوز و گداز　　چشیدۂ مزۂ درد انتظار ہوں میں

نہ محو ناز نہ وقف نیاز نے منت　　نہ زخم خوردۂ گلگیر زینہار ہوں میں

کلید قفل درِ خانۂ شبِ دیجور
طلسم مُہرِ خموشی پردہ دار ہوں میں

نفس نفس سے مرے آہِ آتشیں پیدا
شرر کے پھول ہوں جن میں وہ شاخسار ہوں میں

ادائے لغزشِ مستانہ دلربا نکلی ہو
شراب عشق کو پی کر بھی ہوشیار ہوں میں

فریب خوردۂ حرف وفا کا "داغ جگر"
جلیس بزم محبت کی یادگار ہوں میں

مچل رہے ہیں مرے طفلِ اشکِ دیدۂ غم
یہ بیوقوف سمجھتے ہیں ہونہار ہوں میں

فروغ حسن تجلی وادی ایمن ہو
نمود شوخیِ رنگِ جمال یار ہوں میں

شمیم گلشن لیلا و جان فزا کی طرح
نہاں ہے کیفیت عشق آشکار ہوں میں

بنائے پھول پتنگوں کے پر سے تربت پر
نگاہ والے کہیں کیسی دستکار ہوں میں

جھٹک جھٹک کے نہ دامن کو چل صبا اتنا
لگایا جائے جو آنکھوں میں وہ غبار ہوں میں

نہ تھی تو غاشیہ بردار رنج و غم بھی نہ تھی
ہوئی تو محرم رازِ جگر فگار ہوں میں

نگاہ باطن صوفی میں موت کی تصویر
نگاہ ظاہر بلبل میں گلعذار ہوں میں

فدائے دید تماشائے عکس وجد انگیز
مثال سرو لب آب جوئبار ہوں میں

شگفتگی طبیعت کہاں نصیب مجھے
سرور عیش نہیں "رنج کا خمار ہوں میں

بنائے بخت یہ مشق جفا "نسیم سحر"
انیس گوشۂ عزلت کی غمگسار ہوں میں

خموش بیٹھیں نہ واعظ کہیں حنا لگتی
میں کیوں جلائی گئی؟ کیا گناہگار ہوں میں؟

رفیق رہرو آوارہ خانماں برباد
نشان منزل گم گشتہ دیار ہوں میں

اسیر دام تاسف! رہین حسرت و یاس
بلاکش ستم دور روزگار ہوں میں

کہاں ہیں مدعی ربط و الفت و اخلاص
کہاں ہیں وہ جو یہ کہتے تھے جاں نثار ہوں میں

نہ خوں فشاں کوئی آیا نہ گل فشاں کوئی
امیدوار رہی اور امیدوار ہوں میں

نہ اقربا نہ احبا نہ اپنے بیگانے
جو ہوں تو گور غریباں پہ سوگوار ہوں میں

یہ نور بیزیاں ساری ہیں تا ظہور سحر
خدنگ ہستی موہوم کا شکار ہوں میں

ثبات رشتۂ میثاق بیوفا کی طرح | کسیکے وعدۂ فردا کا اعتبار ہوں میں
یری خدا بیاں مضمر ہیں خندۂ گل میں | ادھر نسیم چلی اور اُدھر فرار ہوں میں
دراز قصۂ غم فرصت بیاں کوتاہ | خیال عمر طبیعی سے اشکبار ہوں میں

کسی کو ذات خدا کے سوا قرار نہیں
ریاض دھر میں کوئی سدابہار نہیں

حکیم عبدالحی۔ ہاتف

شب ہجر

آئی چھائیں شام مصیبت | بیٹھیں سنبھل کر اہل محبت
چین سے سوئے سونیوالے | شام سے بیٹھے رونیوالے
بزم ہیں اُنکی فرش مشجر | خشت وزمیں یاں بالش وبستر
آہیں دل سے بھرنیوالے | موت سے پہلے مرنیوالے
دل کو رخصت کرنے بیٹھے | مرنے والے مرنے بیٹھے
دل نے بپا کی مجلس ماتم | ہونے لگیں یہ باتیں باہم
ہجر کی شب کس طرح بسر ہو | دیکھیں کیونکر آج سحر ہو
کاکل شب کی غالیہ بیزی | اور وہ دل کی وحشت خیزی
ہے وہ بھیانک رات اندھیاری | توبہ اے ایزد باری
اکا دُکا ہیں کچھ تارے | چھپ گئے باقی خوف کے مارے
جتنے شجر ہیں باغ کے اندر | کانپ رہے ہیں خوف سے تھر تھر
رنگ عمارت ہے یہ نرالا | جیسے پہاڑ اک کالا کالا

ایسی سیاہی پھیلی ہر سو — دنیا ہے سب کوچۂ گیسو

سونے والے سوتے ہونگے — رونیوالے روتے ہونگے

کرتی ہے دنیا سائیں سائیں — صرف درندوں کی ہیں صدائیں

ہے سناٹا عالم بھر میں — ہو کا عالم ہے گھر گھر میں

جھونکے ایسے تیز ہوا کے — ہوش پریشاں خود ہیں ہوا کے

سَن سَن چلتی ہیں وہ ہوائیں — ہر سُو وحشتناک صدائیں

کوئی سوادِ شب کی حد ہے — گوشہ گوشہ گھر کا لحد ہے

درد اُٹھا ہے دل میں ستم کا — مہماں ہوں میں کوئی دم کا

میری خبر اب کس کو ہوتی — خلقِ خدا ہے چین سے سوتی

کاہشِ غم نے تن کو گھلایا — شمع کی صورت مجھکو رُلایا

آنکھوں سے یوں آنسو جاری — جیسے برسے ابر بہاری

رگ رگ میں ہے جوشِ محبت — ہر بُنِ مُو ہے نوشِ محبت

دل میں دوزخ سوزِ دروں سے — حال ہے ابتر صیدِ زبوں سے

سوچ رہا ہوں باتیں کیا کیا — دیکھ رہا ہوں نقشہ کیسا؟

پیشِ نظر ہے کون سی صورت — ہاں۔ یہ وہی ہیں کیا اے قسمت!

زانو پر یہ کس کا سر ہے! — کس کا جلوہ پیشِ نظر ہے

صدقے تیرے جذبِ محبت — مجھکو دکھائی تو نے یہ صورت

سودا ہے یہ میرے سر میں
کون وہ آئیں میرے گھر میں

جوشِ جنوں میں آج کہاں ہوں! — ہاں یہ غلط ہے میں ہی وہاں ہوں

کیسی سجی ہے محفل اُنکی — شیشۂ دل سی آئینہ بندی

صرف تصور ہے یہ میرا
کیں یہ شکلیں وہم نے پیدا

کٹ نہ سکی یہ شام مصیبت — شب پچھلے پھر تک کر گئے رحلت
شمع سے باتیں کرتے کرتے — مر گئے آہیں بھرتے بھرتے

مرزا محمد ہادی - عزیز۔ لکھنوی

راسخ مرحوم

مولوی راسخ کے انتقال سے جو صدمہ اردو شاعری کو پہنچا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس واقعہ کے متعلق حال میں دو قطعات تاریخ ہمارے پاس پہنچے ہیں۔ ایک جناب آغا شاعر صاحب قزلباش دہلوی کا اور دوسرا مولوی عبد القدوس صاحب قدسی کا جو مرحوم سے قرابت بھی رکھتے ہیں۔ یعنی مولینا راسخ انکے ماموں زاد بھائی تھے۔ دونو حضرات نے قطعات کے ساتھ چند تمہیدی جملے نثر میں بھی لکھے ہیں۔ ہم قطعات مع تمہید درج کرتے ہیں:-

(۱) میں کیا اور میری تعزیت کیا کیا کروں۔ وطن کی لاج مارے ڈالتی ہے۔ ہائے! میرے دیکھتے دیکھتے زبان اردو کے کئی چراغ گل ہو گئے۔

سب سے پہلے استاد مرحوم نواب فصیح الملک بہادر داغ دہلوی کی سناؤنی آئی۔ پھر شہر آشوب آرشد گورگانی جیسا نادر الکلام اٹھ گیا۔ اب مٹی ہوئی دلی برباد شدہ اجڑے دیار کا ایک رہا سہا ستون وہ بھی اکھڑ گیا۔ یعنی مولوی عبد الرحمن راسخ کا دفعتاً انتقال ہو گیا۔

مرحوم فقیہہ کامل۔ عالم متبحر۔ ناظم و ناثر بے بدل اور خوش تقریر واعظ تھے۔ آپ کی زندگی

کا ایک قابل قدر کارنامہ شرح مثنوی مولانا روم ہے جسکو بیشتر صوفیائے کرام تمام
تراجم سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ آپکا کلام شوخی مضامین۔ بلند پروازی۔ تلاش کامل اور
جدتوں کا آئینہ ہوتا تھا جو مراۃ الخیال سے ظاہر ہے۔

مرحوم کا ایک شعر اس وقت یاد ہے اُسی کو نمک پاشِ جراحت بناتا ہوں اسکے بعد
اپنے چند گسستہ و ژولیدہ مصرعے قطعہ تاریخ کے سلسلہ میں پیش کرکے اس لڑی کو ہمیشہ
کے لئے توڑے دیتا ہوں۔ (شاعر)

"آہی ابکے ساون مین اگر برسے نمک برسے — ہمارے زخم پھیلائے ہوئے بیٹھے ہیں دامن کو"

شاہجہان آباد سُونا ہو گیا — (قطعہ تاریخ) — اک نیا پُرسا مجھے دینا پڑا

تھا کبھی یہ شہر مردم خیز بھی — مرنے والوں کا ہے اب تو مقبرا
نخلِ ماتم ہیں حسینانِ چمن — بال سنبل کے کھلے ہیں جا بجا
خاک اُڑتی ہے صفائے چرخ تک — چار سو مسکی ہوئی گل کی قبا
جسطرف دیکھو بپا ہے شور و شین — علم و حکمت کا ہیں پڑھتے مرثیا
لفظ و معنی کی خرابی آ گئی — بھر دیا آفاقیوں نے ست نجا
مِٹ گئے ارکانِ شعر و شاعری — تنگ ہے اہلِ خرد کا قافیا
اب سنو تو انکی بولی اور ہے — اب لب و لہجہ بھی تو غارت ہوا
اب یہاں توڑی یہاں تک کی جگہ — اب سُتوں کا ہے یہاں سُتیوں بنا
اُٹھ گئے دِلّی ترے سب باکمال — بے کمالی تیرے سر سہرا تھا
ہائے وہ مولانا راسخ کا کلام — وہ تخیل وہ مضامیں کی ادا
آسمانوں پر وہ پروازِ خیال — وہ زمینوں کو بنا لینا نیا

سنہ ہجری

مصرعۂ تاریخ شاعر کیا لکھے
ہائے راسخ فرد کامل گم ہوا
۱۳۲۵ھ

مولینا عبد الرحمن صاحب راسخ - حاجی حافظ مولوی محمد حسین صاحب نقیر بانی مدرسہ حسینیہ دہلی کے فرزند تھے - خود بھی حافظ کلام مجید اور عالم بے بدل تھے -

انکا بیان نکات و معانی کی جان تھا - عرفان کا مینہ جھم جھم برستا تھا - اُن کی مجلس قال میں کوئی صوفیوں کا حال دیکھتا - ذکر شہادت سید الشہدا امام حسین علیہ السلام میں ایکدفعہ پنکھی والوں کی مسجد واقع دہلی میں ایک جوان رعنا دفور بکا ہیجان اضطراب میں مبتلا ہو کر ایسا گرا کہ ہنگام عشا رنگ جان دیگر اُٹھا - خود رقیق القلب عاشق مزاج کثیر البکا ہونے کے سبب بر سر منبر آپ روتے اوروں کو رُلاتے -

مرحوم کا دوسرا دیوان بسیط عاشقانہ جو ہنوز زیر نقاب خفا ہے (خدا کرے جلد شایع ہو) دیدنی ہوگا -

آخر ۱۰ شعبان المعظم ۱۳۲۵ھ مطابق ۲۵ - اکتوبر سنہ ء یوم چہارشنبہ کو قبل از نصف النہار یہ آفتاب معرفت غروب ہوگیا - ایام حیات میں انہی کا دردناک شعر عموماً اُن کا وردِ زبان رہا ؎

نزع میں جب حال راسخ غیر ہو
یا الٰہی خاتمہ بالخیر ہو

ایک شعر اور یاد آیا ؎

اپنے بیگانے ہیں بیگانے نہیں اپنے راسخ
وہ یگانا ہوں میں - اپنوں کا نہ بیگانوں کا

اور سنئے ؎

راسخ تفتہ جگر بوئے کباب آنے لگی
خوش بیاں تجھسے بہت آتش بیاں گنتی کریں

کچھ اور شعر یاد آئے کیا حسب حال ہیں ؎

میرے جنازے پر یہ لب گور نے کہا
مر مر کے پہنچا ہے یہ مسافر وطن کے پاس

پھرتی رہیں گی دلی کی گلیاں نگاہ میں
ہوکر وطن سے دور رہو نگا وطن کے پاس

دل میں ہزار تیر جگر میں ہزار غم
راسخ یہ خار زار ہے میرے چمن کے پاس

افسوس سات فرزند نرینہ پیدا ہوئے اور ایک نہ جیا - تخمیناً چالیس بیالیس کا سن ہوگا کہ پیک اجل کو

لبیک کہکر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ تین بیٹیاں جنہیں دو صغیر السن یتیمہ ہیں اُن کو بیکسانہ حالت میں چھوڑ کر چلدیے۔ (قدسی)

قطعہ تاریخ

ملا ہی دیتی ہے مٹی میں نا آورد کر — زمانہ تجکو سمجھتا ہے اے اجل چھیلا
نہ نیک سے تجھے رغبت نہ بد کی خواہش ہے — کسیکی ہو کے تو رہتی نہیں ہر لے کھیلا
اسی نے قیس کو جنگل میں جا دبایا تھا — اسیکے ہاتھ سے پامال ہو گئی لیلا
وہ کون ہے؟ جسے اے مرگ تو نے چھوڑا ہو — وہ کسکا جام ہے؟ جسکو نہیں کیا میلا

لکھا ہے سال یہ قدسی نے لوحِ تربت پر
ہے قبر راسخ طوطیِ تبسند وادیلا

سنہ ۱۳۲۲ ہجری صلعم

فسانۂ غم

مرے دوستو خدارا سنو مری زبانی — مری دکھ بھری کہانی مرا غم بھرا فسانہ
سبھے یاد آجتک ہیں وہ پرانی داستانیں — وہ کسی پہ جان دینا وہ کسی پہ دل لگانا
وہ کسی کا پیارا چہرہ وہ کسیکی پیاری باتیں — وہ کسی کے پیارے تیور وہ کسی کا مسکرانا
وہ خدنگ نازِ دلکش وہ تفنگ عشوہ سازی — مرے دل جگر پہ برچھی وہ نگاہ کی لگانا
وہ کسی کی نیچی نظریں وہ حیا بھری نگاہیں — وہ کسی کی چال آفت وہ قیامتیں اٹھانا
وہ ہزار شوخیوں کی کبھی چھیڑ چھاڑ باہم — وہ حجاب اوّل اوّل وہ حیا سے منہ چھپانا
وہ مثال سایہ ہردم مرے ساتھ ساتھ رہنا — وہ محبتوں کی باتیں وہ محبتیں جتانا
وہ ہزار منتوں سے کبھی بات چیت کرنا — وہ نگاہ نے تکلف وہ حجاب کا اٹھانا
وہ گلے میں ہاتھ ڈالے کبھی سیر باغ کرنا — وہ ہمیشہ پاس رہنا وہ برابر آ کا جانا

مگر اب وہ ساری باتیں ہوئیں مثل خواب باطل　　شب و روز عیش و عشرت میں ہو سب کے سب روانا
مرے منہ کو کیوں کلیجہ نہ ہزار بار آوے　　وہ نگاہ پھر گئی کیا کہ بدل گیا زمانا
یہی کام آجکل ہے یہی مشغلہ ہے ہر دم　　کبھی خون دل کا پینا کبھی لخت دل کا کھانا
یہ صلہ ملا ہے حامد مجھے عشق و عاشقی کا　　یہی ان بتوں سے پایا یہی ان کو ہو جانا

مکن آشنائی اے دل بکسے کہ نزد دانا
دو سہ روز آشنائی بہ شناختن نیرزد

حامد حسین قادری

صدائے گنبد

صدا آتی ہے گنبد سے کہ اے غافل قدم رکھ　　تو آنش زیر پا رہنا تجھے فرصت یہاں کم ہے
تجھے موج فنا اک دن ہمیشہ کو مٹا دیگی　　مسلط سارے عالم پر یہی قانون محکم ہے
جسے تو زیست سمجھا ہے یہ قید با مشقت ہے　　جسے تو موت سمجھا ہے وہ مقصود مسلّم ہے
بقا تیری اسی بحر فنا میں ڈوب جانا ہے　　یہی بام مراد آزادی افکار پیہم ہے

فلاح عام اور نیکی کا توشہ ساتھ لیتے لے
اگر ملک بقا کی زادِ رہ کا تجکو کچھ غم ہے

بدر الدین (سیوہاری)

حال زمانہ

جو دانا ہے وہ اس چکّی کے ہاتھوں سخت حیراں ہے　　زمیں پاؤں کے نیچے ہے سر کے اوپر چرخ گرداں ہے

کہو اس دور میں ثابت بھلا کیونکر بچے کوئی — کہ گندم کیطرح ہر وقت پسجانیکا ساماں ہے

تشفی سے طبیعت کو نہ اطمینان دل کو ہے — جو اس گلشن میں ہے وہ صورت سنبل پریشاں ہے

گریباں چاک ہے پھولوں کا غنچے منہ پھلائے ہیں — اسی اندوہ سے شبنم برنگ ابر گریاں ہے

صبا بھی اس الم میں اپنے سر پر خاک اڑاتی ہے — کہ سیخ آہ سوزاں پر دل بلبل بھی بریاں ہے

مقیمان گلستاں مطمئن ہرگز نہیں دم بھر — مرض سوکھے کا ہر کانٹے کو امین گلستاں ہے

ہوئی ہے گردش گردوں سے قلب ماہیت ایسی — کہ حیواں سے سوا وحشت زدہ ہر ایک انساں ہے

بشر تو کیا خدا کو بھی نہیں پہچانتے ہرگز — برنگ کور مادر زاد اعمی عین عرفاں ہے

الف میں اور لیٹے میں نہیں تمیز ہے جسکو — وہی جہل مرکب سے سمجھتا سب کو ناداں ہے

تمسخر سے یہ کہتا ہے کہ قبلہ آپ شاعر ہیں — جو کہیے ہاں تو پھر الٹے توے کیطرح خنداں ہے

خدا محفوظ رکھے کچھ عجب یہ وقت آیا ہے — کہ بالکل آدمیت تربت آدم میں پنہاں ہے

دورنگے زمانہ سے نہایت دل پریشاں ہے — مطلع کہ اس گلزار میں بلبل صفت ہر شخص نالاں ہے

کہو کس طرح اطمینان ہو نیرنگ سے اسکے — کسی جا بزم ماتم ہے کہیں عشرت کا ساماں ہے

حقیقت میں بھٹے دانوں کو ہے محتاج دانائی — فضیلت تابع جُہّال مانند کنیزاں ہے

فلک نے یہ عداوت کی ہے پیدا با کمالوں سے — کہ کاہیدہ مہ نو سے زیادہ جسم کیا جاں ہے

نہ دیکھا ہوگا آنکھوں نے کسیکی انقلاب ایسا — خطاب احمق کا لایق ہے لقب دانا کا ناداں ہے

ذرا بوئے وفا گلہائے گلشن میں نہیں باقی — بشکل صبح اس صدمے سے فق رنگ گلستاں ہے

محبت نام کو باقی نہیں خویش و اقارب میں — یہ کیسا ظلم تیرے دور میں اے چرخ گرداں ہے

عوض میں دوستی کے دشمنی اظہار کرتے ہیں — کوئی تو درپئے جاں ہے کوئی عزت کا خواہاں ہے

تاسف کیوں نہو افعال پر اہل زمانے کے — سوائے تہمت و غیبت نہیں کچھ قول انساں ہے

بجز فکر حصول زر نہیں کچھ فکر عقبیٰ کی — ٹکے پر منہدم مسجد کریں یہ دین و ایماں ہے

مروت کا کرم کا بند ہے بازار اب بالکل — عناد و کاوش و بغض و حسد کی گرم دوکاں ہے

ہزاروں دہر میں محروم ہیں نقدِ صداقت سے
دُرستِ کذب کا اُنکے دلوں میں گنج پنہاں ہے

نفاقِ باہمی نے کر دیا مفقود روزی کو
جسے دیکھو وہ روزی کے تردد میں پریشاں ہے

ترحم اپنے ہم جنسوں پہ اس پر بھی نہیں کرتے
پیمبر کا نہ دل میں ڈر نہ ہرگز خوفِ انساں ہے

ہوئے جب بندۂ زر پھر کہاں پابندیِ مذہب
برائے خونِ مسلم گرگ آسا تیز دنداں ہے

نہ بھولو گل کی صورت اس حیاتِ پنجروزہ پر
جہاں میں غافلو جو ہے وہ اک ہفتہ کا مہماں ہے

پڑے ہیں پردۂ غفلت کچھ ایسے دیدہ و دل پر
کہ مثلِ دیدۂ اعمیٰ ندارد نورِ ایماں ہے

بھلا ان مردمِ ناآشنا سے پھر توقع کیا
جسے دیکھو چھری ہر دم لئے ہم شکلِ مژگاں ہے

کبھی احباب کے حق میں نہ بولیں خیر کا کلمہ
زبانِ مردہ دہن ہم صورتِ گورِ غریباں ہے

ارے غافل نمودِ ہوش اتنا تو سمجھ دل میں
کہ تجکو شکر ہے لازم یہ جو عشرت کا ساماں ہے

کہاں ہیں حاتم و قاروں کہاں اسکندر و دارا
کہاں ہے جامِ جم ناداں کہاں تختِ سلیماں ہے

تکبر کو نہ دے رہ اپنے جاہ و عہدِ دولت میں
وہی پھر خاک کا تکیہ وہی شہرِ خموشاں ہے

نہیں معلوم کیا زیرِ زمیں گذرے ترے اوپر
نہ جسکا دیکھنے والا نہ کوئی جسکا پرساں ہے

کہیں گے سچ بتا جو کچھ کیا ہے تو نے دنیا میں
بیاں کر او شقی ہمکو یہی فرمانِ یزداں ہے

ستمگر خوف سے زہرہ ترا ہو جاوے گا پانی
کڑی منزل یہی مرنے پہ از بہرِ انساں ہے

جو عاقل ہے خدا سے ڈر حیاتِ پنجروزہ میں
فشارِ گور گرزِ آتشیں و قہرِ یزداں ہے

نہ کرنا یا خدا پھر بھی گمراہ تو مجھکو
رہوں محکم جو راہِ راست پر تیرا یہ احساں ہے

مزید جاہ و دولت میں نہ دنیا کی محبت ہو
کہ یہ محبوب کا تیرے خداوندا ثناخواں ہے

اگر چمکا دمِ حشر اخترِ تقدیر اے انجم
تو دستِ دل ہے اور آلِ نبی کا پاک داماں ہے

سید نجم الدین احمد انجم (سندیلہ)

فکر صبحگاہی

ریاست ابد دولتِ رام پور عرصہ دراز سے مربی علم و ہنر ہے۔ خصوصاً شعرائے اردو کی قدر دانی واں ہوتی رہی ہے۔
سوائے دکن کے اور کہیں اسکی نظیر نہیں ملتی حال میں یہ پرانا سلسلہ پھر تازہ کیا گیا۔ اور ایک سرکاری مشاعرہ بہ سرپرستی حضور نواب صاحب بہادر دام اقبالہٗ قائم ہوا ہے۔ نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی بھی اس میں مدعو ہوئے تھے۔ چنانچہ گزشتہ مشاعرہ میں انہوں نے مندرجہ ذیل غزل پڑھی جو واں قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ اور مقبول مشاعرہ ہوئی۔ اس کا نام انہوں نے "فکر صبحگاہی" رکھا ہے۔ کیونکہ اشعار فکر صبح کا نتیجہ ہیں۔ اور نیز رعایتِ ردیف بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔

یہ شب عشرت نیا دیکھا گیا ناہنجار صبح ۔۔۔ تار برقی سے زیادہ تیز ہے رفتار صبح
شام سے بیفائدہ ہے حجت و تکرار صبح ۔۔۔ جائیگا جائیگا یا دے ہے اقرار صبح
اذن گلچینی تو دے اے غیرتِ گلزار صبح ۔۔۔ صبحدم ہو جاؤنگیں منت کش ایثار صبح
گھر چلے جائینگے وہ ہنگام ناہنجار صبح ۔۔۔ حشر تک بھی ہوش ظاہر یا خدا آثار صبح
پھر مُصر ہو میری جاں پھر ہو وہی تکرار صبح ۔۔۔ ذہن سے جاتا رہا بیزارہ حالِ زار صبح
عقل کے ناخن لو آؤ ہوش کی دار و گرد ۔۔۔ بیوفا معشوق ہوتے ہیں کہیں یا بھی یار صبح
عشق کی دو حالتیں ہیں ایک فرقت ایک وصل ۔۔۔ ایک راحت رات کی ہر ایک ہے آزار صبح
سہتے سہتے ہو گئے ہم خوگر رنج فراق ۔۔۔ جنکو ہوگی اونکو ہوگی حسرت دیدار صبح
دل لگی میں کیوں نہ کیجے اتباع خوئے یار ۔۔۔ ایک دلبر رات کا ہو ایک ہو دلدار صبح

خوگرِ بیداد کی تیرے لئے ہے آرزو ہو میسر پہلے جیسے لذتِ آزارِ صبح

شامِ فرقت بس تری نازک خرامی دیکھکر پھر گئی آنکھوں میں میرے حشر کی رفتارِ صبح

کان کا موتی ہوا ٹھنڈا کہ وہ گھر چلدیا اُسنے کرلی ہے معین اسقدر معیارِ صبح

آگیا دوران پیری اُڑ گیا عہدِ شباب شامِ عشرت ہو چکی ہے وقتِ ناہنجارِ صبح

کیا عجب گر میں سمیٹوں عاقبت کے بوریئے میں سنے دیکھے ہیں پسِ شامِ الم دیدارِ صبح

کہہ رہے ہیں یک مشل و شبکی نیت ہے حرام رات کو کرتے نہیں گویا کبھی اقرارِ صبح

دم میں جبتک دم ہے میرے میں ہوں اور تیری گلی عکسِ دیوارِ شب ہوں نقش بر دیوارِ صبح

زندگی فرقت میں کٹتی ہے گراں شان سے بیکسی ہے مونسِ شب رنج و غم غمخوارِ صبح

ہمنے یوں دیکھے ہیں مرتے تیرے الفت کے مریض صبح کو بیمارِ شب کا شام کو بیمارِ صبح

جھٹپٹا ہے جائیگا روز روشن ہو تو لے صبح کے جہرےسے ڈھلجائے ذرا زنگارِ صبح

تیرا مُنہ دیکھا تھا جاتا ہے مرے پہلو سے یار یاد رکھیو اسکو تو اے وقتِ ناہنجارِ صبح

سب چُرا کر لیگیا سرمایۂ عیش و نشاط آسماں سے آن کو داتھا کوئی عیارِ صبح

وصل کا وعدہ کبھی کرتا نہیں ظالم وفا صبح کو اقرارِ شب ہے شام کو اقرارِ صبح

یار نے خاصی نکالی ہے تمیز عام و خاص محفلِ شب ایک ہے تو ایک ہے دربارِ صبح

نالۂ شبگیر کی چھریاں چلی ہیں رات بھر یہ نہیں رنگِ شفق ہے زخم دامندارِ صبح

سال بھر کی وضع چھوڑے تیس دن کے واسطے پاسِ بندِ صوم کیونکر ہو سکے بیخوارِ صبح

عاشق و معشوق کا ہنگامِ رخصت ہے یہی کیا کروں دیکھوں نہ دیکھوں شکلِ ناہنجارِ صبح

اُٹھکے خوابِ ناز سے کہنے لگے یہ کیا بنے دیونی سی ہو گئی سر پر کھڑی دیوارِ صبح

رات دن کا فرق ہے شام و سحر میں وصل کی گرم ہے بازارِ شب کا سرد ہے بازارِ صبح

جب شبِ وعدہ وہ آئے ہو گیا ہی جانا ہمنے دیکھے ہیں اندھیری رات میں آثارِ صبح

ہے چڑھائی کس کی اقلیمِ شبِ دیجور پر خاورِ زریں سپر ہے یا علم بردارِ صبح

جان کیونکر ہو نہ اُس نازک خرامی پر نثار ہجر کی شب آ کے دیکھو تم کبھی رفتار صبح

عشق ہے اک بد بلا اُس بت کافر کا عشق شام تک بچتے نہیں دیکھا کبھی بیمار صبح

ایک بوسے کے لئے سائل ہزار چھوڑ ہو چکے

بیسیوں اقرار شب کے سینکڑوں اقرار صبح

تازہ غزلیں

رخسار کے پرتو سے بجلی کی نئی دھج ہے کیوں آنکھ جھپکتی ہے کیا سامنے سورج ہے

دنیا کی زمینوں سے اے چرخ تو کیا واقف؟ ایک ایک یہاں پنہاں کاؤس ہے ایرج ہے

مٹی سے بنے پتلا مٹی ہی میں مل جانا جب خاک کا بستر ہو کس کام کا ہودج ہے

آنکھیں نہیں جو دیکھیں خالی ہیں دماغ انکے اندھیر ہے دنیا میں منصف نہ کوئی جج ہے

دروازے پہ اُس بت کے سو بار ہمیں جانا اپنا تو یہی کعبہ اپنا تو یہی حج ہے

اے ابروئے جاناں تو اتنا تو بتا ہمکو کس رخ سے کریں سجدہ قبلے میں ذرا کج ہے

دلی کی زباں شاعر دلی میں کوئی سیکھے

یہ کانِ جواہر ہے الفاظ کا مخرج ہے

آغا شاعر (قزلباش دہلوی)

اک ہوک سی دلمیں اُٹھتی ہے جب دھیان تمہارا آتا ہے چپکے چپکے روتا ہوں دم گھٹتا ہے جی گھبراتا ہے

پُرنم مژگاں دیکھکے میری یہ کہتے ہیں وہ ہنس ہنسکر یہ ابر سیہ دیکھیں تو سہی کیا کیا موتی برساتا ہے

آنکھیں کھولو کھُل کھیلو شب وصل کی گزری جاتی ہے شوخی وہ تمہاری کیا ہوئی آج اتنا بھی کوئی شرماتا ہے

غماز۔ رقیب اک ہی تھیلی کے دونوں چٹے بٹے ہیں یہ بھی اُسکو شہ دیتا ہے وہ بھی اُسے بہکاتا ہے

انصاف تو یہ ہے میرے لئے تمسے تو تمہارا دھیان اچھا فرقت میں تم تڑپاتے ہو یہ آکے مجھے بہلاتا ہے

سارے گاہک سودا لیکر جاتے ہیں افسوس اپنے گھر کو
ہمنے دُکان لگائی اب بازار جب اُٹھا جاتا ہے

لاکھوں خُم ہیں، لاکھوں شیشے مے سے بھرے سب مُنھ پر ہے
تجکو ہے کمی کیا؟ اے ساقی! ناحق جو مجھے ترساتا ہے

ٹھنڈی ٹھنڈی سانس پہ میری آتی ہے اُنکے لب پہ ہنسی
چلتی ہے نسیم چمن میں جب، فوراً غنچہ کھلجاتا ہے

اس رُتبے اُنکی وصل میں بھی جی بھر کر پیار نہ کر پایا
ہنسکر بیٹھو، کہنا مانو، دیکھو وہ کوئی آتا ہے

غم، غصہ روزِ ازل ہی سے عاشق کی غذا چلی آتی ہے
روکھا سوکھا کھا لیتا ہوں جو کچھ کہ میسر آتا ہے

کیوں چپ چپ ہے خیال اب سوچ رہا ہے کیا؟ کیسی دھن ہے؟ کسکی دھن ہے؟
یہ حال ہے کیا؟ کچھ کہہ تو سہی، یاروں سے بھی کوئی چھپاتا ہے

مولوی ریاض حسنخاں خیال

بڑھاؤ وعدۂ فردا پہ تم اتنی عبارت بھی
کہ فردا کیا نہ بھولونگا میں فردائے قیامت بھی

مزے لیتا ہوں گھنٹوں تلخ کامیِ محبت کے
غضب کا میٹھا میٹھا درد ہے دردِ محبت بھی

نمازِ پنجگانہ سے ہے بہتر کام کیا زاہد
مگر نیت سے پہلے ٹھیک کر لے اپنی نیت بھی

شبِ خلوت جب اُتریں کشتیوں پر کشتیاں مے کی
زمیں پر آسماں سے آگیا دریائے رحمت بھی

اُسے بھی تو لگا ہے خوف میری آرزو نکا
کھٹکتی ہے عدو کے دلمیں میرے دلکی حسرت بھی

سوالِ بوسہ پر بولے کہ دیکھو تُمنے پھر چھیڑا
تمہیں کچھ ہو گئی ہے گالیاں سننے کی عادت بھی

تسلی اس دلِ بیتاب کی میں آپ ہی کر لوں
ہجومِ یاس سے پاؤں کہیں کمبخت فرصت بھی

بہم اک مختصر سے دلمیں ہیں شادی و غم دونوں
یہ چھوٹا سا مکان اور اُسمیں دوزخ بھی ہے جنت بھی

بنے وہ مدعی میرے تو میرے دوست بول اُٹھے
کہ ہم حاضر ہیں دینے کو گواہی بھی شہادت بھی

وہ کہتے ہیں کہ جنت بھی تو ہے کوچہ حسینوں کا
بنا لینا اُسی کوچہ میں جا کر اپنی تربت بھی

یہاں زاہد بنے ہیں اور میخانے سے کل شبکو
نکالے جب گئے میکش تو اونمیں خود بدولت بھی

شبِ غم نیند ہی اول تو کیوں آنے لگی مجکو
اگر سویا تو اُٹھنے کا نہیں میں تا قیامت بھی

تری باتیں بھی نادر کتنی لچھے دار باتیں ہیں
کچھ اقرارِ اطاعت بھی کچھ اندازِ متانت بھی

اضطرابِ عاشقی پھر کارفرما ہو گیا — صبر میرا ناشکیبائی سراپا ہو گیا
سادگیہائے تمنا کے مزے جاتے رہے — ہو گئے مشتاق ہم اور وہ خود آرا ہو گیا
وائے ناکامی نہ سمجھا کون ہے پیشِ نظر — میں کہ حسنِ یار کا محوِ تماشا ہو گیا
بعد مدت کے ملے تو شرم مجھ سے کس لئے — تم نئے کچھ ہو گئے یا میں نرالا ہو گیا
نوجوانی تھی کوئی شیدا نہ تھا میرے سوا — ایک حسنِ یار کا وہ بھی زمانا ہو گیا
شورشیں جاتی رہیں وہ آرزوئے وصل کی — رنجِ دوری مرہمِ زخمِ تمنا ہو گیا
سحر وہ کیا تھا نگاہِ آشنائے یار میں — جو دلِ بیمار کے حق میں مسیحا ہو گیا
ضبط سے رازِ محبت کا چھپانا تھا محال — شوق گر پنہاں ہوا غم آشکارا ہو گیا

حسرت موہانی

بے اختیار صورتِ موجِ رواں ہیں ہم — بہتے بہاتے آئے کہاں سے کہاں ہیں ہم
جب زندگی ہے نام نشیب و فراز کا — پھر ہے بجا یہ ناز کہ ابتک جواں ہیں ہم
قابو میں روکنا نہ چلانے پہ اختیار — اچھے سوارِ توسنِ عمرِ رواں ہیں ہم
مہماں سرائے دہر میں مہمان پنجروز — کہتا ہے میزبان سے خود میزباں ہیں ہم
خالی نہیں ہے عیب سے کوئی سوائے دوست — کوتاہیوں پہ غیر کی کیوں شادماں ہیں ہم
جمتا نہیں ہے فصلِ بہاری کا اعتبار — کچھ ایسے زخم خوردۂ جورِ خزاں ہیں ہم
چھوڑا غبار کر کے سرِ رہگذارِ یار — مرہونِ منتِ ستمِ آسماں ہیں ہم
لیتے ہیں اُڑ کے دامنِ سالارِ کارواں — شکرِ خدا کہ گردِ رہِ کارواں ہیں ہم
دل آشنائے در و زباں آشنائے دل — اہلِ زباں سے کہدو کہ اہلِ زباں ہیں ہم

مخزن بہا کے واسطے اشعار ہیں ضرور
لیکن خبر نہیں ہے کہ صادق کہاں ہیں ہم

صادق علیخاں (از کشمیر)

میں گدائے مست ہوں مشرب مرا رندانہ ہے — میکدہ جھولی ہے کاسہ بھیک کا پیمانہ ہے

گردش تقدیر میری عمر کا پیمانہ ہے — تھا نہ کوئی مجھ سے پہلے بادہ پیمانہ ہے

ہیں کہیں آنکھیں کہیں دل ہے کہیں پیمانہ ہے — ساقی بدمست کی ہر ہر ادا پیمانہ ہے

گو دل وحشی مرا اب سر بسر ویرانہ ہے — شعلۂ خواب بھی کوئی لیکن چراغ خانہ ہے

پانوں ویرانے میں اپنے پانو نہیں ویرانہ ہے — خضر کی تقلید ننگِ ہمتِ مردانہ ہے

لاکھ دیوانوں کا دیوانہ ترا فرزانہ ہے — لاکھ فرزانوں کا فرزانہ ترا دیوانہ ہے

کوچۂ قاتل میں ہر دم گرم ہے بازار موت — کیا متاعِ حسن و الفت کا یہی بیعانہ ہے

تیر میں چکر آنکھ میں گردش نہ دل میں اضطراب — کوئی گشتیاں نہ دربان ہے نہ صاحبخانہ ہے

ڈھلکے آیا ہے پسینہ خالِ عارض کے قریب — جانے کس دشمن کی قسمت کا یہ آب و دانہ ہے

کچھ کہا تو تھا مگر کس نے۔ کہاں۔ کیوں۔ کیا خبر — یاد اک بھولا ہوا سا خواب کا افسانہ ہے

پانوں پھیلائے تپش نے درد نے گھر کر لیا — کون ہے مہمان دل میں کون صاحبخانہ ہے

منزلِ دیر و حرم میں کون کھائے ٹھوکریں — سجدہ گاہ عاشقاں سنگِ درِ جانانہ ہے

ڈوبتا ہوں کہہ کے بسم اللہ بحرِ عشق میں — اب ترے ہاتھ آبروئے ہمتِ مردانہ ہے

انکو محفل میں یہ کہہ کہکر جلایا رات بھر — آپ کوئی شمع ہیں دشمن کوئی پروانہ ہے

وہ نگاہ گرم ہی سے دیکھ لیں قصہ تمام — سرمۂ چشم حسیناں طور کا افسانہ ہے

مِلگیا نقشِ قدم انکا تو دنیا مل گئی — ہم غریبوں کو درِ دشمن بھی دولتخانہ ہے

ہو گیا ثاقب اسی کی جستجو میں بے نشاں

نام سے جس بت کے واقف دل ہمارا تھا نہ ہی

ثاقب (بدایونی)

مخزن ایجنسی کا دوسرا ناول

اُبُومُسلِم خُراسانی

یعنی مشہور مصری رسالہ الہلال کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان (ممبر رائل ایشیاٹک سائٹی لندن) کی مقبول ناول ابومسلم خراسانی کا نہایت با محاورہ سلیس اُردو ترجمہ از مولوی محمد حلیم صاحب انصاری ردولوی جنکی ترجمہ کی ہوئی کتابیں مثل تمدن اسلام - وارمانوسہ - فتاۃ غسان وغیرہ ملک میں نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی ہیں +

اس ناول میں

قرون وسطی کی تدبیر ملکداری سلطنت بنی امیہ کی تباہی اور حکومت عباسیہ کی بنیاد - ابومسلم کی کارگذاریاں - ابومسلم کون ہے - وہ نامور مسلمان پالیٹیشن و بے مثل مدبر جسنے ایک صدی تک نہایت شوکت کیساتھ حکمران رہنیوالے خاندان بنی اُمیہ کو غارت کرکے بنی عباس کی خلافت قائم کردی - افسوس ایسے نامور مدبر کی اردو زبان میں کوئی ایسی مکمل سوانح عمری نہیں جس سے اُسکے اخلاق و عادات و تدبیر ملکداری کا پورا پتہ چل سکے -

علامہ مصری نے احسان کیا ہے کہ ابومسلم کی سوانح عمری حسن و عشق کے نمک کے ساتھ اس غور و تعمق کیساتھ تحریر کی - کہ قرون وسطی کے حالات کا نقشہ آنکھوں میں کھینچ جاتا ہے - اور اِسکے ساتھ ہی خلافت بنی امیہ کی کمزوریاں - خلافتِ عباسیہ کے ثبات کے اصلی راز ایسے دلچسپ زبان میں جو برسوں اسلامی تاریخ پر نظر ڈالنے کے بعد ملتا ہے +

فاضل مترجم نے اس ترجمہ کو اس پاکیزہ ادا کے ساتھ اپنی زبان اُردو میں لیا ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا - دلچسپی کا یہ عالم کہ ایک صفحہ دیکھنے کے بعد بغیر کتاب ختم کیے ہوئے ہاتھوں سے نہیں چھوڑ سکتے ناول کا حجم قریب ۵۰۰ صفحہ کے لکھائی چھپائی صاف سرورق خوشنما - باوجود ان تمام باتوں کے قیمت صرف (۱عہ) علاوہ محصول +

منیجر مخزن ایجنسی - دہلی سے مل سکتا ہے

البیان فی علوم القرآن

مصنفہ مولینا مولوی محمد عبد الحق صاحب دہلوی مفسر حقانی

ضرورت چاہتی تھی کہ بمقابلہ سائنس اور فلسفہ حال اسلام اور قرآن کے اصول نظریات وعملیات (خدا تعالیٰ کی ذات وصفات۔ فرشتہ مرنے کے بعد روح کا باقی رہکر بغیر تناسخ ایک دوسرے عالم میں جزا و سزا پانا۔ ثواب وعذاب قبر جنت و دوزخ۔ نبوت والہام۔ نبی کی روحانی قوت معجزہ وغیرہ) کو براہین سے ثابت کرکے جملہ شکوک وشبہات کا رد کر دیا جاوے۔ اور جملہ مذاہب کا اصلی حال بیان کرکے اُن کے باطل یا ناکافی مسائل سے ثابت کر دیا جاوے کہ وہ مذہب جو انسان کو جاودانی زندگی کا راستہ بتاتا ہے وہ صرف اسلام ہی ہے اور جس قدر قرآن اور نبی علیہ السلام اور اصول ومسائل اسلامیہ پر مخالفوں نے اعتراضات کرکے اسلام کی روشنی پر پردہ ڈالا ہے اُسکو جواب تحقیقی والزامی دے کر اُٹھا دیا جاوے۔ بفضلہ الحمد کہ ایسی کتاب جو ان سب باتوں کو حاوی اور زمانۂ حال کی ضرورتوں کو کافی ہو وہ اب مکمل ہو کر طیار ہے۔ کاغذ اعلیٰ صاف وخوشخط چھپائی۔ ۶۶۲ صفحہ حجم قیمت عہر

ملنے کا پتہ

محمد ابو الحسن۔ کوٹھی نواب لہارو۔ دہلی

آزمائش کیلئے مفت

ہیضہ۔ اسہال پیچش کی مجرب دوائی

بھیم سینی کافور

عوام الناس کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ

فوراً دوائی دافع ہیضہ ہم سے منگوا کر بطور حفظ ماتقدم گھر میں اپنے پاس موجود رکھیں اس دوائی سے اب تک سیکڑوں مواضع میں ہزاروں مریض ہیضہ وغیرہ امراض سے بالکل شفایاب ہو چکے ہیں۔

اور لطف یہ ہے کہ۔

صرف آٹھ آنہ میں ایک انسان کی جان بچ سکتی ہے۔

پس اپنی اور اپنے پیاروں کی عزیز جانیں جو کہ لاکھوں کروڑوں روپیوں خرچ سے بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اُنکے بچانے میں ذرا بھی توقف و تامل کرنا ہرگز ہرگز مناسب نہیں ہے جو لوگ فی سبیل اللہ غریب مریضوں کو دوائی دینا چاہیں اُنکے ساتھ خاص رعایت کیجائیگی

اور حضرت پیرزادگان و سجادہ نشینان و مولویان و اامامان مساجد و پنڈتان و پروہتان و ٹھاکر دوارہ دوہرم سالہ و واعظان واسلامی و ہنود و مسیحی و دیگر اصحاب مثل پٹواریان وہیہ وگرداوران جنکا تعلق پبلک سے ہو ان کو بطور نمونہ ایک شیشی صرف ۲؍ ٹکٹ برائے محصول ارسال کرنے پر مفت نذر کیجائےگی۔

اصل قیمت فی شیشی صرف آٹھ آنہ نصف درجن دو روپے (عہ۲؍) بارہ آنہ درجن۔ پانچ روپیہ

منیجر شفاخانہ ڈاکٹر حکیم غلام نبی زبدۃ الحکما لاہور پنجاب

دیش اپکارک اوشدھالیہ میں دوائی کی سریع التاثیری کے بھروسے پر نمونہ بھی دیا جاتا ہے فہرست طلب کر ملاحظہ فرماویں
ممکن ہے کہ ایک ہی دوائی کل امراض کا حکمی علاج ہو۔ صرف ایک چھوٹی سی شیشی ہر وقت ہر بیماری پر برتی جا سکتی ہے فہرست منگوا دیں
دیش اپکارک طبی اخبار ہندوستان بھر میں ایک ہی ہفتہ وار طبی اخبار ہے طرفہ یہ کہ چھپتا بھی سب سے زیادہ ہے "نمونہ مفت"
کے سلسلہ میں ایک رسالہ ہر دوسرے مہینے نکلتا ہے ایسے طبی مضامین لکھے جاتے ہیں جنکے جاننے کی ہر شخص کو ضرورت ہے۔ فہرست منگوا دیں
ہم [illegible] علاج بھی کرتے ہیں۔ جو صاحب ہمارے پاس آویں ان کو جگہ مفت رہنے کو دیتے ہیں اور دوائی بھی اگر چاہیں تو مفت
امرت کی دھار سچ مچ لاثانی دوائی ہے۔ جو ایک دفعہ منگواتا ہے ہمیشہ کے لئے اس کو اپنا یار بنا لیتا ہے
ہم ان کل امراض کا علاج خاص طور پر کرتے ہیں جو عام طور پر لاعلاج کہی جاتی ہیں۔ مفصل حالات لکھنے چاہئیں
ٹھاکر دت شرما وید مالک دیش اپکارک اوشدھالیہ ایڈیٹر دیش اپکارک و فیملی ڈاکٹر و مصنف رسالجات طبی لاہور چوک متی

فرمائش بحوالہ مخزن تحریر فرمائیگا اور اپنا نام و پورا پتہ معہ ڈاکخانہ خوشخط لکھیگا

نہایت مجرب گورے اور خوبصورت بننے کی دوا

یہ دوا ولایت کے ایک نامور ڈاکٹر کی بنائی ہوئی نہایت خوشبودار ولایتی پھولوں کا عرق ہے اس دوا کو ایک ہفتہ چہرہ و بدن پر ملکر نہانے سے سیاہ رنگت اور گالوں کی جھریاں جاتی رہتی ہیں مہاسے چھیپ وغیرہ دور ہوکر مخمل کے گلاب کے پھول کیطرح سرخ و سفید اور چمکیلا مخمل کے مانند ملائم ہوکر چہرہ چاند سا ہو جاتا ہے اور بدن سے خوشبو نکلنے لگتی ہے قیمت فی بوتل معہ محصولڈاک ۱۲؎ ۲ بوتل کے صرف ۲؎ ۳ بوتل کے ۳؎ اور گھڑی انعام دیجاویگی۔

گولیاں دافع امراض شکم

یہ گولیاں ضعف معدہ قبض دائمی بدہضمی کھٹی ڈکاریں تاب تلی وغیرہ کو دفع کرکے بھوک پیدا کرتی ہیں معدہ میں قوت لاتی ہیں بہت تیار کی گئی ہیں خوش ذائقہ قیمت ۱۲؎

روغن دافع امراض سر

کیسا ہی درد سر ہو یا چکر آتے ہوں یا خشکی ہو نیند نہ آتی ہو یا دماغ ضعیف ہوگیا ہو بعد استعمال کے سب کو نیست و نابود کر دیتا ہے اعلیٰ درجہ کا مقوی ہے قیمت فی شیشی ۸؎

سر و ہونیکا مصالحہ

اس مصالحہ سے جو سر کے بال دھو کر جاوینگے تو بال دراز و ملائم ہوجائینگے جڑیں بالوں کی مضبوط ہوجاوینگی خشکی دور ہوگی دماغ میں قوت آویگی بال سیاہ رہینگے اور خوشبو سے بسے رہینگے قیمت فی بکس ۱؎

منجن مستحکم دندان

کیسے ہی دانت ہلتے ہوں خون سوڑوں سے نکلتا ہو یا منہ سے بدبو آتی ہو اسکے ملنے سے سب تکلیف دور ہو جاویگی اور دانت مانند موتی کے آبدار ہو جاوینگے قیمت فی بکس ۸؎

حمائل شریف عکسی

یہ پورے تیس پارہ کی بالکل صحیح ایک چھوٹی ڈبیہ مثل تعویذ موجود ہے قرآن میں جو شرع زینت اور کے اوصاف اگر لکھے جاویں تو دفتر کا دفتر چاہئیں زیارت پر منحصر ہے واسطے حفاظت جان و مال کے اس سے بہتر کوئی تعویذ یا گنڈا نہیں ہو سکتا ہے تعویذ گلے میں یا بازو پر باندھ دو اور تلاوت کے واسطے اس ڈبیہ میں آتشی گلاس لگا ہوا ہے جس سے بڑے بڑے حروف نظر آتے ہیں یہ حمائل شریف قسطنطنیہ سے منگوائی ہیں بوجہ خریداری بہ لک کے یہ بہت ہی کم رکھا گیا ہے یعنی ۱؎

چینی موتیوں کے زیورات

ہمنے نئی طرز کے سنہری موتی نہایت خوشنما واسطے زیورات کے بکوشش ولایت سے منگوائے ہیں جو بالکل کندن کے معلوم ہوتے ہیں رنگ انکا پانی اور پسینے میں ہرگز خراب نہیں ہوتا ہمارے بنوائے ہوئے زیور کو آپ سنہری زیور میں پہناؤ اگر کوئی انکی شناخت کر دے تو قیمت نہیں جو نسی چیز چاہو بطور نمونہ منگوا کر ملاحظہ کرو قیمت بھی نہایت کم ہے

پہونچی جوڑہ	موہن مالا	تبیج گلے کی	ہار گلے کا
۱؎	۱۲؎	۱؎	۱۰؎

ایمبرائڈری مشین

بیکار شوقین مزاج مستورات کے لئے یہ مشین نہایت کارآمد فائدہ پہنچانیوالی چیز ہے اس مشین کے ذریعہ سے مخمل وغیرہ کی ہر ایک چیز پر بیل بوٹہ گلبول بہت تصویریں جانور وغیرہ بآسانی بموجب کتاب ہدایت کے بنا سکتی ہیں اور کتاب ہمراہ مشین کے بھیجی جاتی ہے قیمت معہ محصول صرف ۵؎

نوٹ۔ ہر ایک قسم کا سامان فرمائش آنے پر بکفایت بھیجا جاویگا

المشتہر محمد حبیب اینڈ کو نمبر (۱۶) مانک چوک شہر متھرا

شہنشاہ ہندوستان و انگلستان
ایک ہزار روپیہ نقد
تصدیق
پتہ: حکیم و ڈاکٹر چراغدین جوہر ایل۔ایم۔ایس
امرتسر

ایچ-ایم-مینیجر کارخانہ منبع فیض شہر دہلی علاقہ بلیماران

قطب صاحب کی لاٹھ

(س) قطب صاحب کی لاٹھ باوجود اسقدر کہنہ ہونے کے اُسیطرح محکم اور استوار کیوں ہی ؟ (ج) تحقیق بسیار کے بعد یہ معما اس طرح حل ہوا کہ اسکے بانی نے اسکی بنیاد کو زر کثیر صرف کرکے اسقدر محکم اور پائدار کیا کہ اسقدر عرصہ گذر جانے کے بعد پھر اُسیطرح قائم اور برقرار ہی - (ج) میرے عزیزو اگر آپ بھی اپنے قوٰی کی بنیاد کو پیری تک محکم رکھنا پسند کرتے ہوں یا اپنے بیش قیمت شباب کے شجر پُر ثمر کو سرسبز اور شاداب رکھنا چاہتے ہوں تو حلوا **بیضۂ مرغ** جسکا نسخہ احقر نے نہایت کوشش اور عرق ریزی سے بہم پُہنچایا ہی استعمال فرمائیے اس کے استعمال سے بوڑھے جوان جوان نوجوان نامرد مرد مرد جوانمرد ہو جاتے ہیں سُستی کمزوری لاغری - ضعف وغیرہ وغیرہ کے لئے تیر بہدف ہی ہر موسم میں اسکا استعمال مفید ہے لیکن موسم سرما کو اس ایسی مناسبت ہی جیسے خشک کھیتی کو باران سے ابھی موسم شروع ہی بہت جلد طلب فرمائیں قیمت فی سیر قسم اول ۴ قسم دوم ۲

حلوا ثعلب مصری مشک والا +

ثعلب مصری کے فوائد کا بیان اس مختصر اشتہار میں کس طرح آسکتا ہی ہمنے اس حلوے میں چند وہ ادویہ شامل کیے ہیں جو درحقیقت جواہرات سے تولنے کے قابل ہیں اگر آپ اپنی گئی ہوئی جوانی کو از سرنو واپس لانا چاہتے ہیں شباب کے پُرجوش ولولوں سے دل خوش کرنے کی آرزو رکھتے ہوں تو حلوا ثعلب مصری منگا کر استعمال فرمائیں بچپن اور شباب کی بے عنوانیاں جو انسان کو بالکل نکما کر دیتی ہیں اسکے لیے اس سے زیادہ زود اثر دوا ناممکن ہی اس کے استعمال سے آنکھوں میں روشنی اور بازوؤں میں قوت چہرے پر سُرخی بدن میں فرہی اور طبیعت کو سرور حاصل رہتا ہے چالیس روز اگر آپ اس کا استعمال کریں تو انشاءاللہ مدت العمر ضعف اعصاب کے شاکی نہ ہونگے زیادہ تعریف فضول قیمت فی سیر پانچ روپیہ (۵)

حلوا بادام

مغز بادام کا حلوا ایک خاص طور سے تیار کیا گیا ہی - دماغ کی حفاظت اور نگہداشت اسکا پہلا کام ہے اور ضعف اعصاب دماغ آنکھ کی بصارت کو قوی کرتا ہی دماغ کو قوت پہنچاتا ہی ضعف گردہ - ضعف مثانہ دور کرتا ہی معدہ اور اعصاب کو تقویت دیتا ہی گلو اور آواز کو صاف کرتا ہی دفتر اور کچہری والے یا جنکو لکھنے پڑھنے کا زیادہ شغل رہتا ہے اُسکے لئے اسکا استعمال نہایت فائدہ مند ہے قیمت فی سیر ۲ (دو روپیہ) نہایت عمدہ لاجواب ہے +

حلوا گزر عنبری

یہ حلوا ہمارے کارخانہ میں نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کیا جاتا ہی جس میں نہایت خوش ذائقہ اور لذیذ ہے ضعف قلب باطنی حرارت اندرونی گھبراہٹ ضعف دماغ چکر - دوران سر - وغیرہ کے لئے نہایت مفید ہے خون پیدا کرتا ہے مقوی اعضاء رئیسہ ہے قیمت فی سیر ۲

حلوا گزر زعفرانی

نہایت خوش ذائقہ تقویت قلب اور تفریح کیلئے نہایت بینظیر ہے - قیمت فی سیر ۱

کارخانہ کا پتہ (ایچ - ایم مینیجر کارخانہ منبع فیض شہر دہلی)

(علاقہ بلی ماران)

ممیرے کا سرمہ

مُصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل ایگزامینر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معززانگریزوں میڈیکل کالج کے پروفیسروں نامور ڈاکٹروں والیانِ ریاست اور ولایت کی یونیورسٹی کے سند یافتہ ڈاکٹروں نے بعد تجربہ اس سُرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ یہ سُرمہ امراض ذیل کے لئے اکسیر ہے۔ ضعفِ بصارت۔ تاریکیِ چشم۔ دُھند جالا۔ پڑوال۔ غبار۔ پھولا سیل سُرخی۔ ابتدائی موتیا بند۔ ناخنہ۔ پانی جانا۔ خارش وغیرہ معزز ڈاکٹر اور حکیم بجائے اور ادویہ کے آنکھوں کے مریضوں پر اس سرمہ کا استعمال کرتے ہیں چند روز کے استعمال سے بینائی بہت بڑھ جاتی ہے اور عینک کی بھی حاجت نہیں رہتی۔ بچے سے لیکر بوڑھے تک کو یہ سُرمہ یکساں مفید ہے قیمت اسلئے کم رکھی ہے کہ خاص و عام اس سُرمہ سے فائدہ اٹھا سکیں۔ قیمت فی تولہ جو سال بھر کیلئے کافی ہے۔ ؏ امیر کا سفید سُرمہ اعلیٰ قسم فی تولہ ے خالص ممیرہ فی ماشہ عہ مصری سُرمہ فی تولہ ؁ خرچ ڈاک ذمہ خریدار۔ منگواتے وقت اخبار کا حوالہ ضرور دیں۔ **المشتہر** پروفیسر میا سنگھ اہلووالیہ مقام بٹالہ ضلع گورداسپور

ان سے بڑھکر اور کیا معتبر شہادت ہوسکتی ہے

(۱) میں بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ ممیرے کا سرمہ جو سردار میا سنگھ اہلووالیہ نے ایجاد کیا ہے بڑی بیش قیمت اور مفید دوا ہے بالخصوص مفصلہ ذیل امراض کے لئے بمنزلہ اکسیر ہے۔ آنکھوں سے پانی کا بہت جانا۔ دُھند۔ سوزش ہر قسم جسکو آنکھ آنا کہتے ہیں جلن اور کمزوری نظر۔ ناخنہ باہر اور اندر کی جھلی کا زخم اور ان سے پیپ کا گرنا۔ چونکہ اس سُرمہ میں کوئی مضر کیمیاوی شے نہیں ہے۔ اسلئے ہر کسی کے لئے اس کا استعمال مفید ہے مفصلات میں جہاں لائق ڈاکٹروں کا ملنا مشکل ہے وہاں ایسی مفید دوا کو ضرور پاس رکھنا چاہئے۔ اس لئے میں صلاح دیتا ہوں کہ مذکورہ بالا امراض کیلئے ممیرے کا سرمہ ضروری ہی مفید ہے۔ راقم ڈاکٹر ایم۔ بی سانگلی صاحب بہادر ایم ڈی ایم۔ ایس سند یافتہ یونیورسٹی ایڈنبرگ انگلینڈ امرتسر

(۲) جناب سردار صاحب تسلیم میں نے آپکا ممیرے کا سُرمہ استعمال کیا میں تصدیق کرتا ہوں کہ بیشک یہ سرمہ کمزوری چشم کیلئے بہت مفید ہے۔ میری آنکھیں بالکل کمزور تھیں۔ لگاتار ایک پہر کام کرنے سے معذور ہو جاتا تھا۔ اب میری یہ کیفیت ہے کہ صرف ۴ روز کے استعمال سے تین تین پہر لگاتار اچھی طرح کام کر سکتا ہوں۔ راقم میاں خورشید مغل خلف نواب میر محمد خاں صاحب بہادر رئیس اعظم ریاست بہاولپور

پانچ ہزار روپیہ انعام { اگر کوئی شخص ممیرے کے سُرمہ کی اسناد میں سے جو زیر بیس ہزار کے ہیں ایک کو بھی فرضی ثابت کر دے تو اسکو مبلغ پانچ ہزار روپیہ انعام دیا جائیگا۔ جو لاہور کے بنک میں اسی مطلب کے لئے ... سے جمع کیا گیا ہے

جنوری ۱۹۰۸ء

مخزن

ایڈیٹر
شیخ عبدالقادر
شیخ محمد اکرام

اُردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

تصویر
نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی سی۔ آئی۔ ای
نیا سال۔ شیخ عبدالقادر ۱
فن موسیقی کا ماہر اُستاد۔ منشی محمد عنایت اللہ بی۔ اے علیگ ۔ ۹
صوبہ مالوہ کی سیر۔ مولوی سید احمد مارہروی ۱۷
امن و خوشی۔ منشی نذر محمد صاحب بی۔ اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس ۲۹
خط تقدیر "عالم خیال" ۳۵
کتاب۔ میرزا عابد حسین صاحب آگرہ ۔ ۴۲
تصویر قناعت۔ شیخ محمد اکرام ۴۵
حضرت کُن۔ خواجہ سید حسن نظامی دہلوی ۔ ۴۷
ماتھ کی لکیریں۔ منشی نور الدین عنبر از کشمیر ۵۰

نظم
نواب محسن الملک۔ شمس العلما مولینا حالی ۵۲
کلام اکبر۔ خان بہادر سید اکبر حسین ۵۳
میر۔ مولوی رضا علی وحشت از کلکتہ ۵۸
یاران ہمدم۔ منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی ۔ ۵۹
پیاس۔ منشی نذیر احمد کامل ۔ ۶۲
راز آشنائی۔ سید غلام مصطفٰے ذہین ۔ ۶۴
حضرت انسان۔ خانصاحب پیرزادہ مولوی محمد حسین ایم اے جوڈیشل ممبر کشمیر
نغمہ مستانہ۔ میر غلام بھیک نیرنگ بی۔ اے۔
تازہ غزلیں۔ شاد عظیم آبادی۔ سائل دہلوی۔ وحشت۔ عزیز لکھنوی۔ محمد علی جوہر بی۔ اے۔ نیرنگ۔ میرزا اعجاز۔ وفا سیتاپوری

دس کروڑ ہندوستانی اُردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اُردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اُردو مادری زبان ہے ▢ ان شہروں میں اُردو مروج ہے ⊙ ان شہروں میں اُردو سمجھی جاتی ہے

پشاور ۔ کشمیر ۔ لاہور ۔ دہلی ۔ لکھنو ۔ کانپور ۔ الٰہ آباد ۔ بنارس ۔ پٹنہ ۔ کلکتہ ۔ کراچی ۔ بمبئی ۔ حیدرآباد دکن ۔ مدراس ۔ بنگلور

باہتمام حاجی مظہر علیم مخزن پریس دہلی میں چھپ کر شائع ہوا

قیمت سالانہ مع محصولڈاک قسم اول (۳ روپے) فی پرچہ ۴ ۔/

سول ملٹری گزٹ لاہور کے مشہور اینگلو انڈین اخبار نے اپنے ۲۴ جنوری کے پرچے میں مقام خلافت پر ریویو کیا ہے جس کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"اردو میں قسطنطنیہ کے متعلق ایک دلچسپ کتاب موسوم بہ "مقام خلافت" ابھی شایع ہوئی ہے مسٹر عبدالقادر بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا۔ سابق اڈیٹر اخبار ابزرور۔ لاہور نے۔ اسمیں اپنی سیر دار الخلافہ سلطان روم کے مشاہدات بیان کئے ہیں اور وہاں کے بعض تاریخی مناظر کی دلکش تصویر کھینچی ہے۔ مسٹر عبدالقادر اپنے ماہوار رسالہ مخزن کے ذریعے اردو لکھنے میں خاص شہرت پیدا کر چکے ہیں اور یہ کتاب انکے طرز تحریر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ کتاب کی چھپائی صاف ہے اور اس میں تصاویر کثرت سے دیگئی ہیں اور اس اعتبار سے یہ اردو کی اُن کتابوں سے جو عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں نہایت ممتاز ہے کتاب کے آخری بابوں میں ٹرکی کی بعض انتظامی کمزوریوں کا تذکرہ ہے اور اسکے مستقبل کی نسبت بحث ہے اور مصنف کی رائے میں مستقبل کی حالت تاریک یا یوس کن نہیں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے استانبول میں اپنے مختصر زمانہ قیام سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور وہاں کی چیزوں کو غور سے دیکھا ہے۔ ٹرکی کی اخبار ی دنیا پر انکی نگاہ خاص دلچسپی رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ خود صاحب اخبار ہیں۔ انہوں نے استانبول میں بہت سے بڑے بڑے عہدہ داران دولت عثمانیہ سے ملاقاتیں کیں اور نیز سفارت انگریزی کے ارکین سے وہ ملے جنمیں سر نکولس اوکانر سفیر انگریزی سے انکی ملاقات خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ ان سب ملاقاتوں کا حال مصنف کے روزنامچہ میں درج ہے جو کتاب کا ضمیمہ ہے۔ اس کتاب کی ضخامت تین سو صفحے سے زائد ہے اور یہ قیمت ۲ مخزن پریس۔ دہلی سے مل سکتی ہے۔"

Mr. Sayid Husain Bilgrami, C.S.I.

نیا سال

۳۱ دسمبر کو میں ایک لنبے سفر سے واپس آکر رختِ سفر کھول رہا تھا کہ رات کے بارہ بجے - پُرانے سال کی عمر کا خاتمہ ہوا - اور نئے سال نے اُسی ساعت جنم لیا - ایک کے گذرنے کا غم دوسرے کے آنیکی خوشی - دو متضاد چیزیں یکجا ہوئیں - گرجا کا گھڑیال پیہم بجنے لگا - گویا زبان حال سے کہہ رہا ہے - جانیوالے تڑا خدا حافظ - آنیوالے تجھے مرحبا - ٹنی سن نے کیا خوب لکھا ہے - " بجاؤ گھڑیال کہ پُرانا سال گیا - بجاؤ گھڑیال کہ نیا سال آیا " گھڑیال ہے کہ دونو خدمتیں بے تکلف انجام دے رہا ہے - اِسکے لئے نغمۂ خوشی اور نالۂ غم دونو برابر ہیں - آواز ایک ہے - سننے والے اپنے اپنے خیال کے مطابق معنے لیتے ہیں - جو گزرنیوالے پر افسوس کر رہے ہیں - وہ سمجھتے ہیں کہ گھڑیال کی آواز کیسی رقّت پیدا کرنیوالی ہے - انہیں گھڑیال کی آواز وداع کے رنج و جدائی کے صدمے سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے - لیکن وہی آواز بعض دوسرے کانوں میں ہنگامۂ شادی

رہے ۔ نئے سال کی آمد آمد ہے ۔ اور مبارکباد کا غل ۔ ہیں نہ سال کہن کے ماتمیوں میں تھا ۔ نہ سال نو کے خوشامدیوں میں ۔ فلسفیانہ طریق سے ایک طرف اُن خیالات کو ٹال رہا تھا ۔ جو ایسے وقت ہجوم کرکے آتے ہیں ۔ سال گذشتہ میں کیا کرنا باقی رہ گیا ۔ اور دوسری طرف اُن بیشمار اُمیدوں اور آرزوؤں کو روک رہا تھا ۔ جو سال نو کے ساتھ لگی ہوئی آتی ہیں اور خانۂ دل میں سما جاتی ہیں اور کچھ عرصے کے بعد زمانے کی ناموافقت سے اکثر زمانے کی مایوسی سے بدل جاتی ہیں ۔ اس اندرونی کشمکش میں طبیعت نے ایک شعر سے مدد چاہی اور میں اسپر غور کر رہا تھا اور اپنے خیال میں محو تھا ۔

آساں گزراں کار جہانِ گزراں را　　　　زیرا کہ خردمندِ جہاں خواند جہان را

کہ اتنے میں ایک دوست نے کہا "سالِ نو خوش باد" اس آواز کا کان میں پڑنا تھا ۔ کہ سالِ کہن کی یاد تازہ ہوئی ۔ اُس مرحوم کا پہلا دن مجھے غربت میں آیا تھا ۔ یہ برس وطن میں شروع ہوتا ہے ۔ مگر غربت بھی اپنے مزے رکھتی تھی ۔ نئے دن اور نئی ملاقاتیں ۔ چار دن کی جان پہچان ہی کیا ہوتی ۔ اسپر کئی مسافر نواز ملاقاتیوں کو از راہِ انسانیت یہ خیال آ گیا کہ جہاں اپنے خاص دوستوں اور عزیزوں کو نئے سال کی مبارکباد بھیجیں ۔ ہمیں کسی غریب الوطن کو بھی ایک رقعہ بھیجدیں ۔ صبح اُٹھتے ہی رنگین اور خوبصورت رقعے آنے لگے ۔ ایک سے ایک کا رنگ نرالا ۔ کوئی پُر تکلف کوئی سادہ ۔ کوئی سنہری ۔ کوئی روپہری ۔ کسی پر فیتا ۔ کسی پر ریشمی ڈورا ۔ اندر باہر دلاویز عبارتیں ۔ نظم و نثر میں لکھی ہوئیں ۔ جس لفافے کو کھولو ۔ سال نو میں کامیاب اور خوش رہنے کی دعائیں آ رہی ہیں ۔ پردیس میں معمولی روشناسوں کی یہ مروت گرویدہ کئے لیتی تھی ۔ صرف یہی نہیں ۔ مشغلہ کتنا اچھا تھا ۔ کہ ہر رقعہ پر غور کرنے سے بھیجنے والی کی طبیعت کا حال کھلتا تھا ۔ خط کے بیل بوٹے فرستندہ کے مذاق

کا پتہ دیتے تھے ۔ جو فقرات یا اشعار خطوں پر چھپے ہوئے تھے وہ بھیجنے والوں کے جذبات قلبی کا اظہار کرتے تھے ۔ یورپ میں جہاں نئے سال کی خوشی منانے کا یہ طریق مروّج ہے ۔ وہاں یہ بھی رسم ہے کہ ہر شخص اُن رقعوں کو جو اسے بڑے دنوں میں اور نوروز کے دن آئے ہیں اپنے ہال نشست کے کمرے میں سجاتا ہے ۔ خود اُن کی بہار دیکھتا اور آنے جانے والوں کو دکھاتا ہے ۔ مینے بھی اپنا مختصر سا سرمایہ اپنے کمرے میں رکھ دیا تھا ۔ ایک ایک پیام مروّت یا محبت کو دیکھتا تھا اور پھڑکتا تھا ۔ اور چاہتا تھا ۔ کہ ہر ایک کا جواب بھی ویسا ہی دیا جائے ۔ دُکانوں میں سیکڑوں نمونوں کے رقعے چھپے چھپائے رکھے ہوتے ہیں ۔ اُن میں سے ہر شخص کے مناسب حال رقعے چنتا تھا اور بھیجتا تھا ۔

یہ دلچسپ رسم صرف ایک پرانے رواج کی پابندی ہی نہیں بلکہ کچھ فائدے بھی رکھتی ہے ۔ ملاقاتوں کی فہرست کی سالانہ جانچ پڑتال اور تجدید ۔ دوستوں میں رابطہ اتحاد کی مضبوطی ۔ اور کم از کم ایک آدھ دن کے لئے معمولی دھندوں کے افکار سے سبکدوشی ۔ ساتھ ہی تجارت کا ایک صیغہ انہی رقعوں کی اشاعت اور تقسیم سے نکل آیا ہے ۔ اب کے سال ہندوستان میں وہ سب مشغلہ خواب و خیال ہو گیا ۔ یہاں ابھی یہ چرچے ہی نہیں ۔ نوروز کے مشرقی طریق کے جشن عہد مغلیہ کے ساتھ رخصت ہو گئے ۔ انگریزی طریق میں مغائرت کی جھلک پائی جاتی ہے ۔ اور بغیر مناسب تغیرات کے سوائے انگریزی داں طبقے کے اور کسی جماعت میں یہ طریق مقبول نہیں ہو سکتا ۔ چند سالوں سے بعض لوگ عید کے موقعے پر اس قسم کے پیغام ایک دوسرے کو بذریعہ ڈاک بھیجنے لگے ہیں ۔ مگر ابھی یہ شوق محدود ہے ۔ اسکے علاوہ یہ سب دولت کے چونچلے ہیں اور ہندوستان جیسے غریب ملک میں جہاں ضروریات زندگی کا پورا ہونا مشکل ہے ۔ ابھی تفریحات کے لئے سرمایہ کہاں سے

آسکے۔

نئے سال کے آتے ہی ایک اور بات۔ پُرانے سال کی یاد آئی۔ یعنی نئے سال کے تحفے۔ دنیا بھر میں یہ دستور ہے کہ دوست دوستوں کو کوئی چیز بطور تحفہ پیشکش کرتے ہیں۔ اسکے لئے مختلف تقریبیں ہیں۔ ہمارے ہاں مذہبی تیوہاروں پر کھانے پینے کی چیزیں اور بعض دفعہ نقد وجنس عزیزوں رشتہ داروں اور دوستوں کے ہاں بھیجنے کا رواج ہے۔ ایسا ہی شادی بیاہ کے موقعہ پر ہوتا ہے۔ یورپ میں اس قسم کے مذہبی تیوہار جیسے ہمارے ہاں ہوتے ہیں نسبتاً کم ہیں۔ اور جو کچھ ہیں ان کے منانے کی طرز جدا ہے۔ البتہ بڑے دنوں اور نوروز کی تقریب پر یا شادی بیاہ کے وقت تحفے بٹتے ہیں۔ مگر اس رسم کو جس خوبی سے وہ ادا کرتے ہیں۔ وہ اُن کا حصہ ہے۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ جو باتیں ہمارے ہاں خاص خاص گھروں میں اور ممتاز لوگوں کے ہاں نظر آتی ہیں وہ وہاں رواج عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں اور ہر کہ ومہ اپنے مقدور کے موافق اسی وضع کا پابند ہے۔ یعنی وہاں تحفہ دیتے وقت اس بات کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے کہ موقعہ کیا ہے اور جسے تحفہ دیا جاتا ہے وہ کون ہے۔ چنانچہ نئے سال کے تحفوں میں بہت چھوٹے بچوں کو طرح طرح کے کھلونے دئے جاتے ہیں مثلاً لڑکیوں کو گڑیاں اور لڑکوں کو چھوٹے چھوٹے گیند بلے۔ اُن سے ذرا بڑے بچوں کو جنھوں نے لکھنا پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ کہانیوں کی کتابیں دی جاتی ہیں۔ یہ کتابیں خاص اہتمام سے تیار کی جاتی ہیں۔ جلد خوبصورت۔ تصویریں دلچسپ۔ عبارت آسان۔ زبان سادہ۔ اور قلم جلی۔ تاکہ بچوں کو پڑھنے میں کچھ دقت نہو۔ نوروز کے موقعہ پر لاکھوں ایسی کتابیں ایک دن میں بک جاتی ہیں۔ اور اُن سے بچوں کو خوشی بھی ہوتی ہے اور تعلیم کا شوق بھی بڑھتا ہے۔ جو لڑکے لڑکیاں

سن بلوغ کے قریب ہیں اور سکول میں پڑھتے ہیں۔ اُنکے لئے اور کتابیں ہیں۔ اپنے علم ادب کی مشہور ترین کتابوں کے عمدہ عمدہ اڈیشن خاص اس مطلب کے لئے نکالتے جاتے ہیں۔ چھپائی نفیس۔ جلد پرتکلف۔ کناروں پر سنہری رنگ جلد کے اوپر سنہری حروف۔ کتاب کو سجا کر دلہن بنا دیا جاتا ہے۔ اور ایسی جلدوں کو تحفے کے لایق جلدیں کہتے ہیں اور عموماً یہی کام اُنسے لیا جاتا ہے اور حقیقت میں ایک علم دوست آدمی کے لئے اس سے بہتر تحفہ کیا ہو سکتا ہے۔ کہ کوئی عمدہ کتاب خوبصورت جلد سے آراستہ ہو کر اسکے پاس پہنچ جائے۔ اور اسکے مجموعۂ کتب کی زینت کا باعث ہو۔

بڑے بوڑھے اظہار دوستی اور یگانگت کے لئے مختلف قسم کے تحفے ایک دوسرے کو بھیجتے ہیں۔ مگر ہر شخص یہ احتیاط کرتا ہے۔ کہ تحفہ کارآمد ہو اور جسکے پاس بھیجنا ہو اسکے مذاق کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر تحفے کے لئے کتابیں انتخاب کرے تو سوچتا ہے کہ کونسی کتاب کس دوست کو پسند ہو گی۔ بعض لوگ اس انتخاب میں اپنے مذاق کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ مثلاً اگر مذہب کی طرف اُن کا میلان زیادہ ہو تو مذہبی کتاب انتخاب کرتے ہیں۔ تاکہ دوست کو تحفہ بھی چلا جائے۔ اور وہ یہ کوشش بھی کرلیں کہ اُن کا دوست اُن کا ہم مذاق ہو جائے۔ مگر اس کوشش میں رسم تحفہ کی خوبی آدھی رہجاتی ہے۔ بہرحال اس ذریعے سے یورپ کے سب ملکوں میں بالعموم اور انگلستان میں بالخصوص ملکی لٹریچر کی اشاعت میں نہایت معقول ترقی ہوتی ہے۔ اور نہ صرف پرانے مصنفوں کی یاد تازہ رہتی ہے۔ بلکہ اہل مطابع اور تاجران کتب کی تجارت کو ایسا فروغ ہوتا ہے۔ کہ بایدو شاید۔

ہمارے ابنائے وطن کا تعلیم یافتہ اور معقول پسند طبقہ اس بات کو تو ضرور تسلیم کرے گا کہ نئے سال کی خوشی منانے کا کوئی نہ کوئی طریق تعلیم یافتہ جماعت کے لئے

بھی ہونا چاہئے۔ پرانی وضع کے لوگ ہر موسم کے تغیر پر کسی نہ کسی مذہبی تقریب کے بہانے کچھ نہ کچھ سامان خوشی کرتے ہیں۔ ابتک بسنت کے میلے ہندوستان کے باشندوں کے لئے نوروز ہیں۔ مگر تعلیم یافتہ جماعت عموماً ان میلوں کی تفریحات میں نہ شریک ہوتی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ انہیں اپنے لئے کوئی نئے رستے نکالنے چاہئیں۔ یہ نہ ہو کہ ادھر سے بھی رہجائیں اور ادھر سے بھی۔ تعلیم کا یہ نتیجہ ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ تعلیم یافتہ لوگ مردہ دل ہو جائیں۔ یا کثرت تردوات سے ناجائز یا نامناسب طریقے غم و فکر دور کرنے کے ڈھونڈھنے لگیں۔ اور صرف پرانے طریقوں کو برا کہنے یا اُن کو نظر حقارت سے دیکھنے پر اکتفا کر کے یاس و نومیدی کو اپنا شعار بنالیں۔ جب اُن سے کہا جائے کہ فلاں رسم قابل ترمیم و اصلاح ہے تو بجائے اصلاح یا ترمیم کی کوشش کرنے کے نہایت مایوس ہو کر یہ کہدیں۔ "وہ ہمارے ملک میں اصلاح ہو چکی۔ اس کا تو کسی دن اسی طرح سختیاں جھیلتے جھیلتے خاتمہ ہو جائے گا" بلکہ اُن کا یہ فرض ہے۔ کہ امید کا پیام اپنے ہموطنوں تک پہونچائیں۔ اپنی زندہ دلی قائم رکھنے کے لئے جائز خوشیوں اور مفید تفریحوں کے سامان اپنے گرد و پیش جمع کریں اور اپنی مثال سے دکھلائیں کہ انہوں نے تعلیم سے کیا کچھ فائدہ اٹھایا۔ تاکہ اور لوگوں کو اُن کی تقلید کی ترغیب ہو۔ آجکل ہندوستان میں ملکی علم ادب کی ترقی کی صدا ہر طرف بلند ہے۔ اور ہر شخص کہتا ہے کہ یہ ترقی خدا اسے جلد دکھلائے۔ مگر اس ترقی کے لئے جس قدر محنت اور کوشش درکار ہے۔ اس کے لئے بہت کم لوگ مستعد ہیں۔ ہمارا پہلا فرض ہے کہ ہمارے ہاں جو لٹریچر موجود ہے۔ پہلے اسے ایک باقاعدہ اور منضبط

حالت میں لے آئیں۔ اگر کسی دوسرے ملک کا آدمی ہم سے ہمارے بہترین مصنّفوں کی کتابیں دیکھنے کے لئے مانگے۔ تو ہم بجز چند ردی کاغذ پر غلط اور بدنما چھپی ہوئی سستی اور بے جلد کتابوں کے اوراق پریشاں کے سوا کیا دکھا سکتے ہیں اور وہ جب اپنے ہاں کی کتابوں کی ظاہری حالت سے ہماری کتابوں کی ظاہری حالت کا مقابلہ کرے گا تو اُسکے دل پر کیا اثر ہمارے لٹریچر کے متعلق پڑے گا۔ اور ہمیں کس قدر شرم آئے گی۔ اِن کتابوں کو صاف اور خوبصورت وضع میں چھپوانا اور اُن کو اپنے کتب خانوں میں جمع کرنا اور اُن کو غور سے پڑھنا ایک ذریعہ ہے نیا لٹریچر ملک میں پیدا کرنے اور بڑھانے کا۔ اگر ہم محض شوق علم سے اِس کے لئے کچھ اہتمام نہیں کر سکتے۔ تو کم از کم کسی دلچسپی کے بہانے سے دوستوں کے خوش کرنے کی غرض سے۔ یورپ کی ایک مفید رسم کی تقلید ہی سے روز نوروز کو ہی ملکی لٹریچر کی سرپرستی کی تقریب بنالیں۔ اور نئے سال کی خوشی تعلیم یافتہ جماعت میں علمی ذخیروں کی تقسیم سے منائی جایا کرے اگر اِس تحریک کا جو اسی دفعہ سال انگریزی کے شروع میں پیش کی گئی ہے۔ یہ اثر ہو۔ کہ آیندہ سال کے نوروز تک ہمارے ہاں کی مقبول کتابیں یا کم از کم اُن میں سے پندرہ بیس جلدیں صحت اور عمدگی کے ساتھ طبع ہو جائیں اور قدردانوں کے ہاتھوں میں موجود ہوں۔ یا سالِ نو کی ڈاک کے ساتھ تقسیم ہوتی نظر آئیں تو یہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ یہ سال جدید ہمارے لٹریچر کے لئے ایک عہدِ جدید کا آغاز ہوگا۔ اور اِس مرتبہ سالِ نو کی پیدائش کے وقت جو آرزوئیں اُسکی جلو میں آئی تھیں۔ سب کی سب مبدّل بہ یاس نہ ہونگی۔ اکثر لوگ نئے سال کی مبارک صبح کو قبول دعا کا وقت سمجھکر دعا مانگتے ہیں۔

لٹریچر کے اِس ادنیٰ خادم کی یہ دُعا ہے کہ " ہمارے لٹریچر کی ترقی" ہمارے نئے سال کا بہترین تحفہ ثابت ہو۔

عبدالقادر

نواب عمادالملک مولوی سید حسین بلگرامی صاحب بہادر- بی-اے- سی-آئی-ای

جن کی تصویر ہم آج شایع کرتے ہیں۔ اُن معدودے چند بزرگوں میں ہیں جنکی ذات پر ہندوستان کی علمی دنیا ناز کر سکتی ہے۔ اُنہوں نے باوجود مناصب جلیلہ کی مصروفیتوں کے تمام عمر مشاغل علمی کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ حیدرآباد (دکن) کے محکمہ تعلیم کے افسر اعلےٰ ہونیکی حیثیت سے جو حصہ اُنہوں نے ریاست کی تعلیم میں لیا۔ وہ محتاج تعریف نہیں مگر یہ ضرور قابل اعتراف ہے کہ اُنہوں نے اپنی کوشش کو حدود ریاست تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ ملک کی دیگر تعلیمی کاموں خصوصاً مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس کی وہ ہمیشہ خدمت کرتے رہے۔ آپ عربی فارسی کے عالم متبحر- زبان انگریزی کے فاضل ادیب اور اُردو کے مستند انشا پرداز ہیں۔ اِس جامعیت پر یہ خوبی کہ جس زبان کو لیا حد کمال تک پہنچا دیا۔ انگریزی میں نثر تو دلپذیر لکھتے ہی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اُن کی انگریزی نظمیں بھی اعلیٰ درجے کی ہیں۔ اُردو لٹریچر کے بڑے قدردان اور سرپرست ہیں۔

زمانہ حال میں شاید کوئی ضروری کتاب اُردو میں ایسی شایع ہوئی ہو جو آپ کی نظر سے نہ گذری ہو۔ یا جسکے مصنف کو آپ سے کچھ نہ کچھ فائدہ نہ پہونچا ہو۔ ریاست حیدرآباد کی طرف سے جو سرپرستی بعض مشہور مصنفین اُردو کی ہوتی رہی ہے۔ اُس میں آپ کی کوششوں کو بہت کچھ دخل ہے۔

ایک زمانہ میں نواب ممدوح خود رسالوں میں مضمون لکھتے تھے اب گو کثرت کار نے وہ شغل چھڑا دیا۔ مگر عمدہ رسالوں سے دلچسپی ضرور باقی ہے۔ مخزن کے حال پر اسکے جاری ہونے کے زمانے سے اب تک انہیں توجہ رہی۔

آجکل اُن کی تصویر اور بھی دلچسپ ہے۔ کیونکہ انہیں نوروز کی تقریب پر خطاب سی-آئی-ای- عطا ہوا ہے۔ اور وہ حال ہی میں انڈیا کونسل میں صاحب وزیر ہند بہادر کے مشیر مقرر ہو کر انگلستان تشریف لے گئے ہیں۔

فن موسیقی کا بہرا اُستاد

آسٹریا کے ملک میں لوی وان بٹ ہوؤن فن موسیقی کا بڑا استاد گذرا ہے - ۱۶ دسمبر ۱۷۷۰ء کو شہر بون میں پیدا ہوا اور ۵۶ برس زندہ رہکر ۲۶ مارچ ۱۸۲۷ء کو وائنا شہر میں مرا - ان دونوں شہروں میں اُسکی سنگین مورتیں نصب ہیں جو اوسکی عزت اور شہرت کی دلیل ہیں - اس صاحب کمال نے علم موسیقی میں بہت سی تصانیف چھوڑیں جنکی قدر یورپ میں ابتک کیجاتی ہے - اوسکی زندگی کا عجیب واقعہ تھا کہ ۲۶ برس کی عمر تک پہونچا تو بالکل بہرا ہوگیا - اگرچہ یہ مصیبت سب کے لئے سخت ہے - لیکن ایسے شخص کے لئے جسکی زیست کا مقصد اور زندگی کا لطف محض کانوں اور عمدہ آوازوں کو قواعد موسیقی کی پابندی کے ساتھ خود ایجاد راگوں اور راگنیوں میں ترتیب دینے پر منحصر ہو اُسکے لئے اس سختی کی کوئی انتہا نہیں رہتی - غرض بیس برس اسی غم اور بے بسی میں کاٹے یہانتک کہ زندگی ختم ہوئی - لیکن اس حال میں بھی شوق جاری رہا اور بڑی قابل قدر چیزیں اپنے فن میں ایجاد و تصنیف کر گیا - ذیل کا مضمون ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے - اس میں وہ چند واقعات درج ہیں جو موت سے پانچ چھ روز پہلے اوسپر گذرے تھے (عنایت اللہ)

مارچ ۱۸۲۷ء کی بیسویں تاریخ تھی کہ ملک آسٹریا کے شہر بیڈن میں ایک بڑی عمر کا آدمی گھر میں پریشان بیٹھا سفر کی تیاری کرتا تھا - صندوق میں سے کپڑے نکال کر ایک بیگ میں رکھ رہا تھا - موسم بہت سرد تھا - دروازوں کے شیشوں پر برف جم گئی تھی - گھر کے اندر آتشدان میں دو چار لکڑیاں جلکر راکھ ہو چلی تھیں - زیادہ لکڑیاں

لگا کر آگ کو تیز کرنے کا خیال یا تو اسلیئے نہ آیا کہ اس غریب کا دل اسوقت کسی سخت الم میں مبتلا تھا - یا یہ خیال ہوا کہ سفر درپیش ہے - سرمایہ قلیل ہے - کفایت شعاری کرنی چاہیئے - گھر کی صورت سے بھی افلاس ظاہر تھا - اسباب میں فقط ایک مسہری تھی جسپر پھیکے رنگ کے سبزاونی پردے پڑے تھے - دو چار پُرانی وضع کی کرسیاں تھیں جنکی پوششیں پُرانی ہوکر خراب ہوگئیں تھیں - باقی ایک میز تھی اور ایک باجا تھا جسکو ہارپ سی کورڈ کہتے ہیں - میز پر بہت سے کاغذ پریشان پڑے تھے جن پر موسیقی کی علامات میں گیتیں[ا] لکھی تھیں - ایک ورقہ پر کچھ مٹے کٹے حرف تازے لکھے نظر آتے تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ اس سے کچھ دیر پہلے وہ کسی کام میں مصروف تھا - اس ویران گھر کے رہنے والے کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان تھی - مصائب نے گو پشت کو خم کر دیا تھا - لیکن بلند پیشانی پر جو عقل و ذہانت سے روشن تھی سفید بالوں کی روپہلی لٹیں بکھری رہتی تھیں - آنکھوں میں وہ چمک اور خلقت کی گرمی تھی گویا سیاہ رنگ کے شعلے روشن ہیں - چہرہ زرد و سفید تھا اور رخساروں کی کسی قدر سُرخی کو زیادہ تیز کر کے دکھاتا تھا - جب سفر کا ضروری سامان بیگ میں رکھ لیا تو میز کے قریب آیا جسپر ایک خط پڑا تھا - شہر وائنا کے ڈاکخانہ کی اوسپر مُہر تھی - خط اوٹھا کر دیر تک اوسکو پڑھتا رہا حالانکہ مضمون صرف اسی قدر تھا -

پیارے چچا - پہلے تو اُس تکلیف و رنج کی معافی چاہتا ہوں جو اسوقت آپ کو دیتا ہوں اور پھر یہ عرض کرتا ہوں کہ ایک جرم میں عدالت سے حکم ملا ہے کہ وائنا سے شہر بدر ہو جاؤں - اسلیئے آپ سے درخواست ہے کہ میری مدد کیجیئے - آپ ہی صرف مجکو اس سزا سے بچا سکتے ہیں - راقم جان -

جب ایک دفعہ اس خط کو اور پڑھ لیا تو سفر کا ارادہ مصمم ہوگیا - ایک ہاتھ میں بیگ

[ا] گت کی جمع -

اور دوسرے میں لکڑی لیکر وانا کو چلنے کی ارادہ سے اُٹھا۔ لیکن جب دہلیز پر پہونچا
تو مڑ کر حسرت سے اوس اُجاڑ اور بے سامان گھر کو دیکھا جسمیں مدت تک امن و عافیت
کے ساتھ زندگی بسر کی تھی۔ دل سے ایک آہ نکلی اور فوراً گویا کسی سحری کشش سے
مجبور ہو کر اپنے باجے کے قریب چلا آیا۔ اور جو کچھ ہاتھوں میں تھا پھینک کر باجے کے
پردوں پر اُنگلیاں دوڑانے لگا۔ آوازیں بلند ہوئیں۔ افسردہ چہرہ انتہائے مسرت کے
اثر سے خود بخود شگفتہ و روشن ہوتا گیا اور ساز کی جاں فزا صدائیں آسمان کی طرف بڑھیں
جو حقیقی وطن خدا کی تعریف کا ہے۔

جب اس عالم ترنم میں محو ہوا تو معلوم ہوتا تھا کہ آج اوسکی روح اپنے قالب اور
اس جہان سے نکل کر صبر و اطمینان کی تلاش اوس عالم میں پہونچی ہے جو سب سے بالا ہے
کچھ دیر کے بعد باجا تھم گیا۔ بڈھے کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے اور ایک آہ سرد
بھر کر چلایا۔

"ہائے میں۔ اور کانوں سے معذور ہو جاؤں! کوئی آواز بھی نہ سن سکوں"

افسوس۔ کہ فن موسیقی کا یہ ماہر بالکل بہرا تھا۔

مسافر غریب نے پھر عصا اُٹھایا اور گٹھڑی اٹھا منزل طے کرنے کا ارادہ کیا۔ گھر
سے نکلا۔ مگر سڑک کے موڑ پر جب پہونچا تو ایک دفعہ پھر حسرت کی نگاہ سے اوس گھر
کی طرف دیکھا جہاں دس گیارہ برس ہونے کو آئے تھے کہ قصور سماعت نے دنیا کی
آوازوں سے محروم کر کے گوشۂ تنہائی میں بٹھا دیا تھا۔ اب کہ قوت سامعہ بالکل معطل تھی
موسیقی اور موسیقی کی لذتیں اوسکی روح میں متمکن تھیں۔ غرض شہر سے نکلکر جنگل اور
دیہات میں گذر ہوا۔ تنگ دستی نے مجبور کیا تھا کہ سفر پیدل کیا جائے۔ منزل ختم
نہوئی تھی کہ رات ہو گئی۔ جب اندھیرا زیادہ ہوا تو چلتے چلتے ایک گاؤں میں ایک دہقان
کی جھونپڑی کے سامنے ٹھیر گیا۔ سمجھا تھا کہ رات ہونے سے پہلے وانا پہونچ جاؤنگا۔

جو بیڈن سے ۳۰ میل تھا۔ بڑی ہمت سے رستہ کاٹا۔ لیکن آخر کار رات آگئی اور چلنے کی قوت نے جواب دیدیا۔ مجبور دہقان کے دروازہ پر دستک دی۔ اندر سے ایک کمسن لڑکی نکل آئی اور پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ لڑکی نے جو کچھ کہا اوسکو مسافر نے نہ سُنا۔ لیکن لبوں کی حرکت سے سوال معلوم کیا اور جواب دیا۔ اے پیاری لڑکی میں مسافر پروری چاہتا ہوں۔ لڑکی نے یہ سُنتے ہی کہا۔ اچھا آپ اندر چلے آئیے۔ میرا باپ تو شب گرفتہ مسافروں کی ہمیشہ خاطر و مدارات کرتا ہے۔ جب اس طرح دل سے تواضع ہوئی تو مسافر گھر میں داخل ہوکر بڑے کمرے میں پہنچا۔ جہاں غریبوں کا سیدھا سادا کھانا گرم گرم میز پر چنا تھا۔ اور سارا کنبہ میز کے گرد بیٹھا تھا۔ لڑکی نے جلدی سے باپ کے قریب مہمان کے لئے میز پر ایک اُجلا رومال بچھا دیا اور مہمان بھی اُسی میز پر کھانے ہو بیٹھا جس پر سارا کنبہ کھانے بیٹھا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوکر مہمان آتشدان کے قریب جا بیٹھا۔ جہاں جاڑے میں راحت پہونچانے والی آگ خوب روشن تھی۔ ماں اور بیٹی نے جلدی سے میز پر سے کھانے کی چیزیں ہٹالیں اور دہقان نے اپنا پُرانا ہارپ سی کورڈ باجا کھولا اور تینوں لڑکوں نے اپنے اپنے ساز دیوار پر سے اُتار لئے۔

باپ بیٹوں نے باجوں کو ملایا اور ماں بیٹی اپنا اپنا کام لے کر آگ کے پاس جا بیٹھیں جہاں اکیلے ایک چراغ نے سارے گھر میں اُجالا کر رکھا تھا۔ باپ نے شروع کرنے کے لئے لڑکوں کی طرف اشارہ کیا اور چاروں نے ملکر ایک گت اُس خداداد ملکہ اور خوبی کے ساتھ بجانی شروع کی جو خاص اہل جرمنی کو اور مقاموں کے مقابلہ میں حاصل ہے۔ رفتہ رفتہ انکی آنکھیں چمکنے لگیں۔ طرح طرح کی حرکات چہروں سے ادا ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ سب کو اسدرجہ محویت ہوئی کہ گویا اِس عالم ہی میں نہ تھے۔ دونوں عورتیں دم بند کئے راگ سنا کیں۔ یہانتک کہ جو کچھ ہاتھوں میں تھا زمین پر گر پڑا۔ باجے

بھی آخر کار بند ہو گئے - اور مسرت آمیز نگاہیں ایک سے دوسرے پر اپنا کام کرنے لگیں - لڑکی اٹھی اور باپ کے سفید سر کو محبت کے جوش میں چومنے لگی - اور سب اسبات کو بھول گئے کہ ایک غیر بھی اسوقت گھر میں موجود ہے - مہمان خاموش بیٹھا یہ سب کیفیتیں محبت کی نگاہ سے دیکھتا رہا - لیکن بہرے کانوں نے ایک آواز بھی ان دلکش نغموں کی نہ سُننے دی تھی جنہوں نے اُسکے غیب میزبانوں پر اس قدر اثر کیا تھا -

آخر کو نہ رہ گیا اور کانپتی آواز سے بڑھے مسافر نے کہا -

"اے میرے مہربانو - تم بڑے قسمت والے ہو کہ راگ سُن سکتے ہو - افسوس یہاں تو برسوں ہوئے کہ موسیقی کی دل آویز صدائیں جو خدا کی آوازیں سُنائی دیتی تھیں - اب تو یہ حال ہے کہ اگر کبھی کسی دُھن میں جنگل کو نکل جاتا ہوں تو ہوا کے جھونکے جو میرے گرد چلتے ہوتے ہیں اپنی قوت کی وجہ سے مجکو محسوس ہوتے ہیں لیکن انکا شور جبکہ ہوا تیز ہو کر بڑے بڑے عالیشان درختوں کو ہلا ڈالتی ہے یا ہلکی ہلکی لچکدار نازک شاخوں اور پھولوں سے گذرتی ہوئی قدرت کے اُس نغمے میں جس میں عالم کا ہر ذرّہ شریک ہے گھُل مِل جاتی ہے - مطلق نہیں سُن سکتا - جب کبھی بہار کے موسم میں دن چھپے گھر آتا ہوں تو یہ دیکھ لیتا ہوں کہ غریب چرواہے کی پیاری صورت والی لڑکی اپنے گلے کو چشمہ پر پانی پلانے لیجاتی ہے لیکن اوسکی سیدھی سادی سہانی الاپیں جن میں وہ اپنا چاہیتا گیت گاتی جاتی ہے میرے کانوں تک نہیں پھونچتیں - جنگل کے خوش آواز پرند جب وہ پہاڑ کی چوٹی سے اُڑ کر گھاٹی میں اُترتے ہیں جہاں اُن کے آشیانے آنکھ سے اوجھل ہیں ہوا میں اُڑتے دیکھتا ہوں لیکن اون کے چہچہے جو صحرائیں نسیم اور صرصر کی پیدا کی ہوئی آوازوں سے اپنا ساز ملاتے ہیں مجکو نہیں سُنائی دیتے - اے نغمہ و سرود تم میری جان ہو - میری روح ہو لیکن وائے

نصیب تمہارے احساس کی قدرت مجھ میں نہ رہی۔ اے میرے مہماں نوازو تم مجکو وہ کاغذ دیکھ لینے دو جنھوں نے تمہارے دل پر ابھی ابھی ایسا اثر کیا تھا۔ یہ کہکر کرسی سے اُٹھا اور وہ کاغذ جس پر موسیقی کی علامات میں گتیں بجانے کے اشارے لکھے تھے اور جنکو دیکھ دیکھکر باپ بیٹوں نے باجے بجائے تھے اُٹھالئے۔ کاغذ دیکھتے ہی دفعتاً اُسکا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اور بے ہوش ہوکر کرسی پر گر پڑا۔

پہلے ہی صفحے پر جہاں مصنف کا نام ہوتا ہے اپنا نام بٹ ہوون لکھا دیکھا۔ گرتے ہی سب لوگ گرد جمع ہوگئے اور اس حالت کو پوچھنے لگے۔ کچھ دیر میں جب کسی قدر ہوش آیا اور آواز پر قدرت ہوئی تو کرسی سے کھڑا ہوا اور بولا" اے میرے دوستو میں ہی وہ بدنصیب ہوں جسکو بٹ ہوون کہتے ہیں اور یہ گتیں اور راگ مجھی بدنصیب کی تصنیف وتالیف سے ہیں اس نام کے سنتے ہی دہقان نے فوراً سر سے ٹوپی اُتار لی اور تعظیم دینے کو جھک گیا۔ لڑکوں نے بھی فوراً سر جھکائے۔

بٹ ہوون نے ان جوان لڑکوں کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں دبا لیا اور خوشی سے رونے لگا۔ دہقان نے بٹ ہوون کے ہاتھ کو بوسہ دیا کیونکہ یہ وہ باکمال تھا جسکی تصنیف سے دن بھر کے تھکے ہارے کسانوں اور مزدوروں کا کچھ دیر کے لئے غم غلط ہوا کرتا تھا۔ یہ ہی وہ ہر دلعزیز شخص تھا جس کی وائنا میں ایسی عزت تھی کہ اگر راستہ میں نظر آتا تھا تو لوگ سامنے سے ہٹ جاتے تھے کہ کہیں اُسکے خیال میں مخل نہ ہوں۔ اور بچہ بچہ دیکھکر کہتا تھا کہ" دیکھو بٹ ہوون وہ جاتا ہے" گو دنیا کے غموں اور تکلیفوں نے بٹ ہوون کی زندگی پر موت کی مُہر لگادی تھی۔ لیکن کمال کا نور اُسکی شریف پیشانی پر اب بھی ہر وقت برستا تھا۔

اِسکے بعد بٹ ہوون خود باجے کے قریب جا بیٹھا اور لڑکوں کو ساز لینے کا اشارہ کرکے اپنی تصنیف کی ہوئی چیزیں شروع کردیں۔ اور راگ کی دُھن میں از خود رفتہ

ہوکر وہ وہ چیزیں بجائیں اور سنائیں جنکو خود پہلے نہ جانتا تھا۔ سننے والے سمجھ رہے تھے کہ آج اوستاد کی روح اُن بندشوں کو توڑ کر جنہوں نے دنیا کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا بڑی شان وشوکت سے آسمان کو اُٹھ رہی ہے۔

بٹ ہوون کے ہاتھوں میں باجے نے بھی آج غیر معمولی آوازیں سنائی تھیں۔ کبھی اُسکی صدائیں ایسی پُرشوکت ہوتی تھیں جیسے طوفان میں بادل کی گرج اور کبھی ایسی لطیف وخفیف جیسے جان کنی میں مرنے والے کی آہیں۔

افسوس! بٹ ہوون کا یہ آخری شغل تھا۔ اسی میں رات زیادہ آ گئی جس بستر پر دہقان سویا کرتا تھا وہ مہمان کے لئے بچھا گیا اور سب نے اصرار کیا کہ اسی پر آرام کرے۔

جب رات زیادہ گئی تو بٹ ہوون کو بخار ہو گیا اور گرمی سے ماتھا بہت جلنے لگا۔ ٹھنڈک کے لئے ہلکے کپڑے پہنے ہوئے باہر ہوا میں نکل آیا۔ ہوا اس وقت بہت سرد اور تیز تھی۔ درختوں کی شاخوں میں ہچکیاں اور سسکیاں لے لے کر روتی تھی۔ بن اور گاؤں پر زور کا مینھ برس رہا تھا۔ غرض جب کمرے کے اندر واپس آیا تو ہاتھ پاؤں بے حس و حرکت معلوم ہونے لگے۔ استسقا کا مرض پہلے ہی سے ہو چلا تھا۔ وہ پھر عود کر آیا اور قلب تک اسکا اثر ہو گیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ اب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوگی۔ آخر کار بمشکل وائنا کے شہر تک مریض کو پہونچایا۔ وہاں ایک ڈاکٹر نے آکر دیکھا اور زندگی سے مایوسی ظاہر کی۔

ہُومل جو بٹ ہوون کا بڑا رفیق تھا یہ خبر سنتے ہی دوڑا آیا کہ جو کچھ ہو سکے آخر وقت میں دوست کی خدمت کرے لیکن جب پہونچا تو بٹ ہوون کے ہوش سلامت نہ رہے تھے دوست کو دیکھکر مریض نے کچھ کہنا چاہا لیکن جن لفظوں کو ادا کرنے کی کوشش تھی وہ مردہ لبوں تک آکر خود بے جان ہو گئے اور منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ لیکن پھر

بھی دوست کو کچھ پہچان لیا اور شکریہ میں لبوں پر ایک افسردہ تبسم ظاہر ہوا۔ ہول غم اور محبت سے بے تاب ہو گیا۔ اور مریض کے ہاتھوں کو جو برف ہو چکے تھے اپنے ہاتھوں میں لیا۔ جب مرنے والے کو دوست کا ہاتھ محسوس ہوا تو ایک پل کے لئے کچھ ہوش سا آیا اور پتھرائی آنکھوں میں کچھ آب آئی۔

تکیہ پر سر آہستہ ڈھلکا اور ہلکی ہچکی کے ساتھ روح پرواز کر گئی۔

عنایت اللہ

اُگتے تھے جنمیں نخل امید وصال کے
کیا ہو گئے وہ باغ طلسم خیال کے

بیٹھا ہے کوئی گیسوؤں کے بل نکالکر
عکس آئینے میں آئے ذرا دیکھ بھال کے

دل سے نکال ڈالے سب ارماں وصال کے
اب پھیک آئیں سینے سے کیا دل نکال کے

ہر بام۔طور۔ وادیِ ایمن ہر اک صحن
جلوے کہاں نہیں تری برق جمال کے

ساقی ہمارے سامنے تو رکھدی بھر کے جام
لا دختِ رز کو نور کے سانچے میں ڈھال کے

بالو نمیں اپنے بیٹھ کے موتی پروئیے
آنسو نہ پوچھیئے کسی آشفتہ حال کے

محفل میں آج شیخ کہن سال ناچ جائے
دو گھونٹ اسے پلا دو مئے کہنہ سال کے

بیدرد تجکو بات کا جب بھی یقیں نہ ہو
ہم رکھدیں سامنے جو کلیجہ نکال کے

اے موسم بہار جو کچھ ہوش آ گیا
چن لیں گے پھول پاؤں سے کانٹا نکال کے

اُنکی طرف سے آکے جو اس دل میں جم گئے
ذرے ہیں آسماں اُسی گرد ملال کے

دل کے لئے حسینوں کی ہم کو کمی نہیں
اچھا ہو مال لاکھ خریدار مال کے

موسیٰ سے کہدو جلوہ گہ طور یہ نہیں
اسکی گلی میں آئیں ذرا دیکھ بھال کے

اٹھوا دو میز سے مئے و ساغر ریاضؔ جلد
آتے ہیں اک بزرگ پرانے خیال کے

صوبہ مالوہ کی سیر

(بھوپال - اُجین - اندور)

ہندوستان آثار قدیمہ اور عجائبات قدرت کے لحاظ سے دنیا کے ممتاز ترین حصوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں قدیم زمانے کے عجائبات کا بڑا ذخیرہ ہے، اور ملک کے ہر گوشہ میں گذشتہ فرمانرواؤں کی عظمت و جلال کی ایسی ایسی شاندار یادگاریں اور اُس عہد کی اعلیٰ اور ناقابل فہم صنعت کاریاں موجود ہیں جنہیں دیکھکر بڑے بڑے نظر بازان یورپ حیران رہجاتے ہیں یوں تو مناظر قدرت کی سیر سے لطف اُٹھانے کا ہر شخص کو فطرتاً شوق ہوتا ہے، لیکن میرا شوق حد سے بڑھا ہوا ہے اور باوجود بے سروسامانی اور خانگی مجبوریوں کے ہمیشہ اس فکر میں رہتا ہوں کہ کم از کم ہندوستان کے تمام مشہور اور تاریخی مقامات کی زیارت کر تو مشرف ہوں عرصے سے صوبہ مالوہ خصوصاً قلعہ مانڈو کی سیر کا از حد شوق تھا۔ لیکن یہ آرزو کسی طرح پوری نہ ہوتی تھی آخر کار قدرتی شوق نے تمام مجبوریوں کو بالائے طاق رکھا اور میں ۱۱ نومبر ۱۹۰۷ء کو آگرہ سے چل کھڑا ہوا اِس سفر میں جہاں جہاں گذر ہوا۔ جن جن دلچسپ اور خوبصورت منظروں کی سیر کی اُن کا مختصر حال ناظرین مخزن کے واسطے قلمبند کر لیا۔ جو وقتاً فوقتاً ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا (سعید احمد)

بھوپال

سب سے پہلے میرا بھوپال میں مقام ہوا۔ مالوہ کے مشہور راجہ بھوج نے اس مقام پر دو پہاڑوں کے درمیان میں ایک بند باندھ کر تالاب بنالیا تھا۔ اور اُس کے کنارہ پر ۱۲۰۰ء میں ایک قلعہ تعمیر کر کے اُس کا نام بھوجپال رکھا کثرت استعمال سے حرف جیم ساقط ہو کر

بھوپال رہگیا اُس زمانہ کی آبادی کا بقیہ اب قلعہ کہنہ ہی رہگیا ہے، جس کی وسعت ۱۲ بسوہ ہے۔ موجودہ حکمراں کے مورثِ اعلیٰ سردار دوست محمد خان نے اس جگھ کو پسند کر کے سنہ ۱۱۲۱ھ میں قلعہ فتحگڈھ تعمیر کیا۔ اور موجودہ شہر کو آباد کر کے شہر پناہ بنوائی۔ اسکے بعد نواب جہانگیر محمد خان نے جہانگیرآباد اور نواب شاہجہاں بیگم نے شاہجہان آباد بسایا۔ یہاں کی قابل دید عمارتیں۔ جامع مسجد۔ موتی مسجد۔ تاج محل۔ شیش محل وغیرہ ہیں۔ ان میں جامع مسجد وسط شہر میں ایک بلند جگھ پر واقع ہے، جس کے مینار شاندار ہیں اِسے ۱۲۴۹ھ لغایت ۱۲۷۱ھ میں نواب قدسیہ بیگم نے پانچ لاکھ ساٹھ ہزار پانسو اکیس روپیہ پونے تین آنے کے صرف سے تعمیر کرایا تھا۔ موتی مسجد بہت خوبصورت عمارت ہے، جس کی بنیاد جامع مسجد دہلی کے نمونہ پر سنگ مرمر اور سنگ سرخ سے نواب سکندر بیگم نے رکھی تھی اور نواب شاہجہاں بیگم کے عہد میں تعمیر ختم ہوئی۔ جھیل کے قریب شوکت محل۔ صدر منزل وغیرہ شاہی محلات اچھے بنے ہوئے ہیں۔ خاص شہر میں یہ ہی جگھ پر فضا ہے، جھیل کے کنارہ پختہ گھاٹ بنا ہے جسکی تاریخ تعمیر یہ کندہ ہے

عہد شاہجہانِ باذل میں بنو قابلِ غسل و دید گھاٹ بنا
سال کہدے ندا علی تاریخ خوب و سنگیں جدید گھاٹ بنا

شاہجہان آباد میں عالیشان عمارتیں ہیں۔ تالاب شاہجہانی اور لب تالاب عمارت تاج محل نہایت خوشنما اور دلکش عمارت ہے جس کے دیوان خاص کی طلائی گلکاری خاصکر قابل دید اور لایق داد ہے، جس جس سال میں محل کا جو جو قطعہ تعمیر ہوا ہے اُس قطعہ کی محراب کے اوپر طلائی اور لاجوردی گلکاری کے درمیان میں تاریخ کا فقرہ بخط نستعلیق منقوش ہے مثلاً عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محمودا۔ ۱۲۵۲
نو منزلِ شاہجہان ست ۱۲۹۰ - دولتخانۂ نفیس ۱۲۹۰

بعہد شاہجہاں شاہ بنا ہے تاج محل - سر تاج محلہائے جہاں تاج محل
تالاب اور اُس کے پلوں نشستگاہوں کا منظر بھی نہایت خوشنما ہے۔ شاہجہاں بیگم
مرحومہ کو عمارت سے خاص دلچسپی تھی۔ اُنھوں نے شاہجہاں آباد میں علاوہ محلسرا کے
کی خوبصورت نور محل کے ایک عظیم الشان جامع مسجد کی جو تاج المساجد کے نام سے
مشہور ہے، تعمیر شروع کرائی تھی۔ اِس مسجد میں مرحومہ کا لاکھوں روپیہ صرف ہوا مگر
خائن اہلکاروں کی بدولت عمارت تکمیل کو نہ پہنچی اور جتنی عمارت تیار ہوئی وہ بھی مبصرین
کے نزدیک دیرپا نہیں ہے، اگر بانی کے حسب دلخواہ یہ مسجد تکمیل کو پہنچتی تو وا قعی بے نظیر
عمارت ہوتی۔ درمیان میں کئی سال اسکی تعمیر بند رہی اب پھر کام شروع ہوا ہے
اور ایک ہزار روپیہ ماہوار کے کاریگر کام کرتے ہیں۔

بھوپال میں اور بھی بہت سی مسجدیں اور قرب وجوار میں باغات ہیں لیکن شہر کی ساخت
بے ڈھنگی ہے، اور منیوسپل انتظام بھی خراب اور قابل اصلاح ہے۔ بیگم صاحبہ کو علمی
معاملات اور صنعت وحرفت سے خاص دلچسپی ہے علاوہ مدرسہ جات نسواں وغیرہ
کے آپ نے اپنے چھوٹے صاحبزادہ کے نام پر ایک پبلک لائبریری قائم کرنے کا ارادہ
کیا ہے، جسکی عمارت حمیدیہ پبلک لائبریری کے نام سے تیار ہو چکی ہے۔ بیگم صاحبہ
اپنے عہد کی تاریخ خاص توجہ سے لکھوا رہی ہیں جس کے مہتمم منشی محمد امین الدین صاحب
مارہروی ایک قابل شخص ہیں۔

ریاست بھوپال میں بھوپال سے دس کوس کے فاصلہ پر ایک موضع سانچی ہے
جس میں ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔ یہ جگہ بودھ مذہب اور آثار قدیمہ کے شائقین کے
واسطے بہت دلچسپ ہے، موضع سے ۱۵ منٹ کے راستہ پر ایک چھوٹی سی پہاڑی
پر بودھ لوگوں کی ایک قدیم عمارت ہے جس کو عوام ساس بہو کا بٹیا کہتے ہیں یہ اور بھیلسہ
اور سوناری وغیرہ قرب وجوار کی عمارتیں ٹوپ کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ فرگسن صاحب

لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں ان ٹوپوں کا مجمع سب سے بڑا اور سب سے زیادہ عجیب ہے۔ یہ ٹوپ سانچی کے قریب وجوار میں ۱۷ میل لمبائی اور ۶ میل چوڑائی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ سانچی میں ۱۰ سوناری میں ۸ سدہارا میں ۶ اندھیرہ میں ۳ بھوج پور میں ۳۵ ٹوپ ہیں ان میں سے اکثر بدھ مذہب کے مشہور طاقتور راجہ اشوک (چندر گپت کا پوتا) کے زمانہ (سنہ ۲۵۰ قبل از مسیح) کے خیال کئے جاتے ہیں لیکن سانچی کا بڑا ٹوپ اس سے بھی ۳۰۰ برس پہلے کی تعمیر ہے، جو سب سے اچھی حالت میں ہے چینی جاتری فاہین نے سانچی کا نام شاچی لکھا ہے وہ لکھتا ہے کہ اُن دنوں میں یہ بہت بھاری ریاست تھی۔

سانچی کے ٹوپ (گنبد) کی نسبت انگریزی میں کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں یہ میجر الگزنڈر نے مدت تک وہاں قیام کرکے ایک کتاب لکھی ہے اُن کی تحریر کے بموجب یہ عمارت چھ سو یا نو سال قبل مسیح تعمیر ہوئی تھی اور اسکی بنانے کے واسطے چار سو سنگتراش چین سے آئے تھے۔ سنگین قبر جو بصورت زرد چوسر بنی ہے وہ شاہ چین کے مرشد کی قبر ہے" اور جو حروف سنگھاسے ابواب وکٹہرہ پر نقش ہیں وہ چینی حروف ہیں۔ اس عمارت میں شیروں وغیرہ کی جو مورتیں ترشی ہوئی ہیں وہ گذشتہ زمانہ کی سنگ تراشی کی نہایت اعلیٰ درجے کی صنعت کا نمونہ ہیں ان کا کام نہایت نفیس و نازک ہے اور خط وخال اس صفائی سے ظاہر کئے گئے ہیں جنہیں دیکھکر آدمی محو حیرت رہجاتا ہے۔

اُجین

بھوپال سے روانہ ہوکر ہم اُجین پہنچے یہ بہت قدیم شہر ہے جس کا ذکر مہابھارت میں موجود ہے۔ اس کا نام اصلی اونت کا پری ہے ہندوؤں کا بہت مشہور تیرتھ گاہ اور

ہندوستان کے سات مشہور تیرتھ گاہوں میں سے ایک ہے۔ راجہ بکرماجیت کے
زمانہ میں مالوہ کا پایہ تخت اور بہت بڑا شہر تھا کوسوں تک کھنڈر دکھائی دیتے ہیں اب بھی
اس کی آبادی ۳۳ تینتیس ہزار اور مالوہ میں دوسرے درجہ کا شہر گنا جاتا ہے اور مہاراجہ
سندھیا کی عملداری میں واقع ہے۔ مادھو کالج۔ مشن ہاسپٹل۔ راجہ کا محل وغیرہ جدید
عمارتیں خوبصورت تعمیر ہوئی ہیں۔ بازار بھی عالیشان ہے۔ اہل ہنود کے آثار کہنہ سے
پچاس موچن کا گھاٹ شپرا ندی کے کنارہ پر سنگین بنا ہوا ہے، یہاں پر غسل کرنے کو
ہندو ثواب سمجھتے ہیں اس گھاٹ کا سنسکرت زبان میں صحیح نام پساچ موکشن
ہے، پساچ بھوت پلید اور ارواح خبیثہ کو کہتے ہیں اور موکشن نجات کو۔ ہندوؤں کا عقیدہ
ہے کہ جس شخص پر بھوت پلید آتا ہو وہ اس گھاٹ پر غسل کرے تو اس سے نجات پاوے
ندی پر گھاٹ کے کنارے بہت سے مندر بنے ہیں سب سے مشہور مندر مہاکال مہادیو
کا ہے۔ جو آبادی کے اندر سنگین بنا ہوا ہے اس مندر کو راجہ بکرماجیت نے بنایا تھا
سلطان شمس الدین التمش نے اس کو کچھ توڑا پھوڑا اب اصلی حالت میں موجود ہے
اس کے کنارہ پر پختہ تالاب ہے۔ جس کا نام گوت تیرتھ ہے یعنے یہاں کے اشنان
کرنے سے کروڑ تیرتھ کا اشنان ہو جاتا ہے، تالاب کے گرد چاروں طرف چھتریاں
بنی ہیں۔ اس مندر سے تھوڑے فاصلہ پر ایک قدیم دروازہ ہے جو راجہ بکرماجیت کے
محل کا دروازہ مشہور ہے آگے دو بڑی بڑی مورتوں کے مٹے ہوئے نشان ہیں درمیان
میں ایک گھنٹہ لٹک رہا ہے، اور ایک بڑا نقارہ رکھا ہے۔ اجین سے تھوڑے فاصلہ
پر پہاڑ کے نیچے ایک سرنگ ہے، جو راجہ بھرتری کی گوپھا کے نام سے موسوم ہے،
اس کے اندر کچھ عمارت بنی ہوئی ہے، راجہ بھرتری۔ بکرماجیت کا بھائی تھا وہ راج چھوڑ کر
جوگی بن گیا تھا اور اس جگہ بیٹھکر عبادت کیا کرتا تھا اس وجہ سے یہ جگہ متبرک سمجھی جاتی ہے
جہانگیر نے جدروپ نام سناسی کا اپنی توزک میں ذکر کیا ہے، اور اس کے قیام گاہ کا جو

حال لکھا ہے، وہ اس سے ملتا جلتا ہے۔ اکبر و جہانگیر تین چار مرتبہ اس ہندو فقیر سے ملنے اس غار میں گئے اور اُس کی گفتگو سے خوش ہوئے چنانچہ جہانگیر نے لکھا ہے:۔

"مکرر شنیدہ بودم کہ سناسی مرتاضی جدروپ نام کہ چندیں سال است کہ نزدیک بہ معمورہ اُجین در گوشہ صحرا آبادانی دور متوجہ و مشغول پرستش معبود حقیقی است خواہش صحبت او بسیار داشتم وقتیکہ در دار الخلافۃ آگرہ بودم میخواستم کہ او را طلبیدہ بہ بینم غایتاً ملاحظہ تصدیع او کردہ نہ طلبیدم چوں بحوالی شہر مذکور رسیدم از کشتی برآمدہ نیم پاؤ کردہ بدیدن او متوجہ گشتم .... خالی از دانش نیست علم بیدانت را کہ علم تصوف باشد خوب ورزیدہ تا شش گھڑی بہ او صحبت داشتم سخنان خوب مذکور ساخت چنانچہ خیلے در من اثر کرد او را ہم صحبت من افتاد۔ درحالیکہ والد بزرگوارم قلعہ آسیر و ولایت خاندیس را فتح نمودہ متوجہ دار الخلافت آگرہ بودند درہمیں جا مقام او را دیدہ بودند و ہمیشہ خوب یاد می کرد"

زمانۂ اسلام میں اول سلطان شمس الدین التمش نے ۶۳۱ھ میں اور اُس کے بعد سلطان علاؤ الدین خلجی نے اجین کو فتح کیا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے "وہ ایک خوبصورت شہر ہے عمارتیں بلند ہیں اور ملک ناصر الدین بن عین الملک جو ایک بڑا فاضل اور کریم النفس آدمی تھا اس شہر میں رہا کرتا تھا اور سنداپور (گوا) کی فتح کے وقت شہید ہو گیا تھا اُس شہر میں فقیہ اور طبیب جمال الدین مغربی غرناطی رہتا تھا"

آثار زمانۂ اسلام میں سب سے قدیم حضرت مولانا غیاث الدینؒ کی درگاہ ہے، جو حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ تھے۔ آپ کی درگاہ پچاس موچن گھاٹ پر مندروں کے درمیان میں ایک بہت بلند پہاڑی ٹیلہ پر واقع ہے، مزار کے مغربی جانب چھوٹی سی قنائی مسجد ہے جس کی محراب میں کلمہ طیبہ او آیت الکرسی منقوش ہے نیز تینوں جانب دیوار اور مشرقی دیوار میں دروازہ ہے، جس چبوترہ پہ مزار ہے وہ مربع

ہے جس کا ہر ضلع ۱۲ ۲ فیٹ ہے۔ چبوترہ کے گرد خوبصورت سنگین کٹہرہ ہے، جس کا ہر ضلع ۱۰ فیٹ ۶ انچ ہے۔ یہ درگاہ پُر فضا جگہ پر واقع ہے۔ احاطہ کے باہر دو تین قناتی مسجدوں کا نشان اور بہت سی پختہ و سنگین قبریں ہیں جن میں مولانا وجیہ الدینؒ اور شیخ ابراہیمؒ مریدان حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ اور شیخ موسیٰ کے جو زمانہ اکبری میں ایک عابد و زاہد بزرگ تھے مزار خاصکر مشہور و معروف ہیں۔ اس درگاہ کے علاوہ شہر میں چند اولیاء اللہ کے اور بھی مقبرے ہیں جن میں مزار شاہ ارزانیؒ (واقع چوک) مزار شیخ جمالؒ و شیخ کمالؒ (مدار دروازہ) مزار احمد بن نعمت اللہ و شیخ عبدالغفور و شیخ احمد متوکل و شیخ نورؒ و ابراہیم نوریؒ و شیخ راج محمدؒ زیادہ مشہور ہیں۔ شیخ راج محمدؒ کے مزار پر یہ تاریخ کندہ ہے ؎

شیخ راجہ از محمدؐ آنکہ بود	شاہد و مشہود در چشم شہود
رفت در کوئے ہوا در ملک او	در شمار نصد و ہشتاد و دو بود

مسجدوں میں سب سے نیوکی مسجد اور جامع قدیم عمارتیں ہیں۔ جامع مسجد میں تین گنبد اور دو بلند منارہ ہیں یہ مزار حسین بیگ نام سے مشہور ہے اس میں مختار خاں کا مقبرہ جو بیگم باغ کے نام سے مشہور ہے اور ایک اور عظیم الشان بجنب باغ کے اندر ایک تین گنبد کی مسجد۔ مدرسہ کے حجرے۔ حوض وغیرہ شکستہ حالت میں موجود ہے، واقع ہو جنوبی حجرہ میں ایک سنگین قبر ہے۔

ممتاز خاں (میر شمس الدین سبزواری) شہنشاہ عالمگیر کے عہد میں منصب دو ہزاری پر سرفراز اور مالوہ کے صوبہ دار تھے ۱۰۹۵ھ میں بمقام احمد آباد گجرات انتقال ہوا۔ باغ اور مقبرہ شکستہ حالت میں اجین میں موجود ہے، اس باغ کے گرد دوہری سی چار دیواری تھی۔ پہلی چار دیواری کا صرف ایک دروازہ اور کہیں کہیں نشان باقی ہے، دوسری چار دیواری کا عالیشان دروازہ بھی شکستہ حالت میں ہے جس پر

گذشتہ نقاشی کا کسی قدر نمونہ موجود ہے، پیشانی پر سنگ مرمر کی تختی پر خط نسخ میں ھذہ روضات خلد فادخلوھا مومنین کندہ ہے، باغ کے درمیان میں پختہ و سنگین مقبرہ ایک چبوترہ پر بنا ہوا ہے جو درمیان سے شق ہو گیا ہے اور بہ ظاہر چند روز کا مہمان نظر آتا ہے۔ اصلی قبر تہ خانہ کے اندر تھی جواب بند ہے اوپر درمیانی کمرہ میں تعویذ اور شمال و جنوب اور مشرق میں برآمدہ ہے اطراف میں سنگ مرمر کی تختیوں پر سنگ موسیٰ کی پچیکاری سے خط نستعلیق میں کتبہ ذیل کندہ تھا سنگ موسیٰ کی پچیکاری اب صرف تین چار جگہ باقی رہ گئی ہے۵۔

معدن فضل و کرم مختار خان	سبزواری و حسینی بالیقین ۵
روز ہیجا شہسوار یکہ تاز	حامی دین مالک تیغ و نگیں
آں سہی سرو ریاض مرتضےٰ	آن گل بستان خیر المرسلیں
آسماں قدرے کہ مہر و دولتش	کرد روشن سر بسر روئے زمیں
ساخت چوں فردوس رنگ روضہ	گلشن بے مثل بر روئے زمیں
ہر گلش رشک بہار جنت است	بلبلانش در ترنم نے قریں
در طراوت رشک گلزار ارم	از صفا آرام گاہ حور عیں
می تراود از زبان ہر گیاہ	ذکر طبتم فادخلوھا خالدیں
شد رقم تاریخش از کلک سخن	با طریق التعمیہ با زیب و زیں
آبرو از روئے رضواں در ربود	گلشن بے مثل در دنیا و دیں

اس کتبہ کے اشعار کے درمیان میں متبرک آیات قرآنی ان المتقین فی جنات و عیون فادخلوھا بسلام امنین۔ لا تقنطوا من رحمت اللّٰہ یغفر الذنوب جمیعا۔ قل رب اغفر وارحم وانت خیر الراحمین۔ وغیرہ خط نسخ میں کندہ ہیں۔

---

۵ جن مصرعوں پر خط کھنچا ہے وہ اب موجود نہیں۔

اُجین سے ڈھائی کوس شمال کی جانب سلطان ناصرالدین ابن غیاث الدین شاہ مانڈو کا محل ہے، جو موضع کالیادہ کے قریب واقع ہونیکی وجہ سے محل کالیادہ کے نام سے مشہور ہے یہ جگہہ نہایت دلنشین فرح انگیز اور نزہت و لطافت میں بے نظیر ہے دریائے سپرا کے مغربی کنارہ پر ایک وسیع چاردیواری کے اندر جس کے نشان ابتک نمودار ہیں یہ محل بنایا گیا تھا۔ محل کے قریب دریا کا بند باندھ کر محل کے مغربی جانب باغ آراستہ کیا تھا۔ دریا سے ایک ندی تراش کر سترہ در کا اُس پر پُل باندھا ہے، اُس پُل میں بحساب قواعد علم ریاضی سوراخ رکھے ہیں اُن میں سے پانی تقسیم ہو کر نکلتا ہے۔ اور چھوٹے بڑے مربع ہشت پہل اور مختلف الوضع خوبصورت حوضوں میں گرتا ہے۔ پھر چکردار نالیوں میں چکر لگاتا اور دوسری نہروں اور حوضوں میں گشت کرتا ہوا تمام باغ کو سیراب کر کے ندی میں جا گرتا ہے۔ جگہ جگہ انواع و اقسام کی آبشاریں اور چکا بو بنے ہیں۔ ایک جگہہ ۱۲ فیٹ لمبا جھرنا لگا ہوا ہے، اُس جھرنے کے ذریعے پانی نیچے حوض میں گرتا تھا اس کا خزانہ اب بگڑ گیا ہے۔ درمیان میں چوڑی چوڑی سنگین روشیں تین چار نشستگاہیں بنی ہوئی ہیں۔ جہانگیر نے ۱۱ سنہ جلوس میں اس مقام کی مرمت کرائی تھی اُس وقت کی ایک نشستگاہ پر یہ کتبہ کندہ ہے ؎

بحکم شاہجہاں ساخت ایں دو عشرت گاہ   حسن بعہد جہانگیر شاہ اکبر شاہ
بہشت روئے ازیں یافت عقل تاریخش   کہ سروران جہاں راست منزل دلخواہ

اندر ایک ستون پر یہ عبارت کندہ ہے۔ بتاریخ سنہ ۱۲ سال الٰہی موافق سنہ ۱۰۲۶ھ کہ رایات ظفر آیات عازم تسخیر دکن بود بایں جا عبور اُفتاد ؎

نامی ز فلک دوش دلم کرد سوال   کز رفتہ و آئندہ بیاں کن احوال
گفتا چہ خبر ز رفتگاں نیست اثر   آئندہ چو رفتہ داں چہ می پرسی حال

راقم محمد معصوم نامی البکری - اسی کے قریب دوسری جگہ یہ کتبہ تحریر ہے - بتاریخ ۴۵ سنہ
الٰہی موافق ۱۰۰۹ سنہ ہجری حضرت خلافت پناہ ظل اللہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ ملک دکن
وخاندیس را فتح کردہ تفویض نمودہ مراجعت فرمودند ؎

فتح خاندیس و دکن چوں کرد شاہ عازم نزہتگہ معمور شد
یکعدد تا می فزود انگاہ گفت شاہ والا عازم لاہور شد

محل کی موجودہ عمارت اندر سے نہ اصلی حالت پر قائم ہے نہ چنداں خوبصورت ہے
اب نہ باغ باقی ہے نہ چمن ہے - حوضوں اور نہروں میں بھی مٹی بھری ہے فواروں کا
نام نشان باقی نہیں - نشستگاہوں کی عمارت بھی شکستہ حال ہے مگر پھر بھی یہ جگہ
بہت خوشنما نفیس اور ایسا مقام خود رفتگی ہے کہ اس کو دیکھکر انسان تمام غم و الم کو بھول
جاتا ہے اور اس دلچسپ اور خوبصورت منظر کے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا اگر یہ دلفریب
مقام انگریزی عملداری میں ہوتا تو خاص تفریح گاہ ہوتا - اکثر مہاراجہ صاحب گوالیار اس
محل میں آکر قیام کرتے ہیں اور دو برس سے پانسو روپیہ سالانہ محل اور رودخانہ کی
مرمت میں صرف ہوتا ہے جو بالکل ناکافی ہے - محمد شاہ کے عہد سلطنت میں راجہ
جے سنگھ صوبہ دار مالوہ نے بیس لاکھ روپیہ کے صرف سے ایک رصدگاہ اُجین میں
بنوائی تھی جس کی چند دیواروں کی بنیاد اور پتھر چونے کا انبار اب تک باقی ہے -

اندور

اُجین کے بعد میں نے اندور کی سیر کی یہ شہر ہلکر کا دارالحکومت دریائے کان کے
کنارے پر واقع اور سطح سمندر سے دو ہزار فیٹ بلند ہے سو برس پہلے یہ ایک گمنام
گاؤں تھا اہلیہ بائی اور جسونت راؤ ہلکر نے اس کو آباد کیا رفتہ رفتہ اس نے ایسی ترقی
کی کہ آج صوبہ مالوہ کا کوئی شہر اس کی برابری کا دعوی نہیں کر سکتا اور بلحاظ اپنی خوبصورت

عالیشان عمارتوں سڑکوں کی صفائی انتظامات تجارت وغیرہ کے مالوہ کا پیرس کہلانے کا جائز طور سے مستحق ہے۔ ندی کے دونوں طرف آبادی ہے درمیان میں نو در کا سنگین پل بھیا بائی دختر جسونت راو ہلکر کا بنوایا ہوا واقع ہے۔ تمام شہر اور چھاونی میں گیس کی روشنی ہوتی ہے بازار عالیشان اور اُس میں دو منزلہ چار منزلہ خوبصورت چوبی مکانات بنے ہیں۔ قدیم عمارتوں میں رانی کرشنا بائی اور آپا بولیا دہری ہلکر کی چھتریاں۔ گوپال مندر۔ مہاراجہ ہلکر کا باڑہ اور نئی عمارتوں میں نیا راج باڑہ۔ شفاخانہ کچھریاں۔ ریزیڈنسی اور آپا بولیا دہری ہلکر۔ کا محل متصل اسٹیشن۔ مشن کالج۔ گرجا گھر۔ گھنٹا گھر ایڈورڈ ہال۔ نیا مسافرخانہ نہایت خوبصورت اور لایق دید ہیں اور نئی نئی عمارتیں مثل ہائیکورٹ وغیرہ کے تعمیر ہو رہی ہیں اور ہنوز شہر کی وسعت و رونق روز افزوں ہے۔

گھنٹا گھر کا درمیانی وسیع ہال نہایت خوبصورت اور اُس کی چھت خاص صنعت سے بالی ٹنگی ہے چھت اور دیواروں میں برقی روشنی کے نفیس خوبصورت جھاڑ اور قمقمے لٹک رہے ہیں اور سنہری بیلیں بنی ہوئی ہیں سنگ مرمر کے فرش میں سنگ موسیٰ کی پچیکاری ہے۔

شہر سے تھوڑے فاصلہ پر لال باغ ہے جس میں موسم گرما کے واسطے سہ منزلہ کوٹھی بنی ہے۔ درمیان میں ایک چھوٹا سا چڑیا خانہ بھی ہے چھاونی بھی بہت رونق پر ہے اور اُس میں اچھے اچھے بنگلے اور کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں۔ ڈاکخانہ کے سامنے ایک تین در اور دو درجہ کی چھوٹی سی سنگین مسجد ہے جس کے دروازہ پر یہ کتبہ کندہ ہے۔

جناب مستطاب مستغنی الالقاب نواب بہادر خلف الرشید مرحمت و غفران پناہ نواب علی بہادر ثانی ابن خلد مکان نواب ذوالفقار بہادر اول ابن جنت آرامگاہ نواب علی بہادر اول نواب باندہ بہ تعمیر این مسجد کہ از ابنیہ خیر است اقدام نمودہ بہ توفیق الٰہی موفق گردید۔ رفع اللہ

درجاته وکثرالله امثالهٔ ؎

بنا فرمود نواب بہادر ہمانا ایں عبادت گاہِ اقدس
چو از وے ایں بنا پایاں پذیرفت شد از ارباب ایماں شاد ہر کس
زروے اُنس قدرت گفت تاریخ مثالِ کعبہ و بیت المقدس

بھوپال - اُجین - اندور بلکہ کل صوبہ میں مسلمان بوہروں کا تجارت[۱۳۲۲ھ] میں خاص حصہ ہے اور اُن میں اکثر بڑے مالدار ہیں -

سعید احمد مارہروی

پند جامی - ہے تو ایک چھوٹا سا رسالہ - مگر عجیب اور مفید ہے - مولوی محمد دین صاحب بی - اے - ممبر کونسل ریاست بہاولپور نے جو آجکل وہاں صیغہ تعلیم کے افسر اعلیٰ بھی ہیں - نہایت صاف اور دلپذیر نثر میں مولانا جامی کے اُن اشعار کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے - جو اُس ہمیشہ زندہ رہنے والی کتاب "یوسف زلیخا" کے اخیر میں مولانا نے اپنے فرزند کو مخاطب کر کے لکھے ہیں - یہ ترجمہ اس ترتیب سے شایع ہوا ہے - کہ پہلے فارسی شعر درج ہے اور اسکے نیچے ترجمہ - اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے مترجم نے مفید نوٹ بھی درج کر دیئے ہیں - ایک مختصر مگر پُر مغز دیباچے سے اس رسالے کا لطف بڑھایا گیا ہے - فاضل مترجم کا یہ قول بالکل درست ہے - کہ ہر ناظرین دیکھیں گے کہ مولانا نے ۹۸ شعروں کے اندر ایک نوجوان کے واسطے جو زندگی کی کٹھن منزلوں میں قدم رکھنے والا ہو کس جامعیت و لطافت کے ساتھ نصیحت کا ایک بیش بہا ذخیرہ جمع کر دیا ہے -

امن و خوشی

انگلستان کے موجودہ مصنفین میں۔ سرجان لبک جواب لارڈ آوبری کے خطاب سے ممتاز ہیں۔ نہایت بلند پایہ رکھتے ہیں۔ خیالات کی عمدگی زبان کی خوبی اور طرز بیان کی لطافت یہ سب خوبیاں اُنکے مضامین میں پائی جاتی ہیں۔ ہمارے فاضل دوست نذر محمد صاحب بی اے۔ اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس نے ان کی ایک مشہور تصنیف کے ایک باب کا یہ ترجمہ ہمیں عنایت کیا ہے۔ ایسے مضامین سے کے مضمون کی ضرورت محتاج بیان نہیں۔

آسودگی اور خوشی کی صورت میں بالضرور توام نہیں ہوتے۔ کئی آدمیوں کو بظاہر تمام سامانِ راحت میسر ہوتا ہے لیکن اونہیں زندگی وبال معلوم ہوتی ہے۔ فطرت اپنے "چاہئے شہ زور" کو جسقدر چاہے دولت۔ ثروت۔ اعزاز طولِ حیات بخشدے لیکن اوسے خوشی عطا نہیں کرسکتی۔ خوشی حاصل کرنا اسکا اپنا کام ہے۔ جس شخص کو دنیا میں کامیابی نصیب ہوتی ہے اُسے کئی خطرے اور تردد بھی ہوتے ہیں۔ جو شخص خوشی کے اصولوں سے بے بہرہ ہو دنیا بھر کی خوبصورتی۔ گوناگونی۔ تفریحات اور دلچسپیاں اُسے خوش نہیں کرسکتیں۔ خوشی کا دارومدار زیادہ تر اس بات پر ہے کہ خیالات پر قابو ہو اور اونہیں ٹھیک راہ پر لگایا جاے۔ تکلیف دہ امور سے اجتناب کیا جاے۔ اور خوش کن خیالات کی یاد سے دل بھلایا جاے۔ مشہور فلسفی شوپنہار کا قول ہے کہ "کوئی تو یہ خیال کرتا ہے کہ دنیا غیر آباد جگہ ہے جہاں غم کے سوا کچھ نہیں اور ہر طرف ظاہرداری نظر آتی ہے۔ دوسرے کے خیال میں دنیا ایک زرخیز مقام ہے جہاں دل لگی کا سامان موجود ہے۔ اور حقیقت سے بحث ہوتی ہے" جسطرح

رباب کا بجانا مشق سے آتا ہے اسی طرح خوشی کے حاصل کرنے لئے بھی مشق درکار ہے۔ اگر درست وسائل استعمال کئے جائیں تو خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن ہاتھ دھو کر اسکے پیچھے بھی نہیں پڑنا چاہیئے۔ ورنہ وہی حال ہوگا۔ جو زمانہ قدیم کے شاعر[۵] اورفیس کا ہوا تھا۔ جوں ہی اوسنے محبوبہ کی طرف دیکھا وہ برزخ میں چلی گئی۔ اسی طرح خوشی کے پیچھے پڑنے سے خوشی پرے ہوتی ہے۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ "عیش سے اجتناب کرو تو عیش خودہی حاصل ہو جاتا ہے"

خودبینی سے پرہیز کرو۔ دنیا میں تم ہی تم نہیں ہو۔ رسکن نے کیا خوب کہا ہے "دل لگی کی تلاش مت کرو۔ لیکن کوئی دل بہلانے والی شے نظر آجائے تو خوش ہونے کے لئے طیار رہو" بڑی بات یہ ہے کہ زندگی کو راحتوں کا ایک سلسلہ بنانا چاہئے۔ خواہ وہ راحتیں کیسی ہی چھوٹی چھوٹی کیوں نہ ہوں مثلاً مزاج یا ظرافت بالخصوص انسان میں ودیعت کی گئی ہے۔ حیوانوں میں عقل کے ہونے میں توشبہ ہے۔ لیکن بہرحال خوش طبعی کا جوہر تو اُن میں نہیں پایا جاتا۔ چیمفرٹ کی رائے ہے "جس دن میں کوئی ہنسی کی بات نہ ہو وہ دن ہی بالکل رائگاں سمجھا جاتا ہے" کسی کو خوش طبعی سے ہنستے ہوئے دیکھنا کیسا لطف دیتا ہے۔ اور خندہ کا اثر ہر شے پر کیسا فروغ بخش ہوتا ہے۔ "شکسپیر کہتا ہے کہ ہشاش بشاش آدمی دن بھر چلتا رہتا ہے۔ لیکن غم آلود کو ایک میل میں ہی تھکن محسوس ہونے لگتی ہے" ایک لاٹ پادری کا قول ہے کہ "مذہب

۵ ٹرکی کے صوبہ تھریس کا شاعر تھا۔ لکھا ہے کہ وہ اپنے راگ سے غیر ذی روح اشیا کو بھی متاثر کر سکتا تھا۔ جب اوسکی بیوی فوت ہوگئی تو اوس نے پاتال میں جاکر اس شرط پر اپنی بیوی کو موت سے مخلصی دلوائی کہ جب تک وہ زمین تک نہ پہونچ لے لوٹ کر نہ دیکھے وہ زمین پر پاؤں رکھنے کو ہی تھا کہ اوسنے پیچھے کی طرف نگاہ کی اور ایک لمحہ میں اوسکی بیوی نظر سے غائب ہوگئی۔

عیسوی کا انحصار دس میں سے نو حصّے خوش مزاجی پر ہے" اور خوش طبعی کا راز یہ ہے
کہ افروختہ کرنے والے خیالات سے پرہیز کی جائے۔

اگر غصہ آجائے تو "غروب آفتاب سے پیشتر اوسے دور کیا جائے" قاعدے کی
بات ہے کہ جھگڑا کرنے کیواسطے دو آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ
دونوں میں سے ایک بننا گوارا نہ کرے۔

بعض آدمی ہمیشہ شاکی رہتے ہیں۔ اگر وہ باغ عدن میں بھی پیدا ہوئے تو بھی اُن کا
شکوے نہ جاتا۔ بعض ایسے ہیں کہ انہیں ہر جگہ مسرت حاصل ہوتی ہے اور اونہیں ہر
جگہ خوبیاں اور برکتیں نظر آتی ہیں۔

"اگر خوف زمین کے خطّے سے محو ہوجاتا اور دل شکنی کا وجود نہ ہوتا اور محبت لازوال
ہوتی تو زمین کس خوبی سے نمونۂ بہشت بن جاتی"

خوش طبعی سے اخلاق کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح سورج کی روشنی
سے پھول نکل آتے ہیں اور پھل پک جاتے ہیں اسیطرح خوش مزاجی سے جس
میں زندگی اور آزادی کا احساس مضمر ہے۔ ہمارے اطوارِ حسنہ کی تکمیل ہوتی ہے۔
اور ہمارے تمام محامدِ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

خوش مزاجی ایک فرض ہے جو کافۂ انام کی طرف سے ہمارے ذمہ ہے
ایک پرانی کہاوت ہے کہ جہاں قوس قزح زمین سے چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہو
واں سونے کا پیالہ ہوتا ہے۔ ایسا ہی سمجھ لو کہ بعض آدمی اس قسم کے ہوتے ہیں کہ
اونکے تبسم۔ آواز۔ گفتگو۔ بلکہ محض موجودگی کو سورج کی کرن سے تشبیہ دے سکتے
ہیں۔ جس گھر میں وہ آئے اُجالا ہوگیا۔ اور جس شے کو اُنہوں نے ہاتھ لگایا
وہ سونا بن گئی۔ جب تک خوش طبعی قائم رہتی ہے۔ دل شکنی نام کو نہیں ہوتی "زندہ
دلی سے نہ صرف اپنی طبیعت ہی خوش رہتی ہے بلکہ دوسروں کا دل بھی ہمیشہ

خوش رہتا ہے۔

بعض شخصوں کا خیال ہے کہ خوش مزاجی میں بے پروائی پائی جاتی ہے لیکن ان دونوں میں کوئی لازمی تعلق نہیں۔ آرنلڈ کہتا ہے کہ "دنیا میں سب سے بڑی برکت خوش طبع لوگ ہیں۔ اکثر ان کے دل میں متانت کے خیالات اور شفقت کے احساسات پائے جاتے ہیں"

کئی لوگ اس قسم کے ہیں جو پیدائش سے ہی گویا جیل خانے میں پڑ گئے ہیں یہ بات غریبوں پر ہی صادق نہیں آتی۔ اب تو امرا کو بھی کہیں ان سے بڑھکر محنت کرنی پڑتی ہے علاوہ بریں جائے غور ہے کہ کتنے ہی آدمی ایسے ہیں جنکا روپیہ ہی زیادہ اونکو مصیبت زدہ بناتا ہے۔ جنکی زندگی میں آرام۔ سکون اور امن نام کو نہیں دنیا میں ہم مصیبت سے تو بچ نہیں سکتے۔ لیکن ہم چاہیں تو اتنا کر سکتے ہیں کہ مصیبت کو محسوس نہ کریں۔ اسکے لئے لازمی ہے کہ ہم اپنے حافظہ کے کمرے کی دیوارون پر خوش کن خیالات کی خوبصورت تصاویر آویزاں کریں۔ عالم خواب میں تو ہم مرضی کے موافق خواب دیکھنے پر مقدرت نہیں رکھتے۔ پر کم سے کم یہ تو ہوسکتا ہے کہ عالم بیداری میں ہم خیالی پلاؤ پکاتے رہیں۔

سب کی خواہش ہے کہ زندگی کا لطف اوٹھائیں۔ لیکن مناسب طرز عمل سے کسی کو بھی آگاہی نہیں۔ انکو زندگی کی مسرت اور عظمت سے کما حقہ آگاہی نہیں ہوتی مصیبت اور رنج سے بچنے کی توقع رکھنا لازمی ہے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ بجائے اسکے ہم غم کی صورت بنائے بیٹھے رہیں ہم خوش طبعی سے رنج کو ٹال دیں ایک مصنف کا قول ہے کہ "مجھے رنج کا احساس تو ہوتا ہے لیکن بفضل خدا دق نہیں ہوتا" چھوٹی چھوٹی تکالیف کو بڑی مشکلات سمجھنا درست نہیں۔ مسٹرڈ کا قول ہے کہ جنکو ابد اور وسعت کائنات سے آگاہی ہو اُسکے آگے دنیا کی سب مصائب ہیچ ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے

کہ اہل بینش کے دل میں یہ بات سمائی ہوئی ہے کہ کوئی امر غیر متوقع ظہور میں نہیں آتا۔ ایسے آدمی کی نگاہ میں ہستی کے مختصر میدان میں یا علوم انسانی میں ایسی کونسی بات ہے جو عظیم یا خطیر معلوم ہو۔ انسان خواہ مخواہ اپنے آپ کو بے چین بناتا ہے۔

جس طرح وقت زخموں کو اچھا کر دیتا ہے اسی طرح تکلیف کا بھی ازالہ کر دیتا ہے۔

مل کا قول ہے کہ" قدرتی اشیا میں۔ ہنر کے کمالات میں۔ نظم کی عالی خیالی میں۔ تاریخ کے حقایق میں بنی نوع انسان کے گزشتہ اور موجودہ رواجوں اور ان کی آئین و صلاح میں۔ غرضیکہ جہاں کہیں تمام اشیا میں دل بہلانے کے لئے لاانتہا ذخیرہ مل سکتا ہے۔ یہ ضرور نہیں کہ ایک فلیسوف کے تربیت یافتہ نفس کو ہی ان امور سے بہرہ یابی ہو۔ کوئی شخص بھی ہو جسکے ذہن کے سامنے علوم کے چشمے کھول دیئے جائیں اور اسکے ذہن کو اپنے قویٰ کا استعمال خاص طور پر آتا ہو ان حقائق سے مستفید ہو سکتا ہے۔

ممکن ہے کہ ان تمام کو نظر انداز کیا جائے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ سب حقائق کے ہزارویں حصے پر بھی عبور نہ ہو۔ لیکن یہ اس صورت میں ہوتا ہے کہ ناظر کو ابتدا سے ہی ان اشیا سے کسی قسم کی اخلاقی یا نوعی دلچسپی نہ ہو۔ اور ان سے اسکی مراد صرف ایک اعجوبہ کی دید ہو۔

دنیا میں پھول۔ درخت۔ گھاس۔ دریا۔ جھیلیں۔ سمندر۔ پہاڑ۔ اور سورج کی روشنی ہمارے سامنے موجود ہیں۔ جو شخص خوش طبع ہیں اُن کے لئے فطرت کا رخ مستور معلوم ہوتا ہے۔ جو تسکین حاصل کرنے پر مائل ہوں اُن کے لئے تشفی بخش ہے۔ وہ آفتاب کے نکلنے کے وقت صبح کا چہرہ خموشی زا اور پیراستہ ہوتا ہے

ہوا میں ایسی بھینی بھینی مہک پائی جاتی ہے کہ گویا موسم بہار از سر نو خزاں کے گرد کلائی ڈال کر گئی گذری رونق کا مُنہ چومنے اور اُسے خواب آلود کرنے کو آیا ہے۔

نذر محمد بی۔ اے

مخزن حکمت ۔ ڈاکٹر غلام جیلانی خانصاحب کی یہ کتاب طالبان علم طب کے لئے خصوصاً اور دیگر شائقین کے لئے عموماً نہایت مفید تالیف ہے۔

آپ سیستان میں سفارتخانۂ انگریزی میں ڈاکٹر رہے ہیں اور ایران سے شمس الاطبار کا خطاب حاصل کر کے آئے ہیں۔ اور وہاں کی مجلس حفظ صحت کے رکن ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے یہ کوشش کی ہے کہ طب قدیم اور طب جدید میں جو مغایرت سی موجود ہے۔ اسکو رفع کیا جاے۔ انہوں نے ہر انگریزی اصطلاح کے مقابلہ میں اسکے مترادف عربی اصطلاح لکھی ہے اور کتاب کو عام فہم بنانے کے لئے اسکے معنے سلیس اُردو میں بھی لکھے ہیں۔ اصحاب طب اس سے بالکل ناواقف ہیں۔ وہ اسے اپنی صحت کی حفاظت کے لئے اور معمولی بیماریوں کے علاج کے لئے اپنا دستور العمل بنا سکتے ہیں۔ طبی لحاظ سے "مخزن حکمت" کی خوبیوں پر بسیط رائے دینا طبیبوں کا منصب ہے اور اسکے متعلق یہ کہنا کافی ہے۔ کہ حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب جیسے مشہور طبیب نے اسکی خوبیوں کی داد دی ہے۔ ہم جناب شمس الاطبا کی محنت اور عرقریزی کا اعتراف کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کتاب کے شایع کرنے سے انہوں نے رفاہ عام کا ایک معقول کام کیا ہے اور وہ ہر طرح کی حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ کتاب کا حجم گیارہ سو صفحے سے زائد ہے اور لکھائی چھپائی کاغذ سب چیزیں پسندیدہ ہیں۔ تشریح کی تصویریں جن میں بعض رنگین ہیں۔ کتاب کی عمدگی میں اضافہ کرتی ہیں اور انگریزی وضع کی نفیس جلد اسے دلکش بناتی ہے۔

ملنے کا پتہ۔ شمس الاطبار ڈاکٹر غلام جیلانی خاں صاحب۔ لاہور۔ قیمت

(مع جلد للعہ۔ بے جلد للعہ)

خط تقدیر

"دنیا میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو فلسفہ کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئیں"
کہتے ہیں کہ شہر لکھنؤ میں ایک بڑا وِدیاوان پنڈت تھا۔ قدرت نے اسکو سوچنے والا دل اور دیکھنے والی آنکھیں عطا کی تھیں۔ ایک روز شام کے وقت وہ تن تنہا دریا کے کنارے ایک دور اور غیر آباد مقام پر سیر کر رہا تھا کہ اسکی نگاہ ریت پر کسی آدھی دبی ہوئی چیز پر پڑی جو سورج کی مغربی شعاعوں میں آئینہ کی طرح چمک رہی تھی۔ پاس جاکر اُٹھائی تو کیا دیکھتا ہے کہ کسی مردے کی پیشانی کی ہڈی ہے۔ قریب تھا کہ ہاتھ سے گرا دے مگر یکایک اسکی نگاہ چند لکیروں پر پڑی جو بے سر کچھ بے قاعدہ سی کھچی ہوئی تھیں اور چیونٹیوں کی رفتار سے مشابہ تھیں۔ پنڈت بہت سے ایسے علموں سے ماہر تھا جن سے عوام الناس ناواقف ہیں اور ایسی پراسرار باتیں پڑھ سکتا تھا جن کا دوسروں کو علم نہیں۔ اسنے مُردے کی پیشانی کی تحریر کو بغور دیکھکر اُسکے نوشتۂ تقدیر کو اپنے علم کی رو سے اسطرح پڑھا:۔

> "جہاں کہیں سے بن پڑے بُری بھلی طرح اپنا پیٹ پالو۔ گلیوں اور کوچوں میں مارے مارے پھرو۔ کھیت اور میدان میں سو۔ دریا کے کنارے پر کتّے کی موت مرو۔ پھر...... دیکھو ہوتا کیا ہے"

یہ الفاظ حیرت خیز اور تعجب انگیز تھے اور انکا مطلب اس سے بھی زیادہ وحشت زا تھا مگر جس بات سے برہمن حیران تھا وہ یہ تھی کہ یہ تحریر اسوقت لکھی گئی تھی جب یہ شخص پیدا ہوا تھا اور خدا جانے کس کس مصیبت اور آفت سے اسنے زندگی کے دن پورے کئے ہونگے۔ اب مرے پر سو دُرّے کی مثال وہ کیا ہے جو اس غریب کو سہنا ہوگا۔

اسے مرے ہوئے خدا معلوم کس قدر عرصہ ہوا ہے یہانتک کہ اسکے گوشت و پوست
کا نشان بھی باقی نہیں رہا اور ہڈیاں گل سڑ کر غبار ہوگئی ہیں اسپر اب کیا باقی رہا ہے جو
اسکے پیش آئے۔ اسی پیچ و تاب میں برہمن نے ٹھان لی کہ اب دیکھنا چاہئے کہ
پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے اور ہڈی کو احتیاط سے اپنی دھوتی کے دامن
میں باندھ کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر پہونچکر اسنے بڑی حفاظت سے اُس ہڈی کو اپنے
کمرے میں ایسی چیزوں کے ساتھ جنکی اپنے پیشے کے متعلق اسکو ضرورت پڑتی
تھی اور جہاں اسکی نجوم اور رمل کی کتابیں رہتی تھیں نہایت پوشیدہ طور پر رکھا
ہر روز صبح کے وقت اپنا بستہ کھولتا اور خبرداری سے جب کوئی دیکھتا نہوا اس میں
سے بدیں خیال وہ ہڈی نکالتا اور دیکھتا کہ اسمیں کوئی تغیر تو واقع نہیں ہوا۔ اسی طرح
مدتیں گذر گئیں اور کچھ بھی ظہور میں نہ آیا۔ اس اثنا میں برہمن کی عورت اسکی تمام کارروائی
سے آگاہ ہوگئی اور دل ہی دل میں بے قرار تھی کہ الٰہی یہ کیا کرتا ہے اور تاک میں
رہتی کہ برہمن کسی وقت غافل ہو اور میں اسکا بستہ کھولکر اس راز سے واقف ہوجاؤں
ایک روز قریب کے گاؤں میں ایک بچہ پیدا ہوا اور برہمن کو صبح سویرے موںہ اندھیرے
وہاں سے بلاوا آیا اور اسکو فی الفور اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کے لئے جانا پڑا۔
عورت جو موقعہ کی تلاش میں تھی وقت کو غنیمت سمجھی اور فوراً برہمن کی کوٹھری میں گھس
اور بستہ کھول گوہر مقصود نکالا تو سوائے اُس استخوانِ پوسیدہ کے اور کچھ برآمد نہوا۔ بہت
سٹ پٹائی کوئی بات سمجھ میں نہ آئی آخر سوچی کہ ہو نہو یہ ہڈی میری سوت کی ہے اور برہمن
کو اس سے اسقدر محبت تھی کہ میرے بعد بھی اسکی پیشانی اس حفاظت سے رکھی ہے
اور صبح صبح اوٹھکر اسکی پوجا کیا کرتا ہے۔ بس یہ خیال آنا تھا کہ آتش حسد سے آگ
بگولا ہوگئی۔ ہڈی کو باورچیخانہ میں لیجا کر سل بٹے سے پیسکر سرمہ کیا اور بدرو میں ڈالدیا
برہمن نے آکر دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ پایا۔ آخر اپنی بیوی سے پوچھا تو وہ پنجے جھاڑ کر

پیچھے پڑ گئی اور گالی گلوچ کا ایسا طوفان اُٹھایا کہ بیچارہ برہمن موںھ دیکھنے کا دیکھتا رہگیا۔
آخر جب اُسنے بتایا کہ میں نے اِس کتیا مُردار کی ہڈی جسکا تم روز درشن کرتے تھے
اور جسکی پوجا کے بغیر تم رہ نہیں سکتے تھے بدرو میں ڈالدی تو اسنے وہاں جاکر
دیکھا۔ مگر سوائے ایک بھوری بھوری خاکستر کے جسمیں پاخانہ سے میلا کچیلا پانی
بہ کر لگگیا تھا اور کچھ نہ پایا غرض استخوان شکستہ کا یہ انجام ہوا۔ اور یوں اس خوفناک
نوشتۂ تقدیر کی آخری پیشینگوئی پوری ہوئی۔

برہمن کچھ موںھ میں بڑبڑاتا باہر چلا گیا اور جورو اپنی کامیابی پر گویا پھولی جامے میں نہ
سمائی تھی۔ رات کو خاوند اور بیوی آرام کے لئے اپنے کمرے میں گئے بیوی تو
سوگئی اور خاوند کو موت اور حیات کے پیچیدہ مسئلے سوچتے سوچتے آدھی رات ہوگئی
اسوقت اسنے جو آنکھ اُٹھاکر دیکھا تو اپنے بستر کے عین برابر چھت میں سے ایک
باریک سا تاگا لٹکتا ہوا پایا۔ پہلے تو کچھ خیال نہ کیا مگر رفتہ رفتہ تاگا بڑھکر اسکی چارپائی
کے قریب پہونچنے لگا۔ برہمن آنکھیں ملنے لگا اور قریب تھا کہ اپنی بیوی کو آواز دے
کہ تاگا ایک نہایت زہریلا سانپ بن گیا اور اسنے برہمن کی ناک پر کاٹ کھایا۔ پیشتر
اسکے کہ برہمن اُٹھکر بیٹھے سانپ ایک روزنِ دیوار میں سے نکلکر کمرہ سے باہر ہوگیا
یہ بمشکل اُٹھکر دروازہ کھولکر باہر نکلنے کو تھا کہ سانپ نے ایک خوفناک بھیڑئے
کی شکل اختیار کی اور ایک ہمسایہ کے بچے کو جو صحن میں سو رہا تھا پھاڑ کھایا۔ برہمن نے
اب جان ہتیلی پر رکھ لی اور اسکے پیچھے پیچھے ہولیا۔ اتنے میں بھیڑئے نے ایک
نوجوان کی شکل اختیار کی اور برہمن کی طرف مڑکر مبتسم نگاہوں سے دیکھا۔ برہمن
نے دلکو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور اسکے پاؤں میں گر پڑا کہ یہ کیا ماجرا ہے
اس نوجوان نے جواب ایسی آواز سے جس میں نہ خفگی تھی نہ ناراضگی تھی دیا کہ میں موت
کا گماشتہ ہوں اور دنیا میں جس جس طرح لوگوں کی موت لکھی ہوئی ہے اسکو پورا کرنے

آیا ہوں - بس اب میرا پیچھا نکرو-

برہمن اپنی جان سے ہاتھ دھو چکا تھا تعاقب سے باز نہ آیا - فرشتے نے پھر مڑکر کہا کہ اب کیا چاہتے ہو-

برہمن نے کہا کہ میں صرف اسقدر پوچھنا چاہتا ہوں کہ میری موت کس طرح لکھی ہے -

موت کے گماشتے نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ تم دلیر آدمی ہو مگر اب بھی اُسکی آواز میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے ترس اور خوف پایا جاوے -

برہمن اپنی بات پر اڑا رہا اور پھر وہی سوال کیا - اسپر فرشتے نے رعد کی آواز میں جواب دیا کہ تم دریاے گنگا میں کام نہنگ کا طعمہ بنوگے - کیا تم اپنی تقدیر سے بھاگ سکتے ہو اور پیشتر اسکے کہ برہمن اس خوفناک پشین گوئی کے معنے سمجھے نوجوان ہوا ہو گیا -

برہمن نے گھر آکر - اپنی جورو کا کریا کرم کیا اور ہمیشہ کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ دیا اسنے اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ ہیبت ناک گنگا کے نزدیک نہ ہونگا - وہی ہو یا کچھ ہو مگر ایسی جگہ جا کر رہونگا جہاں لوگوں نے اس خوفناک دریا کا نام بھی نہ سنا ہو - کہنا آسان ہے مگر کرنا مشکل ہے - بجاے اسکے کہ مغرب کی طرف جاتا (جہاں خواہ لوگوں نے گنگا نام تو سنا ہوگا مگر اسکی شکل نظر نہ آتی) وہ مشرق کی طرف روانہ ہوا اور آخر کار برما کے علاقہ میں پھونچ گیا - یہاں بود و باش اختیار کر لی - ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر اُسے سجایا اور اپنے کاروبار میں مشغول ہوا - اسکی لیاقت اور دانشمندی کا جلد ہی شہرہ ہو گیا - اور وہاں کے مہاراج اوہراج کے دربار تک اسکی رسائی ہو گئی -

اتفاق سے مہاراجہ کو اپنے لڑکے کے واسطے ایک لایق پنڈت کی ضرورت تھی

اسکے فضل و کمال کا شہرہ تو سُن ہی چکا تھا۔ اب دیکھا تو ہمہ دانی اور دانشمندی میں اسے کہیں بڑھکر پایا۔ غرض اپنے لڑکے کا اتالیق مقرر کیا۔ برہمن کا حال کسی کو معلوم نہ تھا اور اسنے اپنی پہلی عمر کے واقعات کی طرف کبھی اشارہ تک نہ کیا۔ لڑکا اس اثنار میں بڑا ہوگیا اور اب وہ وقت آپہونچا کہ مہاراج نے اپنے تمام ارکین سلطنت کو جمع کرکے دریافت کیا کہ شہزادہ کی تعلیم کا کیا بندوبست کرنا چاہئے۔ سبنے عرض کیا کہ نوجوان شہزادہ تمام علوم میں یکتا اور سارے فنون میں کامل ہوگیا ہے اب مناسب ہے کہ گھر سے باہر قدم رکھے اور سیر ممالک سے اپنی نظر کو وسیع کرے۔ چنانچہ سب سامان سفر تیار ہوا اور شہزادہ نے اپنے اتالیق سے کہا کہ آپ بھی تشریف لے چلیں اتالیق نے صاف انکار کردیا۔ یہ خبر مہاراجہ تک پہنچی جسنے پنڈت کو ہمیشہ نہایت مطیع اور وفادار پایا تھا اسکو اس سے نہایت مایوسی ہوئی۔ اور پنڈت سے بضد ہوا کہ آپکو ضرور شہزادہ کے ہمراہ جانا ہوگا۔ پنڈت کو اب انکار مشکل ہوگیا اور ناچار اپنی رام کہانی اور گنگا رانی کی واردات سنانی پڑی۔ اسپر درباری اور خود شہزادہ بھی خوب قہقہہ لگا کر ہنسے اور پنڈت کی توہم پرستی پر اسکو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ پنڈت بہت کھسیانہ ہوا۔ مگر سب کے اصرار و خوشامد و انعام بیش بہا کے وعدوں سے شہزادے کے ہمراہ رکاب جانے پر راضی ہوگیا۔ مگر شہزادے اور اُسکے باپ سے اس امر کا وعدہ لے لیا کہ اگر کہیں شہزادہ دریاے گنگا کے نواح میں پہنچ جاے تو میں اپنے وطن کو لوٹ آؤنگا۔

لگن دیکھکر شہزادہ روانہ ہوا اور بہت سے مقامات کی سیر کی یہانتک کہ ان کا کیمپ جنوبی بنگال میں پہنچ گیا۔ برہمن نے اپنا وعدہ یاد دلایا مگر شہزادہ نے ایک نہ سنی اور اپنا تمام فلسفہ اور منطق برہمن کو سمجھانے میں خرچ کر ڈالا کہ آخر آپ کو اس مقدس دریا سے کیوں نفرت ہے۔ پھر کہا کہ تنخواہ و انعامات موجودہ سے دس گنا

سے لیجیے اور ایک بار میرے ساتھ چلکر دریا کے کنارے پر کھڑے ہوجایئے ورنہ لوگ کیا سمجھیں گے کہ آپ سا دانا ایسی وہمی باتوں کے خیال سے اپنے اوپر جگ ہنسائی کراتا ہے۔

شہزادے کا اصرار۔ انعام کی توقع اسپر ہمراہیوں کی چھیڑ چھاڑ برہمن کے شکوک لگے زائل ہونے اور انجام کار وہ راضی ہوگیا۔ فوراً ایک سو سورما جوان۔ زرہ بکتر پہنے۔ ہتھیاروں سے اوچی بنے۔ ڈھال تلوار لگائے اچھل پڑے اور دریا کے کنارے پہونچے۔ شہزادہ اور اتالیق بھی آکر اپنے گھوڑوں سے اُترے اور دریا کی طرف دیکھنے لگے۔ پانی کس قدر صاف اور دریا کیسا خاموش تھا۔ اسکے تمام وسعت پر ایک لہر تک نہ تھی۔ کیا اس میں گھڑیال ہوگا؟ سب بے اختیار ہنسنے لگے یہانتک کہ خود برہمن بھی اس خوشی میں شریک ہونے سے باز نہ رہسکا اور وہ بھی مسکرانے لگا۔

شہزادہ کے حکم پر ایک سو سپاہی پانی میں کود پڑے اور ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے ایک ایسی جگہ حلقہ باندھکر کھڑے ہوگئے جہاں کمر تک پانی آتا تھا۔ اس حلقہ میں شہزادہ کو اشنان کرنا تھا۔ اس وقت شہزادے نے مسکراکر اپنے اتالیق کی طرف دیکھا جسپر برہمن سے رہا نگیا اور اسکے ہاتھ میں ہاتھ دیکر کہنے لگا۔ میں ایسا بزدل بھی نہیں ہوں کہ آپکے ساتھ ایسی جگہ جہاں ایک سو مسلح جوان کھڑا ہے نہا سکوں اُس طرح سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے مزے مزے کی باتیں کرتے دونوں پانی میں اُترے اور اس حلقہ میں جا کھڑے ہوئے۔ سورج اندر با ہر تھا۔ نہانے والوں نے اشنان کا گیت گانا شروع کیا ایک لحظہ میں سب نے کا اپنے سر پانی میں ڈبوکر غوطہ لگانا تھا کہ یکایک شہزادہ ایک بھیانک اور مہیب گھڑیال بن گیا۔

گھڑیال نے گرج کر کہا کہ او برہمن میں وہی اجل کا گماشتہ ہوں اور برہمن کو کمر سے پکڑ مسلح آدمیوں کی صف چیر کر گھر سے پانی میں لے گھسا اور نظروں سے غائب ہوگیا

عالم خیال

چند روز ہوئے جناب حکیم محمد اجمل خاں صاحب کو خطاب حاذق الملک عطا ہونے پر دہلی کے ہندو مسلمان روسا کی جانب سے ایک شاندار پارٹی روشن آرا باغ میں دیگئی تھی جس میں علاوہ دیسی شرفا کے تمام انگریز حکام مقامی بھی تشریف فرما تھے۔ اس مجمع کے روبرو دہلی کے ناظم خوش بیان جناب سید وحیدالدین خاں بیخود نے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے

حاذق الملک کا ملنا تمہیں کیونکر نہ خطاب ۔۔۔ نام تدبیر ہے جسکا وہ سراپا تم ہو
آپ اپنی ہو نظیر۔ آپ ہو تم اپنا جواب ۔۔۔ یعنی اس عالم ایجاد میں یکتا تم ہو
شہرت عام ہے۔ دعوی پہ دلیل روشن ۔۔۔ خاص نکتہ ہے کہ یکتائی کا دعوی تم ہو
سب طبیبوں کو ہے تقلید تمہاری لازم ۔۔۔ مسند آرا و شہنشاہ اطبا تم ہو
حسن اخلاق بھی ہے دست شفا کی شامل ۔۔۔ چشم عالم کے لئے آنکھ کا تارا تم ہو
دیکھکر جیتے ہیں بیمار تمہارے تمکو ۔۔۔ اپنے بیمار کے جینے کا سہارا تم ہو
نبض پر ہاتھ رکھا اور مرض کہکے ہٹا ۔۔۔ میں نے پہچان لیا ہے تمہیں۔ اچھا تم ہو
نہیں حکمت سے کوئی بات تمہاری خالی ۔۔۔ کسقدر عاقل و فرزانہ و دانا تم ہو
بھاگ جاتی ہے اجل نام تمہارا سنکر ۔۔۔ ملک الموت سے کیوں معرکہ آرا تم ہو
تمسے لقمان و ارسطو کو بھلا کیا نسبت ۔۔۔ چشمہ فیض تھے وہ۔ فیض کا دریا تم ہو
علم و اخلاق و کرم نے جسے ڈھونڈا تم تھے ۔۔۔ جاہ و اقبال و حشم نے جسے تاکا تم ہو
چل نہیں سکتا ہے اعجاز کے آگے جادو ۔۔۔ سامری فن ہے جو دشمن ید بیضا تم ہو
صاف باطن بھی ہو اُتنے ہی خدا ہے آگاہ ۔۔۔ جسقدر دیکھنے میں آئینہ سیما تم ہو
آج اس باغ میں رونق ہے تمہارے دم سے ۔۔۔ سچ کہوں زیب دہ بزم احبا تم ہو
جانتے بھی ہو یہ بیخود کی دعا کا ہے اثر ۔۔۔ اسکے ممدوح مگر شکر خدا کا تم ہو
تم سلامت رہو۔ آباد رہو۔ شاد رہو ۔۔۔ بزم احباب جہاں ہو طرب افزا تم ہو
چشم بد دور زمانہ کی نظر ہے تم پر ۔۔۔ حاذق الملک ہے کیا مال مسیحا تم ہو

کتاب

اے میری سچی غمگسار، میری تنہائی کی مونس، رنج و راحت کی شریک، میری ادیب، میری مددگار، میری کتاب! تیری دلداری و غمخواری پر میں نثار۔ ہر حرف تیرا غنچہ ہے اور ہر لفظ تیرا گلدستہ۔ تیری لوح و جدول سبز رخسار کے خط و خال سے زیادہ دل آویز ہے۔ تیرے مصحفِ رخ کی زیارت مسرت خیز و نشاط انگیز ہے۔

تو ارشاد و ہدایت کا سرچشمہ ہے، اور نیکی و پاکیزگی کا سرمایہ۔ تو علم کی کان ہے، اور اخلاق کی جان۔ فرع و اصل، عقل و نقل کا تو خزینہ ہے، اور سلف کی تحقیق و معلومات کا گنجینہ۔ تیری شعاع نے دماغ کو روشن و عقل کو مزین کیا۔ آدمِ خاکی تیری بدولت اشرف مخلوقات ہوا۔ تو محرم راز و مخزنِ اسرار ہے۔ تو ہمارے بزرگوں کے دماغ سوزی کی بہترین یادگار ہے۔ تو مظاہر قدرت کا منبع ہے اور زمانہ کی نیرنگی کا مرقع۔ "ازل تیری ابتدا اور ابد تیری انتہا ہے"

تو ایزد شناسی کی بسم اللہ ہے اور معرفت الٰہی کا ذریعہ۔ تو نے ذات باری کی وحدت ظاہر و مصنف حقیقی کی معدلت خدا پرستی و خدا ترسی تو نے سکھائی۔ کارساز کریم کی کارسازی و مشکلکشائی تو نے بتائی۔ اُسکی شانِ جلالت کی دلیل اور اُس کے دریاے رحمت کی سبیل تو نے دکھائی۔

تو خدا کا کلام اور اُس کا پیام ہے۔ تو بناے رُسل و شمع سُبل ہے۔ تو رسالت کی بُرہانِ قاطع و نبوت کی نور ساطع ہے۔ تو خدا کا بیش بہا تحفہ، ہادی برحق کی

قوت بازو اور ہماری رہبری رہنما ہے۔ تو وہ برگزیدہ امانت ہے جس کی نبی آخر زمن نے تا دمِ واپسین حفاظت کی اور وقتِ وصال تیری نگہداشت کی تاکید وہدایت کی۔

دین کی قلمرو اگر تیری جاگیر ہے تو دنیا کی مملکت بھی تیرا سریر ہے۔ فضائے بسیط کا بسط، مادہ کا ہیجان وحرکت۔ بحر امواج کی روانی۔ کرۂ نار کی آتش فشانی۔ عناصر کی تعدیل وترکیب۔ عالم دنیا کی تکوین وترتیب وموالید ثلاثہ تیرا دیباچہ ہے نسلِ انسانی کے بانی باوا آدم و ماما حوا کا بہشتی زندگی بسر کرنا، آب وگلِ دنیوی میں پھنسنا، دنیا کو دین کی طرح برتنا اور ویرانۂ جہاں کو اپنے آل وعیال سے بسانا تیرا مقدمہ ہے۔

بنی آدم کی ابتدائی اوقات گذاری، اُن کی عملی زندگی، تدریجی ترقی، اصلاحِ معاشرت، اشیا کی حقیقت وقانون قدرت سے واقفیت تیرا ایک ورق ہے۔ موجوداتِ دنیا وکائناتِ عالم پر انسانی قبضہ، تاریخ ازمنہ سابقہ وقرونِ مختلفہ، مصر کی دانش، ہند کی بینش، فارس کی ذہوشی، یونان کی روشن دماغی، اہلِ عرب کی حکمۃ آموزی، دانایانِ فرنگ کی بہرہ اندوزی تیرا ایک سبق ہے، تو علم وعمل کی حاوی و ادب ومعارف کی حامی ہے۔ تو ہر علم کی عامل وہر فن کی کامل ہے۔ تواریخِ عالم تیرا ایک صفحہ اور اگلی قوموں کا عروج وزوال تیرا خاکہ ہے۔ عروسِ دنیا کی رنگینی وزمانہ کی بوقلمونی تیرے دم سے، اور حسن کی ہنگامہ آرائی وعشق کی کارفرمائی تیرے قدم سے ہے۔ تیرا ہر واقعہ عبرت خیز اور تیرا ہر فسانہ حیرت انگیز ہے۔ شداد کی بہشت کی کیفیات، سکندر اعظم کی فتوحات، وحضر کا آبحیات، تیرا دلربا فسانہ ہے لیلیٰ ومجنوں کے جذبات وشیریں فرہاد کے عشق کے واردات تیرا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اصلاح تیرا کام ہے اور مفتاح تیرا نام۔ کہیں تو دوستوں کی تقریب کرتی ہے،

کہیں دشمنوں سے بچنے کی ترکیب بتاتی ہے، کہیں جلبِ منفعت کا گر سکھاتی ہے اور کہیں دفعِ مضرت کا افسوں پڑھاتی ہے۔ تو ایامِ گزشتہ کا صحیح نقشہ و فدا کا ہوبہو سراپا ہے۔ تو حرزِ جانِ دستِ فطرت کی ترجمان ہے۔ تو یاس و ہراس میں تسکین و تشفی دیتی ہے اور عیش و نشاط میں اعتدال کی تاکید کرتی ہے۔

"تو آسایشِ دو گیتی" کی تفسیر و خواب راحت کی تعبیر ہے۔ تو سیر بین کونین و سر دفتر دارین ہے۔ تو عقل و فکر کی ہیکل و ذہن و جودت کی صیقل ہے، تو لڑکپن کی شفیق و جوانی کی اتالیق اور بڑھاپے کی رفیق ہے۔ کوئی تیری فصاحت پر مائل اور کوئی تیری بلاغت کا قائل ہے۔ تیرا ہر لفظ "اخلاص کے پھولوں میں بسا" اور تیرا ہر نقطہ عطرِ محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔

تیرے قدر شناس صفحۂ ہستی پہ ہمیشہ رہیں گے۔ تیرے دلدادہ تیرے دامنِ فیض کو کبھی نہ چھوڑیں گے۔

اے چشمِ بصیرت کی روشنائی! شکستہ دلی کی مومیائی!! میری لیلائے معانی!!! تیری زلف گرہ گیر کا میں اسیر، اے میری جان، میری ایمان! جب تک دم میں دم ہے تو میرے ساتھ ہے اور مرنے کے بعد بھی تو ہی میری وسیلۂ نجات ہے۔

میرزا عابد حسین (از اگرہ)

اے آنکہ سفتہ در رگِ جانم سخن سخن | ہمچو صدف پُر است ز گوہر دہن دہن
ترکم چو نعرہ زد گُل زخمے کُراد ہم | دل در تپید و گفت کہ جاناں بزن بزن
یک دام بر فگن زتپیدن چو بشکنم | دارد عجیب زلف شکن در شکن شکن
جیبے نہ بگنج قبر ز دنیا کسے نبُرد | دارم ہمیں ز مال جہاں یک کفن کفن
شاعر بجوش آمدہ خونابہ ہائے چشم | کردم بہ اشک دامن خود را چمن چمن حسین

تصویر قناعت

دریا کے کنارے ایک جوگی اپنے دھیان لگائے بیٹھا ہے۔ مال دنیا سے ایک لنگوٹ کے سوا کچھ اسکے پاس نہیں کھانیکی فکر نہ کمانیکا خیال جب سے دنیا کو چھوڑا ایک دن کھانا اپنے ہاتھ سے نہیں پکایا پکی پکائی کا گاہک ہے مل گئی تو کھالی نہ ملی تو خاموش لیٹ رہا دنیا کے بندے جو اپنی غرض کو ملنے جاتے ہیں کچھ نہ کچھ کھلا آتے ہیں۔ مگر کوئی نہ پوچھے تو اسے شکایت نہیں۔ نہ کسی سے سوال کرتا ہے نہ حرف انکار سنتا ہے استغنا کے اس پتلے کو تصویر قناعت کہیں تو شاید بیجا نہو گا مگر قناعت اسی پر نہیں ہے

دوپہر کا وقت ہے۔ زمیندار ہل جوت رہا ہے بیوی گانو سے کھانا لئے آرہی ہے بچے ساتھ ساتھ دوڑے آتے ہیں۔ دوڑ کر باپ سے لپٹ جاتے ہیں۔ جو کی روٹی اسپر پیاز کی ایک گٹھی۔ چھاچھ حلق تر کرنے کو کسان کھانا کھاتا ہے۔ بیوی پاس بیٹھکر اپنے دامن سے پنکھا جھلتی ہے بچے کو چھاچھ گھر سے پی کر چلے تھے۔ ایک ایک پیالہ اور اڑا لیتے ہیں۔ اور جوش خوشی میں اچھلتے ہیں۔ کسان کی مطمئن نگاہ بیوی کی طرف اور بیوی کی محبت بھری نگاہ خاوند اور بچوں کی طرف اٹھتی ہے اور دونو نگاہیں آپسمیں ملتی ہیں۔ کسی مصوّر سے پوچھ لیجیے۔ یہ تصویر قناعت کی کیسی اچھی تصویر ہے مگر ہم کچھ اور ڈھونڈتے ہیں۔ سر کے بال سفید۔ ڈاڑھی کے بال سفید بھووں تک سفید۔ چہرے پر جھریاں ایک بڑے میاں پوتوں پروتوں میں گھرے بیٹھے ہیں۔ اتنی اولاد ہوئی اور آگے اولاد کے اولاد حسن اتفاق سے آجتک کسی کا داغ نہیں دیکھا۔ خود بھی خوشحال ہیں۔ اولاد بھی خوشحال جوانی میں خوب روپیہ کمایا اور پس انداز کیا۔ بڑھاپے میں اسکی آمدنی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور وقت گفتگو

ہر فقرے میں خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اگر کوئی شخص کوئی تجویز پیش کرتا ہے جس سے
انکی آمدنی میں اور ترقی ہو تو فرماتے ہیں میاں خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے
اب زیادہ حرص سے کیا فائدہ یہ بھی ایک تصویر قناعت کی ہے لیکن محض ظاہری
باطن میں ناکمل ہے۔ گو ان مثالوں میں بھی جن کا ذکر کیا گیا ہے قناعت پسندیدہ
ہے لیکن یہ قناعت بہت داد کے قابل نہیں جوگی دنیا ترک کر چکا۔ اسپر اس کا
حصہ اسے پہونچ رہا ہے۔ پھر اسے کیوں شکایت ہو۔ کسان اگرچہ نہایت محنت
کی زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر بھی اسکے درجے کی جو نعمتیں ہیں اسے مل گئی ہیں۔
بڑے میاں کی قناعت دنیا بھر کی کامیابیاں جمع ہونیکا نتیجہ ہے۔ اس پر بھی
اگر وہ زیادہ لالچ کرتا یا اپنے نصیب کی شکایت کرتا۔ تو لالچی اور ہوس پرست کہلاتا ان
سب قناعتوں سے بڑھکر اور زیادہ قدر کے لایق اس حرماں نصیب کی قناعت
ہے جو دنیا کی آلایشوں میں گھرا ہوا دنیا کی ضرورتوں سے مجبور مگر دنیا کی اکثر
نعمتوں سے محروم ہو اور اسپر دلیری کے ساتھ تمام مشکلات کا مقابلہ کرتا ہوا زندگی
بسر کرے اور رنج و غم کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دے۔ اسکے ماتھے پر بے صبری
یا بیقراری کی وجہ سے کبھی بل نہ آئے جب دیکھو خندہ پیشانی جب پوچھو صابر و
شاکر۔ ہمت ہر وقت بلند اور ارادہ ہر حالت میں مضبوط۔ دنیا کے بڑے بڑے
کامیاب اور دولتمند اس ملک قناعت کے بادشاہ کے پیچھے ہیں۔ کیونکہ
اسکے پاس قناعت کا ایک ایسا خزانہ ہے جو کبھی خالی نہو گا۔

اکرام

حضرتِ کُن

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرتِ کُن پیدا ہوتے ہی رحلت فرما گئے۔ اور اب دنیا میں انکا نام ہی نام باقی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام موجودات کا وجود انہی جناب کے سہارے پایا جاتا ہے۔ یہ مرجاتے۔ جہان سے گزر جاتے تو یکگونٗ کی صورت نظر نہ آتی۔

لوگوں کو انکی موت کا شبہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ جو کرشمہ اُنھوں نے اپنی پیدائش کے وقت دکھایا تھا وہ دوبارہ نہ دیکھا گیا۔ انکی پیدایش سے پہلے نہ آسمان تھا نہ زمین اور نہ یہ تمام غلطاں پیچاں چیزیں جو آسمان زمین پر چھائی ہوئی ہیں۔ اور نہ میاں آدم بھی جو آج حضرتِ کُن کی زندگی پر بحث کر رہے ہیں ظہورِ کُن سے اول غائب تھے مختصر بات یہ ہے کہ ناپید اور عدم کا لفظ بھی گم تھا۔

حضرتِ کُن کے میلاد شریف کی کیفیت یوں بیان کی جاتی ہے کہ جب خزانہ مخفی میں خودنمائی وخودآرائی کا جذبہ اُٹھا۔ اور اس جذبہ نے سکوت معدوم کے دریا میں ایک لہر اور جنبش پیدا کی۔ خواہش نمود کا بادل گرجا اور برسوں کی قید شدہ بجلی نے بادل سے باہر آکر چمکنا چاہا تو سب سے پہلے حضرت کُن کو ولادت[۱] کا شرف عطا کیا گیا۔ جب یہ حضرت آغوش دہن سے باہر تشریف لائے تو عجیب شان سے آئے۔

---

۱ یہاں وہ ولادت مراد نہیں جو ماں باپ کے تعلق سے ہوتی ہے۔ اس قسم کی ہر ولادت سے قرآن شریف کی سورۂ اخلاص میں انکار کیا گیا ہے۔ ہم اس منکر کو سچا جانتے اور ڈر کے مارے ولادت کی تشریح کر دیتے ہیں۔ حسن نظامی

ھوحق سناٹے میں زور سے تجلی ہوئی۔ اور ایک سایہ منودار ہوا۔ یہ سایہ تیزی سے گردش کرتا تھا اور موجودہ عالم کی رنگارنگ شکلیں اسمیں یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی جاتی تھیں۔ یہانتک کہ اس سایہ کی گردش آہستہ آہستہ تھمی اور وجود عالم جم کر قایم ہو گیا۔

اسکے بعد نہ پھر کبھی ایسی تجلی ہوئی نہ کوئی اس قسم کا دوسرا عالم ظاہر ہوا۔ اسواسطے بعض آدمی کہتے ہیں کہ حضرت کن چل ہی بسے ورنہ کبھی تو کوئی اور جلوہ دکھاتے۔

لیکن آدم زاد غلطی کرتے ہیں جو مولانا کن کو مردہ تصور کرتے ہیں۔ وہ زندہ ہیں۔ اور ہر روز تجلیاں نازل کرتے ہیں۔ یہ پرانا کارخانہ شب و روز نئے رنگ بدلتا ہے۔ جناب کن نہوتے تو یہ نت نئی رنگینیاں کہاں سے آتیں۔ ہمارا تو اسپر ایمان ہے کہ حضرت کُن زندہ ہیں۔ زندہ رہیں گے۔ اور مرنا انکے لئے محال ہے کلام ہے تو اسمیں ہے کہ آیا انکی ولادت کی ضرورت بھی تھی یا نہیں۔ اور جب وہ پیدا ہو ہی گئے تو انکا وجود کچھ کام بھی آیا یا یوں ہی افشاے راز کا وہم ثابت ہوا۔

اس معاملہ میں دو خیال ہیں۔ حضرت کن کے حامی جو آرائش عالم کی ظاہری بہار کے شیدا ہیں۔ کہتے ہیں۔ کُن نے بڑا احسان کیا جو ہمکو راز کے بند صندوق سے باہر نکالا۔ اور عجیب و غریب تماشے دکھائے۔ مگر گروہ مست قلندر جناب کُن کا بہت شکوہ گزار ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ نہ یہ حضرت تشریف لاتے نہ ہمارے سکون وحدت میں طوفان آتا۔ خشک و تر۔ خیر و شر۔ جاندار و بے جان۔ سینہ سے سینہ لگائے آرام سے سوتے رہتے۔

اب پہاڑ جنگل بیابان میں اکیلے کھڑے ہیں اور شہروں کی رونق دھیل پل

کو ترستے ہیں۔ شہر رات دن کے غل و شور سے اُکتاکر پہاڑوں اور صحراؤں کی تنہائی و خاموشی پر حسرت کے آنسو بہاتے ہیں۔ دریا شاکی ہیں کہ ہم بہتے بہتے تھک گئے۔ یہ کنارہ آرام سے بیٹھا ہے۔ یہ کیوں نہیں بہتا۔ کنارہ کہتا ہے میں خود اپنی اُفتادگی سے نالاں ہوں۔ نقل مکان کر نہیں سکتا۔ ورنہ تمہاری طرح سیر کرتا پھرتا۔ سب سے زیادہ انسان اپنی تکلیفیں بیان کرتا ہے۔ بچپن اور جوانی۔ بیماری اور بڑھاپا۔ غریبی و امیری۔ نیکی و بدی۔ سب اسکی جان کے لئے وبال بنے ہوئے ہیں۔ ہم بھی جہانتک غور کرتے ہیں انسان کی شکایتیں واجبی معلوم ہوتی ہیں۔ پر جہاں اسکو کُن کے سبب آزادہ پراگندگی نصیب ہوئی ہے طرح طرح کی خوشیاں بھی ملی ہیں جو درجوں اور حالتوں میں تقسیم ہو کر ایسی پُر لطف بن جاتی ہیں کہ عالم ایک جائی میں انکا حاصل ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

حسن نظامی (از خانقاہ مبارک حضرت محبوب الہیؒ)

حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خانصاحب کو گورنمنٹ سے خطاب ملنے پر

جو جلسہ عام حال میں ٹاؤن ہال دہلی میں ہوا اس میں شمس العلما مولانا حالی نے اختتام تقریر پر ایک دلچسپ قطعہ بھی پڑھا تھا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

حاذق الملک اس خطاب فرخ و مسعود پر	ایک عالم آپ کو دیتا مبارکباد ہے
پر یہ سے ہے کیسی مبارکباد ہم حیران ہیں	گو کہ دل ہر اپنے بیگانے کا اس سے شاد ہے
سعی و کوشش آپنے کی تھی کبھی بہر خطاب؟	یا کوئی درخواست دی بھی آپنے کچھ یاد ہے؟
یہ تو یارو نکی دعاؤں کا ہے بس سارا ظہور	غیب سے یہ اُن دعاؤں کی ہوئی امداد ہے
پس مبارکباد دیجو دے رہے ہیں خاص و عام	مستحق ہیں اسکے ہم یا آپ۔ کیا ارشاد ہے؟

ملکہ بلقیس

میرا نام "نقاب پوش" ہے میں صحرائے اعظم کا رہنے والا اور بدوؤں کے ایک قبیلہ کا سردار ہوں عربی علم ادب کی تمام مشہور کتابوں پر مجھے عبور حاصل ہے۔ اور میں زبان عربی کا ادیب مانا جاتا ہوں میرا پیشہ تاخت و تاراج ہے۔ صحرائے اعظم سے گذرنیوالے مسافر میرا نام سنتے ہی اپنی جان و مال سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں جس قبیلہ کا میں سردار ہوں۔ اُسکے قانون معاشرت و تمدن کا مجموعہ یہ فقرہ سمجھا گیا ہے کہ "جس کی لاٹھی اُسکی بھینس" میرے قبیلہ کے سب زن و مرد پیر و جوان اپنے چہروں پر ایک قسم کی نقاب ڈالے رہتے ہیں۔ جس میں سے صرف ناک اور آنکھیں دکھائی دیتی ہیں اپنی اپنی نقاب ہم کھانیکے وقت بھی نہیں اُتارتے ہم اسکے یہانتک عادی ہوگئے ہیں کہ جو بغیر نقاب ہو۔ ہم اسکو غیر سمجھتے ہیں۔ اور اگر ہم سے کوئی مارا جائے اور اُنکی نقاب گم ہو جائے (نقاب کے گم ہونیکی فقط یہی صورت ہے) تو جبتک ہم اُسکے چہرے پر نقاب نہ ڈالیں ہم اُسکو پہچان نہیں سکتے۔ اِسلئے ہمارا نام نقاب پوش ہوگیا ہے۔

میرے پہلے ہی سفر کا انجام نہایت عجیب ہوا۔ میرا گذر ایسے خطرناک راستوں سے ہوا۔ جن پر کبھی انسانی قدم نہ پڑا ہوگا۔ اِسلئے اسکا مختصر سا بیان خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

قریب دو ماہ قمری سے ہمارا طائفہ جس میں تین سو جوان مشہور و مسلح شامل تھے ایک کمین گاہ میں پڑا ہوا تھا۔ ہمکو اطلاع مل چکی تھی کہ تاجروں کا ایک قافلہ ہاتھی دانت اور دیگر قیمتی اشیائے تجارتی سے لدا ہوا آرہا ہے۔ ہمارا ارادہ تھا۔ کہ اول تو اُس کارواں سے صحرائے اعظم کے جسکو ہم اپنی میراث و جاگیر خداداد سمجھتے تھے) محصول راہداری کا مطالبہ کیا جائے۔ ورنہ بصورت انکار کارواں کے کل زر و مال کو مال غنیمت سمجھکر اُس پر قبضہ کرلیا جائے۔

ہم کارواں کا انتظار نہایت بے صبری سے کر رہے تھے۔ کہ ہمارے جاسوسوں نے جو نہایت

ہوشیاری سے اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔ مجھے خبر دی کہ ابھی کارواں کو آنے میں ہمارے حدود میں دو ہفتے باقی ہیں۔ میرے دل میں خیال آیا کہ اس اثنا میں گرد و نواح کی چٹانوں اور پہاڑوں کی سیر کیجائے۔ جن پر مسلمان فاتحوں کی یادگاریں کندہ ہیں۔ چنانچہ ایک روز علی الصباح میں اپنی سریع السیر سانڈنی پر مسلمان فاتحوں کی یادگاروں کے معائنہ کیلئے نکلا۔

آفتاب نکل آیا تھا اور میں اسکی شدید حدت میں اُس ریگستان کیطرف جارہا تھا جسمیں پانی عنقا تھا اور جس کی وسعت کا صحیح اندازہ ہم صحرانشیں بھی آجتک نہیں کرسکتے۔ کیونکہ پانی کے نایاب ہونیکے باعث متواتر منازل کا طے کرنا ناممکن محض ہے۔

شام ہونے کو تھی اور میری صبا رفتار سانڈنی کہیں دم بھر کے لئے بھی نہ ٹھہری تھی۔ اب چونکہ نماز مغرب کا وقت قریب تھا۔ میں نے مہار کھینچی اور سانڈنی کو روکا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھکر محمل سے نکلا فرض نماز ادا کیا۔ اور کچھ کھجوریں کھاکر شفق کی آتشگوں سرخی کو دیکھتے دیکھتے خواب پریشان دیکھنے لگا دوسرے اور تیسرے روز بھی اُس سنسان ویرانے میں بڑھتا گیا۔ جہاں کہ جھلسنے والی تیز اور زہریلی سموم میری پیشانی پر سلح آکے لگتی تھی۔ گویا کسی تنور سے شعلے نکل نکل آتے تھے۔ اور جہاں میری جلتی ہوئی آنکھوں کو منتہائے نظر تک پھیلی ہوئی بالو اور افق کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

اپنے ہمراہیوں سے جدا ہوکر چھٹے روز جب دن ڈھلنا شروع ہوا میں نے اپنے سامنے بلند پہاڑیوں کا سلسلہ دیکھا۔ اگرچہ میں اپنی مرز بوم کی جغرافیائی حالات و خصائص سے بخوبی آگاہ تھا۔ لیکن اس سے پہلے میں نے ان پہاڑیوں کا ذکر تک بھی نہ سنا تھا۔ اسلئے مجھے یقین ہوگیا۔ کہ میں غلطی سے وہ راستہ بھول آیا ہوں۔ جو کہ اُن چٹانوں کیطرف جاتا ہے جنپر کتبے کندہ ہیں۔ اور اب میں کسی نامعلوم سرزمین میں آگیا ہوں۔ کئی بار اس چٹانی نالے میں ہمارا گذر ہوا تھا جسمیں میرے ہمراہی پڑے ہوئے تھے لیکن ہم سے کبھی کوئی اُس حصہ صحرا سے آگے نہ گیا تھا۔ جہاں جا بجا بوسیدہ انسانی ہڈیاں دکھائی دیتی تھیں کیونکہ وہاں مشکیزہ یا چھاگل کا پھٹنا یا اونٹ کا لنگ ہونا موت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

میں ناقابل ضبط گھبراہٹ سے پہاڑیوں کیطرف دیکھنے لگا۔ متواتر چھ روز کڑکتی ہوئی دھوپ میں

سفر کرنے اور تکان کے باعث بالکل مضمحل و خستہ ہو گیا تھا۔ ریگ آمیز گرم لو سے میرا دم رکتا تھا۔ میری سبک سیر سانڈنی بھی میری طرح درماندہ ہو رہی تھی۔ اسلئے ایسی جگہ بے سروسامانی کی حالت میں رات کاٹنے سے میرا دل کانپ رہا تھا۔

اگرچہ پہاڑیوں کے عقب میں مہتاب نکلا ہوا تھا۔ لیکن جو منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا اُس پر نہایت خفیف اور دھندلی سی روشنی پڑ رہی تھی۔ طوعاً و کرہاً میں نے سانڈنی کو بٹھایا۔ اور خود ایک ریت کے ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ اور زانوں کو سینے سے لگائے نہایت گہرے غور اور فکر کی حالت میں بیٹھا بیٹھا اونگھنے لگا۔

پیشتر اسکے کہ وہ زعفرانی خط جو شاہ نیتر کا ہراول سمجھا جاتا ہے آسمان پر نمودار ہو میں چند سورتوں کی تلاوت کر کے اپنی سانڈنی پر سوار ہو لیا تھا۔ اور عزم بالجزم سے اُس نامعلوم سلسلہ کی طرف رُخ کیے چلا جاتا تھا۔ جو میرے پاس تھا۔ اسمیں اب صرف اسقدر پانی رہگیا تھا جو ہمارے قیام گاہ تک کافی ہو سکے۔ اور علیٰ ہذا القیاس کھجوریں بھی نصف سے کم رہگئی تھیں۔ اسلئے میں نے روزے رکھنے شروع کیے۔

ریت نہایت نرم اور فریب دہ تھی۔ میری اونٹنی کے اسفنج آسا پاؤں ریت میں دھسے جاتے تھے تین گھنٹے کی کڑی مسافت کے بعد میں پہاڑ کی دو خوفناک چوٹیوں کے دامن میں پہنچا۔ اور اس ڈر سے کہ مبادا ریگ رواں میں دب جاؤں۔ اسجگہ کھڑا ہو گیا۔ مجھے قریب ہی دو پہاڑیوں کے درمیان ایک تنگ راستہ نظر آیا۔ اُس راستہ کے دروازہ پر دو دیو ہیکل بت دیکھکر حیرت زدہ رہگیا۔ ان شکلوں کو دیکھکر مجھے یقین واثق ہوا کہ اب میں منزل مقصود پر پہنچگیا ہوں۔ میں نے سانڈنی کو اور آگے چلایا۔ اور اُن بتوں کے پاس پہنچا۔ یہ بت سنگ سیہ کے بنے ہوئے تھے۔ اور بلندی میں قدِ آدم سے وہ چند تھے۔ ایک اُنمیں سے خوبصورت عورت کا تھا جو اپنے وائیں ہاتھ کو آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے تھی۔ دوسرا ایک زنِ فرتوت کا تھا۔ جو نہایت کریہ المنظر تھی اور اپنے چہرے کو نیچے جھکائے ہوئے تھی۔

میں عالم تحیر میں دم بخود تھا۔ اور اس سرزمین کو دیکھ رہا تھا۔ جو میں نے پہلے کبھی دیکھی نہ تھی۔ لیکن سحر بڑھنے والے اسنحجاب نے مجھے وہاں زیادہ نہ ٹھیرنے دیا۔ میں اپنی اونٹنی کی مہار پکڑے ہوئے۔ اس سنگلاخ وادی میں بڑھتا گیا حتیٰ کہ ایک سرسبز وسیع میدان میں پہنچا۔ جہاں مجھے ایک ویران مگر عظیم الشان شہر کے کھنڈر دکھائی دئے۔ میں سکتے کے عالم میں اُس حیرت انگیز نظارہ کو دیکھنے لگا جبکہ اب مجھے وہم وگمان بھی نہ تھا۔ منہدم معبدوں کے شکستہ ستون اور بڑی بڑی مسمار شدہ اور ٹوٹی پھوٹی لیکن عالیشان عمارتیں جن پر سکوت اور خاموشی کا عالم طاری تھا۔ گذشتہ عظمت وشوکت کا زبان حال سے فسانہ کہہ رہی تھیں۔ جابجا شکستہ حال مینار اور برج استادہ تھے۔ اس شہر غدار کے فراخ اور چوڑے بازاروں کے نشان موجود تھے۔ ایک عقاب ہوا میں اُڑ رہا تھا۔ اور صرف وہ عقاب ہی اُسوقت اُس ویران شہر کی ذی حیات مخلوق تھا۔ اونٹنی کو میں نے باندھ دیا۔ اور آپ آگے چلا۔ یہ شہر کسی زمانے میں اپنے وقت کی تہذیب اور شائستگی کا مرکز تھا اور اسکی نسبت مندرجہ ذیل روایت مشہور ہے۔

اس شہر کی فرماں روا صاحب جاہ وحشم شاہزادی بلقیس تھی جس کا ذکر ہمارے صحیفۂ لازوال میں بھی آیا ہے۔ اور یہی شہر سبا تھا۔ جو کبھی دنیا میں سب سے بڑا اور متمول دارالسلطنت تھا۔ روایت سے صرف اسی قدر پایا جاتا تھا۔ کہ یہ شہر صحرائے اعظم میں کہیں آباد تھا۔ لیکن اسکا صحیح پتہ کسی نے بھی دریافت نہ کیا۔ اگرچہ یہ مشہور عام تھا۔ کہ اس کا دروازہ پہاڑ کی مخروطی شکل کی چوٹیوں کے درمیان ہے اور اسکے آس پاس ایسی ریگ رواں ہے کہ کوئی وہاں جانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

میں نے نہایت سرعت کیساتھ منہدم ستونوں پر پڑھنا شروع کیا۔ اُن پر کچھ حروف کندہ تھے لیکن میرے لئے وہ راز سربستہ سے کم نہ تھے۔ ناگاہ میری نظر ایک اور عالیشان محل پر پڑی جو ایک جانب پہاڑی پر واقعہ تھا۔ شہر سے اس محل تک ایک وسیع زینہ پتھر کا بنا ہوا تھا جسکی دونو جانب دو بت کھڑے تھے۔ وہ صورت شکل میں بالکل اُنسے مشابہ

سے تھے۔ جو شہر کے باہر دروازے پر تھے۔ مجھے شک ہوا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ لیکن پھر اپنے آپکو یقین دلاکر کہ میں بالکل اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔ میں نے اپنا بچالا سنبھالا اور زینے پر چڑھنے لگا۔ جو شہزادی بلقیس کے محل کو جاتا تھا۔ ابھی میں نے پہلے ہی اڈے پر قدم رکھا تھا۔ کہ میری آنکھیں بجلی کی سی کوند سے خیرہ اور میرے کان ایک ایسی گرج کی آواز سے بہرے ہو گئے۔ جس سے زمین میں زلزلہ پیدا ہو گیا۔ میں نہایت تذبذب میں تھا۔ اور دل میں خیال کرتا تھا۔ کہ یہ کہیں میرے شامت اعمال کی اطلاع نہ ہو۔ لیکن میں نے استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ اور زینہ پر نہایت تیزی سے چڑھ گیا۔ چند منٹ میں اُس حسین اور صاحب جبروت ملکہ کے محل کے دروازہ پر جا کھڑا ہوا۔ میں اندر داخل ہونے ہی کو تھا۔ لیکن جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ محل کا فرش آب رواں کا تھا۔ جہاں مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ اور درمیان میں ایک سونے اور عاج کا شاہ نشین تھا۔ جس پر ملکہ بلقیس کا جڑاؤ تخت رکھا تھا۔ جو نیلم و الماس اور جواہر سے مزین و مترتب تھا۔ میں نے پائنچوں کو اُٹھاکر پانی میں اُترنے کا ارادہ کیا۔ لیکن میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ کیونکہ چمکیلے اور صاف سطح آب پر شفاف بلوریں فرش تھا۔ جو گرم موسم میں بھی محل کو سرد خانہ بنائے رکھتا تھا۔ میں تخت کے نزدیک گیا۔ اور اپنے بھالے سے ایک الماس کا ٹکڑا اکھاڑا جو بیضۂ کبوتر کے برابر تھا۔ پھر میں قصر شاہی کی سیر کرنے میں مصروف ہوا۔ اور ایوان شاہی کی مسطح سقف پر سے شہر کی طرف نگاہ ڈالی۔ میں اپنے تخیل میں پھر اسکو آباد دیکھنے لگا۔ اور اسکی عظمت کی شان دیدۂ دل کو نظر آنے لگی۔ بلقیس کے ٹڈی دل لشکر جوق جوق جنگ کے واسطے نکلنے لگے اور حسین و شاندار ملکہ خود سنہری رتھ میں جلوہ افروز ہوئی۔ پھر میں دیر تک اُس قصر شاہی کے دیوان خاص نشست گاہوں۔ خوابگاہوں۔ جلوخانوں آئینہ خانوں و دیگر عجیب و غریب ایوانوں کو دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ مجھے ایک چھوٹا سا حجرہ پہاڑ کی طرف نظر آیا۔

میں نے دیکھا کہ اسمیں نہایت قیمتی و بیش بہا اسباب تھا۔ تمام سامان آرائش مطلا و مذہب تھا۔ سقف کے شہتیروں میں ہیرے جڑے ہوئے تھے جو سورج کی شعاعوں سے روشن و درخشاں تھے۔ مقابل کی دیوار میں ایک اور دروازہ تھا۔ جو نہایت مستحکم و مضبوط لوہے کا بنا ہوا تھا۔ جب میں نے پوری طاقت سے اُسکو کھولا۔ تو مجھے ایک تنگ و تاریک غار سا دکھائی دیا۔ میں نے اُس دروازے کو بغور دیکھا۔ اس میں بڑے بڑے آہنی چٹکنیاں لگی ہوئی تھیں۔ سخت چٹانی زمین میں جاکر بند ہوتی تھیں مجھے خیال آیا۔ کہ یہاں ملکہ کا خزانہ دفن ہوگا۔ میرے دہان طمع میں پانی بھر آیا۔ میں نے وہیں ایک مشعل سی بنائی۔ اور اُس تنگ و تاریک غار کی کوٹھڑی کے اندر گیا۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا۔ کوٹھڑی وسیع ہوتی جاتی تھی۔ اور ہوا اسقدر گرم تھی کہ میری پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگے ایک پرانی تلوار۔ ایک زنگ آلود خود اور ایک شکستہ زرہ وہاں پڑی ہوئی مجھے دکھائی دی۔ جن سے معلوم ہوتا تھا کہ کبھی یہ غار آمد و رفت کی جگہ ہوگی۔ اس لئے مجھے مالامال ہونے کی اُمید میں اور بھی ترقی ہوئی۔ اور میں آگے آگے بڑھا۔ ہر لحظہ گرمی کے بڑھنے سے مجھے حیرانی ہوئی لیکن میں پھر بھی آگے ہی قدم اُٹھاتا گیا۔ میں نے مشعل کو سر کے برابر بلند رکھا۔ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش میں پپوٹوں سے باہر نکلی پڑتی تھیں۔ اور میرے پاؤں رستہ کے ناہموار ہونے کی وجہ سے ٹھوکریں کھاتے تھے۔ دفعتہً ایک سخت کڑک کی آواز میرے کانوں میں آئی اور ساتھ ہی ایک بھاری ضرب میرے سر پر لگی۔ میں بیہوش ہوکر گر پڑا۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ میں کسقدر عرصہ اُس تاریک غار میں پڑا رہا۔ جب میں نے نہایت آہستگی اور تکلیف سے آنکھیں کھولیں۔ تو مجھے معلوم ہوا۔ کہ میرے چہرہ پر میری نقاب تھی (باقی آئندہ)

نور الدین عنبر (سری نگر)

محسن الملک مرحوم

مولینا حالی نے کراچی کے جلسۂ ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر ہونے کی حیثیت سے جو فاضلانہ تقریر کی اُس میں ذیل کا دلگداز بند نواب محسن الملک مرحوم کی شان میں پڑھا۔ مولینا کے یہ تازہ ترین اشعار تبرکاً درج کئے جاتے ہیں۔

جس وقت کا دھڑکا تھا وہ وقت آگیا آخر — یاروں پہ مصیبت کا سماں چھا گیا آخر

وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غمخوار — سر کر کے مہم قوم کے کام آگیا آخر

سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا — اُس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر

رہنا تھا نہ بس قوم کی تقدیر میں بیکس — لکھا ہوا تقدیر کا پیش آگیا آخر

نکبت کا پتہ ڈھونڈھتا پھرتا تھا مقدر — نکبت کا مقدر کو پتہ پا گیا آخر

جیتا تھا تو لوگوں کو گماں اس پہ تھے کیا کیا — پر مر کے خلوص اپنا وہ منوا گیا آخر

جو خندہ زنی کرتے تھے ہر کام پہ اُس کے — وہ خون کے آنسو انھیں رلوا گیا آخر

یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں قومی فدائی — دنیا کو تماشا یہ وہ دکھلا گیا آخر

مہدی کے لئے قوم عزادار ہے ساری
کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

حالی

کلام اکبر

(مخمس بر غزل ظفر)

گرانی مرے محمل کبھی ایسی تو نہ تھی — تند موج لب ساحل کبھی ایسی تو نہ تھی

بدگمانی تری قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی   بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

کرتی ہے خلق کو لیلائے لبرٹی مفتوں   ہند کے دل کو لبھا لیتا ہے آزادی کا یہ فسوں
لاجپت بھی ہوئے شاید کہ اسیر و محزوں   پائے کوباں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں
آتی آواز سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

پیشتر اس سے طبائع کے نہ تھے یہ پہلو   کہیں اشنان کی تھی لہر کہیں موج وضو
اے مس سیم تن و ماہ جبین و گلرو   تری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

یہ حسن اتفاق ہے کہ اس نظم کے پہلے ہی ہفتے میں مجنون و زندان کا معاملہ ختم ہو گیا۔

پسنجر کی آمد رہی در کنار   ہوا ڈاک گاڑی میں بھی انتشار
جو لی ریل والوں نے راہ فرار   ٹریفک کا ہے بند سب کاروبار
کئی دن سے سونی ہے ای آئی آر   بجا کہہ گیا شاعر نامدار
بہ یک گردش چرخ نیلوفری
نہ انجن بماند نہ انجنیری

انور سے کہا میں نے کہ خاموش ہو تم کیوں   تقریر نہ تحریر نہ غصہ نہ خوشامد
بابو کے نہ دمساز نہ یاروں کے ہم آواز   ماہی میں نہ ممتاز نہ اشتر میں سرآمد
کہنے لگے کیا آپ کو معلوم نہیں ہے   کانزا کہ خبر شد خبرش باز نیامد

دیگر

جس نے ابھارا خلق کو طاعت کردگار پر   نقش ابھار رکھ گیا صفحۂ روزگار پر
شاہ و وزیر کے تو نام دب رہے ہسٹری کے ساتھ   سکّہ نام انبیا اب بھی ہے ہر دیار پر

میرؔ

خوشا وہ دل کہ جسمیں قلزمِ غم کی ہو طغیانی　　　قلق جسکا ہے بے پایاں الم جسکا ہو طولانی
جہاں سے ہے عیش کی تقلیل کلفت کی فراوانی　　　برستی ہو اُداسی اور ٹپکتی ہو پریشانی
وہیں قدرِ کلامِ خونچکانِ میرؔ ہوتی ہے
وہیں اس مصحفِ اندوہ کی تفسیر ہوتی ہے

سوادِ ہند میں خورشید سا روشن ہو نام اُسکا　　　حلاوت دستکا ہو نکی زبان پر ہے کلام اُسکا
ہے فکرِ شعر میں کیفیت آمیز اہتمام اُسکا　　　شرابِ عشق غم پرور سے ہے لبریز جام اُسکا
سخن مشتاق سے عالم عجب جادو بیانی ہے
بہا آتا ہے دریا۔ اللہ اللہ کیا روانی ہے!

سُبک اُسکو بنا سکتی نہیں غم کی گرانباری　　　اُسے رسوا سے آسانی کری کیا اُسکی دشواری
فغان و نالہ سے ہر چند آئینِ گرفتاری　　　چھپی ہوتی ہے اُسکی عرضِ اندوہ جگر خواری
نکلتی ہے صدای درد اُسکے پردۂ دل سے
تراوش جسطرح کرتی ہو حیرت چشمِ بسمل سے!

زہے حسنِ اشارت اس نوا سنجی کو کیا کہئے　　　روش یہ ہے تو رنگِ لالہ و گل کی ادا کہئے
خوشا رنگیں بیانی اسکو گلشن کی فضا کہئے　　　روانی کو سخن کی مستیٔ بادِ صبا کہئے
ریاضِ خلد ہے اُسکے چمن کا خوشہ چیں گویا
رواقِ آسماں اُسکی غزل کی ہے زمیں گویا

طریقِ شعر سے رنگِ چمن پرداز ہے پیدا　　　بہارِ جلوۂ نقش و نگار راز ہے پیدا
روش مستانہ ہے معشوق کا سا ناز ہو پیدا　　　ادا سے ہے ادا انداز سے انداز ہے پیدا

پریخانہ ہے دیوانِ سخن حسن مضامیں سے
مرصع صفحۂ قرطاس ہے طغرائے شکیں سے

وفا و مہر کا ایسا نہو گا راز داں ہرگز لکھے گا یوں نہ کوئی درد و غم کی داستاں ہرگز
نہ آئی ہے نہ آئیگی کسی کو یہ زباں ہرگز میسر ہو نہیں سکتا یہ اندازِ بیاں ہرگز
جو اُسکا رنگ ہے وہ کسب سے حاصل نہیں ہوتا
الم پرورد وہ اُسکا سا کسی کا دل نہیں ہوتا

نہ گزرا وادیِ الفت کا ایسا رہنما کوئی دلوں کے راز سے نکلا نہ اتنا آشنا کوئی
حریف اُسکا بیانِ عشق میں وحشت نہ تھا کوئی زمینِ ہند کیا ایران میں بھی کب ہوا کوئی
ہوا تغییرِ رنگ ایک ایک کی شیوا بیانی کا
ہلالی کا ضمیری کا شفائی کا فغانی کا

رضا علی وحشت (از کلکتہ)

یارانِ عدم

یارب مجھے دُنیا کی ہوا راس نہیں ہے وہ گُل ہے یہ بُو جسمیں نہیں باس نہیں ہے
لب تشنۂ الفت ہوں میں او ساقیِ ہستی پانی سے بجھے تیری یہ وہ پیاس نہیں ہے
چھوٹیں نہ سہی جائیگی یہ دردِ جدائی دل ہے۔ کوئی پتھر نہیں۔ الماس نہیں ہے
بیمہر ہے۔ دُنیا کی محبت پہ نہ جانا عیار ہے۔ یاروں کا اسے پاس نہیں ہے
حسرتکدۂ دہر میں کیا شے نہیں ناداں رنج اسمیں نہیں ہے کہ غم و یاس نہیں ہے
دے جان حزیں شمع پہ گر کر نہ پتنگے شعلہ ہے۔ محبت کا اسے پاس نہیں ہے
مرتا ہوں میں۔ آساں مری مشکل ہو الٰہی بالیں پہ دمِ نزع کوئی پاس نہیں ہے

دم توڑ رہا ہوں زن و فرزند کے غم میں
آ جائے کبھی یا رب! کوئی اب آس نہیں ہے

بندہ ہوں گنہگار ترا۔ مجھ پہ کرم کر
حالِ دلِ محزوں پہ توجہ۔ کوئی دم کر

ہوں آہ! بہت دن سہی میں ناکامِ جوانی
گردش زدۂ کلفتِ ایامِ جوانی

سونے دے مجھے اب تو۔ کہ پیری کی سحر ہے
جاگا ہوا ہوں رات کا او شامِ جوانی

دو دن کی ہی مہمان یہ اے عیش پرستو!
چھوڑو بھی خیالِ ہوسِ خامِ جوانی

ہاں! بادہ کشو! ہاتھ نہ ساغر کو لگانا
ہے خونِ جگر بادۂ گلفامِ جوانی

میں بھی کبھی اک رندِ خرابات نشیں تھا
تھا میں بھی کبھی جرعہ کشِ جامِ جوانی

جمگھٹ میں شب و روز پری رویوں کی خوش خوش
ہوتے تھے بسر عیش سے ایامِ جوانی

کوچے میں حسینوں کے رہا آہ! میں برسوں
دیوانہ و شوریدہ و بدنامِ جوانی

سایہ جو ڈھلا شامِ جوانی کا یکایک
جاتی رہی وہ صحبتِ اصنامِ جوانی

اس دل کو حسینوں کی ادا راس نہ آئی
کافر کو محبت کی ادا راس نہ آئی

گردوں نے دیئے داغ بہت آہ جگر پر
یارانِ سفر مجھ سے چھٹے راہ میں اکثر

فریاد سنی قافلہ والوں نے نہ میری
چلایا کیا سر پہ بہت خاک اڑا کر

وہ منزلِ ہستی میں مجھے دے گئے دھوکا
تھی میری جدائی نہ گوارا جنھیں دم بھر

یارانِ عدم بھول گئے کچھ مجھے ایسا
بھیجا کبھی دو حرف کا پرزہ بھی نہ لکھ کر

دل سے خلشِ صدمۂ احباب نہ پوچھو
رہ رہ کے ہے پہلو میں چبھوتا کوئی نشتر

برسیں ہوئیں بچھڑے ہوئے یارانِ عدم سے
لیکن ہے وہی چوٹ جدائی کی جگر پر

میں مرقدِ احباب پہ اور یا سحر دم!
پھولوں کی چڑھاتا ہوں اب بھی کبھی جا در

جی ہی نہ رہا۔ وعدۂ محشر پہ جیے کون
آئے اجل ای کاش! کہ وعدہ ہو برابر

تنہا کوئی دُنیا میں جیا بھی تو جیا کیا
طے جادۂ ہستی کو کیا بھی تو کیا کیا

دل ہی نہیں وابستگی دھر کہاں کی — تنہا کوئی کیا خاک کرے سیر جہاں کی
کرنا صحِ مشفق نہ تسلی کی یہ باتیں — سوجھی ہے تجھے رام کہانی یہ کہاں کی
ٹھہرے رہو ٹھہرے رہو او قافلہ والو! — ہاں تمکو قسم اس دلِ بیتاب و تواں کی
چپ منزلِ ہستی سے گئے ایسے مسافر — آئی کبھی آوازِ جرس سے نہ فغاں کی
چُٹکی غمِ احباب نے لی ایسی الہی! — دھڑکن نہ گئی آہ! مرے قلبِ تپاں کی
جی بھر گیا دنیا کی ہوس اب نہیں باقی — میں کر بھی چکا سیر جہانِ گزراں کی
لے جان - کہ اے موت کے بیدرد فرشتے! — آخر کوئی حد بھی ہے مری دردِ نہاں کی
میں پہلوئے احباب میں ہوں دفن پسِ مرگ — حسرت ہے الہی یہ دلِ سوختہ جاں کی

ملنے کی مجھے آہ! تمنا ہے کسی سے
کچھ مجھکو گلہ - کچھ مجھے شکوا ہے کسی سے

سرور جہان آبادی

بیاس

اے بیاس اے دلبرِ نازک ادائے کوہسار — حُسن کی تیرے مثالیں ہیں کوئی دیکھے بہار
وہ تری سیماب گوں رنگت وہ جوبن کا نکھار — وہ تری مستانہ موجیں اور وہ جوشِ آبشار

روح را در وجد مے آرد صدائے سازِ تو
دلِ بغارت میبرد طرزِ خرامِ نازِ تو

گنبدِ گردوں سے ٹکرائے پہاڑوں کے وہ سر — ہر طرف چھائے ہوئے ابرِ سیہ بنکر شجر

دور سے یوں چوٹیوں پر برف آتا ہے نظر
نور کے تڑکے ہو جیسے چاک دامانِ سحر

خندۂ دنداں نمائے شاہدِ رعناست ایں
یا بیاضِ روئے حورِ جنت الماویٰ ست ایں

اے عروسِ کوہ اے محبوبۂ زیبا نگار
چھین لیتا ہے دلوں کو تیری جوبن کا اُبھار
تیرے سبزے کی کبھی جاتی ہے آنکھوں میں بہار
لالۂ و گل سے ترے شانِ خدا ہے آشکار

دلبرے با ایں چنیں خوبی کسے کم دیدہ است
سبزۂ مثلِ خطِ سبزِ تو کم روئیدہ است

وہ طرارے بھر کے بامِ کوہ سے آنا ترا
لڑکھڑا کر پتھروں سے وہ مچل جانا ترا
موج میں مستوں کی طرح وہ جھاگ بھر لانا ترا
وہ مزاجِ نوجواں کی طرح بل کھانا ترا

مست و بیخود از غمِ سرو جہاں آزادۂ
گرچہ معشوقی چو عاشق سر بہ صحرا دادۂ

وہ سہانا دامنِ دشت اور وہ طرفِ کوہسار
جھنڈ وہ تیرے درختوں کے وہ تیرا سبزہ زار
اونچے اونچے وہ کنارے جن میں پانی کی دہار
جس طرح آغوشِ عاشق میں کوئی زیبا نگار

حسن را با عشق گوئی شیر و شکر کردہ اند
مُہرِ خُم بشکستہ اند و مے بہ ساغر کردہ اند

دامنِ کوہسار میں ہے شور تیرے ساز کا
گونجتا ہے دشت میں کھٹکا تری آواز کا
تیری موجوں میں ہے سناٹا پرِ پرواز کا
تیرے گردابوں میں عالم ہے طلسمِ راز کا

ہر چہ مستی خوب ہستی اے نگارِ شوخ و شنگ
رنگِ رخ بشکستہ بیشت سادہ رویانِ فرنگ

ہیں شرابِ حسن کے سرشار متوالے ترے
بچتے ہیں جو آپ۔ وہ ہیں پوجنے والے ترے
ناوک اندازوں کے دل پر چلتے ہیں بھالے ترے
کم نہیں کچھ نالۂ عشاق سے نالے ترے

آمدہ گردت زہر جانب بتانِ سیمتن
غیرتِ گنگا ترا خوانیم یا رشکِ چمن

جلوۂ نورِ سحر اور وہ طلوعِ آفتاب — وہ چمک کرنوں کی وہ چہرے کی تیرے آب و تاب
وہ قبا اسبرق کی پہنے ہوئے ہر موجِ آب — وہ لئے تصویر سورج کی بغل میں ہر حباب

روشن از نورِ رخت دامانِ صحرا گشتہ است
موجِ حسن است ایں کہ متحرک بہ دریا گشتہ است

چاندنی رات اور نکھرا تیرا وہ بانکپن — چاند تارے کا تنِ سیمیں پہ تیرے پیرہن
چاند کا ٹیکہ وہ اور تاروں کی افشاں کی پھبن — وہ جھمکڑا نور کا اور وہ بھبوکا سا بدن

کرمکِ شب تابِ ساحل را چراغاں کردہ است
آتشِ بید و دگلخن را گلستاں کردہ است

دامنِ صحرا میں کوسوں تک تری اٹکھیلیاں — سبزۂ تر پر وہ تیری چادرِ آبِ رواں
وہ کناروں پر مسلسل دونوں جانب جھاڑیاں — لہلہاتی دھان کی کوسوں تلک وہ کھیتیاں

نخلہا صف بستہ بر ساحل پئے دیدارِ تو
شاخہا خم گشتہ بہرِ بوسۂ رخسارِ تو

جھومتے بادِ سحر سے ہیں ترے بید و چنار — آسماں سے کرتے ہیں باتیں درختانِ دیار
ہے عیاں جلوے سے شانِ قامتِ رعنائے یار — کم نہیں خوشبو میں کچھ صندل سے تیرے دیودار

آبشارت نغمہ سنج و لالہ زارت جلوہ ریز
نخلہایت عنبر افشان و ہوایت عطر بیز

وہ گلاب اور سیوتی کے پیڑ پھولوں سے لدے — وہ چنبیلی کی قطاریں اور وہ بیلے کے پرے
پھول گیندے کے نہیں یہ سبزۂ ترمیں کھلے — ہیں سنہرے گوکھرو دھانی دوپٹے میں ٹنکے

ایں ہمہ گشتہ از فیضِ عمیمت بہرہ یاب

اکتسابِ نور کردہ ذرّہ ہا از آفتاب

وہ ترے ساحل سے نظارے فضائے دشت کے
وہ پہاڑوں کے برابر نیچے اونچے سلسلے

برف کی چادر وہ اُنچی چوٹیاں اوڑھے ہوئے
اور نشیبی سلسلے وہ سبزہ زر سے ڈھنکے

سر برآوردہ ز سبزہ خانہ ہائے خوش بنا
ہمچو محبوبے کہ بر آرد سر از زیرِ ردا

وہ لبِ جوئے نزہت آگیں باغہائے دلکشا
اور وہ میووں کی لطافت خارج از وصف و ثنا

سیب وہ جسمیں ملے سیبِ زنخداں کا مزا
ناشپاتی وہ حسیں چھاتی سے لیں جسکو لگا

میوۂ این جائے باشد گرچہ جملہ انتخاب
لیک خوبانی و آڑو را نہ شد ممکن جواب

سیدھے سادے بھولے بھالے وہ بتانِ مہ جبیں
اور ادائیں اُنکی کافر رہزنِ ایمان و دیں

ہائے وہ کمبل کی پوشش اور وہ جسمِ نازنیں
لعل گدڑی میں اگر ڈھونڈو تو ملتے ہیں نہیں

زاہدا تا چند در خلوت بہ فکرِ گاؤ خر
ہاں بیا و صنعتِ مشاطۂ قدرت نگر

نذیر احمد کامل

رازِ آشنائی

پاس ہو دولت تو مل جاتے ہیں دولت آشنا
ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتے محبت آشنا

ہوتے ہیں ارذال اظہارِ خباثت سے ذلیل
پاک باطن ہیں برجسی نیت سے عزت آشنا

فقر کی دولت سے قانع رہتے ہیں خرم مدام
رنج و غم میں مبتلا ہیں جاہ و ثروت آشنا

پاس عزت ہو نہ جنکو ہوتے ہیں خوار و ذلیل
فعل بد سے محترز رہتے ہیں غیرت آشنا

پاک باطن صاف طینت کا ہے شیوہ صلح کل
مفسد و مکار ہوتے ہیں عداوت آشنا

کھل ہی جاتا ہے بالآخر حال خبث باطنی
حق بجانب ہے جو ذلیل ہوں خباثت آشنا

ہوتے ہیں اپنے مقاصد میں وہ اکثر بامراد
نامرادی میں بھی ہوتے ہیں جو ہمت آشنا

سنتے ہیں تعریف اگلے وقت کے لوگوں کی ہم
اب نظر آتے نہیں ہمکو حمایت آشنا

عزت و توقیر ہوتی ہے امانت دار کی
ہیں ذلیل و خوار عالم میں خیانت آشنا

"وقت را و رباب" کی آواز جب سنتے نہیں
کیوں نہ ہر مقصد میں ہوں ناکام غفلت آشنا

وقت مشکل کام جو آئیں وہی سچے ہیں دوست
ورنہ یوں تو سیکڑوں ہوتے ہیں صورت آشنا

طالب دنیا پریشاں حال رہتے ہیں مدام
ہیں بڑے آرام و آسایش میں عزلت آشنا

صنعت و حرفت تجارت کی انہیں کیونکر ہو
نوکری کی دُھن میں رہتے ہیں اطاعت آشنا

گرتے ہیں قعر مذلت میں جو کاہل لوگ ہیں
زینۂ اجلال پر چڑھتے ہیں محنت آشنا

رہتے ہیں فکر و پریشانی میں طماع و حریص
ہیں بہت خوشحال دنیا میں قناعت آشنا

اُٹھ گئی دنیا سے رسم مہر آئین وفا
اب کہاں سے ڈھونڈھ کر لائیں صداقت آشنا

صحبت ارذال میں نقصان ہی نقصان ہے
آشنائی کے ہیں قابل پاک طینت آشنا

آدمی کی آدمیت خاکساری ہے ذہینؔ
وہ نہیں انساں ہیں ناداں جو ہیں نخوت آشنا

سید غلام مصطفےٰ ذہینؔ

حضرتِ انسان

عجب حالت ہے انساں کی عجب کچھ اسکا عالم ہے
کہ نیک و بد کا اسمیں بھی پراگندہ ہی اک دفتر

نہ بھولو بھولی بھالی صورتِ انسان پر ہرگز
یہ حضرت طرفہ معجوں ہیں غافل اس سے ہو دم بھر

فرشتوں سے سوا ہی خیر کا بھی مادہ انمیں   شرارت پر اگر آویں تو ہیں شیطان سے بدتر

کبھی سوتے نہیں بیمار کی تیمارداری میں   کہیں سوتوں کی گردن پر چلاتے ہیں یہی خنجر

کبھی ہمدرد بنکر جان یہ دیتے ہیں غیروں پر   کہیں بھائی کے پہلو میں چبھوتے ہیں یہی نشتر

کہیں فرعون اور بوجہل کی صورت پکڑتے ہیں   کبھی ہوتے ہیں ظاہر بنکے یہ صدیقؓ اور حیدرؓ

ہوا میں سیر کرتے ہیں کبھی زورِ تخیل سے   حضیضِ خاک میں گرتے ہیں کم ہمت کبھی بنکر

شقاوت کی کبھی دلدل میں پھنسکر جیسے بیٹھے ہیں   کبھی اوجِ سعادت پر چمکتا انکا ہے اختر

سمجھکر بھوت ڈرتے ہیں کبھی دیوار سے حضرت   کہیں جا ہاتھ دیتے ہیں دہانِ شیر کے اندر

کبھی کرتے ہیں یہ باتیں ملاءِ عرش اعلیٰ سے   کبھی ہیں پوجتے حیوان کبھی لکڑی کبھی پتھر

کبھی اپنے بھی ہمجنسوں کی جوتی صاف کرتے ہیں   کبھی انکو دریغ آتا ہے کہ دیکھیں بھی نظر بھر کر

مسخر کر کے دنیا کو کوئی قانع نہیں ہوتا   کوئی خوش ہیں بہت کھا کر غلاموں کی طرح ہنٹر

دکھائی دیتے ہیں عیب انکو اوروں کی خیالی بھی   سمجھتے ہیں مگر عیبوں کو اپنے یہ ہنر اکثر

بہت ہے شوق ان کو صدر بننے کا مجالس میں   مگر جب کام پڑتا ہے نظر آتے ہیں یہ کمتر

کبھی ہیں بد دماغ اور لالطمع یہ دیوجانس سے   کبھی خوش اعتقادی اور خوشخوئی میں اسکندر

انہیں حضرت کا دم کرتا ہے اک دم میں مسیحائی   یہی حضرت ہیں اک لحظہ میں آدم خور و مردم در

خدا نے دی ہے استعدادِ نیک و بد تجھے عارف

ہمیشہ کر یہی کوشش کہ ہو کل آج سے بہتر

عارف (از جموں)

نغمۂ مستانہ

دسمبر ۱۹۰۸ء کے اخیر میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کی تقریب سے راقم اور مسٹر نیرنگ

کراچی میں ہم تھے۔ ۲۹ دسمبر کو ہم دونو ہوائی بندر کی سیر کو گئے۔ ہوائی بندر جیسا پُربہار مقام کشادہ ساحلِ بحر۔ سمندر کی لہروں کا آ آ کر ساحل سے ٹکرانا اور پھر آہستہ سے پیچھے ہٹ کر سطحِ بحر سے محو ہو جانا لہروں کی لگاتار گونج۔ سمندر کی تازہ اور تازگی بخش ہوا۔ غرض تمام حالات اور حوالی ایسے تھے کہ راقم سے بے اختیار میر نیرنگ سے کہا کہ کچھ سنائیے۔ میر نیرنگ نے ایک غزل سنائی جو انھوں نے کراچی جاتے ہوئے راستے میں کہی تھی۔

چونکہ میر نیرنگ نے خود سنانے سے پہلے نغمۂ مستانہ کے نام سے اس کا ذکر کیا تھا اسلئے اسی عنوان سے اسکو شائع کیا جاتا ہے۔ ہوائی بندر کا واقعی سماں اور میر نیرنگ کا مستانہ ترنم تو قابلِ طبع نہیں ہے مگر خود یہ نغمہ ناظرینِ مخزن کی نذر ہے۔ (اکرام)

تو جا بہ جا ہے تو سُو بہ سُو ہے — تو کُو بہ کُو ہے تو مُو بہ مُو ہے

ظاہر بھی تو ہے مظہر بھی تو ہے — ہر سمت اپنے خود رُو برُو ہے

جلوہ بھی تیرا آنکھیں بھی تیری — منظور بھی تو ناظر بھی تو ہے

جویندہ تو ہے یابندہ تو ہے — مطلوب تو ہے تو جستجو ہے

دار الحرم میں بیت الصنم میں — تیری طلب میں اک ہاؤ ہو ہے

صحنِ چمن میں جنگل میں بن میں — تو رنگ و بو ہے نشو و نمو ہے

رمزِ نہاں تو رازِ عیاں تو — نایاب بھی تو حاصل بھی تو ہے

تو۔ تو کہاں ہے جب میں نہیں ہوں — جو کچھ ہے سو ہے میں ہوں نہ تو ہے

تیری لگن بھی تو مل گیا جب — نیرنگ کو پھر کیا آرزو ہے

تازہ غزلیں

ہونگی زیادہ اس سے بھی عشق میں جگ ہنسائیاں — دل نے تو آپ مول لیں اپنے لئے برائیاں

تونے یہ دولتیں دلا جنکے سبب سے پائیاں — آہ وہ صورتیں بھی اب ناشدنی بھلائیاں
خندہ بے محل کو منع تونے نہ کر دیا صبا — اس کا نتیجہ کیا ہوا منہ کی گلوں نے کھائیاں
حسرت عرض مدعا خوب ہوئی ہمیں نصیب — بات کا بھی نہیں جواب بل رے تری رکھائیاں
پڑکے لحد میں اس دلا چین کر اب تو حشر تک — اب کے جفا کی سختیاں تونے بہت اٹھائیاں
فصل خزاں ہے یہ بلا اس سے خدا پناہ دے — منہ پہ صبا کے بھی گلو چھٹنے لگیں ہوائیاں
ترچھی نظر سے لے کے کام پھیر کے منہ چلے گئے — ہائے رے کم نگاہیاں ہائے رے کج ادائیاں
حشر میں رند تھے خموش صحبت مے سے چھوٹ کر — پیر مغاں کو دیکھ کر دینے لگے دہائیاں

وقت خدا نخواستہ پڑ جو گیا تو سب خلاف
شاد کہاں کسی کو یاد گی تری بھلائیاں

ترے رخ نے ضیائے نور عالمگیر کم کر دی — ترے عارض نے مہر و ماہ کی تنویر کم کر دی
وہ دیوانہ ہوں گر میری ذرا زنجیر کم کر دی — تو دل ہے جان تونے عزت و توقیر کم کر دی
عنایت کی نظر تونے بہت بے پیر کم کر دی — مرے دل پر لگائے تیر نوک تیر کم کر دی
جنوں نے اسقدر پھیلائے دست و پا خدا رکھے — کہ وہ دو ہاتھ پاؤں کی مری زنجیر کم کر دی
رقیبوں کے محلے میں بنایا ہے مکاں اسنے — مسافت دشمنوں کی اور وہ اک تیر کم کر دی
کمر پر بار تھا اسکا رہا زیب کمر خنجر — بہت اچھا کیا سفاک نے شمشیر کم کر دی
دم پیری زلیخا کو یہ بگڑا کھائے جاتی ہے — معبر نے مرے خوابوں کی کیوں تعبیر کم کر دی
بڑھی کچھ لذت جور و ستم بالکل گئی الٹی — دم تیر افگنی ظالم نے نوک تیر کم کر دی
گلے ملنے کی جلدی میں گسے رہتے ہیں یہ ارکان — نماز عید میں یاروں نے اک تکبیر کم کر دی
دعاؤں آہ انکو کیا کہ تم کو چین تو آیا — کمر کا بوجھ ہلکا کر دیا شمشیر کم کر دی
دیا یا چارہ گر نے جسقدر رستی بڑھی وحشت — ذرا سا پاؤں پھیلا۔ وہ کڑی زنجیر کم کر دی

حیا و شرم کی بو تک نہیں کہنے کو باقی ہے
مری صورت نے رتبہ میں مری تصویر کم کر دی

صفِ عشاق سے مقتل میں پہلو جو بچا جاتا ہے
یہ فرما کر کہ تیرے قتل میں تاخیر کم کر دی

مرا خط اُس نے پڑھ کر کہہ دیا حسرت کا دفتر ہے
بہت سی آرزوئیں نے وہم تحریر کم کر دی

ہماری آرزوئے بوسہ و نظارہ قسمت نے
کہیں اک ہاتھ کم کر دی کہیں اک تیر کم کر دی

پس شہرت بدلنا نام کا رکھنے سے بہتر ہے
تری تشہیر نے سائل تری توقیر کم کر دی

(۱)

نہیں چین اگرچہ بے مے شب ماہتاب ہرگز
نہ پلائے خود جو ساقی نہ پیوں شراب ہرگز

شب وصل میں ہو یارب شب ہجر کی درازی
کہ طلوع تا قیامت نہ ہو آفتاب ہرگز

جو خطا ہوئی ہے مجھ سے وہ ترے سبب ہوئی ہے
نہ کرے جو تو تغافل نہ ہو اضطراب ہرگز

یہ مزہ شکستگی کا مجھے عمر بھر نہ بھولے
دل کام جو آلی نہ ہو کامیاب ہرگز

جو خدا نے دی ہیں آنکھیں تو کچھ اُن سے کام بھی لے
ہمہ داں بنا سکیگی نہ تجھے کتاب ہرگز

مرے دل میں اسی شب غم تو چھری سی چبھو گئی کیا
کہ نہیں ہے چشم عاشق پہ ذوق خواب ہرگز

یہ ضرور مجھکو وحشت لکھوں خط پہ خط میں اُن کو
اُنھیں ضد کہ ایک کا بھی نہ لکھیں جواب ہرگز

(۲)

غزل دیگر بتبدیل قافیہ

نہ ہو رہنما اگر تو نہ چلوں حجاز ہرگز
جو نہ ہو ترا اشارہ نہ پڑھوں نماز ہرگز

ہوئی ملتفت نہ مجھ پر وہ نگاہِ ناز ہرگز
نہ خبر کو دل کی آئی مژۂ دراز ہرگز

مجھے مرگ ہے گوارا نہ بلاؤ چارہ گر کو
کہ کسی پہ ہو نہ ظاہر مرے دل کا راز ہرگز

وہ ہوا ہے حال میرا کہ جہاں کو ہوگی عبرت
تری دوستی پہ دشمن نہ کرے گا ناز ہرگز

ترے عشقِ غم فزا میں ہوئے دونوں خاک ایسے
کہ دل و جگر میں ممکن نہیں امتیاز ہرگز

اثرِ سجود زاہد ہو جبیں سے گر نمایاں
تو تری نماز کو میں نہ کہوں نماز ہرگز

تو خیالِ زلفِ جاناں کو بنا رفیقِ ہجراں
کہ سحر نہو گی وحشت یہ شبِ دراز ہرگز

رضا علی وحشت (از کلکتہ)

تمنا وصل کی تھی جسکو سمجھے دم نکلتا ہے
یہی ارماں ہے وہ جو زندگی میں کم نکلتا ہے

کھڑے بالیں پہ وہ ہنستے ہیں اپنا دم نکلتا ہے
بُرے وقت ای فلک کوئی کسیکا کم نکلتا ہے

ہماری زندگی کا دوسرا اک نام ہے یہ بھی
کہیں لذت کشِ ایذا کے دل سے غم نکلتا ہے

شبِ غم نزع کی بھی سختیوں کا کرلیں اندازہ
نکل اے آہ یوں سینے سی جیسے دم نکلتا ہے

اُسیکا اب ہے ماتم پہلے ناکامی کا رونا تھا
نہیں ہے دل تو کیا دلکا کہیں کچھ غم نکلتا ہے

فراقِ دل ہجومِ آرزو میں کیا کہوں تجھسے
بھرے گھر سے جنازہ جیسے اے ہمدم نکلتا ہے

وہ وقت آیا کہ اب سینہ میں ہر دم ہوک اُٹھتی ہے
نفس کہتے ہیں جسکو وہ بہت ہی کم نکلتا ہے

کھُلا یہ راز ہم پر جب طلسمِ زندگی ٹوٹا
کہ خاموشی میں تو کچھ اور ہی عالم نکلتا ہے

نہ پوچھو میرے شوقِ قتل کی جمعیتِ خاطر
کبھی وہ صورتِ گیسو اگر برہم نکلتا ہے

بنا ہے مرکزِ تاثیرِ غم بیمار کا چہرہ
کہ آج اُسکی طرف مُنہ پھیر کر عالم نکلتا ہے

ہماری بیکسی کی موت تھی عبرت کا افسانہ
جسے دیکھو شریکِ مجلسِ ماتم نکلتا ہے

رگیں کھنچنے سے جذبِ عشق کا اندازہ کر دیکھا
وہ کیا جائیں ابھی کن مشکلوں سے دم نکلتا ہے

نظر آتی ہے ہر ذرہ میں حُسن و عشق کی دنیا
میرے خاکسترِ دل میں نیا عالم نکلتا ہے

قدم تک آ کے کہدی زلف نے یہ سرگذشت اپنی
جب اتنی عمر آ جائے تو اک عالم نکلتا ہے

عزیزِ نالہ کش کی سونیوالو کچھ خبر بھی ہے
دہی راتوں کو روتا صورتِ شبنم نکلتا ہے

مرزا محمد ہادی ۔ عزیز ۔ لکھنوی

کیا دل سے نکلکر خود ہی استقبال پیکاں کا　　تواضع شرط ہے رتبہ یہی کہتا تھا مہماں کا

اُسیکے منتظر ہیں ہم بھی جس کی تو ہے اے بلبل　　بہار آنے پہ ہوگا فیصلہ دست و گریباں کا

صدائے آفریں سے تیری آنسو کچھ گرے دلکے　　مگر پوچھا نہ تو نے حال بھی کچھ چشم گریاں کا

یہ کیا آئے ہوئے بیٹھے ہو بالیں پر عیادت کو　　اجل کو فکر ہے تجھسے زیادہ تیرے درماں کا

نہیں معلوم آئی تھی حیا کمبخت کو کس سے　　کہ حسرت نے مرے دامان دل میں آکے منہ ڈھانکا

ابھی تک خیر ہے لیکن بہار آنے دو اے بلبل　　بلا لائے گا تیرے سر پہ غنچہ گلستاں کا

اجل کو جا کے سمجھا دو ذرا تکلیف تو ہوگی　　نہیں خاطر میں لاتی کچھ بھی کہنا میرے درباں کا

نکالا پیر سے پھر دلمیں رکھا دستِ وحشت نے　　خدا کی شان ہے رتبہ ہو یہ خارِ مغیلاں کا

لٹک باقی ہے ابتک گو تری محفل میں بیٹھا ہوں
کہ رہ رہکر خیال آتا ہے جوہر کو بیاباں کا

محمد علی جوہر بی۔ اے (آکسفورڈ)

ہر قدم پر اک قیامت منزلِ الفت میں ہے　　میں مصیبت میں اِدھر ہوں وہ اُدھر آفت میں ہے

زیرِ گردوں کس کو کہئے عیش میں راحت میں ہے　　جسکو دیکھو اک نئی الجھن نئی آفت میں ہے

آپ کا دل صاف ہے تو مجھسے بدظن کیوں ہو　　میرے دل میں ہے وہی جو آپکی نیت میں ہے

سادگی کیا کم ہے تم رہنے بھی دو آرائشیں　　ایک غضب کی دلبری اس حسنِ بے زینت میں ہے

حسنِ باطن بھی ہے لازم حسنِ کامل کیلئے　　کاش سیرت میں بھی ہو جو آپ کی صورت میں ہے

دل بھی لگ جائے اگر مجھ سے کسیکا دل ملے　　جستجوئے اُنس ہی پنہاں مری وحشت میں ہے

کس کو کیا سمجھیں عجب عالم ہے اے آئینہ رو　　تیری خود بینی بھی آئینہ بھی اک حیرت میں ہے

اپنا آئینہ بنا میری نگاہِ شوق کو　　دیکھ پھر اے جانِ جاں کیا کچھ تری صورت میں ہے

قائلِ نیرنگ سب کہنے لگے اب آپ کو +
میری رسوائی بھی شامل آپ کی شہرت میں ہے

شعلہ ہائے حسن میں ہے آتشِ الفت میں ہے　　ایک جاں اُسپر یہ آفت ہے کہ اس آفت میں ہے

اے دلِ مہجور کیوں بیتاب فرقت میں ہے — تجکو کیوں ملنے لگا جو غیر کی قسمت میں ہے
آشنائے درد بھی ہوائے دلِ راحت طلب — اِک بلا کا لطف ناداں اِس غمِ الفت میں ہے
ادعائے عشق پر اصرار نا زیبا نہیں — عاشقوں کو بھول جانا آپکی عادت میں ہے
جزر میں مد اور تنزل میں ترقی ہے نہاں — ہوشیاری گوشۂ خمیازۂ غفلت میں ہے
ہیں اِسی سے گلشنِ عالم کی سب نیرنگیاں — کچھ عجب جادو طلسم کوشش و محنت میں ہے
کوشش و تدبیر بھی تو مقتضائے عقل ہے — ہم نے یہ مانا وہی ملتا ہے جو قسمت میں ہے
دستگیری کا محل ہے اے شہنشاہِ عرب — آجکل اُمت تری افلاس میں غربت میں ہے

ہاں رہے روزِ جزا اعجازِ عاصی کا خیال
کچھ ہے۔ اچھا یا بُرا۔ آخر تری اُمت میں ہے

[illegible]

گدگداتا ہے تصورِ شبِ ہجراں کس کا — چٹکیاں لیتا ہے دل میں ترے ارماں کسکا
ہمنے قرباں کیا کفر پہ۔ ایماں کس کا؟ — تو سلامت ہے تو دل کسکا ہے ارماں کسکا
آج مہماں ہو وہ ماہِ درخشاں کس کا؟ — دیکھئے چمکے مقدر شبِ ہجراں کسکا
خاک ہو وعدۂ فردا سے تسلی مجھکو — وہ قسم کھا کے پلٹ جاتے ہیں پیماں کسکا
کششِ عشق نہ کھینچے مہِ کنعاں کو اگر — چاک پھر دستِ زلیخا سے ہو داماں کسکا
کشتۂ ناز تڑپتے ہیں مزے لے لے کر — ہے گذر آج سوئے گورِ غریباں کسکا
بزمِ دشمن کا کرن آنکھوں سے اثر ظاہر ہے؟ — شرم سے سر ہے ہم آغوش گریباں کسکا
روٹھ جانا ابھی سو بار۔ نظر تو ملجائے — یہ تو دیکھو کہ ہے کس ہاتھ میں داماں کسکا
روز بن بن کے بگڑ جاتا ہے نقشِ اُمید — سازکی شکل بھی دیکھی نہیں ساماں کسکا
جسکو چاہا اُسے کھنچتے ہوئے دیکھا ہمنے — ہائے اونچا نہ رہا ہمسے گریباں کسکا
جگر و دل کے پرخچے جو اُڑے جاتے ہیں — تیر خنجر ہے ہلالِ شبِ ہجراں کسکا
سیکڑوں چاندسی تصویریں گذر جاتی ہیں — آئینہ دار ہے یہ دیدۂ حیراں کسکا

اے وفا منزلتِ شعر کسے حاصل ہے
جس کو ہاتف کہیں ہوتا ہے وہ دربان کسکا

[illegible]

نئی صدی کی نئی تصنیف

اُردو شاعروں کا بسیط اور جامع تذکرہ

یہ سب کو معلوم ہے کہ وقتاً فوقتاً اُردو زبان کے شاعروں کے تذکرے لکھے جاتے رہے ہیں جنمیں شعرا کا کچھ کلام اور کچھ حال درج ہے۔ مگر جتنے تذکرے اس وقت تک نکلے وہ تقریباً سب اپنی خاص وضع کے تھے اُنمیں سے ایسا کوئی نہ تھا کہ جو اُردو شاعروں کے انسائیکلوپیڈیا کا کام دے سکے۔ کہیں صرف انتخاب دواوین پر زور تھا۔ کسی میں مدح سرائی یا ہجو سے کام لیا گیا تھا۔ کوئی تذکرہ محض خاص حیثیت کے شعرا سے مخصوص تھا۔ کوئی خاص شہر سے منسوب تھا۔ اُردو شاعری کے شایقین کو لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے منصف دہلوی مقیم لاہور کا مشکور ہونا چاہیے کہ اُنہوں نے اس اہم ضرورت کو پورا کیا۔ اور سترہ برس کی محنت شاقہ اور صرف کثیر سے ایک جامع اور بسیط تذکرہ اُردو شعرا کا تالیف فرمایا جو شعرا کی کثیر تعداد۔ اون کے حالات اور سوانح عمری کے مندرجہ حال کی تکمیل مختلف اصناف کلام کے بامذاق انتخاب طرز کلام پر بصیرانہ تنقید اور دیگر اوصاف میں اپنی نظیر آپ ہے۔ یہ تذکرہ ۲۹×۲۲ تقطیع کے تقریباً تین ہزار صفحوں پر ختم ہوتا ہے۔ بالفعل تذکرہ ہزار داستان یا خمخانۂ جاوید کی اول جلد جو الف سے ب تک ردیفوں پر مشتمل ہے طیار ہوا چاہتا ہے صرف چند جز چھپنے باقی ہیں۔ کاغذ نہایت عمدہ اور لکھائی چھپائی اوّل درجے کی ہے جلد بھی نہایت نفیس ہے۔ درخواستیں ابھی سے دھڑا دھڑ آ رہی ہیں۔ خوف ہے کہ شایقین ناکام نہ رہ جاویں اسلئے اعلان کیا جاتا ہے کہ جو صاحبان مذاق اس تذکرہ کو خریدنا چاہیں وہ صاحب مولف کے پاس بہت جلد درخواست خریداری بھیجدیں۔ ایسا نہ ہو کہ سستی سے مایوسی اُٹھانی پڑے۔ قیمت کاغذ قسم اوّل مبلغ صہ قسم دوم للعہ دونو قسم کے خریداروں کو مجلد کتابیں دیجاینگی۔ محصولڈاک علاوہ۔

مخزن پبلشنگ ایجنسی کی مشہور کتابیں

رسوم دہلی معروف بہ مسلمانان

از تالیف مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ اس کتاب کی خوبی کیلئے اسکے مؤلف کا نام ہی کافی ضمانت ہے۔ فرہنگ آصفیہ کے مرتب کرنیسے مولوی سید صاحب نے جو احسان اُردو زبان پر کیا ہے اسکی کافی داد نہیں دیجا سکتی۔ مولوی صاحب کی معلومات رسوم قدیمہ کے متعلق حیرت انگیز ہیں۔ اس کتاب میں مولوی صاحب نے بچہ کے پیدایش سے لیکر شادی اور میت کی تمام رسومات نہایت شرح و بسط سے لکھی ہیں۔ زبان عورتوں کی لکھی ہے جو اسقدر پیاری اور دلچسپ ہے کہ کتاب چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا اور بے اختیار داد منہ سے نکلتی ہے۔ مستورات کے لئے یہ کتاب زیادہ باعث دلچسپی ہے اور اسکا مطالعہ انکے لئے زیادہ مفید ہے۔

قیمت فی جلد ۱۲ علاوہ محصولڈاک۔

مثنویات میر حسن

میر حسن کی مثنوی بےنظیر بدر منیر کا جو پایہ اُردو زبان میں ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اور یہ بہا چیز جسطرح غلط سلط بُری کھلی چھپکر بازار میں ملتی ہے وہ اس قابل نہ تھی کہ با مذاق اصحاب کی الماریوں کے لئے باعث زینت ہو۔ اسلئے ضروری تھا کہ سلیس اُردو کے اس اُستاد کامل کی کتاب اچھے لباس اور صحت کے ساتھ چھپی ہوئی شایقین کے روبرو جلوہ گر ہو۔ چنانچہ یہ کوشش بارآور ہوئی اور بہت تلاش سے میر حسن کی دوسری غیر مطبوعہ مثنوی گلزار ارم بھی ایک مستند قلمی نسخے سے نقل کرکے شامل کر دی ہے۔ اور ایک نہایت فاضلانہ اور بسیط دیباچہ جناب مولوی سید اشرف حسین صاحب بی اے۔ نے لکھکر اس مثنوی بے نظیر کی داد دی ہے۔ اور اسکی خوبیاں اور دیگر لطیف نکات جو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا نہایت خوبی اور قابلیت سے بیان کئے ہیں۔ قیمت عہ علاوہ محصولڈاک۔

خواب ہستی

مصنفہ پروفیسر میرزا محمد سعید دہلوی۔ ایم۔ اے۔ ایم۔ اے او کالج علیگڈھ۔ ہم یقیناً عام بازاری مخرب اخلاق ناولوں کی اشاعت کے خلاف ہیں۔ اسلئے آپ کو یہ یقین کر لینا چاہئے کہ بصورت اس احتیاط کے جو ناول ہمارے ہاں سے شایع ہوگا وہ کیسا ہوگا۔ خواب ہستی کہنے کو تو ناول ہے لیکن در اصل جدید طرز معاشرت کا سچا مرقع بلکہ رسم و رواج کا آئینہ طلبا کی تعلیمی خانگی اور خلوتی زندگی کا لب لباب ہے جس میں روزمرہ کے واقعات و کوائف کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں لایق مصنف نے ناول کے واقعات

دلکش پیرائے میں زندگی کے ایسے ایسے اہم مسائل بیان کئے ہیں کہ اس سے پیشتر کسی ناول نویس نے اس طرف توجہ نہ کی تھی اور اسی پیرایہ میں دکھایا ہے کہ مغربی تعلیم کا اثر ان نوجوانوں کی طبیعت پر کیا ہوتا ہے جو اپنے مذہب کی ضروری باتوں سے ناواقف رہتے ہیں۔

اس ناول میں اور بھی چند خوبیاں ایسی ہیں جو اسکو دوسرے ناولوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ملک کے تمام اخبارات نے اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

اس ناول میں علاوہ لکھائی چھپائی کے نفیس ہونے کے فسانہ کے متعلق ہی تین ہاف ٹون تصویریں ہیں جو اس کتاب کی زینت کو دوبالا کرتی ہیں۔ حجم بھی دو ڈھائی سو صفحے ہے۔ قیمت [illegible] علاوہ محصولڈاک

ابومسلم خراسانی

یہ مخزن ایجنسی کا دوسرا ناول۔ رسالہ الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے۔ اس عجیب وغریب ناول میں قرون وسطی کی تدبیر ملک داری سلطنت بنی اُمیہ کی تباہی اور حکومت عباسیہ کی بنیاد کا حال مفصل بیان کیا ہے۔

ابومسلم۔ وہ نامور مسلمان پالیٹیشن اور بے مثل مدبر تھا جسنے ایک صدی تک زور شور کے ساتھ حکمراں رہنے والے خاندان بنو اُمیہ کو غارت کر کے بنی عباس کی خلافت قائم کردی۔ افسوس ایسے نامور مدبر کی اُردو زبان میں کوئی مکمل سوانح عمری نہیں۔ جس سے اسکے اخلاق وعادات وتدبیر ملک داری کا پورا پتہ چل سکے۔

فاضل مصنف نے ابومسلم کی سوانح عمری حسن وعشق کے نمک کے ساتھ اس غور وتعمق سے تحریر کی ہے کہ قرون وسطی کے حالات کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ ابومسلم کی چاہنے والی گلنار کی حسرت بھری داستان اس اندوہناک حسرت خیز قصے کی جان ہے۔

وہ وہ کیرکٹر اس ناول میں دکھائے گئے ہیں کہ مصنف کے فن ناول نویسی میں کمال کی داد دینی پڑتی ہے۔ مولوی محمد حلیم صاحب ردولوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمائش پر اسے عربی سے سلیس اُردو میں ایسی خوبی اور قابلیت سے ترجمہ کیا ہے کہ ترجمہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔

اسلامی تاریخ کے شیدائیو یہ ناول ضرور پڑھو۔ حجم چار سو صفحے کے قریب اور قیمت صرف [illegible] علاوہ محصول ڈاک۔

"مخزن حکمت" (یا) "گھر کا ڈاکٹر و حکیم"

مصنفہ شمس الاطبا

کی نسبت ہندوستان کے مشہور حکیموں نامی گرامی ڈاکٹروں اور قابل اڈیٹران کی قیمتی رائیں۔ نواب سر شہباز خان کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ "مخزن حکمت اسقدر قابل عزت کتاب ہے کہ ہر ایک اردو خواں کے پاس اسکا موجود ہونا ضروری اور نہایت ہی مفید ہے"۔

حاذق الملک جناب حکیم محمد اجمل خانصاحب رئیس دہلی و سکرٹری مدرسہ طبیہ دہلی "مخزن حکمت ایک مفید عام کتاب ہے اور مجھے اُمید ہے کہ پبلک اسکی قدر کر کے لایق مصنف کی داد دینے میں بخل نہیں کرے گی"۔

عالیجناب حکیم مولوی نورالدین صاحب سابق حکیم مہاراجہ کشمیر "ہندوستان کے اطبا اور عامۃ الناس کو جناب شمس الاطبا کا صدق دل سے شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ انہوں نے مخزن حکمت جیسی ضخیم و مفید عام کتاب لکھکر ملک کو ممنون احسان بنایا ہے۔ اور جو قیمت مجلد کتاب کی رکھی ہے وہ گویا اصل جواہرات کو کوڑیوں کے مول بیچنے کا معاملہ ہے"۔

عالیجناب حکیم محمد عبدالعزیز صاحب بانی مدرسہ تکمیل الحکمت لکھنؤ۔ "مخزن حکمت واقعی نہایت عمدہ کتاب ہے اور مجھے اُمید ہے کہ پبلک اسکی ضرور قدر کریگی"۔

جناب ڈاکٹر محمد وارث صاحب ایم۔ ڈی (اڈنبرگ) رئیس لکھنؤ "مخزن حکمت ہر ایک گھر میں رکھنے کے قابل کتاب ہے۔ نیز کسی حکیم یا ڈاکٹر کو بھی اس کتاب کے بغیر نہیں رہنا چاہئے"۔

جناب ڈاکٹر بی ایل ڈھینگرا۔ ایم۔ ڈی (لنڈن) چیف میڈیکل آفیسر ریاست جیند "مخزن حکمت" جو کلیات طب کہلانیکی مستحق ہے درحقیقت ایک نہایت ہی مفید تصنیف ہے اور طب خانگی پر بہترین کتاب ہے"۔

جناب ڈاکٹر الہ جویا صاحب پرنسپل حبیبیہ میڈیکل کالج کابل "میں اُردو دان پبلک کو جنہیں میرے خیال میں طب خانگی پر ایک ایسی کتاب کی اشد ضرورت ہے نیز ڈاکٹروں و حکیموں کو مخزن حکمت کی بڑے زور سے سفارش کرتا ہوں"

جناب ڈاکٹر دھنپت رائے۔ ایم۔ آر۔ سی۔ ایس (لنڈن) "میری رائے میں کسی اُردو دان کو مخزن حکمت کے بغیر نہیں رہنا چاہئے"

خان بہادر ڈاکٹر سید امیر شاہ صاحب فیلو پنجاب یونیورسٹی لاہور "کوئی گھر مخزن حکمت سے خالی نہ رہنا چاہئے"۔

رائے بہادر ڈاکٹر بیلی رام صاحب فیلو پنجاب یونیورسٹی "مخزن حکمت تمام اُردو دان اشخاص کیلئے مفید ثابت ہوگی"

مسٹر عبدالعزیز صاحب بی اے ایڈیٹر اخبار آبزرور و فیلو پنجاب یونیورسٹی "مخزن حکمت ایک نہایت ہی مفید اور بہترین تصنیف ہے"۔

مسٹر نگم صاحب ایم۔ اے اڈیٹر اخبار ہندوستان "مخزن حکمت اسقدر قابل قدر ہے کہ ہر ایک گھر میں اسکا موجود ہونا لازمی ہے"

نوٹ ۔ اور بھی بہت سے نامور حضرات کی آرا موجود ہیں جو بسبب عدم گنجایش درج نہیں ہو سکتیں۔

حجم کتاب ۱۲۰۰ صفحات قیمت للعہ مجلد للعہ۔ کتاب کے ملنے کا پتہ: **دفتر جناب شمس الاطبا لاہور۔**

پراسپکٹس

"وکیل ٹریڈنگ کمپنی" لمیٹڈ

جسکی رجسٹری عنقریب بموجب ایکٹ ۱۹۱۳ء قانون کمپنی ہائے ہند کرائی جاویگی

راس المال ایک لاکھ (۱۰۰۰۰۰) روپیہ جو پچاس پچاس روپے کے دو ہزار حصوں پر منقسم ہے اور انکی ادائیگی حسب تفصیل ذیل عمل میں آئے گی۔

درخواست کے ہمراہ پانچ (ﷲ) روپیہ فی حصہ

کام شروع ہونے پر دس (عہ) روپیہ فی حصہ

کام شروع ہونیکے تین ماہ بعد دس روپیہ فی حصہ

باقی پچیس (عــہ) روپے باقساط حسب ضرورت ایک ماہ پیشتر اطلاع دیکر طلب کیے جائینگے

ڈائرکٹران - (۱) جناب شیخ نبی بخش صاحب وکیل گوجرانوالہ

(۲) جناب منشی نیاز محمد خانصاحب وکیل - جالندھر

(۳) جناب شیخ غلام یسین صاحب وکیل - جھنگ

(۴) جناب شیخ عبدالقادر صاحب بی - اے - بیرسٹرایٹ لا - دہلی

(۵) جناب شیخ فضل کریم صاحب مختار عدالت - گجرات

(۶) جناب شیخ غلام محمد صاحب مختار عدالت - امرتسر

(۷) جناب شیخ غلام رسول صاحب مالک مطبع راست گفتار امرتسر

(۸) جناب میر ممتاز علی صاحب مالک رفاہ عام سٹیم پریس لاہور

(۹) جناب خواجہ حسن نظامی صاحب مہتمم توشہ خانہ حضرت محبوب الٰہی - دہلی -

(۱۰) جناب مولوی محمد حسن صاحب گورنمنٹ پنشنر - رئیس لائل پور و لدھیانہ - لدھیانہ -

(۱۱) جناب حافظ عبدالرحمن صاحب سیاح بلاد اسلامیہ - امرتسر

(۱۲) جناب خواجہ غلام الثقلین صاحب بی - اے - ایل - ایل بی - پلیڈر - لکھنو -

خزانچی - نیشنل بنک اوف انڈیا - امرتسر

مشیر قانونی - شیخ عبدالقادر صاحب بی - اے - بیرسٹرایٹ لا - منشی نیاز محمد خانصاحب پلیڈر -

مینجنگ ڈائرکٹر - شیخ غلام محمد مختار عدالت امرتسر

ے

البیان فی علوم القرآن

مصنفہ مولینا مولوی محمد عبد الحق صاحب دہلوی مفسر حقانی

ضرورت چاہتی تھی کہ بمقابلہ سائنس اور فلسفہ حال اسلام اور قرآن کے اُصولِ نظریات وعملیات (خدا تعالیٰ کی ذات وصفات۔ فرشتہ مرنے کے بعد روح کا باقی رہکر بغیر تناسخ ایک دوسرے عالم میں جزا و سزا پانا۔ ثواب وعذاب قبر جنت و دوزخ۔ نبوت والہام۔ نبی کی روحانی قوت معجزہ وغیرہ) کو براہین سے ثابت کرکے جملہ شکوک وشبہات کا رد کردیا جاوے۔ اور جملہ مذاہب کا اصلی حال بیان کرکے اُن کے باطل یا ناکافی مسائل سے ثابت کردیا جاوے کہ وہ مذہب جو انسان کو جاودانی زندگی کا راستہ بتاتا ہے وہ صرف اسلام ہی ہے اور جس قدر قرآن اور نبی علیہ السلام اور اصول ومسائل اسلامیہ پر مخالفوں نے اعتراضات کرکے اسلام کی روشنی پر پردہ ڈالا ہے اُسکو جواب تحقیقی والزامی دے کر اُٹھا دیا جاوے۔ للہ الحمد کہ ایسی کتاب جو ان سب باتوں کو حاوی اور زمانۂ حال کی ضرورتوں کو کافی ہو وہ اب مکمل ہوکر طیار ہے۔ کاغذ اعلیٰ صاف وخوشخط چھپائی۔ ۶۶۲ صفحہ حجم قیمت صہ

ملنے کا پتہ

محمد ابو الحسن۔ کوٹھی نواب لہارو۔ دہلی

عرق ماء اللحم انگوری

اور

درازیٔ عمر

یہ امر تازہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ دو بزرگ ہم عمر عہدہ دار جو اتفاق سے ایک ہی ضلع میں مقرر تھے۔ ایک ہی مرض میں مبتلا تھے ضعف دماغ اور تاریکی چشم۔ سر کا گھومنا چکرانا تھوڑے کام سے دل چرانا جس روز دو چار گھنٹہ بیٹھکر کام کرنا پڑے۔ سر درد ہو جانا۔ بھوک کا بند ہو جانا۔ ہاتھ پاؤں کا ٹوٹنے لگنا۔ اور کبھی گھر میں تخلیہ کا موقع ملے تو صبح کو کوفتِ اعضا تکسی معلوم ہو چارپائی سے اٹھنے کو دل نہ چاہنا۔ ایک صاحب نے عرق ماء اللحم کا استعمال کیا۔ اور دوسرے صاحب اور مختلف معالجہ ڈاکٹروں حکیموں کا کرتے رہے چند دنوں بعد عرق پینے والے کا رنگ سُرخ ہو گیا۔ اور زردی چہرہ دور ہو کر گال جو جھکے ہوئے تھے پر ہو کر رنگ چمکنے لگا۔ تو دوسرے مختلف ادویہ کھانے والے نے دوست سے متعجب پوچھا۔ یار کیا بات ہے۔ تم تو چار بجے کے بعد چھ سات بجے تک کچہری میں کام کرتے رہتے ہو صبح دم دیکھو سویرے ہی اٹھکر پھر ہوا خوری کے لئے تیار یہ ماجرا کیا ہے۔ اسنے کہا بات یہ ہے کہ میں عرق ماء اللحم انگوری دواتشنہ ساختہ حکیم غلام نبی لاہوری پیا کرتا ہوں چنانچہ وہ سنکر نہ رہ سکے جھٹ تار دیا۔ عرق بھیجدو۔ اب اس ڈپٹی کلکٹر کا سارٹیفکٹ ملاحظہ کیجئے۔ جسنے سول سرجن اور دوسرے معزز حکماء کا علاج کیا اور ناکامیاب رہا۔ دیکھئے وہ کیا کہتا ہو۔ دو آنہ کا ٹکٹ بھیجدیجئے سارٹیفکٹ صحت یافتہ صاحب کے بھیجدونگا۔ قیمت فی بوتل ۲؎ تین بوتل سے چھ بوتل لـ۵؎ فی درجن عـ۵؎ بذریعہ ریل منگوائیں محصول کی کفایت ہوگی۔ ریلوے سٹیشن بمعہ لائن صاف لکھیں۔ ورنہ بذریعہ ڈاک منگوائیں مع محصول ڈاک پیشگی آنا ضروری ہے

پتہ

حکیم غلام نبی زبدۃ الحکماء لاہور موچی دروازہ ساتواں منزل

دیش اپکارک اوشدھالیہ میں دوا کی سریع التاثیری سے جو بے نظیر شہرت دی جاتا ہی فہرست طلب کر کے ملاحظہ فرماویں

یہ ممکن ہے کہ ایک ہی دوائی کل امراض کا حکمی علاج ہو۔ صرف ایک چھوٹی سی شیشی ہر وقت ہر بیماری پر برتی جا سکتی ہے فہرست منگوا دیں

دیش اپکارک طبی اخبار ہندوستان بھر میں ایک ہی ہفتہ وار طبی اخبار ہے۔ طرفہ یہ کہ چھپتا بھی سب سے زیادہ ہے "نمونہ مفت"

۲ کے سلسلہ میں ایک رسالہ ہر دوسرے مہینے نکلتا ہے ایسے طبی مضامین لکھے جاتے ہیں جنکے جاننے کی ہر شخص کو ضرورت ہے۔ فہرست منگوا دیں

ہم طبیشر علاج بھی کرتے ہیں۔ جو صاحب ہمارے پاس آویں ان کو جگہ مفت رہنے کو دیتے ہیں اور دوائی بھی اگر چاہیں تو مفت

امرت کی دھارا سچ مچ لاثانی دوائی ہے۔ جو ایک دفعہ منگواتا ہے۔ ہمیشہ کے لئے اس کو اپنا یار بنا لیتا ہے +

ہم ان کل امراض کا علاج خاص طور پر کرتے ہیں جو عام طور پر لا علاج کہی جاتی ہیں مفصل حالات لکھنے چاہئیں

ٹھاکر دت شرما وید مالک دیش اپکارک اوشدھالیہ و ایڈیٹر دیش اپکارک و فیملی ڈاکٹر و مصنف رسالجات طبی لاہور چوک متی

ایک ہزار روپیہ نقد
شہنشاہ ہندوستان و انگلستان
تصدیق
پتہ: حکیم ڈاکٹر چراغدین جوہر امرتسر
ایل۔ ایم۔ ایس
سندیافتہ طب یونانی و ڈاکٹری

نئی روشنی وبال جان

کانگرس کو مشورہ

انگلستان کے محکمہ حفظان صحت نے ۱۹۱۰ء کے آخر میں رپورٹ شایع کی ہے کہ ملک میں جسقدر نئی روشنی کا فیشن اور اعلیٰ معاشرت کا دستور بڑھتا جاتا ہے اسی قدر سل کا مرض ترقی پذیر ہے۔

سل یورپ میں لاعلاج مرض تصور کیا جاتا ہے مگر ہمارے سفوف نے یورپین ڈاکٹروں کے اس خیال کو بدل دیا ہے کہ سل کا کوئی علاج نہیں۔ ۹۵ فی صدی وہ مریض اسکے استعمال سے تندرست ہوگئے کہ جنکی زندگی کی امید بالکل منقطع ہوچکی تھی۔ ڈاکٹر اور دیسی طبیب سل کے بیماروں کے لئے اس سفوف سے بڑھکر کوئی دوسرا سریع الاثر اور مفید نہیں پاتے۔

سل کا سفوف تمام شکمی زخموں کو مندمل کرسکتا ہے۔ خون بواسیر میں اکسیر ثابت ہوتا ہے۔ جس کارخانہ میں یہ سفوف تیار کیا جاتا ہے وہاں چند اور دوائیں بھی خاص تجربہ کے بعد فروخت کے لئے رکھی گئی ہیں۔ جن میں سفوف غلہ۔ وجع المفاصل کی گولیاں اور سانپ کے کاٹے کا علاج اسقدر یقینی فائدہ بخش ہیں کہ ہم دعوے کیساتھ پبلک میں پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں تجربہ سے بڑھ کر کوئی شہادت نہیں ہوسکتی۔ اس لئے اہل کانگرس کو یہ مشورہ دینا کہ وہ ہندوستان کو یورپ طرز معاشرت سے بچائے ہمارے خیال میں الشانی دردمندوں کا فرض ہے سل کا خطرہ احتیاط سے اور ہمارے سفوف سے ہی دور ہوسکتا ہے۔

فی تولہ للعہ

علم حکمت کے بحرزخار کے چار موتی

مجربات عجائب

یہ کتاب ایک شاہی کتاب سے ترجمہ کی گئی ہے
اسکا ہر نسخہ وقت استعمال اکسیر کی خاصیت رکھتا ہے
اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں مردونکے
اُن امراض کا بیان جسکی ہر شخص کو ضرورت ہے مع علامات
کے لکھے ہیں عجیب و غریب روغن سفوف اور مرض کے نسخے
درج کئے ہیں۔ دوسرے حصے میں عورتونکے امراض کا بیان
اور اُنکی زیب و زینت کے اسباب جس سے اُنکی حسن
میں ترقی ہو اولاد نرینہ پیدا ہو مہلک امراض سے
محفوظ رہین۔ درج ہین قیمت ایکروپیہ عہ

بہار زندگی مع رسالہ زرنیخ دستکاری

ہر قسم کے نایاب اور شاہی کھانے مٹھائیان حلوا چاٹ
چٹنی مربہ وغیرہ کی ترکیبین ہر قسم کے دستکاری کے
خفیہ راز کا انکشاف قیمت بارہ آنہ ۱۲

علاج المساکین

سے پاتک کے تمام امراض کا مفصل
بیان نہایت سہل اور مجرب نسخے ہر قسم کے
کشتہ بنانے کی ترکیب اوسکے بجھانیکا طریقہ اور وہ
خاص نسخے جو سینہ بسینہ چلے آتے تھے بغرض
رفاہ عام درج کئے ہین فن طب مین یہ کتاب نہایت
جامع ہے قیمت ایکروپیہ نہایت جستجو سے بہم
پہنچا کر یہ کتاب چھاپی گئی ہے۔

محافظ جان مع رسالہ کبوتر بازی

جان کی محافظت ہر شخص کے لئے ضرور ہے اس
کتاب مین ہر قسم کے زہر کا اوتار تمام زہریلے
جانوروں کے زہر دور کرنے کے مجرب نسخے
کبوتر کی پرورش اور اوسکے سدھانے کی
ترکیب درج ہے قیمت آٹھ آنہ۔

پیری میں دیکھنا ہو جو عالم شباب کا
کافی ہے ایک قطرہ ہمارے خضاب کا
خضاب بہار شباب
یہ عرق بڑی محنت و جانفشانی سے تیار کیا گیا ہے اور
اور ایسے اجزا سے مرکب ہے جو سفید بالوں کو ۵ منٹ
میں قدرتی سیاہ رنگ دیتا ہے۔ بال مثل ریشم کے
نرم رہتے ہیں اور لطف یہ کہ اسکے لگانے سے پیشتر
جتنے بال سفید ہونگے اتنے ہی رہینگے۔ پھر سفید
نہ ہونگے۔ اس میں نہ وسمہ پڑتا ہے اور نہ کوئی ایسی
شے جو کسی مذہب کے رو سے ناواجب اور ناپسند ہو
نوٹ۔ غالباً آپ سینکڑوں قسم کے خضاب بمبئی۔ کلکتہ۔ کوئٹہ۔
لاہور۔ امرتسر وغیرہ سے منگوا کر استعمال کر چکے ہونگے۔ اور
آپ کو پورا یقین ہو گیا ہوگا کہ دنیا میں خضاب کوئی چیز
نہیں۔ مگر ہم دعوے کرتے ہیں کہ ہمارا خضاب اگر
ہماری تحریر کے مطابق نہ ہو تو قیمت واپس
قیمت فی سٹ دو روپیہ (عہ)
آب حیات جوہر عشبہ
تمام مصفی خون دواؤں سے اعلیٰ ذائقہ
فساد خون۔ خارش۔ پھوڑے۔
پھنسیاں۔ درد اعضا۔ بھگندر۔ ناسور۔ بدھ
خنازیر۔ وغیرہ۔ خون کو صاف و پاکیزہ
بنا کر چہرہ خوش رنگ بدن میں چستی و چالاکی
پیدا کرتا ہے۔ ہر مزاج کو موافق ہے
شیشی خورد ایک روپیہ چار آنہ
کلاں دو روپے
ٹوتھ پوڈر
دانتوں کے لئے عجیب منجن ہے
نیبکس ۸ آنہ
نرائن بام
کھانسی تر و خشک۔ دمہ۔ نزلہ۔
زکام کے دفعیہ کے لئے اکسیر ہے
شیشی خورد ۱۰ ار کلاں (عہ)
بال اڑانے
کا پوڈر۔ ۵ منٹ
کے اندر بال دور
نیبکس (۸ر)
نرائن سنگھ اینڈ سنز سوداگران ادویات بازار امرتسر

صاحبان! یہ وہ نامور کمپنی ہے جسکی ۳ کروڑ سے زیادہ گھڑیاں اسوقت دنیا کے تمام بڑے ملکوں میں مستعمل ہیں اور جو اپنے ہم چشموں میں قابل رشک ہے۔ پائداری خوبصورتی اور بناوٹ کے لحاظ سے انکی گھڑیاں لاثانی ہیں یہی وجہ ہو کہ ریاست العالیہ پٹیالہ کے دانا اور تجربہ کار انسپکٹر جنرل پولیس پٹیالہ سٹیٹ جے۔ پی وار برٹن صاحب بہادر نے اپنے افسران پولیس کے واسطے ہمسے اس کمپنی کی پچاس گھڑیاں یکدم خرید فرمائی ہیں تمام گھڑیوں کی انکو ترجیح دیتی ہیں افسوس کہ ہندوستان کے لوگ سستی گھڑیوں کے دلدادہ ہیں اور قیمت کے سامنے عمدگی کا لحاظ نہیں کرتے۔ اور مرمت پر کئی گنا جو قیمت سے زیادہ خرچ کر دینا گوارا کرتے ہیں ہمنے اس کمپنی سے خاص طور پر یہ گھڑیاں تیار کروائی ہیں جو پائیداری اور عمدگی میں لاجواب اور قیمت میں کم ہیں۔ تمام عمر کیلئے ایک گھڑی کافی ہے۔ جلد منگوا کر ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) گن میٹل۔ نکل سلور۔ یا سنہری کیس۔ اعلیٰ درجہ کی لیور قیمت صرف [illegible] گارنٹی ۵ سال۔

(۲) قسم اعلیٰ نکل سلور و خالص چاندی کے کیس منقش قیمت [illegible] روپے و [illegible] روپے گارنٹی ۱۵ سال۔

سستی امریکن و سوئس۔ لیور مضبوط جیبی گھڑیاں۔ قیمت صرف [illegible] و للعہ ر گارنٹی ایکسال۔

دی پنجاب واچ اینڈ ڈائی سنکنگ ہاؤس۔ چیرنگ کراس اپرمال لاہور

شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد کی تصنیفات

مولانا آزاد کی کل تصنیفات ہمنے اعلیٰ درجہ کی خوشخط عمدہ ولائتی کاغذ پر چھپوائی ہیں۔ صرف ہماری دوکان سے بذریعہ وی۔ پی مل سکتی ہیں۔ دوکانداروں سے ۲۵ جلد یکمشت خریدنے پر خاص رعایت کیجاویگی۔

سخندانِ فارس ہ۔ زبان فارسی کی بالکل نئی طرز کی مکمل تاریخ جو آجتک ہندوستان میں نہیں لکھی گئی مصنف نے ۱۵ برس کی محنت سے تیار کی ہے۔ اپنی سیاحت ایران کے دلچسپ حالات جابجا درج کئے ہیں مشہور مصنفین کے کلام میں مابہ الامتیاز دکھائے ہیں معہ تصویر مصنف مطبوعہ لنڈن۔ ۴۲۲ صفحہ قیمت عہ ر

قندِ پارسی :۔ زمانہ حال کی فارسی کا عمدہ نمونہ جو آجکل ایران میں مستعمل ہے۔ ہر قسم کے لوگوں سے روزمرہ گفتگو ۶۰ صفحہ قیمت ۸ ر

نصیحت کا کرن پھول ۔ تعلیم نسوان کے متعلق اظہار خیالات بہت آسان اردو میں لڑکیوں کے پڑھنے کیلئے ۲۲ صفحہ قیمت ۴ ر

نظمِ آزاد :۔ پروفیسر آزاد کا کلام منظوم جسقدر بہم پہنچا ۔ ۲۲ صفحہ قیمت ۸ ر **نیرنگ خیال** ۔ انگریزی طرز پر استعارہ کے مضامین معہ ترمیم ۱۴۸ صفحہ قیمت ۷ ر **دیوان ذوق** معہ مؤلفہ پروفیسر آزاد معہ سوانح عمری استاد ذوق ضروری نوٹ ۴۴۸ صفحہ قیمت عہ ر

المشتہر خلیفہ سید محمد سالم منیجر آزاد بک ڈپو اکبری منڈی لاہور

جملہ حقوق محفوظ

فروری ۱۹۰۸ء

جلد ۱۴
نمبر ۵

ایڈیٹر
شیخ عبدالقادر
شیخ محمد اکرام

مخزن

اُردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

پشاور — کشمیر — لاہور — دہلی — لکھنؤ — کانپور — الہ آباد — بنارس — پٹنہ — کلکتہ — کراچی — بمبئی — حیدرآباد دکن — مدراس — بنگلور

تصویریں
نواب سراج الدین احمد خان صاحب سائل دہلوی
شمس العلماء مولانا حالی مدظلہ
سرسید دو رفیق
مثنوی میر حسن — سید فدا حسین صاحب دہلوی ۱
پھولوالی کا گیت — منشی عنایت اللہ صاحب بی۔ اے۔ ۹
پیران دھار — مولوی سعید احمد صاحب مارہروی ۱۲
شاہین و دراج — مولوی محمد عبدالراشد صاحب الخیری دہلوی ۲۲
جزائر بحرین — سید محمد ضامن صاحب کنتوری ۳۵
زبان — سید نذیر حسین صاحب بی۔ اے۔ ۴۴
تصویر سجاد — سید نظام الدین شاہ صاحب دلگیر
ملکہ بلقیس — منشی نور الدین عنبر۔ از کشمیر
کلام اکبر — خان بہادر سید اکبر حسین ۵۵
باور شید — مرزا اعجاز حسین بی۔ اے۔ ۵۸
خدا کی امانت — لالہ تلوک چند محروم ۶۰
نظام زبان انکی ام — محمد اقبال صاحب ۶۲
شمع اور پروانہ — ایڈیٹر صاحب تہذیب النسواں ۶۳
پیام شام — مولوی ظفر الدین ناصر ۶۴
تضمین — منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی
نوحہ نواب محسن الملک
تازہ غزلیں — شاد۔ سائل۔ نیرنگ۔ ظہیر۔ شوکت

دس کروڑ ہندوستانی اُردو بولتے ہیں اور اسیقدر ہندوستانی اُردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اُردو مادری زبان ہے ▭ ان شہروں میں اُردو مروج ہے ⊙ ان شہروں میں اُردو سمجھی جاتی ہے

باہتمام حاجی مظہر علیم مخزن پریس دہلی میں چھپکر شایع ہوا۔

قیمت سالانہ مع محصولڈاک قسم اول ۔۔ روپے فی پرچہ ۱۲/

ہم تو یہ کہتے ہی ہیں۔ کہ آپ ہم پر اعتبار کریں۔ بلکہ ہم آپ پر اعتبار کرنے کو تیار ہیں۔

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ دوائیاں نہایت مجرب موثر اور اکسیر ہیں

اس دعوے کی سچائی کو جھوٹا ثابت کرنے کا ہر ایک شخص کو حق حاصل ہے۔ ہر ایک شخص کو غریب ہو یا امیر شکی ہو یا دہمی مینتا یا مفت ہر طرح سے اس کی آزمایش کا موقعہ دیا جا سکتا ہے۔

آزمایش کیجئے اور دعویٰ کو جھوٹا ثابت کیجئے

(۱) دوائی خرید کر قیمت کی (۲) واپسی میں بنک چیک۔

جن شخصوں کو دوائی کے مفید ہونے کا شک ہو وہ اس طرح منگوا سکتے ہیں کہ اگر دوائی مفید نہ ہو تو قیمت واپس مل جاوے واپسی کا عذر زبانی نہیں بلکہ قیمت کی واپسی کی گارنٹی امپیریل بنک لاہور کا چیک مل سکتا ہے

آزمایش کیجئے اور دعوے کو جھوٹا ثابت کیجئے۔

(۳) فائدہ ہونے پر قیمت

دوائی کی قیمت پہلے مت دیجئے۔ دوائی بغیر قیمت بلکہ کرایہ پیکنگ منی آرڈر وغیرہ سب کچھ ہمارے گھر سے صرف آپ کے اعتبار پر خود دوائی منگوا کر جب آپ کے مفید ہونے کے قائل ہو جاویں تب قیمت ادا کریں [illegible]

آزمایش کیجئے اور دعوے کو جھوٹا ثابت کیجئے۔

(۴) غریب بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے اگر آپ پوری دوائی نہیں خرید سکتے۔ صرف نصف ۹ کی آزمایشی شیشی منگا کر آزمایش کیجئے ایک آنہ میں آزمایش کیجئے۔ صرف ایک آنہ بھیجکر اور وہ بھی اس خیال سے کہ نمونہ ٹیک دیکھی میں منگوایا گیا ہے

آزمایش کیجئے اور دعوے کو جھوٹا ثابت کیجئے۔

(۵) مفت بھی مل سکتی ہے

جو شخص ایک آنہ بھی خرچ نہیں کر سکتا وہ دوائی کیسے خرید سکتا ہے غالباً انسان جو چیز مفت یا بغیر تکلیف کے ملے پرتا نہیں کرتا۔ مگر مفت بھی اگر کوئی آزمایش کرنا چاہے تو کرے۔

آزمایش کیجئے اور دعوے کو جھوٹا ثابت کیجئے۔

جس طرح جی چاہے آزمایش کیجئے۔ خواہ خرید کر کے یا مفت مگر دعوے کو جھوٹا ثابت کیجئے

دوائی ملنے کا پتہ سدن گوپال کمپنی نمبر ۸ لاہور۔

کھانسی کا مجرب علاج

نئی اور پرانی کھانسی۔ دمہ۔ پھیپھڑے کی بیماریوں عید دق سل

اور بڑھاپے کی کھانسی کا مجرب علاج ہے۔ پرانی برسوں کی اور کیسی ہی تکلیف دہ کھانسی ہو بہت جلدی آرام کرتی ہے قیمت ایک روپیہ (عہ)

لوگ کیا کہتے ہیں

میں عرصہ ۹ سال سے ایک سخت قسم کی کھانسی کا مریض رہا ہوں میں نے بہت سی دوائیاں ڈاکٹری اور دیسی کا استعمال کیا۔ لیکن کچھ فائدہ نظر نہ آیا۔ ایک دوست کی رہنمائی پر میں نے قاعدہ صاحب کے کارخانہ اور واسطہ سے دوائی کھانسی کی لی۔ چند روز کے استعمال ہی سے ان گولیوں نے اپنا جادو کا اثر دکھایا۔ اور میں بڑی مسرت سے اپنا خیال ظاہر کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ ان گولیوں نے علاوہ میرے دیگر میرے متعدد دوستوں کے مریضوں کو حیرت انگیز فائدہ پہنچایا۔ تین روز کے استعمال سے بالکل تندرست ہو گیا۔ واقعی لالہ صاحب نے ان مفید گولیوں کی ایجاد سے جیسی دنیا میں بہت بڑا فائدہ رساں کام کیا ہے میں بڑے زور سے پبلک کو مطلع کرتا ہوں کہ وہ ضرور ان گولیوں سے فائدہ اٹھاویں [illegible]

(۲) بی رہا علی پور [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] دوا (۲) [illegible] سدن گوپال کمپنی لاہور۔

دوائی منگوانے وقت لکھیں کہ بیماری کتنی مدت سے ہے۔

ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی

مثنوی میر حسن

میر حسن دہلوی مرحوم کی مشہور مثنوی سحر البیان جو حال میں مطبع مخزن سے شائع ہوئی ہے۔ اس کا دیباچہ ایک ایسے فاضل ادیب کے قلم سے نکلا ہے جنہیں پبلک اُن سے روشناس ہوتے ہی اردو لکھنے والوں کے اعلےٰ طبقہ میں جگہ دے گی۔ مولوی سید اشرف حسین صاحب دہلوی نے جو مولینا حالی مدظلہ سے تلمذ اور مولینا حافظ نذیر احمد صاحب دہلوی سے قرابت رکھتے ہیں۔ دیباچہ لکھکر ہی ہمیں ممنون منت نہیں کیا۔ بلکہ وقتاً فوقتاً رسالہ میں مضامین لکھنے کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ پہلا مضمون ہم اسی دیباچہ میں سے اقتباس کرکے درج کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کے پڑھنے سے مثنوی سحر البیان کی ایک نئی شان نظر آتی ہے۔ اور سادہ سادہ اشعار میں ایسے ایسے نکات و معانی نکلتے ہیں۔ کہ داد دیتے ہی بن پڑتی ہے۔ اس اقتباس سے ہمارا منشاء صرف مولینا ممدوح اور ناظرین مخزن کے درمیان تقریب ملاقات ہے۔ بلکہ یہ بھی مقصود ہے کہ جن حضرات کی نظر سے مثنوی کا نیا اڈیشن نہ گزرے۔ وہ اس دیباچہ سے بالکل محروم نہ رہیں۔ گو اصلی لطف تو مولوی صاحب کی پوری تحریر پڑھنے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

انگلش لٹریچر کے آنیسے پہلے ہندوستان میں فسانوں کی بنیاد عموماً عشق یا شجاعت پر

ہوتی تھی اور اس کی بھی ایک خاص لے تھی جیسے مشاعرے کی غزلوں کی ایک خاص طرح ہوتی ہے۔ مشاعرے میں تو غیر طرح بھی عرض کرنے کا دستور ہے وہاں اس کا بھی رواج نہ تھا۔ شاید اسکی یہ وجہ ہو کہ ہندوستان کی آب و ہوا میں قدامت پسندی کا خاصہ زیادہ ہے یا یہ کہ ایک ہی طرح میں طبع آزمائی کرنے سے قابلیت کا اندازہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔

سب سے عام طرح فسانوں کی یہ تھی کہ ایک بادشاہ کے چار بیٹے ہوتے تھے یا ایک بھی نہیں۔ جہاں ایک بھی نہ ہوتا تھا وہاں بادشاہ اپنا تخت و تاج عاقل وزیر کے سپرد کر کے فقیر ہو جاتا تھا یا ہونے کا قصد کرتا تھا۔ آخر میں اتفاق سے ایک فقیر کامل مل جاتا تھا جو خاک کی چٹکی دیتا تھا یا دو انار یا فقط ایک سونٹا ہی مار دیتا تھا جسکی برکت سے لڑکا پیدا ہوتا تھا وہ لڑکا تمام اوصاف انسانی میں فوق العادۃ ہوتا تھا۔ تمام دنیا کے علوم و فنون سے آٹھ دس برس کی عمر میں ماہر ہو جاتا تھا۔ بارھواں برس بڑا خطرناک ہوتا تھا یا تو کسی عورت کی تصویر دیکھکر عاشق ہو جاتا تھا اور وزیر زادے کو ساتھ لے کر گھر سے نکل کھڑا ہوتا تھا یا کوئی جوگی یا پری ڈال کے لے جاتا تھا۔ یا پری اُڑا لیجاتی تھی۔ پھر ایک مدت دراز تک عشق و محبت کی مصیبتیں اُٹھا کر ماں باپ سے آن ملتا تھا یہ مضمون معین تھا اور سوائے خفیف اندرونی ردّ و بدل کے اس سے انحراف یا تجاوز کرنا گویا قصّے کو بگاڑنا تھا۔ گلزار نسیم میں بھی بہت کم انحراف ہوا ہے اور اُسکا ذکر ہی کیا حضرت نسیم نے تو دو آتشہ کی ہے[1] خواہ وہ مہوے کی تھی یا انگور کی۔ خیال یوں آیا کہ نثر سے نظم کرنا اور ایک محدود دائرے کے اندر کہنا ایک سی بات ہے۔

کمال بلاغت

سحر البیان میں بہ لحاظ واقعیت یہ تین خوبیاں ایسی ہیں کہ اُردو کی ایک مثنوی میں بھی نظر نہیں آئیں

---

[1] وہ نثر تھی دا و نظم دو دیں + اس مے کو دو آتشہ کروں میں۔

(۱) جامعیت یعنی سلاطین و امرا کے یہاں جو جو حالتیں گذرتی تھیں اور جو معاملات اکثر پیش آتے تھے قریب قریب سب کا ذکر آگیا ہے۔ (۲) اصلیت یعنی جو حالتیں انسان پر واقعی گذرا کرتی ہیں یا گذر سکتی ہیں اور جو معاملات فی الحقیقت پیش آتے ہیں یا آ ذ ممکن ہیں انہیں سے واسطہ رکھا ہے۔ (ممکن کے یہی معنی نہیں کہ سائنٹفک پروف سے مانا گیا ہو۔ عام خیال جسکی تائید کرے وہ بھی شل ممکن ہے۔

(۳) مناسبت یعنی محل و موقع کا خیال۔ اسمیں میر حسن کو خاص ملکہ یہ حاصل تھا کہ جس موقع کی جو بات سب سے زیادہ موزوں سب سے زیادہ باریک اور حد سے زیادہ دلکش ہونی ممکن ہے۔ وہ نظر سے نہیں بچنے پائی۔ یہی شاعر حقیقی کا کمال ہے۔ اس اجمال کی تفصیل چند مثالوں سے کیجاتی ہے:۔

۱۔ بادشاہ نے مایوس ہو کر جب ترکِ سلطنت کا قصد ظاہر کیا تو ارکینِ سلطنت نے اسطرح سمجھایا۔

فقیری جو کیجے تو دنیا کے ساتھ ۔ نہیں خوب جانا اُدھر خالی ہاتھ ۔ کرو سلطنت لیکن اعمال نیک ۔ کہ تا دو جہاں میں رہے حال نیک
جو غافل ہو اس سوچ میں تم رہو ۔ کہ ایسا نہ ہووے جو پھر سب کہیں ۔ تو کار زمیں را نکو ساختی ۔ کہ با آسماں نیز پرداختی
نہ لاؤ کبھی یاس کی گفتگو ۔ کہ قرآں میں آیا ہے لا تقنطوا

عاول بادشاہ کے ہوا خواہوں کو ایسے موقع پر یہی مناسب تھا اور دیندار بادشاہ کے جی کو لگنے والی سب سے بہتر یہی نصیحت ہو سکتی ہے۔

پھر جب شاہزادہ غائب ہو گیا تو اُسوقت کا ہراس کچھ اور ہوتا ہی مصلحت اندیشی پاس نہیں آنے پاتی یہ نصیحت ایسے وقت کام نہ آتی۔ اُسوقت یہ کہنا مناسب تھا۔

نہیں خوب اتنا تمہیں اضطراب ۔ نصیبوں سے تنہا یہ ٹھٹھہ شتاب ۔ خدا جانے اب اس میں کیا بھید ہے ۔ یہ کہتے ہیں جیتوں کی امید ہے
خدا کی خدائی تو معمور ہے ۔ غرض اس کے نزدیک کیا دور ہے ۔ نہیں ایک صورت پہ کوئی مدام ۔ اُسی کی غرض ذات کو ہے قیام

یعنی جب خدا نے نہیں سے ہاں کیا تو کھوئے ہوئے کو ملانا کیا مشکل ہے۔ خدانخواستہ دنیا سے تو چلا ہی نہیں گیا جو نا اُمیدی ہو۔ آدمی جیتا رہتا ہے تو ملتا ہی ہے۔ خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا اور اپنی حکمت وہ آپ ہی جانتا ہے۔ خدا جانے اس چند روز علیحدگی میں شاہزادے کیواسطے کیا بہتری ہے۔ ایک حالت پر تو سوا خدا کی ذات کے کوئی نہیں رہ سکتا۔ کل تک شاہزادہ یہاں تھا آج نہیں ہے کیا عجب ہے کہ کل پھر آ جائے۔

یہاں سے دو نتیجے نکلتے ہیں:۔ (۱) انسان کو کسی حالت میں نا اُمید نہیں ہونا چاہئے۔ (۲) غایت درجے کے رنج اور مایوسی

کی حالت میں انسان کو بُری ہی بُری سوجھتی ہے۔ ایسی حالت میں اپنے شفیق کی راے پر عمل کرنا چاہئے۔

(۲) ایک ہی باغ کی دو تصویریں کھینچی ہیں۔ ایک روشن یعنی رونق کے زمانے کی۔ دوسری تاریک یعنی بربادی کے وقت کی۔ رونق کی کیفیت دُنیا کے کسی باغ میں اگر ہوگی تو بس ایسی۔ گلوں کی رعنائی و خوش نمائی۔

گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا ؎ اُسی اپنے عالم میں منہ چومنا ؎ وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر ؎ نشے کا سا عالم گلستان پر

پانی کے پاس درختوں کی چھاؤں میں جو پودے ہوتے ہیں وہ لمبے پتلے اور ایسے نازک ہوتے ہیں کہ پھول کے ہی بوجھ سے جھکے پڑتے ہیں۔ ذرا سی ہوا کا جھونکا لگا اور اِدھر کے اُدھر ہو گئے بالکل نشے ہی کا سا عالم ہوتا ہے۔ (میووں کی فراط)

صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے بھول ؎ پڑی جا بجا مولسریوں کے پھول ؎ بڑے بڑے درختوں کے پھول پھل جو زمین پر گرتے ہیں اُنکے جمع کرنے کا یہ قاعدہ ہے کہ چُن چُن کر ڈھیریاں لگاتی جاتی ہیں۔ آخر میں سب کو اُٹھا لیتی ہیں جہاں سیکڑوں درخت اور ہزاروں ڈھیریاں ہوتی ہیں وہاں چھوٹ بھی جاتی ہیں۔ بھول جانا خود دلیل کثرت ہے۔ مولسری کا پھول ہوتا بھی ہمرنگ زمین ہے۔ (جانوروں کی خوش نمائی۔)

صدا قرقروں کی بطوں کا وہ شور ؎ درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور ؎ مور درختوں پر بھی بیٹھتے ہیں زمین پر بھی پھرتے ہیں لیکن باغ میں تو کچھ منڈیروں ہی پر بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

امیروں رئیسوں کے یہاں لونڈیاں مامائیں بھی فوج کی فوج ہوتی ہیں اور کام وہی معمولی۔ جو کچھ شُہدپن مچائیں تھوڑا ہے اور جو کہیں ایسی خوشی کا موقع ہاتھ آگیا تو پھر کیا ٹھکانا ہے نئی شوخی اور چُلبلاپن یہی حُسن کارگذاری ہے چٹکیاں تالیاں پھبتیاں گالیاں سب ہی کچھ ہوتی ہیں۔ میر صاحب نے اِن کی حرکتوں میں بھی اندازِ معشوقانہ نکالا ہے فرماتے ہیں۔

کوئی حوض میں جسکے غوطہ لگا ؎ کوئی نہر پر پاؤں بیٹھی ہلا ؎ یہ سب سے چُھپی اوروں کے ساتھ اچھل کود میں تو شریک نہیں ہے لیکن ہر سب سے دور جہاں یہ رونق اور یہ چہل پہل تھی وہاں کا سناٹا بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

ہوئے خشک اور زرد سارے نہال ؎ ثمر لگ کے پاؤں ہوئے پائمال ؎ گویا کسی پرانے قبرستان کی بیریاں ہیں جن کے نیچے مرجھائے ہوئے بیر پڑے رُل رہے ہیں اور آنے جانے کی روندن میں آتے ہیں۔

اُچھلتے تھے فوارے جو اُسکے واں ؎ ہوا گیا سب نکل اُنکا آب و تواں ؎ مژہ پر جو کچھ اشک تھے جھڑ گئے ؎ غرض روتے دو گرا ہو پڑ گئے

ہوا حال چشموں کا یاں تک تباہ ❊ کیا رخت پانی نے اپنا سیاہ ❊ ادھر تو چشموں کی روانی بند ہوگئی اُدھر پتے سوکھ سوکھ کے جو اس میں پڑے تو گل سڑ کے پانی کو سیاہ کر دیا جیسا اکثر کھنڈروں میں دیکھا ہے۔ مکانکی ویرانی کا نقشہ پورا پورا مرزا رفیع السودا کھینچ گئے ایک مضمون حضرت غالب کے واسطے بچ رہا تھا ۵ اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر ❊ مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے دربان کا۔ باغ کی بربادی کی تصویر میر حسن نے تکمیل کو پہنچا دی۔

شادی اور بربادی کے دونوں موقعوں پر سامان وہی رکھا ہے لیکن صرف حالت کے تغیّر سے ایک جگہ رونق کی حد کو پہنچا دیا تو دوسری جگہ مصیبت کی انتہا کر دی۔ وہی پانی جو شیشے جیسا صاف تھا سڑے کی طرح سڑنے لگا۔ درختوں کے نیچے پہلے پھولوں کی ڈھیریاں تھی اب پکے کچلائے پھل پڑے ہوئے ہیں۔ وہی لونڈیاں جو قہقہے اور گالیوں میں مصروف تھیں اب بیان کر کر رو رہی ہیں۔ بعض خواصیں عیش و عشرت میں سنجید؛ تھیں تو بعض اب بھی مصیبت و حیرت کی تصویر بنی کھڑی ہیں ۵ کوئی رکھ کے زیر زنخداں چھڑی ❊ رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی۔

۳۔ دس بارہ برس کے خوبصورت پیارے بچے کے نہانے میں سب سے زیادہ دلکش ادا جو ہو سکتی ہے اور جسے دیکھ کے ہر چھوٹے بڑے کو ہنسی اور پیار آجائے وہ یہی ہے۔ زمرد کی لے ہاتھ میں سنگِ پا ❊ کیا خادموں نے جو آہنگ پا ❊ ہنسا کھلکھلا وہ گلِ نوبہار ❊ لیا کھینچ پاؤں کو بے اختیار ❊ عجب عالم اُس نازنیں پر ہوا ❊ اثر گدگدی کا جبیں پر ہوا ❊ ہنسا اس ادا سے کہ سب ہنس پڑے ❊ ہوئے جی سے قربان چھوٹے بڑے ❊ ایک کمال تصویر کھینچنا ہے۔ دوسرا رنگ بھرنا۔ اثر گدگدی کا جبیں پر ہوا۔

۴۔ شاہزادہ سویا اپنے محل میں تھا آنکھ کھلی تو غیر مکان۔ نیا سامان۔ کیا ہونا چاہئے تھا؟ تھیٹروں میں دیکھا ہے کہ شاہزادے کی ایسی کیفیت ہو جاتی ہے جیسے شیش محل میں کتا۔ اِدھر سے اُدھر بولایا ہوا پھرتا ہے۔ موقع یہی چاہتا تھا ۵ نہ بس تھا جو اُس کا تو سہما بہی کچھ ❊ نہ ہوا کچھ دلیر اور حیراں بھی کچھ ❊ سرہانے جو دیکھی تو چار ❊ وہ ❊ کہ ہر اجنبی سی وہ اک رشک ❊ کہا کون ہے تو یہ کس کا ہے گھر ❊ لی آیا مجھے کون گھر سے ادھر

---

۵ پہرے چوکی والی لونڈیوں کی وردی میں چھڑی بھی داخل ہے۔

پھر اُس نے کہا وہ رُخ پر نقاب ہو وہ یا اُس پری سے یہ ہنس کر جواب ہو خدا جانے تو کون یاں ہے کہاں ہے مجھے بھی تعجب ہے اس بات کا ہے کہاں

اگر سیدھی طرح پری ہی کہہ دیتی کہ میں لائی ہوں یا مجھ ہی سے یہ قصور ہوا ہے تو کوئی اعتراض کی بات نہ تھی لیکن وہ میر حسن ہی کیا ہوئے اور وہ پری ہی کیا ہوئی جو دل میں چبھتی ہوئی بات نہ کہے۔

۵- یہ بھی فسانوں کا ایک مقررہ مضمون ہے کہ شاہزادی اور وزیرزادی میں بڑا اخلاص ہو اور وزیرزادی بہت چنچل بے باک حاضر جواب اور کارگذار ہو۔ ان سب صفتوں میں نجم النسا جیسی کامل وزیرزادی کسی کے ذہن میں بھی نہیں آئی جب شاہزادی کچھ شرمائی ہوئی کچھ گھبرائی سی پردے میں جا چھپی اور اجنبی شاہزادے کو بُرا بھلا کہنے لگی تو وزیرزادی ہنس کے کہتی ہے۔

مجھے جو چلے تو خوش آتی نہیں ہے ترے ناز بیجا یہ بھاتے نہیں ہے مری سمت تک دیکھ تو ہائے اے ہو مثل ہے کہ من بھاتا منڈیا ہلائے

کہیں شاہزادی کی جو شامت آئے تو ایک فقرہ وزیرزادی پر کس دیا

یہ سُن سُن کے وہ نازنین مسکرا کے لگی کہنے اچھا بھلا ری بھلا ہے میں سمجھی ترا دل گیا ہے اُدھر ہو بھانے تو کرتی ہے کیوں مجھ پہ دھر

وزیرزادی کب چوکنے والی تھی۔

لگی کہنے ہنس ہنس کے وہ ماہ وش ہو ہوئی ہی تھی اسی دیکھ میں ہی تو غش ہے تمہیں نے تو چھیڑا کا تھا مجھ پہ گلاب ہو بھلا میری خاطر بلا تو شتاب

سوال و جواب کا موقع اور برجستگی تو ایک طرف۔ شاہزادی کا مسکرا کے کہنا اور وزیرزادی کا ہنس ہنس کے کہنا دونوں کے دل کی حالت کا فرق کیسا ظاہر کرتا ہے۔ نازک خیالی دراصل اسی کا نام ہے ایسی ہی شوخی اور گھٹے پن کی باتیں فیروز شاہ سے کی ہیں۔

۶- شاہزادے کا حسن بدر منیر کے دل پر اثر کر ہی چکا تھا یکجائی اور بے تکلفی کی نوبت بھی آ گئی اتنے میں یہ معلوم ہوا کہ حضرت کسی اور کے پھندے میں ہیں اور اُسی کے ڈر سے چراغ پا ہوئے بھی ہو رہے ہیں۔ کسی قدر کھسیانے ہونے کی بات تھی۔ ایک یہ حالت ہے جس کا اظہار یوں ہوا ہے

یہ سن حال ہی دل بیچ کھا پیچ و تاب ہو دیا شاہزادی نے اُسکو جواب ہو مرو تم پری پر وہ تم پر مرے ہو بس اب تم ذرا مجھ سے بیٹھو پرے

میں اس طرح کا دل لگاتی نہیں ہو یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں ہے دوسرے دن رخصت کا پھر وقت آیا۔ اُس کا اور ہی سماں ہے۔ پہلے دن بیگانگی تھی اب یگانگت ہے۔ پہلے بے تعلقی تھی اب واسطہ بھی

پیدا ہو گیا ہے۔ مختصر یہ کہ پہلے محبت اور غصہ تھا اب عشق اور صدمے ہے جسکی یہ تصویر ہے۔

نہ بولی نہ کی بات نے کچھ کہا ۔ نہ دیکھا اُدھر آنکھ اپنی اُٹھا ۔ کہا مجھ سے پیاری نہ بیزار ہو ۔ پھر اوتنگا بولی کہ مختار ہو

۷۔ طلسمی کارخانے کی بنیاد سب نے محض مبالغے پر رکھی ہے یعنی ایسے واقعات جو انسان کے امکان میں کیا عقل میں بھی نہ آسکیں مثلاً حوض میں غوطہ لگایا تو جنگل میں جا نکلے۔ مرد سے عورت عورت سے مرد بن گئے وغیرہ وغیرہ۔ میر حسن کا مذاق چونکہ نہایت اصلیت پسند تھا صرف اسقدر فرق کیا ہے کہ عیش و آرام کے سامان جو انسان عقل اور دولت کے ذریعے سے بمشکل مہیا کر سکتا ہے وہ طلسمات میں بہ آسانی میسر ہوتے ہیں۔ جن و پری کے متعلق دو خیال سب سے زیادہ عام و خوشگوار ہیں کہ تبدیل ہیئت کر سکتے ہیں اور گانے بجانے کے عاشق ہوتے ہیں شیکسپیر کی نظر میں بھی یہی دو خواص سمائے تھے۔ ان ہی دو صفتوں کو میر حسن نے غایت لطافت کیساتھ نباہا ہے فرماتے ہیں

جواہر کے ذی روح وحش و طیور ۔ خراماں پھریں صحن میں دُور دُور ۔ پھریں ان میں سارے وہ حیوان ہو ۔ کریں رات میں کام انسان ہو

پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں دُور دُور کا جو لطف ہے کسی طرح بیان میں نہیں آسکتا۔ ایک دفعہ تو ہرن بارہ سنگے نظر میں پھر ہی جاتے ہیں۔ دوسری صفت

صدا آپ سے آپ گھڑیال کی ۔ کہیں ناچ کی اور کہیں تال کی ۔ رہے واں کے حجروں کا جو در کھلا ۔ تو دنیا کے باجوں کی آئے صدا

سُنا ہے ریاست ریوان میں بکاولی کا قلعہ ابتک موجود ہے وہاں راتوں کو یہی کیفیت رہتی ہے۔ غرض یہ کہ وہ پرستان ہی نہیں جہاں ناچ گانا نہ ہو۔

۸۔ حالتِ فراق کا جہاں نقشہ کھینچا ہے ہر شعر ایک مرثیے کا حکم رکھتا ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ سحر البیان واقعہ نہیں فسانہ ہے لیکن تسلسل کلام کے سبب کچھ ایسا مسمریزم ہو جاتا ہے کہ سننے سے انتہا قلق ہوتا ہے۔ رقیق القلب آدمی تو ایسے موقعے کو آواز سے پڑھ ہی نہیں سکتا جھوٹی کہانی کا یہ حال ہے۔ سچا واقعہ ہوتا تو نہ معلوم کیا کیفیت ہوتی۔ کہیں مرثیہ گوئی کیطرف توجہ فرماتے تو اسمیں بھی میر انیس کے جد امجد ہی ہوتے۔ کچھ ایسی قوت جاذبہ خدا نے دی تھی کہ قلب انسانی کا پورا مرقع دل میں اُتر آیا تھا۔ مثلاً بدر منیر کے حالِ تباہ کی تفصیل میں فرماتے ہیں۔

ولے اُن دنوں میں جہاں وہ ماہ رو سر شام چھپ چھپ کے کرتا نگاہ ؛ سو وہ بھی ہر دن سے آواں مدام تو اُسی جا وہیں بیٹھ کرتی تھی شام

یعنی جہاں شاہزادہ پہلے دن اتفاق سے نظر آگیا تھا وہیں جا جا کے بیٹھا کرتی تھی۔ عشق کی آفت سے خدا بچائے محبت اور ماتا میں کیا یہ نوبت نہیں پہنچ جاتی تین چار برس کا کھیلتا ملتا بولتا چالتا بچہ جاتا رہے تو ماں باپ کو دونوں تک یہی آس رہتی ہے کہ شاید اس کونے سے نکل آئے شاید اُس در میں کھڑا ہوا نظر آجائے۔ شاید ڈیوڑھی میں سے بولنے کی آواز آجائے ٹوٹے پھوٹے کھلونے پرانی جوتی میلے کپڑے تک عزیز ہوتے ہیں۔ یہ حالت اکثر آدمیوں پر گذری ہوگی لیکن انتخاب کر کے معرض بیان میں لانا میر حسن ہی کا کام تھا۔ اسی عالم بیخودی میں استغراق کی کیفیت ہے۔ کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو ؛ تو اُٹھنا اُسے کہہ کے ہاں جی چلو۔ پہلے مصرعے میں طرز خطاب سے معلوم ہوتا ہے کہ دیر تک ایک جگہ بیٹھے ہوئے دیکھکر کسی خواص نے وہاں سے چلنے کی درخواست کی جواب نہ پایا تو مخاطب کر کے پھر کہا۔ دوسرے مصرعے میں لفظِ ہاں جی سے صاف ظاہر ہے کہ شاہزادی نے سُن تو پہلے ہی لیا تھا لیکن توجہ نہیں ہوئی تھی۔ دوسرا شعر اس سے بھی گہرا ہے۔

کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے ؛ کہا خیر بہتر ہے منگوائیے۔ حالت تو یہ ہے کہ بھوک کا کوسوں پتہ نہیں۔ نوالہ مُنہ میں گولی بن کے رہ جاتا ہے۔ پانی تک حلق میں پھنستا ہے لیکن کھانا کھانے سے انکار نہ کیا۔ کیا کرے کس کس کو اپنا کلیجہ کھول کے دکھائے۔ اگر انکار کرتی ہے تو خواصیں اور پیچھے پڑتی ہیں۔ ایک کہتی ہے بی ہوش میں آؤ اپنا دل ٹھکانے کرو۔ لو اور سنو کھانا بھی کہیں چھٹ سکتا ہے۔ دوسری کہتی ہے بیگم تم نے کیوں اپنی بھلی چنگی جان کو عذاب لگایا خبر ہے وہ اپنے کہاں چین کرتا ہوگا تیسری پچمہ دور ہی سے حاشیہ لگاتی ہے۔ لے کمبخت مردوں کی ذات سدا ہی سے بیوفا ہے۔ ان جگر خراش طعنوں سے اور جی کھسیانا ہوتا ہے سلسلۂ خیال الگ درہم ہوتا ہے۔

سُنا ہے میر انیس مرحوم نے زمانۂ شباب میں مثنوی لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ کچھ لکھی بھی تھی کہ خیال آیا کہ ایک دفعہ دادا جان کی مثنوی کو غور سے پڑھ لینا چاہئیے۔ جب اِس شعر پر پہنچے تو مثنوی کو آنکھوں سے لگا لیا اور کہا یہ حصہ آپ ہی کا تھا۔ اب مثنوی کہنا جھک مارنا ہے +

پھول والی کا گیت

"شہر پومپی آئی کا عہد آخر" بلور لٹن کا ایک مشہور ناول ہے۔ اس میں ایک حصہ نظم ہے جسکا نام مصنف نے "اندھی پھول بیچنے والی کا گیت" رکھا ہے۔ یہ پھول بیچنے والی ایک نوجوان لڑکی تھی جو صورت شکل سب کچھ رکھتی تھی لیکن مادرزاد اندھی تھی۔ یونان اُسکا وطن تھا۔ اور اٹلی میں لونڈی ہو کر ایک ظالم آقا کے ہاتھ فروخت ہوئی تھی۔ آقا نے یہ خدمت بتا رکھی تھی کہ صبح شام شہر کے خاص بازار میں پھول بیچا کرے۔ اور اُس سے جو آمدنی ہو وہ آقا کے حوالہ کرے۔ یہ لڑکی روز باغوں سے پھول توڑ کر لاتی تھی اور ٹوکری میں سجا کر بازار میں جا کھڑی ہوتی تھی۔ ایک ہاتھ میں ٹوکری لٹکا کر دوتارہ بجاتی تھی اور گیت گا گا کر پھول بیچا کرتی تھی۔ اکثر امیرزادے امیرزادیاں شہر کے بیکے ترچھے عاشق مزاج جوان چلتے چلتے اُسکا گیت سُننے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور سب کو اسکے حال پر رحم آتا تھا اور پھول خرید لیا کرتے تھے۔

سودا بیچنے والوں کی بولیاں تو ہر جگہ ایک مقامی لطف رکھتی ہیں اور بنارس کے اُس بڈھے باغبان نے تو غضب ہی کیا تھا۔ جو سردے کی قاشیں سامنے رکھے صدا لگاتا تھا کہ

من قاش فروش دلِ صد پارۂ خویشم

اور ایک شاعر ایسے وارفتہ ہوئے کہ سردہ چھوڑ مصرع ہی خرید کر گھر لے گئے۔ لیکن اس پھول بیچنے والی کا گیت اور اُسکے چند مضامین بھی لطف سے خالی نہیں۔ اس میں شک نہیں وہاں آمد تھی۔ یہاں آورد ہے۔ لیکن جس مجموعی کیفیت کے ساتھ قصہ میں ایک اندھی چودہ پندرہ برس کی معصوم خوبصورت۔ خوش گلو۔ وطن سے دور غلامی کی تکلیفوں

میں پہلا شاعرانہ مزاج لڑکی کو مصنف نے پھول بیچنے کے لئے گیت بنا کر دیا ہے اور اس میں
بڑا کمال دکھایا ہے۔ کسی زبان کی نظم کو غیر زبان کی نثر میں ترجمہ کرنے کے برابر کوئی بدمذاقی نہیں ہو سکتی
لیکن اس خیال سے کہ شاید کوئی شاعر دوست اس طرف توجہ کر کے ایک چھوٹی سی نظم لکھ ڈالیں
میں انگریزی نظم کا ترجمہ یا مطلب لکھتا ہوں۔ عنایت اللہ

ترجمہ

"لوگو میرے پھول خرید لو۔ عاجزی سے کہتی ہوں۔ میرے پھول خرید لو
لوگوں سے سنتی ہوں کہ یہ زمین بہت خوبصورت ہے۔ اگر زمین خوبصورت ہے
تو یہ پھول اوسی زمین کے بچّے ہیں۔ کیا ماں کا حُسن اُنکی صورتوں میں نہیں ہے!
ابھی ابھی اُسکی گود سے اوٹھکر یہ آئے ہیں۔ کیسی میٹھی نیند ماں کی گود میں یہ پڑے
سوتے تھے۔ یوہیں سوتوں کو اُٹھا لائی ہوں۔ اوس پڑ رہی تھی۔ نسیم چل رہی تھی
نسیم کیا چل رہی تھی۔ ماں دعائیں پڑھ پڑھکر ان نازک پھول سے بچوں پر دم
کرتی تھی۔

ماں کے میٹھے میٹھے پیار کے نشان ان بچوں کے لبوں۔ پھولوں کی پنکھڑیوں
پر ہیں۔ اور ماں کے رخسار محبت کے آنسوؤں سے تر ہیں۔ رات دن ان کی
رکھوالی کرتی ہے۔ فکر کرتی ہے۔ دل دھڑکتا ہے اور روتی ہے۔ کبھی خوشی
سے آنسو بہاتی ہے کہ یہ بچے بڑے ہوکر کیسے حسین اُٹھے ہیں۔ محبت سے وہ روتی
ہے۔ شبنم کے قطرے اُس کے آنسو ہیں اور ماں کی ممتا ان آنسوؤں کا
سرچشمہ۔

لوگو۔ تمہاری دنیا نور کا گھر ہے۔ جہاں محبوب کے دل میں بھی محبت کو زندگی
ملتی ہے۔ لیکن مجھ اندھی بے کس کا گھر اندھیری گھپ رات ہے۔ جسمیں فقط
آوازیں بستی ہیں۔ گویا زمین کے نیچے اندھیرے میں مصیبت کی کالی کالی ندیوں

کے کنارے کھڑی ہوں - اچھی اور بُری پرچھائیاں پاس سے گذرتی ہیں جنکو سُنتی ہوں دیکھتی نہیں - انہیں وہ صورتیں بھی ہونگی جن سے لوگ عشق کرتے ہیں وہ کیسی ہوتی ہونگی - ترستی ہوں - پر نہیں دکھائی دیتیں - دل میں جوش اُٹھتے ہیں ہاتھ پھیلاتی ہوں مگر سوائے خالی خولی آوازوں کے میرا کوئی پرسانِ حال نہیں میرے لئے زندہ چیزوں سے مراد ایسی پرچھائیاں ہیں جو آواز رکھتی ہیں مگر جسم نہیں -

لوگو - چلو میرے پھول خرید لو - سُنو - سُنو - یہ پیاری جانیں کیا کہتی ہیں - فریاد کے لئے انکو بھی زبان ملی ہے - پھول -

لوگو - چلو - میرے پھول خرید لو سُنو سُنو اِس لڑکی کا سانس ہماری پنکھڑیوں کو مُرجھا دیتا ہے - ہم نازک ہیں - پھول ہیں - نور کے بچے اور زمین کے پروردہ ہیں - ہم کو اس اندھیرے میں رہنے والی لڑکی سے ڈر لگتا ہے - اس نابینا کی قید سے ہمکو آزاد کر دو - اسکی آنکھیں بے نور ہیں اور ہم اُن آنکھوں کے مشتاق ہیں جو ہمکو دیکھیں - تاریکی میں ہمارا حُسن کس نے دیکھا ہے - ہمارے حسن و جمال کا دل تو تمہارے دیدۂ روشن سے طلوع ہوتا ہے"

لوگو چلو میرے پھول خرید لو -

عنایت اللہ

کچھ حساب اے ستم ایجاد تو کر — کس قدر ظلم کئے یاد تو کر
زندہ جا سکتے ہیں باہر کہ نہیں — دیکھ اسیروں کو اب آزاد تو کر
ارے منہ ڈھانک کے رونیوالے — دم اُلٹ جائیگا فریاد تو کر
خاک کیوں چھان رہا ہے بتلا — تھا کبھی دل پاس ترے یاد تو کر
زلزلہ عرش کو آیا بھی تو کیا — دل لرز جائے وہ فریاد تو کر
ہائے کیا ہوگا بہار آنے تک — قیدی کنج قفس یاد تو کر
وہ تسلی ہی سہی اے صیاد — کچھ معین مری میعاد تو کر

پیران دھار

یہ مقام اب اس قدر گمنامی کی حالت میں ہے کہ عام لوگ پیران دھار کو پڑھکر چونکیں سگے کہ یہ کیا معاملہ ہے حضرات زمانہ سلف میں یہ بڑا غدار شہر تھا۔ اسے راجہ دہانگ پنوارڑے نے بسایا تھا پہلے پواروں کی راجدہانی اجین میں تھی راجہ بھوج نے دھار کو اپنا پایہ تخت بنایا جب مسلمانوں نے مالوہ فتح کیا تو مدت تک یہ ہی شہر مالوہ کا دارالخلافہ رہا پھر بزرگان دین اور اولیا اللہ کے مزارات کی کثرت کی وجہ سے پیران دہار کے نام سے مشہور ہوگیا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے " کہ مالوہ کا سب سے بڑا شہر ہے زراعت اس ملک میں بہت ہوتی ہے خصوصاً گیہوں بہت پیدا ہوتا ہے۔ یہاں سے پان دہلی تک جاتے ہیں جو یہاں سے ۲۴ منزل ہے تمام سڑک پر پتھر کے ستون یعنی میل جن پر فاصلہ درج ہے لگے ہوئے ہیں۔ جب مسافر کو منظور ہوتا ہے کہ وہ معلوم کرے کہ آج کتنا چلا ہے اور منزل تک کتنا فاصلہ باقی رہا ہے یا جس شہر کو جاتا ہے وہ کتنی دور ہے تو ستون پر دیکھنے سے فوراً معلوم ہوجاتا ہے۔ یہ شہر شیخ ابراہیم مالدیپی کی جاگیر میں ہے جس نے ایک بلند ٹیلہ پر جو شہر سے باہر ہے ایک خانقاہ تعمیر کی ہے جس سے ہر مسافر کو کھانا ملتا ہے۔"
اسلامی زمانہ میں یہاں انگور بہت پیدا ہوتا تھا اور دو دفعہ پھل دیتا تھا۔ جس میں پہلی مرتبہ کا پھل بہت شیریں ہوتا تھا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اس شہر پر مرہٹوں کا قبضہ ہوا۔ اب یہ ریاست دھار کا صدر مقام ہے جس کی آمدنی نو لاکھ روپیہ سال کے قریب ہے۔ موجودہ آبادی سولہ سترہ ہزار کے قریب ہے۔ ریلوے اسٹیشن مئو سے ۳۳ میل کے فاصلے پر مغرب کی جانب واقع ہے۔ موجودہ راجہ اپنے آپ کو

بکرماجیت کی اولاد میں بتلاتا ہے۔ مہاراجگان گوالیار اور اندور کی طرح اس خاندان میں بھی محرم دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اور راجہ صاحب کا تعزیہ سب سے اچھا بنتا ہے یہاں کے آثار قدیمہ شاہان غوری و خلجی کے محلات کے کھنڈروں کے علاوہ حسب ذیل ہیں۔

قلعہ

سنگ سرخ کا ایک چھوٹا سا قلعہ آبادی کے قریب ایک ٹیلہ پر بنا ہوا ہے۔ اندر اس کے ریاست کا جیل خانہ ہے۔ اور کوئی پرانی عمارت باقی نہیں صرف دو تین مزار اور ایک باولی ہے۔ ایک نشستگاہ شکستہ پڑی ہے جسکے توڑے مثل شیر کی مورت کے ہیں۔ جس زمانہ میں سلطان محمد تغلق دکن کی تسخیر کے واسطے جاتا تھا اُس نے اس قلعہ کو تعمیر کرایا تھا۔

لاٹ مسجد

یہ سنگین مسجد آبادی کے قریب ناہر دروازہ کے پاس واقع ہے۔ مسجد کا رقبہ ۱۴۳ فیٹ × ۲۴۴ فیٹ اور درمیانی صحن ۱۳۲ فیٹ ۸ انچ × ۱۱۸ فیٹ ہے۔ شمال وجنوب اور مشرق میں ۱۰۔۱۰ فیٹ چوڑے ۸۔۱۰، ۷ اور کے دالان ہیں۔ مسجد کے اندر شمال وجنوب میں ۴۲ فیٹ × ۱۶ فیٹ قطعہ کو چھوٹے چھوٹے ستون کھڑے کرکے دو منزلہ کردیا ہے درمیانی درجے پر گنبد اور باقی چھت چار چار ستونوں کے درمیان میں پتھر کی پٹیوں سے پٹی ہے۔ ستون بلند بعض سادہ اور بعض منقش ہیں جن میں سے بعض میں گھنٹہ اور مورتوں کے مسخ شدہ نشان موجود ہیں اور کسی مندر کے معلوم ہوتے ہیں منبر دس سیڑھی کا گنبد دار خوبصورت ہے۔ جس کے آگے چار ستونوں کے

درمیان میں ایک چبوترہ بنا ہوا ہے مشرقی جانب عالیشان گنبد وار صدر دروازہ ہے جس کی بیرونی پیشانی پر یہ کتبہ کندہ ہے ؎

خدایگان زمیں میر شہر مہر جلال ۔۔۔ مدار اہل زماں آفتاب برج کمال
حمیدہ سیرت و عالی نسب ستودہ تبار ۔۔۔ فلک جناب و ملک قدرت و مسیح مثال
بعدل و بذل و وقار و برزم و بزم و شکوہ ۔۔۔ ندیدہ دیدۂ گردوں و رانندیدہ ہمال
پناہ پشت شریعت عمیدشہ داؤد ۔۔۔ بلے کہ فخر کند قوم ازآں حمیدہ خصال
معین ناصر دین نبی ولایت خاں ۔۔۔ کہ برگزیدہ خداوند ایزد متعال
مرید شیخ طریقت نصیر دیں محمود ۔۔۔ کہ بو ملجائے اوتاد و مرجع ابدال
بہ شہر دھار بنا کرد مسجد جامع ۔۔۔ بہ وقت سعد و خجستہ بروز فرخ فال
چہ مسجدے کہ جہاں راست کعبۂ ثانی ۔۔۔ فزوں ز وصف دو عالم برون حد مقال
مثال مسجد اقصی و بیت معمورست ۔۔۔ کہ یافت عرصۂ گیتی ازو بہائے جمال
گذشتہ بود ز تاریخ سال ہشتصد و ہفت ۔۔۔ کہ شد تمام ز اقبال قبلۂ آمال
بحق احمد مرسل کہ طاعت و حسنات ۔۔۔ خدا ش ثبت کند در جریدۂ اعمال

ایک دروازہ شمالی جانب ہے اس کے پیش طاق پر بھی کتبہ لگا ہے مگر پورا پڑھا نہیں جاتا دونوں کتبوں کا ماحصل یہ ہے کہ اس مسجد کو ۸۰۷ھ میں عمید شہ غوری مخاطب بہ دلاور خان نے جو حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کا مرید اور مالوہ کا پہلا خود مختار بادشاہ تھا۔ تعمیر کرایا تھا۔ مسجد کے اندر ایک جگہ یہ عبارت کندہ ہے ” در زمانیکہ اعلی حضرت خاقانی ظل سبحانی شان مظہر حق شاہ اکبر تعالی شانہ اللہ اکبر عازم دکن بود بتاریخ ہشتم اسفندیار ۴۲ جلوسی موافق ۱۰۰۸ھ ہجری دریں مقام نزول اجلال فرمودند عمل داؤد کندہ کار “

شمالی دروازہ کے سامنے ایک شکستہ چبوترہ ہے جس کے پاس ایک لوہے

کی لاٹ پڑی ہے جس کی بلندی ۲۴ فیٹ اور تین چار فیٹ زمین میں دبی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ لاٹ مربع شکل کی ہے جس کا ہر ضلع ایک فیٹ ہے۔ توزک جہانگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سلطان بہادر شاہ گجراتی نے مالوہ کو فتح کیا تو اس لاٹ کو احمدآباد لیجانا چاہا کارپردازوں نے بے احتیاطی سے لاٹ کو چبوترہ سے اُکھیڑا اور اُس کے دو ٹکڑے ہو گئے جو جہانگیر کے عہد تک وہاں موجود تھے۔ جہانگیر نے لکھا ہے کہ چونکہ یہاں یہ بیکار پڑے ہیں لہذا میں نے حکم دیا کہ بڑا ٹکڑہ یہاں سے آگرہ بھیجا جائے اور حضرت عرش آشیانی (اکبر) کے روضہ کے صحن میں نصب کیا جائے اور شب کو اُس کے اوپر چراغ روشن کیا جائے۔ خدا معلوم اس حکم کی تعمیل ہوئی یا نہیں کیونکہ اکبر کے روضہ میں کوئی لاٹ اب موجود نہیں ہے۔ یہ مسجد اب ویران ہے۔ لارڈ کرزن کی تشریف لیجانے کے وقت سے ایک شخص نندرام برہمن پانچ روپیہ ماہوار تنخواہ کا ریاست کی طرف سے ملازم ہے وہی کچھ صفائی رکھتا ہے لیکن صحن میں گھاس جمی ہوئی ہے۔

درگاہ عبداللہ شاہ چنگال

لاٹ مسجد سے مغرب کی جانب تھوڑے فاصلے پر ایک بلند پہاڑی ٹیلہ پر یہ درگاہ واقع ہے۔ پہاڑی پر چڑھکر اول ایک دروازہ ملتا ہے جس کی چھت گر گئی ہے اُسکے اندر داخل ہوکر شکستہ مسجد کے نشان ہیں اُس کے بعد دوسرا دروازہ ہے جس کی اندرونی پیشانی پر سنگ موسیٰ کی تختی پر اکتالیس شعر کا ایک قصیدہ کندہ ہے۔ اب یہ تختی دو تین جگہہ سے ٹوٹ گئی ہے۔ اوپر ایک چھوٹا سا گنبد ہے جس کے اندر دو مزار ہیں جن میں سے بڑے تعویذ پر لکھا ہے شاہ صاحب کا ہے۔ اس مزار کے پائیں ایک حجرہ ہے اُس میں بھی ایک قبر ہے۔ گنبد کے باہر چبوترہ پر اور درگاہ کے

نیچے بہت سی پختہ قبریں بنی ہوئی ہیں۔ گنبد کے مشرقی جانب ایک پختہ چبوترہ گنج شہدا کا ہے جس کے اوپر چوالیس نشان بنے ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۴ شہدا کا اس جگہ مزار ہے یہ مزارات نہ صرف صوبہ مالوہ بلکہ غالباً کل ہندوستان میں سب سے پرانے ہیں۔ اس نواح کے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہنود کو بھی عبداللہ شاہؒ اور ان کے شہدا کے مزار سے خاص عقیدت ہے۔ درگاہ میں جو قصیدہ کندہ ہے اُس کا ماحصل یہ ہے کہ عبداللہ شاہؒ سے پہلے یہ شہدا اس مقام پر تشریف لائے تھے جب موذن نے صبح کی اذان دی کفار نے چاروں طرف سے اکٹھا ہو کر سب کو شہید کر کے اس جگہ داب دیا اس کے بعد عبداللہ شاہ چنگالؒ معہ چند بہادروں کے تشریف لائے اور اُنہوں نے اس مقام پر قیام کیا اشاعت اسلام شروع کی۔ راجہ بھوج کا زمانہ تھا وہ معہ اپنے لشکر کے مسلمان ہو گیا۔ محمود شاہ خلجی سلطان مالوہ نے ۸۵۹ھ میں عبداللہ شاہ چنگال کے مزار پر قبہ۔ شہدا کے مزار پر چبوترہ۔ حجرے۔ مسجد۔ لنگرخانہ وغیرہ تعمیر کرایا۔" راجہ بھوج سمت ۵۱۶ میں مسند نشین ہوا اور سو برس سے زیادہ اُس نے راج کیا یہ حضرت سرور کائناتؐ کا ہمعصر تھا۔ مشہور ہے کہ اُس نے معجزہ شق القمر بچشم خود دیکھا اور حضرت کی نبوت پر ایمان لایا تھا۔ شاہ عبداللہ چنگالؒ کا حال کسی تاریخ میں نظر سے نہیں گذرا۔ مولانا نظام الدین احمد صاحب طبقاتِ اکبری نے سلطان مظفر شاہ بن محمود شاہ گجراتی کے حال میں صرف اتنا لکھا ہے کہ منقول ہے کہ شیخ عبداللہ کا نام پانڈے برج تھا اور راجہ بھوج کا وزیر تھا اور اُسی زمانہ میں مسلمان ہو کر اس قدر ریاضت کی کہ کمال کے درجے پر پہنچ گیا۔" بہرحال یہ مزار بہت قدیم اور بافیض ہے۔ بوجہ طوالت پورے قصیدہ کے نقل کرنے سے معذوری ہے صرف چند شعر درج کئے جاتے ہیں ؎

تعالیٰ ربنا این قبہ نور ۔ برایں قبر از صفا چوں بیت معمور

سبحان این آستانِ شاہِ بازیست — کہ در چنگالِ شں آمد دیو ما سور
سراپدال عبد اللہ چنگال — چہ چنگالیکہ شب جنبش سحر سور
نخست از وے شد این مرکز مسلماں — ہمہ اعلام دیں زو گشت منشور
شنید ستم کہ بیش از وے تنے چند — رسیدہ اند ریں ویرانۂ عور
موذن چوں ندائے صبح برداشت — بلند مستانہ صورت چوں غو صور
خروشے خاستہ ہر سو ز کفار — دو یدہ ہر تنے با تیغ و ساطور
بکشتند آخر آں مردان دیں را — پس از کشتن بجائے کرد مستور
کنوں آں مشہد گنج شہیداں — نشاں ماندہ ازاں پاکانِ مسرور
چو وقت آمد کہ خورشید حقیقت — شود طالع دریں یلدائے دیجور
رسید این شیر مرد از مرکز دیں — دریں دیر کہن با جمع جمہور
بزد برہم تماثیل بتاں را — مصلا ساختہ آن معبد زور
چو رائے بھوج دیدش از فراست — مسلماں گشتہ با اہل ہمہ سور
شہنشاہ خلج محمود شاہ آنکہ — شد از عدلش جہاں چوں خلد معمور
از سر نو کرد این کہنہ وطن را — نوی از سر گرفت دو مجدد ور
ز ہجرت ہشتصد و پنجاہ و نہ بود — کہ تاریخش مجدد گشت مسطور

درگاہ مولانا شیخ کمال الدین مالوی

مولانا شیخ کمال الدینؒ بن بایزید بن نصیر الدینؒ مالوہ کے مشہور بزرگوں میں سے ہیں آپ سنہ ۶۹۰ھ میں دھار میں وارد ہوئے سلطان محمود خلجی شاہ مالوہ نے آپکا عالیشان مقبرہ معہ مسجد کے تعمیر کرایا ہے۔ دروازہ عالیشان ہے جسکے اگے گنبد بنا ہے پیشانی پر یہ کتبہ کندہ ہے۔

این روضهٔ رضوان که چنین زینت و کمال / وین قبهٔ پر نور که چنین قطب کمال
چون از پئے زائران مسکین و غریب / در ساخت و صحن تنگ بود است محال
این هر دو رواق و صحن وین گنبد در / با پردهٔ سنگ و خانه و آب زلال
هم این صفه و رواق و خانقاه و دهلیز / با کوشک و با کنگرهٔ همچو هلال
هم از پئے آرائش هر اهل دلے / هم از پئے مشغولئ هر صاحب حال
در عهد همایون خود آن شاه جهان / محمود شه خلجی خورشید مثال
در هشتصد و سی و یک آراسته و لبریز / آراسته باو قصر عرش همال
بر درگه این دو شاه دین و دنیا / محمود گدا افتاده در صف نعال
چون هست صلائے عام زین در همه را / باشد ...... گوینده تعال

کتبه و عمله سید حسین الحافظ الشیرازی المرشدی

خاص درگاہ کے احاطہ کے اندر دو گنبد ہیں۔ چھوٹے گنبد میں حضرت کا مزار ہے بڑے گنبد میں چھ قبریں ہیں اور دیوار پر سورہ یسین کندہ ہے احاطہ کے اندر اور بھی بہت سی قبریں ہیں۔ بیرونی احاطہ میں سلطان محمود خلجی اور مولانا حسام الدین خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے گنبد اور چند اولیاء اللہ کے مزار واقع ہیں مولانا حسام الدین کے گنبد کی چھت گر گئی ہے اور دوسرے گنبد بھی اچھی حالت میں نہیں ہیں۔

مسجد کا رقبہ [illegible] فیٹ ہے۔ درمیانی حصہ کے علاوہ جس کی چھت نہایت خوبصورت لداؤ کی گنبد دار ہے باقی چھت ۸۰ ستونوں کے درمیان میں پتھر کی پٹیوں سے پٹی ہے ستون منقش کسی مندر کے منہدم [illegible] ہوتے ہیں اور اس ترتیب سے نصب ہیں کہ مسجد چار درجوں میں منقسم ہو گئی ہے۔ نو سیڑھیوں کا خوبصورت ممبر ہے جس کے اوپر چھتر بنا ہوا ہے اس ممبر کے نیچے شمال کی جانب ایک جگہ ایک سیاہ پتھر نصب ہے جس کے گوشہ پر ہندی زبان میں کچھ کتبہ ہے اور یہ

زائرین دستی کتبہ لکھے گئے ہیں - ایک فارسی غزل کے نیچے عبارت ود فقیہ
خاکپائے درویشان قلندر بیگ سنہ نہصد ونود چہار بتاریخ جمادی الآخر بست و نہم
تحریر یافت" تحریر ہے - شمال و جنوب میں ۱۴-۱۴ - اور مشرق میں ۱۲ در کا والان
درمیان میں وسیع صحن معہ حوض کے ہے -

درگاہ بندی چھوڑ

یہ درگاہ قلعہ دہار کے پیچھے تھوڑے فاصلہ پر ہے ایک پختہ احاطہ کے اندر
سنگین چبوترہ پر مزار واقع ہے قریب ہی ایک قنائی مسجد ہے جس کے طاق
میں سنہ ۲۲۸ھ کندہ ہے - اور بہت سی قبریں اور والان بنا ہے ریاست
کی طرف سے اخراجات کے واسطے کچھ زمین معاف ہے ماہوار خرچ
روشنی اور ۵ سال غلاف خرچ کے نام سے ملتا ہے - ۲ محرم کو عرس ہوتا ہے
جس میں اکثر راجہ صاحب بھی شریک ہوتے ہیں - اہل دہار کو اس درگاہ سے
خاص عقیدت ہے اُن کا بیان ہے کہ صاحب درگاہ کا نام سید مسعود ہے
یہ راجہ دہار کی سرکار میں سپاہیوں کے جمعدار تھے ایک مرتبہ مسلمانوں سے لڑائی
ہوئی ہندو بہت سے مسلمان گرفتار کر لائے سید صاحب کو حمیت اسلام کا جوش
پیدا ہوا جب ان کے پہرہ کا وقت آیا سب قیدیوں کو چھوڑ دیا - ہندوؤں کو خبر ہو گئی
سید صاحب پر آ پڑے آپ نے شجاعت حیدری کے جوہر دکھائے - قلعہ
میں آپ کا سر تن سے جدا ہو گیا - اور تن بے سر دیر تک لڑتا رہا یہاں تک کہ وہ
تن بے سر قلعہ سے باہر آیا اور ہندوؤں کو قتل کرتا ہوا زیر قلعہ پہونچا اس
عرصہ میں قیدی دور نکل گئے تب سید صاحب کا تن روبقبلہ زمین پر گرا وہیں مزار
ہے - سر کی قبر قلعہ کے اندر ہے اور اس پر بھی سفیدی در چادر وغیرہ ہے - [illegible]

انتظام ہے۔

ان درگاہوں کے علاوہ دہار میں اور بھی بہت سی درگاہیں اور بزرگان دین کے مزار واقع ہیں شہر سے باہر پہاڑ پر مولانا غیاث الدینؒ کا مزار ہے یہ بزرگ مولانا مغیث الدین اُجینی کے بھائی اور بڑے فاضل اور کامل بزرگ تھے۔ غیب شاہ غازی شاہ۔ جمن جنتی۔ پیر پتراں۔ شیخ زکریا۔ شیخ جوہر۔ شیخ سعد اللہ صدر جہاں وغیرہ کے مزار بھی مشہور اور زیارت گاہ خاص و عام ہیں اور قبور اسلام نامعلوم الاسم سیکڑوں ہزاروں کے اندر و باہر موجود ہیں مسلمانوں سے زیادہ یہاں کے ہندو ان مزارات کی تعظیم کرتے ہیں۔ جامع مسجد (لوٹ واڑی مسجد) کے دروازہ کے آگے چار قبریں ایک چبوترے پر ہیں جن کے درمیان میں یہ کتبہ کندہ ہے:

خضر خان و مجاہد خان و برہان	جلال الدین کہ ہر یک یار غار اند
وسے یارے کہ بعد از جہاں سپردن	یہ یکجا خفتہ اندر خاک و یار اند
زمن از ہجرت ایناں چہ پرسی	کہ ہر یک رستم و اسفندیار اند
بجاں بازی ایشاں آفریں باد	چہ نیکو آمدہ در وسے کار اند
خرد تاریخ سالِ فوت آں گفت	شہیدے پاک و اکبر ہر چہار اند

۸۵۰ھ بتاریخ ۲۷ ذوالحجہ

تاریخ شہادت مرحومی خضر خاں ولد منصور خاں برادر زادہ ابراہیم خاں مردانی روز سہ شنبہ بیست و ہفتم شہر ذوالحجہ ۸۵۰ھ

دہار میں شاہان مانڈو نے نہایت عمدہ آہو خانہ تعمیر کرایا تھا جس میں قسم قسم کے چرند و پرند جانور جمع کئے تھے اب اسکا کوئی نشان باقی نہیں۔

دہار سے چار پانچ کوس کے فاصلہ پر سعد لپور نام ایک گاؤں ہے اس میں رود خانہ ہے۔ ناصر الدین خلجی شاہ مالوہ نے اس پر پل باندھکر محل اور سیرگاہ

بنائی ہے یہ مقام بھی مثل کالیا وہ اُجین کے نہایت فرح بخش اور دلفریب ہے
جہانگیر نے لکھا ہے اگرچہ عمارات چنداں قابلِ تعریف نہیں لیکن چونکہ درمیان
رودخانہ کے تعمیر کی گئی ہے اور خوبصورت نہریں اور حوض بنائے ہیں لہذا
دلفریب ہے) میں نے وہاں جانیکا قصد کیا تھا مگر سواری کا انتظام نہ ہوسکا لہذا نہ
پہنچ سکا۔ لیکن سنا ہے کہ کالیا دہ اُجین سے یہ اچھی حالت میں ہے۔ اور قرب و
جوار کے انگریز حکام وہاں آنکر قیام کرتے ہیں ایک ڈاک بنگلہ بھی تعمیر
ہوگیا ہے۔

سعید احمد مارہروی

نواب سراج الدین احمد خانصاحب سائل دہلوی جن کی تصویر ہدیہ ناظرین
کی جاتی ہے۔ اُن چند حضرات سے ہیں جن کے دم سے دلّی میں آج کل
شعر و سخن کا چرچا باقی ہے۔ جناب فصیح الملک داغ مرحوم سے آپ کو نسبت فرزندی
حاصل ہے۔ اور شاعری میں بھی جناب داغ کے بہت سے شاگرد اُستاد کے بعد
جناب سائل کی اُستادی کے قائل ہیں۔ علم ادب اور خصوصاً فن شعر سے جو مناسبت
جناب سائل کے خاندان کو رہی ہے محتاجِ بیان نہیں۔ آپ اپنے اسلاف کے
نقش قدم پر چلتے ہیں۔ آپ کا قیام یا حیدرآباد میں رہتا ہے یا دلّی میں۔ پچھلے دنوں
چند ماہ مسلسل دلّی میں تشریف فرما رہے تو یہاں شاعری کی گرم بازاری رہی اب رونق افروز
بزم ہائے دکن ہیں۔ آپ اپنے اشعار ایک خاص لے میں پڑھتے ہیں۔ اور زبان
کی خوبی اور محاورات کی چاشنی کے ساتھ آپ کا پڑھنے کا انداز مشاعروں میں سننے
والوں کے دلوں پر عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اُمید کہ ہم آپ کے کلام سے اکثر
مستفید ہوتے رہیں گے۔

شاہین و درّاج

درّاج

خوشا نصیب اے سرزمین زابلستان! کیسے کیسے گوہر آبدار جنکی چمک سے تمام ایران جگمگا اُٹھا آخر کار تیری گود میں آ لیٹے۔ خدا کی شان! وہ بیابان جن کے بگولے آسمان سے باتیں کرتے تھے اُن باکمال لوگوں کی خوابگاہ بنے جو مرتے مر گئے اور استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔

زابلستان! تو مٹ چکا! تیری عمارتیں مسمار! تیرے محل ڈھنڈھار! تیری آبادی برباد! مگر تو لاکھ تاراج ہو جائے۔ تیری خاک میں وہ لاجواب ذرے چھپے ہیں جنکی آب و تاب آج بھی ویسی ہی ہے جیسی تین سو برس پہلے تھی۔ تیرے کونے کھدرے تیرے پہاڑ اور کھنڈر ہاے اُن خیالات کے خزانے ہیں جنپر زمانہ مدت العمر ناز کریگا۔ تیرے کھنڈروں میں وہ بھلی ہوئی صورتیں آرام کر رہی ہیں جنکا نام صفحۂ روزگار سے مٹنے والا نہیں۔

یلغاری قبرستان! تیرے مہمان قیامت تک کروٹ نلیں انکی ہڈیاں گل جائیں انکی قبروں کے نشان تک مٹ جائیں مگر سچی محبت کا سہرا ان کے سر رہے گا! انکے پکے اصول ایسے شاداب پھول ہیں کہ خزاں تمام دنیا کو برباد کر دے مگر یہ اسوقت تک لہلہاتے رہیں گے جب تک کارخانۂ قدرت میں چشم بینا موجود ہے۔

کون کہہ سکتا تھا کہ یہ بیچاری آغا قندہاری قوم سے یلغاری نسل سے

تاتاری مفلس غریب فاقوں کے ماری اس ناداری میں ایسا لعل بے بہا جن رہی ہے جو ملکۂ شاہین کے گلے کا ہار ہوگا۔ اور یہ مرزا دراج وہ ودو دانوں کو محتاج یہی محبت کی ایسی لاج رکھیگا کہ آج کیا طہران اور کیا اصفہان کیا آذربایجان اور کیا مازندران تمام ایران اس پر فخر کریگا۔

تعجب ہوتا ہے کہ وہ گھر اور نہ صرف گھر بلکہ خاندان جسکا بچہ بچہ متعفن اور بے ایمان اسمیں ایک ایسا شخص پیدا ہو جو آسمان محبت پر چودھویں کا چاند ہوکر چمکے۔ اور عقل کام نہیں کرتی کہ ایسا وحشی جس نے کبھی آنکھ کھول کر تہذیب کو دیکھنا کیسا سنا بھی نہو گا خلق سے کوسوں دور انسانیت سے محروم ایسا مظلوم بنے کہ شہر کا بچہ بچہ اسکے نام پر آنسو بہائے۔

شاہین اور دراج کے تعلقات عشق تھے یا محبت کم تھے یا زیادہ، تھوڑے تھے یا بہت، اچھے برے، جائز ناجائز، صحیح، غلط جو کچھ بھی تھے اور جیسے بھی تھے اور جتنے بھی تھے اتنے ضرور تھے کہ آج ایرانی مغل اسکی جانفشانی پر جسقدر فخر کریں نہایت درست اور بجا۔

یلغاری خاندان برا مانے تو ماناکرے۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ ہم کو تو امید تھی نہیں کہ دراج اس آن کا آدمی نکلے گا کہ جان و ایمان سب کچھ قربان کر بیٹھا مگر اس شان کو ہاتھ سے ندیا۔ ورنہ دراج جو مانگتا وہ ملتا اور جو چاہتا وہ لیتا۔ اس افلاس اور عسرت میں بھی کہ کمبخت فاقوں پہ فاقے کرتا اچھے اچھے صوبہ دار اس کے آگے آنکھیں بچھاتے خاص محلہ شمناور پور کے سردار جنکے گھروں میں سونے چاندی کے ڈھیر اور زر و جواہر کے انبار لگے رہتے تھے اس فقیر کے اوپر سے بھر بھر جھولیاں نثار کرتے اور وہ اللہ کا بندہ آنکھ اٹھاکر نہ دیکھتا۔ ان سب جھگڑوں کو جانے دو کیسے رئیس اور کس کے سردار خود ملکۂ شاہین اگر جھبڑوں اشارہ

باقی تو سچ مچ دُرّاج جو کفن کو بھی محتاج مرا ہیرے اور موتیوں سے مالا مال ہوتا مگر صد آفریں آغا کے لال ہیر حموں میں پلا سفاکوں میں بڑھا ظالموں میں رہا مگر وہ نام کر گیا کہ جب تک چمنستانِ خیال میں محبت کے بار آور نہال موجود ہیں خلوص کے شیدائی تیری حسرت پر روئیں گے صداقت کے دریا تیرے پاؤں میں لوٹیں گے - اور اے دُرّاج اگرچہ تو مر چکا مگر محبت کا تاج تیرے سر پہ ہے جسکے جواہرات تمام عالم کو منور کر رہے ہیں -

شاہین

شاہین والیٔ سلطنت تھی تو عینیت کو بھاگ اور حسن میں بے نظیر تھی تو میاں دراج کی خوش نصیبی ہاں اتنا کہنے کا حق ہمکو بھی ہے کہ یلغاریوں پر ایسا زبردست احسان کر گئی کہ جب تک اُس خاندان کا ایک متنفس بھی زندہ ہے ہمیشہ مالا مال رہیگا - بھیک مانگنے والے فقیر شاہین ہی کا دم تھا کہ پوتڑوں کے امیر بن گئے - آج یلغاریوں کا گروہ کتنا ہی بڑھ بڑھ کر بولے مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ عمر بھر ستے کریں تو شاہین کا نمک اونکی انتڑیوں سے نہیں نکل سکتا - خود دراج کے آخری الفاظ جو اس راز کا انکشاف کر رہے ہیں - صاف صاف بتاتے ہیں کہ جیا تو شرمندۂ احسان جیا اور مرا تو قربان ہو کر مرا -

اس اقرار سے انکار نہیں کہ مرزا بد نصیب نے تکلیفیں سہی گئیں مصیبتیں جھیلیں ظلم و ستم کی بوچھاڑ، رنج و الم کی بھرمار پے درپے صدمات لگاتار تکالیف و آفات غرض جو کچھ ہونا تھا سب ہی کچھ ہوا - مگر یلغاری خاندان گریبان میں منہ ڈالکر دیکھے کہاں ملکۂ شاہین ایک عظیم الشان سلطنت کی مالک تین تاجوں کی سرتاج، کہاں بیچارہ دراج فقیرانہ صورت وحشیانہ مزاج! شاہین سی ملکہ اور دُرّاج کا

کا جوگ! کہاں ننوا تیلی کہاں راجہ بھوگ!

ہمکو اس سفارش کی ضرورت تھی نہ ہے کہ شاہین کی غلط فہمی قابل معافی ہے۔ ہاں جہاں دراج کو بقصور ثابت کرنا ہمارا کام ہے وہاں یہ کہدینا بھی ضرور ہے کہ شاہین پر خواہش نفسانی کا الزام صریح بہتان ہے۔ خدا ترس رحمدل پاکیزہ غریبوں کا سہارا غریبوں کا گذارہ بیکسوں کی رفیق یتیموں کی شفیق محتاجوں کی مددگار مصیبت ماروں کی غمگسار! عیب کہو نقص بتاؤ اعتراض کرو کچھ ہی کہو کچھ ہی کرو صرف اتنا تھا کہ جہاں بات کی سچی تھی وہاں کانوں کی کچی - مگر دراج کے معاملے میں شروع سے آخر تک شاہین پر ایک حرف نہیں آ سکتا! ابتدائی شفقتوں اور مہربانیوں کو دیکھو خدا کی قدرت یاد آتی ہے! دراج کو خواب میں بھی یہ عزت نہ نصیب ہوئی ہوگی۔ مگر اس بغلی گھونسے کا کیا علاج جب موقع ملا اور رخ دیکھا ایسی ایسی خبریں کہ بدگمان کر کے چھوڑا۔ جو لکھا تھا وہ پورا کیا اور جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ شاہین جو کچھ بھی تھی لونڈی نہ تھی باندی نہ تھی! آخر تھی تو ملکہ بدگمانی کے اوپر موقع سے لگائی بجھائی عورت ذات صفائی ہوئی نہیں بات تھی کہ دل میں بیٹھ گئی۔ ایک نہیں پچاس واقعات ملکہ شاہین کے ایسے نکلیں گے کہ سیکڑوں کوس سے لوگ تسکے دربار میں روتے آئے اور ہنستے گئے۔ فریاد لے کر آئے اور واد لے کر گئے۔ کسکو کلام ہو سکتا ہے کہ اگر کہیں معاملہ کا اظہار ہو جاے تو شاہین ملکہ نہ تھی تو کیا اس شان کی عورت تھی کہ دراج کے پاؤں دھو دھو کر پیتی۔

مگر تقدیر کا لکھا کون ٹالتا اور کہیں ٹلتا دراج کا انجام جو ہونا تھا وہ ہوا اور شاہین کی قسمت میں بدنام ہونا تھا وہ ہوئی۔ پھر بھی ہم اس راز کے اختتام پر اتنا کہنے سے باز نہ رہیں گے کہ گو سیکڑوں برس گذر گئے نہ ملکہ رہی نہ دراج نہ وہ ستم رہا نہ کرم نہ وہ وقت رہا! نہ بات مگر اے خوبیوں بھری ملکہ تو ہر الزام سے

بری ہے۔ تیرا تاج شاہانہ محبت کے ایسے پھولوں سے آراستہ ہے۔ جو تمام دنیا کو معطر کر رہے ہیں۔

نوروز اور شاہین کی سواری

جشن کی تیاری یوں تو دونوں کیا مہینوں ہی سے ہو رہی تھی مگر ماہ بہشت ہی تو ایران کا بچہ بچہ اسی ساز و سامان میں مصروف تھا رعیت شاد شہر آباد لوگ خوشحال دل چونچال جو کچھ ہوتا وہ کم اور جو کچھ نہوتا وہ تھوڑا۔ محل شاہی کا تزک احتشام سواری کی دھوم دھام پختہ سنگین سڑکیں دُھلی دھلائی بلور کی طرح صاف شفاف دونوں طرف گملوں کی قطار رنگ برنگ کے پھول کھلے دوکانوں پر بیلیں چڑھی ہوئی جھاڑ فانوس لگے ہوئے بازار بستان تو آنا فانا سے بول اٹھا۔ سواری کا دن آیا تو صبح چار بجے سے ہزار ہا بندگان خدا گھر بار چھوڑ چھاڑ بازار میں آ کھڑے ہوئے عجیب پر لطف وقت اور بہار کا سماں تھا کہ دور دور سے لوگ دیوانہ وار جوق در جوق چلے آتے تھے۔ طلوع آفتاب تک تو دوکانیں اور بالاخانے مردوں اور عورتوں سے اٹ رہے تھے۔ وہ کھچ پچ تھی کہ ایک پر ایک گرا پڑتا تھا۔ خدا خدا کر کے داخلۂ سواری کی توپ چلی! ہاتھیوں کی قطار زربفت کی جھولیں پڑی ہوئی سونے چاندی کی عماریاں کسی ہوئی پیچھے فوج شاہی کا جلوس یہ سب کچھ ہو چکا تو سواری شاہانہ کی آمد آمد ہوئی اور چاروں طرف سے ملکہ اقبال کی صدائیں شروع ہوئیں۔

شہزادی ایک مشکی گھوڑے پر سوار مُنہ پر نقاب ریشمی خراماں خراماں رعیت کو دیکھتی بھالتی سلاموں کے جواب دیتی ولاتی چلی آتی تھی! خوشی کا وقت جشن کا روز کامیابی کی توقع انصاف کا یقین سیکڑوں اللہ کے بندے

اپنی اپنی حالت زار کا اظہار کر رہے تھے۔ محتاج صدقات سے مالا مال مظلوم دادرسی سے نہال نہال۔ ایسی اچھی گھڑی تھی کہ بڑے سے چھوٹے تک جس کے چہرے پر نظر پڑتی تھی ہشاش بشاش دکھائی دیتا تھا۔

محافظین کا گروہ ہاتھ میں ننگی تلواریں کڑیں ایرانی خنجر دامیں بامیں آگے پیچھے ترقی دولت و درازی عمر کے نعرے مار رہا تھا دفعتہً ایک طرف سے بندوق کی آواز آئی جس سے نہ صرف ملکہ اور فوج شاہی بلکہ تاتاری اور ایرانی شہری دیہاتی سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ ترچھی سے اندیشہ کا بگل سا بجایا اور محافظین کا دستہ سمٹ سمٹا کر ایک جگہ جمع ہو گیا۔ ادھر شہزادی ششدر و حیران اودھر فوج شاہی سراسیمہ و پریشان ابھی اطمینان نہ ہوا تھا کہ دوسری گولی شاہین کے پاس سے سائیں سائیں کرتی ہوئی نکل گئی۔ جادو کا سا کارخانہ تھا چاروں طرف لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے تھے مگر خاک پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ واردات ہے کیا! بڑے بڑے بہادر اور اچھے اچھے جری دنگ کھڑے تھے کہ یہ آفت ناگہانی زمینی ہے یا آسمانی!

شیر افگن خاں جیسے سپہ سالار کی دلیری اور مرزا شجاع جیسے جری کی شجاعت دھری کی دھری رہ گئی اور تیر کی گولی نے عربی النسل گھوڑے حسن افروز کو جو جشن نوروز کے واسطے مخصوص تھا ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

دشمن تو اپنا کام کر ہی چکا تھا اور سچ پوچھو تو شاہین کی موت میں کوئی کسر نہ رہی تھی مگر کچھ تقدیر ہی کی زبردست تھی کہ سپہ سالار کی نظر اتفاق سے غنیم پر جا پڑی دیکھا تو ایک شخص کنگورے کی آڑ میں بیٹھا توڑا سلگا رہا ہے! اب کیا تھا سیکڑوں دوڑ پڑے مگر وہ دشمن القلب کیا چوکنے والا تھا۔ جب تک گرفتار نہ ہو ملکہ کی شست باندھ دست بخیر ایک فیر اور کیا! ایسے خطرناک وقت میں بلغاری

خاندان کی وفاداری قابل داد تھی۔ نمکخوار اور جان نثار ملازم اور وفادار سب ہی موجود تھے مگر ایک کی ہمت نہ پڑی کہ حقِ نمک ادا کر جاتا۔ یہ فخر تھا تو دراج کی تقدیر میں۔ محافظین میں شریک نہ فوج میں شامل۔ سپاہیوں میں بھرتی نہ اردلی میں داخل۔ سب ساتھیوں کو چھوڑ چھاڑ آگے بڑھا اور ملکہ کو آڑ میں لے زد پر آ کھڑا ہوا۔ یہ مرزا کی خوش نصیبی تھی کہ گولی خالی گئی۔ قریبی رشتہ دار اور پشت در پشت کے نمکخوار کھڑے کے کھڑے رہے اور قاضی پور کا وحشی سب سے بازی لے گیا۔

ملکہ شاہین کی پرنانی رابعہ ثانی کے عہد سے ایرانیوں میں یہ نئی رسم ایجاد ہوئی تھی کہ جشن نوروز دریا سے زلال دیں منایا جاتا تھا۔

سلطنت کے معزز اہلکار کرسی نشین اہل دربار خاندان شاہی کے رشتہ دار سال بھر تک اپنی اپنی کشتیاں تیار کرتے تھے۔ آبنوس و شیشم کے تختے زمرد و جواہر کی پچیکاری زنگار رنگ کے پردے انواع و اقسام کی گلکاری نیچے رومی و کاشانی مخمل اوپر ایرانی اور زابلستانی قالین۔ جواہر نگار کرسیاں پھولوں کے ہار پڑے ہوئے۔ غرض کچھ ایسے تکلفات ہوتے تھے کہ رفتار دریا میں بھی ایک انداز محبوبانہ پیدا ہو جاتا تھا۔

باغی گرفتار ہو کر سرِ بازار سولی دیا گیا۔ خیر خواہانِ سلطنت رستے بھر روپے اشرفیاں لٹاتے رہے اور سواری شاہین شہر سے ہوتی ہوئی کنارۂ دریا پر پہونچی دستہ تاتاری نے سلامی دی۔ بندوقوں کی گرج سے تمام میدان دھواں دھار ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ یہ صرف ملکہ شاہین کا اقبال تھا کہ بال بال بچی مگر بجائے اسکے کہ وہ نہال نہال ہوتی بالکل افسردہ تھی چپ چاپ چلی اور گم سم آئی۔ اور تری تو مغموم

کھڑی ہوئی تو افسردہ، بیٹھی تو محزوں اور لیٹی تو مردہ۔

شاہین کی خاموشی سے ساری خوشی مٹی کر دی اور سالگرہ کے جشن پر بالکل پانی پھیر دیا! رعیت کے ارمان دل کے دل ہی میں رہے نذریں تو درکنار کسی کی اتنی جرأت بھی نہ ہوئی کہ بات تک کر لیتا! طواف تیموری کی رسم جو پرانی تھی اور خاندانی تھی اور پرانی کے زمانہ سے چلی آتی تھی ضروری سمجھی گئی اور مجبوری ادا کرنی پڑی۔

طواف تیموری سلطان علاء الدین کا رومال اور رابعہ اول کی چوٹی کا موباف تھا جسکے گرد طواف کرنیکے بعد والی سلطنت تخت زابلستان کی ترقی کے لئے دعا کرتا تھا! گنتی کے دو چار آدمی جو خاندان شاہی سے خاص تعلق رکھتے تھے اس رسم کے ادا کرنے میں شریک ہوتے تھے اور اختتام دعا پر امرا و وزرا مع فوج شاہی آمین پکارتے تھے۔

ملکہ کی افسردگی نے وہ تمام سماں درہم برہم کر دیا البتہ مراحم خسروانہ یا جان بچانے کا احسان جو کچھ تھا! اتنا ضرور ہوا کہ مرزا دُرّاج کو اس رسم میں شریک ہونے کی اجازت دی گئی۔ شاہین کی افسردگی اور اضمحلال لحہ بہ لحہ ترقی کرتا جاتا تھا طواف تیموری پہلے ہی سے آراستہ و پیراستہ تھا با دل ناخواستہ گئی طواف کیا اور برائے نام دعا مانگ اوٹھ کھڑی ہوئی۔ اراکین شاہی سلام کے منتظر تھے۔ چھت پر آئی اور تمام فوج کو رخصت کیا!

محافظین کا ایک مخصوص دستہ تیار و کمربستہ کنارہ دریا پر موجود رہا! کام کاج کے لونڈی غلام اور مرزا دُرّاج کشتی کے زیرین حصے میں تھے اور شاہین چھت پر لہروں پر نظر ڈالکر خدا معلوم کس خیال میں غرق ہوئی کہ دن ڈھل گیا اور وہ اپنی جگہ سے نہ سرکی! کس کی مجال تھی کہ دم مارتا! ہمیں تو غریب دُرّاج پر ہنسی آتی ہے

اچھی جان بچائی کہ دن بھر بھوکے مرے! کنارے کی فوج اوسی طرح بندھی بندھی سوکھ گئی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

بسا غنیمت تھا کہ ابر غلیظ چھایا رہا ورنہ زابلستان کی گرمی الامان الحفیظ! آخر آسمان نے طوطے کی طرح دیدے بدلے اور چلچلاتی ہوئی دھوپ نے چھکے چھڑوا دیئے! دوپہر کا سنسان وقت زلاد کا سناٹا اتنے بڑے دریا میں لے دیکر ایک کشتی اُسمیں بھی گنتی کے چند آدمی وہ بھی اول تو لونڈی غلام اور پھر بھوکے پیاسے غرض ایک ہُو کا میدان تھا! چاہیے کہ شاہین محلوں کی بیٹھنے والی سیجوں کی سونیوالی زود رنج عالی دماغ مغرور الغضب نازک مزاج آفتاب کے اس پیچ و تاب سے اُکتا جاتی! توبہ! ایسے غضب کی دھوپ کہ چیل انڈا چھوڑے سب اُسکے سر پر تھی! بہشت کا بہار ساون صاف گذر گیا اور کیا مجال جو اُسکے مُنہ میں اُڑ کے دانہ گیا ہو! سورج اپنی گرمیاں دکھا دکھا کر رخصت کے قریب پہونچا اور آسمان نے ایک دوسری کروٹ لی۔ اب جھٹ پٹا وقت تھا بھوکو نکل آئے رنگ لائی فلک نیلگوں ابر سیاہ سے گھرا اور کالی گھٹا نے اندھیر گھپ کر دیا! ہوا سرسراہٹ سے جھونکے اور جھونکوں سے جھکڑ بنی پانی جو تھوڑی دیر پہلے مستانہ وار اترا اترا کر بہہ رہا تھا گزوں اوپر اوچھلنے لگا! دونو ملاح ہوا کا رنگ دیکھکر دنگ رہگئے مگر کس کی مجال تھی کہ دم مار سکتا! کشتی سفری نہ بیری جشنی کشتی ہلکی پھلکی دو ہی جھونکوں میں کہیں سے کہیں پہونچی! یہ سب کچھ ہوا مگر ملکہ بھی اللہ کی بندی اپنی جگہ سے نہ سرکنا تھا نہ سرکی! کسی اور کی ہمت تو پڑی ہی نہیں ایک بیچارا دُرّاج ہی دکھائی دیا کہ اسنے آ زمین آ کر جان بچائی اوسی غریب کو بازو پر رکھ کر ملکہ کی خدمت میں روانہ کیا۔

زمانہ ایک اکھڑ گنوار تہذیب سے آشنا نہ آداب شناس سے خبردار اسکو

آپ اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے وہ یقین کرچکا تھا کہ میں لاکھ تیراک ہوں مگر اس طوفان میں خاک پیش نہ جائے گی۔ مرتا کیا نہ کرتا دل کڑا کیا اور اوپر پہونچا! شاہین خدا جانے سلطنت کے ایسے کونسے اہم معاملات پر غور کررہی تھی اور کیا الجھنیں سلجھارہی تھی کہ دُرّاج کے پاؤں کھڑے کھڑے شل بھی ہوگئے اور ملکہ نے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا! دُرّاج بدنصیب عجیب مصیبت میں پھنسا ہوا تھا بھوک کے مارے جان نکل رہی تھی طوفان کے مارے ہوش اُڑے جاتے تھے سوچتا تھا کہ آج اچھے کسی منحوس کا منہ دیکھکر اُٹھا کہ روٹی ٹکڑا تو درکنار جان ہی وبالِ جان ہوگئی!! اہتیرا آمادہ ہوتا تھا اور ہزار ارادہ کرتا تھا کہ آگے بڑھوں اور کچھ کہوں مگر کچھ ایسا رعب چھایا کہ ایک قدم آگے نہ اُٹھا! ہوا لحظہ بہ لحظہ تیز ہورہی تھی اور پانی گزوں چھوڑ بلیوں اُچھل رہا تھا! کالی گھٹا خالی نہ گئی اور موسلا دھار پانی پڑنا شروع ہوا! خدا کا شکر ہے کہ اسی بہانہ سے ملکہ کا سلسلۂ خیالات برہم ہوا گھبرا کر اُٹھی اور سٹ پٹا کر نیچے چلی کشتی پہلے ہی سے ڈگمگا رہی تھی دائیں طرف جھکنا تھا کہ پاؤں رپٹا اور دھڑام سے دریا میں! دُرّاج محلہ شناور پور کا رہنے والا اگر دنیا میں کوئی فن جانتا تھا تو صرف تیراکی تھا کودا ملکہ کو پشت پر لیا اور بہ حفاظت تمام کشتی میں لے آیا! سب اپنے اپنے کونوں میں بھوکے پیاسے دبکے سکڑے بیٹھے تھے! اتنے بڑے واقعہ کی کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی!! اس جان بچانے کے یہ دو ایسے زبردست احسان شاہین کی گردن پر ہوئے کہ ہمیشہ کے واسطے ممنون ہوگئی! پوشاک تبدیل کی کنارے پر آئی تو دُرّاج کو اپنے ساتھ چوا سپہ گاڑی میں بٹھایا اور اسطرح باتیں کرنے لگی۔

(شاہین) تم نے دو دفعہ میری جان بچائی تم کون ہو اور کہاں رہتے ہو؟

(دُرّاج) میں یہیں رہتا ہوں میرا گھر قریب ہے اجازت ہو تو جاؤں۔

(شاہین) تم میرے ہمراہ محل تک نہیں چل سکتے ؟

(دُرّاج) میری سب سے چھوٹی بچی جسکو آج تیرہ روز کا چھوڑ کر مری اور اب ڈیڑھ برس کی ہے مجھسے بہت مانوس ہے اُسنے اتنی ہی دیر میں رو رو کر خون کیا ہوگا حکم ہو تو میں کل حاضر ہوں۔

(شاہین) تمنے ایک چھوڑ دو دفعہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈالکر میری جان بچائی یہ ایسا احسان ہے کہ میں اسکا معاوضہ نہیں کر سکتی! بالفعل یہ انگوٹھی قبول کرو اور صبح کو دربار میں حاضر ہو۔

(دُرّاج) میں نے جو کچھ کیا وہ ہرگز احسان نہیں ہے اور نہ اس غرض سے کیا کہ شہزادی کی جان بچا کر مالامال ہو جاؤں اسکا معاوضہ بس صرف اتنا چاہئے کہ میں جب سلام کو حاضر ہوں تو باریاب ہونے کی اجازت مل جایا کرے۔

(شاہین) صرف باریابی سے تمہارا پیٹ نہیں بھر سکتا تمنے ایسا کام کیا ہے کہ جبتک سلطنت زابلستان موجود ہے تمہارا نام باقی رہیگا! تمہارے تعلقات خاندان شاہی کے ساتھ ہمیشہ یادگار رہیں گے! تخت زابلستان تمہاری وفاداری پر فخر کرے گا! میں مناسب سمجھتی ہوں لیک لاکھ درم ماہوار مقرر کر دوں۔

(دُرّاج) میں ہرگز اسکا بھوکا نہیں ہوں مجھکو صرف اتنی اجازت ملے کہ جب حاضر ہوں شرف ملاقات ہو جایا کرے۔ یہ سب سے بڑا احسان ہے۔

(شاہین) میری سمجھ میں نہیں آتا اس سے تمہارا کیا مطلب ہے تم شوق سے آؤ اور جب دل چاہے آؤ! لیکن! اس انگوٹھی کو منظور کرو جو میں اپنے ہاتھ سے تمہاری اُنگلی میں نہایت خلوص کے ساتھ پہناتی ہوں۔

(دُرّاج) اس کی قیمت میری نگاہ میں اس لحاظ سے ہوگی کہ یہ آپ نے بطور مراحم

خسروانہ مجھکو عطا فرمائی۔

اللہ اللہ حیات انسانی کا خوشنما منظر آنکھ کے سامنے ہے! تاروں بھری رات سر پر ہے اور ماہِ کامل سے در و دیوار منور کر رکھے ہیں۔ حسینانِ گل اندام شرابِ ناب ساغرِ بلورین قدرت نے تمام سامان مہیا کر دیئے! اے دل و جان سے زیادہ پیارے دوستو! کہاں ہو! تمہاری صورت دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں! آؤ! آؤ! تھوڑی دیر مل بیٹھو! ادھر آنکھ اوٹھا کر دیکھو! یہ ہزارہا بندگانِ خدا اپنی تمناؤں کو آغوش میں لئے کیسی میٹھی نیند سو رہے ہیں! انکے پختہ سنگین مزار انکی ٹوٹی پھوٹی قبریں! اپنے مٹنے والوں پر حسرت کے آنسو بہا رہی ہیں! رات بھیگ رہی ہے اور ہوا کے خوشگوار جھونکے ان مٹی کے ڈھیروں پر جھاڑو دے رہے ہیں! اے جیتے جاگتے یارو! زندہ عزیزو! دیکھو وقت فرصت ہے اور بسا غنیمت ہے! تغیرات کی بوچھاڑ جان کے ساتھ ہے روؤ گے اور پچھتاؤ گے مگر یہ وقت نہ پاؤ گے! دیکھو چاند مدہم ہوا! چاندنی پھیکی پڑی! تارے جھلملا گئے! ساغرِ بلورین لوٹ گئے اور وہ حسن کی وبیاں چھوٹ گئیں! قافلہ والوں نے اپنا اپنا رستہ لیا! اور بلبل خوش الحان صبح کا پیغام لے آئی! آہ کیسی اچھی رات تھی مگر بات کرنے میں ختم ہو گئی اور دیکھتے دیکھتے وہ سمان درہم و برہم ہو گیا!

اے آبادی کو چھوڑ کر جنگل بسانیوالو! اے نونہالو اور پری جمالو! سوؤ سوؤ پیٹ بھر کر سوؤ! خوش نصیب تھے تم کہ انقلابات کے چکر سے چھوٹے! گھر برباد کئے اور یہ بستی آباد کی!

دنیائے ناپائدار کے دام تزویر میں پھنسنیوالو! تجسس کی آنکھیں کھولو اور تماشا گاہِ عالم کی نیرنگیوں پر نظر ڈالو! زمانہ اُڑا چلا جا رہا ہے اور عمریں ختم ہو رہی ہیں! غنیمت ہے وہ وقت جو اطمینان سے گذر گیا! کشتیِ عمر معمولی رفتار سے بہ رہی ہے

اور انقلاب کی لہریں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔

کیسا مبارک وقت ہے ملکہ شاہین اپنے چھنگلی سے انگوٹھی اُتار کر دراج کی انگلی میں پہنا رہی ہے! دُراج حسرت آمیز نظر سے شاہین کے چہرہ کو دیکھ رہا ہے! انگوٹھی پہن چکا تو کھڑا ہوا اور کہنے لگا!

ملکہ! کس مُنہ سے شکریہ ادا کروں۔

(ملکہ) اب تم جاؤ! صبح کو درِ دولت پر حاضر ہونا۔

گاڑی ٹھیری دُراج اُترا اور سلام کر کے رخصت ہوا۔ (باقی آیندہ)

دلِ پیرِ مغاں میں چاہئے اپنا اثر گھر ہو
رہی مے نوش جو نوکِ نگاہِ چشمِ ساغر ہو

اگر دل کو یہ چاہو تم کہ منزل گاہ دلبر ہو
تو جو ہو غیر تم ہو یا کہ عزا اس گھر کے باہر ہو

بہر صورت طلب لازم ہے آبِ زندگانی کی
اگر پایا خضر تم ہو نہیں پایا سکندر ہو

کوئی تو سکے نکلیگا اُٹھے گی کچھ تو بو منہ سے
در پیرِ مغاں پر مری پرستو چلکے بستر ہو

ہیولیٰ ہو شبِ دیجور کا میرا غبار اِتنا
کسی کا ذرہ ذرہ آفتابِ روزِ محشر ہو

تمھاری ہی بدولت ہے یہ ساری ندی مستی
وہ دن بھی ہو کہ ہم ہوں تم ہو دورِ جامِ کوثر ہو

فراق و وصل کی جھگڑے میں ڈالا مجکو ظالم نے
غبارِ ہستیِ وہمی جو اُڑ جائے تو بہتر ہو

کسی در پر پڑا رو رو کے آسی رات کہتا تھا
کہ آخر میں تمھارا بندہ ہوں تم بندہ پرور ہو

آسی

جزائر بحرین

ستمبر گذشتہ کے پرچے میں ایک مختصر سا مضمون عرب کی عورتوں کے متعلق ایک سفرنامہ سے منتخب کرکے ناظرین کے ملاحظہ کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ اب اسی سفرنامہ کا ایک اور باب پیش کیا جاتا ہے جو شاید گذشتہ مضمون سے دلچسپ تر ثابت ہوگا؛

بہ وجہ بے سروسامانی کے بعض اسما کے رسم الخط کی تحقیق نہ ہوسکی اُمید کرتا ہوں کہ اگر کوئی کرمفرما کسی غلط نام کی تصحیح فرما سکیں تو مجھے مطلع فرمائیں گے۔

ضامن کینتوری

سب سے پہلے ۱۸۸۹ء عیسوی میں ہم نے عرب کا سفر کیا اور جزائر بحرین کو گئے جو خلیج فارس میں واقع ہے۔ ہمارے اس سفر کی محرک وہ حکایتیں ہوئیں جو ہم ہمیشہ سے سنتے آئے تھے کہ عرب میں جابجا مٹی کے ٹیلے ہیں جنمیں فونیشیا کے آثار قدیم کی یادگاریں محفوظ ہیں، انہیں تبرکات کی حقیقت دریافت کرنے کے شوق نے ہم کو اندیشہ ناک اور دور و دراز سفر کے اختیار کرنے پر آمادہ کیا، اور ہم بڑے خوش نصیب تھے کہ ہم کو اپنے دلی مقاصد میں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی۔

آثار قدیمہ کے متلاشی کو اُسکی سعی اکثر نئے مقامات اور نئے معلومات تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ہم کو کسی زمین میں خزانہ ملے یا نہ ملے، لیکن وہاں کے باشندوں کے حالات اور اُن کے طرز تمدن سے ضرور آگاہی حاصل کرنے کے وسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔ جب ہم گھر سے نکلے تو فونیشیا کے آثار قدیمہ کی دریافت کے لئے ہمیں کامیابی کی اُمید موہوم تھی۔ مگر یہ بات کہ معلومات کا

کا ایک ایسا وسیع میدان اس سفر میں ہمارے پیش نظر تھا جن سے ہم مطلق ناواقف تھے۔ ایسی تھی جسکے مقابلے میں گزشتہ کارناموں کے ساتھ بہت کم لوگوں کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔

جزائر بحرین چند جزیروں کا مجموعہ ہے، جو خلیج فارس کے اُس حصّے میں جسے خلیج بحرین کہتے ہیں، جزیرہ نمائے عرب کے ساحل الحسا سے تقریباً بیس ۲۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ بحرین دراصل اس مجمع الجزائر کے سب سے بڑے جزیرے کا نام ہے، جسکا طول ۳۰ میل اور عرض دس ۱۰ میل ہے؛ اور سب سے چھوٹا جزیرہ محارق جو بحرین کے جانب شمال واقع ہے۔ یہ جزیرہ ایک نعل نما آبنائے کے ذریعے سے، جس کا طول ۵ میل اور عرض کہیں ایک میل اور کہیں نصف میل ہے، جزیرہ بحرین سے جدا ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ پانچ اور چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جنکے نام ستراح، بنی صالح، خدیفہ، سایح اور آراد ہیں۔ جزیرہ موخرالذکر محارق کے جانب مشرق واقع ہے، اور اسکی حالت یہ ہے کہ جب سمندر کی لہر چڑھ آتی ہے تو جزیرہ، اور جب اُتر جاتی ہے تو جزیرہ نما بن جاتا ہے۔ اس میں پرتگیزوں کا ایک وسیع اور محکم قلعہ بنا ہوا ہے،

چونکہ ہمنے ہندوستان ہوکر وہاں جانا مصلحت سمجھا اس لئے کراچی اور مسقط ہوتے ہوئے ہم بوشہر پہونچے۔ یہاں ہم نے پانچ ایرانیوں کو نوکر رکھا جن میں سے حاجی عبداللہ جو ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی جانتا تھا، اور عربی بھی، ہمارے لئے ترجمان کا کام دیتا تھا، بوشہر سے ہمارا جہاز بدلا گیا اور ہم دوسرے اسٹیمر میں سوار ہو کے بحرین آئے، چوں کہ سمندر میں پانی کم تھا، جہاز ساحل تک نہ پہونچ سکا اور ہمکو کشتیوں میں جانا پڑا، جب کشتیاں بھی آگے نہ چل سکیں تو ہم اور ہمارا

سامان بحرین کے خوبصورت اسفید خچروں پر بار کیا گیا، جنکی دُمیں اور ایالیں سرخ رنگی ہوئی تھیں۔ اِن خچروں میں وصف یہ ہے کہ ہمارے (ولایتی) خچروں کی طرح پانی سے نہیں ڈرتے اور سوار کو صحیح وسالم خشکی تک پھونچا دیتے ہیں۔

ہم کو جو شہر سب سے پہلے ملتا ہے وہ مناح یا (منامہ) ہے جو بحرین کا دارالحکومت اور یہاں کی تجارتی منڈی ہے۔ یہ شہر ساحل سے نصف میل کے فاصلہ پر، سفید دیواروں، اور بانس کی جھونپڑیوں کے مجموعے کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ چند مسجدیں بھی مع اپنے چھوٹے چھوٹے مناروں کے نظر آتی ہیں، جن میں موذن کی اذان دینے کے لئے سنگی گلدستے بنے ہیں۔ یہ مسجدیں اور موتی کے دولتمند سوداگروں کی دُکانیں، قدیم اسلامی عمارتوں، اور منقش استرکاری کے عمدہ نمونے پیش کرتی ہیں۔

ابھی ہم خچروں سے اُترنے بھی نہ پائے تھے کہ گریہ منظر حبشی غلاموں اور شریف النسل عربوں نے جو ساحل پر جمع تھے، ہر طرف سے ہم کو گھیر لیا۔ یہ سب کے سب لمبی لمبی عبائیں عربی لباس پہنے اور سروں پر اونٹ کے بالوں کی رسیاں، جنکو عِقال کہتے ہیں، باندہے تھے۔

شہر میں پھونچ کے جو مکان ہمکو رہنے کے لئے ملا، وہ ایک نہایت شاندار پختہ عمارت تھی۔ جس کمرے میں ہم ٹھیرے تھے اُسکی زمین پر سنگی فرش کیا ہوا دیواروں میں سولہ کھڑکیاں یا روشندان تھے۔ جنمیں بجائے شیشوں کے لکڑی کی جالیاں لگی تھیں، کمرے کے دروازے میں لکڑی کا کھدواں کام کا قفل لگا تھا۔ جسکی کنجی بھی لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔

اگرچہ ہم اب خطِ استوا سے بہت قریب ہوگئے تھے تاہم غروبِ آفتاب کے

بعد اچھی خاصی سردی ہوتی تھی۔ ہماری راتیں نہایت پریشانی سے کٹیں؛ کتوں کا بھونکنا، مرغوں کا غیر وقت بانگ دینا' اور صبح سے پہلے موذن کی آوازیں نیند اُچاٹ کرنے کا کافی سامان تھے۔ جس بلند مقام پر ہم ٹھیرے تھے وہاں سے بانس کے اُن جھونپڑیوں کا نظارہ خاصے طور پر ممکن تھا جن میں اکثر غوطہ زن آباد تھے۔ یہ مکان نہایت صفائی سے بنائے گئے تھے، صحنوں میں سیپوں سے چمن بندی کی گئی تھی، صحنوں کے بیچ میں خوشنما حوض بنے تھے، جنکو عورتیں کنوؤں سے مشکوں میں پانی لالا کے بھرتی تھیں۔ اکثر گھروں میں چھوٹے بچوں کے پنجرے کی شکل کے جھولے لٹکتے تھے۔ جس زمانے میں ہم یہاں پھونچے ہیں وہ ان لوگوں کی فرصت کا زمانہ تھا۔ کام کا موسم نہ ہونے سے اُن کا سارا دن تفریح اور کھیل تماشوں میں گزرتا تھا۔ اِن لوگوں کا مرغوب کھیل پھرکی گھمانا ہے۔ مسن اور سنجیدہ عربوں کو جمع ہو کر بچوں کی طرح پھرکیاں گھماتے دیکھکے جہاں تعجب ہوتا تھا وہاں دلچسپی بھی ضرور ہوتی تھی۔ یہ پھرکیاں ایک قسم کے گھونگے کی ہوتی ہیں اور غالباً ہمارے ملک (انگلستان) میں بھی یہ کھلونا یہیں سے پھونچا ہے، یہاں کے اکثر مکانات کے دروازوں کی چوکھٹیں وغیرہ ہویل مچھلی کے جبڑوں کی بنی ہوئی ہیں۔ مگر ہڈی کی تجارت یہاں کثرت سے ہوتی ہے، اور اکثر تلواروں اور خنجروں کے میان اسی کے چمڑے کے بنتے ہیں۔

بازار کی سیر کو جاؤ تو دوکانوں میں بڑے بڑے آہنی قفلوں کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے، جن میں بعض کی کنجیاں دو دو فٹ کی لمبی ہوتی ہیں معمولی مکانات کے قفل بالعموم لکڑی کے ہیں۔ بازاروں میں الحسا کا وہ عجیب و غریب سکہ بھی دکھائی دیگا جسکو طویلہ کہتے ہیں۔ یہ تانبے کی سلاخوں کے چھوٹے چھوٹے

ٹکڑے ہیں جو دُہرا کے پیٹ دیئے گئے ہیں۔ اِن پر کچھ حروف بھی کندہ ہیں جنکی عبارت پڑھی نہیں جاتی۔

بحرین کے کافی داں اپنی طرز میں ایک خصوصیت رکھتے ہیں۔ یہ زیادہ تر الحسا کی ساخت کے ہوتے ہیں جو یہاں کی صنعت و تجارت کا مرکز ہے۔ انکی ٹوپیاں لمبی اور چونچ کے مانند خمیدہ ہوتی ہیں، اور اُن پر دو کنگنیاں تلے اوپر بنی ہوتی ہیں جنکے درمیان مختلف نمونوں کے نقش و نگار کندہ ہوتے ہیں۔ منامہ اور محارق کے بازاروں میں قہوہ فروش اسی قسم کے بڑے بڑے کافی پاٹ لئے ہوئے جابجا بیٹھے رہتے ہیں۔ کافی پاٹ کے سرپوش میں کنکریاں بھر دیتے ہیں۔ جس سے کھولنے بند کرنے میں آواز ہوتی ہے۔ جو راہروؤں کو اپنی جانب متوجہ کرلیتی ہے۔ گھروں میں دو چار قہوہ دانوں کا ہر وقت انگیٹھی پر چڑھا رہنا شانِ امارت میں داخل ہے۔

بحرین میں علاوہ قہوہ دانوں کے الحسا کی اور مصنوعات بھی دکھائی دیتی ہیں، ہر معزز خاندان میں لکڑی کے پیالوں کا ہونا نہایت ضروری ہے، جسمیں مہمانوں کو پانی، دودھ، یا دہی پلاتے ہیں۔ ان پیالوں کے اندرونی جانب نہایت باریک اور نفیس نقرئی عرق کام بنا ہوتا ہے۔ بحرین کے شکاریوں کی بندوقوں۔ اور شیوخ کے اونٹوں کے کجاووں پر بھی ایسا ہی چاندی کا کام ہوتا ہے۔

قدیم بدویوں کے اسلحہ میں سے، وہی طول طویل نیزے، وہی اونٹ کی کھال کی طلاکار سپریں جنپر تانبے کے پھول لگے ہوتے ہیں، اور وہی زرہ بکتر اور چار آئینہ جو صدہا برس پیشتر جنگ میں مستعمل تھے۔ ابتک یہاں مستعمل ہیں۔

خرمے کی دو کانیں، جو اہل جزیرہ کی غذائے غالب، بہت کثرت سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بازاروں میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں کے غریب باشندوں کی ایک غذا ٹڈی (ملخ) بھی ہے، جس کو یہ لوگ نہایت شوق سے کھاتے ہیں اوزان کی قسم سے دوکانوں میں سوا پتھروں، گھونگوں اور پیالوں کے جنمیں تمیز کرنا مشکل ہے اور کوئی چیز نہیں دکھائی دیتی۔

اس جزیرے کے باشندوں کا عام پیشہ غواصی ہے "اور منامہ میں آبادی بھی زیادہ تر غواصوں" اور ان جوہریوں کی ہے جو موتی کی تجارت کرتے ہیں۔ بحرین، سکندر اعظم کے زمانے سے لیکر اسوقت تک "اسی فن غواصی کی وجہ سے مشہور رہا ہے۔ آلبیوکرک نے ۱۵۱۰ء میں جو کتاب لکھی ہے اُس میں وہ یہاں کی غواصی کی نسبت اسطرح رقمطراز ہے۔

دو بحرین زیادہ تر گھوڑوں کی وجہ سے "اور نیز جو کی زراعت اور مختلف قسم کے میووں کی پیداوار کے لیے ممتاز ہے۔ اسکے ساحل پر ایسے مقامات کثرت سے ہیں جہاں سے موتی برآمد ہوتا ہے۔ یہاں کا موتی اسوجہ سے بکثرت پرتگال جاتا ہے کہ وہ بہ نسبت دوسرے مقامات کے موتی کی زیادہ پائدار اور عمدہ ہوتا ہے" یہی رائے زمانہ حال کے جوہریوں کی بھی ہے کہ بحرین کا موتی سیلون کے موتی سے بھی زیادہ مضبوط اور دیرپا ہوتا ہے۔ غالباً آلبیوکرک کو شاہِ پرتگال نے موتی ہی لینے کی غرض سے بحرین بھیجا تھا۔ وہ ۱۵۱۵ء میں لکھتا ہے کہ "میں وہ موتی حاصل کر رہا ہوں جن کے لئے میں بھیجا گیا تھا" بحرین کے گوہر فروش اس وقت اپنے کاروبار میں پرتگالی اوزان اور اُنکے ناموں کا استعمال کرتے ہیں۔

راس مسندم سے لیکر خلیج فارس تک ہر جگہ صدف پائی جاتی ہے، مگر

ساحلِ ایران کو اِس دولت میں زیادہ حصہ نہیں ملا۔ جو مقامات قابلِ غوّاصی ہیں، اُن کا طول ساحلِ عمّان سے لیکر نوّے میل تک چلا گیا ہے۔ اُن مقامات پر جہاں پانی زیادہ ہے، اُس وقت تک غوّاصی کا موقعہ نہیں ملتا جب تک بادِ شمال لہروں کے زور کو گھٹا نہیں دیتی۔ غوّاصی کے لئے تین زمانے قرار دیئے گئے ہیں، پہلا موسم بہار کا ہے جبکہ اُتھلے پانی میں غوطہ لگاتے ہیں؛ دوسرا موسم گرمیوں کا جب گہرے پانی میں غوّاصی کرتے ہیں؛ اور تیسرا موسم سرما ہے جب پایاب مقامات پر صدف کی تلاش کرتے ہیں۔ ابتک اِن دریاؤں کے موتی پائداری کی وجہ سے تمام عالم میں مشہور ہیں اور ان کی چھیپیں بہت کم اُکھڑتی ہیں۔ عام طور سے اِن موتیوں کی نسبت یہ رائے ہے کہ پہلے پچاس سال کے اندر جو سالانہ نقصان اُنکے آب و رنگ کو پہونچتا ہے وہ ایک فیصدی کی نسبت رکھتا ہے۔ اُس کے بعد سے پھر اُن کی حالت بدستور قائم رہتی ہے۔ سنگالی اور یہاں کے موتیوں میں یہ فرق ہے کہ وہ صرف چھوٹے ہوتے ہیں اور انہیں سات تیرہ روپے فی ہیرا نکو گیشت پر بنگالی وزن چاول سے خرید لیتے ہیں اور ہندوستان میں آکر انکو چھانٹ چھانٹ کے فروخت کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی بحرین میں اعلیٰ قسم کا موتی ڈھونڈھنا چاہے تو اسکو بدقت مل سکیگا۔

غوّاصی یہاں نہایت قدیم اصول پر رائج ہے، اور اُس کی ضروریات میں صرف اتنی اشیا داخل ہیں:۔ ایک رسّی جسمیں ایک پتھر بندھا ہوتا ہے جسکو پکڑ کے اندر ڈوب جاتے ہیں، ایک چُٹکی جسکو ناک پر چڑھا لیتے ہیں اور ایک قسم کا تیل جو کانوں میں مل لیتے ہیں۔ عمدہ موتی عموماً گہرے پانی میں ملتے ہیں جہاں اُسوقت غوطہ لگانے کا موقعہ ہوتا ہے جب سوتی کھنک جاتا ہے۔ غوطہ خور عام طور پر حبشی غلام ہوتے ہیں۔ اِن غریبوں کی عمریں ہمیشہ مختلف امراض میں مبتلا رہنے سے اکثر قلیل ہوتی ہیں، جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اُنکی بیماریوں کا کوئی علاج نہیں کیا جاتا۔

موجودہ زمانے میں صیغۂ غواصی کے متعلق چار سو کشتیاں ہیں، کسی پر آٹھ اور کسی پر دس آدمی مقرر ہیں، جن کی بابت شیخ کو محصول ادا کیا جاتا ہے۔ غواصی کا موسم اپریل سے اکتوبر تک رہتا ہے۔

عجیب عجیب قسم کی کشتیاں منامہ اور محارق کے درمیانی سمندر میں دکھائی دیتی ہیں۔ جہاں صرف بدنما بگلے ہی چل سکتے ہیں۔ بحرین کے جہازوں کے مستول لمبے ہوتے ہیں۔ جن پر نہایت عمدہ کام بنا ہوتا ہے اور سیپیوں سے آراستہ کئے جاتے ہیں۔ جب باد مخالف کا زور ہوتا ہے تو اُن کو ستونوں کے ذریعے سے جن میں تختے بندھے ہوتے ہیں آگے کو دھکیلتے ہیں، ایسے وقت میں ملاح جہاز کے اُس بالائی حصے پر بیٹھتا ہے جو مستول کے قریب ہوتا ہے جس طریقے سے یہ جہاز رسیوں سے باندھے جاتے ہیں اُسی نے اس نقل کو شہرت دے رکھی ہے جس کیطرف سرجان منڈاویل نے بھی اشارہ کیا ہے، کہ یہاں کے جہازوں میں لوہا اس سلئے نہیں لگاتے کہ ان سمندروں میں مقناطیسی پہاڑ بہ کثرت ہیں، اور اگر کوئی آہن پوش جہاز اودھر سے گزرے تو ان پہاڑوں سے ٹکرا کے تباہ ہو جائے۔

اکثر جہازوں میں عجیب و غریب وضع کے سنگی لنگر اور پانی کے پیپے بندھے ہوتے ہیں، جو دنیا کی ابتدائی حالت کو یاد دلاتے ہیں۔ شیخ کے پاس چند جنگی جہاز ہیں۔ جو بطل کہلاتے ہیں۔ پچاس برس قبل جبکہ سلطان عمان اور حاکم الحسا نے چڑھائی کی تھی جس میں آخر کار میدان بحرین ہی کے ہاتھ رہا۔ اُس لڑائی میں یہ جہاز بھی شریک تھے۔ اب چونکہ خلیج فارس پر عملاً انگریزی قبضہ ہے، اور بحری لوٹ مار کا خاتمہ ہو چکا ہے اس وجہ سے یہ جہاز صرف ز[illegible]ش کے کام کے رہ گئے ہیں۔ شیخ کا سب سے بڑا جہاز، جس پر چھوٹی چھوٹی دس توپیں چڑھ سکتی ہیں، اور جس کا نام

ذوالجناح ہے، اب تجارتی اغراض کے لئے کام آتا ہے۔ جزیرے کے قریب پہونچکر جہاز کارآمد نہیں ہو سکتے، کیونکہ پانی اتنا تھوڑا رہجاتا ہے کہ لوگ میلوں تک مچھلیاں اور دریائی پھل ڈھونڈھتے پھرتے ہیں جو اُنکے اور اُنکے جانوروں کی غذا کے کام آتے ہیں۔

(باقی دارد)

ضامن کنتوری

مصیبت جس سے ٹالا ہو وہی ساماں کر دیگا ۔ نہ گھبرا ناخدا سب مشکلیں آساں کر دیگا

قناعت کی بھی دولت ہو تو استغنا نہیں لازم ۔ جسے تو نفع سمجھا ہے یہی نقصان کر دیگا

تمناؤں کی مہمانی تصور کے حوالے کر ۔ کہ جو جو کچھ مناسب ہے وہی ساماں کر دیگا

مسلماں ہو کہ ہندو ہو مگر دیندار یکتا ہو ۔ خدا اُس حسنِ عالمگیر پر ایمان کر دیگا

خراباتِ جہاں میں کون ہے دل سوز ساقی سا ۔ اگر تلچھٹ بھی دینا ہے تو تجکو جوان کر دیگا

جگہ دل میں نہ دے شوقِ نموداری بُری شے ہے ۔ یہی جسکا تجھے برباد اے نادان کر دیگا

متاعِ بے بہا سے کم نہ جان اے چشم اشکوں کو ۔ یہی رونا ترا خالی تری دوکان کر دیگا

خوشی سے مشکلوں کا سامنا کر منہ نہ پھیر اے دل ۔ ترے عُقدوں کو حل تیرا ہی اوسان کر دیگا

لگی ہے آک جس ساغر کی اک مدت سے اے میکش ۔ اُسی ساغر سے مے ساقی تجھے حیران کر دیگا

بشر پر منحصر کیا تذکرہ اُس کا تو ناحق ہے ۔ یہ عشقِ ذو فنوں حیواں کو بھی انسان کر دیگا

کوئی گر سلطنت بھی دے تو واپس کر نہ آ اے دل ۔ سُبک ہر طرح گو غیر کا احسان کر دیگا

تری رو پوشیاں اے حسن کب بیکار جائینگی ۔ یہی پردہ عیاں عالم میں تیری شان کر دیگا

سکھے دیتا ہوں قاتل سے خبر جاں بازی اپنے ۔ فنا شوق شہادت میں کسی دن جان قرباں کر دیگا

یقیں کر لے کہ خود وہ جلوہ گر پردہ میں ہو ورنہ ۔ یہی ظالم گماں تیرا تجھے حیران کر دیگا

غزل ہم کیا مراد اے شاد ہے صاحب کمالوں کی ۔ کسی دن تصفیہ اُس کا سرِ دیوان کر دیگا

پان

ایشیا کی مہمان نوازی کا پلّہ یورپ سے ہمیشہ بھاری رہا ہے، یورپ میں اگر تواضعاً تمباکو اور چائے پیش کی جاتی ہے تو ایشیا میں علاوہ اِن کے عطر اور پان بھی پیش کیا جاتا ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ اچھی چیزیں ہیں اور مفید۔

یوں تو عالم نباتات میں اچھے اچھے خوشنما پتّے ہیں مگر جو فروغ پان کے پتّے کو حاصل ہے اور کسی پتّے کو حاصل نہیں ہوا۔ سبز مائل بزردی تپلا اور کرارا ایک دُنیا ہے کہ پان پر جان دئے دیتی ہے۔ طب کی رُو سے دیکھئے تو پان کو مقوی دل و دماغ و معدہ مصفیٰ خون مخرج رطوبات مانا ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ اِن امور کی تصدیق کرتے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد لازمی طور پر گلے میں چکناہٹ رہجاتی ہے جسکا دفعیہ کوئی خشک چیز کھانے سے بھی نہیں ہوتا۔ اِسکے علاوہ کھانے کا مزا اور کچھ کچھ بقیہ زبان اور دانتوں میں لگا رہجاتا ہے۔ جسکے لئے پان سے بہتر شاید ہی اور کوئی چیز ہوسکتی ہے۔ پان کھانے سے مُنہ سُتھرا۔ دانت صاف۔ طبیعت بشّاش اور معدہ صحیح رہتا ہے۔ مگر یہ کب۔ جب پان سے جائز حدود کے اندر فائدہ اُٹھایا جائے۔ ورنہ یہی پان زیادتی کے باعث بجائے معدہ کو تقویت پہنچانے کے مضعف معدہ ہوجاتا ہے۔ دانتوں کی جڑوں کو کمزور کر دیتا ہے اور صفائی سے غفلت کی جائے تو مسوڑوں وانتوں کی چمک کو مٹا کر دانتوں کا ستیاناس کر دیتا ہے۔

یہ تھا طبّی پہلو پان کے فوائد کا۔ حُسن پرستی کی نظر سے دیکھئے تو پان میں اور بھی دلفریبی اور دلربائی کی ادائیں موجود ملیں گی۔ کسی حسین بالخصوص صبیح حسین کی بات ترتیب سفید براق تبسّم اور پتلے پتلے ہونٹوں پر پان جو قیامت کے سامان

پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا بیان الفاظ میں مشکل ہے۔ فوراً لبوں پر مسکراہٹ آئی اور ایسا معلوم ہوا گویا شفق میں بجلی کوند گئی۔

پان بنانے اور پیش کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ کہیں اسکی مثلث نما گلوریاں بنائی جاتی ہیں۔ کہیں مستطیل کہیں مخروطی شکل کی۔ ان میں سے ہر ایک انداز بجائے خود قابل قدر ہے۔ کسی سلیقہ شعار حسین کے نازک ہاتھوں کی بنی ہوئی گلوریاں طشتری یا خاصدان میں رکھی ہوئی ملاحظہ کیجئے۔ مثلاً گلوری لے لینے کو جی نہ چاہے تو ہمارا ذمہ۔ ہندوستان کے خاص خاص رنگین شہروں میں پان اور پان کی فروخت سے وہ فائدہ اٹھایا جاتا ہے جو یورپ میں ہوٹلوں کی مدارات سے۔ حسینوں طرحداروں کے ہاتھ کی گلوریاں ان مقامات میں تجارتی اشیاء کا ایک جزو عظیم ہوتی ہیں۔ رات کو کسی شوقین دوکاندار کی دوکان پر عجیب بہار ہوتی ہے۔ تماشائی جوق جوق جمع ہیں۔ پیسے پر پیسہ پڑ رہا ہے۔ پان دیئے جا رہے ہیں۔ پھبتیاں اڑ رہی ہیں۔ جگت بازی ہو رہی ہے۔ ایک دل لگی کا سامان ہے۔ شوقین ہیں کہ کبھی اس دوکان پر ٹھہرے دو دو منہ ہنس بول لئے کبھی اس دکان پر کھڑے ہو گئے اور مذاق کرنے لگے۔ سیر کی سیر تفریح کی تفریح۔

پان کے لوازمات میں الائچی تو ایک معمولی بات ہے۔ زیادہ تکلف مقصود ہو تو کتھے کو عطر میں بسایا جاتا ہے۔ زعفران مشک جاوتری ڈالی جاتی ہے۔ اور اسمیں کچھ بھی شک نہیں کہ تکلف کا بنا ہوا پان نہایت مفرح ہوتا ہے۔

سید نذیر حسین

ملکہ بلقیس

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

آنکھ کھلتے ہی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میری پیشانی پر کسی نے پٹی باندھ دی ہے اور میرا مجروح زخمی سر کسی عورت کے ہاتھ پر ہے۔ زنانہ لہجہ میں کسی نے کہا "اطمینان سے لیٹے رہو۔ اور حرکت نہ کرو۔" میں نے آتشدان کی دھیمی روشنی کی مدد سے دیکھا کہ ایک حسین دوشیزہ کے ہاتھ پر میرا سر ہے۔ اسکے خط وخال عربی ہیں۔ اسکا رنگ نارنگیوں کا سا ہے اسکے سر پر چھوٹی سی ٹوپی ہے جس میں موتی ٹکے ہیں۔ اسکی طلائی چوڑیوں اور بازوبندوں میں ہیرے جڑے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن میں نے ہوش وحواس کو بجا کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ہم دونو ایک چھوٹے سے کمرے میں ہیں جس میں سرخ رنگ کے پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ اور ایک طلائی عود دان سے کمرہ مہک رہا ہے۔ اور میں ایک خوبصورت پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں۔ جس پر ریشمی گدیلے اور تکئے لگے ہوئے ہیں۔

میں نے پوچھا "میں کہاں ہوں" نازنین نے جواب دیا "اب تم محفوظ ہو۔ تم نے اس شہر ویران میں بہ نیت فاسد داخل ہونے کی جرأت کی اور تم پر غضب نازل ہوا" میں نے کہا "اور تم نے مجھے دیکھ لیا تھا" اس نے سر کی حرکت سے کہا "ہاں" وہ اپنی روشن اور شرگیں آنکھوں کو نیچے جھکائے رہی۔ اور کچھ توقف کے بعد بولی۔ "تم اس شہر میں آئے ہو جس پر خدا کا غضب ہے۔ جو یہاں آتا ہے وہ بھی مغضوب ہوجاتا ہے۔ تم ملکہ بلقیس کا خزانہ لوٹنے کی نیت سے یہاں آئے۔ اور معتوب ہوئے۔ لیکن بعض اوقات شر میں خیر مخفی ہوتی ہے۔ کیونکہ تم مصیبت میں میرے رفیق ہوگئے

ہیں سبے اختیار بول اُٹھا۔ "مصیبت میں! تم کون ہو؟" نازنین۔ "میں بلقیس ہوں۔ اُس ملکہ بلقیس کی یادگار جو شہر سبا کی بادشاہزادی تھی۔ میں اُسکے دفینہ کی محافظ ہوں۔ اور ملکہ بے تاج اور فرمانروائے بے رعیت۔ محل جو تم نے دیکھا ہے۔ یہ میری ملکیت ہے۔ اور جس تخت سے تم ایک الماس چرالائے ہو۔ اُس پر بیٹھکر میں تنہائی پر بادشاہت کرتی ہوں۔ اگرچہ تا ابھی دنیا میں میرا نام ملکہ بلقیس کی جانشین بلقیس ہے اور میرے قبضہ میں اسقدر گنجینہ ہے۔ جسکا کوئی صحیح اندازہ نہیں کرسکتا۔ لیکن میری رعایا کی تعداد چودہ سے زیادہ نہیں جوکہ میرے متعلقین ہیں اور اس محل میں میرے ساتھ رہتے ہیں۔ تم دیکھ چکے ہو۔ کہ یہ شہر جو کبھی نہایت پر رونق و آباد تھا۔ اور جسکے نہایت عالیشان محل کے پندرہ دروازے تھے۔ تباہ ہوگیا۔ صرف میں اور میرے خاندان کے لوگ بچ رہے ہیں۔ افسوس میں بھی جلدی قبر کے مُنہ کا نوالا ہونے والی ہوں۔ بلقیس کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔" میں نے کہا۔ "آپ ایسی افسردہ وملول کیوں ہیں۔ آپکو ماشاءاللہ شباب۔ صحت اور سب کچھ خدا نے دیا ہے۔" وہ کہنے لگی "نہیں تم نہیں جانتے۔ میری قسمت کا فیصلہ ہوچکا ہے"

میں نے پوچھا "وہ کیا؟" اس نے جواب دیا۔ "سنو میں سناتی ہوں دو مہینے کا ذکر ہے۔ کہ میں اپنے بوڑھے چچا کے ساتھ ایک دور دراز شہر میں کچھ ضروریات خریدنے کے لئے گئی۔ جیساکہ سال میں دو دفعہ ہمارا معمول ہے۔ واپسی پر ہم کو صحرائے اعظم کے طوفان سے بچنے کے لئے۔ ایک قبیلہ کے خیموں میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ وہاں اس قبیلے کے سردار نے مجھسے اظہار تعشق کیا۔ لیکن میں نے اسکی درخواست سے انکار کیا۔ اس پر اُس نے کہا۔ خواہ کچھ ہو۔ وہ ضرور مجھکو اپنی بیوی بنائیگا۔ میں نے اسکو نہایت حقارت آمیز تبسم سے جواب دیا۔ وہ غالبًا میرے نام ومکان سے بھی ناآشنا تھا۔ دوسرے روز بھی ہم اُن کے پاس

ٹھہرے رہے۔ جب رات ہوئی تو مینے پہرہ دار کو اپنے ہاتھ کی انگوٹھی دی اور اپنے چچا کے ساتھ وہاں سے بھاگ نکلی۔ ہم چاند کی چاندنی میں شہر سبا کیطرف اُڑتے آ رہے تھے۔ چار روز تک ہم نے رستے میں کہیں دم نہ لیا۔ پانچویں دن میری اونٹنی ریگ رواں میں دھس گئی اور اس سبب سے ہمارا شہر سبا میں پہنچنا دشوار ہو گیا۔ میں اپنی چالاکی اور عیاری پر نازاں ہو رہی تھی۔ ایک سو قدم کا فاصلہ طے ہوا ہو گا۔ کہ میں نے اتفاقاً مڑکر دیکھا تو ایک سوار تن تنہا ہمارے پیچھے آتا دکھائی دیا۔ جب میں نے غور سے دیکھا تو یہ وہی سردار تھا۔ وہ زین میں بیحس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔ اور ہماری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ میرے چچا نے میرا اضطراب دیکھکر مڑکر دیکھا اور کہا "بیشک وہ ہمارے تعاقب میں آ رہا ہے"۔

"اس رات میں نے اپنے کنبے کے سب لوگوں کو یہ سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اور وہ سب اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ اُس قبیلے سے لڑائی کیجا ے۔ اُنھوں نے مجھے بھی ہمراہ چلنے پر مجبور کیا۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ میں شہر سبا کی ملکہ اور بقیا اس گنجینہ کی محافظ ہوں۔ اب وہ اُس گروہ کے ساتھ لڑائی کے ارادے پر مجھے اکیلی چھوڑکر چلے گئے ہیں۔ انکو گئے ہوئے آج دسواں دن ہے۔ کل تم یہاں آئے۔ تمہارے چہرے پر نقاب پڑا ہوا تھا۔ جب تم محل میں پھر رہے تھے میں تم کو دیکھ رہی تھی اور جب تم اُس غار کی طرف چلے جس میں وہ گنجینہ مدفون ہے تو میرے دم میں دم آیا۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ تم قبر کے مُنہ میں جا رہے ہو۔ اس غار میں ایک کل لگی ہوئی ہے جسکو خود ملکہ بلقیس اوّل نے تجویز کیا تھا۔ جب کوئی بے خبر اندر آ جاتا ہے اُسکو اُس کل کی کمانی معلوم نہیں ہوتی جب وہ اسکے نزدیک پہنچتا ہے تو اسکے سر پر ایک بھاری لوہے کا گرز پڑتا ہے" میں نے بات کاٹ کر کہا جو میرے سر پر لگا تھا۔ اُس نے افسوس آمیز تبسم سے سر کو ہلایا پھر کہنے لگی۔

"جب میں تمہیں دیکھنے گئی۔ تو تمہارا نقاب چہرے سے ہٹا ہوا تھا۔ اور تمہاری صورت شکل اُس شخص سے بالکل مختلف تھی جسکا خوف میرے دل میں سمایا ہوا تھا۔ میں نے تمام رات تمہاری تیمارداری کی ہے اب دن چڑھ آیا ہے۔ اور تم روبصحت ہو" میں نے کہا کہ "تو میری زندگی کے کچھ دن باقی تھے کہ میں اس آفت سے بچ گیا"۔ نازنین نے کہا "بے شک کئی اُولوالعزم بہادر اور دلاور اسی غار میں جاتے ہی راہی ملکِ عدم ہوئے ہیں" میں نے کہا "اب تنہا تم اپنے خزانے کی محافظ ہو۔ واقعی تم بھی اُس ملکہ کی طرح دلیر اور شجاع ہو۔ جسکے مقابلہ کے لئے کئی سلاطین کو اپنے بیقیاس لشکروں کے ساتھ پسپا ہونا پڑا" اُس نے ایک آہِ سرد بھری اور کہا "ملکہ سبا کا فرض ہے کہ اس محل میں رہے اور اس ویران شہر پر حکومت کرے افسوس میں کسی کی بیوی نہیں بن سکتی۔ اور اپنے مولد ومنشا کو ترک نہیں کر سکتی" میں نے کہا "جو شخص تمکو ڈراتا ہے وہ دھوکے میں ہے" وہ بولی "نہیں اُس سردار نے کہا تھا۔ کہ اگر میں اسکے ساتھ عقد نکاح پر راضی نہ ہونگی تو وہ میرے سارے کنبے کو تباہ کر دیگا" "جب تک میں اسکے قبضہ میں نہ آجاؤنگی وہ ہمکو باغی سمجھیگا" میں نے کہا "تو پھر یہاں سے بھاگ ہی کیوں نہ جائیں۔ میں تمکو وہاں لیچلوں گا۔ جہاں تم بالکل حفظ وامان میں ہوگی۔ اگرچہ ہم قزاق و راہزن ہیں۔ لیکن تمہارے ساتھ کسی قسم کا ناملائم سلوک نہ ہوگا" اُس نے اپنے سر کو ہلایا اور محل کے باہر قدم رکھنے سے انکار کیا۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ اس بات پر راضی نہیں۔ تو میں نے کہا اچھا میں تمہاری مدد کو تیار ہوں۔ اس نے کہا "تو آؤ پہلے اس تخت کو غار میں سے لے چلیں" یہ کہکر وہ مجھکو ایک پوشیدہ دروازے سے بڑے ایوان میں لے گئی جسمیں فرش بلوریں کے نیچے آب زلال بہ رہا تھا۔ ہم دونو نے تخت کو اُٹھایا۔ اور غار کے دروازے پر پہنچے۔ پھر اُس نے ایک مشعل روشن کی اور بڑی مشکل سے میں تخت کو کشاں کشاں اسکے پیچھے لیچلا۔ چند قدم چلکر وہ اُس کل کو کنجی دینے کے لئے جھکی تاکہ وہ گر نہ پڑے دائیں طرف ایک اور مخفی دروازہ

تھا - اور آگے ایک وسیع کمرہ تھا جسمیں طلائی زیور اور بیش بہا جواہر پڑے ہوئے تھے - ایسے جواہر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے - بعض کو بے اختیار میں نے ہاتھ میں اوٹھا لیا - طلائی طشت - جڑاؤ زرہیں - اور تلواریں جنکے دستوں اور میانوں میں ہیرے اور نیلم جڑے ہوئے تھے - دُرہائے ناسفتہ - الماس ناتراشیدہ - جڑاؤ انگشتریاں اور کانوں کی بالیوں کا میرے پانوں کے نیچے فرش تھا - دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے پتھر کے صندوق رکھے تھے - جو کبھی کھولے نہ گئے تھے - بلقیس نے مجھے بتایا "کہ اُن میں وہ تحائف مقفل و سربستہ ہیں - جو حضرت سلیمان نے ملکہ بلقیس کو بھیجے تھے" ایک صندوق کا پتھر ایک جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا - میں نے اسکے اندر ہاتھ ڈالا الماس کے ٹکڑے نکالے - جن کی نظیر دنیا میں ملنی مشکل ہے - میں حیرانی میں مستغرق تھا - اور دل میں اُس گنج فراواں کا خیال کر رہا تھا - بلقیس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھکر کہا - "کہ اس محل کے متعلق ایک اور تعجب خیز بات ہے - سنو کیا تم کو کچھ آواز سنائی دیتی ہے" میں نے کان لگایا - تو ایک گونج کی سی آواز سُنائی دی - میں نے کہا یہ کیا ہے - بلقیس بولی "اِس پہاڑ میں کوئی آتشی مادہ ہے - یہ آواز اسی کی ہے - اور اسی طرح سالہا سال سے جاری ہے - مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن کے زمانہ میں ایک دفعہ کلہٗ مخروطی سے ہم نے دھواں نکلتے دیکھا تھا - خیال کیا جاتا ہے - کہ جہاں ہم کھڑے ہیں اسجگہ سے وہ مادہ کچھ بہت دور نہیں ہے - چنانچہ اس کمرے کی دیواریں گرم ہیں - میں نے دیوار پر ہاتھ رکھا - اسقدر گرم تھی کہ میں نے فوراً ہاتھ اٹھا لیا - بظاہر معلوم ہوتا تھا - کہ صرف ایک دیوار سنگین ہمارے اور اُس مادہ آتشین کے درمیان ہے - بلقیس کہنے لگی - "زمانہ گذشتہ میں اسکی نسبت عقیدہ تھا - کہ اس پہاڑ میں دوزخ ہاویہ ہے جسمیں ملحد اور کافر ڈالے جائیں گے - اُن کو وہاں کھانے کے لئے مردار گوشت اور

پینے کو پگھلی ہوئی رال ملے گی"۔ میں نے کہا "خدا آپ کو حفظ و امان میں رکھے"۔
بلقیس "وہ اور تم پر بھی خدا رحم کرے۔ اب میں نے تم کو اپنے بزرگوں کا راز بتا دیا ہے
تم میرے ساتھ اقرار کرو۔ جب تک میں اور میرے خاندان کے لوگ شہر سبا میں
ہیں۔ تم کبھی اس خزانے پر قبضہ کرنے کی تمنا و سعی نکروگے"۔ میں نے کہا
"اگرچہ میں قزاق ہوں۔ لیکن خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ سے عہد کرتا ہوں۔ کہ
میں کبھی آپ کا راز افشا نکرونگا۔ اور نہ ہی آپ کے دفینہ پر قبضہ کرنے کا قصد کرونگا
اب سے میں آپ کے گھر کو اپنا گھر سمجھوں گا۔ میں ناسپاس و احسان فراموش نہیں"
بلقیس "مجھے تم پر پورا اعتماد اور اعتبار ہے" یہ کہکر اُس نے اپنا نازک ہاتھ
جس سے میری پیشانی پر پٹی باندھی تھی۔ میرے ہاتھ میں دیدیا میں نے اپنی
جیب سے وہ الماس جسکو میں نے تخت سے چرالیا تھا نکالا۔ اور اُسکے ہاتھ پر رکھدیا
لیکن اُسنے واپس لینے سے انکار کیا۔ اور کہا "یہ شہر سبا کی یادگار تم اپنے
پاس رکھو" اُس کمرے کی ہوا سے ہمارا دم گھٹ رہا تھا۔ تخت کو ہم نے ایک طرف
رکھا اور ہم باہر نکل آئے۔ اور بڑے ایوان میں جس نے شہر سبا کی شان و شوکت کے
نظارے دیکھے تھے جا بیٹھے۔ بلقیس مجکو عجیب عجیب تصاویر اور کتبوں کی
حقیقت سنانے لگی۔ پھر اُس نے مجھے بہت سی بزم ہائے راز و نیاز و بزم ہائے
حرص و آز کی کہانیاں سنائیں جو کہ اُس عظیم الشان ایوان میں ظہور پذیر ہوئی تھیں
شام تک ہم دونوں اُسی ایوان میں بیٹھے رہے اور بلقیس ازمنہ گذشتہ کے بڑے
بڑے واقعات بیان کرتی رہی۔ پھر مجھے اُس نے انگوروں کا رس اور کچھ کھجوریں
دیں۔ جب ہم وہاں سے اُٹھکر ایوان میں سے گذر رہے تھے۔ تو اُسنے
ایک چیخ ماری اور ہاتھ کے اشارے سے مجھسے کہا "دیکھو وہ یہاں پہنچگئے ہیں"
جونہی اُسکے منہ سے یہ الفاظ نکلے معاً ایک ستون کے عقب سے ایک مردود نے

اُس پر حملہ کیا - اُس نے پھر زور سے چیخ ماری - لیکن بیشتر اِسکے کہ وہ اسکو چھوئے
میں نے اپنی تلوار سے اُس پر حملہ کیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا نیچے پتھروں پر جا پڑا - اِس
اثنا میں دس بارہ آدمی اُس سردار کی ہمراہی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے - بلقیس پہلے
ہی خوف زدہ کانپ رہی تھی - مجھ سے جلدی مگر نہایت آہستگی کے لہجے میں کہا
"آؤ آؤ - صرف ہم اسطرح بچ سکتے ہیں" یہ کہکر وہ نہایت تیزی سے بھاگی - اور ہماری
دشمن ہمارے پیچھے دوڑے - میرے چہرے پر نقاب نہ تھا - اس لئے ہمارے
حملہ آوروں کو یہ معلوم نہ تھا - کہ میں قبیلہ نقاب پوش سے ہوں - میں اور بلقیس
ایوان بہ ایوان بھاگتے ہوئے اُس غار میں پہنچے اور تاریک جگہ میں بلقیس نے
ایک دروازہ کھولا - مجھے اندر دھکیلا خود بھی اندر آکر دروازہ بند کر دیا - پھر ہم خاموش
وہاں بیٹھے رہے - ہمکو کوئی آواز سُنائی نہ دی - معلوم ہوتا تھا - کہ حملہ آوروں نے ہمارے
پیچھے آنے کی جُرأت نہ کی - بلقیس نے آہستہ سے مجھے کہا - یہ راہ باہر پہاڑ پر جا نکلتی
ہے ہم بچ سکتے ہیں - ہم اندھیرے میں اپنے گھٹنوں اور ہاتھوں پر آگے بڑھتے گئے
قریب آدھ گھنٹہ کی سخت مصیبت کے بعد ہمکو خفیف سی روشنی نظر آئی - اور تھوڑی
دیر کے بعد ہم کھلی ہوا میں جا کھڑے ہوئے - بلقیس نے کہا ابھی ہمکو اوپر چڑھنا
چاہئے - ہم پہاڑ کی دوسری جانب چلے جائینگے - ہم ابھی تھوڑی ہی دور چڑھے تھے
تھے - کہ ہمارے متعاقب سرداروں نے ہمکو للکارا - میں نے مڑکر دیکھا تو ہمارے
بالکل قریب تھے - لیکن ہمارے اور اُن کے درمیان چٹان کا ایک نہایت خطرناک
کنارہ جو پچاس فٹ کے قریب آگے کو جھکا ہوا تھا - حائل تھا - اس لئے ہم ایسی
جگہ تھے جہاں اُنکا پہنچنا ناممکن تھا - بلقیس نے بھی اُنکو حقارت آمیز تبسم سے دیکھا
اُس سردار کی آتش کینہ اور بھی بھڑک اُٹھی - اُس نے اپنے ہمراہی سے تیر و کمان لیا
اور بلقیس پر تیر برسانے شروع کئے - پیشتر اِسکے کہ میں اُسکو زمین پر لٹا سکوں بلقیس

نے ایک چیخ ماری اور لڑکھڑا کر گر پڑی۔ قاتل ہنس پڑا۔ میں نے ایسا وحشیانہ
اور بے رحم قتل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اپنی جان کے لالے پڑتے نظر آئے۔
میں جلدی منہ کے بل لیٹ گیا۔ اور اوپر کو رینگنا شروع کیا۔ وہ سردار اپنے ہمراہیوں کو
مخاطب کر کے کہنے لگا "دیکھو اسکی پہنچیاں اور گلے کا ہار اُتار کر مجھے دیدو۔ اور باقی
زیور تم آپس میں بانٹ لو۔ اسکے ہمراہیوں نے زیور اُتارنے میں اپنی سنگدلی
اور وحشیانہ پن کا پورا ثبوت دیا۔ پھر وہ مجھ پر تیر پھینکنے لگے۔ جب شام کی تاریکی نے
مجھے اُن کی نظروں سے غائب کر دیا۔ تو میں بے دم ہو کر ایک چٹان کی آڑ میں
بیٹھ گیا۔ وہاں سے اُن کے فرودگاہ میں مجھے آگ جلتی نظر آتی تھی۔ آدھی رات
کے وقت میں نے ایک گرج کی آواز سُنی اور پہاڑ کانپ گیا۔ صبح ہوئی تو میں نے
دشمنوں کو واپس جاتے دیکھا۔ اُن کے جانے کے تین گھنٹہ بعد میں ملقیس کی نعش
کے پاس آیا۔ اُس پر بے شمار کوے اور گدھ جمع ہو رہے تھے۔ مجھے رنج و تاسف نے
تنہائی میں آگھیرا۔ اور میں دیر تک نعش کے پاس بیٹھکر اشک خوں بہاتا رہا۔ پھر محل
کی طرف گیا۔ میں نے دیکھا کہ غار کے منہ سے دھواں نکل رہا ہے۔ میں نے آگے
جانے کی کوشش کی مگر گرمی اور دھوئیں کی وجہ سے نہ جا سکا۔ جب میں نے غور
سے دیکھا تو دھوئیں کے ساتھ غار کے منہ پر گرم راکھ اور پگھلی ہوئی گندھک آ رہی
تھی۔ مجھے یقین ہوا کہ وہ دیوار پتھروں کی ٹوٹ گئی ہے۔ اور اب جلدی ہی یہ محل
بلکہ ویران شہر سبا راکھ میں دب جائیں گے۔ میں اپنی جان بچا کر بھاگا۔ جو الماس
ملقیس نے مجھے اپنے ہاتھ سے دیا تھا۔ میری تلوار کے قبضہ میں جڑا ہوا ہے۔ جب کبھی
تلوار کے قبضے پر میرا ہاتھ پڑتا ہے۔ تو مجھے وہ دلفگار واقعہ یاد آجاتا ہے۔ اور ملقیس کی پیاری صورت
میری آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ جو اس دنیا سے یوں ناشاد و نامراد گئی۔ اور میں دست حسرت
وافسوس ملکر رہ جاتا ہوں۔

نورالدین عنبر (از مصری نگر)

تصویر سجّاد کو دیکھکر

سید نظام الدین شاہ صاحب دلگیرؔ اکبر آبادی نے سید سجاد حیدر صاحب کی تصویر دیکھکر مندرجہ ذیل الفاظ میں اُن کی طرز تحریر کی داد دی ہے۔ اور حکایۂ لیلیٰ مجنوں کی بقیہ کیلئے تقاضا کیا ہے

سجّاد! سجّاد! کون سجاد؟ وہی فطرت شناس سجاد، آزاد سجاد، ظرافت پسند سجاد، جسکی تصویر ہنستی بولتی تصویر، اکتوبر کے مخزن میں شایع ہوئی ہے۔ دلوں کو لوٹتے ہوئے دلوں کو، اپنی طرف نئے طرح کھینچتی ہے۔ وہی روشن خیال سجاد، جسکے مضامین کی نسبت بجا طور پر کہا جا سکتا ہے ؎

عطا کیا طبع نکتہ رس نے ترے قلم کو سخنوری میں
خیال انوکھا، بیاں اچھوتا، زمیں نئی، اور روش نرالی

مخزن کا علمی دسترخوان بے نمک ہے اگر سجاد کی ظرافت طبعی کی چاشنی اس میں نہ دی جائے۔ اس پیارے رنگ کے، دل لبھانے والے رنگ کے، ہنسانے رلانے والے رنگ کے، آجکل بے حد قدر دان ہیں جسکو سجاد اپنے رنگ کا مالک سجاد، قلم برداشتہ لکھتا جاتا ہے،

تعجب، سخت تعجب ہے کہ اسکے قلم معجز رقم نے دو حکایۂ لیلیٰ و مجنوں، کو ابتک کیوں نامکمل چھوڑ رکھا ہے، اسے پورا کرنا چاہئے، اور جلد پورا کرنا چاہئے۔

دلگیرؔ

سید سجاد حیدر صاحب کے سب دوست اور مدّاح یہ سنکر خوش ہونگے کہ وہ اب بغداد سے واپس تشریف لے آئے ہیں۔ اور یہاں بدستور اُنکی خدمات پولیٹکل محکمہ سے متعلق رہینگی۔ وہ اب غالباً زیادہ دون میں مقیم ہونگے اپنی زبان اور اسکے لٹریچر کی جو خدمت اُنھوں نے سفر میں کی ہے امید ہے کہ وطن میں آکر بھی جاری رہے گی۔

سرسید کے دو رفیق

مندرجہ ذیل پر اثر مرثیہ جناب شمس العلما مولانا حالی مدظلہ کے قلم جادو رقم سے نکلا ہے۔

خان بہادر محمد برکت علیخاں مرحوم اور سید زین العابدین خاں مغفور کے انتقال سے جو ناقابل تلافی کمی سرسید احمد خاں مرحوم کے پرانے رفقا کی جماعت میں آئی۔ اس کا مرثیہ مولانا حالی سے بہتر کون کہہ سکتا ہے اُنہوں نے یہ حق کچھ عرصہ ہوا ادا کر دیا تھا۔ مگر بعض اتفاقات سے یہ مرثیہ اس سے پہلے شائع نہیں ہو سکا۔ اور اب جناب ممدوح نے ہماری درخواست پر ہمیں اشاعت کے لئے عنایت فرمایا ہے۔

حیف دنیا سے کیا برکت علیخاں نے سفر — جس سفر سے ہے جوانوں کو نہ بوڑھوں کو مفر

جسکی جانب ہے چوکنا گدا ہو یا کہ شاہ — گھات میں ہے جو ہر اک جاندار کی شام و سحر

پر مبارک ہے سفر انکا کہ جو پیش از رحیل — کر گئے لاکھوں دلوں میں نیکیوں سے اپنی گھر

فیض پہنچاتے رہے یوں اپنے بیگانے کو وہ — رہگذر پر میوہ افشاں جیسے نخلِ باردر

ہیں وہی انسان جو آتے ہیں ہمجنسوں کے کام — ورنہ ہیں انسان سے سو بار بہتر جانور

ہیں یہی وہ لوگ جو جیتے ہیں اوروں کیلئے — کھاتے ہیں خود زخم پر اُنکو دیتے ہیں ثمر

ہیں جماعت کے یہی دنیا میں وہ فردِ فرید — جو کہ مر کر توڑ جاتے ہیں جماعت کی کمر

ہیں امیدیں قوم کی وابستہ انکی ذات سے — انکا ماتم قوم کا ماتم ہے قصہ مختصر

کوششیں برکت علیخاں کی رہینگی یادگار — جو فلاحِ قوم میں اُس سے ہوئی ہیں جلوہ گر

پھر نہ کھولی ایک دم جبتک کہ دم میں دم رہا — قوم کی خدمت پہ جب سے اُسنے باندھی تھی کمر

گو کہ ضعف و ناتوانی نے بہت پھیلائے پاؤں — کر کے چھوڑی اُسنے لیکن جو مہم کرنی تھی سر

اُسکو مشتِ استخواں لیکر پہنچنا واں ضرور — جب کسی تقریبِ قومی کی اُسے پہنچے خبر

قوم کی خدمت کا جو سید سے سیکھا تھا سبق — وہ سبق مرحوم نے بھولا نہ ہرگز عمر بھر

اسکی دلسوزی جہاں چپ چاپ کر جاتی تھی کام — واں فصیحوں کی فصاحت تھی سراسر بے اثر

روح قومیت کی اُسنے پھونک دی پنجاب میں — ہو گئے اپنے پرائے ملکے سب شیر و شکر

جو اثر رکھتا ہے گھر والوں پہ اک گھر کا بزرگ — قوم پر پنجاب میں اُسکا وہی دیکھا اثر

اُسکے کاموں میں نمایش تھی نہ باتوں میں نمود — راستبازی کی تھی اک تصویر گویا سر بسر

کود پڑنا آگ میں اوروں کی تھا اُسکا شعار — مشکلوں میں سب کی ہو جاتا تھا وہ سینہ سپر

مٹ گئی افسوس عالی ہمتی کی وہ مثال — پیر و برنا میں نظر آتی نہیں جس کی نظر

اہلِ ہمت چاہئیں یاں گو ہوں پیر ناتواں — ہیں جواں کس کام کے ہمت نہیں جن میں اگر

ایسے مالی اور کہیں سے گر نہ ہوتے دستیاب — پود سید کی نہ ہوتی تا قیامت بار ور

دست و بازو تھے یہی اُس جاں نثارِ قوم کے — جنکی سرگرمی سے لائیں کوششیں اُسکی ثمر

ورنہ تھی چھائی ہوئی بیڑے پہ سر سید کے یاس — رات اندھیری وقت بھیانک اور دریا پُر خطر

سر بسر موجیں ڈرانی اور ہوا ناساز گار — ساحلِ مقصود دور اور راہ میں حائل بھنور

ان عزیزوں نے دیا اُسوقت سر سید کا ساتھ — جب کہ پرچھائیں سے اُسکی قوم کرتی تھی حذر

حیف یہ طبقہ ہے اب یاں کوئی دنکا میہماں — بیٹھے ہیں باندھے کمر تیار سب بہر سفر

دوست تھے سید کے جو مانند اعضائے بدن — وہ مرقع مٹنے والا ہے عزیزو سر بسر

ایک کا ماتم ابھی ہونے نہ پایا تھا تمام — ناگہاں اک دوسری پہنچی مصیبت کی خبر

بعد اس ماتم کے زین العابدین خاں کی وفات — وہ اگر داغِ جگر تھا تو یہ ہے داغِ دگر

رو دئیے پہلے کو یا پچھلے کا ماتم کیجئے — ایک سے ہے ایک حالی حادثہ جانکاہ تر

ہائے وہ سید کا عاشق اور رفیقِ غمگسار — ساتھ سید کا نہ چھوڑا جسنے ہرگز عمر بھر

کوئی چیز اُسنے کبھی رکھی نہ سید سے عزیز — بے تکلف اُسکا گھر گویا کہ تھا سید کا گھر

کی علیگڈھ میں سکونت اُسکی خاطر اختیار — سب وطن اور رشتہ داری کے تعلق توڑ کر

آخرش پہلو میں سسکیہ کیا اُسنے مقام
جب کیا مہمانسرائے دارِ فانی سے سفر

زندگی میں جسطرح چھوٹا نہ اُسکا اُس سی ساتھ
بعد مُردن بھی رہے دونوں رفیقِ ہمدگر

دیکھتے اسے کاش ان بوڑھوں کی یاری ڈھنگ
وہ جواں جو طعنہ زن بوڑھوں کے ہیں اخلاق پر

رنجشیں الفت بھری شکوے سراسر مہر خیز
چھیڑ لطف انگیز خفگی اُس سے لطف انگیز تر

رائے ہر اک کی جُدا تھی اور پانی کی طرح
متحد لیکن مقاصد صورتِ شیر و شکر

رہگئے ہیں چند فروان صحبتوں کی یادگار
ہیں مگر بجھنے کو سب مثلِ چراغانِ سحر

مانگئے حالی بس اب خالق سے پسماندوں کی خیر
سوگ میں اگلوں کے کب تک دل حزین و چشم تر

حالی

کلام اکبر

میں نے کہا یہ اپنے خیالی خضر سے آج
بتلاؤ اس روش سے ترقی کی کیا اُمید

ہر گام پر جو طاعتِ حق سے الگ پڑا
ہوتے رہو گے مرکزِ قومی سے تم بعید

ہاں انتشارِ جہل کی تکمیل ہو گی جب
ہو جاؤ گے بتانِ کلیسا کے تم مُرید

شاید کہ مدعا بھی تمہارا ہے بس یہی
ہر چند ابھی ہے علم کے پردے میں ناپدید

حیرت سے مجھکو دیکھکے اُس خضر نے پڑھا
حافظ کا ایک شعر جو معنی کو تھا مفید

سِرِ ازل کہ پیرِ مغاں باکسے نگفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

ہیں ہوا پر کفر کے گیسوے پریشاں ان دنوں
کوئے دلمیں کیونکر آئے بوئے ایماں ان دنوں

علم دیں مفقود ہے گم ہے صراطِ مستقیم — خضرِ رہ بنتا ہے ہر غولِ بیاباں اندنوں

اپنے اُشتر کو یہ کیا لیجائے گا سوئے حجاز — مست خود ہے بینڈ کی گت پر حُدی خواں اندنوں

بڑھ رہا ہے کفرِ زلفِ علت و معلول کا — حسنِ فطرت ہے حجابِ روئے تاباں اندنوں

شارحِ دیوانِ ہستی ہے قیاسِ مغربی — ہے ازل بھی تجربوں کے زیرِ فرماں اندنوں

ہمکو دیجاتی ہے ترغیبِ خفیف الحرکتی — یوزنا سمجھا گیا ہے جدِّ انساں اندنوں

یاد کرتا ہے گذشتہ با اثر لاحول کو — شیخ کو طعنے دیا کرتا ہے شیطاں اندنوں

کفر نے سائنس کے پردے میں پھیلائے ہیں پاؤں — ننگے زباں ہے بزمِ دل میں شمعِ ایماں دنوں

صورتِ امروز میں ہے گم نگاہِ ناتواں — نقشِ فردا چشمِ باطن سے ہے پنہاں اندنوں

زندگانی کی چمک سے دیدۂ عبرت ہے بند — کم نظر ہے جانبِ گورِ غریباں اندنوں

ہے ایوولیوشن بس اک تفسیرِ رب العالمین — کاش اس نکتے سے واقف ہوں مسلماں اندنوں

من علیہا فان ہی پر ختم ہے قولِ فٹسٹ — کیوں عبث برپا ہے اتنا شورِ طفلاں اندنوں

ہیں ترے ہی واسطے اکبر یہ ساری شعبدے — دیکھ تو اُٹھکے یہاں مذہب کا ساماں اندنوں

ہیں مشاغل محفلِ احباب کے ناگفتہ بہ — مسئلۂ ارتقا، بقائے بہترین

دم بخود بیٹھا ہے اکبر سا سخنداں اندنوں

یادِ رشید

موت محبت کو فنا نہیں کر سکتی۔ عبد الرشید چشتی مرحوم کو مرے پانچ برس ہونے آئے۔ مرحوم کے حلقۂ احباب میں کئی اہلِ سخن تھے۔ سب اپنے اپنے انداز میں دلی رنج کا اظہار کر چکے ہیں۔ نیرنگ نے مرحوم کی قبر کو دیکھکر نالۂ موزوں کھینچا۔ صادق نے اس صدمۂ جانکاہ پر اپنی فریادِ دلخراش بلند کی۔ اس اچانک صدمے نے اعجاز

کو آجتک دم بخود رکھا - مگر دل کی بھڑاس کب تک رکی رہتی - جذباتِ دل
زبان تک آئے بغیر نہ رہے - غم واندوہ دبی آگ کی طرح آہستہ آہستہ سلگتا رہا - آخر
مندرجہ ذیل نظم میں ایک شعلہ فغاں بن کر بھڑک اٹھا - (نیرنگ)

نہ رہجائے کوئی رنج والم کی داستاں باقی
ابھی تو ہے دلِ پُر درد میں تابِ فغاں باقی

نفس کی آمد و شد مد و جزر دردِ فرقت ہے
یہ تن میں جان باقی ہے کہ یادِ رفتگاں باقی

کسیدکا کاروانِ زیست مدت کا عدم پہنچا
نگاہِ شوق میں ابتک ہے گردِ کارواں باقی

عدم کے جانیوالو ہم تو فرقت میں تڑپتے ہیں
بتاؤ تمکو بھی ہے الفتِ پس ماندگاں باقی

رشید با وفا تم تو سراپا مہر و الفت تھے
دکھاؤ گے اگر دیرینہ الفت کا نشاں باقی

کہو کچھ اپنی اور میری سنو - یہ نامناسب ہے
حجابِ خامشی ہو دوستوں کے درمیاں باقی

تمہیں شبنم صفت تھا عشق اک خورشیدِ انور کا[۵۱]
کہو محبوب سے ابتو نہیں فرقِ مکاں باقی

نوازش[۵۲] ہاے ہمدم کو بہت تم یاد کرتے تھے
کہو ابتو نہیں ہیں ہجر کی بپتا بیاں باقی

لو ابتو آملا تم سے تمہارا ہم جماعت[۵۳] بھی
رہیگی اب ولایت کی نہ کوئی داستاں باقی

ہوئے تھے چارہ گر عاجز وہ کیسی شدت تپ تھی
نہ چھوڑا جسنے تم میں ایک مشتِ استخواں باقی

گھلا ڈالا - جلا ڈالا - جواں مٹا مٹا ڈالا
مٹا ڈالا نہ رکھا اتحادِ جسم و جاں باقی

یقیں ہے امن میں ہو اب عناصر کی کشاکش سے
نہیں امراض کی تکلیف کوئی میہماں باقی

ذرا اعجاز سے پوچھو کہ اس پر کیا گذرتی ہے
نہ اسکا کوئی ہمدم ہے نہ کوئی ہمزباں باقی

---

۵۱ سید خورشید انور بی - اے مرحوم - رشید مرحوم کے استاد تھے جنسے مرحوم کو خاص انس تھا
اُن کی طرف اشارہ ہے -

۵۲ نوازش علیخاں مرحوم رشید مرحوم کے دوست تھے - مرحوم سے پہلے انتقال کر گئے تھے -

۵۳ مسٹر شنکر ناتھ ایم اے بیرسٹرایٹ لا مرحوم کی طرف اشارہ ہے -

وطن میں ہو وطن ہو۔ کچھ عجب بے یار و بیکس ہے کوئی غمخوار باقی ہے نہ یار مہرباں باقی

متاعِ صبر و ہمت پہلی منزل میں لٹا بیٹھے کرے طے راہِ ہستی اتنی طاقت اب کہاں باقی

تلاشِ کارواں میں یکہ و تنہا ہے سرگرداں تسلّی کو ہے اک داغِ فراقِ ہمرہاں باقی

تمہارے بعد اس مہجور کو کیا لطف جینے میں بہارِ زیست آخر ہو گئی۔ اب ہے خزاں باقی

تمہارا خاص شیوہ دردمندی رہنمائی تھا یہ جوہر روح کے ہیں۔ تم میں ہونگے بیگماں باقی

عدم کا راستہ دیکھا ہوا ہے پہلے آئے ہو پھر آ جاؤ کہ ہے کرنیکو کار یک جہاں باقی

تمہارے منتظر ہیں باپ، ماں بھائی بہن سارے تمہیں کبتک رہیگا شوقِ گلگشتِ جناں باقی

تمہیں کہتا ہے مردہ کون تم زندوں کے زندہ ہو

تمہاری نیکیاں زندہ۔ تمہاری خوبیاں باقی

اعجاز

خدا کی امانت

یہ بھی خبر ہے او غمِ دنیا کے دوں تجھے سر اپنا لاکھ پیٹ مگر دل نہ دوں تجھے

دل جانتا ہے صورتِ صیدِ زبوں تجھے ورنہ میں دل کے نام پہ قرباں کروں تجھے

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

او قاصدِ شباب! نہ لا نا پیامِ عشق چھاتی دہل گئی ہے یہاں سنکے نامِ عشق

ہو جاؤں یونہی تو جان سے دل سے غلامِ عشق ممکن ہے بھول جاؤں کہیں پی کر جامِ عشق

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

او حسنِ فتنہ ساز تجھے دیکھتا تو ہوں ہے مثلِ سحرِ سامری بیشک ترا فسوں

بہتر ہے تیرے عشوہ و فتنے نا آشنا رہوں تو لاکھ عشوہ باز ہو پر دل تجھے نہ دوں

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

مجنوں کا دل ہے خواہشِ لیلیٰ کیواسطے وامق کا دل ہے دامنِ عذرا کیواسطے
بلبل کا دل بنا گُلِ رعنا کے واسطے پھر دل مرا ہے کسکی تمنّا کے واسطے

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

پنہاں اسی میں راز ہیں کچھ راز دار کے لایا تھا ساتھ عرشِ بریں سے اُتار کے
دامن میں پھول کچھ ہیں کہیں کی بہار کی پہلو میں کچھ ہیں داغ کسی لالہ زار کے

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

کتنے ہی اسکے چاہنے والے ہیں تاک میں دم کر رکھا ہے نفسِ ستمگر نے ناک میں
مل جائے آہ آہ مرا دل نہ خاک میں کیا چیز لیکے جاؤنگا درگاہِ پاک میں

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

صیّادِ نفس! طائرِ دل سے ذرا پرے! کمبخت اپنے جال کو جا کر بچھا پرے
دانا ہے، کب فریب میں آتا ہے جا پرے مکّار جا کے مکر کے دانے گرا پرے

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

کس کام کا یہ دل ہے جو ناپاک ہو گیا ناچیز ہو گیا خس و خاشاک ہو گیا
دل گر مرید راندۂ افلاک ہو گیا آلودۂ گناہ تہِ خاک ہو گیا

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

تلوک چند محروم

غلامِ نیک انجام

کھیت میں اک غلام سوتا ہے　　اک اسیرِ دوام سوتا ہے
ہے پڑا پاس اناج کا گٹھا　　جسکو ہے اسنے کاٹ کر رکھا
ہی درانتی کہ ہاتھ میں خنجر　　سینہ عریاں ہے یا ہی کوئی سپر
گرد آلودہ خاطرِ مرغول　　جسپہ کثرت سے جم گئی ہی دھول
دیکھتا ہی وطن کو خواب میں وہ　　اپنی سب مردہ زنکو خواب میں وہ
ناگہاں دیکھتا ہی اک میداں　　جسمیں دریا ہی ایک سمت رواں
آہ اُسکی وہ خوشنما موجیں　　دلفریب اور دلربا موجیں
دیکھکر بحر کا اُتار چڑھاؤ　　دلمیں آتی ہیں اسکے سو سو چاؤ
اُسپہ سایہ ہی نخلِ خرما کا　　جانتا ہی اُسے وہ بالِ ہما
شانِ شاہی سی آرہا ہے وہ　　بادشاہ بنکے جا رہا ہے وہ
سامنے ہے پہاڑ کا منظر　　دلکشا اور خوشنما منظر
قافلے جو اُتر کے آتے ہیں　　مژدۂ غم رُبا سُناتے ہیں
گدگداتا ہے دل کو شورِ درا　　روح کو بھا رہی ہی اسکی صدا
دیکھتا ہی کہ اُسکے سب بچّے　　گرد اُسکے ہیں حلقہ باندھی ہوئے
اُسکی گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے　　ہاتھ سی اُسکا سر [illegible] لیے ہوئے
چومتے ہیں وہ اُسکے مُنہ کو تمام　　یہ کوئی بادشاہ ہے کہ غلام
اُسکی خوابیدہ آنکھ سی نکلا　　ریت پر اشکِ حسرت اُمڈ گرا
دیکھتا ہے کہ گھوڑا دوڑا کے　　جا رہا ہوں کنارے دریا کے

ہر قدم پر نیامِ تیغِ دودم　　پہلوی اسپ چھو رہا ہے بہم
دے رہا ہے عجیب اک آواز　　ہے یہ آواز یا ہے نغمۂ ساز
آہ نکلا ہی اب شکار کو وہ　　چھوڑ کر گھر کے کاروبار کو وہ
آگے آگے پرند سربہ ہوا　　اُنکے پیچھے یہ گرد اُڑاتا ہوا
دور اب گھر سے وہ نکل آیا　　شامِ غربت کا ہی سماں چھایا
ایلو وہ رات ہوگئی ہے رات　　تیرہ شب میں وہ گھر گیا ہیہات
شیر اور گرگ کی مہیب آواز　　پردۂ گوش کو ہے گوناساز
دلمیں پر کچھ نہیں ہراس اُسکو　　ڈر پھٹکتا نہیں ہے پاس اُسکے
خوف کرتا کہاں ہی گھر دل میں　　ایک ذرہ نہیں ہے ڈر دلمیں
مل گئی اُسکو ان نظاروں میں　　دشت و صحرا کی خارزاروں میں
دولتِ سازگارِ آزادی　　ثروتِ پائدارِ آزادی
پتّے پتّے سے آرہی ہے صدا　　پیاری آزادی دردِ دلکی دوا
ہوکے اس خوشخبر سی وہ آگاہ　　شور و غل سی جاگ اُٹھا ناگاہ
جاگنا یہ مگر تھا خوابِ عدم　　عینِ شادی میں ہوگیا ماتم
سو رہا تھا پڑا ابھی جو یہاں　　ہائے افسوس وہ غلام کہاں
اسکو اب رعب داب کا کیا غم　　گرمیِ آفتاب کا کیا غم
تنِ خاکی کی آہنی زنجیر　　توڑ کر اُڑ گیا پرندِ اسیر
جسمِ خاکی کو کر گیا برباد　　ہوگیا بندۂ خدا آزاد

شہاب

شمع اور پروانہ

مستورات کے مشہور اور مقبول اخبار "تہذیب نسواں" کی اڈیٹر صاحبہ نے یہ نظم ہمیں مخزن میں درج کرنیکے لئے ارسال فرمائی ہے۔ ہم اس عنایت کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ یہ اُن کی آخری علمی امداد نہوگی۔

شمع سوزاں ایک محفل میں تھی ایسی جل رہی
ہر طرف پھیلی تھی جس کی جگمگاتی روشنی

دیکھتا تھا اِک پتنگا شوق سے اسکی بہار
دل ہی دل میں کر رہا تھا جان وہ اپنی نثار

لو لگا رکھی تھی اس نے اپنی دلمیں شمع پر
کہ رہا تھا صدقہ اور قرباں جاؤں میں ترے

حق نے بخشی ہے تجھے کیا روشنی اور آب و تاب
ہیچ ہیں بس تیرے آگے آفتاب و ماہتاب

اتنے میں اِک مکھی آئی بھنبھناتی اسکے پاس
اور یوں کہنے لگی تو ٹھیک کر اپنے حواس

اے پتنگے کسپہ شیدا کسپہ دیوانہ ہے تو؟
شمع سوزاں ہے یہ غافل جسکا پروانہ ہے تو

یہ جلا دیگی تجھے گر پاس اِسکے جائے گا
جل کے مرجائیگا ناداں کچھ تو پچھتائیگا

سُن کے پروانہ یہ بولا ہے غلط تیرا کہا
ہے یہ ناممکن کہ مجھکو پھونک دے یہ خوشنما

بولی مکھی خوشنما بیشک ہے اسمیں شک نہیں
پھونک دیتی ہے مگر ہر ایک کو یہ کر یقیں

میں بھی نادانی سے اِسکے پاس خوش ہو کر گئی
جل ہی جاتی سوز سے۔ باقی تھی لیکن زندگی

طعن سے اسکو دیا پروانے نے پھر یہ جواب
آپ جو کچھ کہ رہی ہیں۔ ہے غلط یہ اجتناب

ایسی اچھی روشنی نقصان دے سکتی نہیں
مجھکو آئیگا نہیں بن امتحاں ہرگز یقیں

مکھی بولی دیکھ غافل اچھی صورت پر نہ جا
ظاہری صورت میں اکثر پائی جاتی ہے دغا

پر یقیں آیا نہ پروانے کو اسکی بات کا
شمع کی جانب لے شوق اسکا آخر لیگیا

جوں ہی پہنچا پاس اسکے جل گئے سب اُسکے پر
مُردہ سا نیچے گرا وہ سوختہ تن آن کر

شمع کے شیدا نے دیدی جاں تڑپ کر خاک پر شمع بھی رویا کی نادانی پہ اس کی رات بھر

مان لو تم ناصح مشفق کا کہنا مان لو

اپنی ہٹ دھرمی سے تم نقصان اپنا مت کرو

اڈیٹر تہذیب نسواں

پیام شام

ہوا جب رنگ پھیکا روئے خورشید درخشاں کا تو حسرت سے لگا مُنہ دیکھنے مہتاب تاباں کا

عروس شام نے آکر دیا پیغام راحت کا ہوا فرط خوشی میں ہر طرف ساماں چراغاں کا

نوید مرگ دی پروانۂ پژمردہ خاطر کو دکھایا شمع محفل کو کرشمہ سوز پنہاں کا

بٹھایا کرمک شب تاب کو پھولوں کی محفل میں جمایا رنگ بزم نوجوانان گلستاں کا

چھپایا دیدۂ صیاد سے مرغ خوش الحاں کو دیا مژدہ گلوں کو خوں کیا گلچیں کے ارماں کا

نکالا وحشیاں دگر گذر بیٔے کو نیستاں سے کیا سردار آہو کو ختن کے سبز میداں کا

صدا دی جاکے یوں خلوت گہ مرغان عیسیٰ میں اُجالا کر دیا ہے مُنہ چھپا کر مہر تاباں کا

ڈرایا قافلے والوں کو یوں صحرائے غربت میں ہلایا پھر رہا ہے ہر طرف غول بیاباں کا

چلایا دیدۂ بیدار کو دار وئے بیہوشی اٹھایا پردۂ رنگیں در خواب پریشاں کا

مسافر کو سلایا بستر سبزہ پہ یہ کہہ کر نگہبان دو عالم نام ہے تیرے نگہباں کا

لٹایا بستر آرام پر سجیدہ لامیں لیں اٹھایا پھر نہ سر تا صبح صادق اسنو دہقاں کا

ہوا کا بھر دیا آوازۂ ناقوس سے دامن بچھایا صحن مسجد میں مصلیٰ نور ایماں کا

مخاطب یوں ہوئی ناصر سرائے دنیا کی سودائی نشیمن روشن تری آنکھوں پیغام تصور زنداں کا

تو محصور طلسم ہستی موہوم ہے ناداں دکھاؤں آ میں نظارہ تجھے شہر خموشاں کا

یہ وہ دنیا ہے جسکی روشنی ہے میری تاریکی اسی گوشہ میں پوشیدہ ہے چشمہ آبِ حیوانکا
وطن سے جانے والے سب اسی منزل میں پہنچے ہیں
مسافر منتظر رہتا نہیں ہے صبح خنداں کا

ظفر الدین ناصر

تضمین

(برغزل حضرت بیان یزدانی مرحوم)

دلِ بیتاب کو سینے سے لگالے آجا کہ سنبھلتا نہیں کمبخت سنبھالے آجا
پاؤں ہیں طولِ شبِ غم نے نکالے آجا خواب میں زلف کو مکھڑے سے ہٹالے آجا
بے نقاب آج تو اے گیسوؤں والے آجا

صورتِ سایہ ہوں افتادہ اُٹھالے آجا ایڑیاں خستہ ہیں اور زخم ہیں چھالے آجا
خارِ صحرا میں زباں ہیں نکالے آجا بیکسی پر مری خوں روتے ہیں چھالے آجا
راہ میں چھوڑ گئے قافلے والے آجا

نہیں خورشید کو ملتا ترے سائے کا پتا کہ بنا نورِ ازل سے ہے سراپا تیرا
اللہ اللہ تری چاند سے مکھڑے کی ضیا کون ہے ماہِ عرب کون ہے محبوبِ خدا
اے دو عالم کے حسینوں سے نرالے آجا

اے مسیحا ترے بیمار نے کیا رکھا ہے رختِ ہستی ترے کوچے سے اُٹھا رکھا ہے
تیری فرقت میں وصال اُنکا بہار رکھا ہے دم تری دید کو آنکھوں میں لگا رکھا ہے
لے سہارے ہیں ترے بیمار سنبھالے آجا

دل ہی دل میں مرے ارمان گھلے جاتے ہیں
خاک پر گر کے مرے اشک رلے جاتے ہیں
میری رسوائی پہ کمبخت تلے جاتے ہیں
ہوں سیہ کار۔ مرے عیب کھلے جاتے ہیں

کملی والے مجھے کملی میں چھپا لے آ جا

ہائے! واماندگیِ وسعتِ دامانِ صراط
المدد! المدد! اے خضرِ بیابانِ صراط
ہر قدم پر نگہِ یاس سی یارانِ صراط
دیکھتے ہیں تجھے پھر پھر کے ضعیفانِ صراط

ڈگمگاتے ہیں قدم۔ کون سنبھالے آ جا

کان میں کچھ جو بصد عذر نزاکت نے کہا
"مرحبا" بڑھ کے اُدھر شاہدِ وحدت نے کہا
آ! بلائیں تری لوں جوشِ محبت نے کہا
پہونچا محبوب تو مشاطۂ رحمت نے کہا

خلوتِ راز میں اے ناز کے پالے آ جا

تیرے دیوانوں کو زنجیرِ طلائی بخشی
جوہرِ آئینۂ دل کو صفائی بخشی
بادشاہوں کو ترے در کی گدائی بخشی
ہم نے خوش ہو کے تجھے ساری خدائی بخشی

اپنے بندوں کو کیا تیرے حوالے آ جا

بھینی بھینی گلِ توحید کی نگہت ہے یہاں
واہ کیا رنگ ہم آہنگیِ صحبت ہے یہاں
ابرِ رحمت ہے یہاں بوئے محبت ہے یہاں
رنگِ وحدت ہے یہاں غنچۂ خلوت ہے یہاں

اے گلِ گلشنِ "لولاک لما"! اے آ جا

آبگینہ ہے مئے دردِ نہاں کا سینہ
یا زمانہ ہے کوئی سوزِ فغاں کا سینہ
تختۂ گل ہے ترے سوختہ جاں کا سینہ
صورتِ لالہ ہے پر داغ بتاں کا سینہ

پڑ رہے ہیں ترے بیمار کے لالے! آ جا

سرور جہان آبادی

نوحۂ نواب محسن الملک مرحوم

جستجو میں تیری ہیں واماندگانِ کارواں
او عدم کو جانیوالے تیری منزل ہے کہاں

تیرے نظارے کو ہے چشمِ تماشا بیقرار
تو کہاں ہے پردہ دارِ خلوتِ رازِ نہاں

آہ! ویرانے میں ہے اب اے گلِ دستارِ قوم!
لالۂ خونیں کفن تیری بہارِ بیخزاں

ہے دُرِ نایاب تو اے قطرۂ بارانِ فیض
ابرِ رحمت اب ہے تیری خاک پر گوہر فشاں

ظلمتِ غم چھا گئی اوجِ سپہرِ قوم پر
تیرا جلوہ ہو گیا آہ! آنکھوں سے نہاں

سر کو سودا ہے ترے طوفِ مزارِ پاک کا
دل کو حسرت ہے کہ رہیئے آہ! چلکر پاسباں

موجِ تحریکِ فغاں سینے سے ہے رخصت طلب
تیرے پھولوں میں رہے بنکر شمیمِ بوستاں

لوحِ محفوظِ محبت ہے تری لوحِ مزار
تیرا تعویذِ لحد ہے مرنیوالے! حرزِ جاں

قوم ہے حرماں نصیب اک پُر ترحم کی نگاہ
آہ! او محوِ سکوتِ لذتِ خوابِ گراں

اٹھ گیا تو ہائے کیا او قافلہ سالارِ قوم
آ رہی ہے دل سے آوازِ درائے کارواں

چارہ سازِ دردِ دل۔ بخیہ گرِ زخمِ جگر
کس پہ ٹوٹا ہائے تو اے دستِ مرگِ ناگہاں

قوم کی حالت پہ ہے اب بھی تاسّف کی نظر
سونیوالے! خوابِ راحت تیری آنکھوں میں کہاں

اب بھی حبِ قوم میں ہے نالہ کش زیرِ مزار
اٹھ رہا ہے روزنِ مرقد سے آہوں کا دھواں

اب بھی ہے تصویرِ غم تو اے گلِ خونیں جگر
تیرے پہلو میں شگفتہ اب بھی ہیں داغِ نہاں

تیرے نالوں میں وہی اب بھی غم افزا ہے اثر
خوں رلاتا ہے تمنا کو ترا رنگِ فغاں

قوم کے دردِ محبت کی خلش اے فخرِ قوم
تیرے پہلو میں چبھوتی اب بھی ہے نوکِ سناں

مرنیوالے! دردرس اب بھی یتیموں کا ہے تو
لے رہی ہیں انکی آہیں تیرے دل میں چٹکیاں

انکے نالے ہیں کلیجے میں گزرتے بنکے تیر
اب بھی آنکھیں ہیں تری بیوؤں کے غم میں خونفشاں

آرزو ہے کاش! کرلوں اور خدمت قوم کی
عمر رفتہ بھیجدے اے دستِ مرگِ ناگہاں

آرہی ہے تیری تربت سے صدائے دردناک
مجھپہ ڈہایا یہ ستم کیا اے زمین آسماں

خدمتِ کالج سے مجھکو کردیا محروم آہ!
مجھسے کیا ایسی عداوت تھی نصیبِ دشمناں

خاک اُڑا سر پر کہ اب ای قوم کے دارالعلوم
گنج مرقد میں نہاں ہے تیرا گنج شائگاں

حشر تک تیرے کلیجے سی نہ جائیگا یہ داغ
تجھپہ لہرائیگا صدیوں آہ! ماتم کا نشاں

نالہ کر! فریاد کر! اے قوم! ای حرماں نصیب!
ایسا محسن اب ملے تجھکو یہ قسمت ہے کہاں

دستِ شفقت کون رکھیگا جگر پر اب ترے
اُٹھتے جاتے ہیں جہاں سے آہ محسن سب ترے

سرور جہان آبادی

تازہ غزلیں

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دیکے بہلایا گیا ہوں

نہیں اُٹھتے قدم کیوں جانبِ دیر
کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں

ستایا آکے پہروں آرزو نے
جو دم بھر آپ میں پایا گیا ہوں

نہ تھا میں معتقد اعجازِ مے کا
بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں

دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم
میں آپ آیا نہیں لایا گیا ہوں

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں

کجا میں اور کجا اے شادؔ دنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

تیری مرضی کا یہ دل پیماں شکن ہو جائیگا — چارۂ تمکینِ خوگرِ رنج و محن ہو جائے گا
دیکھ لینا جس طرف وہ گلبدن ہو جائیگا — دو گھڑی میں کچھ سے کچھ رنگِ چمن ہو جائیگا
روزِ محشر یہ ترا سچا دہن ہو جائیگا — میرا تیرا ایک اندازِ سخن ہو جائیگا
یہ عنایت گر رہی مجھ پر تری آشوب دہر — خون کا پیاسا مرے چرخِ کہن ہو جائیگا
گر نہ کوثر کی ملی زاہد تجھے اک بوند بھی — نشۂ زہد و ورع سارا ہرن ہو جائیگا
مان جا ہرگز نہ جا تو بہرِ گلگشتِ چمن — گل جلیں گے تیری سر خونِ چمن ہو جائیگا
رازِ الفت خامشی سے چھپ نہیں سکتا مدام — اک نہ اک دن ہمنشیں کو سوءِ ظن ہو جائیگا
تیرے باغِ حسن میں بھی آئی جاتی ہے بہار — سرو قامت بن چکا غنچہ دہن ہو جائیگا
وہ نہ آئیگا تصور اسکا آئے گا ضرور — بزمِ خلوت میں کوئی گل پیرہن ہو جائیگا
پیشِ دارو آنکھ کے ایما سے گر روکا مجھے — حلقۂ چشمِ سیہ مہرِ دہن ہو جائیگا
اشکِ گلگوں گر یونہیں جاری رہے مرنے کے بعد — دامنِ تر کی طرح خونیں کفن ہو جائیگا
زخم دل میں جا رہے پیکانِ ناوک جاگزیں — بے زباں پر کیونکر اطلاقِ دہن ہو جائیگا
خوگرِ بیداد کی ہے یہ گذارش آپ سے — خشک دو اک روز میں زخمِ کہن ہو جائیگا
خم اگر پی جاؤنگا ساقی نہو گا کچھ اثر — اپنی جھوٹی دے ذرا سی دل مگن ہو جائیگا
تن گئی ہے بیطرح غنچہ سے اوسکی باغ میں — اسکا یا اسکا کوئی بیدا دہن ہو جائیگا
تو نہ آئے گا شبِ وعدہ نکلجائیگا دم — اور کیا اسکے سوا پیماں شکن ہو جائیگا
جس طرح سے تو ستاتا ہے مجھے او پُر فریب — غیر سے بھی اسطرح پیماں شکن ہو جائیگا
دل سے بھی باتیں کیا کرتا ہوں ڈر ڈر کر مدام — لگ گئی اسکو بھنک تو سوءِ ظن ہو جائیگا

کم سنی کی قید سے نکلو ذرا آزاد ہو! — جانشینِ تیغ و خنجر بانکپن ہو جائیگا
دل کی جانب دیکھ لے بیٹھی نظر سے مان جا — مجھ پہ احساں تیرا اے ناوک فگن ہو جائیگا
آنکھ سے اسکی ملا کر آنکھ کیونکر بات ہو — دل پر افسونِ نگاہِ سحر فن ہو جائیگا

جب نہ مانا میں تو بولی جلکے یوں خاکِ وطن
آپ کے جاتے ہی بس کیا سُونا وطن ہو جائیگا

چار دن کی زندگی پر ہو نہ نازاں منعموں
کیا بنے گی جب فراقِ روح و تن ہو جائیگا

میرے دامن سے یہی کہتی ہے چشمِ اشکبار
یا عدن بنجائیگا یا تو یمن ہو جائے گا

زندگی دو بھر ہے اب عاشق کو تیری بعد مرگ
دیکھ لیجو لاش پر بھاری کفن ہو جائیگا

تیرے دیوانہ کا جیتے جی رہا گر یہ لباس
جامۂ عریاں تنی آخر کفن ہو جائیگا

بیستونِ نقشِ شیریں انگشت منقوش ہیں
کیا ہوا گر اک نشانِ کوہکن ہو جائیگا

گر یہی سوزِ نہانی ہے تو قبل از وقتِ مرگ
جلکے خاکستر ہمارا تن بدن ہو جائیگا

عاشقی کا پھل یہی ہے کہہ رہا ہوں شوق سے
تن پہ جو ناوک لگیگا جزوِ تن ہو جائیگا

فصلِ گل آنے تو دو پھر بات ساری کے ساتھ
بلبلستاں مسکنِ زاغ و زغن ہو جائیگا

عشق میں ترکِ وطن ترکِ وطن ہرگز نہیں
کوچۂ دلدار عاشق کا وطن ہو جائیگا

ضعف کی جانب بھی دیکھو شوق کو جلد آور
راہبر سمجھی ہو جسکو راہزن ہو جائیگا

میری غیبت میں کہا کرتے ہیں یارانِ وطن
کیا خبر تھی سائلؔ آوارہ وطن ہو جائیگا

جو ادا بھائی تھی دل کو بھا گئی
جس پہ آئی تھی طبیعت آ گئی

بانکپن نے لیں جگر میں چٹکیاں
سادگی دل کو اک تڑپا گئی

شکل بھولی باتیں میٹھی چھب غضب
ہر ادا اُس نازنیں کی بھا گئی

بانکپن دیکھے حسینوں کے بہت
سادگی اُسکی قیامت ڈھا گئی

لیسے ہرجائی نہیں اہلِ وفا
آ گئی جس پر طبیعت آ گئی

تم تھے پہلو میں تو تھا دل کو قرار
تم گئے اور یاں قیامت آ گئی

دعوئے خونِ وفا کس نے کیا
وہ نگہ محشر میں کیوں شرما گئی

ہم تو پہلے ہی شہید ناز تھے — تیغ قاتل کس لئے اترا گئی

اس قدر نیرنگ فرقت کا اثر

مُردنی چہرے پہ تیرے چھا گئی

جناب سید عبد العلیم صاحب شرر (سکندر آبادی) جناب ظہیر دہلوی یادگار حضرت ذوق مرحوم و مغفور کی یہ غزل ارسال فرماتے ہیں اور آئندہ بھی کلام بھیجنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

مجرم الفت کی جب تعزیر آدھی رہ گئی — آرزو سے کیا جرأت تقصیر آدھی رہ گئی

ہو سکے پوری وصل کی تدبیر آدھی رہ گئی — بنتے بنتے پھر مری تقدیر آدھی رہ گئی

نالۂ شبگیر میں تاثیر آدھی رہ گئی — آبروئے عاشق دلگیر آدھی رہ گئی

سجدہ ریزی میں ہتوں کی گھس گئی اپنی جبیں — سرنوشت کاتب تقدیر آدھی رہ گئی

عالم غربت میں ہمنے خاک چھانی اسقدر — پھرتے پھرتے گردش تقدیر آدھی رہ گئی

جوش وحشت کا ہمارے کچھ نہ درماں ہو سکا — ناصح ناداں کی سب تدبیر آدھی رہ گئی

اے ظالم تیری شوخی اُف ترا انداز ناز — کھنچتے کھنچتے ناز سے تصویر آدھی رہ گئی

کر دیا اپنا سا صورت گر کو اُسکے ناز نے — ہاتھ سے آدھی کھنچی تصویر آدھی رہ گئی

دمبدم تغیر حالت اسقدر ہے ضعف سے — کھنچتے کھنچتے تک مری تصویر آدھی رہ گئی

وہ تصور میں بھی پورا ناز سے آتا نہیں — جب کھنچی آدھی کھنچی تصویر آدھی رہ گئی

تیری گھبراہٹ نے قاصد جان ہی مارا مجھے — سرگذشت آدھی ہوئی تحریر آدھی رہ گئی

چاندنی میں جب ہوئے وہ جلوہ فرما بے نقاب — آسماں پر چاند کی تنویر آدھی رہ گئی

رہ گئی اسکو اُٹھکے اس جانب نگاہ شرمگیں — قتل پر آدھی کھنچی شمشیر آدھی رہ گئی

داغ کہ ہے تیرے ستم کی جب سے اوکا فرادا — شہرت جور سپہر پیر آدھی رہ گئی

تیرے دیوانے کی ہیں زنداں میں وہ پاکوبیاں — گھستے گھستے پاؤں کی زنجیر آدھی رہ گئی

بزمِ دشمن میں اُٹھا وہ نیم قد تعظیم کو
اب ہماری عزت و توقیر آدھی رہگئی

تیرے دیوانے نے جسدم خاک اُڑائی دو گھڑی
وہ زمیں اُڑ اُڑ کے سو سو تیر آدھی رہگئی

رات آدھی ڈھل چکی ہے نصف سے ہے کم ابھی
اب اُمیدِ عاشقِ دلگیر آدھی رہگئی

بیٹھے ہیں وہ غیر سے زانو بھڑا کر بزم میں
کیا خدنگِ آہ کی تاثیر آدھی رہگئی

آجکل سب ہے نصف ہندی نصف انگریزی ظہیر
ابتو اُردو میں زبانِ میر آدھی رہگئی

خفا وہ تندخو ہے اور جنوں ہنستا ہے گردن پر
رگِ جاں جانکر رکھدی ہے نشتر تارِ دامن پر

نگاہیں تو ملا سکتے نہیں اُس چشمِ فتاں سے
مگر پڑتی ہیں اک عالم کی آنکھیں اُسکی جوبن پر

فدا دنیا کے غمزے ہر ادا پر اس ستمگر کی
ادائیں لاکھ قرباں اسکے اک بیساختہ پن پر

بہت سے بل نکالے آپ کی بانکی اداؤں نے
ہزاروں مر مٹے بانکے تمہاری چھیچھی چتون پر

یہ حسن و عشق کی نیرنگیاں ہیں آج ہی کیا کیا
گریبانِ زلیخا خندہ زن یوسف کے دامن پر

بنا مجھ سخت جانکو تختۂ مشقِ فنا قاتل
تو کرہر تیغ نو کی آزمائش میری گردن پر

نہ امید ہی موقع پرست اغیار سے رکھنا
نجا نا جانِ من ان ظالموں کی "مشفقِ من" پر

بنے کیونکر کہ دونو منچلے اترائیں ہیں کیا کیا
وہ اندازِ تلون پر۔ دل اندازِ طپیدن پر

سرِ شام آسماں پر کسکی سرخیِ شفق ہمدم؟
یہ میرے خون کا دھبہ ہے اس ظالم کے دامن پر

ہمیں ہے ناز اپنے پیارے ہندوستان پر شوکت
ہے ہندوستانکو اُردو پہ اور اُردو کو مخزن پر ناز

محمد رفیق ۔ شوکت (انسپکٹر ...)

تصحیح صفحہ ۲۵

سطر	غلط	صحیح	سطر	غلط	صحیح
۱۱	خبرین	جڑین	۱۲	بدگمانی کے اوپر	بدگمانی کے لئے موقع اوپر سے
۱۳	ہین	نہین	۱۷	نہ	+

ویلش اپکارک اوشدھالیہ ہیں دوا کی سریع التاثیری کے کتنے تجربے ہوچکے ہیں یا جاننا ہو فہرست طلب کر کے ملاحظہ فرماویں

یہ ممکن ہے کہ ایک ہی دوائی کل امراض کا حکمی علاج ہو۔ صرف ایک چھوٹی سی شیشی ہر وقت ہر بیماری پر برتی جا سکتی ہے فہرست منگواویں

ویلش اپکارک طبی اخبار ہندوستان بھر میں ایک ہی ہفتہ وار طبی اخبار ہے جو قریب قریب چھپتا ہے سب سے زیادہ ہے۔ "نمونہ مفت"

۲ کے سلسلہ میں ایک رسالہ ہر دوسرے مہینے نکلتا ہے ایسے طبی مضامین لکھے جاتے ہیں جن کے جاننے کی ہر شخص کو ضرورت ہے۔ فہرست منگواویں

ہم خط و کتابت سے علاج بھی کرتے ہیں۔ جو صاحب ہمارے پاس آ نہ سکیں ان کو حکیم صاحب سے مشورہ کرتے ہیں دوائی بھی اگر چاہیں تو مفت

امرت کی دھارا سچ مچ لاثانی دوائی ہے جو ایک دفعہ منگواتے ہیں ہمیشہ کے لئے اس کا اپنا یار بنا لیتا ہے

ہم ان کل امراض کا علاج خاص طور پر کرتے ہیں جو عام طور پر لاعلاج کہی جاتی ہیں مفصل حالات لکھے چاہئیں

ٹھاکر دت شرما وید مالک ویلش اپکارک اوشدھالیہ ایڈیٹر ویلش اپکارک طبی اخبار و مصنف رسائل طبی لاہور چوک متی

مخزن پبلشنگ ایجنسی کی مشہور کتابیں

رسوم دہلی [illegible] سلطانان

از تالیف مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ۔ اس کتاب کی خوبی کیلئے اسکے مؤلف کا نام ہی کافی ضمانت ہے۔ فرہنگ آصفیہ کے مرتب کرنے سے مولوی سید احمد صاحب نے جو احسان اردو زبان پر کیا ہے اسکی کافی داد نہیں دیجا سکتی۔ مولوی صاحب کی معلومات رسوم قدیمہ کے متعلق حیرت انگیز ہیں۔ اس کتاب میں مولوی صاحب نے بچہ کی پیدایش کی معلومات سے لیکر شادی اور میت کی تمام رسومات نہایت شرح و بسط سے لکھی ہیں۔ زبان عورتوں کی لکھی ہے جو اسقدر پیاری اور دلچسپ ہے کہ کتاب چھوڑنیکو دل نہیں چاہتا اور بے اختیار واہ منہ سے نکلتی ہے۔ مستورات کے لئے یہ کتاب زیادہ باعث دلچسپی ہے اور اسکا مطالعہ انکے لئے زیادہ مفید ہے۔

قیمت فی جلد ۱۲ر علاوہ محصولڈاک۔

مثنویات میر حسن

میر حسن کی مثنوی بےنظیر بدر منیر کا جو پایہ اردو زبان میں ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اور یہ بے بہا چیز جسطرح غلط شلط بُری بھلی چھپکر بازار میں ملتی ہے وہ اس قابل نہ تھی کہ باذوق اصحاب کی الماریوں کے لئے باعثِ زینت ہو۔ اسلئے ضروری تھا کہ سلیس اردو کے اس استاد کامل کی کتاب اچھے لباس اور صحت کے ساتھ چھپی ہوئی شایقین کے روبرو جلوہ گر ہو۔ چنانچہ یہ کوشش بارآور ہوئی اور بہت تلاش سے میر حسن کی دوسری غیر مطبوعہ مثنوی گلزار ارم بھی ایک مستند قلمی نسخے سے نقل کرکے شامل کردی ہے۔ اور ایک نہایت فاضلانہ اور بسیط دیباچہ جناب مولوی سید اشرف حسین صاحب بی اے۔ نے لکھکر اس مثنوی بےنظیر کی داد دی ہے۔ اور اسکی خوبیاں اور دیگر لطیف نکات جو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا نہایت خوبی اور قابلیت سے بیان کئے ہیں۔ قیمت عمہ علاوہ محصولڈاک۔

خواب ہستی

مصنفہ پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی۔ ایم اے۔ ایم اے او کالج علیگڈھ۔ ہم یقیناً عام بازاری مخرب اخلاق ناولوں کی اشاعت کے خلاف ہیں اسلئے آپ کو یہ یقین کرلینا چاہئے کہ بصورت اس احتیاط کے جو ناول ہمارے ہاں سے شایع ہوگا وہ کیسا ہوگا۔ خواب ہستی کہنے کو تو ناول ہے لیکن دراصل جدید طرز معاشرت کا سچا مرقع بلکہ رسم و رواج کا آئینہ طلبا کی تعلیمی خانگی اور خلوتی زندگی کا لب لباب ہے جس میں روزمرہ کے واقعات وکوائف کی ملتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں لائق مصنف نے ناول کے واقعات

دلکش پیرائے میں زندگی کے ایسے ایسے اہم مسائل بیان کئے ہیں کہ اس سے پیشتر کسی ناول نویس نے اس طرف توجہ نہ کی تھی اور اسی پیرایہ میں دکھایا ہے کہ مغربی تعلیم کا اثر ان نوجوانوں کی طبیعت پر کیا ہوتا ہے جو اپنے مذہب کی ضروری باتوں سے ناواقف رہتے ہیں۔

اس ناول میں اور بھی چند خوبیاں ایسی ہیں جو اسکو دوسرے ناولوں سے ممتاز کرتی ہیں ملک کے تمام اخبارات نے اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

اس ناول میں علاوہ لکھائی چھپائی کے نفیس ہونے کے فسانہ کے متعلق ہی تین ہاف ٹون تصویریں ہیں جو اس کتاب کی زینت کو دوبالا کرتی ہیں۔ حجم بھی دو ڈھائی سو صفحہ ہے۔ قیمت ۱۲؎ علاوہ محصولڈاک

یہ مخزن ایجنسی کا دوسرا ناول۔ رسالہ الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے۔ اس عجیب و غریب ناول میں قرون وسطی کی تدبیر ملک داری سلطنت بنی اُمیہ کی تباہی اور حکومت عباسیہ کی بنیاد کا حال مفصل بیان کیا ہے۔

ابومسلم۔ وہ نامور مسلمان پالیٹیشن اور بیل مدبر تھا جنے ایک صدی تک زور شور کے ساتھ حکمراں رہنے والے خاندان بنو اُمیہ کو غارت کرکے بنی عباس کی خلافت قائم کردی۔ افسوس ایسے نامور مدبر کی اُردو زبان میں کوئی مکمل سوانح عمری نہیں۔ جس سے اسکے اخلاق و عادات و تدبیر ملک داری کا پورا پتہ چل سکے۔

فاضل مصنف نے ابومسلم کی سوانح عمری حسن و عشق کے رنگ کے ساتھ اس غور و تعمق سے تحریر کی ہے کہ قرون وسطی کے حالات کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ ابومسلم کی چاہنے والی گلنار کی حسرت بھری داستان اس اندوہناک حسرت خیز قصے کی جان ہے۔

وہ وہ کیرکٹر اس ناول میں دکھائے گئے ہیں کہ مصنف کے فن ناول نویسی میں کمال کی داد دینی پڑتی ہے۔ مولوی محمد حلیم صاحب ردولوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمائش پر اسے عربی سے سلیس اُردو میں ایسی خوبی اور قابلیت سے ترجمہ کیا ہے کہ ترجمہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔

اسلامی تاریخ کے شیدائیو یہ ناول ضرور پڑھو۔ حجم چار سو صفحے کے قریب اور قیمت صرف ۱۲؎

ابومسلم خراسانی

ایک ہزار روپیہ نقد
قیمت پیکٹ کے علاوہ
ایل۔ ایم۔ ایس
پتہ: حکیم ڈاکٹر جوہر
امرتسر

فریڈرک اسٹرنس اینڈ کمپنی دواساز ان ڈیٹرائٹ امریکہ کی مشہور عام ادویہ

اسٹرنس ہیڈایک کیور

ہر قسم کیواسطے بلا ضرر زود اثر اور یقینی فائدہ رساں دوا نقلی مت خریدو صرف اسٹرنس کی اصلی ہے ۱۲ قرص ۱۲ر

اسٹرنس مینتھیلائڈس

کسی قسم کی اور کیسی ہی شانے کی بیماری ہو اسکے پینے سے دور ہو جاتا ہے۔ اس سے بہتر ان بیماریوں کے لئے کوئی ادویہ نہیں۔ آجتک کبھی ناکامیاب نہیں ہوئی بہترین ادویہ ۴۰ گولیوں کی شیشی عار

اسٹرنس زائیمول ٹوتھ پوڈر

دانتونکو سفید مسوڑونکو مضبوط اور خوش رنگ سانس کو نہایت ٹھنڈا اور شیریں بناتا ہے۔ اور دہن میں حیرت انگیز خوشبو پیدا کرتا ہے۔ ۱۲ر

اسٹرنس کارڈیل کیا ہے

یہ کاڈ مچھلی کے تازہ جگر کے تیل کا جوہر مفید ہے جس میں

پیپٹونیٹ آف آئرن معہ ہائپوفاسفائٹس آف کالسیم۔ سوڈیم۔ پوٹاسیم۔ میگانیز نشاستہ جو اور وائلڈ چیری جیسے مفید اور باثر اجزا شامل کئے گئے ہیں۔

اس جدید اور نفیس مرکب میں خاص کیمیاوی طور سے کشید کر کے کاڈ مچھلی کے تازہ جگر کا جوہر شامل ہے۔ روغنی بدبودار اجزا سے پاک۔ خوش ذائقہ اور بلاشک جملہ مروجہ مرکبات مقبولہ سے افضل و بہتر ہے۔ امراض صدر اور عام اور خاص کمزوری کے لئے نہایت مفید ہے۔ اب کسی مریض کو مناسب نہیں ہے کہ اس مرکب کے ہوتے دوسرے مچھلی کے تیل کے مرکبات استعمال کرے اس عجیب و غریب اور سب پر حاوی نسخہ میں سب کے مفید اثر موجود ہیں۔

اسٹرنس کاڈیل

(۱) کسی عطائی کا نسخہ نہیں ہے۔ (۲) دوران ساخت میں ہاتھ نہیں لگایا جاتا ہے

(۳) قیمت بہت گراں نہیں غریب امیر سب استعمال کر سکتے۔

(۴) کوئی شے جو مضر صحت یا کسی مذہب کے خلاف ہو نہیں ڈالی جاتی۔

گورنمنٹ امریکہ کے فوڈ اینڈ ڈرگس ایکٹ نمبر ۹۵۶ مورخہ ۳۰ جون ۱۹۰۶ء کے بموجب اس مرکب کے جملہ اجزا کی پاکیزگی اور نفاست کی ضمانت کی جاتی ہے۔

رسالہ رفیق مریضان جس میں ان اور دیگر ادویہ تیار کردہ فریڈرک اسٹرنس اینڈ کمپنی ڈیٹرائٹ ملک امریکہ کے مشرح حالات ہیں سنالمس ایڈورٹائزنگ ڈپو کشمیری دروازہ دہلی سے مفت اور بلا محصول طلب کرو

مخزن

ایڈیٹر شیخ عبد القادر
شیخ محمد اکرام

مارچ ۱۹۰۸ء
جلد ۱۴
نمبر ۶

اُردو علم و ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

تصویر عبد البہا عباس افندی
عبد البہا - شیخ عبد القادر
عازمان انگلستان کیلئے - شیخ عبد القادر ۶
مدرسہ کی یاد - منشی عنایت اللہ صاحب بی اے ۹
خمخانۂ جاوید - ایڈیٹر ۱۳
قانون آبادی - خواجہ لطیف احمد بی اے پانی پتی ۲۰
مریخ کیساتھ گفتگو - مولوی مقتدے خاں شروانی ۲۸
امن و خوشی - منشی نذر محمد بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس ۳۳
جزائر بحرین - سید ضامن کنتوری ۴۴
شہر حیدر آباد - مولوی سید شمس اللہ صاحب قادری ۴۸
لالۂ صحرا - منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی
حواس عشرہ - مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی
دنیا مطالب آشنا ہے - سید حسین دہلوی
گل نو دمیدہ - لالہ بالک رام شاد دیجوائی
غم فراق - خان احمد حسین خاں ابل
ایک سہ ہراگی - قاضی حمید الدین صاحب حمید
رباعیات - آزاد کا کوروی
شاکر میرٹھی
وضع زمانہ - نواب محمد عمر خاں صاحب وفا
بسمل دہلوی ....
شوق مشاعرہ
تازہ عرض نہیں ....

دس کروڑ ہندوستانی اُردو بولتے ہیں اور اسی قدر ہندوستانی اُردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اُردو مادری زبان ہے ◎ ان شہروں میں اُردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اُردو سمجھی جاتی ہے

باہتمام حاجی مظہر علیم مخزن پریس دہلی میں چھپکر شایع ہوا

قیمت سالانہ معہ محصول ڈاک قسط اول ۵ روپے فی پرچہ ۸ آنہ

عبدالبہا

حضرت عبدالبہا جن کی تصویر ہمیں بہت تلاش سے ملی ہے اور آج شایع کیجاتی
ہے۔ دنیا کے مشہور ترین آدمیوں میں ہیں۔ یہ تصویر اُن کی جوانی کی ہے۔ اور ایک
عرصہ ہوا لی گئی تھی۔ لیکن چونکہ غالباً اسکے بعد اور کوئی تصویر نہیں لی گئی۔ یہ بھی بہت
مغتنم ہے۔ یوں تو ہر نئے مذہب اور اسکی تاریخ کے بنانے والے کے حالات دلچسپی
سے پڑھے جاتے ہیں۔ مگر ایک ایسا نیا مذہب جس کی بنیاد ہمارے بزرگوں کے
دیکھتے دیکھتے پڑی ہو اور جس کی ساخت اب تک ہماری آنکھوں کے سامنے
جاری ہو معاصرین کے لئے خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ اُن مذاہب یا فرقوں میں جو
گزشتہ صدی میں پیدا ہوئے۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے وہ اہمیت حاصل ہے
جو اُس فرقے کو جسکے سرگروہ حضرت عبدالبہا ہیں۔ یہ وہی فرقہ ہے جو پہلے بابی کے
نام سے اُبھرا اور جس نے سرزمین ایران میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس کا بانی سید
علی محمد المعروف بہ "باب" تھا اور اس عرف کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو بعد

آنے والے ہادی کا "دروازہ" یعنے پیش خیمہ بتاتا تھا۔ اُس پر علماء ایران نے کفر کے فتوے دیئے اور وہ زندان میں بھیجدیا گیا اور آخر ۱۸۵۰ء میں اپنے مذہب کی اشاعت کے جرم میں مارا گیا۔ اُسکے غائبانہ مداحوں اور معتقدوں میں ایک نوجوان بہاءاللہ نامی تھا۔ "باب" کی وفات کے بعد اُسنے طہران میں اس نئے مذہب کی اشاعت شروع کر دی۔ حکومت نے اسے بھی قید کیا اور کچھ عرصے بعد جلاوطن کر کے بغداد کو روانہ کر دیا۔ جب بہاءاللہ کا اثر بغداد میں پھیلنے لگا تو علماء کے مشورے سے یہ انتظام کیا گیا کہ اسے مع اسکے بڑے بڑے ہمراہیوں کے قسطنطنیہ بھیجدیا جائے۔ بغداد سے رخصت ہوتے وقت اپریل ۱۸۶۲ء میں بہاءاللہ نے پہلے پہل اپنے خاص معتقدین کو یہ بتایا کہ میں وہی شخص ہوں جس کی بابت "باب" نے پیشین گوئی کی تھی۔ اور جسکے ظہور کے تم لوگ منتظر تھے۔ اُس دن سے بہاءاللہ کا اثر اور بھی ترقی کرنے لگا۔ اسلئے اس غریب الوطن جماعت کو قسطنطنیہ میں بھی چین لینا نہ ملا اور وہاں سے یہ لوگ آدرنہ کو منتقل ہوئے۔ آدرنہ میں ۱۸۶۸ء تک قیام رہا اور اسکے بعد وہ اکّہ کو روانہ کر دیئے گئے۔ جو آجتک اس فرقے کا صدر مقام ہے۔

بہاءاللہ نے جسدن سے اپنے "موعود" ہونے کا اظہار کیا۔ فرقۂ بابیہ میں دو جماعتیں ہوگئیں۔ جن میں ایک اُسکی قائل تھی اور ایک منکر۔ لیکن بابیوں کا گروہ کثیر اُسی کا طرفدار رہا اور اس گروہ نے اُس دن سے بجائے بابی کے بہائی نام اختیار کیا۔ اب بھی عام طور پر لوگوں میں یہ فرقہ بابی کے نام سے مشہور ہے۔ مگر خود یہ لوگ بہائی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ بہاءاللہ نے ۱۸۹۲ء میں رحلت کی اور اپنے معتقدین کو وصیت کر گیا کہ اسکے بعد اسکا بڑا بیٹا عباس آفندی جانشین ہو۔ اور اسے "من اراد اللہ" کا لقب دیا۔ یعنی جو اس منصب کے لئے خدا کے ارادے میں تھا۔ مگر عباس آفندی نے عقیدتمندی کے لحاظ سے "عبدالبہا" یعنی "بہار کا غلام" لقب اختیار کیا۔ آفندی

ممدوح اسی لقب سے مشہور ہیں۔ گو عراق میں عرب لوگ انہیں زیادہ تر عباس آفندی کے نام سے ہی جانتے ہیں۔

ہم فرقہ بابیہ اور اسکی بڑی شاخ فرقہ بہائیہ کے حالات کسی قدر بسط کے ساتھ پھر کسی موقعہ پر لکھیں گے۔ اس وقت فقط حضرت عبدالبہار کے احوال واقوال سے بحث مقصود ہے۔ کیونکہ وہ اب تک زندہ ہیں اور لوگ دور دور سے اُن کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ اور اُنکی تعلیم و تلقین سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ امریکا میں انکا اثر روز بروز ترقی پر ہے۔ امریکا والے دہریت سے پریشان ہوکر روحانیت میں پناہ گزیں ہونا چاہتے ہیں۔ اور اکثر متلاشی مذہب ہیں۔ اسلئے ہر نئے مذہب کا ایک خاص اثر اُنپر پڑتا ہے۔ اور اسی لئے حضرت عبدالبہار کے مریدوں کو جو اشاعت مذہب کی غرض سے امریکا گئے ہوئے ہیں بہت کچھ کامیابی ہوئی ہے۔ اور کئی شہروں میں جماعتیں قائم ہوگئیں ہیں۔ اور اُن جماعتوں کی طرف سے روپیہ جمع ہوکر اکہ میں بہ غرض اشاعت مذہب پہنچتا ہے۔ نہایت خوبصورت اور نقش و نگار سے آراستہ عرضیاں طلب فیض روحانی کے لئے بھیجی جاتی ہیں اور خود وہاں چھوٹے چھوٹے رسالوں اور عام فہم لکچروں کے ذریعے سے بہائی فرقے کی تعریف شایع کیجاتی ہے تاکہ لوگوں کو اسکے اختیار کرنے کی ترغیب ہو۔ بمبئی کے مقبول رسالہ "ایسٹ اینڈ ویسٹ" میں کسی امریکائی لیڈی کا ایک مضمون حال ہی میں شایع ہوا ہے۔ جو اُس نے اکہ کی زیارت اور حضرت عبدالبہار کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد لکھا ہے۔ جس سے نہ صرف اسکی عقیدت ٹپکتی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی دنیا سے جو زائر مشرق کے اس نسبتاً غیر محدود مقام تک فیض روحانی کے شوق میں آتے ہیں۔ وہ مایوس نہیں جاتے بلکہ ایک گہرا نقش دل پر لے کر جاتے ہیں۔ اور باوجودیکہ اس عالم ناپائدار کی چکی میں آجکل غرب سنگ بالا اور شرق سنگ زیریں بنا ہوا ہے تاہم روحانیت میں زمانہ گذشتہ کی طرح

آج بھی ایشیا ہی کا رتبہ بڑھا ہوا ہے اور مشرق یدِ اعلیٰ یعنی اوپر کا ہاتھ اور مغرب یدِ اسفل یعنے نیچے کا ہاتھ ہے۔ ایک ہاتھ بخشنے والا ہے اور دوسرا لینے والا۔

فرقہ بہائیہ کے متعلق مختلف بیانات نظر سے گزرے ہیں اور یہ قرار دینا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے کس کو قابلِ اعتبار مانا جائے۔ لیکن کسی اور بیان کو پیش کرنے سے پہلے تقاضائے انصاف یہ ہے کہ خود اِسکے معتقدین کا بیان اُن کی زبان سے سُن لیا جائے۔ اور وہ یہ ہے۔

"عباس آفندی بمقام طہران۔ ۲۳ مئی ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے عجیب بات ہے کہ اِن کا روزِ ولادت وہی ہے جس دن "باب" نے اپنی تلقین شروع کی۔ آپ اوائل عمر سے اپنے باپ کی خدمت میں حاضر اور اُن کی ساعی میں شریک رہے سب سے پہلے اپنے باپ کے موعود ہونے پر ایمان لائے۔ اور آپ کی تربیت ایسے ڈھنگ پر ہوئی کہ آپ اِس تحریک کا مرکز بن سکیں۔ سارے بہائی آپ کو اپنا روحانی پیشوا مانتے ہیں اور آپ کی بدولت مریدین کو اس روحانی زندگی سے واقفیت ہوتی ہے جو بہاء اللہ کے حصّے میں آئی تھی۔ اِسی مرکز سے اب نورِ حق اطرافِ عالم میں پھیل رہا ہے"

"بہاء اللہ کا مقصد یہ تھا کہ تمام بنی نوعِ انسان کو روحانی طور پر جسمِ واحد بنا دے۔ اور اسکی تلقین ایسی ہے کہ ہر ملک و ملت کا انسان اس پر کاربند ہو سکتا ہے۔ اِسی سبب سے مغربی دنیا کے عیسائی۔ یہودی اور دہریے۔ مشرقی دنیا کے مسلمانوں۔ زرتشتیوں۔ برہمنوں اور بودھ مت والوں سے رشتۂ الفت و ہم خیالی۔ ہم مذہبی جوڑ رہے ہیں"۔

حضرت عبد البہار کی جو نصائح مریدوں کی ہدایت کے واسطے شائع ہوئی ہیں۔ وہ اُن بیشمار نصائح سے جو سب پرانے مقدس مذہبوں کے پیشواؤں نے کیں ہیں کچھ جدا یا نئی نہیں۔ کیونکہ دنیا بھر میں بنیادی اصول ایک ہی ہیں اور انہی پر عمل کرنے سے سچی نیکی حاصل ہوتی ہے۔ یہاں اُن کی نصائح میں سے بعض بطور نمونہ نقل کیجاتی ہیں۔

کسی کو رنج مت پہنچاؤ - ایک دوسرے سے بہت محبت کرو - سب سے مہربانی کا برتاؤ کرو اور اُن سے پاک طینتی محبت رکھو - اگر ہمیں مخالفت برداشت کرنی یا مصیبت سہنی پڑے - تو اُسے برداشت کرنا چاہئے اور اس حال میں بھی حلیم اور مہربان رہنا چاہئے - اگر مصیبت بہت سخت ہو تو ہمیں خوش ہونا چاہئے - کیونکہ خاصان خدا کے لئے یہ انعام ہے"

"دوسروں کے عیوب کے متعلق سکوت اختیار کرنا لازم ہے - اُنکے حق میں دعا کرنی چاہئے - مہربانی اور رفق سے اُن کی مدد کرنا چاہئے - تاکہ اُن کے عیوب کی اصلاح ہو جائے - بجائے برائی پر نظر ڈالنے کے ہمیشہ اچھائی پر نظر رکھو - اگر کسی میں دس اچھی خصلتیں ہیں اور ایک بُری - تو دس کو دیکھنا چاہئے اور ایک کو نظر انداز کر دینا چاہئے - کسی کو لفظاً نا ملائم نہیں کہنا چاہئے - گو وہ ہمارا دشمن ہی کیوں نہو - جو لوگ اوروں کے عیوب ہمارے سامنے بیان کریں - انہیں اس سے روکنا چاہئے -

"تلقین حق میں مصروف رہنا چاہئے - کیونکہ ہمارے آقا نے فرمایا ہے کہ ہم اس حکم کی تعمیل کے بغیر روحانی قوت اور ترقی حاصل نہیں کر سکتے - جس کسی کو یہ قوت حاصل ہے - اسے رضوان الٰہی حاصل ہے - ہمارے آقا نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "اس دور میں جو بیج بویا جائے گا خدا خود اپنی رحمت کے بادلوں سے اسکی آبیاری فرمائیگا اور وہ بار آور ہوگا"

"ہمیں ایک دوسرے کا خادم بننا چاہئے اور یہ جاننا چاہئے کہ ہم سب ایک ہیں ہمیں یہ محسوس کرنا چاہئے کہ ہم ایک روح ہیں جو بہت سے جسموں میں سرایت کئے ہوئی ہے جسقدر ہم ایک دوسرے سے محبت کرینگے - اسی قدر خدا کے قریب تر ہونگے - ہماری محبت ہماری اطاعت اور ہماری توحید محض اقرار زبانی نہ ہوں بلکہ واقعی ہوں"

"ہمیں لازم ہے کہ ہم ہر مریض کیلئے باعث شفا ہر مغموم کیلئے باعث تسلی ہر پیاسے کیلئے خوشگوار پانی ہر بھوکے کے لئے خوان آسمانی - ہر متلاشی کیلئے رہبر - ہر کھیتی کیلئے مینھ - ہر افق کیلئے ستارے - ہر چراغ کیلئے روشنی ہوں - اور ہر شخص کیلئے جو آسمانی بادشاہی کی آرزو میں بیتاب ہو اس بادشاہی کی خوشخبری دینے والے ہوں - ہمارے آقا کا قول ہے کہ ان علامتوں سے خدا کے ہر نیک بندہ کی پہچان کرنا"

عازمانِ انگلستان کیلئے

جو صاحبان تعلیمی اغراض سے انگلستان جانیکا عزم رکھتے ہیں۔ اُن کی سہولت کیلئے لندن کی "نیشنل انڈین ایسوسی ایشن" نے ایک چھوٹی سی کتاب انگریزی میں تیار کر کی ہے۔ جس سے انہیں تعلیم کے مختلف صیغوں میں داخل ہونے کی شرائط فیس کی شرح اور دیگر ضروری اخراجات کے متعلق معلومات حاصل ہو سکیں۔ اسی کتاب میں اختصار کے ساتھ سب ضروری امور کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ اور اس اعتبار سے عازمان انگلستان کیواسطے یہ بہت مفید ہے۔ اس کی خوبی کی یہی دلیل کافی ہے کہ دس مرتبہ چھپکر فروخت ہو چکی ہے اور اب گیارہویں دفعہ شایع ہوئی ہے۔ اس مرتبہ صنعتی تعلیم کے کئی مرکزوں کی مختصر کیفیت بھی اس میں درج ہوئی ہے۔ کیونکہ اب روز بروز اسطرف لوگوں کا میلان ہوتا جاتا ہے۔ اور یہ میلان ملکی ترقی کی ایک عمدہ فال ہے کتاب کا نام "دی ہینڈ بک آف انفارمیشن فور انڈین سٹوڈنٹس" ہے اور لاہور میں بی۔ ایل۔ سوری کی دوکان پر۔ بمبئی میں ڈی۔ بی۔ تاراپوروالا اینڈ سنز سے اور کلکتے میں تھاکر سپنک اینڈ کمپنی سے بہ قیمت ایک روپیہ مل سکتی ہے۔

اس کتاب کے آخر میں ایک باب ہے جس کا عنوان ہے "طلبہ کو نصیحت"۔ اس کے بعض فقرات کا ترجمہ یہاں نقل کر دینا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس میں کئی ایسے سوالات کے جواب لکھے ہیں جو لوگ وقتاً فوقتاً ہم سے کرتے رہتے ہیں۔

لندن میں اگر کوئی طالب علم کفایت سے رہے تو ایک سو بیس پونڈ (یعنی اٹھارہ سو روپے) سالانہ سے لیکر ایک سو پچاس پونڈ (یعنی ساڑھے بائیس سو روپے) سالانہ تک میں اس کا گذارہ ہو سکتا ہے۔ اس رقم میں تعلیم کی فیس وغیرہ کا اخراجات شامل نہیں

بلکہ فقط بود و باش کے ضروری اخراجات ہیں۔ البتہ اگر کوئی طالب علم اڈنبرا میں یا برطانیہ کے بعض دیگر شہروں میں جہاں لندن کی طرح گرانی نہیں رہتی ہے تو اس سے کم میں بھی کام چل سکتا ہے"

"بعض لوگوں میں جو یہ خیال پھیلا ہوا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص گوشت سے پرہیز کرتا ہوا اور صرف نباتاتی غذا کھاتا ہو تو اسے انگلستان میں گوشت مجبوراً کھانا پڑے گا اور اسکے بغیر اسکی صحت میں خلل آجائے گا یا آب و ہوا سرد ہونے کے باعث تندرست رہنے کے لیئے شراب کا استعمال اسکے لئے ضروری ہوگا۔ یہ ہرگز درست نہیں"

"طلبہ کو چاہیئے کہ لندن آتے وقت بحری سفر کے اخراجات کے سوا بیس تیس پونڈ نقد (یعنی تین چار سو روپے) اپنے ساتھ لائیں تاکہ اُن ضرورتوں کے لئے جو وہاں پہنچتے ہی پیش آتی ہیں۔ وہ رقم کام آئے۔ انہیں کوشش کرنی چاہیئے کہ اپنے زمانہ قیام میں کوئی تیس پونڈ کے قریب ہر وقت اپنے نام سے بنک میں امانت رکھیں۔ اور یہ رقم معمولی رقوم خرچ کے علاوہ ہو۔ تاکہ اگر کبھی انہیں خرچ پہنچنے میں دیر ہو جائے۔ یا اچانک وطن جانے کی ضرورت پیش آجائے یا بیماری ہو تو پردیس میں پریشان نہوں۔

"طالب علم کو چاہیئے کہ ہندوستان سے محض انٹرنس کے درجے سے کوئی اونچا امتحان پاس کر کے انگلستان کا قصد کرے تاکہ آتے ہی جس فن کی تحصیل کر لئے آیا ہے۔ اسکے مطالعہ میں مشغول ہو جائے اور اس کا وقت ضایع نہو"

"جو طلبہ آکسفورڈ یا کیمبرج کی یونیورسٹی میں جانا چاہیں۔ انہیں بتاکید یہ ہدایت کیجاتی ہے کہ وہ ہندوستان سے ڈگری سے کر یا ایسا امتحان پاس کر کے چلیں جو آکسفورڈ اور کیمبرج میں بمنزلہ "ریسپانشن" یا "لٹل گو" کے جو وہاں کے امتحانات داخلہ میں سمجھا جائے۔ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس قدر لاطینی سیکھ کر چلیں۔ کہ آتے

ہی ان امتحانات میں شریک ہو سکیں - کیونکہ لاطینی نہ جاننے کے سبب یا ہندوستان سے بڑے امتحان پاس کرنے کے بغیر چلنے کے باعث اکثر بہت سا قیمتی وقت اور روپیہ ان ابتدائی امتحانات کی تیاری میں ضایع ہوتا ہے"

"طالب علم کو مناسب ہے کہ وہ لندن پہنچنے سے پہلے اپنے کسی دوست یا واقف کو اپنے پہنچنے کی تاریخ سے بذریعہ خط یا تار مطلع کر دے - اگر کسی کا کوئی دوست یا واقف لندن میں نہ ہو تو وہ "نیشنل انڈین ایسوسی ایشن" کے آنریری سکرٹری کو اطلاع کر دے" اس جماعت کی طرف سے کچھ نہ کچھ بندوبست اسکے لئے ہو جائے گا اور کوئی شخص اسے ریل پر لینے کے لئے بھیجا جائے گا۔

واضح رہے کہ یہ وہی ایسوسی ایشن ہے جس کا کام نیک دل مس مینگ مرحومہ نے مدت العمر انجام دیا اور اب یہ اہم فرض ایک اور نیک دل انگریزی خاتون یعنے مس - ای - بیک نے اپنے ذمے رکھا ہے اور وہ اس جماعت کی آنریری سکرٹری ہیں - ہندوستان کے لوگوں سے انھیں بسبب اپنے مرحوم بھائی مسٹر تھیوڈور بیک پرنسپل علیگڈھ کالج کے خاص دلچسپی ہے اور وہ نہایت سرگرمی سے اپنا فرض ادا کر رہی ہیں - اُن کا پتہ یہ ہے نمبر ۲۲۳ - البیون روڈ - سٹوک نیونگٹن - لندن نارتھ - انگلینڈ -

عبدالقادر

روح نے ہوش میں کیا ایسی صفت پائی ہر — سیر کو عالم ادراک میں کیوں آئی ہے
نہ تعلق ہے کسی سے نہ شناسائی ہر — انجمن میں ہوں مگر عالم تنہائی ہے
حسن بت یہ ہے تو اب یاد خدا کی نہیں خیر — یہ ادا ہے تو نماز و نکی قضا آئی ہے
عشوہ و دہر سے ہیں مستعد دہن میں جانیں — کم ہیں جو سوچ رہی ہیں کہ قضا آئی ہے
وصف کوئی نہیں اکبر میں برائی کے سوا — مدح فرماتے ہیں یہ آپ کی اچھائی ہے

مدرسہ کی یاد

(اپنے پرانے مدرسے پر شاعر گرے کے خیالات)

اے دور سے نظر آنے والے کنگورو اور مینارو۔ اے قدیم عالیشان گنبدو جن کے نیچے شکرگذار علم اپنے محسن بادشاہ ہنری کی روح کو ثواب پہنچاتا ہے اور اے لوگو جو بلند قلعے ونڈسر کی شاہانہ پیشانی سے نیچے کے ہرے ہرے درختوں کے جھرمٹوں اور سبزہ زاروں کو دیکھتے ہو جن کے سبزے اور چھاؤں اور پھولوں میں سے ہوتا ہوا ٹیمز کا دریا اپنے چاندی سے چمکتے ہوئے رستے پر بہتا ہے۔!!! تمہیں سب سے میرا خطاب ہے۔

اے زندہ اور خوشدل پہاڑیو! اے فرحت انگیز سایہ دار درختو۔ اور اے دلفریب سبزہ زارو۔ تم سے دل لگانا عبث ہے۔ تم ہی میں میرا بچپن بے پروائی کا زمانہ آوارہ رہا ہے جبکہ وہ تکلیف و درد سے ناآشنا تھا۔ ہوا کے ہلکے ہلکے سبک جھونکے تمہاری طرف سے آرہے ہیں اور اس خستہ حال جسم بیجان کو بھی آرام دیتے ہیں۔ جوانی و انبساط سے ایسے معطر ہیں کہ گویا اس خزاں بُردہ دل میں نئی بہار کی خبر لاتے ہیں۔

اے ٹیمز کے دریا۔ تو ہی کچھ منھ سے بول۔ کیونکہ تو نے اپنے زمرد سی کنارے پر بہت سی زندہ دل کم سن گذری ہوئی نسلوں کو تماشے کرتے دیکھا ہوگا جہاں وہ خوشی و خرمی کی راہوں میں کھیلتی پھرتی ہونگی۔ بتا تو۔ اب وہ کونسے لڑکے ہیں جو خوش خوش اپنے قوی بازوؤں سے تیری بلوری موجوں پر کشتیاں دوڑاتے ہیں۔ وہ صیاد کونسے ہیں جو خوش آواز پرندوں کی تاک میں درختوں کے نیچے

دن کاٹتے ہیں۔ اب وہ کونسے کھلاڑی ہیں جو چپکڑوں کو چلاکر اور گیندوں کو ٹھکرا کر اُنکے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں؟

کچھ ایسے ہونگے جنھوں نے آیندہ آسائش و آزادی کے خیال سے ابھی اپنے اوپر بہت سی قیدیں لگالی ہونگی۔ اور ہمتیں باندھے مطالعہ میں مصروف رہتے ہونگے بہت سے وہ بھی ہونگے جو اپنی سلطنت کی حدود سے گذر کر نئی نئی جگہوں کی سیر و تماشے کو بیخوف نکل جاتے ہونگے۔ پر جتنا آگے بڑھتے ہونگے پیچھے مڑکر دیکھتے جاتے ہونگے۔ ہوا کے ہر جھونکے میں کوئی نہ کوئی آواز سُنتے ہونگے اور ہر قدم پر خوشی اُٹھاتے اور خوف کھاتے ہونگے۔ جوان اُمیدیں اور اُمنگیں جنکو پاک تصور نے پیدا کیا ہے انکی ہیں۔ آنسو بھی ہیں مگر وہ جو آنکھ سے گرتے ہی یاد نہیں رہتے۔ خوشی کی دھوپ اِنکے سینے میں کھلی ہے۔ توانائی اور صحت جس کا چہرہ گلنار ہے ان ہی کو نصیب ہے۔ ہنسیاں ہیں جن میں شرارتیں بھری ہیں۔ شوخیاں ہیں اور طرح طرح کی۔ نت نئے کھیل ہیں نت نئے تماشے۔ خوشدلیاں ایسی جن کو جسمانی صحت نے پیدا کیا ہے۔ بے فکری کے دن ہیں۔ آرام کی راتیں۔ وہیں پاک ہیں۔ نیندیں ہلکی جو صبح آنکھ کھلتے ہی بھاگ جاتی ہیں۔

لیکن افسوس! اپنے نصیبوں سے بے خبر یہ معصوم ہنسی خوشی کھیلتے پھرتے ہیں۔ کچھ خبر نہیں کیا ہونے والا ہے۔ آج کے سوا کل کی فکر نہیں۔ پر۔ دیکھو تو۔ وہ کارکنان قضا اور یہ سیاہ بختی کا غول ان کی تاک میں کیسا بیٹھا ہے! کوئی اِن بچوں کو دکھاوے جہاں یہ قاتل چھپے بیٹھے ہیں۔ یا ان معصوموں سے فقط اتنا ہی کہدو کہ لو بس اب تم جوان ہوگئے خبیث خواہشیں ہونگی جو درندوں کی طرح انکو پھاڑ ڈالیں گی نفرت

اور غصّہ۔ زرد صورت والا خوف اور شرمندگی جو پیچھے پیچھے دبے پاؤں چلی آتی ہے یا جان کو مضمحل کرنے والا عشق ہوگا جو ان کی جوانی خراب کرے گا۔ رشک کے تیز دانت ہونگے جو دل کو اندر ہی اندر سے کھا کر خالی کر دینگے۔ حسد ہوگا جو ہر وقت جلائیگا۔ فکر ہوگا کہ جان تک گُھل جائیگی موذی و بدہیت مایوسی ہوگی اور غم کے تیر ہوں گے کہ کلیجے کو چھید ینگے حُبِ جاہ بلندی پر پہونچنے کی ترغیب دیگا تاکہ پستی میں گرا دے مگر بلندی سے تلخ عداوت زہر چکھائیگی اور بدنامی دانت نکوسے آئے گی اور ان کو شکار کرلے گی۔ فریب اور جھوٹ ہر وقت نشتر لگائیگا چٹکیاں لیگا نامہربانی کی بھری نظروں کا سامنا ہوگا جو مظلوم کی آنکھوں سے پہلے آنسو نکلوائیگی اور پھر اوپر ہنسیگی۔ پشیمانی وہ ہوگی جو بدن کا خون تک بگاڑ دیگی۔ یا جنون ہوگا کہ سخت سے سخت مصیبتوں پر بھی قہقہے لگائیگا۔

لو اور دیکھو۔ ذرا نیچے زمانہ کی وادی پر نظر ڈالو۔ یہ بدہیت ڈراونی صورتیں کون ہیں؟ یہ موت کا ظالم پیش خیمہ ہے جن میں ہر ایک اپنے سردار سے بھی جلّادی میں بڑھا ہوا ہے۔ ذرا دیکھو۔ کوئی بدن کے جوڑوں کو توڑتا ہے کسی نے رگوں میں آگ لگادی ہے۔ کسی نے پٹھے کھینچ دیئے ہیں بہت سے وہ ہیں جو اور بھی اندر پہونچکر اعضائے رئیسہ میں اپنی غارتگری دکھا رہے ہیں۔

لو۔ اور۔ دیکھو۔ اس ظالم سفّاک انجمن کو پورا کرنے کے لئے مفلسی اور بڑھاپا بھی آن پہونچا۔ ایک روح تک کو اپنے سرد بے مہر ہاتھوں سے برف سے کئے دیتا ہے دوسرا رفتہ رفتہ جان کا ہلاک کرنیوالا ہے۔

ہر شخص اپنی اپنی مصیبت میں مبتلا ہے۔ اور کیوں نہو۔ سب انسان میں

اور یکساں نالہ وزاری پر مجبور۔ جو دردمند ہیں وہ غیروں کی تکلیف پر اور جو بے درد ہیں وہ فقط اپنی تکلیف پر روتے ہیں۔ لیکن کیوں ان معصوم بچوں کو اپنی قسمت کا حال ابھی سے معلوم ہو جبکہ مصیبت کو کہیں پہونچنے اور آسائش کو کہیں سے بھاگتے دیر نہیں لگتی۔ بس خاموش۔ جہاں نادانی خوشی کا باعث ہو وہاں دانا بننا نادانی ہے۔

عنایت اللہ خاں

ہو گیا عشق تری زلف گرہ گیر کے ساتھ
سلسلہ دل کا ملا تھا ابھی زنجیر کے ساتھ

زخم دل میں اسے رہنے دو یہی بہتر ہے
دل بھی کھنچ کر نکل آئے نہ کہیں تیر کے ساتھ

نگہ ناز سے اللہ بچائے دل کو ہو ہو
کہ قضا آتی ہے یہاں کی بجلی اس تیر کے ساتھ

لذتیں کرتی ہیں انسان کو دنیا میں ہلاک
زہر بھی ہے یہ خانم شکر و شیر کے ساتھ

دل سے ملئے تو دلوں میں ہو محبت کی جگہ
خوش مزاجی کا اثر کچھ نہیں تزویر کے ساتھ

پیار کے ساتھ خوشامد بھی کرونگا شب وصل
ہے یہ لازم کہ دعائیں بھی ہوں تدبیر کے ساتھ

کیں نگاہیں تو لگاوٹ کی ادائیں بھی سہی
ولیے مرہم بھی لگاتے رہے وہ تیر کے ساتھ

جنبش ابروئے قاتل کا اشارہ ہے یہی
کام چلتا ہے جو دنیا میں تو شمشیر کے ساتھ

وقت پیری نہیں یاروں کی مروت باقی
آنکھ دنیا کی بدل جاتی ہے تقدیر کے ساتھ

عمر زنداں میں کٹی شوق رہائی رخصت
ہو گیا انس مرے پاؤں کو زنجیر کے ساتھ

مے سے پرہیز حسینوں سے الگ رنگ سے دور
رہ چکے شیخ ان اوصاف پہ توقیر کے ساتھ

پاس کے معشوقوں کو مرشد نہ کریں کیوں آزاد
زہرہ جب ناچ رہی ہے فلک پیر کے ساتھ

عشق گیسو نے کیا راہ خیالات کو بند
اب تعلق ہے مرے دل کو بھی زنجیر کے ساتھ

مست ہے نغمۂ بلبل سے چمن میں اکبر
آپ محفل میں سنیں راگ مزامیر کے ساتھ

خمخانۂ جاوید

اُردو زبان کے شعراء ماضی و حال کا ایک ضخیم تذکرہ تیار ہو رہا ہے۔ جس میں کوئی تین ہزار شعراء کے کلام کے نمونے اور جہانتک معلوم ہو سکے ہیں اُنکے مختصر حالات درج ہیں۔ یہ تذکرہ پانچ جلدوں میں مکمل ہوگا۔ پہلی جلد چھپ چکی ہے اور عنقریب شائقین اسے دیکھکر محظوظ ہونگے۔ لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے۔ دہلوی۔ خلف الرشید جناب آنریبل رائے بہادر مدن گوپال صاحب ایم۔ اے آنجہانی نے زبان اُردو پر ایک مستقل احسان کیا ہے۔ کہ ایسا جامع تذکرہ لکھکر شایع کیا۔ "خمخانۂ جاوید" اسکے لئے نہایت موزوں نام ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اُردو دنیا کی اُن زبانوں میں ہے۔ جو عالمگیر ہونے کے علاوہ پائدار بھی ہیں اور جس حد تک دنیوی چیزوں پر ثبات کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ اُس حد تک یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اُردو جنم سے ہی خلعت جاودانی پہن کر نکلی ہے۔ پس جو کتاب اس زبان کے سخنوروں کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے تالیف ہو۔ وہ بھی اُردو کے ساتھ نبھیگی۔ اسلئے یہ "خمخانۂ جاوید" مئے سخن کے متوالوں کو مدتوں سرشار رکھیگا۔ اور صاحبانِ ذوق اشعار کے اس مجموعے کے مزے لیتے رہیں گے ادبیات اُردو کی تاریخ جب کبھی لکھی جائے گی اور جو کوئی اُسے لکھنے بیٹھیگا۔ اُسکو اس تذکرے سے بہت کچھ مدد ملے گی اور وہ لالہ سری رام کی محنت کی داد دیگا کہ انھوں نے کس تلاش سے ایسے شعرا کا نام اور کلام ڈھونڈھا ہے جن کا پہلے تذکروں میں ذکر تک نہیں۔ اور اسکے ساتھ ہی زمانۂ حال کے شعرا کی حتی الوسع مکمل فہرست مرتب کی ہے۔ صاحبِ مولف کی عنایت خاص سے اس تذکرہ

سکے اوراق جوں جوں چھپنے گئے ہمارے پاس پہنچتے گئے۔ اور ہمیں یہ موقعہ ملا۔ کہ ہم نے دیگر شائقین سے پہلے اسے دیکھا۔ شوق متقاضی تھا کہ یہ اوراق اکثر پیش نظر رہیں۔ اسلیئے میز پر سامنے رکھے رہتے تھے۔ ایک دن ایک طباع دوست ملنے آئے اور کچھ دیر تک اوراق تذکرے کو اُلٹتے رہے۔ اسکے بعد اُنہوں نے اپنی رائے اس کے متعلق ظاہر کی۔ فرمانے لگے۔

"لالہ سری رام صاحب نے شاعروں کی فہرست تو اچھی تیار کردی ہے" گویا اس بلیغ جملے میں اُنہوں نے وہ کل اعتراضات جمع کردیئے جو اُن کے نزدیک اس کتاب پر وارد ہو سکتے ہیں۔ اسکے بعد کتاب کی ظاہری خوبیوں کی تعریف کرتے رہے۔ کہ چھپی خوب ہے۔ کاغذ عمدہ ہے۔ اُن کے اعتراض کا ماحصل یہ تھا۔ کہ شعرائے مشمولہ تذکرہ کی کثرت تعداد کے سبب شعرا کے حالات کے اعتبار سے بعض جگہ تذکرہ کی شان نہیں پیدا ہوئی۔ بلکہ فہرست کی شان ہے۔ یعنے نام اور تخلص اور چند شعر بطور نمونۂ کلام درج ہیں۔ مگر اوّل تو بہت سے شعرا کے حالات مبسوط درج ہیں اور دوسرے ہمارے نزدیک یہ اس کتاب کی خوبی میں داخل ہے۔ کہ ایک جامع فہرست شعرا کی اسمیں موجود ہے جس سے آیندہ کام پڑے گا۔ اور بعض باتیں جن کا پھر پتہ لگانا دشوار ہوتا۔ اب محفوظ ہوگئیں ہیں۔ مثلاً جب ہندو مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہو کر اُردو کو اپنے بزرگوں کا ترکہ ماننے لگیں گے۔ اور اسکی ترقی کے لئے مل کر کام کرنا چاہیں گے۔ اُس وقت ضرورت ہوگی کہ ہندی سخنوروں کی ایک فہرست مرتب کیجائے۔ جس سے ہندوؤنکو معلوم ہو کہ اُن کے بزرگ اس زبان سے کیسی الفت رکھتے تھے اور کیا کیا خدمت اسکی کرتے رہے۔ اور جس سے مسلمانوں کو واضح ہو کہ اتفاق اور اتحاد کے ہاتھوں نے اُردو علم ادب کی بنیاد ڈالی تھی۔ اور

اِسلیئے اب بھی اُردو ذریعۂ اتفاق ہونی چاہیے۔ نہ باعثِ اختلاف۔ "خمخانۂ جاوید" پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا۔ کہ بزمِ سخنوراں میں تمیزِ شیخ و برہمن نہیں رہی۔ کبھی ہندو ساقی بنتے ہیں اور مسلمان بادہ نوش۔ کبھی مسلمان خمار ہیں اور ہندو مخمور۔

از تعصب کاسۂ شیخ و برہمن شد جدا
ورنہ در میخانہ یک ساقی و یک جام است و بس

مثال کے طور پر ہم تذکرے کی ردیفِ الف پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہیں۔ کتاب کھولتے ہی اتفاق سے ہمارے سامنے ایک تخلص آیا۔ آرام۔ نام راے پریم ناتھ۔ صاحبِ تذکرہ لکھتے ہیں کہ دو ہزار شعر کا ایک دیوان اُنکے یادگار ہے۔ اِن کے بعد ایک اور صاحب یہی تخلص فرماتے ہیں۔ راے بہادر منشی شیو نراین بیکنٹھ باشی۔ غالب کے شاگردوں میں تھے۔ اون کی ایک غزل درج ہے۔ جسکا مطلع اور مقطع قابلِ داد ہے۔

نخست ہے مدعی جو ہو وہی پھر مدعا ٹھیرے ۔۔۔ جو اپنا دشمنِ دل ہو وہی دل کی دوا ٹھیرے
قیام اپنا ہوا اس محنت سرا دہر میں کیونکر ۔۔۔ جہاں آفت ہی آفت ہو وہاں آرام کیا ٹھیرے

چند ورق اور اُلٹ جائیے۔ پنڈت امرناتھ دہلوی متخلص بہ آشفتہ کا کلام بہ نظر صفائی زبان ملاحظہ ہو۔

دل سے جو اُسکی یاد ہماری اُتر گئی ۔۔۔ کیا اسے موت تو بھی زمانے سے مر گئی
معشوق کے بگاڑ میں بھی سو بناؤ ہیں ۔۔۔ جتنے وہ بگڑے اتنی ہی رنگت سنور گئی
عریانیٔ حباب کا رکھا نہ کچھ خیال ۔۔۔ مقراضِ موج دامنِ دریا کتر گئی

کچھ اور آگے چل کر جناب راج نراین صاحب ارمان سے ملاقات ہوتی ہے۔ آپ داغ مرحوم کے شاگرد ہیں۔ اور پنڈت آفتاب راے صاحب مضطر کے پوتے۔ چنانچہ

دونوں نسبتوں پر ناز کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

شوخیِ مضموں کا حصہ داغ سے مجھ کو ملا
شاعری مضطر سے ہے میراث میں پائی ہوئی

اور شوخی اور شاعری دونو شعر مندرجہ ذیل میں جمع ہیں:-

خود ہی پہنچ گیا ہوں وہاں بحرِ التجا ؟
طرزِ بیاں بتاتا ہوا نامہ بر کو میں ؟

ہندو سخنوروں کے کلام کے یہ چند نمونے محض مثال کے طور پر نقل کئے گئے ہیں۔ تذکرہ مکمل ہو جائے گا تو سیکڑوں نمونے اسمیں ملیں گے۔ جنکے کلام سے ہندو مسلمان یکساں محظوظ اور جن پر دونو یکساں نازاں ہو سکیں گے اس سلسلے میں جناب پنڈت بشن نراین صاحب دربیر سٹرایٹ لا کا کلام جو اس تذکرے میں منقول ہے خاص طور پر قابلِ قدر ہے۔ آپ آبر تخلص کرتے ہیں۔ اگرچہ شعر لکھنے کا اتفاق گاہے گاہے ہوتا ہے۔ مگر جب لکھتے ہیں خوب لکھتے ہیں۔ اشعارِ ذیل کی پاکیزگی دیکھئے:-

غنچوں کو گو زباں ملی اور گل کو گوش　　رازِ ریاض و ہر مگر کچھ کھلا نہیں
گل سے یہی اشارہ شبنم ہے باغ میں　　رونیکا ہے مقام یہ ہنسنے کی جا نہیں
فوارہ کی زباں پہ یہ جاری ہے رات دن　　سرکش وہ کون ہے کہ زمیں پر گرا نہیں

نہایت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ایک ہندو دوست نے ایسا تذکرہ لکھا اور اُس میں ہندو سخنوروں کے کلام کی مناسب داد دی۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ صاحبِ تذکرہ نے مسلمان ساتذہ کے کلام کی تعریف میں کسی طرح کمی کی۔ کیونکہ لالہ سری رام کو اردو کے باکمال اُستادوں سے صرف عقیدت ہی نہیں۔ بلکہ عشق ہے۔ اور انھوں نے ہر عہد کے اُستادوں کا ذکر عام

اس سے کہ ہندو ہیں یا مسلمان - ارادت مندانہ محبت سے کیا ہے۔ مثال
کے طور پر چند فقرات اُس عبارت کے نقل کئے جاتے ہیں۔ جو اُنھوں نے
مفتی صدرالدین خانصاحب آزردہ مرحوم کے احوال میں لکھی ہے:-

"جناب آزردہ مرحوم اُن چند اشخاص میں تھے جنھوں نے اعلیٰ درجے
کی جامع قابلیت و فضیلت کے باوجود ملکِ سخن میں بھی اپنی اعلیٰ استعداد
کا سکہ بٹھایا ہے۔ منصبِ اعلیٰ پر ممتاز و حکام رس ہونیکے باوصف آپ کی طبیعت
ظاہری نمائش سے کوسوں دور تھی۔ دنیوی آسائش کے تمام سامان بہم پہونچائے
مگر خود سیدھی سادھی وضع سے بسر کرتے رہے۔ عدالتی کاروبار سے فرصت
کے وقت طلبہ کا حلقہ آپ کے گرد رہتا تھا۔"

آدیب دہلوی کا حال نہایت دلچسپ لکھا ہے۔ اُس میں سے کچھ حصّہ
اقتباس کیا جاتا ہے:-

"شاہ عبدالحق محدث کی دوما (؟) اور اہلِ اسلام کے ایک نامی گرامی خاندان
کے چشم و چراغ تھے۔ . . . محدث علیہ الرحمۃ کے ڈھائی سو برس بعد
سیف الحق ۱۲۸۲ھ میں مقام دہلی محلہ مفتی صاحب پیدا ہوئے۔ خاندانی تربیت
تو تھی ہی مگر باعثِ صد حیرت و استعجاب یہ امر ہے کہ مکتب اور سرکاری مدرسے
میں صرف معمولی عربی فارسی اور برائے نام انگریزی تعلیم پائی جس کی معراج
مڈل کے درجے تک تھی۔ آدیب کی اچھوتی اور ہونہار طبیعت نے وہ قابلیت
واستعداد فراہم کرلی کہ اچھے اچھوں کی ٹکر جھیلنے لگے . . . . . شروع میں مرزا
یوسف علیخان عزیز شاگرد مرزا غالب سے تلمذ اختیار کیا اور کئی برس
تک اُن کی روش پہ کہتے رہے۔ ایک دفعہ کسی مشاعرے میں غزل پڑھی
جس کا مطلع یہ ہے ؎

لیجاؤ میرے سینے سے ناوک نکال کے
پر دل نکل نہ آئے کہیں دیکھ بھال کے

سُنا ہے کہ مرزا غالب بھی موجود تھے۔ پاس بلا کر پیار کیا اور فرمایا کہ "میاں سیفو۔ ہمارے پاس آیا کرو۔ آج سے ہم تمہیں بتائیں گے" ...... غالب کے تلمذ نے آپ کے کلام میں ایک عجیب شان پیدا کر دی۔ وہ یہ کہ مومن اور غالب کے رنگ کو سمو کر جدت پسندی سے ایک ایسا دلچسپ اور پسندیدہ رنگ اختیار کیا جس میں فصاحت و بلاغت، شوکتِ لفظی، مناسبتِ شعری اور نازک خیالی سب اپنی اپنی جگہ جداگانہ شان دکھاتی تھیں۔ اُردو فارسی دونوں زبانوں کا کلام نہایت آبدار و بلند پایہ ہے۔ مگر اُنکے فطرتی استغنا سے بہت سا حصہ تلف ہو گیا۔ اور جو کچھ بچ رہا وہ بھی نایاب ہے اور چھپنے کی توقع نہیں۔ بڑی مشکل سے تھوڑا سا کلام ہمارے ہاتھ لگا ہے۔ نثر کا بھی کافی ذخیرہ آپ سے یادگار ہے"۔

غرض "خمخانۂ جاوید" کی یہ پہلی جلد جسکا حجم کوئی سات سو صفحے کے قریب ہے۔ اسی قسم کے دلچسپ حالات یا انتخابِ اشعار سے پُر ہے اور اسکا مطالعہ اُردو نظم کے ہر قدرداں کے لئے ضروری ہے۔ ہمارے لایق دوست نے اپنی عمر کا بہترین حصہ اِس کتاب کی تیاری میں صرف کیا ہے۔ اُنہوں نے پہلے اِس تالیف کا قصد ۱۸۹۲ء میں کیا۔ گویا یہ کتاب سولہ سال کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اسی لئے اُنہوں نے کتاب میں اپنی دو تصویریں* شایع کی ہیں جن سے

* ہم لالہ سری رام صاحب کے ممنون ہیں کہ اُنہوں نے ان دو تصویروں کی بہت سی کاپیاں مخزن کو عنایت کی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اُنکی تعداد اسقدر ہے کہ وہ صرف خریدارانِ قسم اول کے پاس پہنچ سکینگی۔ بلکہ اُنمیں سے بھی کسیکو اگر نہ پہونچیں تو وہ معذور رکھیں۔ کیونکہ جسقدر تصویریں ہمیں ملی ہیں اُسیقدر تقسیم ہو سکینگی۔ محرر

معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے اوائل عمر سے وسط شباب تک کا سارا حصہ اس شوق کی نذر کر دیا ہے۔ مگر اُمید ہے کہ اونہیں داد بھی اسقدر ملے گی۔ کہ کلفت و محنت سب دور ہو جائے۔ پہلی عزت جو اُنہیں اِس تذکرے کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہٗ نے "خمخانۂ جاوید" کا اپنے نام نامی سے معنون ہونا منظور فرما لیا ہے۔ یہ ایسا امتیاز ہے جو ہندوستان میں بہت کم مصنفوں یا مؤلفوں کو حاصل ہوا ہے۔ ہم لالہ سری رام صاحب کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ ہمیں اُنکے اِس اعزاز سے خصوصاً اسلئے مسرت ہے کہ وہ مخزن کے جاری ہونے کے وقت سے ہمارے معاون ہیں اور انھوں نے اِس تذکرے میں بھی شعرائے حال کے ذکر میں جابجا مخزن کا حوالہ دیا ہے۔ گویا تذکرے کی لمبی عمر میں مخزن بھی شریک ہو گیا۔

ایڈیٹر

مری تقدیر موافق نہ تھی تدبیر کے ساتھ
کھل گئی آنکھ نگہباں کی بھی زنجیر کے ساتھ

ہو مرقع ہی سے یکجائی کا ارماں پورا
اپنی تصویر لگا دوں تری تصویر کے ساتھ

کھل گیا مصحفِ رخسار بتانِ مغبچہ
ہو گئے شیخ بھی حاضر نئی تفسیر کے ساتھ

گئے سے صلح تو وہ اصلاح طلب بھی نہ ہے
شمع بھی بزم سے رخصت ہوئی گلگیر کے ساتھ

ناتوانی مری دیکھی تو مصور نے کہا
ڈر ہے تم بھی کہیں کھنچ آؤ نہ تصویر کے ساتھ

ہو گیا طائرِ دل صیدِ نگاہِ بے قصد
سعی بازو کی یہاں شرط نہ تھی تیر کے ساتھ

حیف کی جا ہے مطیعوں پہ اگر ظلم رہا
چشمِ انصاف بھی ہو سرِ تسخیر کے ساتھ

تن بہ تقدیر بس آرام سے بیٹھا ہوں میں
کون جھگڑے میں پڑے سازش و تدبیر کے ساتھ

شوق سے آپ کے جائیے ناوک فگنی
دل مرادوں سے کہ بڑھتا ہے ہر تیر کے ساتھ

لطف لطف ہے ترقی پہ ترا حسن و جمال
جسکو شک ہو مجھے دیکھے تری تصویر کے ساتھ

شرفِ حیرت ہوں کہ کیسے کہوں سبحان اللہ
چاند کو دیکھ رہا ہوں تری تصویر کے ساتھ

میں ہوں کیا چیز کہ اُس طرز پہ جاؤں اکبر
ناسخ و ذوق بھی جب چل نہ سکے میر کے ساتھ

قانونِ آبادی

غالبًا یہ عنوان اُردو خواں پبلک کے لئے غیر مانوس ہے اور اوسکی وجہ صرف یہی ہے کہ اُردو ابھی اکثر علوم جدیدہ کی اصطلاحات سے خالی ہے - اور اصطلاحات کا مہیا کرنا کسی فرد واحد کی کوشش کا کام نہیں ہے مندرجہ ذیل مضمون میں میں نے کوشش کی ہے - کہ علم اقتصاد کے اس ضروری مسئلہ کو جہانتک ممکن ہو عام فہم عبارت میں بیان کردوں - (لطیف احمد)

اس اہم اور ضروری مسئلہ پر علم اقتصاد کے ماہروں میں سب سے پہلے مسٹر مالتھس نے دنیا کو متوجہ کیا اور بتایا کہ آبادی ایک قانون کے تابع ہے اور رہنی چاہئے - اس قانون کا سمجھنا ہماری بہت سی مشکل مشکلات کے حل کرنیکا پہلا زینہ ہے اور ہماری زندگی کی بہت سی خوشیوں کا دارومدار اسی پر ہے جسقدر زیادہ لوگ اس قانون سے واقف ہوتے جائینگے - اُسی قدر دنیا کی آفتیں اور تکالیف کم ہوتی جائینگی اور ہزارہا ایسی برائیاں ناپید ہوجائینگی جنکا وجود سوسائٹی کے لئے نہایت شرمناک ہے -

مسٹر مالتھس کی نہایت قابلِ قدر تصنیف تقریبًا ایک صدی پیشتر تیار ہوئی تھی لیکن اوسکے دلائل آجتک لاجواب ہیں - مگر دیکھنا یہ امر ہے کہ کیا وجہ ہے کہ اوسکے حقائق کا اثر دنیا پر بہت کم ہوا اور اُنکا علم بھی بہت ہی محدود فرقے تک مخصوص رہا - اور غالبًا اُسکا بھی کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلا - اس کے دو سبب ہیں - اوّل تو یہ کہ یہ مضمون زیادہ تر اُن مضامین کے زمرہ میں سے ہے - جن کا بیان کرنا شرم وحیا کے خلاف سمجھا جاتا ہے:

اور دوسرے یہ کہ جو علاج مسٹر مالتھس نے تبلایا وہ عملی طور سے ایسا ہی غلط نکلا جیسا اُسکا قانون مسلّم اور صحیح تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اِس قانون کے علم سے زیادہ کونسی چیز انسانی خوشی اور بہبودی کے لئے ضروری ہوسکتی ہے۔ افلاس کا محنت کی زیادتی کا۔ کسنی کی اموات کا۔ اور بہت سی ایسی بُرائیوں کا جن سے آج متمدن دنیا نالاں ہے اصلی سبب صرف یہی قانون ظاہر کرتا ہے۔ اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ افلاس ہزار ہا برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ اور جب تک افلاس دور نہیں ہوگا۔ کسی ہمدرد انسان کی کوئی کوشش اصلاح کامیاب نہیں ہوسکتی۔

جیسے نیوٹن نے قانونِ کشش دریافت کرکے دنیا کو مرہونِ منت کیا ہے اُسی طرح مالتھس نے افلاس کے اسباب دنیا پر روشن کرکے انسانی بہبودی کی ایک شاہراہ دکھادی ہے۔ کسی بُرائی کا سبب دریافت ہوجانا اُسکے علاج اور دفعیہ کے لئے ایک مقدم امر ہے۔ مسٹر مالتھس نے افلاس کا اصلی سبب تبلادیا ہے لیکن اُسکے مجوزہ علاج ناقابلِ عمل ہیں۔ تاہم اب ہم اُس حدتک پہنچ گئے ہیں کہ کچھ ترمیم اور تنسیخ کرکے ایک مفید اور قابلِ عمل ضابطہ تیار کرسکیں۔

انسانی سوسائٹی کی اصلاح کے مضمون پر غور کرنے کے لئے دو باتیں پیشِ نظر رکھنی پڑتی ہیں۔

(۱) اُن رکاوٹوں کی تحقیق کرنا جو انسانی خوشی اور بہبودی کے راستے میں حائل ہیں۔

(۲) اُن رکاوٹوں کو کلاً یا جزواً دفع کرنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟۔

اس مضمون کا مقصد صرف اُس ایک سبب کے نتائج بیان کرنا ہے جو انسان کی فطرت سے نہایت مضبوطی سے وابستہ ہے۔ اور جس کا عمل اگرچہ روزِ آفرینش سے جاری ہے لیکن اُسپر بہت ہی کم توجہ کی گئی۔ یہ سبب جس کی طرف میں نے

اِشارہ کیا ہے دراصل ہر ایک مخلوق کا وہ دائمی اور فطری میلان ہے جو اُس کی شمار اور اعداد کو اسقدر بڑہاتا ہے کہ دنیا کے اکثر ملکوں میں انسانی آبادی کے لئے مُلکی پیداوار ناکافی ہوتی جاتی ہے۔

ڈاکٹر فرنیکلن کا مشاہدہ ہے کہ نباتات اور حیوانات کی قوتِ تولید لامتناہی ہے۔ اور اِس قوتِ تولید کے عمل میں جو کچھ بھی رُکاوٹ ہے وہ یہ ہے کہ بعض حیوانات بعض حیوانات کی غذا قرار دئے گئے ہیں۔ اور نباتات کے لئے زمین محدود کر دیگئی ہے۔ مثلاً اگر سطح زمین بالکل صاف ہو اور کوئی پودا یا درخت یا کسی سبزہ کا اُس پر وجود تک نہو اور ہم سونف کی صرف ایک قسم کو زمین میں لگائیں۔ تو ایک خاص مدت میں وہ تمام سطح زمین پر چھا جائیگی۔ یا اگر زمین حیوانات سے بالکل خالی ہو تو چند صدیوں میں صرف ایک ہی قوم مثلاً جاپانی دنیا کی سطح کے چپہ چپہ پر نظر آئینگے۔ یہ قانون مسلمہ طور پر صحیح ہے اسمیں شک نہیں کہ قدرت نے حیوانات اور نباتات کے بیج نہایت فیاضی سے بکھیرے ہیں لیکن اِنکے پھلنے پھولنے کی جگہ اور اِن کی غذا محدود کر دی ہے اگر یہ بکھرے ہوئے بیج آزادی سے پیدا ہوں اور بڑھیں تو چند ہزار برس میں مثل ہماری زمین کے کئی لاکھ زمینیں بھرپور ہو جائیں گی۔ نباتات اور حیوانات کے اقسام مقررہ حدود میں پھلنے پھولنے کے لئے مجبور ہیں۔ اور اِس جبریہ قانون سے انسان بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔

نباتات اور ادنیٰ حیوانات میں ایک قوی قابلیت ہے کہ وہ اپنے اپنے نوع کے افراد کا شمار تولید سے زیادہ کریں۔ اور بعض دفعہ اس طاقت کا ظہور اس سبب سے نہیں ہوتا کہ وہ اپنی اپنی اولاد کے معاش سے تنگ ہو جاتے ہیں۔ اور جہاں کہیں اِس فکر سے آزادی ہوگی۔ اِس قوت کا عمل زبردست ہوگا۔ اور زائد افراد کے وجود کو پامال کرنے کا ذریعہ صرف مکان یا غذا کی قلت

ہوگی۔

انسان پر اس مزاحمت کا عمل زیادہ پیچیدہ ہے۔ اسمیں بھی بیشک قوتِ تولید اسی زیادتی کے ساتھ ہے جیسی اور مخلوق میں۔ لیکن عقل جو خدا کی طرف سے انسان کے حق میں بہترین انعام ہے اُس سے پوچھتی ہے کہ دُنیا میں ایسے افراد کی پیدائش کا سبب ہونا جنکی پرورش کے لئے غذا کا کوئی سامان نہو کہانتک جائز ہے؟ اگر وہ اس قدرتی سوال کی طرف متوجہ ہوکر اپنے نفس پر ناجائز تشدد کرتا ہے تو اس کا نتیجہ بہت زیادہ صورتوں میں بُرا ہوتا ہے۔ اور اگر وہ اسکی پرواہ نہیں کرتا تو نوعِ انسان دائمی طور پر تعداد میں بڑھکر ذرایع معاش کو ناکافی بنا دیتی ہے۔ بیشک قانونِ قدرت کے مطابق غذا انسانی زندگی کیلئے لابدی ہے۔ اور انسانی آبادی شمار میں کبھی اتنی زیادہ نہیں ہوئی کہ کسی فرد کو اُسکی حیات قائم رکھنے کے لئے کم از کم غذا نہ مل سکے اس لئے آبادی کے بڑھنے میں جو کچھ مزاحمت پیش آتی ہے وہ دراصل وہ مشکلات ہیں جو غذا کی تحصیل میں انسان کو اُٹھانی پڑتی ہیں۔ یہ مشکلات کہیں نہ کہیں ضرور واقع ہوتی ہیں۔ اور لازمی طور پر کسی نہ کسی آفت یا مصیبت کی صورت میں انسانی آبادی کے ایک بڑے حصے کے لئے نمودار ہوتی ہیں۔

اگر ہم انسانی سوسائٹی کی مختلف حالتوں پر نظر ڈالیں تو یہ امر کہ آبادی کا رجحان غذا کی مقدار سے زیادہ بڑھجانیکا ہے اور وہ اِن اسباب کے عمل سے ایک خاص حد سے تجاوز نہیں کرتی صاف معلوم ہوجاتا ہے۔ لیکن ہمیں اول اس بات کی تحقیق کرنی چاہئیے کہ اگر آبادی آزادی سے بڑھنے دیجائے تو اُسکی قدرتی زیادتی کی حد کیا ہوگی۔ اور اُسکے ساتھ ہی زمین کی پیداوار انسان کی پوری محنت اور لیاقت کے صرف پر کس حساب سے بڑھتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ابتک کوئی ملک ایسا نہیں معلوم ہو سکا جہاں قوتِ بالیدگی نے پوری آزادی سے عمل کیا ہو اور جہاں بری رسموں ۔ مضرِ صحت پیشوں ۔ نہایت سخت محنتوں ۔ اور شہروں کی زندگی کے سبب نسلِ انسان کے شمار میں کسی قسم کی کمی نہوئی ہو ۔

امریکہ کی شمالی ریاستوں میں جہاں کہ ذرایع معاش زیادہ افراط سے تھے اور لوگوں کا طریق معاشرت سادہ اور صاف تھا اور کم عمری کی شادیوں میں بھی بہت کم رکاوٹیں حائل تھیں ۔ ڈیڑھ سو برس تک یہ امر دیکھا گیا ہے کہ تقریباً ہر پچیس برس کی مدت میں آبادی دوچند ہو جاتی ہے ۔ لیکن اس مدت میں بھی بعض شہروں میں تعداد اموات تعداد پیدائش سے زیادہ ہو گئی ہے ۔ جس سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے ۔ کہ ملک کے اُن حصوں میں جو اس کمی کو پورا کرتے ہیں آبادی کے بڑھنے کی رفتار اوسط سے زیادہ تیز رہی ہے ۔

اُن پس ماندہ مقامات میں جہاں کہ صرف زراعت ہی پر گذران ہے ۔ اور بری رسمیں اور غلیظ پیشے ناپید ہیں یہ امر دیکھا گیا ہے کہ آبادی صرف پندرہ ہی برس کی مدت میں دوچند ہو گئی ہے ۔ آبادی بڑھنے کی یہ غیر معمولی رفتار غالباً قوتِ بالیدگی کی انتہائی طاقت سے کم ہے ۔ کیونکہ سر ولیم پٹی یہانتک فرماتے ہیں کہ صرف دس ہی برس کی قلیل مدت میں آبادی دوچند ہو سکتی ہے ۔

لیکن کوئی بات وثوق کے ساتھ کہنے کے لئے ہم بالیدگی کی وہ کم سے کم رفتار اختیار کرتے ہیں جس میں تمام شہادتیں متفق ہیں ۔ اور جو بار بار مشاہدہ اور تجربے سے گذر چکی ہے ۔ ”پس ہم بلاخوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ آبادی بشرطیکہ اس کی بالیدگی میں کوئی مزاحمت نہو ہر پچیس برس میں دوگنی ہو جاتی ہے“

اس اندازے کو ثابت کرنے کے لئے ہمیں شمار اور اعداد سے بحث کرنی

لازم ہے۔ پس وہ ملک یعنی شمالی امریکہ کی ریاست ہائے متحدہ جس کی مثال
ہم یہاں پیش کرتے ہیں اُسکی آبادی کی بالیدگی کی رفتار سب سے تیز مانی گئی
ہے۔ ریاست ہائے متحدہ میں ہر دسویں برس مردم شماری کی گئی ہے۔ چنانچہ
کانگرس کے حکم کے مطابق ۱۷۹۰ء میں جو مردم شماری کی گئی اور جس کے صحیح
ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ ریاست ہائے متحدہ کی "سفید آبادی" (یعنی
گوروں کی آبادی) ۳۱۶۴۱۴۸ تھی۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں بڑھکر ۴۳۱۲۸۴۱ ہوگئی گویا ۱۷۹۰ء
سے لیکر سنہ ۱۸۰۰ء تک دس برس کے عرصے میں آبادی کے بڑھنے کی شرح ۳۶٫۴
فیصدی رہی جسکی روسے بائیس برس ساڑھے چار مہینے میں آبادی دگنی ہوجاتی
ہے۔

تیسری مردم شماری کے مطابق جو سنہ ۱۸۱۰ء میں کیگئی سفید آبادی کی تعداد
۵۸۶۲۰۵۲ ہوئی جو سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۱۰ء تک ۳۶٫۱ فیصدی کے حساب سے بڑھتی
رہی۔ اور اس حساب سے ساڑھے بائیس برس میں آبادی دوچند ہوجاتی ہے
چوتھی مرتبہ سنہ ۱۸۲۰ء میں جو مردم شماری ہوئی تو سفید آبادی کی تعداد ۷۸۶۶۷۱۰
نکلی۔ جو سنہ ۱۸۱۰ء سے سنہ ۱۸۲۰ء تک ۳۴٫۱ فیصدی کے حساب سے بڑھتی رہی
اور اس لحاظ سے تیئیس برس سات مہینے میں آبادی دگنی ہوجاتی ہے۔ لیکن اس
اندازہ میں ہم اُس تعداد کو نظرانداز نہیں کرسکتے جو دوسرے ملک یعنی انگلستان
سے آکر ہر سال ریاست ہائے متحدہ میں بستی رہی۔ اور نہایت قابل اعتبار کاغذات
سے یہ پتہ ملیگا کہ ریاستہائے متحدہ میں ان پچیس سالوں میں آکر بسنے والوں کی
تعداد دس ہزار فی سال سے یقیناً کم ہے۔ ڈاکٹر سیبرٹ جو امریکہ کا نہایت معتبر مؤلف
ہے بیان کرتا ہے کہ سنہ ۱۷۹۰ء سے سنہ ۱۸۱۰ء تک مہاجرین کی تعداد چھ ہزار سالانہ
سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ اور انگلینڈ آئرلینڈ اور سکاٹ لینڈ کے کاغذات کے مطابق

مہاجرین کی تعداد جو ۱۸۱۲ء سے ۱۸۲۱ء تک دس سال ہیں امریکہ میں جا کر آباد ہوئی سات ہزار سالانہ کے اوسط سے تجاوز نہیں کرتی۔ حالانکہ ان دس سالوں میں ۱۸۱۷ء و ۱۸۱۸ء بھی شامل ہیں۔ جن میں مہاجرین کی تعداد غیر معمولی طور پر زیادہ تھی امریکہ کے سرکاری کاغذات بھی جو صرف ۱۸۱۹ء سے دو سال تک کے ہیں اسی اوسط کی تصدیق کرتے ہیں۔

بہر حال جزائر برطانیہ کے اُن مہاجرین کی سالانہ اوسط تعداد جو امریکہ میں جا کر بستی رہی دس ہزار سالانہ سے نیچے ہی نیچے ہے۔ پس اگر ہم ۱۷۹۵ء سے ۱۸۲۰ء تک پچیس سالوں میں دس ہزار سالانہ کے اوسط مہاجرین کا لحاظ کریں۔ اور آبادی کے دوچند ہونے کی مدت تئیس برس سات مہینے فرض کریں۔ تو بھی ایک سال اور پانچ مہینوں میں ۵۸۶۲۰۰۰ کی آبادی اُس سے بہت زیادہ بڑھجائے گی۔ جو دس ہزار سالانہ کی اوسط کی زیادتی اور اُن کی تعداد پیدائش بڑھا سکتی ہے ۱۸۲۱ء کے امریکہ کے "قومی کیلنڈر" سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ۳۰ ستمبر ۱۸۱۹ء سے ۳۰ ستمبر ۱۸۲۰ء تک ۱۰۰۰۱ مہاجرین امریکہ میں آئے اور ان میں سے صرف ۱۹۵۹ عورتیں تھیں۔ باقی ۵۰۴۲ مرد تھے۔ اس نسبت سے مہاجرین کی پیدائش میں ایک بہت بڑی کمی ہوجاتی ہے۔ بہر حال اگر ہم اس تفصیل کا چنداں خیال بھی نہ کریں اور برطانیہ سے امریکہ میں مہاجرین کی سالانہ تعداد دس ہزار ۱۷۹۵ء سے ۱۸۲۰ء پچیس سال تک مان لیں اور ان دس ہزار کی تعداد پیدائش بھی پوری شمار کریں تب بھی پچیس سال سے کم مدت میں ۳۱۶۴۱۴۸ تھی ۱۷۹۵ء میں بحساب اُس رفتار کے جس سے یہ بڑھ رہی ہے۔ اسکو ۳۶۹۴۱۰۰ ہونا چاہیئے تھا اور یہ فرض کرنے پر کہ پچیس برس میں آبادی دوچند ہوجاتی ہے تو ۱۷۹۵ء سے لیکر ۱۸۲۰ء تک اسکی تعداد ۷۳۸۸۲۰۰ ہونی چاہیئے

مگر سنہ ۱۸۲۰ء کی مردم شماری کے مطابق یہ تعداد ۱۰۱۷۱۶۸۷ ہوئی گویا ۴۷۳۵۱۰ کی زیادتی پھر بھی رہی۔ اور اگر ہم دس ہزار سالانہ مہاجرین کی تعداد معہ ان کی تین فیصدی تعداد پیدائش کے حساب کریں (جس رفتار سے چوبیس سال میں آبادی دوچند ہو جاتی ہے) تو کل ۳۶۴۵۹۲ ہوتے ہیں۔

آبادی کے سرعت کے ساتھ بڑھنے کی ان شہادتوں پر اگر ہم یہ اور زیادہ کریں کہ یہ رفتار اس وسیع ملک میں تھی جس کے بعض حصوں کی آب و ہوا مضر صحت تھی اور بہت سے لوگ غلیظ پیشوں میں مصروف تھے اور آبادی کے بڑھنے میں مثل اور ملکوں کے بہت سی رکاوٹیں بھی تھیں۔ سوائے اسکے ریاستہائے متحدہ میں بعض بعض شہر نہایت عظیم الشان تھے۔ اگرچہ مغربی صوبوں میں جہاں آبادی کے بڑھنے میں یہ مزاحمتیں حائل نہیں ہیں آبادی کے بڑھنے کی رفتار اوسط سے مقابلۃً بہت زیادہ رہی۔ تو ہم اندازہ لگا سکیں گے کہ آبادی کس تیزی سے بڑھتی ہے۔

ان شہادتوں سے سٹر مالتھس اس نتیجہ پر پہنچے "کہ یہ امر بلاخوف تردید بیان کیا جا سکتا ہے کہ آبادی جب اسکے بڑھنے میں کوئی مزاحمت نہو تو اس رفتار سے بڑھتی ہے کہ پچیس سال میں دگنی ہو جاتی ہے"۔ (باقی آئندہ)

لطیف احمد

من کہ خود را فارغ از گبر و مسلمان کردہ ام
آنچہ چشم پرفنش فرمودہ است آن کردہ ام

زہد و رندی را بہم کردن چہ مشکل کار بود
سعی ہا انگیختم کیں مشکل آسان کردہ ام

غیر ازیں از رندی من تا بہ تقوی فرق نیست
بر ملا ہم کردم اکنوں آنچہ پنہان کردہ ام

بایدم رندی و مستی ہم بہ طرزِ تازہ کرد
زاں کہ ہر کارے کہ من کردم بہ ساماں کردہ ام

رسم و آئینِ ہم آغوشی نمی دانم کہ چیست
دستِ گستاخ آنچہ فرمودہ است من آں کردہ ام

پارہ ے پرسید شبلی را کہ چوں برباد رفت
مشتِ خاکے در ہوا پیششں پریشاں کردہ ام

مریخ کے ساتھ گفتگو

(۱) کب ہوگی؟ (۲) کس زبان میں ہوگی؟ (۳) کیسے ہوگی؟

علمائے فلکیات نے اجرام سماویہ میں سب سے زیادہ مریخ کے مطالعہ پر جو ہمت صرف کی ہے اس کے کئی وجوہ ہیں۔ بالکل ابتدائی وجہ تو یہ ہے کہ مریخ ہر دو سال بعد زمین کے مقابل ہوتا ہے۔ جس سے اُس کے بخوبی مطالعہ کر سکنے کا موقع زیادہ ملتا ہے۔ یہ وجہ تو ہمیشہ سے چلی آتی ہے۔ لیکن ۱۸۷۷ء میں ملّان کے مشہور اور محققی پروفیسر شیپارلی نے یہ دریافت کر کے دنیا کو مریخ کی جانب اور بھی زیادہ متوجہ کر دیا کہ مریخ کی سطح پر جو باریک باریک متوازی و متقاطع خطوط نظر آتے ہیں وہ درحقیقت نہریں ہیں جن کی تعمیر صرف ذی شعور ہاتھ سے ممکن ہے۔ بعد کی معلومات نے پروفیسر شیپارلی کے اس خیال کو یقین کے درجے تک پہونچا دیا۔

بیسویں صدی عیسوی نے آنکھ کھولی ہی تھی کہ ایک اور نامور پروفیسر ڈگلس نے امریکہ کی رصدگاہ ایک سے اعلان کیا کہ مریخ کی سطح سے زمین کی طرف کچھ روشنی کے خطوط آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو اس امر کا بیّن ثبوت ہیں کہ سیارہ مریخ آباد ہے۔ اور اُس کے باشندے ان نورانی خطوط کے ذریعہ سے زمین کے باشندوں سے گفتگو کرنی چاہتے ہیں۔ یہ قیاس ایک دلچسپ اور حیرت انگیز انکشاف ہے اور اس کے شائع ہوتے ہی علما "مریخیوں" سے نامہ و پیام کرنے کے ذرائع بہم پہونچانے کے درپے ہو گئے۔ اور اگرچہ ابتدا میں یہ کام سخت مشکل معلوم ہوتا تھا۔ لیکن برقیات کی ترقی نے اسے اتنا

نہیں رہنے دیا۔ چنانچہ سائنس دانوں نے اب اس مسئلہ پر بحث کرنا ہی چھوڑ دیا ہے کہ "ہم مریخ سے باتیں کر سکتے ہیں یا نہیں"؟ بلکہ وہ اُن سوالات پر غور کر رہے ہیں جنھیں میں نے اپنے اس مضمون کے عنوان کے ذیل میں لکھا ہے۔

اُس برقی تلاطم کا جو مریخ کی ہوا میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتا ہے امریکہ کے کامیاب عالم برقیات نکولا ٹسلا الملقب بہ "معجزہ نمائے امریکہ" نے بھی برسوں مطالعہ کیا ہے۔ ابتدا میں تو اسے محض موسمی اثر قرار دیا گیا تھا۔ لیکن اب خود ٹسلا کہتا ہے کہ کامل غور اور مشاہدے کے بعد "میں بھی اسی یقینی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ تلاطم خود باشندگان مریخ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ جس سے اُن کی غرض یہ ہے کہ ہم ساکنانِ ارض اُسے سمجھیں اور اُسکا جواب دیں"۔

اس بنا پر ٹسلا ۱۹۰۹ء سے باشندگانِ مریخ سے گفتگو کرنے کی کوشش شروع کرنیوالا ہے۔ اُسے اپنی کامیابی پر پورا بھروسہ ہے۔ ہر پندرہ سال بعد مریخ زمین اور آفتاب دونوں سے قریب ترین موقع پر آتا ہے۔ اس طرح گویا آخر اگست ۱۹۰۹ء میں مریخ کا قرب زمین سے صرف ساڑھے تین کروڑ میل ہوگا۔ حالانکہ بالاوسط زمین اور مریخ کے مابین چھ کروڑ دس لاکھ میل کا بُعد رہتا ہے۔ پس اس قرب سے فائدہ اُٹھانے کے لئے پروفیسر ٹسلا آخر اگست ۱۹۰۹ء میں زمین کی طرف سے مریخ کو پہلا پیغام بھیجینگے۔ لہذا امید کیجاتی ہے کہ آیندہ سال ۱۹۰۹ء میں مریخ کے ساتھ گفتگو کا آغاز ہو جائیگا

زبان کا مرحلہ درحقیقت سخت پیچیدہ ہے۔ مگر علماء سائنس ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ باشندگانِ مریخ فہم و فراست میں ہم سے بہت آگے ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے پیغام ہم تک پہنچا دے شروع کر دیئے

رہیں۔ جنکا جواب دینا تو درکنار ہم اب تک انہیں کما حقہٗ سمجھ بھی نہیں سکے۔ پس وہ اپنے اعلےٰ تر علم کے ذریعہ سے ہمارے پیغام کو فوراً سمجھ لیں گے۔ اور ہمارے ضعیف سے ضعیف اشارات کا مطلب نکال لیں گے۔ بلکہ اپنے ساتھ باتیں کرنا ہمیں خود سکھالیں گے۔

ایک عربی مثل ہے "الحدیث ذو شجون" یعنی بات میں سے بات پیدا ہوتی ہے۔ جب مریخ کے ساتھ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہو گیا تو پھر تو ہمکلامی کے لئے بہت سے موضوع نکل آئیں گے۔ لیکن اس وقت ایک سوال یہ بھی ہے کہ "ہمارے پہلے پیغام کا مضمون کیا ہو گا"؟ اس کا فیصلہ ٹسلا نے یہ کیا ہے کہ "سب سے پہلا پیغام جو میں بے تار کی خبر رسانی کے ذریعے سے بھیجوں گا یہ ہو گا کہ ہم آپ سے یہ دریافت کرنے کی کہ آپ کا مزاج کیسا ہے تقریباً دس ہزار سال سے کوشش کر رہے ہیں"۔

جب سے مریخ کے ساتھ گفتگو کرنے کا خیال پیدا ہوا ہے اُس وقت سے تیسرے اور آخری سوال کے حل کرنے کیلئے کہ "گفتگو کیسے ہو گی"؟ بہت سی تجاویز پیش کیجا چکی ہیں۔ اور اُن پر وقتاً فوقتاً گرم مباحثے ہو چکے ہیں۔ ایک تجویز یہ تھی کہ ایک عریض و طویل جھنڈا بلند کر کے اپنے دوست سیارہ مریخ کے پیغاموں کا خیر مقدم کیا جائے۔ یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ آئرلینڈ کے رقبے کے برابر (۶۰۵۲۱ مربع میل) ایک جھنڈا اس مقصد کو اچھی طرح پورا کر سکے گا۔ ایک دوسری تجویز یہ بھی تھی کہ ہم اپنی زمین پر بڑی بڑی نہریں کھودیں۔ جب باشندگانِ مریخ ہماری زمین کی شکل میں ایسی نمایاں تبدیلی دیکھیں گے تو ضرور اُسکی کنہ تک پہنچ جائیں گے اور اُسکے جواب میں وہ شاید کوئی فلک فرسا پہاڑ بنائیں گے جس کے مقابلے میں کم از کم ہمارا کوہِ الپس۔ جس کا ارتفاع ۱۵،۷۸۴ فٹ ہے۔ بالکل بے حقیقت

ہوگا۔ لیکن فنافی المریخ ٹسلا ان تجاویز میں سے کسی سے بھی متفق نہیں ہے بلکہ مشہور میکسم توپ کے موجد سر ہائرم میکسم کے خیال پر کاربند ہوکر آبشار نیگرا سے برقی قوت حاصل کرکے باشندگانِ مریخ کی جانب پیغام بھیجنا چاہتا ہے اُسنے اعلان کر دیا ہے کہ آبشار نیگرا سے برقی قوت پیدا کرنیوالی جتنی کمپنیاں ہیں اُن سب نے مجھے نیگرا کے ذریعے سے مریخ تک پیغام پہنچانے میں مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ ٹسلا نے ایک ایسا طریقہ دریافت کرلیا ہے جس سے بذریعہ مارکونی گراف (بے تار برقی خبر رسانی) چار کروڑ سے دس کروڑ میل تک پیغام بھیجا جاسکتا ہے۔ آبشار نیگرا سے اگرچہ ایک ارب گھوڑوں کی طاقت پیدا ہوسکتی ہے۔ مگر جو خلیج مریخ اور زمین کے درمیان حائل ہے اُسکے پار بے تار برقی پیغام بھیجنے کے لئے اتنی قوت کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ ٹسلا کے بے تار برقی آلات بمقام وارڈن کلف (لونگ آئی لینڈ) قایم ہوچکے ہیں۔ جن سے اسّی کروڑ گھوڑوں کی طاقت حاصل ہوسکتی ہے لیکن ٹسلا کے مقاصد کے لئے اتنی قوت بھی بہت زیادہ ہے۔ ٹسلا نے بتایا ہے کہ اِس ذریعے سے مریخ کے ساتھ آسانی سے گفتگو ہوسکے گی۔ اور یہ کہ اگر مریخ والے بھی یہی طریقہ استعمال کریں تو انھیں ہم تک پیغام پہنچانے کے لئے نسبتاً بہت کم قوت درکار ہوگی۔ کیونکہ جو قوت زمین سے مریخ تک پہنچ سکتی ہے اُسکا صرف سولھواں حصّہ مریخ سے زمین تک سہولت کے ساتھ پہنچ سکتا ہے۔ غرض یہ ترکیب مریخ کے ساتھ گفتگو کی نکالی گئی ہے۔

اِس تمام جدّوجہد کے نتایج پر اِس وقت بمشکل کوئی قیاس قائم کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اس قدر یقینی ہے کہ اُن لوگوں کی نسبت (جن کی ترقی ہماری دنیا کے کوئی شکل اختیار کرنے سے پہلے ہی شروع ہوگئی تھی) یکایک علم حاصل

ہو جانے سے ہمارے سائنس دانوں اور فلاسفروں کے آدھے نظریے غالباً الٹ جائیں گے۔ اور ہماری زندگی اور شاید ہمارے عقائد کا رنگ بالکل بدل جائے گا۔

دیدہ باید کہ چہ از پردہ بروں می آید

محمد مقتدی خاں

جب تیرے تصور سے ہوتی ہے ہم آغوشی — پہروں ہمیں رہتی ہے بیہوشی سی بیہوشی

یہ راز کھلا ہم پر ہنگام قدح نوشی — مدہوشی ہے ہوشیاری ہوشیاری ہے مدہوشی

سر دیکے ہوئی ہمکو مدفن سے ہم آغوشی — سفاک مبارک ہو تجکو بھی سبکدوشی

کس فکر میں ہے زاہد کر خوب قدح نوشی — کہتے ہیں جسے جنت ہے غم کی فراموشی

ہم تیرا کرم کیونکر اے پیر مغاں بھولیں — شیوہ ہے کمینوں کا احسان فراموشی

شرمندۂ عصیاں ہو محشر میں ترا بندہ — ستار تو ہے یارب کر میری خطا پوشی

در پردہ ہے ماتم میں غم اسکو بتوں کا ہے — پوچھو نہیں زاہد کعبہ کی سیہ پوشی

صورت نے تیری سکو تصویر بنا ڈالا — ہے محفل خوباں میں بتخانہ کی خاموشی

دشمن سے گلے ملتے وہ شوخ نظر آیا — اے مرگ کہاں ہے تو کر ہم سے ہم آغوشی

یہ راز نہیں کھلتا کیوں دی چمن آرا نے — نرگس تجھے حیرانی سوسن تجھے خاموشی

مشاطہ بھی حیراں تھی اسکی دم آرائش — آئینہ کو تھا سکتہ خود اسکو تھی بیہوشی

اے یاد جوانی تو سرمایۂ زحمت ہے — پیری میں بڑی رحمت ہے تیری فراموشی

پردہ نہیں زیبندہ مشتاق تماشا سے — اس جلوہ نمائی پر اے یار یہ روپوشی

کیا کیا غم ساقی میں پیتے ہیں لہو اپنا — ہم رندوں کی مے نوشی زاہد ہے بلا نوشی

ہستی کی فراموشی آرام کی صورت ہے — جنت میں کہاں زاہد ہستی کی فراموشی

بالین آخر پر وہ آئے بھی تو کب آئے — جب نزع میں طاری تھی بیچارے کو بیہوشی

امن وخوشی

(سلسلے کے لئے جنوری کا پرچہ ملاحظہ ہو)

خوبصورت اشیا کے پرکھنے کے لئے بھی ایک خاص قوت تمیز درکار ہے گتے اور ہاتھی کی سمجھ کی بہت تعریف ہوتی ہے۔ لیکن کوئی شخص بھی باور نہیں کرے گا کہ ان حیوانوں کو دنیا کے عمدہ ترین منظر سے ذرا بھی فرحت حاصل ہو سکتی ہو۔ بعض آدمی اس امر کے شاکی ہوتے ہیں کہ ہم اُداس ہیں۔ بیکار ہیں حقیقت میں اپنی سستی کے موجد وہ آپ ہوتے ہیں "کوئی ذی علم جسکو خدا نے صحت۔ چشم بینا۔ دست کارکن۔ اور فارغ البالی عطا کی ہو اگر یہ کہے کہ مجھے کسی شغل کی تلاش ہے تو یہ سمجھ لو کہ قادر مطلق نے یہ تمام برکتیں ایک ایسے انسان پر نازل کیں ہیں جو اوسکا مستحق نہیں"۔

خوشی دولت اور منزلت پر منحصر نہیں۔ محبت۔ فیاضی۔ اور تسکین قلب کے بغیر ممکن ہے کہ کوئی امیر یا رئیس ہو جائے۔ لیکن خوش وخرم نہیں ہو سکتا۔

ایرانیوں میں ایک کہاوت ہے کہ شاہ اعظم نے تنگ آکر نجومیوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایسے آدمی کی قمیص پہننے سے جو کمال درجہ خوش ہو خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ بہتیری تلاش کی گئی لیکن اس وصف سے متصف شخص نہ تو کچہری میں ملا اور نہ دیگر آسودہ حال طبقوں میں۔ آخر کار معلوم ہوا کہ ایک مزدور جو اپنا کام کرکے آرہا تھا اس شرط کو پورا کرتا ہے۔ یہ شخص بالکل خوش تھا۔ لیکن افسوس! کہ مرض کا علاج نہ ہو سکا۔ وجہ یہ کہ اسکے

پاس کوئی قمیص نہ تھی۔

حکما اس بات پر متفق ہیں کہ خوشی نہ تو دولت سے حاصل ہو سکتی ہے نہ اقتدار سے۔ بادشاہوں کے تاج میں بھی کانٹے ہوتے ہیں (یعنی اُن کو بھی فکر دامنگیر رہتی ہے) "اکثر آدمی شوکتِ شاہانہ کی بھڑک پر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ مجھے اس پر کچھ تعجب نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ عوام الناس میرے خیال میں عموماً ظاہری حالات سے خوشحالی اور مصیبت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ لیکن میں تجربہ سے بخوبی جانتا ہوں کہ بادشاہوں کو بڑے سے بڑے عیش کا عشرِ عشیر بھی نصیب نہیں ہوتا۔ بلکہ بڑی سے بڑی تکالیف کا سب سے بڑا حصہ اُنہیں ملتا ہے"۔ کسی کو مصیبت کا سامنا ہو تو ایک فرانسیسی مصنف کے اس مقولے سے تسکین حاصل کرے۔ "اس آفت کا کیا باعث ہے۔ اے انسان۔ کیا اسکا سبب یہ نہیں کہ تو اپنے عنصر سے باہر نکل کر یہاں زمین پر آگیا۔ تو بہشت کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ زمین تیرا مکان نہیں۔ اور جس چیز کو خدا سے کوئی نسبت نہیں اس کو تجھ سے بھی کوئی واسطہ نہیں"۔

بکین کا قول ہے کہ "نہ تو خوشی کے مختلف مدارج معلوم ہو سکتے ہیں اور نہ مہربانی کے دلآویز طریقے بیان میں آسکتے ہیں نہایت درجے کی مہربانی کی نسبت زیادہ سے زیادہ بیان جو ہم کر سکتے ہیں یہ ہے کہ اس میں نامعلوم اور ناممکن البیان فریفتگی ہوتی ہے۔ سب سے بڑی برکت کی نسبت ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ بیان سے باہر ہے"۔

ہم سب اپنی منظورِ نظر اشیا کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ بقول انجیل مقدس ایسی شے پر زر صرف کر سکتے ہیں جو روٹی نہیں۔ اور ایسی شے کے حصول

میں محنت کو صرف کرتے ہیں جس سے طمانیت حاصل نہیں ہوتی'' لیکن چشم بصیرت سے دیکھیں تو ہم سب اطالیہ کے نامور شاعر ڈانٹے کے ہم خیال ہو سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے ''مجھے ہر طرف غایت درجے کی مسرت معلوم ہوتی تھی۔ موجودات کا چہرہ کلیتہً خنداں معلوم ہوتا تھا۔ لاثانی خوشی۔ ناممکن البیان انبساط۔ امن اور محبت کی دائمی زندگی۔ لازوال دولت اور لاانتہا برکت ہر طرف نظر آتی تھیں''

فطرت کی ہر شے ایک ایسے قانون کے تابع ہے جس سے زیرکی اور فیّاضی مترشح ہوتی ہے۔ ہر شے ایک سلسلہ میں مربوط ہے۔ اور اسکا فعل بہتری پر دال ہے۔ اگر ہم رنج اٹھاتے ہیں تو یا تو یہ ہمارا قصور ہوتا ہے یا بہبودِ عامہ کے لئے ہم ایسا کرتے ہیں روما کی فلسفی سنیکا کا قول ہے کہ ''کوئی فرض ایسا نہیں جس کی ادائگی سے خوشی حاصل نہ ہو۔ اور نہ کوئی برائی ایسی ہے جسکا دفعیہ نہ ہو سکے''

سسرو سے منقول ہے کہ ''ایپی کیورس[۱] نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ خواہشیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ اول وہ جو طبعی اور ضروری ہیں۔ دوم وہ جو طبعی تو ہیں لیکن ضروری نہیں۔ سوم جو نہ تو طبعی ہیں نہ ضروری۔ اور ان کی نسبت مذکور ہے کہ جو ضروری ہیں اُن کے پورا کرنے میں چنداں تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی نہ بہت خرچ ہوتا ہے۔ اور نہ اُن خواہشوں کے پورا کرانے میں کوئی وقت واقع ہوتی ہے جو طبعی اور غیر ضروری ہیں۔ کیونکہ فطرت خود اسقدر زر و مال آسانی سے پیدا کر لیتی ہے جس پر اُسکی خوشنودی مبنی ہے۔

لیکن فضول آرزوؤں کا نہ تو کوئی ٹھکانا ہے اور نہ اُن میں میانہ روی کا اصول پایا جاتا ہے''

[۱] یونانی فلسفی جسکا قول تھا کہ دنیا میں زندگی مزے سے کاٹنی چاہئے۔

زندگی کا پورا لطف اٹھانے کے لئے ضرور ہے کہ ہم ایثار کے لئے تیار ہیں بحریص وہ راحتوں سے اجتناب کریں اور اپنی منفعت کا چنداں خیال نہ کریں ایک فرانسیسی مقولہ ہے کہ "قرار اصلی اسوقت مل سکتا ہے جب خودی فراموش ہوجائے"

نفس کشی سے بہ نسبت تن پروری کے زیادہ خوشی حاصل ہوسکتی ہے۔ حواس کے ذریعہ سے دنیا کی اشیا کا پورا پورا مزہ حاصل ہوتا ہے۔ اگر ہم حواس کے تابع رہیں تو ان کا یہ حال ہے کہ قدیم زمانہ کی موہنی مورتوں[52] کی طرح ہماری جہاز کے یا تو بحر حیات کے چٹانوں پر ٹکڑے کر ڈالیں گے یا اسے گرداب زندگی میں فنا کردینگے۔" اس شخص کی حالت کیا مزے کی ہے جو کسی کی مرضی کے تابع نہیں ہوتا (یعنی آزاد ہوتا ہے) جسکو تدین کے خیالات اسے زرہ بکتر کا کام دیتے ہیں اور جسکی انتہائے لیاقت اسکی راستگوئی ہوتی ہے۔ اس زمانے میں ایک آفت یہ ہے کہ فرصت عنقا ہے۔ ہماری زندگی مصروفیت کے چکر میں گزرتی ہے۔ پورشیا[53] نے جو کہا تھا "میرا چھوٹا سا جسم اس عظیم دنیا سے بیزار ہوگیا ہے" یہ مقولہ کئی عورتوں پر۔ عورتوں پر ہی کیا موقوف ہے کئی مردوں پر۔ صادق آتا ہے۔ واضح ہو کہ گھبراہٹ میں کام اچھا نہیں ہوسکتا غور و خوض کے لئے وقت اور سکون کی ضرورت ہے۔

---

۵۲ فسانوں میں لکھا ہے کہ پرانے زمانہ میں اطالیہ کے جنوبی ساحل پر یہ پرند رہتے تھے جنکے چہرے دوشیزہ لڑکیوں کیطرح تھے۔ یہ جہاز والوں کو اپنی سریلی آواز سے بہلا کر کنارہ کی طرف لے آتے تھے۔ اور انکو مار ڈالتے تھے۔ انہیں "سائرن" سے موسوم کرتے ہیں۔

۵۳ شیکسپیر کے ایک مشہور ناٹک میں اس عورت کے حسن و عشق کا قصہ درج ہے۔

کنگسلے کہتا ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ "ہم سب کو شگون کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ دل و دماغ کو آرام ہو۔ اور طبیعت کو قرار۔ بڑی خواہشوں سے اجتناب ہو اور ایثار کے اوصاف پائے جائیں۔ ایسے آدمی کو نہ افسردہ دلی کا غلبہ ہوتا ہے اور نہ اُسکو کسی محرک کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ اُسے اضطراب ہوتا ہے۔ نہ پریشانی۔ اس قسم کے آدمی کو زاہدانہ پابندی کی بھی ضرورت نہیں ہوتی ہے وہ اس وجہ کی قوت رکھتا ہے کہ خدا کے عطیات کو جائز طور سے استعمال کر سکے۔ الغرض ایسا انسان پورے درجہ کا اعتدال پسند ہوتا ہے۔ نہ صرف اکل و شرب میں بلکہ تمام خواہشوں اور خیالات اور افعال میں وہ اعتدال ملحوظ رکھتا ہے۔

ہاں میں مکرر کہتا ہوں کہ مجھے معلوم ہے کہ ہمکو آرام کی ضرورت ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ قرار یا آرام صرف وہیں ملے گا جہاں پہلے تھا"

ایکٹی ٹس کا قول ہے کہ "خدا کا حکم ہے کہ ایسا کرو۔ اگر تم نہیں کروگے تمکو تاوان دینا ہوگا۔ تمکو سزا ملے گی۔ کونسی سزا؟ بس یہی عدم ادائگی فرض۔ اسی میں تمہاری حیا۔ ایمانداری اور معقولیت کے جوہر زائل ہوجائیں گے۔ کیا اس سے بڑھکر اور کوئی سزا ہوسکتی ہے"

رسکن کہتا ہے کہ "ہم کئی حوائج کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ ووٹ دینے کا حق ہمکو چاہئے۔ آزادی ہمکو چاہئے۔ دل لگی ہمکو چاہئے۔ روپیہ ہم کو چاہئے لیکن کسی کو یہ بھی خبر ہے کہ ہمکو امن بھی چاہئے۔ اگر امن مطلوب ہو تو یاد رہے کہ یہ دو طرح سے حاصل ہوسکتا ہے۔ ایک تو مطلقاً تمہارے اختیار میں ہے۔ یعنے اپنے آپ کو خوش کن خیالات کا مخزن سمجھ لو۔

ابھی تک کسی کو معلوم نہیں کہ مرغوب خیالات کو دل میں رکھنے سے کسقدر

مسرت حاصل ہوتی ہے اور تنگدلی نام کو بھی نزدیک نہیں آتی۔ ایسی مفید معلومات کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ کسی کو بھی اوائل عمر میں اس قسم کی تربیت نہیں ہوئی۔ روشن خیالات۔ کامیابی کی نگہداشت عالی شان سوانح۔ سچے مقولے سب قیمتی اور راحت افزا خیالات کے خزانے ہیں۔ ان خیالات کو نہ فکر مندی پراگندہ کر سکتی ہے نہ دکھ درد تاریک بنا سکتا ہے۔ اور افلاس ہم سے چھین سکتا ہے۔ یہ خیالات کے خزانے ایسے محل ہیں جن میں ہماری روحیں رہتی ہیں۔ ان کی تعمیر کے لئے ہاتھوں کی ضرورت نہیں ہوتی"۔

موت سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ جبر یہ زینو[۱] کا ایک معلم اخلاق کہتا ہے کہ "موت ہی صرف اس قسم کا رنج ہے جسے ہم کبھی محسوس نہیں کر سکتے۔ جب ہم زندہ ہیں موت نہیں۔ جب موت آتی ہے۔ ہم نہیں ہوتے"۔

ایک اور بزرگ کا قول ہے کہ "ترک ہوس سے امن نصیب ہوتا ہے"

زندگی میں جس طرح بڑی بڑی باتوں سے تکلیف پہونچتی ہے اسیطرح چھوٹے چھوٹے امور بھی باعث رنج ہوتے ہیں۔ انجیل میں مذکور ہے کہ صحت بدن سے بڑھکر کوئی دولت نہیں۔ اور انبساط قلب سے بڑھکر کوئی خوشی نہیں۔ نیک دل شاہ روما انٹونینس نے بستر مرگ پر اپنے پاسبان کو لفظ راہداری جو بتایا تھا وہ "اطمینان قلب" (یا شانتی) ہے حضرت مسیح کی حیات میں ہمیشہ یکساں بردباری پائی جاتی تھی۔ آپ فرماتے ہیں "وہ اپنی گردن پر وہی جوا اٹھالو جو میں نے اٹھایا تھا تو تمہاری روح کو امن حاصل ہوگا"۔

خوشی کے حصول کے لئے کسی خارجی شے کی تلاش کی ضرورت نہیں خوشی خود ہمارے اندر۔ ہمارے نفس میں موجود ہے۔ اور آسمان کی بادشاہت

[۱] زینو اس فرقے کا بانی تھا۔ ان لوگوں کے عقائد کے بموجب دنیا کی رنج و راحت سے انسان کو کچھ واسطہ نہیں

تمہارے اندر موجود ہے" اگر ہم اس جگہ خوش نہیں ہو سکتے تو آیندہ کی خوشی کی کیونکر متوقع ہوتی ہیں کیا کارساز عالم کو آیندہ دنیا میں بہ نسبت حال کی ہمارے معاملات میں زیادہ دلچسپی ہوگی اگر دنیا میں ہم پیدا کر سکتے ہیں تو عاقبت میں کیا توقع ہو سکتی ہے۔ وجہ کیا ہے کہ امن ہم سے دور رہتا ہے یہی خود غرضی۔ لالچ۔ تکبر اور ہوس۔ ان چیزوں سے امن پرے بھاگتا ہے اگر یہ خواص نہوں تو ہمکو خوشی اس دنیا میں نصیب ہو سکتی ہے۔ جہاں یہ ہوں خوشی کا وجود بھی ممکن نہیں۔ اگر اس دنیا میں ہمیں یہ فکر دامنگیر ہو کہ مبادا ہماری فلاں قیمتی شے ضایع ہو جائے۔ تو آیندہ دنیا میں یہ احساس کس قدر زیادہ تیز ہوگا اگر دوسروں کے ساتھ سلامت روی سے ہم نہیں رہ سکتے تو دوسری جگہ امن سے رہنے کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ اگر ہم امن اور خوشی کا انحصار خارجی اشیا پر رکھیں گے اور محض دوسری دنیا کی راہ دیکھیں گے۔ تو دوسری دنیا میں کیا تیسری دنیا کی راہ نہ دیکھتے رہیں گے۔ اور کیا یہ سلسلہ اسی طرح نہ جاری رہے گا؟

اس میں کلام نہیں کہ فی الحقیقت خوشی کے تینوں پہلو مبارک ہیں۔ توقع حصول۔ اور گزشتہ راحت کی یاد۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ خوشی کے حاصل کرنے کا ایک خالص اور بڑا ذریعہ یہ ہو کہ ہم زمان مستقبل پر نگاہ ڈالیں اور اُن عزیزوں سے ملنے کی توقع رکھیں جو ہماری آنکھ سے اوجھل ہو گئے ہوں۔ یعنی جو کچھ اب ہماری نظر سے مخفی ہے اسکا بہت ساحصہ صراحت کے ساتھ دیکھ لیں۔ تسکین اور انبساط کے اس ذریعے کے برخلاف میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ لیکن واضح ہو کہ موجودہ برکات کی کم قدری سے کفرانِ نعمت کے الزام کو اپنے اوپر عاید نہیں ہونے دینا چاہیئے۔

پس اپنے جذبات پر اس قسم کا قابو حاصل کرو کہ تم کہہ سکو" اے مالک اے

میرے خدا۔ اپنی مشیت کے مطابق کر۔ میں مطمئن ہو کر بیٹھا رہونگا۔ اور جنبش نہیں کرونگا۔ مبادا کہ تیرے بازو کی امداد کے جاتے رہنے سے وہ افسوں بے اثر ہو جائے جس کے ذریعے سے میں نہایت آرام سے اپنے (آسمانی باپ) کے سینہ سے لگ کر تسکین حاصل کرتا ہوں"۔

ورڈس ورتھ اس امن کو اُس خموشی سے تعبیر کرتا ہے جو تاروں بھرے آسمان میں پائی جاتی ہے اور اُس سناٹے سے مثال دیتا ہے جو سنسان پہاڑیوں میں پایا جاتا ہے۔

جو اس امن کو حاصل کرے اُس کے گھر میں فرشتوں کی آمد اسی طرح ہو گی جس طرح زمانہ قدیم میں حضرت ابراہیم کے پاس فرشتے آتے تھے۔

ممکن ہے کہ کئی نئی خوشیاں ایسی ہوں جن سے انسان نا آشنا ہو۔ اور جنکو وہ تہذیب کے شاندار راستہ پر پائے گا۔ جرمی ٹیلر لکھتا ہے کہ روح اور جسم ملکر اُس وقت انسان کامل بنجاتا ہے جب روح جسم پر (جو کہ اُسکا شریک تو ہے لیکن۔ ادنی درجہ کا خادم) دانشمندی سے حکومت کرتی ہے۔ محبت سے غالب رہتی ہے۔ اسکے لئے مفید طور سے تردد کرتی ہے اور اُسکے حوائج کو بکثرت پورا کرتی ہے۔ نیز نیک نیتی سے اسکی رہنمائی کرتی ہے۔ برعکس اسکے اگر جسم حکومت کرے اور ہوا و ہوس کے غلبہ سے اول تو قوت مدرکہ کا بیجا استعمال ہوتا ہے اور پھر قوت ارادہ اور انتخاب کا بہترین حصہ زیر ہو جاتا ہے۔ یہ صورت ہو تو سمجھ لو کہ جسم اور روح کی موزوں رفاقت نہیں۔ اُس وقت آدمی کو بیوقوف اور بدبخت کہتے ہیں۔ اگر روح حکومت نہیں کرتی (یعنی تابع ہو کر رہتی ہے) تو یہ انبار ہو نہیں سکتی۔ لازم ہے کہ یا تو روح حاکم بن کر رہے یا غلام"

اگر ہم زندگی کا مزہ نہیں لے سکتے تو ہمارا اپنا قصور ہے۔ یہ قول رسکن کا ایسے

آدمی ہوتے ہیں جو کارنمایاں کر کے دکھلاتے ہیں۔ لیکن زندگی کا حظ سب اٹھا سکتے ہیں۔" نفس کو پُرامن اور خوش رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں دانشوری اور شرافت کے خیالات بھر دیئے جائیں۔ افلاطون لکھتا ہے کہ خوبصورتی۔ عقلمندی اور نیکی الٰہی خواص ہیں۔ اِن سے روح کے بازو کو سرعت سے تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اگر روح کی غذا بدی ہو تو وہ مرجھا کر تلف ہو جاتی ہے"

پس (طرزِ عمل کے) انتخاب میں دانائی سے کام لینا چاہیئے۔ اور "خوشی کو اپنا بنا لینا چاہیئے اور اپنے فراخ دل میں اُسے جگہ دینی چاہیئے۔ اور ترقی کے لئے اُسے وقت دینا چاہیئے اور اُسکی تربیت کرنی چاہیئے۔ پھر یہ صورت ہوگی کہ خواہ تم کھیت میں ہل چلاتے ہوگے خواہ صبح کے مقدس اوقات میں مزدوری کرتے ہوگے۔ خوشی آئے گی اور تمہارے لئے گیت گائے گی۔ خوش رہنا ایک مستحسن وطیرہ ہے۔ خوش رہنا خدا کا شکریہ ادا کرنا ہے"

سقراط کا قول ہے کہ "بہترین انسان وہ ہے جو اپنے تئیں کامل بنانے کی بہترین سعی کرتا ہے۔ اور غائت درجہ کی راحت اُسی آدمی کو نصیب ہوتی ہے جو بدرجۂ اقصٰے اِس امر کا احساس رکھتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو درجۂ کمال تک پہنچا رہا ہے"!

نذر محمد۔ بی۔ اے

حیرت زدہ ہوں اپنی جوانی سے جھوٹ کے
سب نقد مال لے گئی کمبخت لوٹ کے

اوروں کی طرح گو نہیں ناصح کا اعتبار
اِک یہ بھی اپنے دوست سہی جھوٹ موٹ کے

ساقی سا کون ہے متحمل جہان میں
سیکش گرے ہی پڑتے ہیں شیشوں پہ ٹوٹ کے

آپ اپنا پردہ پوش ہوا ہے حسن تو ٹوٹ کیوں
بھر دی خدا نے تجھ میں حیا کوٹ کوٹ کے

واعظ نے مئے کی ہجو میں دریا بہا دیا
ہم سے تو کر رہ گئے یونہیں چپ گھوٹ گھوٹ کے

نکلی شب فراق کی بیکار داستاں
اے شاد تم تو رونے لگے پھوٹ پھوٹ کے

جزائر بحرین

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

جزائر بحرین اور برّاعظم کے درمیان سمندر کے اُتھلے ہونے کی وجہ سے ان جزیروں کو بہت کچھ جغرافیائی اور تجارتی شہرت حاصل ہوئی ہے سواحل عرب پر بڑے بڑے جہازوں کا پہنچنا دشوار ہے، یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں کارواں اس راستے سے ہوکر گزرتے تھے، اور تمام مال واسباب بحرین سے جہازوں پر بار کیا جاتا تھا۔ سرایم ڈورانٹ اپنی مفصل رپورٹ میں یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ "اگر جزائر بحرین کسی باقاعدہ گورنمنٹ کے تحت میں ہو تو وہ ایران اور عرب کے لئے ایک اعلیٰ درجے کی تجارت گاہ ہونے کی قابلیت رکھتا ہے اور نیز ایک عمدہ بندرگاہ کارخانہ جات کے قرب میں قائم ہوسکتی ہے"

اگر یوفریٹیس ویلی (یعنی وادیٔ فرات) جاری ہوگئی ہوتی، اور اُس کا صدر مقام کویت قرار پاتا، تو جیسا کہ اڈمرل چارلس وڈ اور جنرل چیسنی کی جماعت پیمایش کنندہ کی رائے تھی، جزیرہ بحرین اور اُس کے متعلقہ جزائر فوراً ترقی کے اونچے زینے پر پہنچ گئے ہوتے۔ دراصل اگر دیکھا جائے تو بحرین خلیج فارس کا سیپرس (قبرس) ہے، اگرچہ آج کے روز یہ تجویز ملتوی ہوگئی ہے، مگر جب انگلستان، روس، اور ٹرکی کے باہمی اختلافات رفع ہوجائیں گے اور کوئی رائے ان تینوں قوتوں کے باہمی اتفاق سے اس مشرقی ریلوی کے متعلق قرار پاسے گی، اُس وقت خلیج فارس ایک آن واحد میں تجارت کا شارع عام بن جائے گا اور پھر جزائر بحرین کی جانب بھی توجہ

مبذول ہوگی"

پرتگیز، جو پہلی یورپی قوم ہے جس نے سکندر اعظم کے بعد خلیج فارس میں قدم رکھا ہے، بحرین کی اہمیت کا اندازہ کر چکے ہیں۔ ان کے زمانے سے قبل یہ خلیج محض ایک اسلامی جھیل کی حیثیت رکھتی تھی۔ سکندر اعظم کے بعد جس شخص نے سب سے پہلے اہل یورپ کے لئے اس خلیج کا راستہ کھولا وہ البیوکرک ہے۔ شروع سولہویں صدی یعنی ۱۵۰۰ء میں اس نے خلیج فارس کی راہ دریافت کرنے کا ارادہ کیا۔ ۱۵۰۶ء میں تین بیڑے ٹرسٹان دی اکونا کی ماتحتی میں مشرق کو روانہ ہوئے۔ جنکا دوم کمان افسر البیوکرک تھا۔ ٹرسٹان نے تھوڑی دور آکر ساتھ چھوڑ دیا، اور البیوکرک آگے نکل گیا۔ اس سپہ سالار نے پہلی دفعہ ہرمز پر حملہ کیا۔ جس کا حاکم اسوقت ایک ایرانی شاہزادہ تھا۔ اس نے اسطرح یہاں اور مسقط میں پرتگالی قوت کا سکہ بٹھا کے بحیرہ فارس میں جانے کا راستہ کھولا۔

مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بحرین کا بادشاہ حاکم ہرمز کا ماتحت تھا اور اسکو سالانہ چالیس ہزار سکہ رائج الوقت خراج دیا کرتا تھا، لیکن البیوکرک کی تحریرات سے پایا جاتا ہے کہ پہلے سے بحرین پر قبضہ کرنے کی اسکیم تیار کر چکا تھا، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "جب ہرمز اور بحرین ان کے قبضہ تصرف میں آ جائیں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ پورے طور سے خلیج فارس پر قبضہ ہو گیا"۔

اسمیں شک نہیں کہ اسوقت البیوکرک کی اسکیم محض خیالی پلاؤ معلوم ہوتی ہوگی، کیونکہ اُس کا ارادہ تھا کہ دریائے نیل کا رُخ پھیر کے اسکو بحیرۂ احمر میں گرا دیا جائے، اور اسطرح مصر کو ویران کرکے ہندوستانی تجارت کا راستہ

بذریعہ خلیج فارس یورپ سے کھول دیا جائے۔ اِس اسکیم کا ماحصل صرف سرسری طور پر ہمکو معلوم ہوا ہے۔ اس لئے کہ البیوکرک کی اتفاقی موت نے وہ نقشہ ہی بدل دیا، اور جو کچھ اُس کے دل میں تھا اسکا اظہار صرف چند مستحکم قلعوں کی صورت میں ظاہر ہونے پایا، باقی سارے لنبے چوڑے منصوبے اسی کے ساتھ کتم عدم میں پوشیدہ ہو گئے۔

ہمکو صحیح طور سے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ پرتگیزوں نے بحرین کو کب فتح کیا، لیکن ۱۵۲۱ء کے ایک واقعے کا پتہ چلتا ہے جس میں عربوں نے ایرانیوں اور پرتگیزوں کے مقابلے میں بغاوت کی تھی، اور اسی بغاوت میں مرکیل ایک پرتگیز افسر مارا گیا تھا۔ اس بلوے کا بانی، شیخ حسین بن سعید نامی عرب کے قبیلہ بنی ربیعہ سے تھا۔ دوسرے سال پرتگالی گورنر ڈان لوئیس دی نینزرنے شیخ حسین سے صلح کر کے اس کو پرتگال کیجانب سے جزیرہ بحرین کا سفیر مقرر کر دیا۔ چند سال کے بعد حاکم بحرین نے پھر مخالفت شروع کی جس کے مقابلے کے لئے سرسیمن ڈی اکونا بھیجا گیا۔ ہرچند کہ اکونا اور اس کے اکثر ہمراہی عارضہ تپ میں مبتلا ہو کر مر گئے، لیکن پرتگیزوں کی قوت پھر اپنی اصلی حالت پر آ گئی۔

سولہویں صدی کے آخر میں پرتگال اسپین کی سلطنت کا محکوم ہو گیا، اور اُس وقت سے پرتگیزوں کی قوت خلیج فارس میں کم ہونی شروع ہو گئی۔ اُن کی فوجیں بجائے اس کے کہ مشرق نوآبادیوں کے انتظام کے لئے مقرر کی جاتیں فلانڈرس کی لڑائیوں میں بھیجی جانے لگیں، اور ۱۶۲۲ء میں تو ان کی مشرقی قوت کا بالکل ہی خاتمہ ہو گیا جب شاہ عباس نے انگریزی توپ خانے کی مدد سے ہرمز اور بحرین پر تسلط کر لیا۔

اس کے بیس سال بعد پھر ایک پرتگیز سوداگروں کی کمپنی نے اس جزیرے کے موتیوں کے لالچ میں اپنے جہازوں کا بیڑا بحرین کو فتح کرنیکی غرض سے روانہ کیا، لیکن بیڑے کو خلیج فارس میں عربوں نے لوٹ مار کے تباہ کر دیا۔ اسطرح خلیج فارس پرتگال کی قوت کا خاتمہ ہوا جسکی یادگار اس وقت صرف چند قلعے باقی رہگئے ہیں جو بحرین میں واقع ہیں۔

۱۶۲۲ء سے برابر ایرانیوں اور عربوں میں بحرین کے لئے جھگڑا ہوتا چلا آیا، لیکن چونکہ عربوں کے انحطاط اور ایرانیوں کے عروج کا زمانہ تھا ۱۷۱۱ء تک ایرانی ہی غالب رہے۔ ۱۷۱۱ء میں سلطان بن یوسف نے بحرین کو ایران کے قبضے سے نکال لیا اور ۱۷۸۴ء میں والی الحسا نے اسکو فتح کیا، اسوقت سے باوجود سید سعید والی عمان، ترکوں، اور ایرانیوں کے لگاتار کوششوں اور حملوں کے ابتک الحسا والوں کے قبضے میں چلا آتا ہے اگرچہ ترکوں نے اہل الحسا کو انکی قدیم سلطنت سے محروم کر دیا ہے لیکن یہ جزیرہ ابتک اُن کی وسیع سلطنت کی یادگار باقی ہے۔

۱۸۶۷ء میں ایرانیوں نے اس استحقاق پر کہ وہ شاہان صفویہ کے زیر حکومت رہ چکا تھا فتح بحرین کا پھر ارادہ کیا اور اسپر حملہ آور ہو کر ایرانی جھنڈا چڑھا دیا۔ لیکن انگریزی جہازوں نے گولہ باری کر کے سلسلہ رسل و رسائل منقطع کر دیا جس سے ایرانیوں کو جزیرہ خالی کر دینا پڑا۔ اسوقت سے بحرین انگریزوں کے زیر اثر آگیا۔ ۱۸۷۵ء میں ترکوں نے پھر اُس کے فتح کرنے کا ارادہ کیا، لیکن انگریزی جہاز آسپرے نے عین موقع پر پہونچکر اُن کو پسپا کر دیا، اور اُن شیوخ کو جو انگریزوں کے مخالف تھے گرفتار کر کے ہندوستان بھیج دیا، اور شیخ عیسیٰ کو اپنی سرپرستی میں مسندنشین بنایا جو اسوقت تک نہایت امن و امان سے سلطنت

کر رہا ہے۔

ہمکو شیخ عیسیٰ کی ملاقات کیلئے محارق جانا پڑا جہاں وہ جاڑوں کے موسم میں دربار کیا کرتا ہے۔ جب ہم یہاں داخل ہوئے اور محل سلطانی کے قریب پہونچے جو مختلف الاوضاع عربوں سے بھرا ہوا تھا، تو اس کی طرز عمارت نے ہمکو الحمرا یاد دلا دیا۔ سلطان کا لباس نہایت قیمتی اور خوش وضع تھا۔ ہز مجسٹی اور دوسرے شاہی خاندان کے لوگ جو عقالین سر پر باندھے تھے انمیں سنہری ڈوریاں بھی لپٹی تھیں، جو سوا خاندان شاہی کے دوسرے اشخاص نہیں باندھ سکتے۔ یہ سنہری عقال سرخ پگڑی پر نہایت خوشنما معلوم ہوتی تھی اور سلطان کا سیاہ کوٹ جس پر نقری میان کی تلوار لٹک رہی تھی ہر طرح اسکو رئیس ثابت کر رہا تھا۔

ہم نے بحرین کے درباری لوگوں کا فوٹو بھی لیا جسمیں شاہزادہ محمد ولی عہد اور وزیر اعظم سعید بن عمر بھی شریک تھے مگر خود شیخ نے اپنی تصویر کھچوانے سے انکار کیا۔ جب ہم شیخ کی ملاقات کو گئے تو ہندوستانی وضع کی اونچی کرسیاں جنکا پالش بھی اڑ گیا تھا ہمکو بیٹھنے کو ملیں، اور ہمارے لئے پہلے سیاہ رنگ کی بدمزہ کافی لائی گئی اسکے بعد شربت پلایا گیا جس میں دارچینی بھی شامل تھی۔

محارق دار السلطنت ہونے کیوجہ سے زیادہ تر امرا سے آباد ہے، برخلاف اسکے مناسہ میں تجار کی آبادی زیادہ ہے۔ ان دونو شہروں کے مابین پرتگیزوں کا ایک قلعہ واقع ہے جو اب سلطانی اصطبل کے کام میں آتا ہے اس شہر میں پینے کا پانی جو آتا ہے اسکا ذکر ضروری ہے۔ سمندر کے آب شور کے نیچے ایک شیریں چشمہ ہے جہاں سے پانی لایا جاتا ہے اور کھاری پانی میٹھے پانی سے چھ فٹ اوپر رہتا ہے۔ جب پانی زیادہ چڑھ آتا ہے

اسوقت غواص مشکیں سے لے کر غوطہ لگاتے اور نیچے سے شیریں پانی بھر لاتے ہیں ورنہ عورتیں خود بھر لاتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس شیریں چشمے کا پانی اس زور سے اُبلتا ہے کہ وہ کھاری پانی کو ہٹا دیتا ہے اور اپنے ساتھ مخلوط نہیں ہونے دیتا۔ غرض کہ یہ پانی اتنا شیریں ضرور ہے کہ اسکے پینے میں تکلیف نہیں ہوتی۔ اس چشمے کو بیر محب یا بیر اعب کہتے ہیں" اور اس ساحل پر اسطرح کے متعدد چشمے پائے جاتے ہیں۔ بحیرۂ روم (میڈی ٹرینین) پر جو فونی شیا کا اراڈس یا اروادتھا وہ بھی اسی قسم کے ایک چشمے سے سیراب ہوتا ہے جو سمندر کے اندر واقع ہے۔

شیخ عیسیٰ کا نائب جو منامہ میں رہتا ہے' اور رئیس بازار کے لقب سے مشہور ہے' اسکو والی بحرین نے ہماری مہانداری پر مقرر فرمایا تھا اور ہمارے پندرہ روز کے زمانۂ قیام میں اُسنے ایک دن بھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا۔ (باقی دارد)

مترجمہ
ضامن کنتوری

عمری است عشق ورزم و کارم تمام نیست ۔۔۔ این بادہ پختہ نیز نشد گرچہ خام نیست

ما آنچہ دیدہ ایم نہ ہر دیدہ بنگرد ۔۔۔ نظارۂ جمال تو عام است و عام نیست

می خواہد این کہ در رہِ رندی قدم نہد ۔۔۔ زاہد کہ ہم بہ شیوۂ تقوی تمام نیست

چنداں کہ رام می شوم او بدگماں شوم ۔۔۔ باآن کہ این نوازش خاص ست عام نیست

این ہاست وضع موجب ناکامیِ من ست ۔۔۔ خوش عاشقی کہ در گرو ننگ و نام نیست

شبہائے ہجر دیدہ ام و باز زندہ ام ۔۔۔ گویا کہ کار مرگ و قضا را انفصام نیست

در بزم گاہِ ناز تو شبلی ہنوز ہم
جا داشتہ است لیک بہ آں احترام نیست

شہر حیدرآباد

ہمارے غائبانہ عنایت فرما سید شمس اللہ صاحب قادری۔ ایک قابل قدر تالیف میں مشغول ہیں جس میں حیدرآباد اور گولکنڈہ اور ان کے مضافات کے آثار قدیمہ کا بیان ہے اس کتاب کا نام انہوں نے اپنے آقائے نامدار شاہ دکن خلد اللہ ملکہ کے نام پر "محبوب الآثار" رکھا ہے۔ شہر حیدرآباد کے آباد ہونے کی مندرجہ ذیل کیفیت انہوں نے اپنی اس کتاب کے مسودے سے نقل کر کے بھیجی ہے۔ اور قبل از اشاعت کتاب بعض اور حصے بھیجنے کا بھی وعدہ فرمایا ہے:-

شہر حیدرآباد ۱۸ درجہ عرض البلد شمالی اور ۷۸ درجے ۳۰ دقیقہ طول البلد شرقی پر واقع ہے۔ اسکے گرد و نواح کی سرزمین ایک بہت بڑا مسطح میدان ہے جسکے چاروں طرف کئی کوس تک چھوٹی چھوٹی بیشمار پہاڑیاں اور پتھریلی چٹانیں نظر آتی ہیں۔

شمال کی طرف عین حصار کے نیچے ایک دریا جو رود موسیٰ کہلاتا ہے، رواں ہے۔ یہ دریا اگرچہ موسم گرما میں ایک چھوٹا سا نالہ معلوم ہوتا ہے اور عموماً پایاب رہتا ہے لیکن موسم بارش میں اسکو خوب طغیانی ہوتی ہے۔ جسکی وجہ سے اسکا پاٹ ڈیرہ سو گز سے بھی زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ ۱۹۰۳ء کے موسم برسات میں اس دریا میں ایک عظیم الشان سیلاب آیا تھا اس سے بہت سی جانیں تلف ہوئیں اور لاکھوں روپے کا نقصان ہوا۔

حیدرآباد کا بانی دولت قطب شاہیہ کا پانچواں تاجدار سلطان محمد قلی قطب شاہ ہے۔ ۱۰۰۰ھ میں اسکی بنیاد ڈالی گئی اور ۱۰۰۶ھ میں تعمیر کا کام ختم ہوا۔

یا حافظ تاریخ بنا اور فرخندہ بنیاد تاریخ اختتام ہے۔ حیدرآباد کے آباد ہونے سے پہلے یہاں جنگل تھا۔ رود موسی سے جانب جنوب تقریباً نصف میل کے فاصلے پر عین اُسی مقام پر جہاں اب محلہ شاہ علی بنڈہ ہے چند گداگر برہمنوں کی آبادی تھی اور اُسکو چچلم کہتے تھے۔ اسکے پاس سلطان محمد قلی نے ایک عمدہ سا باغ لگوایا تھا۔ جس میں اُسکی محبوبہ بھاگ متی رہتی تھی بادشاہ یہاں سیر و تفریح اور عیش و عشرت کے لئے آیا کرتا تھا۔
بھاگ متی بادشاہ سے کہا کرتی تھی کہ یہاں ایک بڑا شہر آباد کیا جائے۔

ابتدائے عہد سے قطب شاہیوں کا دارالحکومت گولکنڈہ تھا۔ گولکنڈہ کی آبادی سلطان ابراہیم کے ہی زمانہ میں بہت بڑھ گئی تھی۔ اور جبکہ نظام شاہی سلطنت تباہی کے کنارے لگ گئی اور خاندیس کی حکومت اُجڑ گئی تو بکثرت آدمی آوارہ ہو کر گولکنڈہ میں آبسے۔ محمد قلی عیش دوست اور خوشمزاج آدمی تھا اُسکی عیش پرستی کے باعث گولکنڈہ کی آبادی اور بھی بڑھ گئی اور ایسی گنجان ہو گئی کہ اکثر بیماری پھیلتی رہتی تھی۔ اور بڑی بادشاہت کے لئے اُسکا دارالحکومت ایسا چھوٹا موزوں بھی نہ تھا۔ اس لئے محمد قلی کو فکر ہوئی کہ کہیں دوسری جگہ ایک شہر بسا کر اُسے اپنا دارالحکومت بنائے۔

اس سبب سے اور نیز اپنی معشوقہ بھاگ متی کی تحریک سے محمد قلی نے اس شہر کو آباد کیا اور اپنی معشوقہ کے نام پر اُسکا نام بھاگ نگر رکھا۔ مگر جب وہ مر گئی اور لوگوں نے اُسے شرم دلائی تو پھر اُسکا نام سترہ برس کے بعد حیدرآباد رکھدیا۔ لیکن پھر بھی اچھی طرح اسکا نام حیدرآباد قطب شاہی سلطنت کے آخر ایّام تک عام میں نہ پھیلا اُسوقت تک عوام میں بھاگ نگر ہی مشہور رہا۔ جبتک کہ یہاں مغلوں کی عملداری قائم نہیں ہوئی۔

حیدرآباد کی عملداری محمد قلی کے ہی عہد میں اس کثرت سے ہو گئی تھی کہ دکن میں ایک بڑا نامی شہر سمجھا جاتا تھا۔ اُسکے باغات اور تفریح گاہیں چاروں طرف دس دس کوس تک پھیل گئی تھیں اور زرگمو گڑہ ابراہیم پٹن۔ بھونگیر پٹن چرچہ اسکی چاروں حدیں ہو گئی تھیں۔ سلطان محمد قلی نے شہر میں نہایت بڑے بازار بنوائے تھے اور ہر ایک بازار میں سڑکیں اسطرح پر نکالیں جو ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر قطع کرتی تھیں اور اُن کے تقاطع سے چوراہے بنتے تھے۔ پھر سڑکوں کے کنارے پانی کی نہریں جاری کیں اور اُن کے کنارے کنارے سایہ دار درخت لگوائے اور شاہی محلات شمالی جانب کو تعمیر کرائے تھے۔ کہتے ہیں کہ اُسکی بنائی ہوئی صرف چودہ ہزار دوکانیں تھیں اور حمام خانقاہ مدرسے لنگر خانے مہمان خانے بارہ ہزار کے قریب تھے اور جتنی عمارات تھیں تمام چونہ اور پتھر سے بنائی گئی تھیں۔

عہد قطب شاہیہ میں شہر بے حصار تھا۔ لیکن اُن تمام راستوں پر جو غیر آباد مقامات کے مقابل تھے دروازے لگے ہوئے تھے۔ یہ دروازے معمولی تھے اور ایک پھاٹک سے زیادہ کام نہیں دے سکتے تھے۔ جب کوئی نیا مسافر شہر میں داخل ہونے کے لئے ان دروازوں پر جاتا تو وہاں روک دیا جاتا تھا۔ کیونکہ کوئی بھی نیا شخص داروغہ سے اجازت حاصل کئے بغیر شہر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ علاوہ اِسکے اُسکی تلاشی بھی لیجاتی تھی کہ کوئی شاہی محصول کی چیز تو نہیں ہے۔

شہر کا حصار جو اسوقت موجود ہے قطب شاہی سلطنت کے خاتمے کے بعد بنا ہے۔ عماد الملک مبارز خاں نے جو سلاطین تیموریہ کیطرف سے یہاں کا بارہ سال تک صوبہ دار رہا ہے اپنی صوبہ داری کے اخیر ایام

میں اسکی تعمیر شروع کی تھی۔ اور قریباً ایک ثلث بنانے پایا تھا کہ نواب
آصف جاہ صوبہ دار مقرر ہوئے۔ بقیہ حصہ جو دو ثلث سے زیادہ ہے نواب
آصف جاہ کے عہد میں مکمل ہوا اور اسکی پتھر اینٹ چونہ سے نہایت مستحکم تعمیر
ہوئی۔ چادر گھاٹ کے دروازے سے دبیر پورہ کے دروازے تک جو
حصار بلا کنگرہ ہے وہ مبارز خاں کا بنوایا ہوا ہے۔ اور بقیہ تمام فصیل جو کنگرہ
دار ہے آصف جاہ کے عہد کی تعمیر شدہ ہے۔

حصار چھ میل کے دور میں ہے اور اسکا عرض مختلف مقامات پر ڈیڑھ گز
سے دو گز تک ہے اور اسمیں جا بجا برج بنے ہوئے ہیں جن پر اگلے وقت
کی چڑھی ہوئی توپیں ابتک موجود ہیں۔ حصار تعمیر ہونے کے سو برس بعد
مرمت طلب ہوگئی تھی۔ غفران مآب حضور نظام علیخاں کے پونہ کی مہم پر جانے
کے بعد مرہٹوں نے آکر حیدرآباد کا محاصرہ کیا تو بہادر دل خاں شجاع الدولہ
نے جو بلدہ کا ناظم تھا مقابلہ کے وقت تمام شکستہ مقامات کو مرمت کروایا تھا
موجودہ حالت یہ ہے کہ حصار اکثر مقامات پر شکستہ ہوگیا ہے مگر افسوس ہے
کہ اسکی درستی کیطرف کوئی توجہ نہیں کیجاتی۔

نوٹ۔ یہ مضمون حسب ذیل کتب سے لیا گیا ہے (۱) تاریخ قطب شاہی جو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے
حکم سے لکھی گئی ہے (۲) تاریخ قادری از منشی قادر خاں جو بہ عہد نظام علیخاں تالیف ہوئی ہے (۳)
تاریخ گلزار آصفیہ از حکیم غلام حسین خاں (۴) تاریخ رشید الدین خانی از منشی غلام امام خان دہلوی (۵)
حدیقۃ العالم از علامہ ابو القاسم میر عالم شوسٹری وزیر اعظم نواب سکندر جاہ (۶) تاریخ محمد ہاشم خافی خاں
(۷) سیاحت موسیو ٹیورنیر فرانسیسی (۸) سیاحت موسیو تھیونو فرانسیسی۔ یہ دونوں سیاح عبداللہ
قطب شاہ کے عہد میں حیدرآباد میں آئے تھے۔

شمس اللہ قادری

لالۂ صحرا

پسند لالۂ صحرا! تری فضا ہے مجھے   چمن کے پھولوں سے دلکش تری ادا ہے مجھے
بہشت خانہ ترا کنجِ خوشنما ہے مجھے   جنوں میں تیرا نظارہ سکوں فزا ہے مجھے

گلوں سے ہے مجھے تیرے جگر کا داغ پسند
وہ رند ہوں کہ ہے تیرا مجھے ایاغ پسند

مئے نشاط کا تیری سرور ہے دل میں   تری شراب چھلکتی ہے آنکھ کے تل میں
گلوں کا عکسِ شفق گوں ہے تیری منزل میں   شرابِ سرخ کے شیشے ہیں تیری محفل میں

عجب بہار ہے رنگیں پیالیوں میں تری
چھلکتی ہے مئے احمر پیالیوں میں تری

مجھے بھی بھر کے کوئی جامِ خوشگوار پلا   جنوں کا جوش ہے سر میں مجھے بہار پلا
تری شراب کا ہوں رندِ بادہ خوار پلا   ہزار جام پلا۔ اور ہزار بار پلا

پلا وہ مے کہ غبارِ وطن نہو جس میں
پلا وہ پھول کہ خارِ وطن نہو جس میں

فریب خوردۂ بزمِ نشاطِ دنیا ہوں   میں انجمن میں صدائے شکستِ مینا ہوں
نہ پوچھ ساقیِ صحرا! کہ کون ہوں کیا ہوں   شہیدِ ناوکِ بے مہریِ احبا ہوں

سرشکِ خوں سے ہے غربت میں یوں گریباں سرخ
لہو بھرا کسی گل کا ہو جیسے داماں سرخ

فلک نے مجھکو دکھائی ہیں سبز باغ بہت   مئے نشاط کے چھلکائی ہیں ایاغ بہت
کئے ہیں نذرِ تمنا کے گل چراغ بہت   دیئے ہیں اہلِ وطن نے جگر پہ داغ بہت

کہاں کہاں سے دکھاؤں میں آہ! داغ تجھے
جلا نہ دیں مرے دلسوز! یہ چراغ تجھے

سناؤں کیا اب تجھے غربت میں روئدادِ وطن میں بدنصیب وطن ہوں میں نامرادِ وطن
ستم رسیدہ ہوں۔ کیسا خیالِ یادِ وطن سوا گور نگاہوں میں ہے سوادِ وطن

دلِ فسردہ ہوں۔ پہلوئے داغ خوردہ ہوں
صبا بجھائیگی کیا! میں چراغ مردہ ہوں

خیالِ صحبتِ احباب کیا؟ وہ دل ہی نہیں جگر میں وہ تپشِ شوق متصل ہی نہیں
وہ آگ تھی جو کلیجے میں مشتعل ہی نہیں وطن کی خاک کا سودا تھا اب وہ گل ہی نہیں

گئے وہ دن۔ کہ تھی غربت میں آرزوئے وطن
مرے ندیم! نہ کر اب مجھ سے گفتگوئے وطن

ذراسی رہنے کو دے کنجِ دلنشیں میں جگہ مجھے بھی تھوڑی سی صحرا کی سرزمیں میں جگہ
شرارِ غم ہوں۔ دلِ داغ آفریں میں جگہ ملے اگر ترے آغوشِ نازنیں میں جگہ

دکھاؤں اپنے وطن کی بہارِ باغ تجھے
تپِ دروں کے پھپھولے جگر کے داغ تجھے

سرور جہان آبادی

حواسِ عشرہ

ہیں حواسِ عشرۂ انساں طلسمِ قدرتی عقل کو ادراک کی جنکے ذرا ہمت نہیں
صنعتِ صانع پہ نازاں ہو گئے کیوں نہ حواس کونسی کثرت ہے جسمیں جلوۂ وحدت نہیں

کہ رہا ہے ناز سے ہر حاسہ اپنی جگہ | میں وہ عالم ہوں جہاں حد نہد گی وسعت نہیں

شکر منعم ہے ودیعت مجکو انسا نیں کیا | مجھسے بہتر اب زمانہ میں کوئی نعمت نہیں

ہیں دماغ حضرت انسا میں یہ دو جنتیں | روح کو جنکے بغیر اک لمحہ بھی راحت نہیں

وسکے عہد سلطنت میں ہے دماغ اُسکا مشیر | اور ہمارا فرض غیر از خدمت و طاعت نہیں

تابع دل ہے دماغ اور ہم ہیں محکوم دماغ | کام ہم سب کا بجز اظہار تبعیت نہیں

ہم نہیں تو کیا ہے نفس ناطقہ کا انبساط | شور ماتم ہے سوائے نغمۂ عشرت نہیں

ہم میں سے ہر ایک اپنے عہدے پر مامور ہے | کاروبار منصبی سے ایک دم فرصت نہیں

پانچ ہم میں گوشہ گیر طارم قصر دماغ | پانچ حسن ظاہری ہے مائل خلوت نہیں

باصرہ وہ جسکو شغل ادراک لون و شکل کا | سامعہ وہ جسکو درک صوت سے فرصت نہیں

شامہ کو ذوق استشمام رہتا ہے مدام | ذائقہ وہ ہے کہ سنے اُسکے کوئی لذت نہیں

لامسہ وہ جس سے ہے احساس سرد و گرم کا | یہ نہیں اعضا میں گر ادراک کیفیت نہیں

یہ حواس ظاہری سنے اے حریف علم و فن | باطنی بھی سُن کہ وہ بھی خالی از حکمت نہیں

ہے قبول ارتسام صورت اشیا محال | گر حِسّ مشترک کی مجھمیں کچھ قوت نہیں

مرتسم شکلیں حواس ظاہری کی ہیچ ہیں | یہ نہیں ہے تو قبول جلوۂ صورت نہیں

صورت محسوسہ کو محفوظ رکھنے کے لئے | جز خیال حضرت انساں کو کوئی طاقت نہیں

خار خار لذت بیداد مژگاں سے محال | اُس طرف تخئیل کو جب تک کہ محویت نہیں

جان سے ترکیب صورت ہے معانی سے محال | تجھمیں اے عاقل تصرف کی اگر قدرت نہیں

گر نہیں ہے واہمہ خلاق علم سیمیا | وسوسہ کی جا نہیں گنجائش ہیبت نہیں

ہو گیا علامۂ دوراں تو اس سے فائدہ | گر نہیں ہے حافظہ تو علم کی وقعت نہیں

سامنے جبتک کتابیں ہیں تو ہو تو فلسفی | جاہل اُسکے بعد ہے پھر کوئی علمیت نہیں

ہے یہی گنج حواس ظاہری و باطنی

اس سے بہتر اور کوئی خازنِ دولت نہیں

مرزا محمد ہادی۔ عزیز۔ لکھنوی

دنیا مطلب آشنا ہے

ایک دن بلبل نے گل سے یہ کہا — اے رخِ زیبا لئے تو روحی فدا
حق نے کیا تجھکو بخشا ہے جمال — واہ وا! کیا حسن ہے صلِ علیٰ
رشکِ صد نخلِ طوبیٰ شاخ شاخ — قاتلِ حور و پری ہر اک ادا
غیرتِ حسنِ مجسم برگ برگ — صورتِ دلخواہ از سر تا بسر
رنگِ رشکِ زعفرانِ کاشمیر — اور بو خجلت دہِ مشکِ خطا
تیری خوشبوئی نہیں رکھتی جواب — کیا بیاں ہو وصف تیرے حسن کا
ہیں مگر کچھ نقص بھی اے جانِ من — کہدوں وہ بھی گر نہ مانے تو برا
خوشنما ہیں تیری شاخیں گو۔ مگر — بے ثمر ہیں شاخ آہو سے سوا
برگِ تر یاقوت سے خوشتر۔ مگر — قاتلِ عشاقِ بے برگ و نوا
بوئے خوش محسودِ خوشبوئے عبیر — بوئے الفت کا نہیں لیکن پتا
رنگِ روشن غیرتِ رنگِ شفق — نام کو لیکن نہیں رنگِ وفا
ہیں بہت سی خوبیاں تجھمیں جہاں — ہے وہاں یہ ایک عادت ناسزا
اپنے عاشق سے نہ کرنا التفات — بلکہ اور اس پر ستم رکھنا روا
آہ تجھکو میری کچھ پروا نہیں — اور میری جان ہے تجھپر فدا
تو مجھے ہے جان سے بڑھکر عزیز — گو نہیں میری تجھے الفت ذرا

میری حالت غیر تیرے عشق میں　　اور غفلت تیری معمولی ادا
تیرے پیچھے خار کی پروا نہیں　　تیرے آگے ڈر نہیں صیاد کا
تیری الفت میں مٹا سب ننگ و نام　　ہند سے ایران تک خاکہ اُڑا
عشق سے تو کی ہی تھی بے عزتی　　شاعروں نے اور بھی رسوا کیا
کاش! ہوتا تیرے دل میں سوزِ عشق　　اور الفت کا مزا تو جانتا
کاش! عاشق ہوتا تو میری طرح　　اور ملتا تجھکو تجھسا دلربا ہو بہو
جب تجھے معلوم ہوتی میری قدر　　اور کھلتا حال میرے عشق کا
یاوہ گوئی کیجیو میری معاف　　آج مجھکو جوشِ وحشت ہے سوا
گر نہ تجھسے کیجئے تو اور پھر ہو　　کس سے جاکر کیجئے تیرا گلا
الغرض جب شکوۂ بلبل تمام　　گل ز اوّل تا بہ آخر سن چکا
زخم اپنے سینۂ صد چاک کے　　اس نے بلبل کو دکھا کر یوں کہا
سچ کہا جو کچھ کہا اے مہرباں　　باوفا تو اور میں ہوں بے وفا
کہہ مگر تو ہی ذرا انصاف سے　　سینے کہیں جاکے رفو ہیں ذرا
ہو گیا میرا جگر سب چاک چاک　　اور دل بھی پارہ پارہ ہو گیا
چشمِ گریاں کی بدولت ہر سحر　　آنسوؤں سے رہتا ہے دامن بھرا
سبزۂ گلشن پہ آتے ہیں نظر　　قطرہ ہائے اشک میرے جابجا
تیری ہی خاطر ہے یہ حالِ زبوں　　تیرے ہی باعث ہے یہ آفت بپا
حیف تجھکو اسکی کچھ پروا نہیں　　اور پھر دعوے ہے تجھے عشق کا
کیا طریقِ عشق میں جائز ہے یہ　　کیا وفا کے دین میں ہے یہ روا
بلبل و گل کی تو سن لی گفتگو　　سنئے اب عرشی کا بھی کہنا ذرا
عشق بلبل کو نہ گل کو زینہار　　جھوٹ ہیں سب دعویِ مہر و وفا

دستِ گلچیں میں ہوں گل گر صد ہزار
اُن کے پاس آئے نہ بلبل کی بلا

دیکھے گلچیں کو جب آتا گل کے پاس
پھر سے اُڑ جائے وہ بالائے ہوا

توڑ لے یا چھوڑ دے گلچیں اُسے
وہ نہ دیکھے مڑ کے بھی پھر کیا ہوا

جا براجے دوسرے گل پر کہیں
ڈھونڈ لے پھر اور کوئی دلربا

ہے یہی احوال گل کا ہو بہو
جیسے بلبل کو تھا دعوئ وفا

گل کو پروا ہی نہو مطلق اگر
قید میں ہو بلبلِ بے دست و پا

گر قفس میں کوئی بلبل کے قریں
رکھدے گل کو شاخ سے کر کے جدا

تو نہو گا وصلِ بلبل سے وہ خوش
بلکہ اکتا اور مرجھا جائے گا

الغرض دھوکے کی باتیں ہیں یہ سب
کچھ نہیں دنیا میں جز مکر و دغا

کوئی عاشق ہے نہ یاں معشوق ہے
اپنے مطلب کا ہے ہر اک آشنا

اسعد حسین

گلِ نودمیدہ

گلچیں! ستم نہ کر کہ میں نازآفریدہ ہوں
مجھکو نہ توڑ تو۔ کہ گلِ نودمیدہ ہوں

مجھ خستہ جاں کے درپئے آزار تو نہو
مجھکو لگا کے ہاتھ گنہگار تو نہو

خوں میری آرزو کا نہ او فتنہ ساز کر
مجھپر نہ آہ دستِ ہوس تو دراز کر

دلکش عجیب ہیں مرے نقش و نگار دیکھ
آنکھیں خدا نے دی ہیں تو میری بہار دیکھ

آ! کنجِ دلنشیں میں مرے سیرِ باغ کر
نکہت سے میری اپنا معطر دماغ کر

مجھ کو سمجھ کے تو کسی عاشق کا دل نہ توڑ
چٹکی سنبھل کے لے مرا ننھا سا دل نہ توڑ

پہلو میں میرے اِک خلشِ خار کم ہے کیا
چرکا نہ دل پہ دے کہ یہ آزار کم ہے کیا

اٹھیگا آہ اب مجھسے نہ تیرے ستم کا بار
کرنیں بھی آفتاب کی ہیں مجھکو ناگوار

ہیں نیم باز دیدۂ نظارہ جو ابھی
ننھا سا ہوں میں آہ! گُلِ نازبو ابھی

مجھکو لگی نہیں ابھی ظالم! ہوائے دہر
یعنی میں شاخِ گل پہ ہوں ناآشنائے دہر

پنچھی کا دلفریب ترانہ سنا نہیں
دنیا کا دل پسند فسانہ سنا نہیں

نظارۂ چمن سے ہوں بیگانہ وار ابھی
دیکھی نہیں ہے موسمِ گل کی بہار ابھی

جھڑیوں سے آہ! آئینہ کی ناآشنا ہوں میں
کم سن غریب گل ابھی نام خدا ہوں میں

اُلٹی ہے رُخ سے بادِ صبا نے نقاب بھی
آیا نہیں ہے جوش پہ حسنِ شباب ابھی

سنتا ہوں میں جہاں کے مناظر ہیں دلفریب
دلچسپ ہیں یہاں کے مناظر ہیں دلفریب

میں عشوۂ قمر سے ہوں بیگانہ خو ابھی
دنیا کی سیر کی ہے مجھے آرزو ابھی

بھونرا نے مجھکو پیار کیا ہے ابھی کہاں
بلبل نے ہمکنار کیا ہے ابھی کہاں

کوئل کی مجھ غریب نے کوکو سنی نہیں
قمری کی گفتگو بھی لبِ جو سنی نہیں

شبنم کی آرسی نظر آئی نہیں ابھی
تاروں کی چھاؤں بھی نظر آئی نہیں ابھی

سنتا ہوں   کی ہے آوازِ دلفریب
میں نے مگر سنا نہیں یہ سازِ دلفریب

بندِ قبا ابھی مرے کھولے صبا نے ہیں
اُلٹے ورق ابھی مرے موجِ ہوا نے ہیں

گلچیں ابھی سے میرے گلے کا نہ ہار ہو
ظالم! ترے ستم پہ خدا کی سنوار ہو

کیوں توڑتا ہے مجھکو عبث او جفا پسند
ہے ایسی کونسی تجھے میری ادا پسند

بیدرد دیکھ تو مری نزاکت کا پاس کر
انسان ہے تو اُنس و محبت کا پاس کر

بالک رام شاد بجواڑیہ

غمِ فراق

نہ مے پرست ہوں لوگو نہ بادہ خوار ہوں میں — مگر شرابِ محبت کا خواستگار ہوں میں

کسی زمانے میں گذرا ہے قیس دیوانہ — اسی شہیدِ محبت کی یادگار ہوں میں

میں داغِ یاس ہوں تصویرِ دردِ حسرت ہوں — مٹا ہوا خطِ لوحِ سرِ مزار ہوں میں

شرابِ نابِ محبت کا خم بنا لینا — پسِ فنا مری مٹی سے خاکسار ہوں میں

بھرا ہے درد مرے دل میں ساری دنیا کا — تڑپ رہے ہیں کوئی اور دلفگار ہوں میں

کہاں ہے بلبلِ شیدا کدھر ہے پروانہ — وہ جاں نثار ہیں اور اُنکا رشتہ دار ہوں میں

جگر میں سینے میں۔ پہلو میں آگ ہے میرے — مثال شعلۂ جوالہ شعلہ بار ہوں میں

کہاں ہیں مشکِ محبت خریدنے والے — مجھے بھی دیکھ لیں اِک نافۂ تتار ہوں میں

رفو کرے گی کسے ہائے سوزنِ تدبیر — کتانِ صبر تو کہتا ہے تار تار ہوں میں

چھپا کے تیشۂ فولاد پوچھ پھر فرہاد — کہ بردبار ہے تو یا کہ بردبار ہوں میں

مجھے بھی ساتھ لئے جاؤ قافلے والو — تھکا ہوا ہوں پیادہ ہوں اشکبار ہوں میں

یہ سچ ہے بجتی نہیں ایک ہاتھ سے تالی — جفا شعار ہے دنیا وفا شعار ہوں میں

ہے بر میں دل مرے بے کینہ مثل آئینہ — ذرا بھی جھوٹ ہو اس میں تو سنگسار ہوں میں

وفا خدا کے لئے آ کے کر مسیحائی — لبوں پہ دم ہے مرا چشم انتظار ہوں میں

لگا تھا روکنے ہاتھوں نے ناوکِ غم کو — صدا یہ آئی کہ سینے سے تیر پار ہوں میں

گلِ امید اُڑا لے گئی کہاں صرصر — مثالِ بلبلِ بیتاب سوگوار ہوں میں

مجھے نہ چھیڑیئے کہہ کہہ کے بے نظیر احمد

کہ اِس جہاں میں سیہ بخت و دلفگار ہوں میں

ایک بیراگی

ہمارے دیرینہ عنایت فرما قاضی حمید الدین احمد صاحب ایڈیٹر الکاشف مدت کی خاموشی کے بعد مہر سکوت توڑتے ہیں۔ آج کل ایک کتاب تصوف پر لکھ رہے ہیں اور اس نظم میں وہی رنگ غالب ہے۔

اور رام نام والو سُن لو کتھا ہماری — ہم بھی ہیں اسی پیا کی صورت کے ہیں پجاری
بیراگ لے کے اسکا آئے ہیں گیانیوں میں — چھوڑا ہے دیس اپنا بنیم کے ہیں بھکاری
من کی بنا کے تونبی گیت اسکے گا رہے ہیں — رہتے ہیں یوگیوں میں بھگوان کے ادھاری
جنگل میں گھر کے منگل بیٹھے ہیں پاس اسکے — ست کے پرمیوں نے اک ماروی کٹاری
مکتی کی اچھیتا میں پرم آتما کی دھن ہے — اک چنیر پاس اپنے ساجن کی ہے دلاری
دیکھی ہے اس نگر میں ہر چیز رام روپی — کسکے لئے یہ کایا پھرتی ہے ماری ماری
کرپا اوسی کی ہر سو گنگا بہا رہی ہے — جسکی دیا سے جگ میں جمنا کی رو ہے جاری
مکے میں اُسکے جلوے کاشی میں اُسکے درشن — گوکل میں چھب اُسیکی تیرتھ ہیں جسکی بھاری
من موہنی وہ مورت سندر ہے جسکا مکھڑا — رہتی ہے جو دلوں میں سج دھج ہے پیاری پیاری

رچنا اوسی کی پیارے جگ میں رچی ہوئی ہے
اک دھوم جسکے دھن کی ہر سو مچی ہوئی ہے

آنکھوں میں جوت اسکی من میں اُسیکی مایا — سب روپ ہیں اُسیکے جسکا ہے جگ پہ چھایا
جل میں جھلک اُسی کی پربت پہ ٹھاٹھ اُسکا — چاروں طرف وہ پربھو پرم آتما ہے چھایا
اکاش پر وہ نیلا اور سورج میں پیلا — دھرتی پہ اور لیلھا کیا رنگ ہے بنایا
نفرت سے دیکھنا ست جگ میں کسیکو پیارے — کہتے ہیں گیان والے ہر میں ہے ہر سمایا

جھگڑا نہ کر کسی سے سب نیچ ہیں اُسی کے دھنوان ہے وہ گیانی جسنے یہ گیان پایا
تو دلکو دیکھ اپنے اک لال ہے یہ اُسکا ہو جائیگی اسی سے کُندن بھی تیری کایا
پھل کرم کا ہے تیرے تری ہر ایک حالت جی تونے ہے جگت کے کس جال میں پھنسایا
کیا کر رہا ہے مُوہن کر جگ میں میرا تیرا مایا ہے سب یہ اسکی تیرا ہے کچھ نہ میرا
مل بیٹھنا یہاں کا سمجھے رہو غنیمت اس لوبھ کی جگہ میں دو دن کا ہی بسیرا
اک منڈلی کے ہو تم سارے پریم بھائی آئے ہو جس نگر سے ہوگا وہیں یہ ڈیرا!
ملکر کرو تم اپنا ہر ایک کام پیارو اس نے گتی میں بتیا ڈالے نہ آکے گھیرا
ہیں سب اُسی کی پرجا گورے ہوں یا کہ کالے آنکھوں پہ کیوں تمہاری چھایا ہے یہ اندھیرا

دو دن یہاں پہ رہ کر بھولے ہو ریت اپنی
کیوں چھوڑتے ہو لیکن پیارو پریت اپنی

کیا تھا بچن تمہارا اور ڈھنگ کیا دکھائے اس پرتھوی پہ آکر کیوں بن گئے پرائے
تم پڑ گئے یہاں پر کن خانہ جنگیوں میں ڈرتا ہوں میں کہ شاید دُھن یہ نہ کام آئے
ہے ہے ستم تو دیکھو کیا ہو رہی ہے درگت روٹھے ہوئے ہیں بھائی منتے نہیں منائے
واعظ نہ چھیڑ ہمکو دیکھے ہیں ڈھنگ تیرے بستی میں اُسکے تونے فتنے کئی اُٹھائے
پنڈت تری کتھا بھی کرتی ہے کام کھنڈت تونے بھی رامیوں کو اشلوک وہ سنائے
جن سے پڑی ہوئی ہے اک کھلبلی کپٹ کی دیکھو وہ یار ہمسے جاتا ہے منہ چھپائے
تم چاہتے ہو پرجا اُسکی نہ بیٹھے مل کر بیٹھے تو سر تمہارے چرنوں پہ آ جھکائے
لیکن پریم والو آنند ہے اسی میں جھگڑو نہ تم جی کسیکا کوئی نہ یاں دکھاوے
ست گرکی ہے یہ سکھا سب سے ملاپ رکھنا پاپی وہی بڑا ہے آپے میں جو نہ آئے
اپنا تو یہ دھرم ہے اے شیخ تیرا مذہب ملنے سے دو دلوں کے جاتا ہے گر تو جائے

حمید الدین حمید

وضع زمانہ

جناب نواب محمد عمر خاں صاحب ۔ وفا ۔ رئیس حیدرآباد ۔ اشعار ذیل میں شکایت کرتے ہیں کہ زمانہ میں "فیشن" کی تقلید وبا کی طرح پھیل گئی ہے ۔ یہ شکایت بہت کچھ حق بجانب ہے ۔ اور رہ و رسم اغیار کا اس قدر تتبع جسقدر آج کل رواج پاتا جاتا ہے ۔ بیشک قابل اعتراض ہے ۔ لیکن جناب وفا اس بات کا کیا جواب رکھتے ہیں ۔ کہ خود یہ شکایتی اشعار اور ان کے اشعار کے بیشتر الفاظ اسی "فیشن" کی تقلید میں ہیں ۔

جسطرف دیکھو جہاں دیکھو ہوا فیشن کی ہے
آجکل کی پود پر نازل بلا فیشن کی ہے

فیشن ایبل جو نہیں اسکی شرافت بھی گئی
کیا کرامت آجکل بہر خدا فیشن کی ہے

چاہے فاقہ ہو ۔ مگر یاد رہیں ہو آسن کا بوٹ
سوٹ عابد شاپ کا کچھ انتہا فیشن کی ہے

کوچ کرسی کے سوا بیٹھے نہ کوئی فرش پر
یاد رکھو آبرو اس سے سوا فیشن کی ہے

زیب تن جو کچھ ہو ۔ اُسکی ہو بہت عمدہ فنش
کف ڈبل ۔ کولر بھی عمدہ ہو ہوا فیشن کی ہے

مفتیانِ دیں بھی فرشو پہرے پھرتے ہیں شوز
بندگی کچھ ان دنوں ایسی ہوا فیشن کی ہے

ہو سکونت کے لئے بنگلہ بھی عمدہ پُر سواد
ڈگریاں ہو جائیں کیا پروا سزا فیشن کی ہے

میر ۔ سید ۔ شیخ ۔ خاں ۔ پنڈت یہ کہنا منع ہے
لفظ مسٹر چاہیئے کہنا ۔ ادا فیشن کی ہے

فرش پر بیٹھیں تو پتلو نیں پہ بیجا ہیں شکل
ہائے بندی اہل یورپ سوا فیشن کی ہے

صاحبِ دولت تھے پہلے اب ہیں مقروض و ذلیل
ابتدا کچھ اور تھی یہ انتہا فیشن کی ہے

یہ مرض پھیلا ہوا ہے ہند بھر میں اے وفا
اس سے ڈریئے ۔ خوف کیجے یہ وبا فیشن کی ہے

رباعیات

(آزاد کاکوروی)

ہمارے مکرم جناب محمد اظہر علی صاحب المتخلص بہ آزاد جن کے تراجم شیکسپیر کے دلچسپ نمونے مخزن کے پڑھنے والے ناظرین کو ضرور یاد ہوں گے۔ رباعیات ذیل ارسال فرماتے ہیں:-

گل عارض میں کبھی ہم بھی تھے خوشبو کیطرح سینے پر سایہ فگن تھے کبھی جگنو کی طرح
تھے بس اک شب کیلئے دل میں کسیکے مہماں صبح کافور ہوئے نکہتِ شبو کی طرح

ہنستا ہوا نصیب جب سے روئے دم بھر کو ہنسے تھے عمر بھر کو روئے
تھا کون غریب ہم سے بڑھکر آزاد جسکو یہ چرخ جور افگن کھوئے

راحت کیا شے ہے چین کسکا ہے نام آرام کہاں ہوا اگر دل آرام
غم ہی میں تو عمر ساری ہو گئی آخر آیا تھا شباب ہجر کا لے کے پیام

طفلی سے شباب پھر جوانی دیکھی وہ کیف جنوں وہ لن ترانی دیکھی
کل ہنستے تھے کیل کھلا کے جو گل آزاد آج انکی لحد پہ نوحہ خوانی دیکھی

لیتے تو یگانگت کا دم بھرتے ہیں احباب خلوص پر لڑے مرتے ہیں
دامِ مطلب سے ہو کے یکسر آزاد وہ کون ہیں ہم پہ جو کرم کرتے ہیں

یاری یاروں کی آزمائی ہم نے
الفت یاروں کی آزمائی ہم نے
کیا چیز وفا ہے جسکا سنتے ہیں نام
آزاد مگر نہ دیکھ پائی ہم نے

(شاکر میرٹھی)

یکساں نہیں ہیں ظاہر و باطن جن کے
چھٹوائے گی ان کو یہ دورنگی ستنگے
گر دل میں نہیں چور تمہارے شاکر
کیوں رکھتے ہو ڈر ڈر کے قدم گن گن کے

ناصح کی نصیحت کو نہ مانا ہم نے
پستی و بلندی کو نہ جانا ہم نے
سیدھے ہوئے ٹھوکر یہ جو کھائی ٹھوکر
اُستاد تجھے مانا۔ زمانا ہم نے

خورشید درخشاں میں جھلک تیری ہے
اور گوہر لامع میں ومک تیری ہے
ہیں کون و مکاں نور سے تیرے پر نور
ہر ذرہ تاباں میں چمک تیری ہے

غیروں پہ بھروسہ ہے تو یہ گت ہو گی
عزت ہی نہ حاصل کبھی دولت ہو گی
تم آپ کرو اپنی مدد اے شاکر
ہر طرح کی پھر رفع شکایت ہو گی

گل کا نہ گلستاں کا نشاں باقی ہے
کیا دیدۂ بلبل میں سماں باقی ہے
ساماں نہ راحت کے رہے گو۔ شاکر
وہ دم ہی غنیمت ہے جو یاں باقی ہے

کیوں نیند قیامت کی ہے طاری جاگو
اب جاگ چکی خلق ہے ساری جاگو
غفلت ہے یہ کہ خواب گراں اے شاکر
یہ موت ہے یا نیند تمہاری جاگو

دُنیا کو عجب طرفہ تماشا پایا
اِک حال پر قائم نہیں ماشا پایا
جب نظر و نہیں تولا اِسے ہم نے شاکر
تولہ کہیں پایا۔ کہیں ماشا پایا

بسمل دہلوی

اس سگئے گزرے زمانے میں بھی وتی اہل کمال سے خالی نہیں۔ مگر کمال یہ ہے کہ وہ دنیا سے بے پرواہیں اور دنیا اُن سے بے پروا۔ چند روز ہوئے جناب مرزا بسم اللہ بیگ صاحب بسمل دہلوی کے غیر مطبوعہ کلام کا کچھ حصّہ نظر سے گزرا۔ معلوم ہوا کہ داغ و آزاد سے داد سخن لے چکے ہیں۔ افسوس ہوا کہ ناظرینِ مخزن آجتک آپ سے اور آپ کے کلام سے ناآشنا رہے مگر آپ نے ازراہِ مہربانی تلافیِ مافات کا اور وقتاً فوقتاً اپنا کلام عنایت کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اخلاقی مضامین پر آپ کی خاص توجہ ہے۔ پہلی چیز جو ہمیں ملی ہے وہ ایک سہ غزلہ ہے جس میں درمیانی غزل اُن کے مرغوب طبع رنگ میں ہے۔ پہلی غزل عاشقانہ رنگ کا نمونہ ہے۔ گو اس میں بھی بعض شعر غور سے دیکھے جائیں تو علاوہ معمولی معانی کے گہرے معانی رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر مطلع اوّل کی خوبی ملاحظہ ہو۔ گویا پردہ کی حمایت میں ایک آرٹکل ہے:-

سو آفتوں سے امن ہے اُنکے حجاب میں
سو فتنے ہیں بند سے ہوئے بندِ نقاب میں

کیا جوشِ اشک سے مری چشمِ پر آب میں
دریا کئی کئی ہیں اس ایک ایک حباب میں

چشمِ اشک میں سے اشک میں چشمِ پر آب میں
دریا میں ہیں حباب تو دریا حباب میں

پرزہ کیا اُڑا کے خط کے یہ اِک پرزہ لکھدیا
لو اپنے ایک خط کے یہ سو خط جواب میں

ناراستی بھی حسن ہے اپنے مقام پر — کاکل کا اور حسن بڑھا پیچ و تاب میں
قربان اس بگاڑ پہ سو سو بناوٹیں — بن جاتے ہیں وہ کیسے بگڑ کر عتاب میں
موجود ہیں وہ چشم تصور کے سامنے — سو کوس مجھسے جا کے چھپیں گر حجاب میں
پیدا ہے یہ ترے لب و دنداں کی شرم سے — پنہاں ہے لعل سنگ میں اور گہر آب میں
حدت ہے داغ دل میں شب و روز ایک سی — شدت ہے دوپہر کو فقط آفتاب میں
کمھلا نجائیں پھول سے رخسار آپ کے — ہر دم نہ گھونٹ گھونٹ کے رکھو نقاب میں
پروانے کو چراغ مجھے داغ ہے پسند — ہے اپنی اپنی فہم جدا انتخاب میں
کب دیکھ سکتے ہم اگر اغیار دیکھتے — اچھا ہوا یہی کہ رہے وہ حجاب میں
عشاق کے لہو کی تری تیغ آبدار — پیاسی ہے گرچہ ہے ہمہ تن غرق آب میں
دیکھا جو دیکھ لینے میں اس چشم مست کے — دیکھا کبھی وہ کیف نہ پیکر شراب میں
شرمندگی ہے زندگی ہجر سے مجھے — پر وصل کی امید ہے اسکے جواب میں
واعظ جہنم اُنکے مقابل میں خلد ہے — ہیں جو عذاب عشق مصیبت مآب میں
سورج نہیں کہ ابر ذرا آیا اور چھپا — چھپتا کہیں ہے وہ رخ روشن نقاب میں
آئیں گے کہاں وہ خانہ خراب ہونگے گھر کہاں — یہاں خواب تک نہیں کہ کبھی آئیں خواب میں
گھر کا تو ذکر کیا ہے اگر اسکا بس چلے — آئے نہ وہ خیال میں میرے نہ خواب میں
یہ روئے یار میں لب و دنداں ہیں جلوہ گر — یا جڑ دئے ہیں لعل و گہر آفتاب میں

دیواں انھوں نے دیکھ کے بسمل کا دی یہ داد
قسمت کا رونا رویا ہے خوب اس کتاب میں

دنیا میں تیرہ دل ہے فزوں اضطراب میں — شعلے سے ہے زیادہ دھواں پیچ و تاب میں
حالانکہ پانوں رکھ چکے ہیں ہم رکاب میں — غفلت یہ ہے کہ ہیں پھر اُسی طرح خواب میں
دنیا ہے ایک خواب اور اسمیں یہ زندگی — گویا کہ خواب دیکھ رہے ہم ہیں خواب میں

گر چشم ہوش کھول کے دیکھو تو غافلو عبرت کا موجزن ہے سمندر حباب میں
دنیا میں اور اپنے ہی گھر بیٹھے غافلو جنت کی سیر چاہو تو دیکھو کتاب میں
جو کچھ ہے ایک صفحۂ دل پر لکھا ہوا مضموں نہ وہ سمائے ہزاروں کتاب میں
اسلام سے کے جو بندے تھے قبروں میں جا بسے اسلام رہ گیا ہے فقط اب کتاب میں
زاہد ملے گی فرد نہ محنت سے کئے بغیر یہ سوئے ظن ہے اسکی کریمی کے باب میں
تکیہ جو عفو پر تھا وہ طاعت پہ آ رہا الٹا صواب کر کے پڑا میں عذاب میں
بدتر اگر ہیں سو سے تو بہتر ہزار سے ہیں لاکھ لاکھ شکر خدا کی جناب میں

پیری میں توبہ کر کے وہاں کے اڑاؤ عیش
یہاں کے تو عیش اڑا چکے بسمل شباب میں

دفتر کے دفتر انکو لکھے اضطراب میں دو حرف تک انہوں نے نہ لکھے جواب میں
سرکش کا خاک اوج سمجھتا ہے صاف دل نیچا ہی آسماں نظر آتا ہے آب میں
پیری میں ہمنے ایسی ثقاہت پہ وہ کیا رندوں نے جو کیا نہ ہو عہد شباب میں
ہے وصل میں بھی ہجر کا دھڑکا لگا ہوا ہوں آپ اپنی فہم رسا سے عذاب میں
توبہ تو ہم بھی کر لیں ابھی شیخ جی مگر بہتی ہمیں نظر نہیں آتی شباب میں
گردش میں اپنا ہی یہ مقدر جو ہے سو ہے چکر میں چرخ ہے نہ جہاں انقلاب میں
دل اپنا زلف شاہد دنیا میں ہے اسیر یہ عمر بھر رہے گا یونہیں پیچ و تاب میں
کرتے ہیں شکوہ ضعف کا پیری میں ہم عبث مارے تھے تیر ایسے ہی ہمنے شباب میں

جوہر شناس کون ہے بسمل کو جو اٹھائے
کیا گوہر آبدار پڑا ہے خلاب میں ؎

شوقِ مشاعرہ

پرانے مشاعرے خواب و خیال ہو گئے۔ دنیا کا رنگ کچھ کا کچھ ہو گیا۔ مگر یاروں میں شوقِ مشاعرہ برابر باقی ہے۔ حضرت شاد مدظلہ کی غزل سے جو مصرع طرح دلی کے ایک مشاعرے میں چند مہینے ہوئے لیا گیا تھا۔ اور جس مشاعرے کی دو چیدہ غزلیں ہم نے شایع کی تھیں۔ اس پر بعض اور رسالوں میں بھی طبع آزمائی ہوئی اور ہمارے پاس بھی غزلیں چلی آتی ہیں۔ سب کے لئے تو جگہ کہاں نکل سکتی ہے۔ مگر ذیل کی دو غزلیں درج کی جاتی ہیں۔ ان کے بھی چند اشعار بغرض اختصار چھوڑ دینے پڑے ہیں۔ پہلی غزل جناب فراق دہلوی کی ہے۔ آپ کا نام نامی سید ناصر نذیر ہے اور آپ خواجہ میر درد مرحوم کی یادگار اور شمس العلما مولینا محمد حسین آزاد کے تلمذ ہیں۔ دوسری غزل جناب منشی محمد اشرف صاحب فائق دہلوی نے عنایت کی ہے:۔

تمنا کوئی پیدا کر کوئی ارمان پیدا کر
کسی سر راہ تو بھی اے دلِ نادان پیدا کر

سمائی میرے ارمانوں کی شاید اسمیں ہو جائے
الٰہی دوسرا اک عالمِ امکان پیدا کر

یہ مانا حسن و خوبی میں نہیں کوئی ترا ثانی
مگر مجھسا بھی عاشق کوئی میری جان پیدا کر

یہ خونخواری دل آزاری چلن دیو پری کا ہے
خدا کیواسطے تو خصلتِ انسان پیدا کر

سنا کر خوبیاں فردوس کی حوروں کی اے زاہد
دلوں میں نوجوانوں کے نہ تو ہیجان پیدا کر

تقاضے ہو رہے ہیں پے بہ پے مجھپر طبیعت کے
کوئی معشوق خوشرو اور خوش الحان پیدا کر

نہیں لکھی گئی گر شادمانی میری قسمت میں
تو میری مرگ کا ہی اے خدا سامان پیدا کر

مریضان محبت سُن کے کہتے ہیں مسیحا سے
ابھی تشخیص حاصل کر ابھی ایمان پیدا کر

زمانہ سرد مہری کی شکایت تجھ سے کرتا ہے
محبت اپنے دل میں تو کسی عنوان پیدا کر
بُرائی اور بھلائی دیکھ لی دنیا زمانہ کی
شعور اب تو کسی صورت دلِ ناداں پیدا کر
سمجھ میں تیری آجائے تو میں یہ راز دیتا ہوں
کسی کا عشق تو بھی ناصحِ ناداں پیدا کر
چھچھوری حرکتیں بیہودہ باتیں چھوڑ دی بالکل
زمانہ کی نگاہوں میں تو عزو شان پیدا کر

فراقؔ آنسو بہا کر حضرت شبیرؑ کے غم میں
سمندر کوئی پیدا کر کوئی طوفان پیدا کر

نگہ میں شوق دل میں حسرت و ارمان پیدا کر
تو سُننے ملنے جلنے کے ذرا سامان پیدا کر
ادا بانکی نظر ترچھی نرالی آن پیدا کر
نشانِ شانِ محبوبی تو میری جان پیدا کر
کیا مسند نشینِ مصر آخر بے گناہی نے
زلیخا اور قیدِ یوسفِ کنعان پیدا کر
شب ہجر روز چشم تر ہجوم یاس و تنہائی
وفورِ جوشِ خونِ دل کہیں طوفان پیدا کر
فلک نے رنج ہے وہ روکش جہاں دشمن ہے ہونے دو
جفائیں سہنی ہیں جانِ حزیں اوسان پیدا کر
نظر حیراں ہو دل مضطر شہید ارماں ہوں غم افزوں
ادائے حسنِ زیبا میں غضب کی آن پیدا کر
برنگ بوئے گل جامے سے باہر تو نہ ہو ناداں
تمیز نیک و بد دنیا میں تا امکان پیدا کر
غبارِ خاکِ راہِ منزلِ فکرِ سخن بن کر
بلندی اور پستی کی ابھی پہچان پیدا کر

نہاں لطفِ سخن ہو بندشِ الفاظ و معنی میں
طریقِ موشگافی فائقؔ ناداں پیدا کر

تازہ غزلیں

خنجر بدست ہے وہ بتِ شنگ آجکل
چھڑتے کو ہند میں ہے کوئی جنگ آجکل

ممکن ہے مرگیا ہو ترا وحشیٔ حزیں — لڑکوں کے ہاتھ میں جو نہیں سنگ آجکل
اک مستِ ناز کے لبِ لعلیں کو دیکھکر — بکتا پھرے ہے بادۂ گلرنگ آجکل
لیتا ہے نام و ننگ کی مستونکے سامنے — ناصح جو آبرو سے ہے کچھ تنگ آجکل
اُس گُل کی بو صبا! بنفسِ یار لے صبا! — غنچے سے بھی ہوں بڑھکے میں دل تنگ آجکل
الفت بھی چل رہی ہے زمانیکے ساتھ ساتھ — اگلے سے عاشقی کے نہیں ڈھنگ آجکل

بزمِ سخن کا رنگ ہے پھیکا پڑا ہوا
محروم کیوں خموش ہے نیرنگ آجکل

تلوک چند محروم

مرغوب ہے حسینونکی اک اک ادا مجھے — آتی ہے کچھ جفا میں بھی بوئے وفا مجھے
ہے صورت آفرینِ جہاں سے گلہ مجھے — جسمیں نہ کچھ قرار تھا وہ دل دیا مجھے
اُس چشمِ فتنہ زا نے کیا۔ جانے کیا مجھے — اک اشتیاق تھا کہ جو برسوں رہا مجھے
ناآشنا کوئی بھی سمجھا ملا مجھے ق — جب تک رکھا رکھا تہِ تیغِ جفا مجھے
وہ میں کہ میرے دل کی زمانہ میں موم تھی — دیکھا کسی کو دکھ میں تو آئی حیا مجھے
وہ میں نہ میرا حسنِ طبیعت کبھی کھُلا — وہ میں نہ جانتا تھا مرا آشنا مجھے
وہ میں کہ میرا دل تھا گذرگاہِ آرزو — وہ آرزو نہ جس کا لگا خود پتا مجھے
وہ میں کہ مجھکو چرخ نے ناکام ہی رکھا — وہ میں کہ یاس کا ہی رہا آسرا مجھے
وہ میں کہ میرے دل کو مروّت کی چاہ تھی — وہ میں۔ ملا جو کوئی ملا بیوفا مجھے
ساقی! لا شرابِ ناب کا ساغر پلا مجھے — ہاں دیر کیا ہے۔ دیدے مئے غمزدا مجھے
زاہد نہ میرے ظاہر و باطن پہ جائیو — وہ رند بے ریا ہوں ہے سب کچھ روا مجھے
ہیں اور جنکو خضرِ طریقت کی ہے تلاش — یاں شوقِ دیدِ یار ہے خود رہنما مجھے
تکلیفِ سیرِ باغ مجھے ہمنشیں نہ دے — ناساز دیدہ سے ہے چمن کی ہوا مجھے

سمجھوں گا روحِ تازہ یکایک مجھے ملی ملجائے غیب سے جو کوئی دلربا مجھے
کس کی نگاہِ ناز نے مدہوش کر دیا اچھا بھلا تھا میں ابھی یہ کیا ہوا مجھے
اللہ رے زبانِ محبت کی لذتیں بھولیگا عمر بھر نہ یہ اے دل مزا مجھے
ہے شوقِ وصلِ یار نے بیخود سا کر دیا رہتا ہے گویا آٹھ پہر اک نشا مجھے

ناشاد سوزِ عشق سے مجبور ہوں کمال
اس درد کی کہیں نہیں ملتی دوا مجھے

میر نذیر حسین ناشاد

محتسب رندوں نے کیا اوچھا تھا رسوا ہو گیا مفت میں بدنام یہ بندہ خدا کا ہو گیا
میری بل کھائی ہوئی قسمت سے پھندے پڑ گئے حال نستعلیق میں لکھتا تھا طغرا ہو گیا
دستِ نورانی جو رکھا اُس نے سینے پر مرے داغ دل میرا چراغِ دستِ موسیٰ ہو گیا
وصفِ چشمِ یار لکھتا آبرو اپنی بڑھی ایک ہی نقطے میں میں ادنیٰ سے اعلیٰ ہو گیا
کعبۂ دل میں ہر اک اِنسان کے رہنے لگے ان بتوں کا مرتبہ اللہ اتنا ہو گیا
کس طرح سے میرے کہنے کا انہیں آتا یقین ہاتھ کے رکھتے ہی دلکا درد اچھا ہو گیا

ڈالتے ہی ہاتھ میں لچکی کلائی شوخ کی
چوڑیوں کا بوجھ اختر لاکھ من کا ہو گیا

اختر شاہجہانپوری

مزہ جبھی ہے کہیں ہم بھی جلے مکاں کی طرح مجھے بھی پھونکدے اے برق آشیاں کی طرح
کھنچے ہی رہتے ہیں بازو ترے کماں کی طرح جھکے ہی رہتے ہیں ہر وقت آسماں کی طرح
اُمیدیں تجھسے بہت کچھ تھیں مجکو اے تقدیر جواب تو نے بھی آخر دیا فغاں کی طرح

کچھ اُن سے لینی تھی قیمت مگر بہت چوکے — جو دیدیا اُنھیں دل ہمنے ارمغاں کی طرح

ہجوم غم سے کچھ اُس انجمن میں کہہ نہ سکے — خموش بیٹھے رہے ہم بھی بے زباں کی طرح

بہار آتے ہی توبہ شکن میں بن بیٹھا — بدل گئی مری نیت تری زباں کی طرح

عدوئے جاں ہیں مری جان لیکے چھوڑینگے — عدوئے عیش نہیں ہیں وہ آسماں کی طرح

خدا کرے ترے ابرو تنے رہیں یونہیں — کسے پسند ہے اُتری ہوئی کماں کی طرح

دوائے دردِ جگر ہے یہ یار کی تحریر — گلے میں باندھ لوں تعویذ حفظ جاں کی طرح

تمام شب ترے آنیکا انتظار رہا — لگی نہ آنکھ مری چشم پاسباں کی طرح

نکل کے جائیں کہاں موج حسرتیں دل کی
رہیں گی دل ہی میں ناکام حیا وداں کی طرح

پنڈت چھوٹو لال موج

وہ ہیں اور جلوہ ہے مشتاق تماشا اُنکا — ہم ہیں اور سامنے آئینہ حیرانی ہے

مژدہ اے سلسلۂ شوق پریشان گوئی — مدعا شانہ کش زلف پریشانی ہے

کیوں کیا حوصلۂ عرض تمنا کو ذلیل — مجھ سے نادم مرا انداز پشیمانی ہے

مژدہ اے جوشش تپیدن کہ بہ خنجر شوق — ناز بسمل ہے اور آغوش گرانجانی ہے

ناز بردار اجل ہے مری بیتابی دل — میں ہوں اور حوصلہ ذوق تن آسانی ہے

تا کجا ذوق نظر بازی عبرت کہ جہاں — سر و ساماں ہوس بے سر و سامانی ہے

کیا ہوا اے نفس باز پسین بسمل — آج کیوں اس قدر ارمان گرانجانی ہے

وائے بیگانگی عرض تمنا کہ ہنوز — مدعا وحشت آہوئے بیابانی ہے

حسن بے پردہ و بیتاب نظر ہے توفیق
چشم مشتاق سے پھر وعدۂ حیرانی ہے

مخزن پریس دہلی

نے

اتنے ہی عرصے میں جو خصوصیت چھپائی میں حاصل کرلی ہے وہ سب ناظرین جانتے ہیں۔ اس سے پیشتر ہمارے ہاں باہر کا کام نہیں چھپ سکتا تھا اور بار ہا انکار کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اس مہینے سے ہمنے پریس میں توسیع کردی ہے اور اب مخزن پریس احباب کی فرمائشوں کیلئے مستعد ہے لیتھو میں جس قسم کا کام آپکو چاہیئے ارشاد فرمائیے انشاء اللہ حسب منشاء تعمیل ہوگی۔ اعلیٰ قسم کی چھپائی اور ہر قسم کا رنگین کام مخزن پریس کی ایک خصوصیت ہے۔ جو صاحب چھپائی کا کام بھیجنا چاہیں وہ اب بلا تکلف بھیجدیں۔ ہر چیز کا نرخ خط و کتابت سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کاغذ وغیرہ ہر چیز موجود رہتی ہے۔ آپ مسودہ مفصل ہدایات لکھکر بھیجدیجئے کتاب چھپی چھپائی آپکو گھر بیٹھے مل جائے گی۔

مینیجر مخزن پریس

دہلی

مخزن پبلشنگ ایجنسی کی مشہور کتابیں

رسوم دہلی مستورات مسلمانان

از تالیف مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ اس کتاب کی خوبی کیلئے اسکے مؤلف کا نام ہی کافی ضمانت ہے۔ فرہنگ آصفیہ کے مرتب کرنیسے مولوی سید احمد صاحب نے جو احسان اُردو زبان پر کیا ہے اسکی کافی داد نہیں دیجا سکتی۔ مولوی صاحب کی معلومات رسوم قدیمہ کے متعلق حیرت انگیز ہیں۔ اس کتاب میں مولویصاحب نے بچے کے پیدایش کی معلومات سے لیکر شادی اور میت کی تمام رسومات نہایت شرح و بسط سے لکھی ہیں۔ زبان عورتوں کی لکھی ہے جو اسقدر پیاری اور دلچسپ ہے کہ کتاب چھوڑنیکو دل نہیں چاہتا اور بیساختہ داد مُنہ سے نکلتی ہے۔ مستورات کے لئے یہ کتاب زیادہ باعث دلچسپی ہے اور اسکا مطالعہ انکے لئے زیادہ مفید ہے۔

قیمت فی جلد ۱۲ علاوہ محصولڈاک۔

مثنویات میر حسن

میر حسن کی مثنوی بےنظیر بدر منیر کا جو پایہ اُردو زبان میں ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اور یہ بےبہا چیز جسطرح غلط شلط بُری کلیما چھپکر بازار میں ملتی ہے وہ اس قابل نہ تھی کہ باذاق اصحاب کی الماریوں کے لئے باعث زینت ہو۔ اسلئے ضروری تھا کہ سلیس اُردو کے اس اُستاد کامل کی کتاب اچھے لباس اور صحت کے ساتھ چھپی ہوئی شائقین کے روبرو جلوہ گر ہو۔ چنانچہ یہ کوشش بارآور ہوئی اور بہت تلاش سے میر حسن کی دوسری غیر مطبوعہ مثنوی گلزار ارم بھی ایک مستند قلمی نسخے سے نقل کرکے شامل کر دی ہے۔ اور ایک نہایت مفصل اور بسیط دیباچہ جناب مولوی سید اشرف حسین صاحب بی اے نے لکھکر اس مثنوی بےنظیر کی داد دی ہے۔ اور اسکی خوبیاں اور دیگر لطیف نکات جو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا نہایت خوبی اور قابلیت سے بیان کئے ہیں۔ قیمت عہ علاوہ محصولڈاک۔

خوابِ ہستی

مصنفہ پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی ایم اے۔ ایم اے او کالج علیگڈھ۔ ہم یقیناً عام بازاری مخرب اخلاق ناولوں کی اشاعت کے خلاف ہیں۔ اسلئے آپکو یہ یقین کر لینا چاہئے کہ بصورت اس احتیاط کے جو ناول ہمارے ہاں سے شائع ہوگا وہ کیسا ہوگا۔ خواب ہستی کہنے کو تو ناول ہے لیکن درحقیقت جدید طرز معاشرت کا سچا مرقع بلکہ رسم و رواج کا آئینہ طلبا کی تعلیمی چشمک اور خلوتی زندگی کا لب لباب ہے جس میں روزمرہ کے واقعات و کوائف کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ لائق مصنف نے ناول کے واقعات

دلکش پیرایے میں زندگی کے ایسے ایسے اہم مسائل بیان کیے ہیں کہ اس سے پیشتر کسی ناول نویس نے اس طرف توجہ نہ کی تھی اور عجیب پیرایہ میں دکھایا ہے کہ مغربی تعلیم کا اثر ان نوجوانوں کی طبیعت پر کیا ہوتا ہے جو اپنے مذہب کی ضروری باتوں سے ناواقف رہتے ہیں۔

اس ناول میں اور بھی چند خوبیاں ایسی ہیں جو اسکو دوسرے ناولوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ملک کے تمام اخبارات نے اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

اس ناول میں علاوہ لکھائی چھپائی کے نفیس ہونے کے فسانہ کے متعلق بھی تین ہاف ٹون تصویریں ہیں جو اس کتاب کی زینت کو دوبالا کرتی ہیں۔ حجم بھی دو ڈھائی سو صفحے ہے۔ قیمت ۱۲؎ علاوہ محصولڈاک

ابو مسلم خراسانی

یہ مخزن ایجنسی کا دوسرا ناول۔ رسالہ الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے۔ اس عجیب و غریب ناول میں قرون وسطیٰ کی تدبیر ملک داری سلطنت بنی اُمیہ کی تباہی اور حکومت عباسیہ کی بنیاد کا حال مفصل بیان کیا ہے۔

ابو مسلم۔ وہ نامور مسلمان پالیٹیشن اور بے مثل مدبر تھا جسنے ایک صدی تک نہ صرف شور کے ساتھ حکمران رہنے والے خاندان بنو اُمیہ کو فاحت کر کے بنی عباس کی خلافت قائم کر دی۔ افسوس ایسے نامور مدبر کی اُردو زبان میں کوئی مکمل سوانح عمری نہیں۔ جس سے اسکے اخلاق و عادات و تدبیر ملک داری کا پورا پتہ چل سکے۔

فاضل مصنف نے ابو مسلم کی سوانح عمری حسن و عشق کے نمک کے ساتھ اس غور و تعمق سے تحریر کی ہے کہ قرون وسطیٰ کے حالات کا نقشہ آنکھوں میں کھینچ جاتا ہے۔ ابو مسلم کی چاہنے والی گلنار کی حسرت بھری داستان اس اندوہناک حسرت خیز قصے کی جان ہے۔

وہ وہ کیریکٹر اس ناول میں دکھلائے گئے ہیں کہ مصنف کے فن ناول نویسی میں کمال کی داد دینی پڑتی ہے۔ مولوی محمد حلیم صاحب سندیلوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمائش پر اسے عربی سے سلیس اُردو میں ایسی خوبی اور قابلیت سے ترجمہ کیا ہے کہ ترجمہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔

اسلامی تاریخ کے شیدائیو یہ ناول ضرور پڑھو۔ حجم چار سو صفحے کے قریب اور قیمت صرف ۱۲؎

"مخزن حکمت" (یا) "گھر کا ڈاکٹر و حکیم"

معنفہ شمس الاطبا

کی نسبت ہندوستان کے مشہور حکیموں نامی گرامی ڈاکٹروں اور قابل ایڈیٹران کی قیمتی رائیں۔ نواب سر شہباز خان کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ "مخزن حکمت ستقدر قابل عزت کتاب ہے کہ ہر ایک اُردو خواں کے پاس اسکا موجود ہونا ضروری اور نہایت ہی مفید ہے"۔

حاذق الملک جناب حکیم محمد اجمل خانصاحب رئیس دہلی و سکرٹری مدرسہ طبیہ دہلی "مخزن حکمت ایک مفید عام کتاب ہے اور مجھے اُمید ہے کہ پبلک اسکی قدر کر کے لایق مصنف کی داد دینے میں بخل نہیں کرے گی"

عالیجناب حکیم مولوی نورالدین صاحب سابق حکیم مہاراجہ کشمیر "ہندوستان کے اطبا اور عامۃ الناس کو جناب شمس الاطبا کا صدق دل سے شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ انہوں نے مخزن حکمت جیسی ضخیم و مفید عام کتاب لکھکر ملک کو ممنون احسان بنایا ہے۔ اور جو قیمت مجلد کتاب کی رکھی ہے وہ گویا اصل جواہرات کو کوڑیوں کے مول بیچنے کا معاملہ ہے"۔

عالیجناب حکیم محمد عبدالعزیز صاحب بانی مدرسہ تکمیل الحکمت لکھنؤ "مخزن حکمت واقعی نہایت عمدہ کتاب ہے اور مجھے اُمید ہے کہ پبلک اسکی ضرور قدر کریگی"۔

جناب ڈاکٹر محمد وارث صاحب ایم۔ ڈی۔ (ہائیڈلبرگ) رئیس لکھنؤ "مخزن حکمت ہر ایک گھر میں رکھنے کے قابل کتاب ہے۔ نیز کسی حکیم یا ڈاکٹر کو بھی اس کتاب کے بغیر نہیں رہنا چاہئے۔

جناب محمد ڈاکٹر بی ایل ڈھینگرا ایم۔ ڈی (لنڈن) چیف میڈیکل آفیسر ریاست جنید "مخزن حکمت جو کلیات طب کہلانیکی مستحق ہے درحقیقت ایک نہایت ہی مفید تصنیف ہے اور طب خانگی پر بہترین کتاب ہے"

جناب ڈاکٹر الہ دیا صاحب پرنسپل حبیبیہ میڈیکل کالج کابل "میں اُردو داں پبلک کو جنہیں میرے خیال میں طب خانگی پر ایک ایسی کتاب کی اشد ضرورت ہے نیز ڈاکٹروں و حکیموں کو مخزن حکمت کی بڑے زور سے سفارش کرتا ہوں"

جناب محمد ڈاکٹر دھنپت رائے۔ ایم۔ آر۔ سی۔ ایس (لنڈن) "میری رائے میں کسی اُردو داں کو مخزن حکمت کے بغیر نہیں رہنا چاہئے"

خان بہادر ڈاکٹر سید امیر شاہ صاحب فیلو پنجاب یونیورسٹی لاہور "کوئی گھر مخزن حکمت سے خالی نہ رہنا چاہئے"۔

رائے بہادر ڈاکٹر بیلی رام صاحب فیلو پنجاب یونیورسٹی "مخزن حکمت تمام اُردو داں اشخاص کیلئے مفید ثابت ہوگی"

مسٹر عبدالعزیز صاحب ایم۔ اے۔ ایڈیٹر اخبار آبزرور و فیلو پنجاب یونیورسٹی "مخزن حکمت ایک نہایت ہی مفید اور بہترین تصنیف ہے"

مسٹر نگم صاحب ایم۔ اے۔ ایڈیٹر اخبار ہندوستان "مخزن حکمت ستقدر قابل قدر ہے کہ ہر ایک گھر میں اسکا موجود ہونا لازمی ہے"

نوٹ۔ ابھی بہت سے نامور حضرات کی رائیں موجود ہیں جو بسبب عدم گنجایش درج نہیں ہو سکتیں۔

حجم کتاب ۰۰۰ صفحات قیمت للعہ مجلد ہیر کتاب کے ملنے کا پتہ۔ دفتر جناب شمس الاطبا لاہور۔

عرق ماء اللحم انگوری

اور

درازیٔ عمر

یہ امر تازہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ دو بزرگ ہم عمر عہدہ دار جو اتفاق سے ایک ہی ضلع میں مقرر تھے۔ ایک ہی مرض میں مبتلا تھے ضعف دماغ اور تاریکی چشم۔ سر کا گھومنا تھوڑے کام سے دل چرانا جس روز دو چار گھنٹہ جھکر کام کرنا پڑے۔ سرد رد ہو جانا۔ بھوک کا بند ہو جانا۔ ہاتھ پاؤں کا ٹوٹنے لگنا۔ اور کبھی گھر میں تخلیہ کا موقع ملے تو صبح کو کوفت اعضا تھکی معلوم ہو چارپائی سے اُٹھنے کو دل نہ چاہنا۔ ایک صاحب نے عرق ماء اللحم کا استعمال کیا۔ اور دوسرے صاحب نے مختلف معالجہ ڈاکٹروں حکیموں کا کرتے رہے چند دنوں بعد عرق پینے والے کا رنگ روئے سرخ ہو گیا۔ اور زردی چہرہ دور ہو کر گال جو پچکے ہوئے تھے پُر ہو کر رنگ چمکنے لگا۔ تو دوسرے مختلف دوا کھانیوالے نے دوست سے متعجب پوچھا یار کیا بات ہے۔ تم تو چار بجے کے بعد چھ ساڑھے چھ بجے تک کچہری میں کام کرتے رہتے ہو صبح دم دیکھو سویرے ہی اُٹھکر پھر ہوا خوری کے لئے تیار یہ ماجرا کیا ہے۔ اسنے کہا بات یہ ہے کہ میں عرق ماء اللحم انگوری دوا ساختہ حکیم غلام نبی لاہوری پیا کرتا ہوں چنانچہ وہ سنکر رہ سکے جھٹ تار دیا۔ عرق بھیجدو۔

اب اس ڈپٹی کلکٹر کا سارٹیفکٹ ملاحظہ کیجیے۔ جسنے سول سرجن اور دوسرے معزز حکماء کا علاج کیا اور ناکامیاب رہا۔ دیکھئے وہ کیا کہتا ہے۔ آمد آنہ کا ٹکٹ بھیجدیجئے سارٹیفکٹ صحت یافتہ صاحب کے بھیجدونگا۔ قیمت فی بوتل ؏ تین بوتل سے چھ بوتل لعہ فی درجن عـہ بذریعہ ریل منگوائیں محصول کی کفایت ہوگی۔ ریلوے سٹیشن بمعہ لائن صاف لکھیں۔ ورنہ بذریعہ ڈاک منگوائیں عہ محصول ڈاک پیشگی آنا ضروری ہے

پتہ

حکیم غلام نبی زبدۃ الحکماء لاہور موچی دروازہ اعوان منزل

دیش اپکارک اوشدھالیہ میں دوا کی سریع التاثیری کے بھروسے پر نمونہ بھی دیا جاتا ہے فہرست طلب کر ملاحظہ فرماویں

یہ ممکن ہے کہ ایک ہی دوائی کل امراض کا حکمی علاج ہو۔ صرف ایک چھوٹی سی شیشی ہر وقت ہر بیماری پر برتی جا سکتی ہے نہ منگا دیں

دیش اپکارک "طبی اخبار" ہندوستان بھر میں ایک ہی ہفتہ وار طبی اخبار ہے۔ طرفہ یہ کہ چھپتا بھی سب سے زیادہ ہے "نمونہ مفت"

۲ کے سلسلہ میں ایک رسالہ ہر دوسرے مہینے نکلتا ہے ایسے طبی مضامین لکھے جاتے ہیں جنکے جاننے کی ہر شخص کو ضرورت ہے۔ فہرست منگاویں

ہم طیشر علاج بھی کرتے ہیں۔ جو صاحب ہمارے پاس آویں ان کو جگہ مفت رہنے کو دیتے ہیں اور دوائی بھی اگر چاہیں تو مفت

امرت کی دھارا سچ مچ لاثانی دوائی ہے۔ جو ایک دفعہ منگواتا ہے۔ ہمیشہ کے لئے اس کو اپنا یار بنا لیتا ہے +

ہم ان کل امراض کا علاج خاص طور پر کرتے ہیں جو عام طور پر لا علاج کہی جاتی ہیں مفصل حالات لکھنے چاہئیں +

ٹھاکر دت شرما وید مالک دیش اپکارک اوشدھالیہ و ایڈیٹر دیش اپکارک و فیملی ڈاکٹر و مصنف رسالجات طبی لاہور چوک متی

امریکہ کی شہرہ آفاق کی سٹون ایلگن واچ کمپنی کی بے مثال و بے نظیر جیبی گھڑیاں
صاحبان! یہ وہ نامور کمپنی ہے جسکی ۳ کروڑ سے زیادہ گھڑیاں اسوقت دنیا کے تمام بڑے ملکوں میں مستعمل ہیں اور جو اپنے ہم چشموں میں قابل رشک ہے۔ پائداری خوبصورتی اور بناوٹ کے لحاظ سے انکی گھڑیاں لاثانی ہیں یہی وجہ ہے کہ ریاست ہائے عالیہ پٹیالہ کے دانا اور تجربہ کار انسپکٹر جنرل پولیس عالیجناب مسٹر جے۔ پی وار برٹن صاحب بہادر نے اپنے افسران پولیس کے واسطے ہمسے اس کمپنی کی پانچسو گھڑیاں یکدم خرید فرمائی ہیں اور تمام گھڑیوں پر انکو ترجیح دیتے ہیں۔ افسوس کہ ہندوستان کے لوگ سستی گھڑیوں کے دلدادہ ہیں اور قیمت کے سامنے عمدگی کا لحاظ نہیں کرتے۔ اور مرمت پر تگنا چوگنا خرچ کر دینا گوارا کرتے ہیں ہمنے اس کمپنی سے خاص طور پر یہ گھڑیاں تیار کروائی ہیں۔ جو پائیداری اور عمدگی میں لاجواب اور قیمت میں کم ہیں۔ تمام عمر کیلئے ایک گھڑی کافی ہے۔ جلد منگوا کر ملاحظہ فرمائیے۔
(۱) گن مٹل۔ نکل سلور۔ یا سنہری کیس۔ اعلیٰ درجہ کی لیور قیمت صرف گارنٹی ۵ سال۔
(۲) قسم اعلیٰ نکل سلور و خالص چاندی کے کیس منقش قیمت روپے و روپے گارنٹی ۱۵ سال۔
سستی امریکن و سوئس۔ لیور مضبوط جیبی گھڑیاں۔ قیمت صرف گارنٹی ایکسال۔
دی پنجاب واچ اینڈ ڈائی سنکنگ ہاؤس۔ چیرنگ کراس ایریا لاہور
شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد کی تصنیفات
مولانا آزاد کی کل تصنیفات ہمنے اعلیٰ درجہ کی خوشخط عمدہ ولائتی کاغذ پر چھپوائی ہیں۔ صرف ہماری دوکان سے بذریعہ وی۔ پی مل سکتی ہیں۔ دوکانداروں سے ۲۵ جلد یکمشت خریدنے پر خاص رعایت کیجاویگی۔
سخندان فارس
قند پارسی
نصیحت کا کرن پھول
نظم آزاد
نیرنگ خیال
دیوان ذوق
المشتہر خلیفہ سید محمد سالم مہتمم آزاد بکڈپو اکبری منڈی لاہور

اپریل ۱۹۰۸ء

جلد ۱۵ نمبر ۱

مخزن

ایڈیٹر شیخ عبد القادر
شیخ محمد اکرام

اُردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

تصویر
حاجی مرزا محمد تقی

نثر
اقتصادی ترقی ۔ مسٹر منوہر لعل ایم اے پرنسپل نذیر کالج ۱
شاہین و دُرّاج ۔ مولوی محمد عبد الراشد الخیری ۱۱
حکایۂ لیلیٰ و مجنوں ۔ سید سجاد حیدر بی اے ۱۹
دردِ جانستاں ۔ سید ناصر نذیر دہلوی ۲۷
صحرا کی لڑکی اور سن رسیدہ شاعر ۔ منشی محمد عنایت اللہ بی اے ۳۵
آخری مغلیہ بادشاہ کا خاصہ ۔ پنڈت شیو نراین شمیم وکیل چیف کورٹ ۳۹
گنیش چوتھ کا برت ۔ مولوی سید احمد دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ
خرقۂ بہائیہ کے داعی ۔ شیخ عبد القادر

نظم
عروسِ شاعری ۔ مولوی عبد الغفور خاں شہباز
ماتمِ آرزو ۔ منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی
بلبلِ اسیر ۔ سید شمس الحق خیال ۵۸
حرصِ دنیا ۔ سید دلاور شاہ فصیح دہلوی ۵۹
تضمین حضرت بیان بر غزل خود ۶۲
تحفۂ عظیم آباد ۶۴
ارمغانِ غازی پور
تازہ غزلیں ۷۱

دس کروڑ ہندوستانی اُردو بولتے اور اسی قدر اور ہندوستانی اُردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اُردو مادری زبان ہے ▢ ان شہروں میں اُردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اُردو سمجھی جاتی ہے

باہتمام حاجی مظہر علیم مخزن پریس دہلی میں چھپ کر شائع ہوا

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک قسم اوّل ہے فی پرچہ ۸ر

مستورات کیلئے اردو میں ایک نئے ماہوار
رسالے کی تجویز کا
اعلان

مخزن پریس دہلی میں چھپا

ہندوستان میں ہماری دنیا دو حصّوں میں منقسم ہے۔ گھر کی چار دیواری اِن دونوں میں حد فاصل ہے۔ ایک حصّہ چار دیواری کے باہر ہے۔ ایک چار دیواری کے اندر ہمارا طریق عمل بتا رہا ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ چار دیواری کے باہر سب کچھ ہے اور چار دیواری کے اندر کچھ بھی نہیں۔ باہر کی دنیا دنیا ہے اور اندر کی دنیا صرف چلتی پھرتی بولتی چالتی تصویریں ہیں۔ جو باہر کی دنیا کے دل بہلانے کے لئے مُہیّا کی گئی ہیں۔ جب باہر سے ذرا تھکے تو اندر جاکر اُن کا تماشا دیکھ لیا۔ لیکن اس بات کا وقت آگیا ہے کہ یہ غلط خیال ہمارے دلوں سے نکل جائے اور ہمارے موجودہ طریق عمل کی اصلاح ہو جائے چار دیواری کے اندر جو دنیا آباد ہے وہ زندہ دنیا ہے۔ اور اس عالم میں انہیں مقاصد سے اسے بھی زندگی بخشی گئی ہے جن کی تکمیل ہماری زندگی کا مآل ہے۔ اُس اندر کی دنیا کے رہنے والوں میں عقل خداداد ایسی ہی موجود ہے جیسی باہر کی دنیا والوں میں ذہانت بسا اوقات اعلےٰ درجے کی پائی جاتی ہے۔ بہت سے اور وصف ہیں جو قدرت نے باہر کی دنیا کے برابر یا اس سے بڑھ کر انہیں دئے ہیں۔ مگر اندر کی دنیا علم کی روشنی سے محروم ہے۔ غنیمت ہے کہ ملک میں جابجا زنانہ مدارس کے ذریعے اندر کی دنیا سے تاریکی دور کرنے کی کوشش شروع ہوئی ہے اور چند رسالے اور اخبار اس کوشش کی تائید پہ آمادہ ہوئے ہیں۔ ان مدارس اور

اخبارات اور رسائل کے سامنے جو کام ہے وہ بہت اہم ہے اور اسکی بڑائی اور وسعت کے اعتبار سے ان کی تعداد اور قوت نہایت کم ہے۔ چونکہ ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے مقدور کے موافق اُس کام میں جسے وہ نیک سمجھے مدد دے۔ اسلئے ہم بھی خدا کے توکّل پر ایک ناچیز سی کوشش سے اُن لوگوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں جو پہلے سے اس مبارک کام میں مصروف ہیں اور اُردو میں ایک رسالہ نکالنا شروع کرتے ہیں جو اس نظر سے لکھا جائیگا۔ کہ اردوداں مستورات اسے آسانی سے پڑھ سکیں اور اسکے پڑہنے سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

اِس رسالہ کا نام 'عصمت' ہوگا۔

۱۔ حرم کی حرمت قایم رکھنا۔ انگریزی زبان میں ایک مثل ہے کہ "انگریز کا گھر اسکے لئے قلعہ کا حکم رکھتا ہے"۔ اسی طرح ہمارے ہاں ہر شخص اپنے گھر میں پادشاہ ہے۔ گھر کی چار دیواری مٹی کی بنی ہوئی کیوں نہ ہو۔ دروازہ کے باہر پھٹے سے ٹاٹ کا پردہ کیوں نہ پڑا ہو۔ مگر یہ وہ مبارک حدود ہیں جن کے اندر غیر کا قدم نہیں آسکتا۔ مرد شریف کا منتہائے خیال یہ ہونا چاہیئے کہ حرم دنیا میں ایک بہشت کا نمونہ بن جائے۔ چار دیواری کے باہر جد و جہد اور کد و کاوش ہو تو چار دیواری کے اندر امن و امان اور سکون و اطمینان۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہی۔ جب ساکنانِ حرم ایسی تربیت پائیں جس سے وہ اپنے فرایض منصبی کو عمدگی سے انجام دے سکیں۔

۲۔ عالم نسوان کی ترقی۔ عالم نسوان صرف بیرونی دنیا سے ہی قطعی الگ تھلگ پڑا ہوا نہیں۔ بلکہ اپنے حال سے بھی بے خبر ہے اسکے پاس

اس بات کے معلوم کرنے کے ذرایع بھی بہت کم ہیں کہ دوسری مُلکی بہنیں کیا کر رہی ہیں اگر کہیں بعض خواتین علم سے بہرہ ور ہوکر ترقی کر بھی رہی ہیں تو اُنکی اکثر بہنیں اس حال سے واقف نہیں ہیں ورنہ ایک کی ترقی دوسری کے لئے ترغیب کا باعث ہو۔ اس ترقی کے سب حالات مختلف ذرایع سے جمع کر کے اُن کی طرف دوسری خواتین کو متوجہ کیا جائے گا +

۳۔ **تعلیم نسواں کی حمایت**۔ چند سال سے ملک میں تعلیم نسواں کا شور ہے۔ مگر کامیابی بہ قدر ضرورت تو کجا۔ ابھی بہ قدر شور بھی تو نہیں ہوئی۔ بلکہ ابھی اس پر بحث ہو رہی ہے کہ تعلیم کیسی ہو اور کہانتک ہو۔ یہ بھی زیر بحث ہے کہ کیونکر ہو۔ اور کچھ لوگ تو ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ کیوں ہو۔ خیر ان سے تو بحث بے سود ہے۔ مگر باقی سب کو اکثر یاددہانی کی جائیگی کہ اس ضروری فرض کے ادا کرنے کی طرف جلد متوجہ ہوں اور اس مسئلہ پر ناقدانہ غور کر کے اس کا فیصلہ کریں +

۴۔ **معلومات عامّہ**۔ ناظرین کیلئے معلومات عامہ بہم پہنچانا اور اُن کی معلومات عامہ کو بڑھانا اخبار اور رسالہ کا فرض ہوتا ہے عصمت اس فرض کی ادائگی میں اپنے ناظرین کی ضروریات ملحوظ رکھیگا۔ منجملہ دیگر معلومات کے پردہ نشین خواتین کیلئے وقتاً فوقتاً مشہور مقامات کے مختصر حالات مع تصاویر دیا کریگا۔ تاکہ مستورات گھر بیٹھی ہی مُلک کی سیر کر سکیں۔ اور حالات ملک سے بالکل ناواقف نہ رہ جائیں +

۵۔ **معلومات خاصّہ**۔ یوں تو اس رسالے کا اکثر حصّہ خواتین کا لکھا ہوا ہوگا مگر وہ اوراق جو ان معلومات سے پُر ہوں۔ جو مستورات کیلئے خاص طور پر مُفید یا ضروری ہوں ذی علم مستورات سے لکھوائے جائینگے +

۶ عصمت میں مضامین علمی۔ ادبی۔ تاریخی۔ معاشرتی۔ سوشل غرضیکہ ہر قسم کے مضامین جو مستورات کے لئے مفید اور ضروری سمجھے جائینگے درج ہونگے۔ پولیٹکل مضامین سے قطعی احتراز ہوگا۔ دلچسپ سلیس معنی خیز نظمیں بھی ہوا کرینگی +

عصمت میں مستورات سے مخصوص خبروں کا خلاصہ بالالتزام اور دیگر مضامین کا اقتباس یا ترجمہ وقتاً فوقتاً درج ہوگا +

۷ ۔ زنانہ لٹریچر کی توسیع اور ملک کے مشہور اہل قلم سے کنواری اور بیاہی لڑکیوں کے لئے مفید اور ضروری کتابیں تصنیف کرانا عصمت کے مقاصد میں ہوگا +

۸ ۔ کوشش کیجائیگی کہ ہندو اور عیسائی بہنیں اس رسالہ کی دلچسپی کے بڑھانے میں اپنی مسلمان بہنوں کے شریک ہوں اور عصمت میں مضامین لکھیں۔

۹ ۔ جواب طلب استفسار بھی بصورت گنجایش درج ہوسکینگے۔

اسوقت اردو میں تین چار پرچے ایسے ہیں جو عالم نسواں کی خدمتمیں مصروف ہیں اور ان میں بھی صرف دو ایسے ہیں جنہوں نے ملک میں شہرت اور اعتبار پیدا کیا ہے۔ مگر اتنے بڑے ملک میں اتنی ضروریات کے لئے دو پرچے بہت کم ہیں۔ ہم ان دونو کی بیش بہا خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ اور انصاف یہ ہے۔ کہ انہی دونو کی بدولت اس تیسرے پرچے کی ہستی ممکن ہوئی ہے۔ ورنہ چند سال پیشتر کسی کو ایسا رسالہ نکالنے کی جرأت نہ ہوتی اور اگر جرأت کرتا تو اُسے یقیناً ناکامی کا سامنا ہوتا۔ مگر اب حالت بدل گئی ہے۔ لاہور کے مشہور ہفتہ وار پرچہ **تہذیب نسواں** کی کوشش اور مسز ممتاز علی صاحبہ اور مولوی ممتاز علی صاحب کی توجہ سے

ایک معقول حلقہ اخبار بین مستورات کا پیدا ہو گیا ہے۔ رسالۂ **خاتون** علیگڈھ اور اسکے اڈیٹر شیخ عبداللہ صاحب بی۔اے۔ وکیل اور مسنر شیخ عبداللہ صاحبہ کی کوشش بھی اسی طرح داد کے قابل ہی اور انھوں نے بھی پڑھی لکھی خواتین میں مضامین لکھنے اور پڑھنے کا شوق پیدا کرنے میں معقول حصہ لیا ہے۔ اِن دونو پرچوں کے بَین بَین ایک پرچے کی ضرورت بعض خواتین نے خود محسوس کر کے مختلف موقعوں پر تحریک کی۔ کہ ایک رسالہ مستورات کے لئے مطبع **مخزن** سے بھی نکلے تو خوب ہو۔ یہ آج کا اشتہار اُس تحریک کا جواب ہے۔ ہمیں پُکارا گیا تھا۔ ہم لبّیک کہتے ہیں اور خدمت پر کمر بستہ ہیں۔ جو حضرات اس خیال کے مؤید ہوں اُن سے التماس ہی کہ اعلان سے ایک مہینے کے اندر اس قدر درخواستیں تو بھجوادیں جنسے یہ یقین ہو جائے کہ مُلک میں ایک ایسے رسالے کی مانگ ہے اور پھر اسکے نکلنے پر مزید کوشش اسکی اشاعت کے لئے فرمادیں ÷

رسالہ عصمت کا حجم علاوہ سرورق کے ۴۸ صفحے ہوگا اور سرورق ایسا ہوگا جو اُن ہاتھوں میں جانے کیلئے موزوں ہو جنکے لئے یہ رسالہ مقصود ہی۔ یہ رسالہ چکنے ولائتی کاغذ (مخزن قسم اوّل کا کاغذ ہوگا) پر خوشش قلم چھپے گا۔ اور کم از کم ایک تصویر سے مزیّن ہوا کریگا۔ اسکی قیمت سالانہ مع محصولڈاک تین روپیہ صرف ہوگی۔ جو ہر صورت میں پیشگی واجب الادا ہوگی۔ شائقین درخواست کے ساتھ بھیجدیں یا پہلا پرچہ وی۔پی روانہ کرنیکی اجازت دیں۔ جو صاحبان اِس رسالے کے مقاصد سے ہمدردی رکھتے ہیں اور اسکی قلمی اعانت کرنا چاہیں انہیں اپنے مضامین میں زبان کی سادگی اور سلاست کو ملحوظ رکھنا ہوگا خواہ وہ نظم لکھیں یا نثر۔ اور خیالات میں بھی اس امر کا پاس

رکھنا ہوگا کہ یہ پرچہ شریف بیبیوں اور پڑھی لکھی کم عمر کنواری لڑکیوں میں جائیگا۔ تعلیم یافتہ خواتین کے مضامین جو چھپنے کے لائق ہوں گے دلی شکریہ کے ساتھ درج کئے جائیں گے +

اگر کوئی خاتون اپنا نام چھپوانا نہ پسند کریں گی تو اسکی بجائے وہ فرضی نام جو وہ اپنے لئے انتخاب کرکے ہمیشہ کے لئے مقرر کرلیں گی۔ آنکے مضمون کے اختتام پر درج ہوگا +

جو مستورات ترسیل زر یا ترسیل مضامین کے علاوہ دیگر امور میں کچھ خط وکتابت ایسی کرنی چاہیں جسکا مردوں کے ہاتھ میں جانا اُن کے نزدیک مناسب نہ ہو تو وہ مسز محمد اکرام صاحبہ کو خط لکھیں جو عصمت کی ترتیب میں اڈیٹر عصمت کی شریک حال رہیں گی اور اُن خاص صورتوں میں اُن خطوط کا جواب خود دیں گی +

رسالہ عصمت کا پہلا پرچہ انشاءاللہ ۱۵ جون تک شائع ہو جائیگا +

شیخ محمد اکرام
ایڈیٹر رسالہ عصمت
دہلی

اقتصادی ترقی

مندرجۂ ذیل مضمون ایک ایسے فاضل کے قلم سے نکلا ہے جنکی قابلیت علم اقتصادی میں اسدرجہ مسلمہ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے اس علم پر لکچروں کے ایک سلسلے کی اُن سے فرمایش کی ہے اور انہیں اپنا پہلا اعزازی لکچرار قرار دیا ہے - ہماری مراد مسٹر منوہر لال صاحب ایم اے پرنسپل رندھیر کالج کپورتھلہ سے ہے - کیمبرج میں جو اُنھوں نے نام پیدا کیا محتاج توصیف نہیں - مگر خوبی یہ ہے کہ یہاں آکر بھی تعلیم کے متعلق عملی کام میں مصروف ہیں - اور یونیورسٹی میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں - چنانچہ کلکتہ یونیورسٹی کے جلسۂ جوبلی پر ہماری یونیورسٹی کی طرف سے آپ ہی قائم مقام تھے - جس لکچر کا ترجمہ انہوں نے مخزن کو عنایت کیا ہے وہ ٹکنکل انسٹیٹیوٹ لاہور کے سالانہ جلسہ پر انگریزی میں دیا گیا تھا غنیمت ہے کہ آپنے اپنے اُردو داں بھائیوں کو اسکے مطالب سے محروم نہ رکھا - اس جلسے کے صدر نشین ہز ہائنس مہاراجہ صاحب بہادر والئی جموں و کشمیر تھے اور فاضل لکچرار نے اُن سے اور آنریبل جسٹس چیٹرجی سے خطاب کرکے یہ مضمون پڑھا +

جب اس جلسے کے منتظمین نے مجھے اس موقع پر تقریر کرنے کو بلایا تو انتخاب مضمون اور طرز بیان میں مجھے آزاد رکھا - چونکہ اسکے تیار کرنے کا زمانہ بڑے دنوں کی تعطیل کا زمانہ تھا

جب بہت سے چھوٹے چھوٹے کام مانع فکر کامل ہوتے ہیں۔ میں نے اس آزادی سے فائدہ اٹھایا۔ اور ایک وسیع مضمون لیلیا ہے جسمیں آزادانہ جدھر چاہوں رُخ کرلوں۔ اس طریق کو پسند کرنے کی میرے لیے ایک اور وجہ بھی ہے وہ یہ کہ میں اب تک محض ایک طالب علم ہوں جسے پہلی دفعہ اپنے مطالعہ گاہ سے کھینچکر لوگوں کے سامنے کھڑا کردیا گیا ہے۔ میرے خیال میں طالب علم ایک خاص مخلوق ہے جو کوئی فیصل شدہ عقیدے اور پختہ رائیں نہیں رکھتا اور جو ہمیشہ شکوک میں مبتلا رہتا ہے اور کبھی نہیں سمجھتا کہ اسکے پاس کس مضمون پر راے قائم کرنیکے قابل کافی مصالحہ جمع ہو گیا ہے۔ وہ اس بارے میں ایک کاروباری انسان سے بالکل متناقض ہے۔ کاروباری انسان کا اعلیٰ نمونہ ملکی مدبر ہوتا ہے جسکو پالسی کے عام اور وسیع راستے تجویز کرنا اور انکے جزئی امور کو فیصل کرنا یکساں آسان ہوتا ہے۔ اور وہ بالعموم خوشگوار نتائج پیدا کرنیمیں کامیاب ہوتا ہے۔ جس کا سبب کچھ تو یہ ہے کہ اسکی زبردست شخصیت سے اس بات کا لوگوں کے دلوں پر قوی نقش ہوجاتا ہے۔ اور ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ طریق ہی ایسا ایجاد کرتا ہے جسکا انجام کامیابی ہو۔ میں اس خیال سے کانپتا ہوں کہ ایسے پلیٹ فارم پر تقریر کرنیکے لیے جہاں عملی تجربہ کے مشورے درکار ہیں ایسے شخص کو انتخاب کیا گیا ہے جو پولیٹکل اکانمی یعنی علم الاقتصاد کی خیالی طور پر تحقیق کرنیوالا ہے۔ کبھی اسکا دلچسپ مطالعہ اور کبھی "تعلیم صنعتی اور اسکے مقاصد و متعلقات"۔ مگر یہ اطمینان ہے کہ یہاں ہم سب ایسے مدعا کیلیے جمع ہوئے ہیں جسمیں کسیطرح کا اختلاف راے نہیں ہے۔ آجکل ہندوستان میں یہ کہنا مشکل ہے کہ طالب علم خصوصاً یونیورسٹی کے طلبا کون سے معاملات میں شریک ہوسکتے ہیں۔ تھوڑا عرصہ ہوا انسٹیٹیوٹ کے قابل اور سنجیدہ پریسیڈنٹ[۵] نے قابل استناد طور پر اور منصبی استحقاق سے صرف ایک دائرہ عمل کی نسبت فرمایا تھا کہ

۵ مراد آنریبل جسٹس چٹرجی وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی سے ہے اور انکی اس تقریر کی طرف اشارہ ہے جو جلسہ کانووکیشن پر پیش ہوئی تھی ۔

اس میں طلبا کو زیادہ حصہ نہیں لینا چاہیئے۔ہم نے ان کا قول بڑی توجہ سے سنا تھا مگر غالباً پورے طور پر ان سے اتفاق نہیں کیا۔خیر اور باتوں کی نسبت اختلاف ہو تو ہو مگر یہ مسلم ہے کہ تمام طلبا اور مدرسین خاموشی کے ساتھ اقتصادی حالت کو ترقی دینے سے ملک کی قابل قدر خدمت بآسانی بجا لا سکتے ہیں۔پس اب ہمارا مدعا اس امر کی تحقیق کرنا ہے کہ اپنے صوبہ کی اقتصادی ترقی کے مختلف شعبوں میں کیا تدبیریں ممکن ہیں۔

ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے ایک مکمل اور وسیع تعلیم صنعت و حرفت کی اہمیت ظاہر ہے۔حال ہی میں جو فسکل بحث[۵۱] انگلستان میں شروع ہوئی تھی۔خوش قسمتی سے میں اس بحث کے زور و شور کے زمانہ میں وہاں تھا۔اس بحث نے "فری ٹریڈ"[۵۲] اور "پروٹکشن" کے متعلق موافق و مخالف دلائل کو نئے قالب میں ڈھال دیا تھا۔اور اثنائے بحث میں اس بات پر بہت کچھ بحث رہی کہ کوئی ایسے اسباب ہیں جن سے یہ احتمال ہو کہ انگلستان کی "مینو فکچرنگ انڈسٹریز"[۵۳] ایسی عمدہ حالت پر نہیں جیسا کہ انکو ہونا چاہیئے۔اسکے متعلق اس زمانے سے جبکہ ۱۵ مئی سنہ ۱۹۰۳ء کو مسٹر چیمبرلین نے مقام برمنگھم میں سپیچ کی۔ساڑھے چار سال تک جو سرکاری اور نجی کی تحقیقات جاری رہی اس سے بجا طور پر دو نتیجے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ایک یہ کہ اگرچہ انگلستان کی بعض مصنوعات کو بہت نقصان پہنچا ہے۔مگر بحالت مجموعی انگلستان کے صنعتی کاروبار کو برسر زوال سمجھنا بہت کچھ مبالغہ ہے۔دوسرے یہ کہ دوا یا علاج یا مدد جو کچھ ہو اسکی ضرورت اسی وجہ سے ہے کہ کاروبار ایسے عمدہ اور باقاعدہ طریق سے چلایا نہیں جاتا جیسے جرمنی اور امریکہ میں۔اور نیز "سائنٹفک" اور "ٹکنکل" تعلیم عام اور کافی نہیں غرض بحث کرنیوالے ہر دو فریق نے بالاتفاق تسلیم کیا کہ مشینوں کے استعمال میں اور کام کا نمونہ بنانے اور طرز ایجاد کرنے میں بڑی عام اور وسیع تربیت کی ضرورت ہے۔لارڈ روزبری نے اپنی مشہور

---

۵۱ فسکل بحث ان تمام مسائل پر مشتمل ہے جو فری ٹریڈ اور پروٹکشن یعنی آزادی تجارت و آزادی محصول کے متعلق ہو رہے ۵۲ یعنی دوسرے ممالک کی اشیا کو محصول داخلہ سے بری رکھنا اور دوسرے ممالک کی اشیا پر بوقت داخلہ [illegible] خیال محصول لگانا کہ اس سے ملکی تجارت کو فروغ ہو ۵۳ کاروبار مصنوعات۔لفظ مینو فکچر دو لاطینی لفظوں سے مرکب ہے جس کا ترجمہ [illegible]

شفیلڈ والی تقریر میں یہ مدعا اپنی بے نظیر طرز ادا سے بیان کیا تہا کہ "تم ان مخالفانہ یعنی شرح محصول سے کیونکر مقابلہ کروگے۔ مجھے یقین ہی کہ ہمکو زیادہ سائنٹفک اور بہتر طریق تعلیم سے مقابلہ کرنا چاہیئے"

یہ درست ہی کہ بنکوں کے طریق کے نامناسب ہونے سے یا کسی غلط کرنسی پالسی سے یا گورنمنٹ کی طرف سے قانون بنانیمیں نامناسب کوتاہی یا بیجا مداخلت ہونے سے ملک کی خوشحالی کو بہت کچھ نقصان پُہنچ سکتا ہی۔ لیکن ملک کی اقتصادی بہتری کا حقیقی سرچشمہ گورنمنٹ کی توجہ یا عدم توجہ کو نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کسی ملک کی خوشحالی اُس کے باشندوں کی اُس طاقت پر منحصر ہے جو انہیں قدرت کی قوتوں کے مطیع کرنیمیں حاصل ہو۔ زمین میں کتنے ہی معدنیات ہوں کھیت کیسے ہی زرخیز ہوں اور نیچر کیسی ہی مہربان ہو۔ اگر اہل ملک نیچر کی طاقتوں سے کام لینے کی قابلیت نہیں رکھتے تو ممکن ہی کہ ملک پھر بھی مفلس رہے۔ وہ قوت جس سے انسان نیچر کی طاقتوں کو کام میں لائے اور خاتون قدرت کو اپنی خادمہ بنائے۔ اسیکا نام ٹکنکل علم ہی۔ بس جس حد تک کسی ملک کے باشندے یہ علم یا یہ طاقت رکھتے ہوں گے اُتنی ہی اُنکی اقتصادی حالت بہتر ہوگی امریکہ کے ممالک متحدہ جو اقتصادی ترقی میں سب سے برتر ہیں کبھی وہ ہی زمین تھی کہ بیشمار دقتوں کے سبب انسانی بود و باش کے لائق نہ تھی۔ اور آج وہی زمین ہی جو سبق دیتی ہو کہ انسان نیچر پر غالب آنے سے کیا کچھ نہیں کرسکتا۔ ملک جاپان ایک دوسری نظیر ہی جو اپنے باشندوں کی جرأت اور استقلال سے اور نیز اس دانائی اور پختگی سے جو انھوں نے اپنی قومی اور ٹکنکل تعلیم کے قائم کرنیمیں ظاہر کی ہو۔ آج تمام مہذب ممالک سے بڑھا چلا جارہا ہی۔ شاید ہمارا ہندوستان امریکہ کی سی حیرت انگیز خوشحالی کو نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ یہاں قدرت ویسی فیاض نہیں۔ لیکن تاہم اگر اہل ملک اب سے زیادہ مضبوط

ک حکمت عملی متعلقہ زر سکوک ۱۲

ہوں اور نیچر پر حملہ کرنیکی قابلیت زیادہ پیدا کریں تو ہمارے لیے بڑی بڑی حد تک ترقی ممکن ہی۔ کیونکہ قدرت نے جو کچھ ہمکو دیا ہی وہ بھی بہت ہی سیر چشمی سے دیا ہی کمی ہی تو اسی کہ ابھی تک ملک کی اچھی سے اچھی طاقت سے کام نہیں لیا گیا۔ ہند کی معدنیات میں سے کچھ ذخیرہ نکالا گیا ہی۔ مگر ابھی بہت سا خزانہ ہی جو مخفی پڑا ہی۔ ایک اور قوت پانی کی ہی جسکو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اور کون ٹھیک بتا سکتا ہی کہ انہی دو خزانوں میں ہمارا کتنا مال مدفون ہی البتہ ہمارے صوبے میں پانی کی طاقت سے تجارتی فائدہ لینے کی کوشش شروع ہوئی ہی۔ اور ہمارے لیے کچھ کم فخر کا مقام نہیں کہ ایسی کوشش ایک قابل قدر پرنس کیجانب سے شروع ہوئی ہی جس سے آج ہماری صدر کرسی کو زینت ہی۔ ان کا ملک قرنوں سے صنعتی قابلیت میں مشہور ہی اور جائے مسرت ہی کہ اب وہ خود اپنی رعایا کو ترقی دے رہے ہیں ڈاکٹر واٹ نے جو اب سر جارج واٹ ہیں۔ ہمارے معدنی ذخیروں کی بہت کچھ توضیح کی ہی۔ اور ہندوستانی محقق مسٹر جوشی نے اپنے عالمانہ مضمون میں جو انڈسٹریل کانفرنس بنارس کے سامنے پڑھا تھا اس بارے میں ترقی کا بہت کچھ امکان ظاہر کیا ہی +

زراعت۔ ہندوستان کی اقتصادی حالت یہ خصوصیت رکھتی ہی کہ اس کا بڑا پیشہ زراعت ہی۔ اور اس بڑی آبادی کی تین چوتھائی بالواسطہ یا بلاواسطہ زراعت پر انحصار رکھتی ہی اور باوجود اس عجیب ترقی کے جو حال میں کلوں اور کارخانوں کے متعلق ہو رہی ہی اور باوجود اس افسوس کے جو آبادی کے دیہات سے شہروں کی طرف مائل ہونے کی نسبت ظاہر کیا جاتا ہی یہ امر قابل غور ہی کہ انیسویں صدی کے آخری دس سالوں میں مردم شماری سے انگریزی علاقہ میں ۶ فیصدی اور دیسی ریاستوں میں ۳ فیصدی خاص زراعت پیشہ آبادی کی ترقی ظاہر ہوتی ہی۔ یعنی ۱۸۹۱ء میں اگر انگریزی علاقے کے اندر زراعت پیشہ ۶۲ فیصدی تھے تو ۱۹۰۱ء میں ۶۸ فیصدی تھے +

معاملات زراعت کا علم زیادہ ہونے سے جس کے متعلق گورنمنٹ قابل تحسین تدابیر

کررہی ہے۔ اور دیہاتی آبادی کو بہتر طریق زراعت سکھانے سے امید ہے کہ یہاں کی زراعت کو بہت کچھ فائدہ پہنچے گا۔ اور اجناس پہلے کی نسبت بہتر اور بیشتر پیدا ہونگی۔ مگر اُن لوگوں کی رائے میں جنہوں نے اِن مسائل کا غور سے مطالعہ کیا ہے جسقدر ترقی ممکن ہے وہ بہت محدود ہوگی۔ کیونکہ یہاں کی ہمدردانہ تحقیق کرنے والے جنکی رائے قابل قدر ہے مثلاً ڈاکٹر وولکر ظاہر کرتے ہیں کہ یہاں کے اہل زراعت اب بھی اپنی زمینوں کی قدر و کیفیت کو سمجھتے ہیں اور اُن کا علم اجناس کے "روٹیشن" یعنی نوبت بہ نوبت ردّ و بدل اور کھاد دینے کے متعلق قابل تحقیر نہیں ہے۔ ملکی زراعت کا سوال بالکل مختلف قسم کا ہے جسکی تشریح و توضیح ایک جداگانہ تحریر کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ ہمارے مسئلہ زراعت کے بڑے بڑے پہلو یہ ہوں گے۔ اوّل زراعت پیشہ آبادی کی مقروضیت اور اِسکا علاج یا تو زراعتی بنک[1] کے رواج سے۔ یا اُن لوگوں میں "سلف ہلپ" اور کفایت شعاری پھیلانے سے ہوسکتا ہے۔ یا گورنمنٹ کی طرف سے وصول مالیہ کی پالسی میں کچھ تغیر و تبدل کرنے سے۔ جسکے متعلق مسٹر آر سی دت نے بےنظیر قابلیت سے تفصیل کی ہے۔ اُن لوگوں کا بار کم کیا جاسکتا ہے۔ دوم قحط اور اُن وقتوں کا سوال ہے جو "مونسون" یعنی باد باراں آور کے تغیر و تبدل یا نہ آنے سے پیدا ہوتی ہیں اور اگرچہ نیچر کی بیقاعدگی اور قدرت کے تغیرات کا کوئی علاج نہیں ہے تاہم وسائل آبپاشی کو وسیع پیمانے پر جاری کرنے سے قحط کو بہت کچھ روکا جاسکتا ہے۔ اور امداد قحط کے نئے عمدہ طریق سے ایام قحط میں لوگوں کی مصیبتیں بہت کچھ کم ہوسکتی ہیں۔ اِسمیں بہت سے غور کرنے والوں کا خیال ہے کہ گورنمنٹ کی نظام وصول مالگزاری کے تغیر و تبدل سے ہی امداد پہنچائی جاسکتی ہے۔ بلکہ شاید اسی کے ذریعہ سے قحط ہمارے ملک سے بالکل نیست و نابود ہوجائے۔ لیکن میرے خیال میں وہ لوگ گورنمنٹ کے فرائض کو حد سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور قدرتی اسباب کی طاقت کا ٹھیک اندازہ نہیں لگاتے۔ مگر اِس بحث

---

[1] اِس قسم کے بنک جو رسی فائنن کے نام سے موسوم ہیں۔

میں بہت سے پیچیدہ سوال پیدا ہوتے ہیں۔ جنکے حل کرنیکا یہ موقع نہیں ۔
سوم زمین کی زرخیزی اور قدرتی طاقتوں کے بحال رکھنے کا سوال ہی ہم سب دیکھتے
ہیں کہ کسقدر جانوروں کی ہڈیاں ریلوے سٹیشنوں کے قریب لادنے کیلیئے پڑی
ہوتی ہیں۔ مگر ہم میں سے بہت کم سمجھتے ہیں کہ زمین پر اسکا کیا اثر ہی۔ در حقیقت زرخیزی
کی یہ اتنی قوت ضائع کیجا رہی ہی۔ اسیطرح جانوروں کے گوبر اور لید کو ایندھن کے
طور کام میں لانا زمین کو پیداوار کے ایک دوسرے قیمتی ذریعے سے محروم کرنا ہی۔ اور
اس طرح یہ سارا سوال ہمارے ملک میں جنگلات کی ترقی اور بحالی کی مناسب تدابیر پر
انحصار رکھتا ہی۔ کیونکہ فن سائنس نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی کہ مصنوعی کھاد اس قدر
سستی ہوں کہ عام رواج پا سکیں ۔

غرض ہندوستانی زراعت کے یہ تین بڑے مسئلے ہیں جن کا فیصلہ پیچیدگی
کے سبب بہت دشوار ہی۔ اور اہل الرائے انکی تدابیر اور اسباب کے متعلق مختلف رائیں
رکھتے ہیں لیکن ہم یہاں اس معاملہ پر بحث و مناظرہ کے لیے جمع نہیں ہوئے۔ اور میں نے
ان امور کیطرف اشارہ کیا ہی تو اسلیے کہ ان پر غور کرنیسے ہندوستان کی اقتصادی حالت
اپنی اصلی صورت میں ہمارے پیش نظر رہیگی۔ علاوہ ازیں زراعت ہماری اس انسٹیٹیوٹ
کے اغراض سے خارج بھی نہیں ہی۔ اگرچہ جہانتک مجھے علم ہی۔ ابتک زراعتی تعلیم کے متعلق
اسمیں کوئی کوشش نہیں کیگئی۔ زراعت کا سوال اگرچہ پیچیدہ اور مشکل ہی۔ مگر ملک کے
لیے بہت ضروری ہی۔ اور ضرورت ہی کہ ہمارے اہل الرائے اور اہل علم نہایت توجہ سے
اسکے ہر پہلو پر غور کریں۔ کیونکہ آخر ش ہندوستان کی آیندہ بہبودی اسی کروڑہا مخلوق
کی حالت پر منحصر ہی جسکو دیہاتی آبادی کہتے ہیں ۔

دستکاری۔ زراعت سے دوسرے درجے پر ہماری دستکاری اور مینوفیکچرز ہیں۔ اور
ٹکنکل تعلیم کا مدعا دونوں کو زیادہ مکمل اور عمدہ بنانا ہی۔ ٹکنکل تعلیم صرف انہی کاریگروں کو

مدد نہیں دیتی جو ہاتھ سے اور چند اوزاروں سے کام کرتے ہیں بلکہ کارخانوں میں بذریعہ مشین کام کرنیوالے مزدوروں کی قابلیت کے لیے بھی ایک ضروری عنصر ہے۔ ہمارے ملک میں کل کی مصنوعات روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہیں جو موجودہ اقتصادی طریق مقابلہ کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اور فنون خصوصاً لطیف قسم کے دن بدن رو بہ تنزل ہیں۔ مگر دستکاری کا زمانہ ابھی بالکل ختم نہیں ہوا کیونکہ نفیس چیزیں ہمیشہ دستی ہی ہوتی ہیں اس زمانے کی اقتصادی جدوجہد میں اپنے تئیں قائم رکھنے کیلیئے یہ اشد ضروری ہے کہ ہم اپنے قدرتی ذخیروں کے استعمال اور مینوفکچرز پر توجہ کریں۔ مگر بہرحال صنعت و حرفت ہی کے ذریعے سے ہندوستان اور ملکوں میں ممتاز ہو سکتا ہے۔ اور پھر یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے گزشتہ زمانے کی شاندار وراثت کو یونہی پھینک دیں۔ اگرچہ بعض دستکاریاں ایسی ہیں جنکو قائم رکھنے کی کوشش کا انجام یقیناً ناکامی ہے اور جنکو قائم رکھنا ملکی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرنا ہے +

ٹکنیکل تربیت میں ایک طرف ہاتھ اور آنکھ کی تربیت شامل ہے تو دوسری طرف ذہنی تربیت بھی اسیکا ایک حصہ ہے۔ اس سے دراصل آرٹ میں تو تعلیم نہیں ہوتی مگر یہ ذہن کو اس درجہ قابل کر دیتا ہے کہ وہ ہر ایک عمل کے تناسب اور موزونیت کو کافی طور پر سمجھ لیتا ہے اور اس سے دل نئے ڈیزائن اور نئے نمونوں پر کام کرنیکے قابل ہوتا ہے اور اعلے ٹکنیکل تعلیم میں ڈیزائن کا تصور بھی شامل ہے۔ لیکن عملی باتوں کا ہر حال میں لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اور ذہن کے ساتھ ساتھ اسی مناسب حال آنکھ اور ہاتھ کی تربیت بھی جاری رہتی ہے۔ اور مدعا یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف نئے ڈیزائن سوچنے والے اور انمیں نکتہ چینی کرنیوالے بلکہ نئے ڈیزائن کو ہاتھ سے بنا کر دکھانے والے بھی پیدا ہوں +

آرٹ کا سوال دستکاری کے سوال سے مختلف ہے۔ آرٹ صرف چند خاص حالات میں ترقی کر سکتا ہے جنکو مدد دیکر بڑھانا ہمارا فرض ہے مگر جو ہر ایک کی دسترس سے باہر ہے۔

اعلیٰ آرٹ مشرقی ملکوں میں اور کم از کم آجکل کے زمانے میں صرف اعلیٰ سرپرستی اور قدردانی سے ترقی کرسکتے ہیں۔ ٹکنکل مدارس کسی طرح بھی جوہر ذہانت کو پیدا نہیں کرسکتے بلکہ مدارس اور غیر ممالک کے نمونوں کا وجود اس بارے میں کسی قدر نقصان دہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر برتھ وڈ جن کا بیان ہندوستانی فنون کے بارے میں قابل استناد ہے اس اثر کا ذکر کرتے ہوئے جو غیر ممالک کی شال کے نمونوں کا کشمیر کی تجارت شال پر ہوا ہے نہایت زور سے کہتے ہیں کہ "کشمیریوں کا شال بنانے کا طریق ایسے سچے اُصول پر مبنی ہے جو اُنہوں نے قرنوں کی مشق سے معلوم کیے ہیں اور عمل کرنے پر جنکی صداقت میں حرف نہیں آیا۔ پس ہم ایسے لوگوں کی آرٹ ٹکنکل تعلیم میں دخل دینے سے اپنے اوپر بہت بڑی ذمہ واری لیتے ہیں"۔ غرض صنعتی ذہانت ایک آہستہ بڑھنے والا جوہر ہے اور ایسی چیز ہے جو ان رو کھے اور قاعدوں کے پابند سکول ماسٹروں کے دماغ سے یکلخت طلبا کے دماغ میں منتقل نہیں ہوسکتی +

جہاں ایک طرف آرٹ اپنے ناقابل تقسیم قاعدوں کے موافق بڑھنے والا اور خاص قدردانی سے ترقی پانیوالا ہے وہاں دوسری جانب ٹکنکل لیاقت تربیت سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اور اسکے لیے کسی سرپرستی کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ اپنی طاقتوں کے جو ہم میں موجود ہیں عمدہ اور بہتر استعمال پر منحصر ہے +

اب ہم بالاختصار اُن دستکاریوں کو دیکھتے ہیں جو ہندوستان میں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور اِن میں سے بیشتر توجہ اُن دستکاریوں پر کرینگے جو خاص ہمارے صوبہ میں زیادہ ترمروج ہیں۔ اور جنکے سبب پنجاب کو خاص امتیاز ہے۔ دوسرے ملکوں میں فنون اور دستکاریوں کے اقسام مقرر کرنا اور انکو جداگانہ اور ممتاز جماعتوں میں تقسیم کرنا اکثر مشکل ہوتا ہے۔ مگر ہندوستان میں ایسی جماعت بندی کچھ مشکل نہیں ہے۔ کیونکہ جیسا کہ سر جارج واٹ فرماتے ہیں "۔ باوجود اس عجیب ترقی کے جو مشینوں سے متعلق گزشتہ صدی میں ہوئی ہے دستکاری اب بھی ہندوستانی لوگوں میں خاص اہمیت رکھتی ہے

مگر ہم اپنے سرسری ملاحظہ سے اِن اعلٰے صناعیوں کو خارج رکھیں گے جو براہِ راست اِس قسم کے مدارس میں جیساکہ یہ ہی باقاعدہ تعلیم اور مقررہ قواعد کے دائرہ میں نہوں مثلاً وہ باریک کام جو لکڑی مٹی پتھر دھات یا کپڑے پر کیئے جاتے ہیں۔ ملک کے بہت سے آرٹس سکول طلبا کو ٹکنکل قابلیت کی بہتر شکلوں کی تعلیم دیتے ہیں اور اپنے دل سے نئے صنعتی نمونے ایجاد کرنیکی طاقت کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ہم کو اس وقت ایسے مدارس سے بحث نہیں ہے۔

ہم اپنی فہرست سے بعض چھوٹی چھوٹی دستکاریوں کو بھی خارج رکھیں گے۔ اگرچہ ویسے وہ بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اور پنجاب میں نہایت کامیابی سے عمل میں آ رہی ہیں مثلاً لاکھ چڑھا ہوا اخراد کا کام جو شاہپور فیروزپور اور ہوشیارپور میں بنتا ہے اور تیزاب سے لاکھ چڑھانے کا کام جو بنوں ڈیرہ اسمٰعیلخاں پاک پٹن ضلع منٹگمری فیروزپور۔ اور ہوشیارپور میں ہوتا ہے۔ یا رنگنے کی صنعت جو اب زوال پذیر ہے۔ کیونکہ یورپ سے سستے معدنی رنگ خصوصاً "اینیے لائن"۔ اور "الے زرائن" قسم کے کثرت سے آنے لگے ہیں اور اسی مجموعے میں کشمیر اور پشاور کے قلمی شدہ اور روغنی برتن اور لاکھ چڑھے ہوئے برتن بھی شامل ہیں۔

(باقی دارد)

منوہر لال

ندامت شرمندگی اور ندامت ایک ایسی خوبی ہے جسکا احساس ہر شخص کو ہونا چاہیئے جب ہم اپنے کسی فرض منصبی کو ادا نہ کریں یا اپنے کسی دوست کو تکلیف پہنچائیں یا کسی قسم کا ناجائز فائدہ اُٹھائیں یا جھوٹ بولکر لوگوں کو دھوکہ دیں تو کیا اُس وقت ہمیں کچھ احساس ہوتا ہے۔ ہم اگر اُسوقت نادم ہیں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اور اپنی اِس ندامت کا اظہار اپنے قصور کے اعتراف اور تلافی مافات سے جلد کرنا چاہیئے۔ زیادہ خوفناک اور افسوسناک امر یہ ہے کہ ہم قصور بھی کریں اور نادم نہوں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم پے در پے ایسے ہی گناہوں کے سلسلے میں مربوط ہو جائینگے ندامت کا احساس اگر مطلق نہ رہا تو موت بھی مُردہ سمجھیے۔ بہتر ہے کہ موت اِس بیحیائی کی زندگی کا جلد خاتمہ کرے۔ گناہوں کا بوجھ تو کم ہوگا۔

شاہین و دُرّاج

(سلسلہ کے لیے فروری سنہ ۱۹۰۸ء کا پرچہ ملاحظہ ہو)

دربار شاہین

دُرّاج کی دوسری جان نثاری کا علم شاہین تک محدود ہو مگر پہلا معرکہ تو ایسا علی الاعلان تھا کہ ایران کا بچہ بچہ اُسکی شجاعت کا لوہا مان گیا! یہ پیڑیوں کے نمکخوار اور بڑے بڑے پہلوان سب کھڑے کے کھڑے ہی رہے اور ایک سے اتنا نہ ہوا کہ وقت پر کام آتا! شاہین لاکھ بڑی آدمی ہو مگر احسان فراموش نہ تھی۔ سوچتی تھی کہ اگر زر و جواہر سے بھی تول دوں تو اس کے احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتی! آدھی رات تک اسی چکر میں پڑی رہی۔ سیکڑوں تدبیریں اور ہزاروں منصوبے سوچ ڈالے! جس عورت نے کبھی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دی ہو اُس پر ایک چھوڑ دو دو احسان اور وہ بھی ایسے زبردست! اُس پر طرّہ یہ کہ پالا پڑا تو ایسے شخص سے جو دل کا غنی نیت کا شیر ہاتھ کا سچا بات کا پکا! صورت کا خونخوار سیرت کا وفادار خوشامد سے کوسوں دور وضعداری میں چکنا چور!! چھٹکارا ہو تو کیونکر! کہتی تھی اور سچ کہتی تھی کہ عجب قسم کا آدمی ہے۔ وظیفہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھر گیا! روپیہ سے بیزار! انگوٹھی سے انکار پاس بیٹھنے سے وحشت ساتھ چلنے سے نفرت! ایسے شخص کا احسان تقدیر میں لکھا تھا! دیکھا نہ سُنا! بھوکا ہوتا پیٹ بھرتی۔ ننگا ہوتا بدن ڈھانکتی۔ مال و دولت کا طالب ہوتا فقیر سے امیر کرتی۔ جاہ و حشمت کا طلبگار ہوتا وزیر سلطنت بناتی! یہ کیسا ستم ہے کہ یہ بچہ کچھ چاہتا کچھ نہیں۔ دُوں تو کسکو اور کروں تو کیا! آدمی کیا فرشتہ ہے نہ واسطہ نہ غرض جان نہ پہچان۔ خدا واسطے جان پر کھیل گیا! سیکڑوں ہی انسان دیکھے اور سنے برتے اور پرکھے

مگر ایسا شخص تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا! کچھ نہ ہونے پر تو یہ کچھ ہی کچھ ہوتا تو کیا کچھ ہوتا! یہ برسوں اور قرنوں کے غمخوار جنکو جاں نثاری کے بڑے بڑے دعوے تھے عمر بھر مُفت کی روٹیاں توڑیں اور ایک بھی کام کا نہ ملا سب نمکحرام اور ایک سے ایک بدتر! عقل کام نہیں کرتی کیا کروں کیا نہ کروں؟ مگر اسمیں کلام نہیں مال و دولت کیا اگر سلطنت بھی بخشدوں اور وظیفہ و خلعت کیا اگر ریاست و حکومت بھی منظور کرے تو احسان کا معاوضہ تو ہوتا نہیں!

رات کا بڑا حصہ اسی اُدھیڑ بُن میں گزرا۔ اور علی الصباح شہباز خاں وزیر اعظم حکم شاہی ہاتھ میں چو اسپہ گاڑی ساتھ میں دُرّاج کے دروازے پر حاضر ہُوا۔

دُرّاج غریب اُس گھڑی کو نہ پاتا تھا جب جشن دیکھنے کا ارادہ کیا! شاہین کے الطاف خسروانہ رسم تیموری میں ساتھ لیجانا۔ گاڑی میں پاس بٹھانا یہ دو ہی وار ایسے کافی تھے جنکی تلافی اُسکے بس کی نہ تھی۔ اسپر انگوٹھی کا نشتر ایسا کاری زخم لگا جس نے ساری شیخی کرکری کردی!۔

دُرّاج سا سادہ لوح اور ہاتھ ملانے کا زبردست چرکا جبتک ملکہ آنکھ کے سامنے رہی بہت کچھ سنبھالا رہا۔ مگر اوجھل ہونا تھا کہ وہ صفائی اور بیباکی سب رخصت ہوئی! گاڑی سے اُترا تو دل کا اللہ ہی مالک تھا۔ بھُوک پیاس گئی گزری کس و مکان ندارد۔ ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ چشم زدن میں وہ سہارا بھی گیا اور گاڑی آناً فاناً یہ جا وہ جا! حسین عورت شباب کا زمانہ۔ کانوں میں الماس گلے میں مالا۔ صورت کی افضل سیرت کی اعلیٰ۔ ہاتھوں میں ہیرے پاؤں میں لعل۔ محبوبانہ انداز مستانہ چال حُسن میں مست جوانی میں چُور۔ دُرّاج کو تو شاہین سچ مچ کی حور تھی!۔

دل تو صورت دیکھتے ہی نذر ہو چکا تھا۔ رہے سہے ہوش حواس انگوٹھی کے بھینٹ چڑھے! کسکا کھانا دانہ اور کیسی بھُوک پیاس شاہین کے پاس سے اُٹھنا تھا کہ کلیجہ مُنہ کو آنے لگا۔ گھر کیطرف مُڑا تو دل کی حالت ہی کچھ اَور تھی۔ قدم رکھتا کہیں تھا پڑتا کہیں۔

منہ سے کہنا کچھ تھا نکلتا کچھ ۔ خدا خدا کر کے گھر پہنچا تو لڑکی نے ایک آفت مچا رکھی تھی ۔ بن ماں کی بچی ۔ ڈیڑھ برس کی جان ۔ مگر اُس اتنی سی فتنی نے گھر بھر کو ہلکان کر دیا ! دن کے دس بجے سے جو چلانا شروع کیا تو چھ گھڑی رات کی توپ چل گئی اور اسکی چیخم دھاڑ نہ تھمی ! جھولے میں لٹا کر جھوٹے دیئے ۔ گود میں لٹا کر لوری دی ۔ مگر کیا مجال جو ذرا تالو سے زبان لگی ہو ! جس دن سے ماں مری کھانا پینا اُٹھنا بیٹھنا جو کچھ بھی تھا باپ کے ساتھ اور باپ کے ہاتھ ! ماں تھی تو وہ ہستی ہی نہ تھی باپ تھا تو وہ ! کیسی ہی بلکتی ہو جہاں گود میں لیا ۔ اور کندھے لگا کر ٹہلا جھٹ نیند آئی ! پوری طرح پاؤں پاؤں بھی تو نہ چل سکتی تھی ۔ مگر دم بھر کو بھی ذرا ادھر اُدھر ہوتا تو وہ گھٹنی گھسٹتی ۔ لڑھکتی پڑتی ڈیوڑھی میں جا بیٹھتی ۔ اور بابا بابا کہکر پکارتی ۔ اسکی آواز سنی اور تالیاں بجا بجا کر نہال ہوتی ! آج بھی کچھ دیر تک تو بیا بیا کہکر خوب تماشا کرتی رہی ! اور پھر تو آخر دُرّاج ہی کی بیٹی تھی مزاج تھا کہ گھڑی تولہ اور گھڑی ماشہ ! ٭

آغا قندھاری بیچاری پہلے ہی اپنی بیماری میں گرفتار تھی ۔ ذرا کسی کی آواز نکلی اور اُسکے کان کے پار ہوئی ۔ پوتی کا بلکنا اور مرے کو مارے شاہ مدار تھا ! مگر کیا کرتی اور کہاں جاتی ۔ دن بھر گود میں لیے ٹہلتی رہی ۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو سیکڑوں ہی پھیرے دروازے کے کر ڈالے ہونگے ! دالان انگنائی ایک کر دیا ۔ مگر وہ چنچل ہی قابو میں نہ آئی ! دُرّاج غریب کی خود جان پر بنی ہوئی تھی ۔ کسکی ماں اور کیسی بیٹی ! کہیں آدھی رات کے قریب گرتا پڑتا گھر پہنچا تو ادھر سے ماں بھبک کر آئی اُدھر سے بہن نے ٹانگ لی ! لڑکی یا تو یہ کیفیت تھی کہ گھر بھر کو پریشان کر رکھا تھا یا باپ کی آواز سنتے ہی جان میں جان آگئی ! مرزا کی حالت دیکھنے کے قابل تھی ! چاروں طرف سے بوچھاڑ ہو رہی تھی اور گم سم کھڑا تھا ماں کے بیسیوں کوسنے بہن کی سیکڑوں باتیں اس کان سنیں اور اس کان اُڑا دیں ۔ اتنی بھی خبر نہ ہوئی کہ یہ ماں بیٹیاں کہہ کیا رہی ہیں ! لڑکی کو لے چبوترے پر

ٹہلنے لگا! گود میں لڑکی خیال میں شاہین لب پر دعا اور دل میں آمین!!

پھر اس کل چکی تو ماں نے اُٹھکر کھانا نکالا بہن نے پانی کی صراحی بھری اور بھائی کے پاس لاکر رکھی! بچی دن بھر کی تھکی ہاری سولہ سترہ گھنٹے کی چھوٹی پہلے تو خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی اور پھر تو ہر باپ کی گود اوپر سے بلی لوری کندھے پر سر رکھتے ہی چُپ ہو گئی! الگ سے لا دستر خوان پر آیا جوان آدمی ہٹا کٹا موٹا تازہ سیر آدھ سیر کچھ تو کھاتا! پہلا ہی نوالہ گولی بن کر رہ گیا! شاہین کی صورت دلمیں ایسی کھپی کہ کھانا پینا سب بھلا دیا! سوچتا تھا اور ٹھیک سوچتا تھا کہ شاہین جیسی ملکہ اور میں! زربفت کو گاڑھا مخمل کو ٹاٹ! جنم نہ دیکھا بوریا سپنے آئی کھاٹ! کیسی حوریں اور کس کے غلمان بس شاہین کے آگے اللہ کا نام ہے! ہاتھ پاؤں آنکھ ناک جو عضو ہے سانچے میں ڈھلا کانٹے میں تُلا۔ صورت سیرت وضع طرح ایک سے ایک بہتر ایک سے ایک اعلیٰ! کس سے کہوں اور کیا کہوں جو سُنیگا وہ پاگل بنائیگا! اُسکے ادنیٰ غلام بھی تو مجھ سے اچھے ہونگے! اچھی جان بچائی کہ اپنی ہی جان اجیرن ہو گئی کہیں جلد صبح ہو! بلا سے اور کچھ نہیں تو دُور سے دیکھ تو لونگا!!!

دستر خوان پر بیٹھا خیالی پلاؤ پکا تا رہا ماں بہنوں کو اِس ریوڑی کے پھیر کی کیا خبر وہ دونوں کبھی کی پڑ کر ڈھیر ہو رہیں! اُٹھا کھانا جوں کا توں چھینکے پر رکھ پلنگ پر آیا تو آنکھیں پتھر کی تھیں پلک سے پلک جھپکانی حرام ہو گئی!

تماشا گاہ قدرت کے مبصر چشم تامل سے دیکھ رہے ہیں کہ جسدخاکی کا عنصر خاکی قالب انسانی کے سانچے میں ڈھلا رنگ برنگ کے جلوے دکھا رہا ہے! زندگی کا چمن شاداب پیش نظر ہے! وسط چمن میں ایک خوشنما قطعہ ہے جسکے چاروں طرف تمیز کامل کی مصفا نہر لہریں لے رہی ہے خوشنما خوش رنگ ہمرنگ پھول کھل رہے ہیں! زمین گلہائے رنگین کی بچھاوٹ سے عروس جبین بن چکی ہے! بادِ مراد کے جھونکے چل رہے ہیں اور بارآور ڈالیاں جھوم جھوم کر پانی کا

منہ چوم رہی ہیں! طائران خوش نغمہ لٹک لٹک کر جھک رہے ہیں اور گل امید کی پنکھڑیوں پر پروانہ وار نثار ہو رہے ہیں!

سبزۂ خوابیدہ پر یاس و ناامیدی کا جال پھیلا ہوا ہے اور انقلاب زمانہ کا صیاد تاک لگائے بیٹھا ہے مگر یہ بھولی بھالی صورتیں نشۂ محبت میں چور۔ ہشاش بشاش کلیلیں کرتی پھر رہی ہیں! پرتعل تول کر پھولوں پر گر رہی ہیں اور پانی میں ڈبکیاں لگا لگا کر پھر پھر اڑ رہی ہیں!

مایوسی کے پھندے صاف نظر آ رہے ہیں مگر امید کے بندے ایسے اندھے ہوئے کہ کچھ سوجھائی نہ دیا!!

آخر فلک کج رفتار نے صبح صادق کو زوال بنایا اور رفتہ رفتہ آفتاب جہانتاب نے بسیرے کی ٹھہرائی! گلدستۂ پھول جنگلی مہکار کو سوں جا رہی تھی کہیں سے کہیں پہنچے!

اب وہ تمام سماں درہم برہم ہوا قطعہ امید کانٹوں سے پٹا پڑا تھا! جس پانی میں رنگ برنگ کی مچھلیاں تیرتی پھرتی تھیں خشک ہو چکا تھا! کہیں کیچڑ کے ڈھیر تھے کہیں دلدل کے انبار! جنگلی نوا سنجیاں کلیجوں کے پار ہو رہی تھیں! جال میں پھڑپھڑا رہے تھے اور حسرت و ندامت سے سر دے دے پٹکتے تھے!!!

دراج ژولیدہ رفتار کو نیند تو کیا خاک آتی لاکھ بن سنور کر لیٹا ہزار کروٹیں لیں بہتیرا چاہا۔ ہر چند کوشش کی مگر شاہین کا خیال ایسا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا کہ کسی عنوان تسکین نہ ہوتی تھی! کبھی گل امید کی خوشنما پنکھڑیاں دل و دماغ کو معطر کر دیتی تھیں اور کبھی یاس و ناامیدی زندگی سے بیزار کر دیتی تھی! لیٹا بیٹھا اٹھا پھر زینہ کھول اوپر گیا۔ دروازہ کھول باہر آیا چھت پر بیٹھ کر تارے گنے۔ کمرے میں لیٹ کر گھڑیاں گنیں! تڑپا لوٹا چیخا پیٹا مسجد میں جا کر مؤذن کو جھانکا۔ کھانچے میں آ کر مرغ کو ٹھونگا۔ جو نہ کرنا تھا وہ کیا اور جو نہ کیا تھا وہ کر ڈالا مگر صبح نہ ہونی تھی اور نہ ہوئی!

دلمیں کہتا تھا کہ اگر کہیں ملکہ جھوٹوں اشارہ پا گئی تو سن بچہ کو لہو میں پلوا دیگی! حلوا خوردن را روے باید۔ کس منہ سے اظہار کروں۔ سب کیا کرایا خاک میں ملجائے گا۔ یہ جو کچھ عزت وقعت خاطر مدارات ہی کچھ بھی نہ رہیگا اور بنی بنائی بات بگڑ جائیگی! مگر ترپوں گا تو کہاں تک اور نہ کہوں گا تو کب تک! مروں یا جیوں کہنا تو پڑے ہی گا! کس قیامت کی رات ہی کہ صبح ہونے کا نام ہی نہیں لیتی! سیکڑوں ہی صورتیں اچھی بری گوری کالی آنکھ سے نکلیں مگر خدا گواہ ہی اس آن بان کی عورت! ایمان کی بات تو یہ ہی! دنیا میں تو ہے نہیں آسمان پر ہو تو ہو! یہ کیسی آفت ہی کہ حسن میں بینظیر اور پہر والی سلطنت وہی کہاوت ہو گئی کریلا اور نیم چڑھا! محتاج ہوتی راج کرواتا! حاجتمند ہوتی چوری کرتا ڈاکہ ڈالتا سر آنکھوں پر بٹھاتا! مگر کہاں میں کہاں وہ۔ گھر میں نہیں دانے بڑھیا چلی بھنانے۔ یہ بیل تو منڈھے چڑھتی نہیں۔ اچھا عذاب پیچھے لگا! جھونپڑوں کا رہنا محلوں کے خواب! روٹی تو پیٹ بھر کر نصیب نہیں شہزادی کا عشق ہوا! تن پہ نہیں لتہ مستی لگاؤں البتہ زندگی شب سیاہ نے آسمان کو کروٹ دی اور دراج کے اس خبط پر صبح صادق کھلکھلا کر ہنسی! نماز پڑھنے کا اتفاق تو شاید عمر بھر نہوا ہو مگر اذان کی آواز کان میں آتے ہی جان میں جان آگئی! باہر آیا تو وزیر اعظم سے مٹ بھیڑ ہوئی! اندھا کیا چاہے دو آنکھیں طلبی کا پیغام زبانی سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا! دراج جیسا فقیر اور اردلی میں وزیر خوشی کے مارے باچھیں کھلی جاتی تہیں! منہ پر دو چار چھپکے مار کر کپڑے بدل بدلا چلنے لگا تو لڑکی بابا بابا کہتی ہوئی اٹھ بیٹھی! مگر وہ بچی کو روتا ماں بہنوں کو سوتا چھوڑ چھاڑ گاڑی میں بیٹھ دربار میں جا حاضر ہوا!!

دربار کا کوئی خاص اہتمام نہیں دربار عام نہیں۔ خاص دربار وہ بھی بضرورت چند معزز عہدہ دار انے گنے ایک کا دائیں بائیں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے تھے اور بیچمیں ملکہ شاہزادی تخت شاہی پر جلوہ گر تھی! دراج کا دل ہونا تھا کہ ملکہ اور ملکہ

شب ہجراں کی درازی!!!

کے ساتھ ہی تمام دربار استقبال کو اُٹھ کھڑا ہوا! شہزادی کی اس عنایت پر لوگوں کو تعجب ہُوا ہو خواہ حسد مگر سب مبہوت کھڑے تھے! دُرّاج سے تو اتنی امید تھی نہیں مگر خدا جانے کسی نے پڑھا سکھا کر بھیجا یا عشق نے یہ آداب کھائے۔ مجرا کیا زمین بوس ہو! اوپر نگاہ اُٹھا کر دیکھا ہی تو دھانی جوڑا ستم ڈھا رہا تھا! ارکین دربار کو دُرّاج کی یہ حرکت ضرور ناگوار ہوئی اور بعض تاڑ نیوالے تاڑ بھی گئے۔ مگر روک ٹوک تو درکنار کسی کی اتنی ہمت بھی نہ پڑی کہ نیچی سے اونچی نگاہ کر لیتا! سلام کر کے ٹھٹکا تو ملکہ نے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا!۔ آگے بڑھا اور دعائیں دیتا ہوا پہلو میں جا بیٹھا! کشتئ زرنگار میں خلعت ہفت پارچہ پہلے ہی سے رکھا تھا پیش کیا گیا۔ اور ایک بیش قیمت دوشالہ جس میں چاروں طرف ہیرے اور جواہرات ٹک رہے تھے شاہین نے اپنے ہاتھ سے عطا کیا! ضرورتِ نے سب باتیں سکھا دیں۔ تخت سے اُترا سامنے آکر کھڑا ہوا۔ سر پر رکھا آنکھوں سے لگایا اور شکریہ ادا کیا!

دربار ختم ہوا درباری رخصت ہوئے! ملکہ گاڑی میں بیٹھ دُرّاج کو ساتھ لے محل میں آئی کمرۂ خاص میں بٹھانے کا حکم دیا۔ اور تھوڑی دیر بعد خود بھی آ پہنچی۔ دھانی کے بدلے زعفرانی جوڑا گلے میں تھا اور تاج شاہی کے بجائے جواہرات سے لپی ہوئی چادر زلف سرکش سے سرگوشیاں کر رہی تھی!

دل نو گرفتار کی اُمنگیں شاہین جیسی ملکہ آنکھ کے سامنے اور تنہائی کا عالم غریب دُرّاج کا خدا ہی نگہبان تھا! مُنہ میں زبان نہ تھی بدن میں جان نہ تھی تصویر کی طرح گُم سُم بیٹھا تھا!

(تخلیہ)

شاہین لاکھ کم سن ہزار ناتجربہ کار سہی مگر تھی تو شہزادی سیکڑوں آدمی روزنگاہ سے نکلتے تھے۔ تاڑ تو کل ہی گئی تھی آج اچھی طرح سمجھ گئی کہ میرے حُسن کا جادو دُرّاج پر چل گیا! کچھ دیر تک تو اس اُمید پر چپکی بیٹھی رہی کہ یہ اب کچھ بولے اب کچھ بولے گا

جب دیکھا کہ اسکو سانپ ہی سونگھ گیا۔ لاکھ موقع تنہائی دوں لیکن کچھ رعب حسن کچھ آداب شاہی یہ اسیطرح گم سُم رہیگا تو مجبور خود ہی پیشقدمی کی! ایک تمکنت آمیز نظر جس نے غریب کا کلیجہ تک چھلنی کردیا دُرّیج پر ڈالی اور مُسکراکر کہا!

(ملکہ) کچھ مُنہ سے بولو سر سے کھیلو تم تو بالکل ہی تصویر ہو گئے! آب رواں کی ہلکی سی نقاب نے حسن کی آب و تاب کو دوبالا کر رکھا تھا۔ اِس اوٹ نے اور بھی لوٹ پوٹ کردیا! گورا رنگ کتابی چہرہ بڑی بڑی آنکھیں پتلے پتلے ہونٹ! رنگ میں ملاحت چہرہ پر نزاکت۔ آنکھوں میں جادو۔ لبوں پر تبسم! عقل ٹھکانے سے بے ٹھکانے ہوئی۔ صبر و شکیب غارت شرم و حیا برباد! دیوانہ وار اُٹھا اور یہ کہتا ہوا پاؤں پر گر پڑا "اے حسینہ! میں تیرے دربار میں آکر لُٹ گیا"!

(باقی دارد)

راشد الخیری

مہندی مل کر مرے گھر آئے ہیں بن آئی ہے
یہ حنا جاکے انہیں ساتھ لگا لائی ہے۔

ہم چلے پھول لیے پھول اُڑانے کیلیے
جب سُنا دُھوم ہے گلشن میں بہار آئی ہے

سُنکے نالے مرے مُنہ پھیر کے ہنسنا اُن کا
ہنسکے کہنا کوئی دیوانہ ہے سودائی ہے

کیوں نہ ٹوٹے مری توبہ جو کہے تو ساقی
پی لے پی لے اسے گھنگھور گھٹا چھائی ہے

میں کہوں حشر ہے یہ حشر وفا ہوں وعدے
وہ کہیں ہائے یہ کیسی مری رُسوائی ہے

میرے آغوش میں یونہیں کبھی آجا تو بھی
جس ادا سے تری آنکھوں میں حیا آئی ہے

لے گیا لُوٹ کے کیا طیر کی رونق کوئی
نہ وہ جلوے ہیں اب کوئی تماشائی ہے

نیچی ہوگی نہ تری آنکھ بپا حشر ہوں للکھ
نہ یہ شرمائے گی ظالم نہ یہ شرمائی ہے

چھیڑ ساقی کی ہے دیتا جو نہیں جام ریاض
توبہ کی ہے نہ کبھی ہم نے قسم کھائی ہے

حکایۂ لیلیٰ و مجنوں

(سلسلہ کے لیے دیکھو رسالہ مخزن ماہ اکتوبر ۱۹۰۷ء)

(۴)

مغرب کے بعد قیس ہوٹل میں داخل ہوا۔ آج کی رات یہاں ایک جلسہ تھا، اور قیس اُسمیں مدعو تھا۔ ڈرائنگ روم روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ لیڈیوں کی ریشمی گونوں کی سرسراہٹ، باریک لوچدار قہقہوں کی پُرترنم آواز، دستی پنکھوں کا جلد جلد ہلنا، اور اسطرح اُن پُر زینت چہروں کو جو نہایت کوششوں اور گھنٹوں کی عرق ریزی سے اس وقت کے لیے آراستہ کیے گئے تھے کبھی چھپا دینا، کبھی جھلک دکھا دینا، یا یُوں کہنا چاہیے کہ چاندوں کا جو کسی درخت کے نیچے سے دیکھے جا رہے ہوں کبھی پتّوں میں چھپ جانا کبھی ظاہر ہو جانا، سفید بُرّاق گردنوں پر موتیوں کے ہاروں کا چمکنا، کسی خوش قسمت شخص سے ہاتھ ملاتے وقت برقی روشنی کا لیڈی کے ہاتھ کی انگوٹھی پر پڑکے دمکا دینا، کسی کونے سے برق تبسّم کا گرنا، کسی صوفہ سے نغمۂ خندہ کا اُٹھنا، ایک ایسا دلفریب منظر تھا کہ بہت سے لوگ جو اُس "ڈرائنگ روم" میں تھے، بات کرکے بھی خلل انداز ہونا چاہتے تھے پلک جھپکاکے بھی اس نشہ کو جسے وہ آنکھ کے ذریعہ سے پی رہے تھے، ایک لمحہ بھر کے لیے بھی کم نہ کرنا چاہتے تھے، بلکہ آرام کرسی یا کسی صوفہ پر سر کو ٹیکے، اس فردوسِ نگاہ و جنتِ گوش میں بے حس و حرکت پڑے تھے۔

لہ میں معترف ہوں کہ اِسمیں بہت تاخیر ہوئی، میں معذور تھا، لیکن اپنی معذوری کو لکھوں تو ایک ٹریجڈی لکھنی پڑے، لہذا اے خندہ دوست قارئین کرام ہ

خوش ہو پڑھ پڑھ کے قصۂ مجنوں ۔ نہ سنو میری داستاں نہ سنو ۔ تم کو لیلےٰ کی کاکلوں سے غرض ۔ سرگزشتِ بلاکشاں نہ سنو ۔

وہ انسانی تیتریاں جنہیں لوگ غلطی سے اغلطی سے نہیں طبیعت کے ٹھوس پنے سے "عورت" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں متحرک تھیں۔ بھونرے۔ رات کا سیاہ لباس پہنے ہوئے۔ مرد بھونرے ہی کے لقب کے مستحق ہیں۔ بھی متحرک تھے۔ کہیں ایک بھونرے کے گرد دو تین تیتریاں تھیں، کہیں ایک تیتری کے چاروں طرف تین چار بھونرے جمع تھے۔

قیس، اس بزم کے کنہیا تھے۔ سب کی آنکھیں ان پر پڑ رہی تھیں۔ سب لیڈیوں کے لیئے ان میں کشش تھی غیر ملک کے آدمی کی طرف ہر شخص مائل ہوتا ہے۔ عرب وہ بھی نجد کا عرب کس کیلئے اعجوبہ نہ ہوگا۔ ان کی طبیعت اس وقت خاص طور پر بشاش تھی۔ نجد کا حال بیان کر رہے تھے۔ لوگ سوالات کر رہے تھے، وہ اُن کا جواب دیتے تھے۔ مگر ایک نوجوان، ہیجدہ، نوزدہ سالہ سیاہ پلکوں والی، سیاہ بالوں والی لڑکی جو زرین تاجوں یعنی سنہری بالوں۔ مذہب تیروں یعنی سنہری پلکوں والی لیڈیوں میں ایسی ہی عجیب معلوم ہوتی تھی، جیسا اُن مغربیوں میں، قیس جیسا مشرقی، ایک غیر معلوم کشش سے قیس کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور خود قیس کی طرف کھنچی جا رہی تھی قیس کی باتوں میں بیغایت دلچسپی، اس لڑکی کے پُر اشتیاق چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ کوئی اور سوال کرتا تو قیس جواب تو دیتے اور اچھی طرح جواب دیتے، غیر تسکین بخش جواب دینا تو اخلاق و نزاکت طبیعت کے خلاف تھا۔ مگر کچھ بہت خوشی سے جواب نہ دیتے۔ لیکن اگر یہ لڑکی سوال کرتی۔ اور اور سائل ذرا فرصت دیتے تو یہ سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتی تھی۔ تو قیس اس طرح جواب دیتے گویا اُنکی تمام روح، اُنکی تمام قابلیت خوش کرنے کی تمام قوت و خواہش، اس جواب میں آکر جمع ہو گئی ہے۔ اوروں کو جواب دیتے وقت بھی، اُنکی نظر۔ دزدیدہ نظر۔ اُن سیاہ پلکوں۔ اُن چمکدار سیاہ پتلیوں اور نرم سیاہ بالوں ہی میں جا کر پھنس جاتی تھی، اور وہاں سے واپس نہ آنا چاہتی تھی۔ اور اگر خاص اُسکے جواب میں اُسکو مخاطب کرنا ہوا تو پھر اُنکی نظروں میں گویا کمرے بھر میں کوئی

اور ہوتا ہی نہ تھا۔ اور اس لڑکی میں بھی:۔ اِن گھنی سیاہ پلکوں، اور سیاہ چمکدار پتلیوں اور نرم سیاہ بالوں کا۔ قیس کے لیے کچھ ایسا سحر تھا: اور اُسکے دماغ پر ایسا اثر کرتا تھا کہ اُسے یہی چیزیں اُسکے سامنے تیرتی، اُسکے دماغ میں چکر کھاتی معلوم ہوتی تھیں:

لڑکی کا چہرہ نہایت دلکش تھا، لیکن قیس کے سطحِ دماغ پر اُسکے چہرے کا نقش نہیں جم رہا تھا، بلکہ یہی گھنی سیاہ پلکوں۔ سیاہ پتلیوں اور سیاہ ریشمی بالوں کا ان میں اُسکے لیے کچھ ایسی کشش تھی کہ اُسکی نظر سکڑ سکڑ کے، انہیں پر جمع ہوجاتی تھی، اور دوسری چیزوں پر۔ چہرے پر رخساروں پر پڑنے سے بھی ابا کرتی تھی:

ایک طرف سے تجویز ہوئی۔ قیس کو اتنا ہوش نہ تھا کہ معلوم ہو کہ کس نے تجویز پیش کی اور کیا تجویز تھی، صرف لوگ اُسکے پاس سے ہٹتے نظر آئے۔ کہ پیانو کا شغل کیا جائے۔ عورتیں اور مرد پیانو کے گرد جمع ہوگئے: اُسکے پاس سے بھیڑ چھٹ گئی:

مگر قیس مسحورانہ وہیں بیٹھا رہا! اُسکی آنکھوں میں وہی سیاہ گھنی پلکیں، وہی سیاہ چمکدار پتلیاں، اور وہی سیاہ ریشمی بال چھارہے تھے۔ ہاں چہرہ ایک سفید نقطہ کی طرح نظر آتا تھا۔ پیانو سے آواز نکلنی شروع ہوئی، اور عورتوں کی باریک اور مردوں کی بھری ہوئی آوازیں پیانو کا ساتھ دینے لگیں۔ لیکن اسکی آنکھوں میں وہی سیاہ گھنی پلکیں، وہی سیاہ چمکدار پتلیاں، وہی سیاہ ریشمی بال اس طرح چکر کھا رہے تھے۔ جیسے شراب کے نشہ میں سامنے کی چیزیں پھرتی اور دُھندلی دُھندلی نظر آتی ہیں۔

ان دُھندلی دُھندلی سیاہ چیزوں میں وہ سفید نقطہ جو اُسے اپنی طرف اسقدر مائل کیئے ہوئے نہ تھا۔ بولتا نظر آیا، اور اُسکے کانوں میں یہ آواز پہنچی:

"مگر مسٹر قیس! آپنے وہاں کی عورتوں کا حال بیان نہ کیا: اُن کا حُسن مغربی حُسن سے ضرور فرق رکھتا ہوگا؟"

اِسپر وہ چونکا اور گویا عالم رویا سے عالم بیداری میں آیا۔ اُس وقت اُسے معلوم ہوا کہ وہ لڑکی اُسکے پاس بیٹھی ہے اور سوال کر رہی ہے۔ اُسکے گرد اور کوئی نہیں ہے۔

قیس نے اپنا ہاتھ اپنی آنکھوں پر پھیر کر، گویا اپنے دماغ اور دماغ کی کھڑکیوں کو اپنی اصلی حالت پر واپس لانیکی کوشش کرکے جواب دیا:-

"معاف کیجیئے گا، میں ایک خیال میں چلا گیا تھا۔ مگر آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں آپ بھی گانے کا لُطف اُٹھایئے۔"

لڑکی نے جواب دیا: "مجھے معاف کیجئے، اگر میں نے اس سوال سے آپکے لطف میں خلل ڈالا مجھے خیال نہ تھا کہ آپ حالت استغراق میں ہیں۔"

"یہ معافی مانگنا تو دو طرفہ جاری رہیگا۔ اسلیئے اِسکے ختم کرنیکے لیے میں کہتا ہوں کہ میں نے معاف کیا، مگر حقیقت میں یہ تو فرمایئے کہ آپ اِس وقت جبکہ پیانو آپکو بلا رہا ہے اور ہر شخص آپکی آواز کی حلاوت سے متمتع ہونے کا آرزومند ہے۔ میرے پاس بیٹھکر کیوں آپ اپنا وقت ضائع کر رہی ہیں۔"

کہنے کو تو وہ کہہ گیا، لیکن قیس دل میں خدا سے چاہ رہا تھا کہ وہ جہاں تھی وہاں سے نہ ہٹے۔ اُسکی اِس دلی خواہش کو لڑکی کے اِس جواب نے پُورا کیا۔

"مجھے اِس وقت نہ گانے، نہ گانا سُننے کی خواہش ہے۔ میں خوش ہوں کہ اس وقت پیانو نے آپکے پاس سے بھیڑ کو ہٹا لیا ہے، کیونکہ لوگ اس قدر آپسے سوالات کرتے ہیں کہ مجھے کچھ پوچھنے نہیں دیتے۔ آپ بالکل نہیں کے حصے میں آجاتے ہیں۔ مگر مجھے خوف ہے کہ میں آپکے پیانو کا لطف اُٹھانے میں ہارج ہو رہی ہوں۔"

"بالعکس آپ نہ سُننے میں مدد دے رہی ہیں۔ میں اسوقت، نہ معلوم کیوں، پیانو کیا موسیقی سے بیزار ہوں اور چاہتا ہوں کہ میرا خیال اُس طرف نہ جائے۔ آپ پوچھیئے میں خوشی سے آپکے سوالات کا جواب دوں گا۔"

میں یہی چاہتی تھی کہ نجد کی عورتوں کی کچھ کیفیت آپ بیان کریں۔ ظاہر ہے کہ عورت کو اپنے ہی ہمجنسوں کے حالات میں زیادہ دلچسپی ہوگی۔ یہ بتائیے کہ وہاں کی عورتوں کا اثر مردوں پر ہے یا نہیں، مشرق اس معاملے میں ہمیشہ غرب کا مطعون رہا ہے۔ اگرچہ میں ان طعنوں کو بہت کچھ بے بنیاد سمجھتی ہوں۔ تاہم آپ سے اسکے متعلق ایک جواب شافی سننا چاہتی ہوں۔ انکے حسن انکے رنگ انکے خد و خال کا بھی کچھ حال بیان کیجیے۔ بلکہ میرا پہلا سوال تو یہی تھا۔ آپ نجد کے حسن میں اور میں محض مثالاً کہتی ہوں۔ یوروپ یا غرب کے حسن میں کیا ما بہ الامتیاز پاتے ہیں۔ شاید کیا غالباً حسن تو وہیں کا آپ کی نظروں میں کھبتا ہوگا۔ لیکن اس کھبنے کی وجہ بھی بیان کیجیے گا۔"

قیس نے ذرا مسکرا کے جواب دیا "آپکے سوالات نہایت دلچسپ ہیں۔ مگر سب ایک ہی دفعہ نہ پوچھ ڈالیے! نجد میں عورتوں کا کیا اثر ہے۔ اسکا حال تو آپ کو صرف اس مثال سے معلوم ہو جائیگا جو آپنے ضرور کہیں نہ کہیں پڑھی ہوگی اگر آپ کو مشرقی لٹریچر ترجموں ہی کے ذریعے سے ملگیا ہے کہ نجد میں ایک مشہور شخص جو میرا ہمنام تھا، ایک عورت کے لیے دیوانہ ہوگیا، بطور استعارہ کے لفظ دیوانہ استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ حقیقت میں وہ فاطر العقل ہوگیا تھا۔ چنانچہ آج تک کتابوں میں، نظم میں، نثر میں، عرف عام میں وہ مجنون کے ہی لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب تک زندہ رہا۔ اپنی محبوبہ لیلےٰ ہی کا نام لیتا رہا۔ اسی کے خیال کی پرستش کرتا رہا۔ یہ واقعہ ہے، خیالی فسانہ نہیں، اس شخص نے وہ نام حاصل کیا کہ آج میں بھی اسکا ہمنام ہونے پر فخر کرتا ہوں۔ پس لیلےٰ کا اثر مجنوں پر، نجد کی عورت کے نجد کے مرد پر اثر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اسکی فتوحات کی سب سے بڑی یادگار ہے۔ خدا ہی کو معلوم ہے کہ اس لفظ "لیلیٰ" میں کچھ جادو ہے۔ یا مشیت میں یہ لکھا ہے۔ کہ کسی دلپر سب سے زیادہ قابو پانیوالی عورت

نجد میں لیلیٰ ہی کہلائے گی یا کیا۔ میں بھی (میں آپ سے اعتراف کرتا ہوں، مگر آپ اپنے تک ہی رکھیئے گا) میں بھی نجد کی ظالم۔ ظالم کہوں یا مہربان، کیونکہ اُسمیں دونوں صفتیں پاتا ہوں، میں بھی نجد کی جس لڑکی کا اسیر ہوں۔ اُسکا نام بھی لیلیٰ ہے۔ اور کون کہا سکتا ہے کہ کتنی "لیلائیں" کتنے "قیسوں" پر نجد میں ظلم کر رہی ہیں! بس یہ سمجھ لیجیے کہ نجد میں اِسوقت تک لیلائے نجد کی مٹھی میں نجد کے قیس کی رگ جان ورشتہ قلب ہے"۔

پیانو کی اور پیانو کے ساتھ گانے والوں کی آوازیں اُٹھ رہی تھیں، اور اونچی ہو کر اُس طرف کو جا رہی تھیں جہاں سے موسیقی اُتر کے اِس دنیا میں آئی ہے!

مگر قیس اور اُسکی سیاہ آنکھوں والی، سیاہ پلکوں والی، سیاہ ریشمی بالوں والی سامع کے لیے گویا کمرے میں خاموشی طاری تھی!۔

ایسا سامع اور یہ مضمون! یہ معلوم ہوتا تھا کہ لڑکی نے ایک اُستادِ فن کی چابک دستی سے۔ اور کہاں ہے وہ لڑکی جو اِس فن میں ہی ایک دست نہیں، ماہر نہیں! قیس کے دل کے اُس تار کو چھیڑ دیا تھا۔ جس سے سب سے زیادہ رقیق، سب سے زیادہ دل دوز صدا نکلتی تھی۔ وہ ذرا کی ذرا ٹھیرا، پھر اُسکے چہرے پر، آنکھوں میں ایک ایسی چمک آگئی جو بتا رہی تھی کہ وہ عالم تصور میں جسمیں وہ اِسوقت تھا، کسی نہایت دل خوش کن نظارے کو دیکھ رہا تھا!

لڑکی نہایت شوق سے اِس حالت کو دیکھ رہی تھی اور مخل نہ ہونا چاہتی تھی، کیونکہ وہ سمجھتی تھی؟ دیکھ رہی تھی۔ عورت کا دل جہانِ محبت کے لیے آئینہ جم ہے کہ قیس نجد اِسوقت لیلائے نجد کی زیارت کر رہا تھا!

قیس اِس عالم سے باہر آیا، اور معذرت خواہی کے لہجے میں کہنے لگا: آپ میری اِن بے موقع خاموشیوں کو خیال میں نہ لایا کریں، یہ میری عادت سی ہوگئی ہے کہ موقع بے موقع تصورات میں چلا جاتا ہوں، آپ حُسنِ نجد! حسن نجد کے خد وخال کا

حال بھی پوچھتی تھیں۔ یہ مشکل سوال ہے، کیونکہ جواب میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایسا نہیں ہوتا۔ ویسا نہیں ہوتا، کیسا ہوتا ہے، اسکے ظاہر کرنیکے لیے نمونہ کی ضرورت ہے۔ اور وہ یہاں میرے پاس۔ نہیں کہنا چاہتا تھا! مگر یہ غلط ہے۔ اس کا ہو بہو نمونہ نہ سہی تو بہت مشابہ نمونہ تو میرے پاس ہے۔ اب اگر اُسے ظاہر کروں تو یقین نہ کیا جاؤں گا، اور اگر نہ کہوں تو ادائے مطلب سے قاصر ہوں گا۔

خیر جو کچھ ہو، وہاں کے حُسن کا حال اگر آپ پوچھتی ہیں تو میں مختصراً یہ عرض کیے دیتا ہوں کہ حُسن نجد ایسا نہیں جیسا اس وقت یہاں، اس کمرے میں مشغول نغمہ طرازی ہے۔ نجد کی دلبری اُس شکل میں ظاہر ہوتی ہے جو — اجازت ہے تشبیہ دوں؟"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں، جب میں نہایت بیتابی سے سُن رہی ہوں، آپنے اپنے فقرے کو ناتمام چھوڑ دیا، نجد کی دلبری کس شکل میں ظاہر ہوتی ہے"؟

"جو اس وقت مشغول جرح ہے"

اسپر لڑکی کھسیانی سی ہوگئی، اور کہنے لگی: "معلوم ہوا نجد کے مرد بھی، ہمارے ملک کے مردوں کی طرح چاپلوس ہیں، خوشامدی ہیں"

"میں پہلے ہی اس اعتراض کے وارد ہونیکا خوف کرتا تھا، اور وہی ہوا۔ بہرحال اب میں واقعات کو پلٹ تو سکتا نہیں"

لڑکی کے اس جواب میں "تو وہ کیا چیز ہے جو آپکے جرح کرنیوالے کو بقول آپکے، لیلائے نجد سے مشابہ کرتی ہے"؟ کھسیانہ پن تو تھا، مگر ایک خوشنودی کی ادا بھی شامل تھی۔

اس پر وہ جوش میں آگیا اور کہنے لگا۔ "وہ، وہ زلف عنبریں، وہ، وہ گیسوئے مشکیں ہے جو میرے جارج اور لیلائے نجد میں مشترک ہے، وہ، وہ سیاہ تیر ہیں، وہ، وہ سیاہ مگر روشن ستارہ ہے، وہ، وہ غیر قابل بیان دلکشی ہے جسے میں نجد میں پلا ہوا

دل محسوس کرتا ہی مگر الفاظ میں ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ میں وہاں کے حسن کو ترجیح تو دیتا ہی ہوں گا مگر اُس ترجیح کی کوئی وجہ بھی بیان کروں۔ آپ امواجِ بحر سے پوچھیئے کہ چاند کی طرف کیوں کھنچتی ہیں؛ آپ پروانوں سے۔ اُن میری طرح بیوقوف دلدادوں سے پوچھیئے کہ شمع پر آ کر کیوں گرتے ہیں؟ آپ سورج مکھی سے کہ پرستندۂ آفتاب ہی سوال کیجیئے کہ اُس نے آفتاب کو کیوں قبلہ بنا رکھا ہی؛ جب یہ جواب دیسکیں گے تو شاید میں بھی جواب دی سکوں..... آہ! آہ! توبہ اُف، اُف یا اللہ توبہ ہی....

قیس یکایک سوفا سے زمین پر گر پڑا۔ اُسکے ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے۔ ڈرائنگ روم میں کہ بزمِ طرب تھا، اِک دم کھلبلی پڑ گئی۔ سب اِس کے گرد آ کر جمع ہو گئے لیکن بیچارہ قیس بڑی تکلیف میں تھا، اُسکی رگیں کھنچ رہی تھیں، ہاتھ اینٹھے جاتے تھے۔ مجمع میں چند ڈاکٹر بھی تھے، اُن کی رائے تھی کہ مرگی کا دورہ ہی۔ بعضوں نے کہا کہ اختلاجِ قلب کی علامتیں ہیں۔

دوا کے لیے لوگ دوڑے گئے، کہ اتنے میں قیس کی حالت میں بہتری ظاہر ہونے لگی، اور تھوڑی دیر میں بغیر کسی دوا کے، وہ خود بخود اُٹھ کھڑا ہوا۔

لوگوں کے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایسا دورہ اِس سے قبل کبھی نہیں پڑا تھا۔ جہاں تک اُسے یاد تھا یہ پہلی دفعہ تھی کہ اُسکی یہ حالت ہوئی۔

بہر حال ڈاکٹروں کا ایک مشورت کا جلسہ ہوا۔ سب نے مِلکر، پانچ چھ طب کی ضخیم کتابوں میں ڈوبے ہوئے، دبے ہوئے دماغوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مرگی کا دورہ تھا، اور اُسکے لیے علاج تجویز کر دیا۔

(باقی دارد)

سجاد حیدر

دردِ جاں ستاں

یادگار خواجہ میر درد جناب سید ناصر نذیر صاحب دہلوی نے ایک سچے واقعے
کو ایک مختصر سے ناول کے پیرائے میں لکھا ہے۔ اور اسکا نام "دردِ جانستاں" رکھا ہے
یہ نام لفظاً و معناً اس قصے کے انجام پر صادق آتا ہے۔ زبان اور روزمرہ کی صفائی اور دلی
کی معمولی زندگی کا فوٹو قابل ملاحظہ ہیں۔ ہم اس قصے کو باقساط ہدیۂ ناظرین کرینگے۔ اور ہم سید صاحب
موصوف کے نہایت ممنون ہیں کہ انھوں نے یہ دلچسپ چیز ہمیں بغرض اشاعت عنایت کی۔ جیسا کہ
ہم پہلے ایک موقع پر لکھ چکے ہیں۔ سید صاحب کو شمس العلما مولنا آزاد سے تلمذ ہے اور صاحب
ممدوح سے ارادت خاص رکھتے ہیں چنانچہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "جب سے حضرت
شمس العلما کا دماغ خراب ہوا دل سرد ہو گیا۔ نہ نظم کا ذوق رہا نہ نثر کا شوق۔ آزاد اگر اب
تندرست رہتے تو یہ خاک اکسیر بن جاتی۔ مگر ہماری بدقسمتی نے مولنا کو دارین سے آزاد کر دیا
اور ہم بینوا ہو گئے۔"

پہلا باب

رات کے چار بجے ہیں۔ شہر دہلی کے بازاروں اور گلی کوچوں میں سناٹا ہے
گھنٹہ گھر جہاں شام کو آدمیوں کے ہجوم سے خدا رکھے کھوے سے کھوا چھلتا تھا
اور آدمیوں اور سواریوں کے سوائے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اب یہاں سے ادھر
فتح پوری اور ادھر خونی دروازے تک نظر صاف آتی جاتی ہے۔ آدمی کیا آدمی کی پرچھائیں
بھی معلوم نہیں ہوتی۔ البتہ سو سو پچاس پچاس قدم پر باقبال گورنمنٹ کے
کانسٹبل ضرور ٹہلتے دکھائی دیتے ہیں۔ جو چاندنی چوک کی لاکھوں روپیوں سے
مال کی بھری ہوئی دوکانوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ یا سڑک کے کنارہ پر میونسپل

کمیٹی کے اہتمام سے لال ٹینیں روشن نظر آتی ہیں۔ اور اُن پر باوفا پروانوں اور پتنگوں کا ہجوم ہی جو اپنے محبوب کی نورانی اور چمک دار صورت پر واری اور قربان ہورہے ہیں۔ ہمارا گمان تھا کہ چاوڑی بازار میں دہلی کی ماہ جبینوں کا آسمان ہی اسوقت ضرور چہل پہل ہوگی۔ مگر نہیں یہاں بھی بے رونقی چھائی ہوئی ہے۔ اور سارے کوٹھوں اور تمام کمروں کے دروازے اس طرح بند ہیں جس طرح کسی ماہ رُخ نازنین نازک دماغ کی آنکھیں شراب ناب کے تیز نشہ سے بند ہوجاتی ہیں۔ مگر ہمارے چلبلے خیال نے جو ہر رات نئے تماشے اور ہر دن انوکھے جلسے دیکھنے کا عادی ہے چین نہ لینے دیا اور چاوڑی سے جامع مسجد۔ مٹیا محل دکھاتا ہوا ہمیں اعظم خاں کی حویلی لے پہنچا ہے۔ یہاں تو اسوقت بڑی دُھوم دھام ہے۔ لو دیکھو اس محلہ کے صحن میں کتنی گاڑیاں۔ بگھیاں کھڑی ہیں۔ ڈولیاں بھی موجود ہیں ڈولی بان بھی حاضر ہیں۔ دو پینسیں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ جنکے لال لال پردے اور پردوں کی گوٹہ کناری بے کہے بتا رہی ہے کہ اس محلہ میں کسی مرد شریف کے ہاں شادی ہے۔ اور یہ ساری چیزیں برات کے لوازم سے ہیں۔ بیشک بیشک یہ گمان بالکل صحیح ہے۔ ہم اعظم خاں کی حویلی میں چند ہی قدم چلے تھے اور مہوچیوں کی گلی کی طرف مُڑنے کا ارادہ ہی تھا جو سامنے کوٹھی پر نظر پڑی تو دیکھا اُسکے تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ کوٹھی روشنی اور شیشہ آلات اور دلربا فرنیچر سے دُلہن بنی ہوئی ہے۔ بڑے کمرہ میں دو براتیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ دہلی کے مہذب براتیوں یا براتیوں کی پاکیزہ صورت و لباس کی تعریف کی کچھ ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ مگر یہاں دس بیس قصباتی بھی دکھائی دیتے ہیں جنکی شکلیں اور ہیئت کذائی ہم سے کہتی ہے کہ ہم انکی کچھ تعریف کریں۔ اول تو ماشاءاللہ اُن کا لباس ہی اُنکی قلعی کھولے دیتا ہے۔ مگر دو چار حضرات کی گفتگو ایسی بے ڈول ہے جو مستواتر ٹکسال باہر باتیں کرکے سُننے والوں کا دم بُولائے دیتے ہیں۔ مسندپر

دو دو دولھا سرنگوں اور شرگیں بیٹھے ہیں - ایک دولھا کا گندمی رنگ ہی - آنکھیں نہ
چھوٹی ہیں نہ بڑی - ناک کسی قدر پتلی ہے مگر چنداں بدنما نہیں ہی - سر پر بنارسی دوپٹہ
اور دوپٹہ پر پھولوں کا معطر سہرا ہے - اور لباس سے قطعی یقین ہوتا ہی کہ یہ لڑکا ہماری
دہلی کا ہی ہی - اور غالباً ہم نے اسکو دیکھا بھی ہے - مگر اسکے پہلو میں جو دوسرے نوشہ بیٹھے
ہیں یہ سانولے ہیں - ناک پھیلی ہوئی - آنکھیں اگرچہ بڑی ہیں مگر کوئی دلفریبی اُن میں
نہیں ہے - لباس کا رنگ اور وضع صاف کہہ رہی ہی کہ یہ دہلی کے ہرگز نہیں ہیں
اُنگلی میں کسی گنوار سُنار کی بنائی ہوئی ایسی بھدی انگوٹھی پہنے ہوئے ہیں جس
نے ہاتھ کو بھی لاج لگادی ہی - سہرہ اِنکے سر پر بھی ہی - مگر افسوس ہے کہ سہرہ کی
پھبن بالکل اُڑگئی ہے - اِن کے قریب اِن کے ہمصورت ایک بزرگ اور بیٹھے
ہیں جو قیافہ سے ہم کو ان کے بھائی معلوم ہوتے ہیں - چونکہ سردی کا موسم ہے
لال چھینٹ کا ایک انگرکھا پہن رہے ہیں - جسکی اونچی چولی سینہ کے پاس پہنچگئی
ہی - موٹے موٹے بند لٹک رہے ہیں - اوپر سے ایک کاکریزی رزائی اوڑھے ہوئے ہیں
جسمیں تین پاؤ سے کم روئی نہیں ہی اور اُسکی ضخامت لحاف کو شرماتی ہی - خدا جانے
خط بنوانے کی عادت نہیں ہے یا قصداً رخسار کے بال اِس قدر بڑھائیے ہیں جو
آنکھوں کے پاس پہنچگئے ہیں - ڈاڑھی گھن دار اور لمبی ہی - اور سیاہ بھی ایسی ہی جو
حضرت کی جلد بدن سے ملتی جُلتی ہی - سامنے ایک ڈبل نیچوان رکھا ہی - سٹک اُس کے
ہاتھ میں ہی اور اُسکو متواتر پیئے جاتے ہیں اور دُھواں چھت کی طرف اُڑادیتے ہیں
یا تو اِن بزرگوار کو اِس سے پہلے کبھی برقی لیمپ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا - اِسی
واسطے یہ چھت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جاتے ہیں - اور لیمپ کی طرف سے نظر
نہیں اُٹھاتے ہیں یا کچھ مراق ہے جو اِس لغو حرکت میں گرفتار ہیں - ہم نے ابھی
اِن قصباتی صاحب کا حلیہ اچھی طرح دیکھا بھی نہ تھا جو حضرات دہلی میں سے ایک صاحب

سیاہ فام متوسط قد چالیس سال کی عمر مخملی انگریزی تراش کی اچکن پہنے مغلیہ ٹوپی سر پر سفید دوشالہ اوڑھے محفل میں آگئے اور سلام علیک کر کے ان کے پاس بیٹھ گئے اور فرمایا قاضی انوارحسین صاحب آپکا ہی نام نامی ہے۔

وہی بزرگوار قصباتی (جنکا حلیہ ہم نے بیان کیا ہے) جی ہاں۔ انوارحسین مجھی کو کہتے ہیں۔ اور آپ کا اسم مبارک۔

حضرت دہلوی۔ میرا نام میرزا فرحت ہے۔ مجھے حافظ احمد علی صاحب (بیٹی کے باپ) نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ قاضی صاحب دولھا کو کابین نامہ باضابطہ لکھنا چاہیئے۔ اُسکے بعد نکاح ہوگا۔

قاضی انوارحسین۔ حافظ صاحب ہمیں سے کابین نامہ لکھوائیں گے یا دوسری صاحبزادی کے دولھا سید اصغر علی صاحب جو یہ بیٹھے ہیں ان سے بھی۔

میرزا فرحت۔ جی نہیں۔ ان سے نہیں۔

قاضی انوارحسین اِس کا سبب؟

میرزا فرحت۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سید اصغر علی کے خاندان اور اُن کے خاندان کے چال چلن سے حافظ صاحب واقف ہیں۔ دونوں صاحبوں کی اصلیت شہر دہلی کی ہے ان کی طرف سے پورا اطمینان ہے۔ اور آپ سے نہ اگلی شناسائی نہ آپ صاحبوں کے طرزِ معاشرت سے آگاہی۔ نہ آپ شاہجہاں آباد کے رہنے والے۔ اس لیے احتیاطاً کابین نامہ لکھوایا جائے گا۔

قاضی انوارحسین۔ میرزا صاحب! ہمارے خاندان میں آجتک کسی نے کابین نامہ نہیں لکھا ہے۔ اس واسطے ہم نئی بات نہیں کر سکتے۔ اور نہ ہمارے ہاں باہر شہر کے میں کابین نامہ کا رواج۔

میرزا فرحت اے جناب ہم کو باہر شہر اور آپکے رواج خاندان سے کیا غرض

ہم کو اپنے خاندان اور اپنے مطلب سے مطلب ہے۔ آپ کو کابین نامہ ضرور لکھنا ہوگا۔

قاضی انوار حسین۔ میرزا صاحب! میں اس سے زیادہ گفتگو کرنی نہیں چاہتا آپ حافظ صاحب سے جاکر صاف کہہ دیجیے کہ دولہا اور دولہا کے بھائی کو یہ شرط منظور نہیں ہے نکاح ہو یا نہ ہو۔

میرزا فرحت دہلی کے شہزادے اور نازک مزاج۔ اُنکو قاضی انوار حسین کی یہ باتیں بہت ناگوار ہوئیں۔ اور اُنھوں نے دوسرے کمرہ میں جاکر حافظ احمد علی سے کہا ،، حافظ صاحب قاضی جی کی نیت درست نہیں ہے۔ اُنھوں نے صاف کہدیا کہ میرے بھائی کا نکاح ہو یا نہ ہو۔ میں کابین نامہ نہیں لکھ سکتا۔ حافظ جی شریف اور شریف بھی سید۔ میرزا فرحت کی باتیں سُنکر دم بخود ہوگئے۔ اور چپکے زنانی ڈیوڑھی پر چلے گئے۔ وہاں سمدھنیوں کی خاطر مدارات ہو رہی تھی۔ اور عورتیں دونوں لڑکیوں کو دُلہن بنانے میں مشغول تھیں۔ مارے غُل کے کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ جب بہت چیخے چلائے تو وزیرن ماما ڈیوڑھی تک آئی۔ اور اُس نے کہا میاں آپ کیا فرماتے ہیں ہم کو تو دم لینے کی فرصت نہیں ہے۔ اِدھر تو سمدھنوں کی آؤ تواضع میں لگ رہی ہیں۔ اُدھر خدا رکھے دو لڑکیاں۔ اُنہیں دُلہن بنا رہی ہیں۔

حافظ صاحب۔ خیر تم اپنی بیوی کو تو میرے پاس بُلالاؤ مجھے اُن سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔،،

وزیرن دوڑی دوڑی حویلی میں گئی۔ اور حافظ احمد علی صاحب کی بیوی کو ڈیوڑھی میں بُلا لائی۔

حافظ صاحب کی بیوی۔ کہو صاحب کیا کہتے ہو؟ جلدی کہو۔ ابھی سمدھنوں کو شربت پلانے کا بھی وقت نہیں آیا۔ ایک جان اور ستر کام ہیں۔ جہیز کے جوڑوں میں سے ایک جوڑہ چھوٹی کا ابھی نہیں ٹکا ہے۔ جہاں آرا بیگم اور ہرمزی خانم بیٹھی سی رہی

ہیں۔ چنپا اور کرن صندوقچہ میں سے نکالکر دیتی تھی جو وزیرن نے کہا میاں ڈیوڑھی پر کھڑے چلا رہے ہیں۔ اور آپ کو بلا رہے ہیں جلدی چلیئے۔

حافظ صاحب۔ کیا کہوں قاضی انوار حسین مہر کا کاغذ لکھنے کی حامی نہیں بھرتے اور کہتے ہیں چاہے نکاح ہو یا نہ ہو ہم کاغذ نہیں لکھنے کے۔

حافظ جی کی بیوی (سر پکڑ کر) اے امتہ تیری تقدیر۔ میں تو بری کو ہی دیکھکر سمجھی تھی کہ یہ لوگ کم ہمتے ہیں۔ مصری کھانڈ نقل میلے۔ قرص خراب کلاوہ بے رونق میوہ گھن کھایا ہوا۔ سہاگ پوڑہ کوئی روپیہ سوا روپیہ والا۔ مینڈھی اتری ہوئی جوڑہ چوتھی کا ایسا ذلیل ہو کہ دیکھے سے تن بدن میں آگ لگی جاتی ہو۔ اب تم نے یہ اور سنایا کہ کاغذ لکھنے سے انکار کرتے ہیں ایسے بیاہ سے میری بن بیاہی اچھی ہو۔ اگر وہ کاغذ لکھنے سے انکار کرتے ہیں تو اُن سے کہدو جائیے اپنا رستہ لیجئے۔ تمھارے کورے چاول تمھارے ہاں اور ہمارے کورے چاول ہمارے ہاں۔ بھاڑ میں جائیں چولھے میں جائیں۔ خدا ان باہر والوں سے بچائے۔ موئے نفاختے۔ گنوار گوں کے یار" وہی مثل ہو "چمڑی جائے مگر دمڑی نہ جائے" تم اُن سے جاکر صاف کہدو کہ تمہیں کاغذ لکھنا منظور نہیں ہمیں لڑکی کا نکاح کرنا منظور نہیں۔ اور اللہ کا نام لیکر چھوٹی کا نکاح پڑھوا دو۔ لوگ یہ کہیں گے پہلے چھوٹی کا کردیا اور بڑی کو بٹھائے رکھا خیر کہیں۔ اور ہم تم کیا کریں۔ اپنی اپنی تقدیر۔

حافظ احمد علی اپنی بیوی کا یہ جواب سُن کر باہر آئے اور میرزا فرحت۔ مولوی عبدالرحمن میرزا یارن جان وغیرہ اپنے دوستوں اور عزیزوں سے کہا کہ لڑکی کی ماں کی بھی یہی مرضی ہے کہ یا تو کاغذ لکھوا لیا جائے نہیں قاضی جی والی برات کو اُلٹا دیا جائے۔ مردوں نے بھی متفق ہوکر حافظ صاحب کی بیوی کے قول کی تصدیق کی۔ اور قاضی انوار حسین سے جاکر کہا کہ اگر آپ کا بھائی پانچہزار کا مہر قبول کرسکتا ہو اور کاغذ یہ

لکھ سکتا ہی تو نکاح ہو سکتا ہی۔ نہیں ما بخیر و شما بسلامت۔ اپنے دولت خانے کو ٹھنڈے ٹھنڈے تشریف لیجائیے۔ کیونکہ اس حجت و تکرار میں بہت دیر ہوگئی ہی۔ دوسری لڑکی کے نکاح کا حرج ہو رہا ہی۔ مگر بقول شخصے مرغی کی ایک ٹانگ۔ قاضی جی یہی کہتے رہے کہ ہم کاغذ نہیں لکھ سکتے ہیں۔ اور غالباً اُنکے منہ سے یہ بھی نکلا کہ ہم بغیر نکاح کیئے یہاں سے ٹلنے والے بھی نہیں۔ بیٹی والوں کو یہ فقرہ ان کا بہت ناگوار گزرا۔ اور وہ اس کا جواب سخت دینا چاہتے تھے لیکن حافظ جی کے بڑے صاحبزادہ کو جس کا نام رفیع تھا اس کے سُننے کی تاب نہ ہوئی اور اُسے طیش آگیا۔ اور اُس نے ایک کہی نہ دو کہی قاضی خورشید حسین یعنی دولہا کو مسند پر سے گھسیٹ کر چاندنی پر کھڑا کر دیا۔ اور کہا خیر اسی میں ہی کہ آپ یہاں سے سر پر پاؤں رکھکر بھاگ جائیے۔ نہیں پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے ہوگا۔ اور قاضی انوار حسین سے کہا شعر

پگڑی اپنی سنبھالیئے گا میر اور بستی نہیں۔ یہ دلّی ہے

اگرچہ یہ تہتک ایسا تھا کہ ایک ادنیٰ اور کمینہ آدمی کو بھی غصہ آجاتا۔ اور وہ رفیع سے ضرور گتھم گتھا ہو جاتا۔ مگر خورشید حسین نے اُف نہیں کی۔ خدا جانے اُسکا مزاج ہی ایسا حلیم تھا یا موقع اور وقت کا لحاظ اُس نے کیا۔ دولہا کا دھکیل دینا اور براتیوں کو دھکے دیدینا تھوڑی بات نہ تھی اس سے ساری محفل درہم برہم ہوگئی اور کوٹھی میں ہُلڑ مچگیا۔ تو مجھ پر اور میں تجھ پر۔ اسی ہنگامہ میں دولہا نے اپنے بھائی انوار حسین سے کہا کہ ہائے شہر میں آکر آپ کیوں رسوا ہوتے ہیں اور اپنے ساتھ مجھے کیوں بلا میں پھنساتے ہیں۔ وہ لوگ کیا بیجا کہتے ہیں۔ کابین نامہ کیا نہیں لکھے جاتے ہیں بڑے بڑے مہر نہیں ہوتے ہیں۔ مگر خدا جانے اِسوقت آپکو کیا ہوگیا ہے۔ رفیع کے دھمکانے اور بھائی کے اِس کہنے سے قاضی صاحب کی عقل ٹھکانے ہوئی۔ اور انھوں نے بقول ؎ آنچہ دانا کند کند ناداں + لیک بعد از ہزار رسوائی +

مسز افرحت صاحبہ سے کہا۔ ہمارا قصور آپ صاحب معاف کریں ہمیں آپ کی دونوں شرطیں بدل و جان منظور ہیں۔ پانچہزار کا مہر بھی بندھوا دیجئے اور کاغذ بھی لکھوا لیجئے بارے اُسیوقت شادی لال قبالہ نویس نے کابین نامہ تحریر کیا۔ دولھانے اپنے دستخط اور اُنکے بھائی اور سب براتیوں نے گواہی لکھدی۔ مُہریں کردیں۔ اور امتہ (دولھن کا نام ہی) کا نکاح اس دقت اور پریشانی کے بعد خورشید حسین سے ہوگیا۔ اور چونکہ حافظ صاحب کی چھوٹی لڑکی کے نکاح کے وقت کوئی نضیتہ یا قصہ پیش نہیں آیا اسواسطے اسکی نسبت صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ اُس کا نکاح بخیر و خوبی خیریت کے ساتھ ہنسی خوشی سے ہوگیا۔

سید ناصر نذیر

ایک ضروری اطلاع ۔حال میں ڈاک خانہ کیطرف سے جونئے وی پی فارم جاری ہوئے ہیں وہ اسقدر تکلیف دہ اور پریشان کن ہیں کہ اور اخبارات بھی اسکے شاکی ہیں پہلے فارم ہیں یہ دقت نہ تھی پھر خدا جانے کس مصلحت سے ڈاک خانہ کو اس جدت پر مجبور کیا۔

اس وقت نئے فارموں کی کوپن جو روپے کے ساتھ ہمیں ڈاکخانہ سے ملتے ہیں اسقدر نامکمل اور غلط لکھے ہوتے ہیں کہ اُنسے بعض اوقات تو اتنا پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ روپیہ کس کا آیا ہے اگر رقم لکھی ہے تو بھیجنے والے کا نام نہیں نام ہے تو مقام کا پتہ نہیں۔ الغرض موجودہ صورت میں بالکل ممکن ہے کہ بعض نئے خریداروں کے نام درج رجسٹر ہونے سے رہجائیں اسلیے تاوقتیکہ حکام ڈاک خانہ اس بدعنوانی کی اصلاح کیطرف توجہ نہ فرمائیں اور کوئی معقول انتظام نہ کریں مخزن کے نئے خریدار جو وی پی وصول کر چکے ہوں اور جن کا نام درج رجسٹر ہونے سے رہگیا ہو تکلیف فرماکر ایک اطلاعی کارڈ دفتر مخزن میں بھی بھیجدیا کریں۔ رسالہ نہ پہنچنے کی شکایتیں بھی روز افزوں ہیں ان میں کمی نہیں ہوتی ناچار ہم خود خسارہ اٹھاکر دوبارہ پرچہ بھیجدیتے ہیں۔ حکام ڈاک خانہ کے تغافل کی شکایت فضول ہے کبھی شنوائی نہیں ہوتی۔ لو کچھ تو ہمارے اپنے مہربان بھی اس شکایت کا باعث ہیں انہیں سے بعض تو تبدیل مقام کی اطلاع دفتر

صحرا کی لڑکی اور سن رسیدہ شاعر

شام کا وقت تھا۔ اوس پڑنی شروع ہوگئی تھی۔ آسمان پر تارے چمکنے لگے تھے۔ راستے کے دونوں طرف اونچی اونچی جھاڑیاں کھڑی تھیں۔ فکرِ شعر میں سر جھکائے چلا جاتا تھا کہ آواز آئی "پی لے پیارے بچے پی لے"۔ اتنا سنتے ہی ٹھیر گیا اور سر اونچا کرکے جھاڑی پر سے دیکھا تو کیا دیکھا کہ ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی ہے۔ اور ایک سفید برف سے اُجلا بھیڑ کا بچہ ہے۔ اور لڑکی اس بچے سے باتیں کرتی ہے۔

بھیڑ کا بچہ اکیلا ہے۔ کوئی بھیڑ بکری پاس نہیں ہے۔ پتلی سی ایک ڈوری گلے میں پڑی ہے۔ ڈوری کا دوسرا سرا ایک پتھر سے بندھا ہے۔ لڑکی ایک گھٹنا زمین پر ٹکائے دونوں ہاتھوں میں تھالی اور تھالی میں دودھ لیئے بچے کو پلاتی ہے۔

بچہ دودھ پیتا جاتا ہے اور خوش ہو ہو کر کان ہلاتا ہے۔ اور لڑکی سے کہ پیاری پیاری نازک آواز سے کہے جاتی ہے "پی لے پیارے بچے پی لے"۔ اور یہ جملے اس قدر پیار اور محبت کے لہجے میں کہتی ہے کہ جو اُسکے دل کا حال تھا وہی میرے دل کا حال ہوگیا۔

اس لڑکی کا نام باربیرا تھا۔ صحرائی تازگی و توانائی کا نمونہ تھی۔ اور ایسی خوبصورت لڑکی تھی کہ ایسی خوبصورت لڑکیاں کہاں ہوتی ہیں۔ میں اس باغ دنیا کا پرانا شیدائی ان دونوں بچوں کو دیکھکر خوش ہوتا رہا۔ جیسا اُجلا اُجلا بھولی بھولی صورت کا وہ بھیڑ کا بچہ تھا ویسی ہی پیاری پیاری صورت کی یہ لڑکی تھی۔ جب بچے نے دودھ سب پی لیا تو لڑکی خالی تھالی لیکر گھر کی طرف چلی۔ دو چار قدم چلی تھی کہ کھڑی ہوگئی۔ اور بچے کی طرف دیکھنے لگی۔ میں چپ چاپ جھاڑی کے پیچھے کھڑا لڑکی کے چہرے کو اور اس چہرے پر محبت اور درد محبت کی جو جو علامتیں پیدا ہوتی تھیں اُنکو غور سے دیکھتا رہا۔ دفعتاً

خیال آیا کہ اگر قدرت اِس لڑکی کو اسوقت شاعر کی زبان دیتی تو اِس بےزبان بھیڑ
کے بچے اور اِس معصوم لڑکی کی حکایتِ عشق کچھ اِن سیدھے سادے بھولے بھالے
خیالات میں نظم کی صورت اختیار کرتی۔

"میرے پیارے بچے۔ تجھے کس بات کی تکلیف ہی۔ کچھ مُنہ سے تو کہہ۔ رسّی کو
کیوں گھسیٹے جاتا ہے۔ خدا کا دیا سب کچھ تیرے پاس ہی۔ کھانا۔ پینا۔ سونا۔ چلنا۔
پھرنا۔ سب باتوں کا آرام ہے۔ کوئی چیز تجھسے دور نہیں ہے۔ تیرے گھاس کے تختہ پر
نرم نرم گھاس جمی ہے۔ پھر کیوں آرام نہیں کرتا۔ آخر کس بات کی تجھے تکلیف ہی۔"

"وہ کونسی چیز ہے جسکو تیرا جی ڈھونڈتا ہے۔ وہ کیا بات ہی جسکی یہ بیقراری ہے
ہاتھ پاؤں کا تو مضبوط ہی۔ صورت شکل کا بھلا تجھسے اچھا کون ہوگا۔ یہ گھاس دیکھ
کیسی نرم ہی۔ اِن پھولوں کو دیکھ کانٹے نام کو نہیں۔ اور پاس ہی کھیتوں کا سبزہ اول
دن بھر تیری آنکھوں کے سامنے لہلہاتا ہی"

"اگر دھوپ سے جی گھبراتا ہو تو جھاڑیوں کی چھاؤں پاس ہی۔ گلے کی ڈوری لمبی ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں جا بیٹھا کر۔ مینہ یہاں بہت نہیں برستا۔ آندھی بوکھا
نہیں آتا۔ جنگل کے بگولے یہاں اُٹھتے نہیں۔ پھر ان کا تجھے کیوں ڈر ہو۔ یہ بلائیں
تو یہاں آتی ہی نہیں۔"

"سو جا۔ پیارے بچے سو جا۔ وہ دن بھول گیا کہ یہاں سے کوسوں دور پہاڑوں
میں بھوکا پیاسا پڑا پھرتا تھا۔ بہتیری بھیڑیں اپنے اپنے بچوں کو لیے پہاڑوں پر
چرتی پھرتی تھیں۔ پر تجھکو کوئی نہ پوچھتا تھا۔ اور تیری پیاری ماں تجھے خدا کے
سپرد کر کے دنیا سے چل بسی تھی۔ میرا باپ اُدھر سے نکلا اور تجھپر ترس کھا کر گود میں اُٹھا
گھر لے آیا۔ وہ دن تیرے لیے بڑی برکت کا تھا۔ جب تو ہمارے گھر آیا تو تیری سہیلی
میں بنی۔ تیری کھلائی میں بنی۔ سچ تو یہ ہے کہ جس ماں نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر تجھے

دودھ پلایا تھا اُسکو بھی مامتا ہوگی تو ایسی ہی ہوگی جیسی مجکو تیری محبت ہی۔"

اُسی تھالی ہیں دن میں دو دفعہ چشمے سے صاف ستھرا پانی لاکر تجھے پلاتی ہوں۔ دونوں وقت شام سویرے۔ زمین پڑی اوس میں بھیگی ہوتی ہے کہ تازہ اور گرم دودھ تیرے لیے لاتی ہوں"

"گھبراتا کیوں ہو۔ کوئی دن میں بڑا ہوجائے گا۔ ہاتھ پاؤں اچھے ہوگئے مضبوط ہوجائینگے۔ پھر میں گاڑی بناؤنگی اور گاڑی میں گھوڑے کی جگہ تجھے لگاؤنگی۔ اور پھر ہم تم ملکر کھیلا کرینگے۔ اور جب جاڑے میں برف گرا کرے گی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں نعد کی چلا کریں گی تو گھر کے اندر آگ جلاکر جہاں ہم سب تاپا کرینگے وہیں بیٹھکر تو بھی آگ تاپا کیجیو اور وہیں جگالی کرتے کرتے سو جایا کیجیو۔ اور پھر ہمارا گھر تیرا گھر ہوجائے گا۔"

"کیا کروں۔ بچے۔ تجھے چین کیوں نہیں آتا۔ یہ کہنے کی بیقراری ہو کہیں تجھے اپنی ماں تو نہیں یاد آرہی۔ کیا خبر ہے جن چیزوں کو میں نہیں جانتی۔ وہ تجکو پیاری ہوں اور ایسی چیزوں کو یاد کرکے تیرا جی کڑھتا ہو جنکو اب دیکھ سکتا ہی اور نہ سن سکتا ہے۔"

"پیارے بچے۔ تو نہیں جانتا ہو۔ پہاڑوں کی چوٹیاں دور سے سری بھری سہانی دکھائی دیتی ہیں۔ پر سُنا ہی وہاں کالی کالی آندھیاں اُٹھتی ہیں گھپ اندھیرا ہوجاتا ہے ندیوں میں یوں تو پانی بہتا اور چمکتا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب مینہ برستے ہیں تو اُنکو غصہ آتا ہے اور غصہ میں وہ ایسا دہاڑتے ہیں کہ شیر بھی کیا دہاڑینگے۔"

"یہاں تجھے بیری کا ڈر ہے نہ بازکا۔ کیا دن اور کیا رات۔ کسیوقت بھی کسی بات کا ڈر نہیں ہے بچے۔ بچے۔ کیوں میرے پیچھے ایسا ہنہناتا اور چلاتا ہے۔ ایسے زور زور سے کیوں گلے کی رسی کو کھینچتا ہی۔ سورہ پیارے۔ سورہ۔ سورج نکلتے ہی پھر تیرے

پاس آؤں گی"

لڑکی بچے کا مُنہ تکتی اپنے گھر چلی گئی۔ میں بھی اِسی مضمون کی نظم دل میں کہتا ہوا اپنے گھر کی طرف چلا۔ نظم کے اشعار کو پڑھتا تھا اور سوچتا تھا کہ آدھی نظم اُس لڑکی کی کہی ہوئی ہے اور آدھی میری۔

ایک دفعہ پھر نظم کے اشعار کو دوہرایا تو دل سے بے اختیار صدا نکلی کہ تو بھول گیا۔ تیرا دل تو اُس لڑکی کا دل ہو چکا تھا۔ پھر یہ نظم تیری کہاں سے ہوئی۔ آدھی سے بھی زیادہ اُس لڑکی کی کہی ہوئی ہے۔ کیونکہ اُسکی معصوم نظر میں وہ محبت تھی اور اُسکی پیاری آواز و لہجے میں وہ اثر تھا کہ اُس کا دل شاعر کا دل اور اُسکی طبیعت شاعر کی طبیعت ہو چکی تھی +

ع ۔ ا

نہیں جمتا کسی کا نقش اِس نیلے فانی میں
حباب آسا مٹا۔ اُبھرا جو بحرِ زندگانی میں

زبانِ حال سے پروانہ بسمل یہ کہتا ہے
حضوری ہو اگر حاصل مزا ہے نیم جانی میں

حباب اپنی خودی سے یں ہی کہتا ہوا گزرا
تماشا تھا ہوا نے اِک گرہ دیدی تھی پانی میں

حدیں قوموں کی قسمت کی کیا کرتا ہے یہ عالم
زمانہ دیکھ کر چلیئے طریقِ زندگانی میں

ادائے شکر کرکے احتراز اولیٰ ہے اے اکبر
ہزاروں آفتیں شامل ہیں اُن کی مہربانی میں

بحرِ ہستی میں ہوں مثالِ حباب
مٹ ہی جاتا ہوں جب اُبھرتا ہوں

لاکھ نعمت ہے اتنی آزادی
سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں

اُن کا گھر چھوڑ کر کہاں جاؤں
دل ہی کے ساتھ میں ٹھہرتا ہوں

لن ترانی نہیں ہے مانعِ عشق
میں ترے نام ہی پہ مرتا ہوں

دیکھ کر رنگ کالج و اسکول
ق
اس زمانے کی قدر کرتا ہوں

مفلسی میں بھی ہے ترقیِ علم
مر رہا ہوں۔ مگر اُبھرتا ہوں

آخری مغلیہ بادشاہ کا خاصہ

سنہ ۱۸۸۵ء میں مطبع ارمغان دہلی سے ایک نہایت دلچسپ کتاب ۱۰۲ صفحے کی شائع ہوئی تھی جو اِن دنوں نایاب ہے جس میں آخری مغلیہ شاہ کے طرزِ معاشرت کا تذکرہ نہایت دلچسپ طریق پر بیان کیا گیا ہے۔ اِسکے مصنف منشی فیض الدین صاحب ملازم شہزادہ مرزا الٰہی بخش ہیں۔ مخزن کے ناظرین کے لیئے ذیل میں بادشاہ کے خاصہ کا حال نقل کرکے بھیجتا ہوں۔ خطوطِ وحدانی میں جو نوٹ ہیں وہ میں نے بڑھائے ہیں۔ (شمیم)

خوانوں کا تار لگ رہا ہے۔ ایلو! خاصے والیوں نے پہلے ایک سات گز لمبا تین گز چکلا چمڑا بچھایا۔ اُسپر سفید دسترخوان بچھایا۔ بیچوں بیچ میں دو گز لمبی ڈیڑھ گز چکلی چھ گرہ اونچی چوکی لگا اُسپر بھی پہلے چمڑا پھر دسترخوان بچھا خاصے کی داروغہ سامنے ہو بیٹھی۔ لو اب کھانا چنا جاتا ہے۔

چپاتیاں۔ پھلکے۔ پراٹھے۔ روغنی روٹی۔ بری روٹی۔ بیسنی روٹی۔ خمیری روٹی۔ نان۔ شیرمال۔ گاؤ دیدہ۔ گاؤ زبان۔ کلچہ۔ باقرخانی۔ عوصی روٹی۔ بادام کی روٹی۔ پستے کی روٹی۔ چاول کی روٹی۔ گاجر کی روٹی۔ مصری کی روٹی۔ نان پنبہ۔ نان گلزار۔ نان قماش۔ نان تنکی۔ بادام کی نان خطائی۔ پستے کی نان خطائی۔ چھوارے کی نان خطائی۔ (گویا ۲۶ قسم کی انواع و اقسام کی روٹیاں چنی جاتی تھیں۔ مقابلہ فرمایئے کہ اِن دنوں اِن میں سے کتنی روٹیوں کے لوگوں نے نام بھی نہیں سنے ہونگے۔ انگریزی زمانہ میں ڈبل روٹی پر کس قدر ناز ہے)۔

یخنی پلاؤ۔ موتی پلاؤ۔ نورمحلی پلاؤ۔ نکتی پلاؤ۔ کشمش پلاؤ۔ نرگسی پلاؤ۔ زمردی پلاؤ۔ لال پلاؤ۔ مزعفر پلاؤ۔ فالسائی پلاؤ۔ آبی پلاؤ۔ سنہری پلاؤ۔ روپہلی پلاؤ۔ مرغ پلاؤ۔ بیضہ پلاؤ۔ انناس پلاؤ۔

کوفتہ پلاؤ ۔ بریانی پلاؤ ۔ چُلاؤ ۔ سارے بکرے کا پلاؤ ۔ بونٹ پلاؤ ۔ شولہ ۔ کھچڑی ۔ قبولی طاہری ۔ متنجن ۔ زردہ ۔ سونیاں ۔ من و سلویٰ ۔ فرنی ۔ کھیر ۔ بادام کی کھیر ۔ کدو کی کھیر گاجر کی کھیر ۔ کنگھنی کی کھیر ۔ یاقوتی ۔ نمش ۔ دودھ کا دلمہ ۔ بادام کا دلمہ ۔ سموسے میٹھے سموسے سلونے ۔ شاخیں ۔ کھجلے ۔ تقلمے ۔ قورمہ ۔ دوپیازہ ۔ ہرن کا قورمہ ۔ مرغ کا قورمہ مچھلی ۔ بورانی ۔ رائتا ۔ کھیری کی دوغ ۔ ککڑی کی دوغ ۔ پنیر کی چٹنی ۔ سمٹی ۔ آش ۔ دہی بڑے بیگن کا بُھرتا ۔ آلو کا بھرتا ۔ چنے کی دال کا بھرتا ۔ آلو کا دلمہ ۔ بیگن کا دلمہ ۔ کریلوں کا دلمہ بادشاہ پسند کریلے ۔ بادشاہ پسند دال (ان کھانوں میں بعض غالباً ہندوؤں سے کھانے ایزاد ہوئے ہیں)

سیخ کے کباب ۔ شامی کباب ۔ گولیوں کے کباب ۔ تیتر کے کباب ۔ بٹیر کے کباب ۔ نکتی کباب ۔ لوزات کباب ۔ خطائی کباب ۔ حسینی کباب ۔

روے کا حلوا ۔ گاجر کا حلوا ۔ کدو کا حلوا ۔ ملائی کا حلوا ۔ بادام کا حلوا ۔ پستے کا حلوا سیب کا مربا ۔ آم کا مربا ۔ بہی کا مربا ۔ ترنج کا مربا ۔ کریلے کا مربا ۔ زنگترے کا مربا ۔ لیموں کا مربا انناس کا مربا ۔ گڑہل کا مربا ۔ بادام کا مربا ۔ ککروندے کا مربا ۔ بانس کا مربا ۔ ان سب قسموں کے اچار کے علاوہ کیڑے کا اچار ۔

بادام کے نُقل ۔ پستے کے نُقل ۔ خشخاس کے نُقل ۔ سونف کے نُقل ۔ مٹھائی کے زنگترے شریفے ۔ امرود ۔ جامنیں ۔ انار ۔ وغیرہ اپنے اپنے موسم میں ۔ اور گیہوں کی بالیں مٹھائی کی بنی ہوئیں ۔ حلوا سوہن گری کا ۔ پپڑی کا ۔ گوندے کا ۔ حبشی ۔ لڈو موتی چور مونگ کے ۔ بادام کے ۔ پستے کے ۔ ملائی کے ۔ لوزات مونگ کی ۔ دودھ کی ۔ پستے کی بادام کی ۔ جامن کی ۔ زنگترے کی ۔ نالسے کی ۔ پیٹھے کی مٹھائی ۔ پستہ مغزی ۔ امرتی جلیبی ۔ پھینی ۔ پھینی ۔ قلاقند ۔ موتی پاک ۔ دربہشت ۔ بالوشاہی ۔ اندرسے کی گولیاں یہ سب چیزیں قابوں ۔ طشتریوں ۔ رکابیوں ۔ پیالیوں ۔ پیالوں میں قرینے قرینے سے

چُنی گئیں۔ بیچ میں سُلفدان رکھ دیئے اور نعمت خانہ کھڑا کر دیا تاکہ مکھیاں دسترخوان پر نہ آویں۔ مشک زعفران کیوڑے کی بو سے تمام مکان مہک رہا ہے۔ چاندی کے ورقوں سے دسترخوان جگمگا رہا ہے۔ سلفچی آفتابہ۔ بیسدانی چنبیلی کی کھلی صندل کی ٹکیوں کی ڈبیاں۔ ایک طرف زیر انداز پر لگی ہیں۔ رومال۔ زانو پوش۔ دست پاک بینی پاک ایک طرف رومال خانہ والیاں ہاتھوں میں لیے کھڑی ہیں جسولنی نے عرض کیا۔ حضور خاصہ تیار ہے۔ بادشاہ اپنی تپک پر چوکی کے سامنے آن کر بیٹھے۔ دائیں طرف ملکہ دوران اور بیگماتیں۔ بائیں طرف شہزادے شہزادیاں بیٹھیں"

شمیم

کوئی چل جاتا ہے جب تیر نظر تیر کے ساتھ — خود تڑپ جاتا ہے صیاد بھی نخچیر کے ساتھ

بڑھتی جاتی ہے ادا زلف گرہ گیر کے ساتھ — قتل کرنے کو ہی شمشیر بھی زنجیر کے ساتھ

میری صورت سے نہ تھے عشق کے ظاہر آثار — کھنچ گئی آہ بھی شاید مری تصویر کے ساتھ

چشم سفاک سے بچنا دل مشتاق ذرا — اک بلا اور بھی ہے زلف گرہ گیر کے ساتھ

کبھی قسمت کی شکایت کبھی رونا دل کا — رات بھر رہتی ہیں باتیں تری تصویر کے ساتھ

کچھ بناتے بھی ہیں کچھ دل کے طلبگار بھی ہیں — شوخیِ طبع بھی ہے شوخیِ تقریر کے ساتھ

جس میں کوشش ہو سوا کام بگڑتا ہے وہی — دشمنی ہے مری تقدیر کو تدبیر کے ساتھ

میں مسلمان ہوں اسکا بھی ذرا دھیان رہے — میری گردن پہ چھری پھیرئیے تکبیر کے ساتھ

دلربائی اسے کہتے نہیں یہ لوٹ ہوئی — دل لیا چاہتے ہو حیلہ و تزویر کے ساتھ

زخم کو دیکھ کے ڈرتے ہو جو منہ پھیر لیا — کچھ اشارے بھی تو چلتے رہیں شمشیر کے ساتھ

آنکھ بھی مجھ سے لڑی سخت زبانی بھی ہوئی — ایک برچھی بھی کلیجے میں لگی تیر کے ساتھ

آہِ مظلوم میں تاثیر نہ ہو کیا معنی — آسماں کو بھی ہے گردش مری تقدیر کے ساتھ

صبر کیجے ابھی بیخود نہیں پچھتائیگا — عشق میں کام بنا کرتے ہیں تدبیر کے ساتھ

بیخود دہلوی

گنیش چوتھ کا برت

یہ دلچسپ مضمون ہمارے مکرم جناب مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ نے عنایت کیا ہو۔ دلی کی پُرانی رسموں کی بابت اُن کی معلومات وسیع اور قابل قدر ہیں۔ اُنھوں نے دلی کی پُرانی رسوم کا بیان سرکاری فرمایش سے تیار کیا تھا اور اُسمیں مسلمانوں اور ہندؤں کی رسموں کا جُدا جُدا ذکر تھا۔ اِس ذخیرہ معلومات کا پہلا حصہ مسلمانوں کی رسوم کے متعلق حال ہی میں مخزن ایجنسی نے شائع کیا ہے۔ اِسلیے اُسکے کسی باب کے یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں۔ شائقین اِس کتاب سے مفصل معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن وہ حصہ جو ہنود کے متعلق ہی جو ابھی طبع نہیں ہوا۔ لطف خاص رکھتا ہو۔ گو ممکن ہے کہ ناظرین کے شوق اور قدردانی کا اندازہ کرنیکے بعد ہم دوسرے حصے کو بھی کتاب کی صورت میں چھپوائیں۔ کیونکہ ہمارا فرض ہو کہ اِن دبے ہوئے خزانوں کو اُنکے خزانچیوں سے دادِ محنت دیکر جھٹ پٹ اُگلوالیں کیونکہ ایسے لوگ بار بار اور ہر ایک زمانے میں پیدا نہیں ہوتے جو زمانہ ماضی کے حالات سے اِس درجہ واقفیت رکھتے ہوں)+

گنیش چوتھ کے بیان سے پیشتر یہ معلوم کر لینا ضرور ہو کہ گنیش جی کون ہیں جس کا چوتھی اگن کو خاصکر اور باقی مہینوں کی چوتھ بدی کو اکثر عورتیں اور بعض مرد برت یعنی روزہ رکھا کرتے ہیں۔ گنیش جی یا گنپتی۔ اصل میں شیوجی باپ اور پاربتی ماں کے بیٹے ہیں جو ہندوؤں میں دانائی کے دیوتا اور بہت بڑے مشکل کشا مانے جاتے ہیں چنانچہ اِسیوجہ سے کوئی مشکل کام شروع کرتے وقت اُسکے انجام پر پہنچا دینے کی غرض سے اول گنیش جی کا نام لیتے ہیں۔ آپ کا حلیہ اِس طرح بیان کیا جاتا ہے۔ قد چھوٹا جسم

نہایت موٹا۔ اور سر ہاتھی کا ہے۔ سواری چوہے کی مانی گئی ہے۔ تمام رسموں اور تہواروں کے شروع میں اول انکی پوجا کی جاتی ہے۔ اس پوجا میں جو چیزیں چڑھائی جاتی ہیں اُن میں سے بعض آرتی سے ظاہر ہوتی ہیں اور بعض کا اپنے موقع پر بیان آئیگا۔

آرتی

جے گنیش جی جے گنیش جی جے گنیش دیوا ماتا واکی پاربتی پتا مہادیوا

پان چڑھے پھول چڑھے اور چڑھے میوا لڈوؤں کا بھوگ لگے سپھل تیری سیوا

پس گنیش چوتھ ایک ہندی تہوار ہے جو اگن مہینے کی چوتھی بدی کی اندھیری پاکھ میں خاصکر اور ہر مہینے کی پہلی چوتھ کو اُن کا برت عام طور پر رکھا جاتا ہے۔ گنیش جی کے نام پر آج کے دن اکثر عورتیں اور کمتر مرد روزہ رکھتے ہیں۔ روزہ چاند دیکھنے گنیش پوجا کرنے اور چندرماں کو ارگ دینے کے بعد یعنی پہر رات گئے کھولا جاتا ہے۔ انکی پوجا میں دوب گھاس کے چند پتے۔ چاولوں کے چند دانے۔ کچھ پھول جنپر چندن چھڑکا ہوا ہوتا ہے۔ رکھے جاتے ہیں۔ اس برت کو کھولکر چورما یعنی مالیدہ اور پوریاں اکثر کھاتے ہیں۔ لیکن اور چیزوں کے کھانے کی بھی کچھ ممانعت نہیں ہے۔

اس وقت برہمنی ایک بڑھیا اور اُسکے بچے کی کہانی سُناتی ہے جس سے اس برت کے پھل ظاہر ہوتے اور مشکل حل ہونے کا ثبوت دیا جاتا ہے۔ اس تہوار اور اس برت کو عورتیں سب سے زیادہ مانتی ہیں چنانچہ اُن کا قول ہے ؎

چوتھ کروں گی برت گنیش جو کاتوں تو ہوے کلیش

یعنی گنیش چوتھ کا برت ضرور رکھوں گی۔ اگر نہ رکھوں گی اور چرخہ کاتوں گی تو ضرور کوئی نہ کوئی مصیبت آئیگی۔

یہاں تک تو ہم نے گنیش چوتھ کا ذکر لکھا۔ اب ہم اس کہانی کو جو اس موقع پر سُنائی جاتی ہے خاص اُن ہی کی زبان میں لکھتے ہیں۔ اگرچہ ہم کہیں کہیں مشکل الفاظ کے معنی خطوط وحدانی میں

لکھینگے۔ لیکن اِس امر کا خیال رہے کہ ہندنیاں یعنی ہندو عورتیں کاف بیان کی بجائے اگ بفتح الف و کاف تازی ساکن بالالتزام زبان پر لاتی ہیں۔

کہانی

ایک بوڈھیا تھی۔ اُس بوڈھیا کے ایک بیٹا تھا۔ سو بہت گریب (غریب) تھے اگ اُنکو کھانے کو بھی موسر (میسر) نہیں تھا۔ سو وہ بوڈھیا اپنے بیٹے کے روجگا (روزگار) کیو اسطے گنیش چوتھ کا برت کیا کرے تھی۔ اور چورما پوری کھایا کرے تھی ایک وچھے (دفعہ) بوڈھیا کی پروسنوں نے بوڈھیا کے بیٹے کو بہکا دیا "اگ تیری ماں گنیش چوتھ کا برت کیا کرے ہی۔ گُنکٹ[۱] (غٹک) چوتھ کیا کرے ہی۔ سو بوڈھیا کے بیٹے نے اپنی ماں سے کہا۔ اری ما! میں تو گانوں جاؤنگا۔ کچھ روجگار کرونگا۔ بوڈھیا نے کہا ارے بیٹا! گانو جاکے کیا کریگا۔ اور کیوں جاوے ہی۔ یہیں کچھ روجگار جو تیرے سے بن سکے سو کرلے۔ باہر گانو میں جاکے کیا لیگا۔ اور رونے لگی۔ پھیر کہا اگ گانو میں اپنا کون ہی۔ جسکے پا (پاس) چلا جاویگا۔ وہی کہاوت ہی "پردیس پرایا۔ ماں ما کا جایا" سو تو کہیں مت جا۔ جد (جب) بیٹے نے کہا اری ما! تو گنیش چوتھ کا برت کیا کرے ہی جو تو گنٹک چوتھ کرے ہی۔ بوڈھیا نے کہا ارے بھائی تجھے کسی کمبکھت (کم بخت) نے بہکا دیا ہے۔ اب کے برت کو تو بھی کھاکے دیکھ لیجو۔ اگ میں کیا گنٹک چوتھ کیا کروں ہوں ایسے کیا میں رسیرے (حلوے) سُہال کرکے کھالیا کروں ہوں۔ بوڈھیا کے بیٹے نے کہا "نہیں کچھ ہی ہو میں تو پردیس ہی جاؤنگا" جد بوڈھیا نے دیکھا اگ یہ نہیں مانتا۔ جاوے ہی گا تو تھوڑے سے جو اور چاول جو گنیش جی کی پوجا کے گنیش جی کے اوپر چڑھے (چڑھے) ہوئے رکھے تھے۔ اپنے بیٹے کے پلے میں باندھ دیئے اور کہا یہ

---

[۱] غٹک چوتھ خورندم چرندم کے روزے سے مراد ہے۔ یعنی ایسا روزہ رکھتی ہے جس میں مزے مزے کی چیزیں یعنی حلوا پوریاں وغیرہ کھانے میں آئیں ۱۲

تو لے جا۔ جہاں کہیں رستے میں تجھے کچھ کسی طرح یوں (طرح) کی مشکل پڑے تو اس میں سے تھوڑے جو اور چاول گا ڈھ کے (نکال کے) آگے گیر (ڈال) دیجیو۔ وہ مشکل اسان (آسان) ہو جائیگی۔ یہ سن کر بوڑھیا کا بیٹا چلا گیا +

ایک دن بڈھیا کا بیٹا چلا جاوے تھا تو دیکھا اک بھیڑ بہت جمع ہو رستہ بند ہے۔ بڈھیا کے بیٹے نے کسی سے پوچھا اک بھئی رُکے کیوں کھڈے (کھڑے) ہو۔ آگے کیوں نہیں چلتے۔ اُسنے کہا یہ دروجا (دروازہ) گراؤ ہو رہا ہے۔ اس واسطے آگے نہیں چلتے بڈھیا کے بیٹے نے جھٹ اپنے دوپٹے کے پلّے سے جو اور چاول کول (کھول) تھوڑے سے آگے ڈال دیئے تو وہ دروجا گرنے سے تھم گیا۔ اِدھر کے لوگ اُدھر چلے گئے۔ اُدھر کے لوگ اِدھر چلے آئے +

پھر ایک دن بڈھیا کے بیٹے نے دیکھا اک آگے سیر دھاڑ رہا (شیر دھاڑ رہا ہے) سارے مسا پھر (مسافر) کھڈے (کھڑے) ہیں۔ رستہ بند ہو رہا ہے۔ بڈھیا کے بیٹے نے وہاں بھی جو اور چاول گیر دیئے۔ سیر جو تھا سو پرے کو چلا گیا۔ اُدھر کے لوگ اِدھر اور اِدھر کے اُدھر چلے گئے +

پھیر آگے جا کے بڈھیا کے بیٹے نے دیکھا اک ندی بہت چڈھ (چڑھ) رہی ہے نہ ناؤ لگے ہے نہ بیڑا لگے ہے۔ یہ دیکھکر بڈھیا کے بیٹے نے جو اور چاول واں (وہاں) بھی گیر دیئے۔ سو ہی ندی اُتر گئی۔ گھٹنوں گھٹنوں پانی رہ (رہ) گیا۔ اِدھر کی دنیا اُدھر ہو گئی اور اُدھر کی دنیا اِدھر ہو گئی +

پھیر بڈھیا کا بیٹا ایک نگری میں گیا۔ تو واں (وہاں) کیا دیکھے ہے۔ اک ایک بڈھیا کڑھائی چڈھا (چڑھا) کے **گلگلے** کر رہی ہے اور رو رہی (رہی) ہے۔ بڈھیا کے بیٹے نے اُس نگری والی بڈھیا کے پا (پاس) جا کے پوچھا "اری مائی یہ کیا بات ہے۔ اک تو گلگلے کرتی جائے۔ اور روتی جائے"۔ اُس نگری والی بڈھیا نے کہا اک بیٹا میری بپتا (مصیبت)

کچھ مت پوچھے۔ پہلی بڈھیا کے بیٹے نے کہا "مجھے بتا تو سی (سہی) اک تو کیوں روئے
ہے"۔ اِس نگری والی بڈھیا نے کہا۔ اک بیٹا گلگلے تو اِسواسطے کروں ہُوں اک میرے بیٹے
نے کہا ہی۔ آج میں گلگلے ہی کھاؤں گا۔ اور رووں اسواسطے ہُوں اک اِس نگری کے راجہ کے
ہاں برسویں دن آوا چڈھا (چڑھا) کرے ہی۔ اور ایک آدمی اُس آوے کے بیچمیں بٹھا کے
آگ دیدیا کریں ہیں۔ سو آج میرے بیٹے کی باری ہے وہ آوے میں بٹھایا جاویگا۔ پہلی
بڈھیا کے بیٹے نے کہا۔ ری مائی "آج تو مجھے پیٹ بھر کے گلگلے کھلا دیجو"۔ میں تیرے
بیٹے کے بدلے، راجہ کے آوے میں بیٹھنے چلا جاؤنگا۔ تو کے (کہہ) دیجو اک میرا بیٹا یہی ہے
اِس نگری والی بڈھیا نے کہا "ناں رے بھائی۔ کون کسی کی آئی گیا ہی جو تو جاویگا۔ آ بیٹھ جا
گلگلے تو جتنے چئیں (چاہییں) پیٹ بھر کے تو کھالے۔ پر میں تجھے تو نہیں بھیجنے کی ہوں"
پہلی بڈھیا کے بیٹے نے کہا "اری نہیں ری بوڈھی مائی۔ گلگلے کھاکے میں سوؤنگا۔ میں
ہارا تھکا بڑی دور سے چلا آؤں ہُوں۔ جب راجہ کے سپاہی تیرے بیٹے کے لینے کو آویں تو
تو مجھے جگا دیجو۔ میں اُنکے ساتھ چلا جاؤنگا"۔ سو پہلی بڈھیا کا بیٹا گلگلے کھا کے سو رہا۔ اور
اُس نگری والی کا بیٹا جد (جب) آیا تو وہ بھی گلگلے کھاکے سو رہا۔ آدھی رات کے بکھت
(وقت) بڈھیا اُٹھ کے اِدھر اُدھر کھٹکا کرنے لگی۔ کیوں؟ اک پرائے بیٹے کو کیونکر جگاؤں
کھٹکے سے آپ ہی جاگ اُٹھے تو ناں جانو (شاید) چلا جائے۔ سو پہلی بڈھیا کا بیٹا جاگ
اُٹھا۔ اور راجہ کے سپاہیوں کے ساتھ چلا گیا۔ راجہ کے سپاہیوں نے پہلی بڈھیا کے
بیٹے کو آوے میں بٹھا دیا۔ اور اوپر سے ایندھن دھر کے آوے میں آگ لگا دی۔ پہلی
بڈھیا کے بیٹے نے اپنے چاروں طرپھ (طرف) جو اور چاول بکھیر دئیے اور رامجی سے
دھیان لگائے بیٹھا ریا (رہا)۔ اِس بکھت بوقت سنکٹا ماتا[1] پہلی بڈھیا کی بیٹی پاس آئی
اور اُسکے اوپر اپنا ہاتھ پھیر گئی۔ اور کھانا پانی دے گئی اور کہہ گئی اک تیری ماں تیرے

[1] سنکٹا ماتا۔ نصیب کی دیوی۔ مجازاً مصیبت دور کرنے والی دیوی۔ مشکل حل کرنے والی دیوی ۱۲

دِھیاوَنے مناوَنے کیواسطے گنیش چوتھ کا برت کیا کرے ہے۔ سو میں تیرے اوپر تُشٹ وان ہوکے تیری سہائی (مدد) کرنے آئی ہوں۔ اور روج (روز) دونوں بکھت (وقت) آیا کرونگی۔ کھانے کو لو سپانی دے جایا کرونگی۔ تو کسی طریوں (طرح) ڈر یو گھبرایو مت پہلی بڈھیا کے بیٹے نے سنکٹا ماتا کے پیرن میں اپنا سر دیا۔ اور دونوں ہاتھ جوڑے۔ سنکٹا ماتا چلی گئی۔ اِسی طرح روج رنج (روز روز) دونوں بکھت (وقت) پہلی بڈھیا کے بیٹے پا (پاس) آیا کرتی۔ کھانے کو اور پانی دیجایا کرتی۔ جَو اور چاول جو پہلی بڈھیا کے بیٹے نے اپنے چاروں طرپھ (طرف) بکھیر دیئے تھے۔ سو وہ سارے کے سارے اُبیا (اُگ آئے) اور ہرے ہو گئے۔ اور سارے آوے میں آگ دوڑ گئی۔ پر پہلی بڈھیا کا بیٹا آرام سے ٹھنڈک میں بیٹھا رہا۔ اُسکو آنچ کی جرا (ذرا) گرمی بھی نہیں لگی +

تین چار دن پیچھے راجہ کے آدمیوں نے جو جا کے آوے کو دیکھا تو جانا اک آوا پک کے تیار ہو گیا۔ راجہ کے آدمیوں نے راجہ سے جا کے کہا اک مہاراج راج کلج بُڈھے (بڈھے) مہاراج ہماری جان ہمکو بکسو (بخشو) تو کہیں۔ مہاراج نے کہا اے بھائیو کہو۔ راجہ کے آدمیوں نے راجہ کے آگے ہاتھ جوڑ کے کیا (کہا) اک مہاراج آوا تو پک کے تیار ہو گیا۔ تو راجہ نے کیا (کہا) اے آوا تو سداں (ہمیشہ) چھ مہینے میں پکا کرے ہے۔ اب کے تین ہی دن میں کس طریوں (طرح) پک گیا۔ تم جھوٹ بولو ہو۔ راجہ کے آدمیوں نے پھیر کیا (پھر کہا) اک مہاراج دھراج تم ہمارا (ہمارا) کینا (کہنا) جھوٹ مانو تو آپ چل کے دیکھ لو جو ہم جھوٹ بولتے ہونگے تو ہم اپنا کیا پاوینگے۔ راجہ اُسی بکھت (وقت) گھوڑے پہ چڈھ (چڑھ) گیا اور آوے کے پا (پاس) جا کے کہا اک اِسکا مونہ کھولو۔ جوں راجہ کے آدمیوں نے آوے کا مونہ کھولا تو کھن کھن کر کے باسن کھڑکنے لگے اور بڈھیا کے بیٹے نے کہا ”اک ہولے سے“ بڈھیا کے بیٹے کی آواج (آواز) سُن کے راجہ کے آدمی ڈر گئے

---

[1] دِھاوَنا مناونا۔ پرستش اور بندگی سے رجھانا۔ سیوا کر کے خوش کرنا۔

مارے بھاج (بھاگ) گئے۔ راجہ نے اُنھوں سے پوچھا اک ارے تم کسواسطے بھاجے (بھاگے)۔ جب راجہ کے آدمیوں نے راجہ سے کہا اک مہاراج آوے میں تو کوئی بولے ہی "اک ہووے سے" نہ جانیں (واللہ اعلم) اِسمیں کوئی بڈبیٹھا (جا بیٹھا) ہی۔ اک کوئی دیو ہی۔ اک کوئی دانو (دیوانہ) ہے راجہ نے کہا اچھا آوے کی چاروں طرپھ (طرف) ساری پھوج (فوج) تلواریں لے کے کھڈی (کھڑی) کردو۔ پھیر آوا کھولو۔ دیکھیں ایسا کون دیو دانو ہے۔ سوئی (سوہی) راجہ کی ساری پھوج (فوج) آگئی۔ چاروں طرپھ گھیر الگھیر کے کھڈی ہوگئی اور آوے کے آدمی باسن نکالنے لگے۔ پھیر پہلی بڈھیا کے بیٹے نے کہا "ہووے سے"۔ راجہ کے آدمیوں نے پھیر راجہ سے کہا اک مہاراج اواج (آواز) پھیر آئی "اک ہووے سے"۔ راجہ نے کہا ارے تم سارے ہوسیار (ہوشیار) رو (رہو) ادھر ڈرومت نہیں۔ باسن کاڈھے جاؤ رکھاتے جاؤ۔ سو راجہ کے آدمی باسن کاڈھنے لگے۔ کاڈھتے کاڈھتے۔ دیکھیں کیا اک جسے بیٹھایا تھا وہ آلتی پالتی مارے (مارے) بیٹھا ہی۔ اور پہلی بڈھیا کے بیٹے کو دیکھا اک چاروں طرپھ جَو اور چاول ہرے ہرے اُگے کھڈے میں اور پہلی بڈھیا کے بیٹے کو جرا (ذرا) بھی آنچ نہیں لگی۔ سو ہی اُسکو آوے میں سے اُٹھا کے راجہ کے پا (پاس) لے گئے۔ راجہ نے پہلی بڈھیا کے بیٹے سے پوچھا اک یہ کیا بات ہی جو تیرے آنچ نہیں لگی اور تیرے چاروں طرپھ جَو اور چاول اُگ کھڈے ہیں یہ آوا جیٹھ کے مہینے میں پکا کرے تھا۔ اب کے تین ہی دن میں پک گیا۔ پہلی بُڈھیا کے بیٹے نے کہا۔ اک مہاراج مجھے تو اِس بات کی کچھ کھبر (خبر) نہیں میری ما مہینے کے مہینے چوتھ کے دن برت کیا کرے ہی۔ چاند دیکھ کے اور چاند کو ارگ دیکے کھانے کو کھایا کرے ہے سو مہاراج پڑوسنوں نے مجھے بہکا دیا اک تیری ما سکٹ چوتھ کیا کرے ہی۔ گُلگُ جو تھ کرے ہے سو مہاراج میں اپنے گھر سے چلا آیا ہوں۔ سو میری ما نے آتی برِیاں (دفعہ) رگھنے اور چاول جو پوجا کرکے گنیش جی کے اوپر چڈھایا کرے تھی سو میرے پلے باندھ دئیے تھے اور کہدیا تھا کہ جہاں کہیں تجھے سنکٹ (مشکل) پڑے تو اِن میں سے تھوڑے سے اپنے

آگے بکھیر دیجیو۔ سو مہاراج بستے میں ایک جنگا (جگہ) دروجہ زدروازہ گریت تھا۔ دوسری جنگا (جگہ) سیر (شیر) کے تھا تیسری جنگا (جگہ) ندی چڈھ (چڑھ) رہی تھی ان جُو اور چاولوں نے سب بچا دیا۔ پھیر (پھر) دوسری بڈھیا کا حوال (حال) کہہ کے کہا۔ مہاراج جد تھارے (جب تمھارے) لوگوں نے مجھے آوے میں بھڑکے اگ لگا دی پیچھے ایک بوڈھی مائی میرے پاس آئی۔ اور کہا اک میں سنکلا ماتا ہوں تیری ماجو مجھے وہاوے مناوے ہی سو میں تیری سہاے (مددگار) ہوں کھانے اور پینے کو دے گئی۔ اور کہہ گئی اک میں روج (روز) دونوں بکھت (وقت) تیرے پاس آیا کروں گی۔ سو مہاراج وہ روج آوے تھی۔ راجہ نے یہ ساری کہانی سُن کے پہلے بڈھیا کے بیٹے کو اپنے پاس سنگھاسن (راج گدی) کے اوپر بٹھالیا۔ اور اپنے مندر (محل) کو لے گیا۔ اور اپنی کنّیا (بیٹی) کا بواہ (بیاہ) پہلی بڈھیا کے بیٹے کے ساتھ کردیا۔ اور اپنے سارے نگر میں ڈونڈی پٹوادی "اک جو کوئی جو تھے اپنی سنکلا ماتا کا برت کریگا اور گنیش جی کی پوجا کریگا اور چاول دیکھ کے چاند کو ارگھ دیکے بھوجن کریگا۔ اسکے من اچھا (خواہش) منورتھ (مراد) پورن (پورے) ہوں گے" یعنی دلی مرادیں برآئینگی ۔۔

جد (جب) راجہ کی بیٹی بیاہی گئی تو اسنے پہلی بڈھیا کے بیٹے اپنے بھرتار (خاوند) سے کہا اک تیرے گھر کون کون ہے۔ اُسنے کہا اک میرے ایک مائی۔ اور کوئی نہیں۔ راجہ کی بیٹی نے کہا۔ اک تو اپنے گھر چل۔ اُسکے پتی (خاوند) نے کہا اک تو اپنے ماباپوں سے کہو (کہو) راجہ کی بیٹی نے کہا اک آجتک کسی بیٹی نے اپنے گھر جانے کیواسطے نہیں کہا۔ میں کیوں کہوں۔ تم کہو اک میں اپنے گھر جاؤنگا اسے بدا (وداع) کردو۔ سو پہلی بڈھیا کے بیٹے نے راجہ سے کہا اک مجھے بدا (وداع) کرو

ارگھ یا اگ یا پانی کی دھار اور چاول چاند کو چڑھانا ۔

میں اپنے جاؤنگا راجہ نے کہا اک ہم تو یہی چاہیں (چاہتے) ہیں۔ بہت اچھا۔ راجہ
نے بہت سا دان دہیج (جہیز) لونڈی۔ باندی۔ نوکر۔ چاکر دیے بدا کر دیا
پہلی بڈھیا یعنی اسکی ماں رو رو کے اندھی ہو گئی تھی۔ جد بڈھیا کا بیٹا اپنے گانو میں
پہنچا تو کسی نے جا کے اُسکی ماں سے کہا۔ ری بڈھیا تیرا بیٹا بڈی (بڑی) دُھوم سے
آیا ہے۔ بڈھیا نے کہا ارے بھائی میرا بیٹا نا جانوں (خدا جانے) کہاں گیا مجھے تم
کیوں بہکاؤ ہو۔ اتنے میں بیٹا اور بو (بہو) دونوں آ کے پیروں میں گر پڑے۔ بڈھیا
نے کہا اک میں جد جانوں اک میرا بیٹا ہے۔ "جو میری آنکھوں کے جالے کانوں کے تلے
ٹوٹ جائیں اور میرے دودھ کی سوت جاری ہو جائیں" سو اُسی دم آنکھوں کے جالے
کانوں کے تالے ٹوٹ گئے اور دودھ کی دھار نکل کے بیٹے کے مُنہ پہ پڑی۔ بہو کی
چوٹری بھیجی (اوڑھنی بھیگی) جیسی پہلی ہوئی کسی کے نا ہوئے۔ پچھلی سب کسی کے ہوئے

سید احمد دہلوی

نوٹ محققانِ زبان اُردو اِس سے بڑے بڑے نتیجے نکال سکتے اور اپنی زبان کو بہت کچھ
ہندی فصیح الفاظ سے وسعت دے سکتے ہیں۔ دہلی کے بعض خاندانوں کی گھریلو زبان ثابت کرتی ہے
کہ فارسی عربی الفاظ نے کیسی کیسی پٹیاں کھا کر ہندی زنانہ بول چال میں اپنا گھر کیا اور کس قدر
تصرف کو کام فرمایا ہے۔ اِن فقروں کا اثر دلوں پر کیسی کیسی متاثرانہ روشنی ڈالتا ہے۔ مذہبی سوم کو
کس قدر پکا اور مضبوط بناتا ہے گو یہ کہانیاں قرینِ قیاس نہ ہوں مگر جو اصول انکے ذریعے سکھائے
جاتے ہیں وہ خالی از فائدہ نہیں مگر ان میں جو کچھ جادو بھرا ہوا ہے وہ خاندان کے بچوں اور بچیوں
کو کیسا راسخ الاعتقاد بناتا ہے۔ اِن الفاظ کی قدر وہی کر سکتا ہے جسکو زبان کا چسکہ پڑا ہوا ہے۔
مسلمانوں کی رسموں میں بھی یہی باتیں پائی جاتی ہیں مگر اُن کا رنگ دوسرا ہے۔ وہ اپنے مذہب کا
پہلو لیے ہوئے ہیں اور جہاں اس پہلو کو چھوڑا ہے وہیں اپنے ہندو بھائیوں کی رسموں ہندی تحریریں
ہندی کی آب و ہوا کا ساتھ دیا ہے۔ اللہ اللہ ایک ایک لفظ اپنی تاریخی جنم پتری اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے

فرقہ بہائیہ کے داعی

فرقہ بہائیہ اور اسکے موجودہ پیشوا عبدالبہا عباس آفندی کے حال کو جن لوگوں نے دلچسپی سے پڑھا ہوگا۔ انہیں یقیناً اس امر کے دریافت کرنے کا شوق ہوگا کہ اس فرقہ کے معتقد اپنے عقائد کی اشاعت کے لیئے کن وسائل سے کام لے رہے ہیں۔ اور جو شہرت اس مذہب نے مختلف ممالک میں پیدا کی ہے وہ اسے کیونکر میسر ہوئی ہے۔ دنیا میں کبھی کسی کو اپنے مقصد میں عام اس سے کہ وہ مقصد دینی ہو یا دنیوی کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوتی جبتک وہ اپنے آپ کو اس مقصد کی خاطر قربان نہ کردے۔ جب سے اس مذہب کا آغاز ہوا ہے اُس وقت سے بہت سے لوگوں نے اپنی جانیں اس پر نثار کیں۔ بہت سے فدائیوں نے اس کی خاطر قید کی مصیبتیں جھیلیں اور بہت سے جلاوطن ہوئے۔ مگر ان سب تکالیف کو اُس دھن کے مقابلے میں جو انہیں دل سے لگ رہی تھی انہوں نے کچھ نہ سمجھا۔ اب گو وہ خطرات جو اوائل میں انہیں درپیش تھے کم ہو گئے اور اس جماعت کے سرگروہ اپنی جائے پناہ عکہ میں نسبتاً امن آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تاہم اس کام سے جو انہوں نے اپنے ذمہ لیا ہے غافل نہیں ہیں دنیا کے ہر گوشے کی تسخیر کی فکر میں ہیں۔ اور اپنے داعی اور مشنری جابجا روانہ کرتے رہتے ہیں۔ امریکا میں جو عقیدت مند اس فرقہ کو ملے ہیں وہ بھی ان ہی مشنریوں کی بدولت ملے ہیں۔ اور اب اُن امریکائی بہائیوں میں سے بعض دعوت مذہب کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رہے ہیں چنانچہ کوئی سال بھر ہوا چار آدمی اس فرقہ کی طرف سے ہندوستان میں تلقین کرنے آئے تھے۔ اُن میں دو امریکا کے رہنے والے تھے جو کئی مہینے ہندوستان میں دورہ کرکے اور چھوٹے چھوٹے رسالے اپنے مذہب کے متعلق تقسیم کر کے واپس چلے گئے ہیں۔ دو صاحب ایرانی تھے جو اب تک ہندوستان میں مقیم ہیں۔ اُن میں ایک حکیم مرزا محمود شیرازی لاہور میں مقیم ہیں۔ اُن سے ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ ایک حکیم

متین اور ذی علم شخص ہیں۔ انھوں نے اپنا طریقِ اشاعت اپنے مزاج کے موافق رکھا ہوا ہے۔ نہ کہیں وعظ کہتے ہیں نہ کسی سے مناظرہ کرتے ہیں۔ مگر چپکے چپکے برابر اپنا کام کیے جاتے ہیں۔ جہاں کسی تعلیم یافتہ یا ذہین آدمی سے ملاقات ہو گئی اُسے کچھ کتابیں یا رسالے اپنے عقائد کے متعلق دکھا دیے۔ پنجاب کے دار الحکومت میں اُنکا قیام گویا پنجاب ایک خاموش یورش ہے۔ وہاں سب اضلاع پنجاب کے چیدہ آدمی آتے رہتے ہیں۔ اور کسی نہ کسی تقریب سے اُن میں سے اکثر سے ملنے کے مواقع پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس مُلک میں رہتے رہتے کچھ اردو بھی اُنھوں نے سیکھ لی ہے۔ اور انگریزی جاننے کو یہاں کے لیے اور دیگر ممالک کے لیے مفید سمجھکر اسکی تحصیل کا بھی قصد کر رہے ہیں۔ ان کے دوسرے ایرانی رفیق حاجی مرزا محمد تقی ہیں جو اِس وقت کلکتہ میں مقیم ہیں اور کلکتہ جیسے مرکز علم و دانش کے لیئے موزوں بھی ایسا زبردست داعی ہی تھا حاجی مرزا محمد تقی کی ایک پرانی تصویر ہمیں ملی ہے جس میں وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے دو ایرانی سپاہیوں کے پہرے میں نظر آتے ہیں۔ اسکی کیفیت یہ ہے کہ بہائی طریق اختیار کرنے سے پہلے حاجی صاحب ایران کے طبقۂ علماء میں تھے۔ جب انھوں نے علانیہ طور پر اپنے عقیدے کے بدلنے کا اقرار کیا تو حکومت کی طرف سے گرفتار کیے گئے یہ اُفتاد پڑی تھی۔ مگر زندان اُنکے جوش میں کچھ کمی پیدا نہیں کر سکا۔ بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ سرگرم اور مستعد ہو کر نکلے اور اُس وقت سے برابر اپنے مرشد اور اپنے مذہب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ یہ ایثار۔ یہ بے غرضانہ جاں نثاری۔ یہ مذہب کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑ کر غیر ملکوں میں رہنا اور مذہب کی اشاعت کرنا۔ ایسے افعال ہیں کہ بے اختیار اُن لوگوں کی ہمت۔ محنت اور عقیدت کی داد دینی پڑتی ہے جو اپنی زندگی اس طرح وقف کر دیتے ہیں۔ خواہ اُن کے مذہب سے ہمیں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔

فرقۂ بہائیہ کے داعیوں نے امریکا اور ہندوستان میں جو لٹریچر تقسیم کیا ہے

اور کئی برس تک [illegible]

اُس سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ اِس مذہب سے زیادہ صلح پسند مذہب کوئی مشکل سے ہوگا۔ مگر ایران میں اِس مذہب کی تاریخ اِس کے خلاف شہادت دیتی ہی۔ ہر چند کہ اِس مذہب کے ساتھ سختیاں کی گئیں۔ لیکن اسکے بعض معتقدین نے دوسروں پر حملہ کرنے میں یا انکی دل آزاری میں کوتاہی نہیں کی۔ اُن ممالک میں جہاں نئے خیالات اور نئے علوم کی روشنی پھیل رہی ہی۔ اِن داعیوں کا بالکل صلح جو طریق اختیار کرنا اور اِس امر کا اعلان کرنا کہ اُن کے مذہب کا مقصد اصلی اتحادِ مذاہب ہے اور ہر عقیدے کے آدمی اِس برادری میں جو بہاء اللہ نے قائم کی ہی شامل ہو سکتے ہیں محض انکی زمانہ شناسی پر دلالت کرتا ہی۔ اسمیں شک نہیں کہ مہذب دنیا کا میلان روز بروز اِس خیال کیطرف ہوتا جاتا ہے۔ کہ اختلافاتِ مذاہب اگر مٹ نہ سکیں تو فروضرور کیے جائیں۔ ہر شخص دوسرے مذہب کی تعظیم کرے اور اِس بات کو تسلیم کرے کہ سب ادیان جوہر حق سے آراستہ ہیں فرق صرف طریق کا ہی کہ اُس منزلِ مقصود تک جو سب ادیان میں مشترکہ ہی کیونکر پہنچیں۔ اور اِس لیئے جس کسی کو جس راستے پر چلنے میں آسانی ہو وہ اُس راستے کو اختیار کرے اور دوسرا اُس سے تعرض نہ کرے۔ اور عجب نہیں کہ ایکدن ایسا آئے جب یہ خیال سب اقوام متمدنہ میں عام ہو جائے۔ وہ دن جب کبھی آئیگا بنی نوع انسان کے لیئے خوشی کا موجب ہوگا۔ اِس خیال کی اشاعت میں اگر بہائی استقلال کے ساتھ مصروف رہے تو وہ بھی مہذب دنیا کے شکریہ کے بحصہ رسدی مستحق ہوں گے کیونکہ اُن کے سوا اور اُن سے پہلے اِس خیال کے پھیلانے والے دنیا میں ہو چکے ہیں۔ اور اب تک موجود ہیں۔ مشرقی دنیا میں اہل تصوف و یدانت سب سے بڑھکر داد کے مستحق ہونگے۔ کیونکہ انہوں نے اِس خیال کی اشاعت ایسے زمانے میں کی جب لوگ اِس سے بالکل ناواقف تھے۔ آج کل جو لوگ اِس فکر میں ہیں اُنہیں مادہ تیار ملتا ہے۔ اور اُن کے پیشرووں کی کوششیں انسانی طبیعتوں کو

اس رائے کے قبول کرنے پر پہلے سے آمادہ کر چکی ہیں موجودہ زمانے میں جو
قومیں اس سعی میں مصروف ہیں اُن میں تھیوصوفی خصوصیت سے قابل ذکر ہے
بہائی جتنا حصہ اپنے مذہب کا اسوقت اہل ہند کے روبرو پیش کر رہے ہیں اُس میں
اور تھیوصوفی میں کچھ بڑا فرق نہیں لیکن جو ایسے مسائل اُنکے ہاں موجود ہیں
جن کے سُننے سے اُنہیں ڈر ہے کہ عام مسلمان برہم ہوں گے اُن کو درمیان نہیں لاتے +

عبد القادر

ریویو

رُسوم دہلی متعلقہ مسلمانان

مصنفہ مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ

مولوی سید احمد صاحب کو فرہنگ آصفیہ کی تصنیف نے اپنی اردو زبان کی زباندانی میں لاثانی
ہونے کی سند دیدی ہے اور سلسلے ہندوستان میں انکا نام روشن کر رکھا ہے۔ واقعی آج
تک ایسی فرہنگ تصنیف نہیں ہوئی اور شاید مدت تک تصنیف نہیں ہوگی کہ اس میں پچپن ۵۵
ہزار سے بھی زیادہ لغات و محاورات وغیرہ مع اسناد کے تفصیل و بسط سے بیان کیے گئے ہوں
پس مصنف نے جیسی یہ فرہنگ جو کل اُردو ہندی لغات پر محیط ہے تصنیف کی ہے ایسی ہی یہ "رُسوم دہلی"
لکھی ہے کہ وہ مسلمانوں کے ہر فرقہ اونے متوسط اعلیٰ کے مراسم جدید و قدیم اور متروک و مروج پر حاوی ہے۔
اسکے بیان میں کوئی بات فروگزاشت نہیں کی اور فضول بات نہیں لکھی۔ خاندان تیموریہ کی بعض مراسم
جو بالکل فراموش ہونیکو تھیں انکو اس کتاب میں مصنف نے محفوظ کر دیا ہے۔ یہ انہیں کا کام تھا دوسرا نہیں
کر سکتا تھا +

ہر رسم مسلمانوں میں اسلیئے مقرر کیگئی ہے کہ وہ آپس میں شادی و غمی میں مِل جُلکر شادی کو بڑھائیں
اور غم کو گھٹائیں۔ پس ان کا بیان بھی مصنف نے اس کتاب میں مسرت افزا اور غم زدا لکھا ہے۔
عموماً دونوں۔ عورتوں اور مردوں کو اسکے پڑھنے سے خوشی حاصل ہوگی اور غم غلط ہوگا۔ اور دانشمند بھی
اسکو پڑھکر یہ تمیز کر سکیں گے کہ ان مراسم میں سے کون سی اس زمانہ میں ایسی ہیں کہ ان کا کرنا حماقت
میں داخل ہے اور کونسی ایسی ہیں کہ جن کا رکھنا فراست میں داخل ہے۔ اس کتاب میں تاریخ اور افسانہ دونوں کی تفریح
موجود ہے۔ ایک دلچسپ تماشا اسمیں نظر آتا ہے کہ ان مراسم میں احمق اور عاقل دونوں آپسمیں مساوی ہو جاتے ہیں
مجھے یقین ہے کہ خواندہ مسلمان اس کتاب کو اپنے گھر میں رکھکر اسکے مطالعہ سے اپنی بیوی بچوں کا دل خوش
کرینگے + ۳۰۔ مارچ ۱۹۰۸ء خان بہادر شمس العلما منشی محمد ذکاء اللہ صاحب دہلوی

عروسِ شاعری

پروفیسر شہباز مخزن کے اولین معاونوں میں ہیں۔ ایک عرصے سے بعض مجبوریوں سے فکرِ سخن کے لیے وقت نہیں نکال سکے۔ ہم ممنون ہیں کہ باوجود کثرتِ مشاغل کے انھوں نے مخزن کو فراموش نہیں کیا اور یہ دلچسپ نظم عنایت کی:-

اے عروسِ شاعری کچھ عرض کرتا میں بھی ہوں
مہر کا سا سر پہ بارِ قرض رکھتا میں بھی ہوں

گو نہیں با ضابطہ میرا ہوا تجھ سے نکاح
پر تو منکوحہ تو ہے از روئے قانونِ صلح

یہ نہیں کہتا دلِ راضی سے شرمندہ نہ ہو
پر جو عاشق ہو کبھی قاضی سے شرمندہ نہ ہو

میں نے تیرے واسطے کوئی غزل لکھی نہیں
ہجو میں غیروں کی بھی کوئی غزل لکھی نہیں

منہ سے کر دیتا تو ہوں ابرو پہ تیرے سر نثار
کب کیے لیکن قصیدے ہو کے مدح گوہر نثار

تیرے عاشق ہیں ہزاروں میں بھی اک عاشق سہی
میں ہی اک کاذب سہی سب عاشقِ صادق سہی

عشق تو کچھ دل میں جیسے داغ لالے کا سا ہے
یہ تعلق تو اندھیرے اور اُجالے کا سا ہے

مجھ سے بہتر ہیں تو میری تجھکو کچھ پروا نہ ہو
تجھ سے بہتر ہیں تو تیری مجھکو کچھ پروا نہ ہو

عاشقوں میں بات یہ کیا قابلِ حیرت نہیں
تو کہیں جائے مجھے اسکی ذرا غیرت نہیں

چاہتا ہوں تیرے یاروں کا جتھا بڑھتا رہے
کوئی پنڈت ہو کہیں تیری کتھا پڑھتا رہے

میں نہیں یہ چاہتا تو میری ہی ہو کر رہے
صرف یہ ہوں چاہتا جو ہو تری ہو کر رہے

وضع میں جدت ہو تیری خوش لباسی کم نہ ہو
تازگی میں ہار تیرے گو ہو باسی کم نہ ہو

نو بنو ہوں ناز تیرے اور غمزے نو بنو
عشوے تیرے نو بنو ہوں اور کرشمے نو بنو

داغِ دامن جس طرح ممکن ہو دھویا چاہیے
ایشیا میں تجھکو یورپ کو ہویا چاہیے

یہ زمانہ ہے نیا تو ہر جگہ درکار ہے
اپنی عزت آپ کر اونچی تری سرکار ہے

ماتمِ آرزو

ای دلِ مُردہ! کہاں اب روزگارِ آرزو
نا اُمیدی کر چکی کب کا فشارِ آرزو

ہائے! وہ دل جسمیں اُمیدوں کی تھی بزمِ نشاط
اُسمیں ہے اک آہ! چھوٹا سا مزارِ آرزو

مِٹ نہ جانا۔ تجھکو میری نااُمیدی کی قسم!
اے جگر کے داغ! ہے تو یادگارِ آرزو

چارہ گر! دستِ تسلّی میرے سینے پہ رکھ
آہ! اس منقل میں پنہاں ہیں شرارِ آرزو

اب کہاں بزمِ تمنّا۔ اے دلِ خمیازہ کش!
میں ہوں۔ تو ہے۔ اور تکلیفِ خمارِ آرزو

ناتواں ہے۔ یہ نہ جائے ہوکے خونابِ جگر
لے نہ چُٹکی دل میں دردِ انتظارِ آرزو

کب سے تیرے منتظر داغِ جگر کے پھول ہیں
تو کہاں ہے؟ آہ! اے طاقِ مزارِ آرزو

حسرتِ مردہ کے غم میں ہائے ہے اے غمگسار!
مر مِٹا کیا تو بھی شوقِ بیقرارِ آرزو

خانہ زارِ یاس و حرماں آہ! اب پہلو میں ہے
دل کہ تھا اک باغِ نیرنگِ بہارِ آرزو

ہائے! وہ راتیں مرادوں کی اُمنگوں کے وہ دن
ہائے! وہ تسکیں فزا لیل و نہارِ آرزو

ہلکا ہلکا ہائے! وہ جامِ تمنّا کا سُرور
ہائے! وہ ذوقِ شرابِ خوشگوارِ آرزو

چارہ گر! سینے پہ رکھکر دیکھتا ہے ہاتھ کیا
دل تڑپتا ہے پڑا۔ زیرِ مزارِ آرزو

بیکسی! بزمِ نشاطِ دلمیں کیا رکھا ہے اب
جمع ہے کچھ گردِ حسرت کچھ غبارِ آرزو

میرے پہلو میں تڑپتا ہے جگر بھی دل کے ساتھ
آہ! یہ بھی ہے شہیدِ انتظارِ آرزو

آج وہ بھی مِٹ گیا۔ لو ہو گیا قصہ تمام
داغِ حسرت دلمیں تھا اک یادگارِ آرزو

کیا خبر تھی ایک دن مجھسے جُدا ہو جائیگا
تیرا آغوشِ تمنّا اے کنارِ [illegible]

دل کی کشتی تیری موجوں میں بہی جاتی ہے ہائے!
آہ! سیلِ گریۂ بے اختیارِ آرزو

چلدیا پامال کرکے آہ! دل کو تو کہاں
اے سمندِ ہستیٔ ناپائدار آرزو

آرہی ہے بیکسی کی آہ! پُتلے سے صدا
راکھ میں میری ہے اب بھی کچھ شرارِ آرزو

سو جگہ سے چاک ہے کب تک کریگا تو رفو | اے رفوگر! دامنِ صبر و قرارِ آرزو

ہے دلِ مُردہ کی تربت بھی یہیں اے بیکسی! | جس جگہ ہے میرے پہلو میں مزارِ آرزو

ایسا ٹوٹا ہے یہ کانٹا کہ لے دستِ جنوں | مرتے مرتے بھی نہ نکلا دل سے خارِ آرزو

اے رفیقِ صحبتِ دیرینہ بزمِ نشاط | دل میں آجا! اے خیالِ غمگسارِ آرزو

تجھکو بھی رونا پڑیگا ایک دن اے بیکسی | تو ہی تُو نہیں جو چندے سوگوارِ آرزو

سُرور جہان آبادی

مرحومہ کی یاد میں

جادو بیان ٹامس مور کی ایک چھوٹی سی نظم کا جو کسی محبوبہ مرحومہ کی بے چین کرنے والی یاد میں لکھی گئی ہے ہم انھیں الفاظ اور اُسی تخیل میں ترجمہ کرتے ہیں۔ اور اس ترجمہ کو ہم اردو ادب کے فاضلوں کی خدمت میں نہیں بلکہ اُن سوگواروں اور مصیبت کے ماروں کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جنکو قسمت نے کوئی ایسا ہی صدمہ پہنچا کر ہمیشہ کے لیے مغموم کر دیا ہے اور جنکے دل و دماغ ایسے پُرغم تخیل میں شریک ہونے کیلئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ہاں اُنہی کی خدمت میں یہ نظم پیش کیجاتی ہے اور وہی مصنف کے پاک خیالات اور مترجم کے پُرغم جذبات کی قدر کر سکتے ہیں:- (نادر)

رات کے پچھلے پہر روتی ہیں جب چشمِ نجوم | اُلفتِ دیرینہ کی وادی میں اُڑ جاتا ہوں میں

اور اُس وادی میں مرحومہ! جو یاد آتی ہو تم | محو ہو جاتا ہوں کچھ ایسا مزا پاتا ہوں میں

وہ مکاں وہ قصر وہ تم وہ تمھاری حسرتیں | وہ گلے وہ عذر وہ گزری ہوئی دلچسپیاں

دیر تک کرتا ہوں میں یاد آہ! اُن ایام کو | ہائے وہ راتیں کہاں وہ دن کہاں وہ تم کہاں

اُس سکوت اُس محویت میں پھر یہ آتا ہے خیال ق روحیں منڈلاتی ہیں گر اوجِ فضائے عرش پر
اور جھپکر آتی ہیں اس خاکدانِ عشق میں تاکہ دیرینہ علائق دیکھ لیں پھر اک نظر

شاید آ جائے تمہاری روح بھی اور یہ کہے کیا بتلاؤں جنت الماویٰ میں میں کیسی رہی
اس جدائی میں رہا میرا تمہارا ایک حال تم یہاں روتے رہے اور میں وہاں روتی رہی

پھر سراپا شوق ہو کر وہ غزل گاتا ہوں میں تم جو تنہائی میں چپکے چپکے گاتی تھیں کبھی
گونج کر جب نغمہ ٹکراتا ہے تو کہتا ہوں میں یہ تمہاری روحِ مضطر آ رہی ہے گاتی ہوئی

یہ لب و لہجہ وہی ہے یہ سُریلا پن وہی لیکن اب اس میں تو کچھ کچھ ضعف کا انداز ہے
اور پھر کچھ سوچ کر پہچان کر کہتا ہوں میں یہ وہی آواز ہے بیشک وہی آواز ہے

نادر علیخاں نادر کاکوروی

بلبلِ اسیر

اک بلبلِ اسیر کے نالے سُنے جو کل غم سے خیال میرے تو آنسو نکل پڑے
رو رو کے کہہ رہی تھی قفس میں کہ ہائے ہائے یاری نہ کی نصیب نے مجھ بدنصیب سے
کہتی تھی بار بار تڑپ کر کہ اگلے سال افسوس قید ہی میں کٹے دن بہار کے
لیکن خدا نے چاہا تو اب کے برس ضرور لوٹوں گی پھر بہار کی میں لذتیں مزے
یہ غم ہے عارضی یہ مصیبت ہے چند روز ہوگا چمن وہی وہی پھر ہونگے چہچہے
صحنِ چمن میں اڑتی پھرونگی ادھر ادھر ہونگے ترقیوں پہ مرے دل کے حوصلے
لیکن مزا ملا یہ خیالی پلاؤ کا صیاد سنگدل نے مرے پر کتر دیے

آئی بھی۔ اور چلی بھی گئی فصلِ گل مگر
تقدیر نے نکل نہ سکے دل کے حوصلے

سر پھوڑ کر قفس سے نہ مرجاؤں کس لیے
اک بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے

سید شمس الحق خیال

حرص دُنیا

کریگا حرص کے بندے کہانتک حرص دنیا کی
کوئی حد بھی ہے آخر طمع کی تحسین بیجا کی

ذرا تو غور کر تو کیا ہے تیری اصلیت کیا ہے
دماغ عرش معلےٰ پر ہے تیرا کس سیخا کی

تری قسمت کا جو کچھ ہے بہرصورت وہ تیرا ہے
اُٹھا زحمت نہ ہرگز جستجو نے روح فرسا کی

سعی خیر سے جو کچھ ملے اُس پر قناعت کر
نہ رکھ تدبیر پہ تہمت نہ ہو تقدیر کا شاکی

نہ بیش از وقت و بیش از بخت کچھ حاصل تجھے ہوگا
اُڑائے خاک ہر جتنی اُڑانی کوہ و صحرا کی

دغا سے جھوٹ سے کر حیلہ سے جعلسازی سے
پرایا مال لینے میں یہ حکمت ہو چالاکی

فنا کا جام پینا ہے فقط دو روز جینا ہے
اسی ہستی پہ عیاری ہو مکاری ہو سفاکی

خدا سے مانگ جو کچھ مانگنا ہے التجا کر کے
نہ لے احسان اپنوں کا خوشامد کر نہ اعدا کی

وہ چاہے فقر و فاقہ ہو ترا دم کیوں جاتا ہے
بلا تیری اُٹھائے علم حاتم کی مسیحا کی

لگا ئے گا کہاں تک نعرۂ ھل من مزید آخر
چلی جائیگی یوں ہی تا کجا تیری ہوسناکی

خزانہ کچھ نہ آیا کام قاروں سے تونگر کا
گیا دنیا سے جسدم ہاتھ خالی تھا سکندر کا

سوا ہر وقت حرص و آز کا جن تیرے اوپر ہے
نہ ہے کچھ شرم دنیا کی نہ عقبےٰ کا تجھے ڈر ہے

تجھے حاصل ہیں سب سامان راحت کے زمانے میں
خوشی ہے عیش ہے آرام ہے زر ہے جواہر ہے

اگر مٹی میں تو نے ہاتھ ڈالا بن گئی سونا
خدا سید ہا ہے رتّی سامنے ہر بخت یاور ہے

مہم جو پیش آئی تجھکو وہ سر ہو گئی فوراً
نصیبا تیز ہے طالع میں تیرے سعد اکبر ہے

حسیں پہلو میں تیرے اور تو ہی بزم عشرت میں | مئے گلرنگ ساغر میں ہی اور گردش میں ساغر ہے
ارسطو علم و حکمت میں ہی رستم زور و طاقت میں | اگر حشمت میں دارا ہی تو شوکت میں سکندر ہے
تجھے گر مجمع خوبی کہیں بیجا نہیں ہوگا | زمانے بھر سے تو افضل ہی برتر اور بہتر ہے
زر و گوہر دیا جی کھول کے جسکو دیا تو نے | ہی دامن۔ دامن وسیلہ در دولت ترا در ہے
کرے گا کوئی تیری ہمسری یہ کس میں جرأت ہے | ذرا میدان میں آئے اگر کوئی دلاور ہے
اب اس سے بڑھ کے ہوگا اور کیا حاصل خدائی میں | خدا کے فضل سے جو چاہیئے سب کچھ میسر ہے

مگر بااینہمہ ہیں روز افزوں خواہشیں تیری
نکالے سے نکل سکتی نہیں ہیں حسرتیں تیری

کہاں تک تجھکو دلچسپی رہیگی زیب و زینت سے | کہاں تک دل نہ اُکتائیگا تیرا عیش و عشرت سے
کہاں تک پاؤں پھیلائے رہیگا دار فنائی میں | کہاں تک منہ چھپائے جائیگا تو جام رحلت سے
کہاں تک گور تنہائی سے تو پہلو بچائے گا | کہاں تک دن گزارے جائیگا یوں شان و شوکت سے
کہاں تک تو رہیگا مبتلا دنیا کے دھندوں میں | کہاں تک یوں رہیگا بے خبر روز قیامت سے
کہاں تک گنج قاروں سے بھریگا اپنے تہ خانے | کہاں تک دل نہوگا سیر تیرا مال و دولت سے
کہاں تک ہستی موہوم پر اترائے جائے گا | کہاں تک باز آئیگا نہ تو کبر و رعونت سے
کہاں تک راہ میں اپنے بچھائے جائیگا کانٹے | کہاں تک یہ خلش دلمیں رہیگی خار حسرت سے
بڑھی ہیں خواہشیں جوں جوں بڑا ہی مرتبہ تیرا | ملا جتنا تجھے نکلا وہ کم تیری ضرورت سے
خدا نے گو تجھے سارے جہاں کی نعمتیں بخشیں | مگر اسپر بھی وہ کافی نہ نکلیں تیری قسمت سے
ملا جو تجھکو وہ کچھ پھل نہ تھا تدبیر و دانش کا | خدا نے جو دیا بیشک دیا وہ اپنی رحمت سے

بجا لایا نہ لیکن شکر تو رزاق مطلق کا
کیا کفران نعمت عمر بھر ناشکر ناحق کا

نمونہ باغ جنت کا ہے قصر دلکشا تیرا | جواب جام جم ہے ساغر فرحت فزا تیرا

حسینوں میں بسر ہوتی ہے تیری عیش و عشرت — لیے رہتے ہیں دل ہاتھوں میں اپنے مہ لقا تیرا
لگے رہتے ہیں تیرے حکم پر کان اک عالم کے — اشارے میں ہوا کرتا ہے پورا مدعا تیرا
زمانہ تیرے بچپن کا جوانی کا بڑھاپے کا — کٹا ہے عیش سے از ابتدا تا انتہا تیرا
ترے ہر کام میں مشکل میں آفت میں مصیبت میں — ہوا اقبال یاور اور مقدر رہنما تیرا
جہاں میں نوحۂ غم کان تک تیرے نہیں آیا — رہا ہے نغمۂ شادی ہمیشہ ہمنوا تیرا
خدا جانے یہ کیا جادو ہے کیا تسخیر ہے تجھمیں — جسے دیکھا نظر آیا وہی مدح سرا تیرا
کبھی خالی پھرا کرتا نہیں سائل ترے در سے — بڑھایا تجھکو جب دست کرم یوں بڑھ گیا تیرا
بنایا مرجع ہر خاص و عام اللہ نے تجھکو — بھلا کیونکر نہ چاہے رات دن خلق خدا تیرا
جو مانگا تو نے بخشا مبدأ فیاض نے تجھکو — اثر کو چھین لایا جب بڑھا دست دعا تیرا

نجانا تو نے یہ جو کچھ ہے میرا ہے نہ تیرا ہے
سرائے دہر میں نادان شب بھر کا بسیرا ہے

سمجھ رکھا ہے تو نے اپنا گھر دنیائے فانی کو — نہیں سمجھا ہے کوئی چیز ملک جاودانی کو
نہیں ہے بادۂ غفلت میں تجھکو فکر پیری کا — ہمیشہ رہنے والی چیز جانا ہے جوانی کو
نہ جان ہرگز لب جان بخش تو لب ہائے جاناں کو — نہ رکھ آب بقا غافل شراب ارغوانی کو
یہ دولت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے اک جا نہیں رہتی — سمجھتا ہے عبث میراث عیش و کامرانی کو
نہیں چھوڑیگا گلچیں نام کو گل باغ ہستی میں — خزاں ہے ایکدن آخر بہار زندگانی کو
پناہ اللہ سے مانگ اور توبہ کر گناہوں سے — نہیں لگتی ہے دیر آتے بلائے ناگہانی کو
اگر کچھ ہے تو بس اسکی ہی خوشنودی سے حاصل کر — مقدم جان لے سب سے خدا کی مہربانی کو
جسے سچی خوشی کہتے ہیں وہ ہے پارسائی میں — سمجھ اک شعبدہ عیش و طرب کی شادمانی کو
اگر تو چاہتا ہے طالب ذات خدا ہونا — بھلا دے دل سے اس دنیا کی سب جھوٹی کہانی کو
لیے جائیگا کب تک دون کی تو خود پسند آخر — بس اب موقوف کر بہر خدا اس لن ترانی کو

اگر تو چاہتا ہے سرخرو ہونا قیامت میں
شرف لیجا ریاضت میں عبادت میں قناعت میں

فصیح دہلوی

تضمین حضرت بیان بر غزل خود

ہمارے ہاں کے کتب خانے میں ایک قلمی بیاض ملی جسمیں مختلف شعراء کی تضمینیں لکھی ہوئی تھیں۔ میرا مدت سے ارادہ تھا کہ اس قابل قدر کلام کو مخزن کے ذریعے قدردانان شاعری کے سامنے پیش کروں مگر فرصت نہ ہوئی۔ اس وقت میں ایک تضمین جو حضرت بیان یزدانی مرحوم نے اپنی غزل پر لکھی ہے پیش کرتا ہوں۔ انشاء اللہ اور تضمینیں بھی حضرت بیان اور منشی اصغر علی صاحب تفقّق اور جناب سوزو وغیرہ کی حاضر کرونگا۔

حامد حسین قادری۔ اندام پور

بات پھوٹی ہے چمن میں مرے مرجانے کی
اڑی پرندوں کی طرح پرندوں کے اڑجانے کی
عرق شرم سے لکھی نہیں دھو جانے کی
تہمت قتل مٹائے سے نہیں جانے کی
خون ناحق مرا سرخی ہے ترے افسانے کی

نہ ہوئیں شربت دیدار سے آنکھیں سیراب
سامنے آن کے بیٹھے بھی تو اٹھا نہ حجاب
زلفیں ڈالِ صبا نے جو اٹھادیں تو شتاب
جلوہ سے ڈال دیا چشم تماشا پہ نقاب
یہ نئی وضع ہے ظالم ترے شرمانے کی

تم تو وہ شعلہ سوزاں ہو کہ کیا ہوئیگی شمع
ہاتھ پروانے سے کیا گریہ سے منہ دھوئیگی شمع
سوگ نے سودے ہی کیا پائیگی جاں کھوئیگی شمع
اب مجھے کھو کے نہ رو رو کر اگر روئیگی شمع
جان پڑ جائیگی کیا راکھ میں پروانے کی

یم میں طوفان چلے آتے ہیں کیا جوشیدہ — ابھی جاری ہے کوئی دیدۂ محنت دیدہ

کیوں ہمیں کوہکن و قیس گئے رنجیدہ — آندھیاں آتی ہیں ہر سال کوئی شوریدہ

خاک اُڑاتا ہے ابھی تک کسی ویرانے کی

نعمتیں کھائیں مگر غم کے سوا کچھ نہ بچا — تن بدن آتشِ سوزاں نے جلا خاک کیا

ہائے کس سوختہ ساماں کا میں مہماں ہوا — ہڈیاں راکھ میں ڈھونڈیں نہ ملیں تجھکو ہما

شکوہ مت کیجو کہ جو تھی مجھے غم کھانے کی

نقش عشاق پہ گزری ہے قیامت مت پوچھ — تجھکو نے سوگ نہ سوزش نہ ندامت مت پوچھ

سارے معشوقوں سے اُلٹی ہی تری مت مت پوچھ — اثرِ سوزشِ تاثیرِ محبت مت پوچھ

ہو گئی شمع ستی آگ میں پروانے کی

گوش زد شورشِ مستانِ محبت ہی کہاں — دیکھ تو تلخیٔ صہبا کی سی لذت ہے کہاں

وقت ناقصوں سے نہ کھو عیش کو مہلت ہے کہاں — وعظا نوش بھی کر شورِ قیامت ہے کہاں

ہے یہ آواز کسی مست کے بَرّانے کی

کیا برا کرتے ہیں کیوں آٹھ پہر ہے وعظ — بت پرستی پہ ہماری تو نظر ہے واعظ

اپنے اللہ کے گھر کی بھی خبر ہے واعظ — سنگِ اسود ہے حرم میں مجھے ڈر ہے واعظ

کہیں پڑ جائے نہ بنیاد صنم خانے کی

تر زباں فیضِ الٰہی کی بدولت تھا میں — نقشِ رنگینیٔ صنعِ یدِ قدرت تھا میں

قدس میں مرغِ شب آہنگ حقیقت تھا میں — چمنِ دہر میں اک بلبلِ فصاحت تھا میں

لیکن اے چرخ نہ تھی فصل ابھی مرجانے کی

آگیا وقت برا اے گئی اچھوں کو فنا — نیکیاں پردہ نشیں عیب ہوئے جلوہ نما

تو نے دیکھا ہے زمانہ مجھے تحقیق بتا — اے بیاں صفحۂ ہستی سے اُٹھے نیک دیا

مجھ ہی بدبخت سے کوئی نہیں کرتا نیکی

تحفۂ عظیم آباد

مجھے ایک عرصہ سے آرزو تھی کہ عظیم آباد پہنچکر بزرگانِ عظیم آباد سے ذاتی طور پر نیاز حاصل کروں۔ گزشتہ فروری میں یہ آرزو پوری ہوئی۔ ایک ضرورت سے کلکتہ گیا تھا۔ واپسی میں عظیم آباد اترا۔ خان بہادر سید علی محمد صاحب شاد کی مسافر نوازی کبھی نہ بھولے گی انھوں نے تازہ کلام سے بھی محظوظ فرمایا جسے انکی زبان سے سننے کا جداہی لطف تھا۔ اسکے بعد میں حافظ فضل حق صاحب آزاد کی خدمت میں حاضر ہوا اور انکے ہاں سے بھی انکے اخلاق اور مہربانی کا پائدار اثر دل پر لیکر آیا۔ ان دونوں بزرگوں کی زیارت کے علاوہ شمس العلما مولوی سید امداد امام صاحب اثر کے شرفِ ملازمت کی نعمت غیر مترقبہ ملی۔ غرض عظیم آباد میں جتنا وقت صرف ہوا وہ نہایت ہی مفید طور پر صرف ہوا۔ اور اس سے ناظرین مخزن کی ضیافتِ طبع کا بھی سامان بہم پہنچگیا۔ ہر سہ حضرات کا تازہ کلام ذیل میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے:۔

(اکرام)

تجھ میں گیسو کا تصور ہے جگہ پانے کو — دل خبردار کہ ہے کالی بلا آنے کو

جلوہ گر تو ہو جہاں کیوں اُسے کعبہ کہیں — ہم تو بتخانہ سمجھتے نہیں بت خانے کو

قربِ معشوق ہوا کرتا ہے ایذا کا سبب — دور سے شمع جلاتی نہیں پروانے کو

قید خانے میں رہے یوسفِ کنعاں کبتک — روح اک روز ہے قالب سے نکل جانے کو

دلِ صدچاک کی تقدیر پہ رو دیتا ہوں — گیسوئے یار میں جب دیکھتا ہوں شانے کو

سوزِ عاشق کے ہوا کرتے ہیں معشوق شریک — ساتھ پروانے کے ہی شمع بھی جل جانے کو

مہرباں تم کو کیا غیر نے کس حرفت سے — اپنا افسانہ بنایا میرے افسانے کو

ورد کا شغل تو اچھا ہے مگر اے زاہد — کون گنتا ہے تسبیح کے ہر دانے کو

غیر کی لاش پہ ﷲ زباں بند رہے — اب جاں بخش سے کیا آپ ہیں فن ملنے کو
جو ہیں ناجنس ہیں کیا ان سے مزہ اُٹھیگا — اپنے اعمال کی ذرا ہے سزا پانے کو
بزم میں آئے جو تیرے رُخِ روشن کے قریب — شمع پروانے گئے قتل دے پڑ لانے کو

جس سے کل نیند نہ آئی تھی آخر ساری رات
آج آغاز کیا پھر اُسی افسانے کو

کوئی روگ ہو تو مداوا کریں — مرض ہجر کا ہے اسے کیا کریں
بحسرت کریں سوئے دشمن نظر — انہیں ساری محفل میں سوا کریں
یہ دل چاہتا ہے کہ اے مہ جبیں — ترے روئے روشن کو دیکھا کریں
نہیں خوبرویوں کا کچھ اعتبار — عبث ہی جو تجھ پر بھروسا کریں
شکایت فقیروں کو زیبا نہیں — ہم ایسوں کی کیونکر وہ پروا کریں
عجب کیا کہ قامت سے محشر کے دن — قیامت قیامت میں برپا کریں
ہوس عیش کی دل پہ موقوف ہے — جو دل ہی نہیں کیا تمنا کریں

اثر ضبط گریہ کو کہتے ہیں آپ
مگر دل کی تکلیف کو کیا کریں

دیکھیے تو کس آنکھ سے جلوہ یار دیکھکر — دل کو فسردگی سی ہے باغ و بہار دیکھکر
رنج بشر کو رنج پر دے جو خدا تو دے مگر — دل کو جگر کو دیکھکر صبر و قرار دیکھکر
آنکھ سے آنکھ لڑ گئی شکل چمن بگڑ گئی — پھولوں پہ اوس پڑ گئی انکا نکھار دیکھکر
وصل میں آہ نہیں نہیں پھر وہ ادائے دلنشیں — باہیں گلے میں ڈالدیں انکو نہیں پہ یار دیکھکر

رند سے کیوں جھگڑتے ہیں شیخ ہوا سے لڑتے ہیں　　پاؤں پھسل ہی پڑتے ہیں چلیئے ہزار دیکھکر
شیشۂ دل کو تُو نہ توڑ قیس حزیں سے مُنہ نہ موڑ　　پردۂ محمل اپنا چھوڑ ناقہ سوار دیکھکر
مہر ہے یا مہ مبیں ایک ہیں یہ کشش نہیں　　آنکھیں سی اپنی کُھل گئیں جلوۂ یار دیکھکر
حیف یہ شب وہ بیدلی اُف وہ شباب بیخودی　　اپنی خزاں بھی دیکھ لی اپنی بہار دیکھکر
جلوۂ حسن تابناک نازو نیاز سے ہی پاک　　دامنِ گل ہیں چاک چاک بخیۂ خار دیکھکر
ہجر میں عیش بے نمک آتشِ دل اُٹھی بھڑک　　آنکھیں بھر آئیں یک بیک ابرِ بہار دیکھکر
رم گیا زیرِ آسماں دودِ دلِ آہوں کا دُھواں　　اُٹھیں سیاہ آندھیاں دل میں غبار دیکھکر
جلوہ فروش کیوں نہو جانِ جہاں وہ دوستو　　اپنے خدنگ ناز کو سینہ کے پار دیکھکر
دن ہیں خوشی کے ساقیا دور ہو میکدے کا وا　　دیکھیئے چاند عید کا ابروئے یار دیکھکر
دل غمِ ہجر سے لہو کسکو ہولے رنگ و بو　　بُجھ گئی دل کی آرزو شمعِ مزار دیکھکر
سینہ میں غم سے دل گراں آتشِ دل شرر فشاں　　سر سے اُٹھے نہ کیوں دُھواں سنگ و شرار دیکھکر

نام ہے گرچہ فضلِ حق ہوں ہمہ تن عرق عرق
شکل سحر ہے رنگ فق زرشتی کار دیکھکر

کسی دل کی محبت کی اگر نعمت نہیں ملتی　　جوانی کی جو اک لذت ہی وہ لذت نہیں ملتی
ازل سے ناصحا اُمید و حسرت دونو توام ہیں　　کسے انکار ہے اس سے مگر صورت نہیں ملتی
بُرا ہو بیقراری کا اِسی نے بے اجل مارا　　کہیں کچھ حالِ دل یہ بھی ہمیں مُہلت نہیں ملتی
ہزار آرام کے ساماں ہوں لیکن ہے طلب جسکی　　وہی جبتک نہ ہو اس روح کو راحت نہیں ملتی
زمانے کے تغیر کا الٰہی کچھ ٹھکانہ ہے　　جو کل صورت تھی اُس سے آج کی صورت نہیں ملتی
فقط دولت کا وافر جمع ہو جانا نہیں کافی　　خصائل جب تلک اچھے نہوں عزت نہیں ملتی
بھلا گر چاہتا ہے آ کے ہم رندوں میں داخل ہو　　فقط تقوے سے زاہد یاد رکھ جنت نہیں ملتی

کہا مانو مرا سمجھو غنیمت نوجوانی کو جوانو عمر بھر ڈھونڈھے سے یہ نعمت نہیں ملتی
غضب کی الجھنیں ہیں زندگی بس بس میں باز آیا باطمینان دم لینے کی بھی مہلت نہیں ملتی
غضب کا تفرقہ آپس میں دیکھا نوع انساں کے جو صورت اتفاقاً مل گئی سیرت نہیں ملتی

مرے یارانِ رفتہ کھو گئے ای شاد کچھ ایسے
کہ اب اُن مٹنے والوں کی کہیں تربت نہیں ملتی

تبانِ ماہ رو جب جب نئے بیداد کرتے ہیں خدا بخشے جوانی کو ہم اپنی یاد کرتے ہیں
خزاں میں سوگوارِ باغ جب فریاد کرتے ہیں تڑپ جاتے ہیں ہم اپنی مصیبت یاد کرتے ہیں
ضعیفی کو دعائیں دے دلا خوش ہو بڑھاپے سے کہ مالک بندگانِ پیر کو آزاد کرتے ہیں
تماشا ہے کہ دُکھ دینے کا بھی الزام ہے مجھ پر مزا یہ ہے کہ ہر دُکھ میں مجھی کو یاد کرتے ہیں
احبا ہر طرح خوش ہیں ستایش جسقدر چاہیں بڑے بنتے ہیں وہ غیروں پہ کیوں بیداد کرتے ہیں
اِنہیں سے تم کو پیرانِ طریقت جانتے ہیں ہم سر آنکھوں سے بجا لاتے ہیں جو ارشاد کرتے ہیں
لٹاتے ہیں متاع آرزو تیری گلی میں ہم کمائی عمر بھر کی کیا کریں برباد کرتے ہیں
اشارہ چشم ساقی کا نہ سمجھے رند لے ناصح تری تجویز پر اے دوست ہم بھی صاد کرتے ہیں
شب فرقت کی تنہائی میں آہیں رنگ لائیں گی ملک اے بیکسی اس آہ کی امداد کرتے ہیں
ترے کشتہ نے پہنا ہے نیا خلعت شہادت کا فرشتے عرش پر شورِ مبارک باد کرتے ہیں
نہیں قائل ہم ایسے بندگانِ عیش دنیا کے کہاں ملتے ہیں کامل آپ کیا ارشاد کرتے ہیں
سر اپنا اپنے زانو سے ہٹائے پر نہیں ہٹتا ضعیفی میں جوانی کے جو قصے یاد کرتے ہیں
خزاں میں چھٹ کے اب نخلِ چمن کو خیر کہہ بیٹھیں یہ پتے کیوں گلوں کو پھاڑ کر فریاد کرتے ہیں
ہنسی آتی ہے گلگشت چمن میں گھڑیوں ہی اُنکو اشارے اُس طرف تن تن کے جب شمشاد کرتے ہیں
کتاب عمر ہے پیش نظر چشم تصور میں اُلٹتے ہیں ورق بھولے سبق کو یاد کرتے ہیں

بتا کس رو سیہ کو شوق مے نوشی ہو اے زاہد
جو رم محزوں کو دم بھر میکدے میں شاد کرتے ہیں

درازی عمر کی حد سے سوا جب جب ستاتی ہے
یہ حسرت ہم تجھے ای موت گھڑیوں یاد کرتے ہیں

پہناتے ہیں لباس فارسی اردو کے قالب پر
غزل کہتے ہیں ہم یا طرز نو ایجاد کرتے ہیں

مصیبت ہجر کی کاٹے نہیں کٹتی قیامت ہے
اکیلے گھر میں بیٹھے نالہ و فریاد کرتے ہیں

بہت دن ہو گئے رہتے ہوئے اب جی نہیں لگتا
ارادہ اس سرا سے کوچ کا ای شاد کرتے ہیں

ارمغانِ غازی پور

مدت ہوئی مولوی شاہ عبد الصمد مرحوم رئیس غازی پور نے چند غزلیں اپنے استاد حضرت شاہ عبد العلیم آسی مدظلہ کی مخزن میں شائع کرائی تھیں جو بہت پسند کی گئی تھیں مولوی صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ حضرت آسی کا کلام برابر بھیجتے رہیں گے۔ مگر اُنکے انتقال پرملال نے اس وعدے کا خاتمہ کر دیا۔ اور چونکہ شاہ صاحب ممدوح خود درویشانہ رنگ میں محو ہیں پھر اُن کا کلام دستیاب نہ ہوا۔ اب کے فروری کے مہینے میں اس کلام کی تلاش مجھے غازیپور لے گئی مولانا شاہ ابو الخیر صاحب سجادہ نشین فصیحی کے ہاں مہمان ہوا اور اُنہیں کی توجہ سے یہ مقصد پورا ہوا چند غزلیں حضرت آسی کی ملیں جو غازی پور میں نہایت مقبول ہیں اور مجالس سماع میں بڑے شوق سے گائی جاتی ہیں۔ چند احباب نے مزید تلاش سے کلام آسی فراہم کر کے عنایت فرمانے کا وعدہ بھی کیا۔ چند غزلیں مولوی عبد الصمد مرحوم کی بھی دستیاب ہوئیں جو بجائے خود بڑی دلچسپ ہیں اور استاد کے رنگ کی جھلک بھی رکھتی ہیں علاوہ بریں مولوی عبد الاحد صاحب شمشاد سے بھی ملاقات ہوئی۔ آپ وہاں کے مشہور اساتذہ میں سے ہیں [illegible] نیز صاحب دیوان ہیں آپکے کلام کا نمونہ بھی ساتھ لایا ہوں۔ تینوں کے نمونے

سرِدست بعنوان "ارمغان غازی پور" ہدیۂ ناظرین مخزن کرتا ہوں - اور باقی غزلیں وقتاً فوقتاً پیشکش ہوتی رہیں گی + (اکرام)

آنکھیں تجھکو ڈھونڈتی ہیں دل ترا گرویدہ ہے ۔ جلوہ تیرا دیدہ ہے صورت تری نادیدہ ہے

وصل سے پردہ میں اب تک فرقِ غم پیچیدہ ہے ۔ بلبلا ہے عین دریا میں مگر نم دیدہ ہے

بے حجابی یہ کہ ہر شے میں ہے جلوہ آشکار ۔ اُس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

یار تیرے حسن کو تشبیہ دوں کس چیز سے ۔ ایک تو ہی دیدہ ہے تیرے سوا نادیدہ ہے

حشر میں مُنہ پھیر کر کہنا کسی کا ہائے ہائے ۔ آسیِؔ گستاخ کا ہر جرم نابخشیدہ ہے

پھر مزاج اُس رند کا کیونکر ملے ۔ جسکو تیرے ہاتھ سے ساغر ملے

جانتے ہو اُسکو نفرت ہم سے ہو ۔ ہم ہیں جبتک وہ ہمیں کیونکر ملے

کعبہ - بُت خانہ - کلیسا - صومعہ ۔ پھرتے ہیں گھر گھر کہ تیرا در ملے

وصل ہے پر جوشش صہبائے فنا ۔ پھر اگر کوئی ملے کیونکر ملے

میری آنکھیں اور اُن کی خاکِ پا ۔ تیرے کوچے کا اگر رہبر ملے

یہ بھی ملنا ہے کہ بعد از صد تلاش ۔ حاجیٔ وہم و فہم سے باہر ملے

ظاہر و مظہر میں فرق ایسا نہیں ۔ پیر ہاتھ آئے تو پیغمبر ملے

آسیِؔ گریاں ہا محبوب سے
گُل سے شبنم جس طرح رو کر ملے

مجھکو گلے لگا کے یہ اُن کا سوال تھا ۔ ہاں سچ کہو اسی سے اتنا ملال تھا

پہلو میں دی جگہ تمھیں دلدار جان کر ۔ تم دلربا بنو گے کہاں یہ خیال تھا

دل کا کہیں پتہ نہ جگر کا نشان ہے ۔ سب چھین کر وہ لے گئے مفلس کا مال تھا

غش آگیا تھا حضرتِ موسیٰ کو طور پر — جلوہ فگن وہاں بھی ترا ہی جمال تھا
کیا دن مزے کے تھے وہ کہ راتوں کو صبح تک — میں تھا تیری جناب تھی دستِ سوال تھا
تم کو بھی کچھ خبر صمدِ خستہ جاں کی ہے — دیکھا تمہارے میں نے بہت غیر حال تھا

کہتا ہوں اُس لٹیرے سے میں ہاتھ جوڑ کے — سب کچھ ہے تیری نذر مگر دل کو چھوڑ کے
افسوس دانے دانے کو محتاج ہیں وہ لوگ — جن کے یہاں حساب نہ تھے کچھ کروڑ کے
جو بےخودیٔ نشۂ دولت میں تھے رفیق — وقتِ خمار چل دیئے سب منہ کو موڑ کے
اُنکو کہاں دماغ کریں سیرِ باغِ خلد — تیری گلی میں بیٹھے ہیں جو پاؤں توڑ کے
میرا وہ دل جو لعلِ بدخشاں سے کم نہ تھا — کس سنگدل نے پھینکدیا توڑ پھوڑ کے
اخلاص کی شمیم میں نفرت کی بو رہی — بیٹھا کبھی وہ پاس تو دامن سکوڑ کے
زانوئے یار پر ہے مرا بانیادِ سر — فرہاد بےمراد گیا سر کو پھوڑ کے
ملتا رہا بھی غیروں ہی سے نقدِ مدعا — مانگا کئی عزیزوں سے منہ پھوڑ پھوڑ کے
ہے دھوم جنسے دہر میں طوفانِ اشک کی — دو بوند میرے آنسو ہیں وہ بھی نچوڑ کے
مجکو لڑا کے غیر سے تم اُس کے ہو گئے — آتے ہیں تم کو فقرے بڑے توڑ جوڑ کے
پیری وہ پہلوان ہے جس سے لپٹ گئی — توڑے گی بند بند اُسی کے جھنجھوڑ کے
ایسا غموں نے چوس لیا میرے جسم کو — جس طرح پھینکدی کوئی ہڈی چچوڑ کے
مغرور کیوں ڈپٹتے ہیں اتنا غریب کو — کُتّے بھی کاٹتے نہیں ایسا بھنبھوڑ کے

شمشاد ایک گل کے اگر تم ہو عندلیب
بلبل کا دل دکھاتے ہو کیوں پھول توڑ کے

تازہ غزلیں

ہجر کی شب جائے۔ آئے ساعتِ دیدارِ صبح
یا الٰہی جلد پیدا ہوں کہیں آثارِ صبح

اُنکی چشمِ مست کو آئے پسند آثارِ صبح
اے خوشا بختِ بلند و طالعِ بیدارِ صبح

وصل کی شب ہو چکی پیدا ہوئے آثارِ صبح
ہیں بجائے نغمۂ شب نالہائے زارِ صبح

واہ کیا کہنا ہے تیرا اے نسیمِ صبح خیز
تیرے دم سے ہے چمن میں گرمیِ بازارِ صبح

وصل کی شب ہو چکی غم کا سماں ہے پیشِ چشم
یہ شعاعِ مہر ہے یا آہ آتشبارِ صبح

مدتوں سے آج کل پر ٹالتے ہیں وہ مجھے
صبح کو اقرارِ شام اور شام کو اقرارِ صبح

شب گزرتے ہی ہوئی برخاست بزمِ میکشی
گردنِ مینا سے شاید اُٹھ نہ سکتا بارِ صبح

عاشقوں کے دم سے ہے یہ رونقِ لیل و نہار
نغمۂ مستانۂ شب نالہائے زارِ صبح

وصل کی شب ہے نہ گزرے میرے گھر ہو کر تو خوب
کاش اے گردوں بدل جائے رہ رفتارِ صبح

عہدِ پیری ہیں ہے رخصت وہ داغِ سوزِ عشق
شمعِ محفل سے سحر ہاری دیکھکر دیدارِ صبح

آپکے عارض سے دیتے ہیں اسے تشبیہ لوگ
اے خوشا بختِ بلند و طالعِ بیدارِ صبح

عاشقِ دنیا کو کیوں آئے خیالِ آخرت
کس نے پروانے کو پایا شائقِ دیدارِ صبح

خوابِ نوشیں سے ترا بیدار ہونا الاماں
یہ خمارِ نرگسِ مستانہ یہ آثارِ صبح

دیدنی ہے شغلِ یارانِ طریقت ان دنوں
بیچو اسی کارِ شب حکمت فراشی کارِ صبح

حُسن کی تزئین میں گردوں کی کفایت دیکھیے
شام کا موباف ہے وہ جامۂ زرتارِ صبح

چرخ نے بھی اُس بُتِ رشکِ قمر کے ہجر میں
قشقۂ خورشید کھینچا باندھ لی زنارِ صبح

منکرِ روزِ قیامت میں تو اے اکبر نہیں
وصل کی شب میں کروں کسطرح پھر انکارِ صبح

مجھسے آنکھیں لڑائے جاتے ہیں
سوتے فتنے جگائے جاتے ہیں

تیکھی چتون دکھائے جاتے ہیں
دل پہ بجلی گرائے جاتے ہیں

پی گیا سُن کے ذکر مے زاہد — ابھی حضرت شدھائے جاتے ہیں
سو سُنی اُن کی ایک اپنی کہی — حوصلے یوں بڑھائے جاتے ہیں
ڈالدو ہاتھ میری گردن میں — اس طرح دل ملائے جاتے ہیں
تمکنت کے تمھاری کچھ انداز — میری حسرت میں پلے جاتے ہیں
چھوڑے جاتے ہیں دل تمھارے پاس — رنگِ صحبت جمائے جاتے ہیں
میں کروں ترکِ عشق لے ناصح — ایسی بگڑے نبائے جاتے ہیں
کیا غضب ہے نئی نویلی عمر — خود بخود وہ لجائے جاتے ہیں
گرمیِ مے نے اور پھونک دیا — گل سے رخ تمتمائے جاتے ہیں
دیکھنا اُن کی وصل میں شوخی — پانوں سے گدگدائے جاتے ہیں
دیکھئے طاہر تمھیں مبارکباد — ٹھیرو وہ دن بھی آئے جاتے ہیں

نواب سید محمد علی حسن طاہر از لکھنو

شوق دیتا ہے مجھے پیغامِ عشق — ہاتھ میں لبریز لیکر جامِ عشق
آپ ہوں ذوقِ اسیری سے خراب — کوئی لیجائے مجھے تا دامِ عشق
قیس وو امق سے کمال اہلِ دل — تھا انہیں لوگوں سے روشن نامِ عشق

قطعہ

نعش پر فرہاد کے شیریں گئی — وہ ستم پروردہ آلامِ عشق
اور یوں کرنے لگی رو کر خطاب — اے وفا کی جان اے ناکامِ عشق؟
تجھ سے رونق آشنا ہے صبحِ شوق — تجھ سے زینت آفریں ہے شامِ عشق؟
جان دیکر تو تو چھوٹا رنج سے — رہ گئی میں ہی بلا آشامِ عشق؟
تیرا مرنا عشق کا آغاز تھا — موت پر ہوگا مری انجامِ عشق؟
وحشت وحشی کہ تھا سب سے الگ — ہوگیا کیا بے تکلف رامِ عشق

بےنظیر وبدر منیر

میر حسن کی مشہور مثنوی نہایت صحت و اہتمام سے اعلیٰ قسم کی لکھائی چھپائی کیساتھ مخزن پریس لاہور میں شایع ہوئی ہے۔ دیباچہ ایک سخن فہم فاضل نے اس قابلیت سے لکھا ہے کہ مثنوی کی خوبیاں اور دیگر نکات جو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا اب نہایت آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔

گلزار ارم

میر حسن کی دوسری نایاب مثنوی بھی شامل کردی ہے۔ کتاب کی ضخامت دو سو صفحے سے زیادہ ہوگئی۔ سرورق وغیرہ ہر چیز غرضیکہ خوشنما ہے۔ دیدنی ہے اور داشتنی۔ بےتکلف دیکھئے قیمت دانستہ کم رکھی ہے یعنی عہ علاوہ محصولڈاک۔

رسوم دہلی متعلقہ مسلمانان

مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ نے نہایت دلچسپ پیرایہ میں اردو کی زبان میں دہلی کے مسلمانوں کی رسومات موجودہ وحال کو بیان کیا ہے۔ پیدائش سے لیکر موت تک کی سب رسمیں آگئی ہیں۔ کتاب اسقدر دلچسپ ہے کہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ مستورات کے لئے اسکا مطالعہ بہت مفید ہے۔ قیمت صرف ۱۲ر علاوہ محصولڈاک۔

خواب ہستی۔ از تصنیف مرزا محمد سعید ایم۔ اے۔

ابو مسلم خراسانی۔ از جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال۔ مترجمہ مولوی محمد سلیم انصاری

مخزن ایجنسی کے دو نہایت مشہور اور قابل دید ناول ہیں جس شخص نے دیکھا پسند کیا۔ ممکن نہیں کہ آپکو پسند نہ آئیں۔ خواب ہستی میں ہاف ٹون تصویریں بھی ہیں۔ لکھائی چھپائی بہت نفیس۔ ابو مسلم خراسانی ۰۰ہم صفحے کا ایک ضخیم ناول ہے۔ دلچسپ اسقدر ہے کہ ختم کئے بغیر آپ رہ نہیں سکتے۔ بہت جلد بک گیا ہے اب چند جلدیں باقی ہیں۔

جملہ حقوق محفوظ
مئی ۱۹۰۸ع
ایڈیٹر
شیخ عبدالقادر
شیخ محمد اکرام
مخزن
اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ
پشاور
کشمیر
لاہور
دہلی
لکھنؤ
کانپور
الہ آباد
بنارس
پٹنہ
کلکتہ
کراچی
بمبئی
حیدرآباد دکن
بنگلور
مدراس
تصویر
اقتصادی ترقی
حکایتِ لیلیٰ و مجنوں ۔ سید سجاد حیدر بی اے
کلام ولی ۔ مولوی رضا علی وحشت از کلکتہ
شاہین و دُرّاج ۔ مولوی محمد عبدالرحمٰن صاحب
دردِ جانستان
نظم
دربار بسنت
بی بی اور لیڈی کا مکالمہ
فریادِ حسن
تازہ غزلیں
دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں
مطبوعہ مخزن پریس دہلی

علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی راے

مثنویات میرحسن عہ

میرحسن کی مثنوی بدرمنیر مشہور ہے جس سے بہتر آجتک کوئی مثنوی اُردو زبان میں نہیں لکھی گئی۔ مگر افسوس ہے کہ چھپا خانے آجتک سکونڈ کلیس کاغذ پر چھاپ رہے ہیں۔ اور اسکی تصحیح کی بھی پروا نہیں کی۔ اب اس مثنوی کی قسمت چمکی۔ اور مخزن پریس دہلی نے اسپر توجہ کی نظر ڈالی۔ اس نے اس مثنوی کو نہایت خوشخط لکھوایا۔ اور نفیس کاغذ پر نہایت خوشنما چھپوایا۔ اور اسکی تصحیح کرائی اور آخر میں ایک اور مثنوی میرحسن کی شامل کی جسکا نام "گلزار ارم" ہے اور جو ابتک عام لوگوں کی نظر سے نہیں گذری۔ نیز شروع میں ایک بسیط دیباچہ لکھوایا جسمیں میرحسن کی شاعری کی خوبیاں اور اس مثنوی کی لطافتیں نہایت عمدگی اور قابلیت سے بیان کیگئی ہیں۔ یہ مخزن پریس کا وہ احسان ہے جسکو اُردو زبان کبھی نہیں بھول سکتی۔ مخزن پریس کا ارادہ اُردو کی اور عمدہ کتابوںکو بھی اسی طرح چھپوانے کا ہے ہم کو یقین ہے کہ یہ اولوالعزمی خاص قدر اور وقعت کی نظر سے دیکھی جائیگی۔

روانہ پیسہ اخبار

رسوم دہلی متعلقہ مسلمانان ۱۲ار

جناب مولوی سید احمد صاحب دہلوی قابل مولف ارمغان و فرہنگ آصفیہ نام نامی زبان اُردو کے وسیع حلقہ اثر میں فرط شہرت سے محتاج تشریح نہیں۔ آپ نے نہ صرف انڈین لنگویج فرہنگ (مشترکہ زبان ہند) کی پہلی مکمل لغات طیار کرکے لکھے پڑھے آدمیوں کو اپنا ممنون احسان بنایا اور اُردو لٹریچر کی تاریخ میں اپنے لئے جانشین کرسے وقار و احترام کا مستقل درجہ محفوظ فرمایا ہے۔ بلکہ تمدنی و معاشرتی اُمور پر بھی متعدد کارآمد کتابیں لکھی ہیں جو اپنی اپنی جگہ بعض خاص خاص ضرورتیں پوری کرتی ہیں۔ انہی میں سے ایک مندرجہ بالا نام کی کتاب ان دنوں مشہور و معروف رسالہ مخزن دہلی کے دفتر سے لکھائی چھپائی کے عمدہ اہتمام کیساتھ دبیز کاغذ پر شایع ہوئی ہے۔ جو ملک کی ہر دلعزیز زبان کے ذخیرے میں جسکا نہایت مختصر ہونا مکمل ہونا حامیان اُردو کیلئے موجب تاسف و انفعال ہونا چاہئے۔ ایک قابل قدر اضافہ سے تعبیر کیجاتی ہے۔ رسوم دہلی میں جیسا کہ اسکے نام سے پتہ لگتا ہے اسلامی تہذیب ہند کے عظیم الشان مرکز کی تمام قدیم و موجودہ رسمیں جو مسلمانوں کے ان شادی و غمی کے موقعوں پر اور مذہبی قومی تقریبوں پر مروج ہیں پوری تفصیل کیساتھ لکھی گئی ہیں اور ہر ایک بات ایسی شرح و بسط سے بیان ہوئی ہے کہ ایکبار اُن مواقع کا پورا سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور پڑھنے والا اپنی طبیعت میں مسرت و حسرت کے جذبات محسوس کرنے لگتا ہے کتاب کو عام فہم اور خصوصاً اجنبیوں کے لئے دلچسپ و مفید بنانیکی خاطر مختلف موقعوں کے مروجہ گیتوں اور نغموں کا ترجمہ بھی سلیس و آسان عبارت میں لکھدیا ہے۔ اور جا بجا بعض مراسم کی اصلیت و ابتدا کا پتہ لگانیکی بھی کوشش ہوئی ہے جس سے کتاب نے ایک تاریخی وقعت پیدا کرلی ہے۔ ہر چند کہ کتاب کی ضخامت آٹھ دس جزو سے زیادہ نہیں مگر اپنے مقصد خاص میں یہ بخوبی جامع اور تولید سے لیکر وفات تک جملہ مراسم متعلقہ پر حاوی ہے۔

منیجر مخزن ایجنسی دہلی سے طلب فرمایئے۔

مستورات کیلئے اردو میں ایک نئے ماہوار
رسالے کی تجویز کا
اعلان

مخزن پریس دہلی میں چھپا

ہندوستان میں ہماری دنیا دو حصوں میں منقسم ہے۔ گھر کی چار دیواری ان دونو میں حد فاصل ہے۔ ایک حصہ چار دیواری کے باہر ہے۔ ایک چار دیواری کے اندر ہمارا طریق عمل بتا رہا ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ چار دیواری کے باہر سب کچھ ہے اور چار دیواری کے اندر کچھ بھی نہیں۔ باہر کی دنیا دنیا ہے اور اندر کی دنیا صرف چلتی پھرتی بولتی چالتی تصویریں ہیں۔ جو باہر کی دنیا کے دل بہلانے کے لئے مہیا کی گئی ہیں۔ جب باہر سے ذرا تھکے تو اندر جا کر ان کا تماشا دیکھ لیا۔ لیکن اس بات کا وقت آگیا ہے کہ یہ غلط خیال ہمارے دلوں سے نکل جائے اور ہمارے موجودہ طریق عمل کی اصلاح ہو جائے چار دیواری کے اندر جو دنیا آباد ہے وہ زندہ دنیا ہے۔ اور اس عالم میں انہیں مقاصد سے اسے بھی زندگی بخشی گئی ہے جن کی تکمیل ہماری زندگی کا مآل ہے۔ اس اندر کی دنیا کے رہنے والوں میں عقل خداداد ویسی ہی موجود ہے جیسی باہر کی دنیا والوں میں ذہانت بسا اوقات اعلےٰ درجے کی پائی جاتی ہے۔ بہت سے اور وصف ہیں جو قدرت نے باہر کی دنیا کے برابر یا اس سے بڑھ کر انہیں دئے ہیں۔ مگر اندر کی دنیا علم کی روشنی سے محروم ہے۔ غنیمت ہے کہ ملک میں جا بجا زنانہ مدارس کے ذریعے اندر کی دنیا سے تاریکی دور کرنے کی کوشش شروع ہوئی ہے اور چند رسالے اور اخبار اس کوشش کی تائید پر آمادہ ہوئے ہیں۔ ان مدارس اور

اخبارات اور رسائل کے سامنے جو کام ہے وہ بہت اہم ہے اور اسکی بڑائی اور وسعت کے اعتبار سے ان کی تعداد اور قوت نہایت کم ہے چونکہ ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے مقدور کے موافق اس کام میں جسے وہ نیک سمجھے مدد دے۔ اسلئے ہم بھی خدا کے توکل پر ایک ناچیز سی کوشش سے ان لوگوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں جو پہلے سے اس مبارک کام میں مصروف ہیں اور اردو میں ایک رسالہ نکالنا شروع کرتے ہیں جو اس نظر سے لکھا جائیگا کہ اردو دان مستورات اسے آسانی سے پڑھ سکیں اور اسکے پڑھنے سے فائدہ اٹھا سکیں۔

اس رسالہ کا نام 'عصمت' ہوگا۔

۱۔ حرم کی حرمت قایم رکھنا۔ انگریزی زبان میں ایک مثل ہے کہ "انگریز کا گھر اسکے لئے قلعہ کا حکم رکھتا ہے"۔ اسی طرح ہمارے ہاں ہر شخص اپنے گھر میں بادشاہ ہے۔ گھر کی چاردیواری مٹی کی بنی ہوئی کیوں نہ ہو۔ دروازہ کے باہر پھٹے سے ٹاٹ کا پردہ کیوں نہ پڑا ہو۔ مگر یہ وہ مبارک حدود ہیں جن کے اندر غیر کا قدم نہیں آسکتا۔ مرد شریف کا منتہائے خیال یہ ہونا چاہیے کہ حرم دنیا میں ایک بہشت کا نمونہ بن جائے۔ چاردیواری کے باہر جد وجہد اور کد وکاوش ہو تو چاردیواری کے اندر امن و امان اور سکون و اطمینان۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ساکنان حرم ایسی تربیت پائیں جس سے وہ اپنے فرایض منصبی کو عمدگی سے انجام دے سکیں۔

۲۔ عالم نسوان کی ترقی۔ عالم نسوان صرف بیرونی دنیا سے قطعی الگ تھلگ پڑا ہوا نہیں۔ بلکہ اپنے حال سے بھی بے خبر ہے اسکے پاس

اس بات کے معلوم کرنے کے ذرایع بھی بہت کم ہیں کہ دوسری ملکی بہنیں کیا کر رہی ہیں اگر کہیں بعض خواتین علم سے بہرہ ور ہوکر ترقی کر بھی رہی ہیں تو اُنکی اکثر بہنیں اس حال سے واقف نہیں۔ ورنہ ایک کی ترقی دوسری کے لئے ترغیب کا باعث ہو۔ ان ترقی کے سب حالات مختلف ذرایع سے جمع کرکے اُن کی طرف دوسری خواتین کو متوجہ کیا جائے گا +

۳۔ تعلیم نسواں کی حمایت:۔ چند سال سے ملک میں تعلیم نسواں کا شور ہے۔ مگر کامیابی بہ قدر ضرورت تو کجا۔ ابھی بہ قدر شور بھی تو نہیں ہوئی۔ بلکہ ابھی اس پر بحث ہو رہی ہے کہ تعلیم کیسی ہو اور کہانتک ہو۔ یہ بھی زیر بحث ہے کہ کیونکر ہو۔ اور کچھ لوگ تو ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ کیوں ہو۔ خیر ان سے تو بحث بے سود ہے۔ مگر باقی سب کو اکثر یاد دہانی کی جائیگی کہ اس ضروری فرض کے ادا کرنے کی طرف جلد متوجہ ہوں اور اس مسئلہ پر ناقدانہ غور کرکے اس کا فیصلہ کریں +

۴۔ معلومات عامہ۔ ناظرین کیلئے معلومات عامہ بہم پہنچانا اور اُن کی معلومات عامہ کو بڑھانا اخبار اور رسالہ کا فرض ہوتا ہے۔ ضمناً اس فرض کی ادائگی میں اپنے ناظرین کی ضروریات ملحوظ رکھیگا۔ منجملہ دیگر معلومات کے پردہ نشین خواتین کیلئے وقتاً فوقتاً مشہور مقامات کے مختصر حالات مع تصاویر دیا کریگا۔ تاکہ مستورات گھر بیٹھی ہی ملک کی سیر کر سکیں۔ اور حالات ملک سے بالکل ناواقف نہ رہ جائیں +

۵۔ معلومات خاصہ۔ یوں تو اس رسالے کا اکثر حصہ خواتین کا لکھا ہوا ہوگا مگر وہ اوراق جو ان معلومات سے پُر ہوں۔ جو مستورات کیلئے خاص طور پر مُفید یا ضروری ہوں ذی علم مستورات سے لکھائے جائینگے +

۶ عصمت میں مضامین علمی۔ ادبی۔ تاریخی۔ معاشرتی۔ سوشل غرضیکہ ہر قسم کے مضامین جو مستورات کے لئے مفید اور ضروری سمجھے جائینگے درج ہونگے۔ پولیٹکل مضامین سے قطعی احتراز ہوگا۔ دلچسپ سلیس معنی خیز نظمیں بھی ہوا کرینگی +

عصمت میں مستورات سے مخصوص خبروں کا خلاصہ بالالتزام اور دیگر مضامین کا اقتباس یا ترجمہ وقتاً فوقتاً درج ہوگا +

۷ ۔ زنانہ لٹریچر کی توسیع اور ملک کے مشہور اہل قلم سے کنواری اور بیاہی لڑکیوں کے لئے مفید اور ضروری کتابیں تصنیف کرانا عصمت کے مقاصد میں ہوگا +

۸ ۔ کوشش کیجائیگی کہ ہندو اور عیسائی بہنیں اس رسالہ کی دلچسپی کے بڑھانے میں اپنی مسلمان بہنوں کے شریک ہوں اور عصمت میں مضامین لکھیں۔

۹ ۔ جواب طلب استفسار بھی بصورت گنجائش درج ہو سکینگے۔

اسوقت اُردو میں تین چار پرچے ایسے ہیں جو عالم نسواں کی خدمتمیں مصروف ہیں اور اُن میں بھی صرف دو ایسے ہیں جنہوں نے ملک میں شہرت اور اعتبار پیدا کیا ہے۔ مگر اتنے بڑے ملک میں اتنی ضروریات کے لئے دو پرچے بہت کم ہیں۔ ہم ان دونوں کی بیش بہا خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ اور انصاف یہ ہے۔ کہ انہی دونو کی بدولت اس تیسرے پرچے کی ہستی ممکن ہوئی ہے۔ ورنہ چند سال پیشتر کسی کو ایسا رسالہ نکالنے کی جرأت نہ ہوتی اور اگر جرأت کرتا تو اُسے یقیناً ناکامی کا سامنا ہوتا۔ مگر اب حالت بدل گئی ہے۔ لاہور کے مشہور ہفتہ وار پرچہ **تہذیب نسواں** کی کوشش اور مسز ممتاز علی صاحبہ اور مولوی ممتاز علی صاحب کی توجہ سے

ایک معقول حلقہ اخبار میں مستورات کا پیدا ہوگیا ہے - رسالۂ **خاتون** علیگڈھ اور اسکے اڈیٹر شیخ عبداللہ صاحب بی - اے - وکیل اور مسنر شیخ عبداللہ صاحبہ کی کوشش بھی اسی طرح داد کے قابل ہے اور انھوں نے بھی پڑھی لکھی خواتین میں مضامین لکھنے اور پڑھنے کا شوق پیدا کرنے میں معقول حصہ لیا ہے - ان دونو پرچوں کے بین بین ایک پرچے کی ضرورت بعض خواتین نے خود محسوس کر کے مختلف موقعوں پر تحریک کی - کہ ایک رسالہ مستورات کے لئے مطبع **مخزن** سے بھی نکلے تو خوب ہو - یہ آج کا اشتہار اُس تحریک کا جواب ہے - ہمیں پکارا گیا تھا - ہم **لبیک** کہتے ہیں اور خدمت پر کمر بستہ ہیں - جو حضرات اس خیال سے مؤید ہوں اُن سے التماس ہے کہ اعلان سے ایک مہینے کے اندر اس قدر درخواستین تو بھجوا دیں جنسے یہ یقین ہو جائے کہ مُلک میں ایک ایسے رسالے کی مانگ ہے اور پھر اسکے نکلنے پر مزید کوشش اسکی اشاعت کے لئے فرماویں ÷

رسالہ عصمت کا حجم علاوہ سرورق کے ۴۸ صفحے ہوگا اور سرورق ایسا ہوگا جو اُن ہاتھوں میں جانے کیلئے موزوں ہو جنکے لئے یہ رسالہ مقصود ہے - یہ رسالہ چکنے ولائتی کاغذ (مخزن قسم اوّل کا غذ ہوگا) پر خوش قلم چھپے گا - اور کم از کم ایک تصویر سے مزیّن ہوا کریگا - اسکی قیمت سالانہ مع محصولڈاک تین روپیہ صرف ہوگی - جو ہر صورت میں پیشگی واجب الادا ہوگی - شائقین درخواست کے ساتھ بھیجدیں یا پہلا پرچہ وی - پی روانہ کرنیکی اجازت دیں جو صاحبان اس رسالے کے مقاصد سے ہمدردی رکھتے ہیں اور اسکی قلمی اعانت کرنا چاہیں انہیں اپنے مضامین میں زبان کی سادگی اور سلاست کو ملحوظ رکھنا ہوگا خواہ وہ نظم لکھیں یا نثر - اور خیالات میں بھی اس امر کا پاس

رکھنا ہوگا کہ یہ پرچہ شریف بیبیوں اور پڑھی لکھی کم عمر کنواری لڑکیوں میں جائیگا۔ تعلیم یافتہ خواتین کے مضامین جو چھپنے کے لائق ہوں گے دلی شکریہ کے ساتھ درج کئے جائیں گے +

اگر کوئی خاتون اپنا نام چھپوانا نہ پسند کریں گی تو اسکی بجائے وہ فرضی نام جو وہ اپنے لئے انتخاب کر کے ہمیشہ کے لئے مقرر کر لیں گی۔ آنکے مضمون کے اختتام پر درج ہوگا +

جو مستورات ترسیل زر یا ترسیل مضامین کے علاوہ دیگر امور میں کچھ خط وکتابت ایسی کرنی چاہیں جسکا مردوں کے ہاتھ میں جانا اُن کے نزدیک مناسب نہ ہو تو وہ مسز محمد اکرام صاحبہ کو خط لکھیں جو عصمت کی ترتیب میں اڈیٹر عصمت کی شریک حال رہیں گی اور اُن خاص صورتوں میں اُن خطوط کا جواب خود دیں گی +

رسالہ عصمت کا پہلا پرچہ انشاءاللہ ۱۵ جون تک شائع ہو جائیگا +

شیخ محمد اکرام

ایڈیٹر رسالہ عصمت

دہلی

مشیرالدولہ ممتازالملک آنریبل خلیفہ سیّد محمد حسین مرحوم مغفور

اقتصادی ترقی

(گزشتہ اشاعت سے آگے)

ہندوستان کی دستکاری میں سب سے مقدم لکڑی کا کام ہے۔ ہمارے مستند اہل الرائے سر جارج واٹ نے نجار کے کام کی تاریخی عظمت کو تعریف کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ "ہندوستان میں آرٹس کی نسبت واقفیت حاصل کرنیکے لئے سب سے زیادہ لکڑی کے کام پر توجہ کرنا ضروری ہے یہ بہت ہی قدیمی صنعت ہے اور اس کے علاوہ سلطنت ہند کے ہر ایک اہم حصے میں اس لکڑی کی ساخت کا جو کثرت سے مل سکتی ہو اور جو بیشتر مناسب حال ہو اور نیز مذہبی عقاید کا اور لوگوں کی قومی خصوصیات کا اس صنعت پر اثر پڑا ہے اور اس نے اس کو گوناگوں شکلیں دیدی ہیں"۔ اسپر تو ہندوستانی صنعت کے تمام مطالعہ کرنیوالوں کا اتفاق ہے کہ پتھر کے کام کی معماری اور سنگتراشی پرانے لکڑی کے کام کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

نجار - یہ لوگ ہنرمندی میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اور بہت سے مدارس میں خصوصیت سے اسی پیشہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ اور اچھی نجاری اور

چوبی نقاشی کا عمدہ کام اُن ہنروں میں ہے جو سکھائے جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ لاہور کے آرٹس سکول کے آرائشی چوبی کام سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہمارا صوبہ چوبی کام میں ممتاز ہے۔ لیکن بڑی بڑی ہنرمندانہ تکمیلوں سے قطع نظر کہا جا سکتا ہے کہ نجّاری کی تمام صنعت میں بڑا انقلاب ہو رہا ہے۔ پچھلے زمانے میں نجّار کا بڑا کام تخت چوکی اور دیگر مختصر چوبی کام ہوتا تھا یا ہندوستانی گھروں کی وہ قابلِ فخر چیز یعنی چوکھٹ جس پر دیسی نجاروں کی اچھی سے اچھی قابلیت خرچ کی جاتی تھی اور گھروں میں آرائشی سامان مختصر ہوتا تھا یا بالکل نہ ہوتا تھا۔ اس لئے جس کو فرنیچر کہا جائے بالکل نہ تھا۔ یا بہت کم تھا۔ مگر اب حالات بدل گئے ہیں لیکن اگرچہ ہم میں چوبی کام کو ترقی دینے کی قابلیت اور طبعی جوہر موجود ہے مگر اس مُلک میں جو ترقی ہوئی ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ حالانکہ یہاں اچھی سے اچھی لکڑی میسّر ہے۔ مثلاً۔ ساگون۔ شیشم۔ دیار۔ اخروٹ اور تُن۔ لیکن باستثنا اس حقیر کوشش کے جو نصف درجن مشہور انگریزی کارخانوں نے مُلک کے چند بڑے شہروں میں کی ہے ہندوستانی فرنیچر کی تجارت نے کچھ ترقی نہیں کی اور اسکے کئی سبب ہیں جنمیں یقیناً خاص سبب یہ ہے کہ فرنیچر کے کام کا کوئی انتظام بڑے پیمانے پر نہیں ہے اور اس قسم کی نجاری کیلئے کسی سادہ سی تعلیم کا سامان بھی مہیا نہیں ہے۔ لاہور اس صوبے کا پایہ تخت ہے۔ دو لاکھ کی آبادی رکھتا ہے اور بہت سے امیر خاندانوں کا مستقل مسکن ہے۔ اور ہماری طرح جو لوگ یہاں کرسمس وغیرہ کے موقعوں پر کبھی کبھی آمد و رفت رکھتے ہیں وہ اس کی روز افزوں رونق کے معترف ہیں لیکن یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہو گا کہ اگر آپ یہاں کی کُل فرنیچر کی دُکانوں میں چکّر لگائیں تو کس قدر ساگون کی کرسیاں

خرید سکیں گے۔ حضرات! میں نے گذشتہ ہفتے میں یہ تجربہ کیا کچھ تو اس لئے کہ مجکو چند کرسیوں کی ضرورت تھی اور کچھ اس لئے کہ ذاتی طور پر اس تجارت کا حال دیکھوں۔ اِس میں شک نہیں اور ہمارا سب کا تجربہ ہے کہ ہمارے دوکاندار اپنا اسباب دکھانے اور گاہکوں کو اپنی طرف کھینچنے کے آرزومند نہیں ہوتے اور انکی بڑی مرفہ الحالی ہم لوگوں یعنی کرسمس پر آنے والوں کو کرایہ پر مال دینے سے حاصل ہے۔ اِس لئے اگر کسی کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو خود دُکان کے کونے کونے میں تلاش کرنا پڑتا ہے اور ایسے گھر کی تلاشی لینی ہوتی ہے جو کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوتا ہے۔ غرض بڑی تلاش کے بعد مجھے ایک دکان سے دو اصلی ساگون کی مستعمل کرسیاں ملیں اور ایک ایسی جس کی صورت ساگون کی سی بنا لی تھی اور ہمارے دوست کباڑی نے اُن پر سے گرد بھی نہ جھاڑی تھی کیونکہ اس کو اپنا مال بکنے یا نہ بکنے کی پرواہ ہی نہ تھی وہ ایک قیمت کہہ کر خاموش ہو رہا کیونکہ لاہور کے کارخانہ داروں نے گویا ایک طرح سے سازش کر لی ہے کہ اپنی بات سے ذرہ بھر نہ ہٹینگے اور پھر یہ بھی خیال فرمائیے کہ یہ کُرسیاں جیسی کچھ بھی تھیں لاہور کی ساخت نہ تھیں بلکہ بمبئی سے آئی تھیں۔

اِس سے ظاہر ہوگا کہ ہمارے کاروبار کے طریق کیا ہیں اور ایک ایسی بڑی تجارت میں جس میں ترقی ممکن ہے اِن لوگوں کی کوشش کیا ہے۔ جب ہم خیال کریں کہ پنجاب فرنیچر کی تجارت میں کیسا اِمتیاز حاصل کر سکتا ہے تو افسوس اور بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ہمارے مُلک میں گجرات ایک چھوٹا سا مرکز ہے جہاں اچھا سادہ اور صاف فرنیچر تیار ہوتا ہے مگر اسی کو دیکھہ کر خیال بھی آتا ہے کہ یہ کیسے اچھے موقعے ہیں جن سے لوگ فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ میں کرتارپور کے

قریب رہتا ہوں جو اُن بدنما کرسیوں کا بڑا مرکز ہے جن سے ہم سب نفرت کرتے ہیں لیکن انکے بغیر چارہ بھی نہیں۔ مگر کرتارپور کے نجار شکل میں انداز میں لکڑی میں اور اسکی کمزوری میں ذرا سا تغیر بھی روا نہیں رکھتے۔ اب لدھیانہ اور انبالہ میں فرنیچر کا کام شروع ہوا ہے مگر ابھی اس کا آغاز ہے اور باقاعدہ تجارت کے ابھی کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

تربیت اور باقاعدگی اس بارے میں بہت کچھ کر سکتی ہے۔ کپورتھلہ میں ایک بڑا محل بن رہا ہے اور اس کی آرایش ایک بڑی انگریزی فرم کے اہتمام میں ہے۔ مجھے کبھی کبھی اس فرم کے کارندوں سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر وہ لوگ نہایت وثوق سے کہتے ہیں کہ اگر ہندی کاریگروں کو مناسب تربیت دیجائے تو وہ فرنیچر اور آرایش کی تجارت نہایت خوبی سے چلا سکتے ہیں۔ ہم خود بھی خیال کر سکتے ہیں کہ ہمارے معمولی نجار کیسی جلدی اچھی الماریاں بنانے میں ماہر ہو گئے ہیں۔ انگلستان میں ساگون کا بڑا ذخیرہ سوئٹزرلینڈ سے آتا ہے اور کواڑ اور کھڑکیاں بھی اکثر باہر سے منگوائی جاتی ہیں۔ مگر ہندوستان میں ہمنے اپنے خزانوں کو بیکار چھوڑ رکھا ہے۔

بافندہ۔ نجار کے بعد طبعاً بافندہ کا خیال آتا ہے اور اشیائے خوردنی کے بعد کپڑے کا سامان ہندوستان کی سب سے بڑی پیداوار اور محنت کی چیز ہے۔ اور اس جنس کی عظمت کا کسی قدر خیال ذہن میں جاگزیں ہوتا ہے۔ جب دیکھتے ہیں کہ ایک سنہ ۱۹۰۳-۴ء میں جس قدر کچا اور بُنا ہوا کپڑے کا سامان۔ ہندوستان سے باہر گیا اسکی قیمت ۹۸ کروڑ روپیہ تھی اور ابھی اس رقم میں وہ لین دین شامل نہیں جو خود مُلک کے اندر ہوا ہوگا اور وہ بھی اس رقم سے کم نہ ہوگا کیونکہ جس قدر روئی ہندوستان میں پیدا ہوتی ہے

تقریباً اس میں سے نصف خود ہندوستان کی بافندگی کے کارخانوں میں سما
جاتی ہے اور اسکے علاوہ بہت سی مقدار ان دستی کرگوں کے بھی کام آتی
ہوگی جو ملک میں ابھی کثرت سے موجود ہیں اور یہی کیفیت دوسری نباتی پیداوار
کی سمجھنی چاہیئے جو کپڑے کے کام آتی ہے یعنی سن - اور یہی حال حیوانی پیداوار
کا ہوگا - یعنی ریشم پشم اور بال جو ملکی حرفت میں بہت کچھ کام دیتے ہیں -
اُون بھی ملکی کاروبار میں دن بدن زیادہ خرچ ہونے لگی ہے -

غرض پارچہ بافی کا سوال ہندوستان میں بہت سے پہلو رکھتا ہے -
ایک سوال "ہینڈ لوم" یعنی دستی کرگوں کا ہی جس سے ہم سب واقف ہیں - دستی
کرگوں کی حمایت میں مسٹر ہنری گوس اور مسٹر ای بی ہاول پرنسپل کلکتہ آرٹس
سکول نے بڑی قابلیت سے حصّہ لیا ہے - امریکا اور یورپ میں روئی کے
کام کی دفعتہً تکمیل سے ہندوستان کی بافت کو بہت نقصان پہنچا ہے -
اس بارہ میں یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی خودغرضانہ تجارتی
پالسی نے اس خرابی کو زیادہ بڑھا دیا ہے - "انڈسٹریل ریوولیوشن" (صنعتی
انقلاب) نے باوجود اپنے فائدوں کے مغرب پر بڑی مصیبت ڈالی تو
ساتھ ہی ہندوستان کو بھی دقّتوں میں مبتلا کر دیا - لیکن اس سوال کا
تاریخی پہلو چاہے کیسا ہی ہو - یہ ظاہر ہے کہ دستی کرگون کی صنعت یوماً فیوماً
تباہ ہوتی جاتی ہے - مگر چونکہ ابھی تک ملک میں اس صنعت کے بڑے بڑے
مرکز موجود ہیں اور نیز دیہاتی بافندوں کو بھی ایسی بیرحمی سے تباہی اور بیکسی
کے ہاتھ بیچنا نہیں چاہیئے - اسلئے جہانتک ممکن ہو ضرور ہے کہ کام کرنے
والوں کو اس تباہی سے تکلیف نہ پہنچنے دیں لیکن اگرچہ ہمکو بتقاضائے
انسانیت ایسا کرنا چاہیئے مگر حقیقت میں ایسی صنعت کو بحال رکھنا جس کی

تباہی مقدر ہے ملکی اقتصاد کو نقصان پہنچاتا ہے اور جو چیز موجودہ کاروباری دنیا کے مقابلہ میں نابود ہو رہی ہے اسے ضرورت سے زیادہ قایم رکھنے میں ہمیں کچھ فائدہ نہیں۔ دستی کرگونکی حمایت کرنیوالے تقاضائے انسانیت سے متاثر ہیں اور ہمکو ان کے خیالات کی عزت کرنی چاہئیے۔ مگر یہ بھی تسلیم کرنا چاہیئے کہ ان کا مستقل کارخانون کے طور پر قایم رہنا ناممکن ہے۔ اتنا وقت نہیں کہ یہ مضمون آسانی سے طے ہو سکے مگر جس طرز سے بعض جلیل القدر اصحاب نے دستی کرگونکی حمایت کی ہے اور ان میں سب سے بڑھکر وہ دو بزرگوار ہیں جن کا ذکر کر چکا ہوں اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ ہماری اقتصادی رفتار میں ایک غلط قدم ہوگا۔ اور میرا خیال ہے کہ اس سب سے بڑی ہندوستانی حرفت یعنی زراعت کے بعد یہ مناظرہ جو کرگوں کے حامیوں اور مینوفکچر کے وکلا میں شروع ہی اسکی نسبت ہندوستان کے اہل الرائے اور معاملات کے پرکھنے والون کو نہایت سنجیدگی اور غور سے کام لینا چاہیئے کیونکہ لوگوں کے طرز عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ فکٹریوں کے جلدی جاری ہونیکی زور سے حمایت کر رہے ہیں۔

پارچہ بافی کے سوال کا دوسرا پہلو ملک میں جو روئی بوئی جاتی ہے اس سے متعلق ہے اور اکثر جگہہ اب تجربے ہو رہے ہیں کہ آیا لمبے رویں کی روئی ہندوستان میں پیدا ہو سکتی ہی یا نہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ کچھہ نہ کچھہ ترقی ممکن ہے اور کچھہ بھی ہو روئی کے کام کی آیندہ رونق بہت کچھہ اسی تحقیق پر منحصر ہے کہ ہندوستان کی زمین اب سے کس قدر بہتر روئی پیدا کر سکتی ہے۔ اس وقت ہمارے اسی ہلکے درجے کے سوت کی مانگ اس ملک میں اور نیز چین میں بہت ہے لیکن ممکن ہے کہ کچھہ وقت کے بعد ان ملکوں میں یہ گھٹیا چیز قبول نہ ہو اور وہ ایسی مصیبت ہوگی جو خیال میں نہیں آسکتی۔

گورنمنٹ اس سوال پر بڑی توجہ دے رہی ہے اور ہندوستان کی خوشحالی چاہنے والوں کو ان تجربوں کے نتایج کا بڑا انتظار ہے جو آجکل روئی کی کاشت میں کیئے جا رہے ہیں۔

پنجاب میں ریشم کی صنعت ہمارے صدر انجمن کی سرپرستی میں جاری ہوئی ہے۔ یہ مہاراجہ صاحب بہت کم مغربی عادات کے پابند ہیں۔ اگر اپنے ملک کے تجارتی مفاد کو ترقی دینے کیلیئے بالکل مغربی اصول پر کاربند ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ سری نگر میں ریشم کے کام میں بڑی کامیابی ہوئی ہے اور اب سنا جاتا ہے کہ مہاراجہ صاحب کے دوسرے پایہ تخت جموں میں بھی کام جاری ہونے والے ہیں۔ اور ہم سب آرزومند ہیں کہ ہر جگہہ یکساں کامیابی ہو۔

اب مجھے معدنی صنعت کی نسبت کچھ عرض کرنا باقی ہے۔ ہندوستان نے قدیم زمانے میں معدنیات کے کام میں بہت کچھ کامیابی حاصل کی ہے۔ دہلی میں قطب صاحب کی لاٹھ ایک سائنٹفک معمّا ہے جو آج تک حل نہیں ہوسکا۔ لیکن ملک میں کان کنی اور معدنی صنعت کو بڑھانے کے لئے ابھی بڑا میدان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کے وسیع رقبے کو دیکھتے ہوے اسکے معدنی ذخیرے بہت کم ہیں۔ لیکن جو کچھ بھی ہیں ابھی تک پورے دریافت نہیں ہوئے اور ترقی کیلیئے بہت کچھ گنجایش ہے

دباغت اور چرمی کاروبار کی نسبت چند لفظ کافی ہونگے۔ یہاں بھی بہت کچھ ازدیاد کی گنجایش ہے ہندوستان میں چمڑا رنگنے کا بہت کچھ عمدہ سامان مہیا ہے۔ کانپور اور مدراس میں اسکے متعلق قابل تعریف کوشش ہو رہی ہے اور مسٹر چیٹرٹن نے 'کروم' دباغت بھی مہیا کی ہے۔

چرمی صنعت میں ترقی کا امکان تجارت درآمد و برآمد کے اعداد و شمار سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ میں امپیریل گزیٹیر آف انڈیا کی جلد سوم طبع حال سے اقتباس کرتا ہوں۔ یہ ایسی کتاب ہے کہ ہندوستانی اقتصاد کا شوق رکھنے والوں کو اس کا غور سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس میں لکھا ہے کہ:۔

"بوٹ اور جوتیوں کا داخلہ چند سال سے سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے چنانچہ ۱۸۹۶-۹۷ء میں ایسے مال کی قیمت ۳ء۱۱ لاکھ تھی اور ۱۹۰۳-۰۴ء میں ۹ء۲۷ لاکھ ہے اور بالخصوص قابل ذکر یہ امر ہے کہ گزشتہ دس سال سے ہندوستان سے بوٹ اور جوتیاں باہر بھی جانے لگی ہیں۔ ۱۸۹۸-۹۹ء میں اس قسم کا مال ½۳ لاکھ کا باہر گیا تھا اور ۱۹۰۳-۰۴ء میں ۶ لاکھ کا۔ یہ برآمد بیشتر کلکتہ اور بمبئی سے ہوئی ہے اور مال نٹال کیپ کالونی۔ مارشس اور مصر کو جاتا ہے۔"

اپنی تمام دستکاریوں کو مفصل ذکر نہ یہاں ممکن ہے اور نہ ضرور ہے۔ زیادہ اہم دستکاریوں کا ذکر ہو چکا ہے باستثنا ان کے جو آرٹ کی قسم میں شامل ہیں اور جن سے ہمکو براہ راست تعلق نہ تھا۔ پنجاب میں ہندوستان کے صنعتی عجائبات کا ایک بڑا ذخیرہ ہے اور بحالت مجموعی اس کا کاروبار سستے مغربی نمونوں کے برے اثر سے محفوظ رہا ہے۔

اس سے بیشتر کہ چند نتائج اخذ کروں میں صحیح طالبعلمانہ طریق سے سرسری طور پر بغیر کسی تشریح کے ہندوستانی پیشوں کے شمار د اعداد عرض کرتا ہوں ان شمار و اعداد کو مدنظر رکھنے سے ہمارے ملکی مسائل کی اہمیت معلوم ہوگی اور قیاس ہو سکیگا کہ کہانتک اپنی بہتری کا امکان ہے۔ میں یہ شمار و اعداد ۱۹۰۱ء کی مردم شماری سے لیتا ہوں۔

تقریباً ہماری آبادی کا ۶۷ فیصدی حصہ زراعت پیشہ ہے اور تقریباً ۱۵ فیصدی

خام اجناس مہیا کرتے ہیں اور ان میں سے تہائی سے زیادہ اپنی معاش ماکولات و مشروبات کے اہتمام سے اور ایک چوتھائی کپڑے کا سامان مہیا کرنے سے پیدا کرتے ہیں - اور خانگی اور صفائی کی خدمتوں پر بہت ہی کم تعداد مامور ہے - جن کا شمار کل آبادی کے ۴ فیصدی سے کمتر ہے - ۲ ½ فیصدی گاڑیبانی اور مال لانے لیجانے اور ذخیرہ کرنے کا کام کرتے ہیں - سرکاری ملازمت میں ۱۹ فی ہزار ہیں اور معزز علمی اور صنعتی پیشیوں پر ۷ فی ہزار -

یہ شمار و اعداد کل آبادی کی اوسط ہیں جو شہر اور دیہات کے لحاظ سے باہم مختلف ہونگے - تمام حرفتی کاروبار میں روئی کے کارخانے زیادہ اہم ہیں اور مردم شماری کی رو سے ۳۴۷۷۲۰ اشخاص ان کارخانوں پر مامور ہیں جنمیں سے ۱۸۵۸۷۵ واقعی کام کرنے والے ہیں -

ہمنے مختلف صنعتی سوالوں کے لمبے سلسلہ کو ملاحظہ کیا اور اگرچہ ہمنے ملک کی مادی خوشحالی کے تمام اسباب کو نہیں دیکھا اور نہ ان سب رکاوٹوں پر غور کیا جو ہندوستان کی اقتصادی ترقی کی راہ میں حائل ہیں لیکن پھر بھی سرسری ملاحظہ سے اس قدر معلوم ہو گیا کہ بعض رائیں سراسر غلط ہیں اور یہ کہ غالباً کام کے بعض طریقوں کا انجام ناکامی ہو گی - ہندوستان کی آئندہ اقتصادی حالت کا سوال اگرچہ بہت مشکل ہے مگر اسی قدر دلفریب بھی ہے - ہندوستانی مسائل اب دنیا کی تاریخ میں اہم درجہ رکھتے ہیں اور جائے مسرت ہے کہ ہندوستان کے مسائل پر غور کرنیوالے اصحاب کی ایک جماعت تقریباً تمام بڑے بڑے مغربی ملکوں میں بنتی چلی جا رہی ہے - ہمارے مسائل پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں جن کے سبب سے امور متنازعہ صاف ہوتے جائینگے اور نتائج پیدا کرنے کے اسباب قریب آتے جائینگے -

ہم یہاں رفتار کو بڑھانے کے زیادہ عملی اور صاف اسباب دیکھنے کے لئے جمع ہوئے ہیں جن کے فواید میں کسی کو کلام نہیں ہمیں ہند کے اقتصادی معاملات دیکھنے سے معلوم ہوا ہے کہ ہمکو علم اور ہنر کی ضرورت ہے۔ آیئے ہم اس کا اہتمام کریں جس سے ہماری اقتصادی خوشحالی کی آخری عمارت کیلئے بنیاد کا کچھ نہ کچھ سامان ہو جائے گا۔ ٹیکنکل تعلیم کی ضرورت اب پہلے سے زیادہ ہے۔ قدیم زمانے میں ہندوستان کی دیہاتی اقوام میں تجارت کا ایک مستحکم نظام تھا جس سے لوگوں کو ضروری تربیت بالکل بے ارادہ مگر نہایت موثّر طور پر ہو جاتی تھی۔ ہم ایسے زمانے میں ہیں کہ ذات پات کے تفرقے نے جھتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور قابلیت کو ورثہ میں لینے کے موقعے کم رہ گئے ہیں۔ ایسے زمانے میں ان دستکاریوں کو جنکی تکمیل موروثی قابلیت پر منحصر ہے بہت نقصان پہنچا ہے۔ اسلئے ایسے زمانے میں ٹکنکل تعلیم نہایت ضروری ہو گئی ہے۔ اور اس کے علاوہ ہم اپنے مُلک کی مادّی تاریخ کے ایک نازک زمانے میں سے گذر رہے ہیں۔ اور صنعتی انقلاب یہاں حال ہی میں شروع ہوا ہے۔ پس مشینوں کی ایجاد سے پورا فائدہ اُٹھانے کیلئے ضرور ہے کہ ہنرمندوں کی ایک جماعت کی تربیت کی جائے۔ تاکہ وہ بڑے اعلےٰ درجے کی فکٹری کا کام درست طور پر انجام دے سکیں۔

ہمارا یہ مُدّعا گنگا ماتا سے سیراب ہونے والے پوتّر دیس کے دوسرے مقاصد کے برابر شریفانہ ہے اور علاوہ اسکے عملی بھی ہے یہ انسٹیٹوٹ ایک ضروری اور مُفید مُعین اور عملی مُدعا اس بڑے مُلک کی نسبت رکھتی ہے جسکے اولا ہو ہونیکا ہمیں فخر ہے اور اس لئے اسکے دعاوی ہم سب کی حمایت کے متعلق قابل قدر ہیں۔ اس کے سرپرستوں اور حاکموں کی فہرست میں بڑے بڑے عالی قدر

فرمانروا اور لکھ پتی اُمرا کے نام ہیں مگر باوجود ایسے اعلےٰ مقاصد کے اسکی حالت حوصلہ پست کرنے والی ہے۔ آیئے ہم اس کے وسیع مفاد کو مدّنظر رکھیں اور نئے سال کو نامور وزیر اعظم انگلستان سر ہنری کیمبل بینرمین کے پُر زور الفاظ کے پورے مطالب کا تصوّر جما کر شروع کریں چنانچہ تین سال گذرے انہوں نے فرمایا تھا کہ :-

"کسی قوم کی تجارتی قوّت اور اسکے اسباب میں کوئی چیز دماغ سے زیادہ کام کرنیوالی نہیں ہے۔"

منوہر لال

صورتِ وصل نکلتی کسی تدبیر کے ساتھ ۔۔۔ میری تصویر ہی کھنچتی تری تصویر کے ساتھ

نہ منے روٹھ کے شب کو کسی تدبیر کے ساتھ ۔۔۔ وہ بھی بگڑے رہے بگڑی ہوئی تقدیر کے ساتھ

آہ وہ کیا نہ کھنچے دل سے جو تاثیر کے ساتھ ۔۔۔ تیر کس کام کا پیکاں نہ ہو جس تیر کے ساتھ

نالہ کر بیٹھوں کہیں میں بھی نہ زنجیر کے ساتھ ۔۔۔ گھونٹ دے ضبط گلا طوقِ گلوگیر کیساتھ

مجھکو اور اُس کو تو رکھتا ہے فلک کب یکجا ۔۔۔ دیکھ سکتا نہیں تصویر بھی تصویر کے ساتھ

ہوگیا جلد اگر وصل تو کیا لطف اس میں ۔۔۔ کیجئے وعدہ مگر تھوڑی سی تاخیر کیساتھ

موُنھ کو آتا ہے جگر جیسے فغاں کے ہمراہ ۔۔۔ دم بھی کھنچ آئے یونہیں نالۂ شبگیر کے ساتھ

کچھ پتا ہی نہیں نکلی ہے کچھ ایسی دل سے ۔۔۔ آہ بھی ہوگئی گم آہ کی تاثیر کے ساتھ

سچ ہے کرتا ہے کڑی میں کوئی کسکی شرکت ۔۔۔ نہ سُنا طوق کو نالاں کبھی زنجیر کے ساتھ

ان حسینوں کو زمانہ کبھی سیدھا کردے ۔۔۔ نکلیں ابرو کے بھی بل زلفِ گرہگیر کے ساتھ

مجرمِ عشق ہے تعزیر کا خواہاں تم سے ۔۔۔ کبھی تقصیر سے پہلے کبھی تقصیر کے ساتھ

ای تصور ترا احسان بھی ترے جذب کا بھی ۔۔۔ کھینچلا صاحب تصویر کو تصویر کے ساتھ

خود بھی ہے حُسن کا اپنے وہ پری دیوانہ ۔۔۔ طوق بھی گردنِ نازک میں ہے زنجیر کے ساتھ

نامہ بر پڑھ نہ سکے تو تو پھر اچھا ایلچیل ۔۔۔ کاٹ کر میری زباں بھی مری تحریر کے ساتھ

اُنکا رہ رہ کے تسلی مجھے دینا یہ جلال ۔۔۔ وعدہ ہم لوگ وفا کرتے ہیں تاخیر کیساتھ

حکایۂ لیلیٰ و مجنوں

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

(۵)

"جناب اڈیٹر صاحب پیسہ اخبار۔ آج میں نے ایک ایسا عجیب نظارہ دیکھا کہ اسے آپ کے ناظرین تک پہونچائے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

میں اتفاقاً آج دوپہر کو زوالوجیکل گارڈنز (باغ حیوانات یا عرف عام میں چڑیاخانہ) کی طرف چلا گیا۔ دوپہر کا وقت تھا اور لاہور کی دھوپ۔ مشکل سے کوئی آدمی وہاں نظر آتا تھا۔ کہ اتنے میں میری نظر ایک شخص پر پڑی جسنے بے اختیار مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ یہ ایک خوشرو جوان تھا۔ لباس تو وہی تھا جو آجکل کل ممالک متمدنہ کے لوگوں کا لباس ہے، مگر چہرہ اور خط وخال صاف بتا رہے تھے کہ ہندوستان کا آدمی نہیں ہے۔ اہالی یورپ کا بھی نقشہ نہ تھا، وہ کرختگی، وہ شان تبختر چہرے سے نمایاں نہ تھی؛ چہرہ پر ایک غمگینی مگر ساتھہ ہی اسکے بلا کی متانت تھی؛ ایک شعریت تھی جو الفاظ میں نہیں آسکتی؛ ایک محزونیت تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دل عمیق تجسسات کا آماجگاہ رہتا ہے۔ میں نے جلد معلوم کرلیا کہ یہ شخص۔ جو خوشحال اور اچھے گھرانے کا اور اچھی تعلیم پائے ہوئے معلوم ہوتا تھا۔ عرب اور وہ بھی قبلۂ شعرا، کعبۂ ادبا سرزمین نجد کا عرب ہے۔ میری عربی دانی آج کام آگئی، اور میں نے وہ کچھہ دیکھا اور وہ کچھہ سُنا جو ابتک مجھے حیرت میں ڈالے ہوئے ہے؛ اور خود میں شبہہ کر رہا ہوں کہ

آیا میری آنکھ نے غلطی تو نہیں کی، اور میرے کانوں نے دُھوکا تو نہیں کھایا۔ یہ شخص بایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں، اور داہنے ہاتھ کا انگوٹھا واسکٹ میں ڈالے اور باقی چار انگلیاں باہر نکالے، ٹوپی پیچھے کو ڈالے، ایک لاؤ بالیانہ انداز سے ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر پھر رہا تھا۔ کبھی اس کٹہرے کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا، کبھی اُس کٹہرے کے اندر کے جانوروں یا پرندوں کو منٹوں کھڑا غور سے دیکھتا تھا۔ ایک دفعہ ایک پارک کے قریب جسکے گرد تار کھنچا ہوا تھا ٹھٹک گیا۔ اس پارک میں، جیسا آپکو معلوم ہے، ہرن اور اُنکے مختلف اقسام جمع ہیں۔ اِس خاص مجموعہ کیلئے لاہور کا باغ حیوانات بالتخصیص ممتاز ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مجموعہ، اس اجنبی کے لئے خاص دلکشی رکھتا تھا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ وہ یہاں بڑی دیر تک کھڑا رہا۔ دھوپ کی وجہ سے ہرن، دور درختوں کے سائے کے نیچے کھڑے تھے۔ لیکن وہ انہیں اپنی طرف بُلانا چاہتا تھا۔ اُسنے اوّل تو ہری، ہری دوب چھانٹ کر، اور اپنے ہاتھ میں لیکر انکو دکھائی، مگر پارک میں دوب کی کمی نہ تھی، اِسلئے وہ اسکی طرف متوجہ نہ ہوئی۔ پھر یہ نوجوان وہاں سے چلا گیا، اور تھوڑی دیر میں واپس آیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس نے جیب میں سے کچھ چینے اور جو وغیرہ نکال کر ڈالے۔ اِس دفعہ وہ کامیاب ہوا، اور کچھ ہرن اُسکی طرف آئے۔ یہانتک تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ لڑکے اور عورتیں اور بڑے آدمی بھی، جنھیں حیوانات سے دلچسپی ہے اور اس بے زبان مخلوق سے ہمدردی رکھتے ہیں، باغ حیوانات میں آکر انہیں کچھ کھلاتے ہیں بتعجب کی بات تو وہ تھی جسے اب میں بیان کرتا ہوں ان ہرنوں میں چند غزال عرب بھی تھے۔ غزال عرب جیسا سب جانتے ہیں۔

ہرن کی جنس میں سب سے زیادہ حسین، متناسب الاعضاء، اور ہلکے بدن کا ہوتا ہے۔ یہ جب اسکے پاس آیا تو نوجوان نے ایک وارفتگی سے اس کے مونہہ کو پکڑ کے اُسکی آنکھوں کو چومنا شروع کر دیا۔

غزال ایسی محبت کا عادی نہ تھا، اور وہ کوشش کر کے اپنے تئیں چھڑا کے، ہوا میں چوکڑی بھرتا، اور اپنے خوبصورت پتلے کھُروں کے نشان زمین پر لگاتا، بھاگ گیا اور دُور جا کے کھڑا ہو کے، مُڑ مُڑ کر اسکی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے دیکھا کہ نوجوان کے چہرے پر محزونیت کے علائم زیادہ گہرے ہو گئے، اور اُسنے جنگلے سے ٹیکا لگا کے عربی زبان میں یہ کہنا شروع کیا:

"معلوم ہوا، بس نجد میں ہی نہیں (اور اس فقرے سے میں سمجھا وہ نجدی ہے) بلکہ ہر جگہہ یہ مجھسے نفرت کرتے ہیں۔ اسکی وجہ کیا ہے۔ ما ادری میں انکے بُرا چاہنے والوں میں تو ہوں نہیں، لا واللہ۔ مگر۔" اور یہاں اُسنے ایک شعر پڑھا جسکا اگر سرسری ترجمہ کیا جائے تو یہ ہو سکتا ہے:

عیناً لیلٰے کا سا چلن ہے دیکھو سارے غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھہ اچھی آنکھوں والوں کا

سوائے اُس لڑکی کے کہ میں اُسکی توجہات اور عنایات کا ممنون ہوں، باقی اور میں نے کسی لیلٰے چشم کو اپنی طرف مائل، اپنے اوپر رحیم نہ پایا؛ اور مصیبت یہ ہے کہ میں ایک بے اختیارانہ، بے تابانہ کشش سے انکی طرف کھنچتا ہوں۔ آہ! لیلٰے، میں تیری پرستش کہاں کہاں اور کس کس چیز کو دیکھہ کر کرتا ہوں؛ تجھے کچھہ خبر بھی ہے؟ مگر تجھے کیا خبر اور خبر ہونیکی ضرورت ہی کیا!!"

یہ کہکر اُس نے کوٹ کی جیب میں سے ایک رومال نکالا اور چہرے پر رکھ لیا، اور آہستہ آہستہ وہاں سے باہر چلا گیا اور میری نظروں سے غائب ہو گیا۔

اِس نظارہ سے کون متاثر نہوتا۔ میں متاثر ہوا مگر اُس سے زیادہ متعجب۔ یہ معاملہ کیا تھا، قصہ کیا تھا؟ لیلٰے! انجد! میں صحیح سُن رہا تھا، یا وا ہمہ نے صورتیں اور مکالمہ پیدا کر دیا تھا؟ مگر میں صحیح صحیح عرض کرتا ہوں کہ جب میں اُس باغ میں گیا ہوں، نہ میں نجد کا خیال کر رہا تھا، اور نہ لیلٰے کا نام میرے ذہن میں تھا۔ اِس حیرت انگیز واقعہ کی توجیہہ کرنے سے میں تو قاصر ہوں۔ آپ اور آپ کے معزز اخبار کے بیشمار ناظرین کی خدمت میں اِس غرض سے پیش کرتا ہوں کہ اسکے متعلق اپنی رائے سے بذریعہ پیسہ اخبار کے مطلع فرما دیں۔ کیا یہ ممکن ہو کہ سیکڑوں برس کے بعد اُس سرزمین میں جسکا نام ہی ہم مشرقیوں کے دلوں میں، دو زندہ جاوید عاشق و معشوق کی یاد زیادہ کر دیتا ہے، کیا یہ ممکن ہے ــ میں ڈر ڈر کے کہتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے اس خیال پر لوگ میری ہنسی اُڑائیں گے۔ میں کہتا ہوں کیا یہ ممکن ہے کہ اُس سرزمین میں جو اُس عجیب و غریب ڈرامے کی تماشا گاہ رہی ہے، پھر وہ ایکٹر آ کھڑے ہوئے ہوں؟

راقم
متحیر و متعجب

انتخاب از پیسہ اخبار مورخہ ۲۰ اپریل سنہ ۱۹۰۰ء

۲۰ اپریل سنہ ۱۹۰۰ء کا "متحیر و متعجب" شاید اس کی توجیہہ نہ کر سکے۔ مگر ہمارے ناظرین کو کسی قسم کی توجیہہ کی ضرورت نہیں، وہ تمام واقعات سے کماحقہ واقف ہیں۔ صرف اتنا کہنا ہے کہ قیس، دو دن ہوئے، دلّی سے اپنے وطن جانیکے ارادے سے روانہ ہو چکا تھا۔ دو ایک دن کے لئے

لاہور بھی ٹھہر گیا، اور یوں ہی باغ حیوانات کی سیر کو چلا گیا تھا۔

باغ حیوانات سے متاثر و محزوں، اپنی جائے قیام پر آیا تو اُسے ایک اور مارکونیگرام ملا، جو دہلی ہوتا ہوا یہاں آیا تھا :-

"اِس عرصہ میں میری طبیعت پھر اچھی نہیں رہی، نقاہت بہت ہوگئی تھی، کل شب کو کوئی آٹھ یا نو بجے ڈاکٹروں نے میرے ہاتھوں کو (برقی بیٹری) Electric Battery لگائی اُسوقت تو ہاتھوں میں بہت اینٹھن ہوئی اور تکلیف پہونچی، مگر اب حالت بہت بہتر ہی ہے"

ناظرین نے حساب لگا لیا ہوگا، یہ وہ رات تھی اور وہ وقت تھا جبکہ دہلی میں قیس، سو فلاں پر سے گر پڑا تھا اور اُسکے ہاتھ اینٹھنے لگے تھے۔

ڈاکٹروں نے اُسوقت مرگی تشخیص کی تھی۔ معلوم ہوا علم طب، اُسوقت ہمارے زمانے سے بھی بہت زیادہ ترقی کر گیا تھا!

(۶)

ریل کا اسٹیشن تھا، اُس شہر کا جو اِس خصوصیت کے لحاظ سے دُنیا میں یگانہ ہے، کہ یہاں ملت واحد رہتی ہے، اور خدائے واحد کی پرستش کرتی ہے؛ جہاں انسان خدا کو خدا مانتا ہے؛ اور اُسکے پرعظمت، پرہیبت خیال کو سامنے رکھکر۔ خیال کو، خیال کے سوا کسی اور چیز کو نہیں۔ اُسکے مقابل میں اپنے عاجز سر کو جھکاتا ہے؛ جہاں تک پہونچنے، جسے ایک دفعہ دیکھنے کی آرزو دنیا کی آبادی کے ایک بڑے حصہ کو ہے؛ جس کے قریب پہونچکے امارت و اسارت، راحت و نعمت، علمیت و جہالت، اپنے ظاہری لباسوں اپنے بیرونی رنگ برنگے پرالوان کو علیحدہ کر کے، ایک سفید، ایک بے داغ، گویا اپنے تمنائے دلی (یعنی کاش اسکی طرح ہم بھی بے لوث و بے داغ ہوتے)

کو ظاہر کرنیوالے لباس میں ملبّس ہوکر، عقیدت کے ولولے اور جوش کے
غلغلے کے ساتھ آگے بڑھتی ہے؛ جہاں میں نہیں کہتا کہ گناہ نہیں ہوتا،
مگر جہاں ارتکاب گناہ کی نیت سے لوگ نہیں جاتے، جسکی طرف، خدا کو
اپنے لئے نہیں سوچنے والا، دنیا کے کسی حصے میں ہو، احتراماً مونہہ کرتا ہے،
جہاں موحدین کا قبلہ، مسلمین کا کعبہ ہے؛ جو مکہ ہے. سکۃ الحدید اعجاز
کے اس موقف پر قطار آکر ٹھہری. مدیر الموقف، جلدی سے اپنے ادارہ سے
نکلکر انتظام و نگرانی کے لیئے باہر کھڑا ہوا. قطار کی گاڑیوں کی کھڑکیاں
کھلنی شروع ہوئیں. اور اُن میں سے، عقیدت و اخلاص کے جوش میں
متوالی، اپنی منزل مقصود تک پہنچ جانیکی خوشی میں سراسیمہ، دنیا کے ہر حصہ
اور ہر زبان کے بولنے والی خلقت نکلنے لگی.

اس خلقت کے ہجوم میں ہمارا قیس اور اُس کا باپ بھی تھا!

ہندوستان سے واپسی پر، قیس کی حالت میں کوئی بہتری ظاہر نہیں
ہوئی تھی. لوگوں کو توقع تھی، اور اس توقع میں اُسکا بیچارہ، درماندہ حیران و
پریشان باپ بھی شریک تھا، کہ ہندوستان سے واپس آنے پر وہ قیس
لیلےٰ کا اسقدر گرویدہ نہ رہیگا. سفر اور غیر ممالک کے مناظر اُسکو نئی دلبستگیاں
دکھائینگے نئی دلچسپیاں ہوجائینگی، اور وہ لیلےٰ کے تصور کی اس قدر رٹ
نہ لگائیگا! قیس کے حصول مرام کی جہانتک اُسکے شفیق باپ سے ہوسکتا تھا،
اس نے کوشش کی تھی، مگر لیلےٰ کا مغرور، دولت اور عالیخاندانی کے نشہ
میں سرشار خاندان ان کوششوں کو نہایت حقارت سے ادا کرچکا تھا.

اُس کا باپ سمجھتا تھا کہ وہ اسقدر گرویدہ نہ رہیگا، مگر ہوا کیا؟ جس وقت
وہ واپس آیا تو ایک ایسے انسان کی طرح جو بہت دنوں تک بھوکا رکھا گیا ہو،

اور پھر اسکے سامنے عمدہ کھانا پیش کیا جائے، نتائج کی طرف سے بےپروائی
کے ساتھہ اسنے لیلےٰ سے ملنے کی کوشش کرنی شروع کی۔

جب اسکے خطوط پے در پے وہاں سے واپس آنے لگے، تو اسنے "العصر"
قسیم[1] میں جو نجد کا سب سے بڑا اخبار تھا لیلےٰ کے لئے خطوط چھپوانے شروع
کر دئے؛ وہ اپنی بے تابی اور بے صبری کو نہایت پُردرد الفاظ میں ظاہر کرتا تھا۔

ل - کو (ابھی اُس میں اتنی عقل تھی کہ لیلےٰ کا نام درج نہیں کرتا تھا)

تمھارے قدموں تک میری جبیں کا پہونچنا کجا، تمھارے حضور تک میرے
فریاد نامے بھی نہیں پہونچتے؛ نہیں پہونچنے دئے جاتے۔ تمھارے جو دو ایک
مار کونیگرام مجھے ملے ہیں، انہوں نے مجھے اسکی ہمت دلائی ہے کہ میں تمسے
تمھاری توجہات کی مداومت و ایفا کی التجا کروں۔ مگر عرصے سے وہ بھی بند
ہیں۔ کیا ایک ملک، ایک شہر میں رہکر میں خیریت مزاج کی خوشخبری سے بھی محروم
رہونگا؟ آہ نجد میں رحم نہیں رہا، نجد میں شاید ہو مگر تمھارے خاندان میں نہیں۔ ق۔

کچھہ یہ ہی ہوتا آیا ہے کہ محبت میں لوگ سمجھتے ہیں کہ باقی دنیا کی آنکھیں
نہیں، اور کوئی انکے راز کو نہیں جانتا، انکی کیفیت کو نہیں دیکھہ سکتا۔ چنانچہ وہ
یہ سمجھتا تھا کہ کوئی اس اشتہار کے، (سوائے لیلےٰ کے) معنی نہ سمجھیگا؛ نہ کسی
کو یہ پتا چلیگا کہ کس کی طرف سے ہے اور کس کے لئے ہے۔

مگر ان اشتہاروں نے، اسکی اور اسکے ساتھ لیلےٰ کے خاندان کی خوب
شہرت کی؛ وہ ظاہر ہے کہ ان کو پڑھ پڑھ کے آگ بگولا ہو گئے۔ اور انہوں نے
"العصر" پر ازالۂ حیثیت عرفی کے دائر کرنے کا تہیہ کر لیا۔ لیکن لوگوں نے
بیچ میں پڑ کر مصالحت کرا دی اڈیٹر نے نہایت لجاجت سے معذرت خواہی کی۔

[1] نجد کا سب سے بڑا شہر۔

اور اس بات کا یقین دلایا کہ آیندہ سے اس قسم کے اشتہار کسی صورت میں نہ چھپینگے۔

یہ حالتیں دیکھکر اُسکا والد حیران تھا اور اُسے کوئی ترکیب نظر نہ آتی تھی۔ لیلےٰ کا خاندان اپنی طرف اڑا ہوا اُدھر قیس کی یہ کیفیت۔ بیچارہ اپنے تئیں ایک بڑی مصیبت میں مبتلا پاتا تھا۔ آخر اُسنے مذہب کی طرف رجوع کی، اور اس اُمید پر کہ وہاں پہونچکر قیس روبراہ ہوگا، اور وہاں اُسکے اصلاحِ مزاج کی دُعا قبول ہوگی، وہ اپنے (دُنیا کی نظر میں دیوانے) بیٹے کو لیکر مکّہ آیا۔

وہاں آیا، جہاں ہر شخص اپنی عزیز ترین تمنا لیکر آتا ہے، اور جہاں سے - جس در کے سامنے، جس چھت کے نیچے - سب سے زیادہ صمیمی، سب سے زیادہ دلی دُعائیں مانگی جاتی ہیں، یا زیادہ صحیح یہ کہ ہر جگہہ سے زیادہ قوی اُمیدِ اجابت کے ساتھہ تختِ سماوی کی طرف جاتی ہیں (ورنہ صمیمیت تو دنیا کے ہر گوشہ میں فریادِ قلب کر رہی ہے) وہاں وہ اسے لیکر پہونچا۔ خود خضوع و خشوع سے دُعا مانگی اور قیس سے بھی کہا کہ اپنی قابلِ رحم حالت سے نجات پانے کے لئے دستِ دُعا اُٹھائے۔

اور قیس نے دستِ دُعا اُٹھائے، اور انتہائے صمیمیت، غائتِ تضرّع سے، اعماقِ دل سے نکلنی والی صدا سے، دُعا مانگی۔ مگر کیا؟ وہی جو اُس نے سیکڑوں برس پہلے مانگی تھی، اور جو ہر قیس طبیعت چاہے وہ کہیں ہو اور کسی زمانے میں ہو، مانگیگا:-

"میں جس مصیبت میں مُبتلا ہوں، خدا کرے وہ کبھی نہ کم ہو"

سجاد حیدر

کلام ولی

ولی کو موجد شعر اردو سبھوں نے بالاتفاق تسلیم کر لیا ہے۔ اُس سے پہلے بھی کسی کسی نے ریختے میں کلام موزوں کیا ہے مگر اصل بنیاد ولی ہی کی ڈالی ہوئی ہے۔ ہمکو صرف اسکے کلام پر ایک تنقیدی نظر ڈالنا ہے۔ انکے سوانح کو اسکے حالات سے کچھ بحث نہیں۔ علاوہ بریں اسکے حالات بھی اچھی واضح طور پر معلوم نہیں ہو سکتے۔ اسقدر کہدینا کافی ہے کہ عالمگیر کے وقت میں اسکو شہرت حاصل ہوئی تھی اور محمد شاہ کے زمانے میں گجرات سے دہلی میں آیا تھا اور بہت سے لوگ اسکے فیض سے سخنور بنے تھے۔ اُسوقت سوائے فارسی شاعری کے کوئی ذکر ہی نہ تھا۔ ریختہ سے لوگ ناواقف تھے۔ اس زمانے میں ولی نے ریختہ کہا اور ایسا کہا کہ فارسی کہنے والے اُردو کی طرف مائل ہوگئے۔ واقعی یہ ولی کی کرامت تھی۔ ولی کا کلام دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے کہ یہ اُردو کا پہلا شاعر ایسا ترانہ سُنا گیا کہ گزشتہ دو سو برس میں اسکا جواب نہو سکا۔ رنگین بیان شعراء گزرے ہیں۔ زورِ کلام سخنوروں نے دکھایا ہے۔ مضمون آفرینی کے کرشمے بہت دیکھنے میں آئے ہیں مگر وہ سادگی وہ حلاوت جو ولی کے کلام میں موجود ہے سوائے میر کی غزلوں کے ہم کہیں نہیں دیکھتے۔ شاعری کے لئے جیسی طبیعت کہ ولی کے حصے میں آئی تھی کم کسی کو نصیب ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ باوجود دو سو برس گزر جانے کے ہم آج بھی ولی کے کلام سے لطف اُٹھاتے ہیں۔ اس عرصہ دراز میں کتنے باکمال سخنور اپنا اپنا کمال دکھا کر چلے گئے اور ہمکو انکے نام تک کی خبر نہیں ہے۔ کتنے اپنے وقت کے اُستاد تسلیم کئے گئے لیکن چونکہ انکا کلام انہیں کے

زمانے کے حسب مذاق تھا دیتا تاکہ اپنی دلفریبی کو قایم نرکھ سکا - دلی کی زبان کو گو آج کی اُردو سے کوئی مناسبت نہیں مگر دلوں کو اس سے بوئے آشنا آتی ہے - اُسکی شاعری باوجود یکہ بہت سے اساتذہ عجم کی پوری پوری پابند ہے ہمیشہ خاطر محبت سرشت وحسن آشنا میں چٹکیاں لیتی رہیگی کیونکہ وہ جذبات قلبی کی ترجمان ہے - البتہ جنکو صحیح مذاق سخن نہیں ہے (اور ایسے ہی لوگوں سے ہمارا ہندوستان بھرا ہوا ہے) وہ دلی کی پرانی زبان میں کچھہ مزہ نہ پائینگے -

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ شعر گوئی مبتذل ہوگئی ہے اور ہندوستان میں گروہ شعر گویاں میں جسقدر کمی ہو خوشی کی بات ہے مگر کیا یہ زیبا ہے کہ ہم اپنے قدیم شعرا کو جنکی بدولت آج ہم ایک مہذب اور فصیح زبان کے بولنے والوں میں شمار کئے جاتے ہیں بالکل بھول جائیں اور اپنی غفلت سے اُنکی بیش بہا تصانیف کو ضایع ہونے دیں؟ چاسٹر[1] - اسپنسر[2] وغیرہ جن کی زبان آجکل کی زبان سے بالکل الگ ہے ہنوز زندہ ہیں - ان کے کلام متعدد مطابع میں چھپ چکے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں - یہاں بد مذاقی کا یہ حال ہے کہ نولکشور نے نایاب کتابیں بصرف زر کثیر چھپوائیں مگر ناقدری سے بارثانی کی نوبت نہ آئی اور رفتہ رفتہ وہ سب کتابیں اب نایاب ہو چلی ہیں -

دلی کی پرانی زبان پر آجکل کی اُردو والے ہنستے ہیں اور یہ نہیں جانتے

+ اس "شعر گوئی" سے میری مراد اُن لوگوں کی شعر گوئی ہی جو سمجھتے ہیں کہ شعر کہنا گویا فرض ہے اور ہر شخص کو کچھہ نہ کچھہ کہنا چاہیئے گو فطرت کا تقاضا برعکس ہو - (وحشت)

[1] [2] دونو قدیم شعرائے انگلستان میں ہیں -

کہ ہماری موجودہ زبان بھی ایک دن یونہیں پُرانی ہوجائیگی اور آیندہ نسلیں ہم پر ہنسینگی۔ مجھکو تو بذاتِ خود اِن متروک لفظوں میں ایسا مزہ ملتا ہے کہ کیا کہوں۔ میرے ایک دوست نے ایک بار میر کا یہ شعر پڑھا ؎

دور بہت بھاگو ہو ہمسے سیکھہ طریق غزالوں کا وحشت کرنا شیوہ ہی کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

اور کہا کہ اس ایک "بھاگو ہو" پر ہزاروں "بھاگتے ہو" قربان ہیں اور واقعی جو انہوں نے فرمایا ہے نہایت درست ہے۔ جسکو خدا نے مذاق صحیح عطا کیا ہی وہ اِن رموز کو سمجھہ سکتا ہے۔ اب ہم ولی کے کلام سے انتخاب پیش کرتے ہیں:-

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا شاید کہ مرا حال اُسے یاد نہ آیا

کمال دیکھیے یہ شعر بالکل حال کی زبان میں ہے۔

اگر جاوے پیا کی مکھ طرف بخت آزمائی کوں (کو) کرے پیو (معشوق) کا تغافل اُٹھ کے استقبال عاشق کا

کیسا نازک مضمون اپنی پُرانی زبان میں باندھ گیا ہے۔ بخدا کہ عرفی و نظیری اس سے بہتر نہیں کہہ سکتے۔ کہتا ہے کہ اگر عاشق اپنے بخت کی آزمایش کے لئے اپنے محبوب کے پاس جائے تو اُسکا استقبال محبوب کا تغافل اُٹھکر کریگا یعنی اُسکو عاشق کے آنے کی خبر تک نہو گی۔ حُسن بیان کتنا اچھوتا ہے۔

جو بھید سوں واقف نہیں اور طعن عاشق پر رکھے تو عاشق جانباز کوں اُس بیخبر سوں کام کیا

"سوں" سے مراد "سے" ہے اور "کوں" سے "کو"۔ باقی مطلب ظاہر ہے یعنی ناصح مشفق سے عاشق کو کیا کام۔ بقول غالب ؎

یہ کہاں کی دوستی ہی کہ بنے ہیں دوست ناصح کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

تری بن مجھکو اے ساجن تو گھر اور بار کرنا کیا اگر تو نا اچھے (آئے) مجھہ کن تو یہ سنسار کرنا کیا

کسقدر حسرت انگیز مضمون ہی۔ کہتا ہے کہ اگر تو ہی میرے گھر نہ آیا تو بھلا گھر بار سے مجھکو حاصل۔

اوّل سوں جب تھی آنے کی منسا دلیں تمناں کے تو مجھسے دُکھ بھرے سَں پھر جُھٹا اقرار کرنا کیا
جھوٹا

'اول' میں واو مشدد نہیں ہے۔ منسا بمعنی ارادہ۔ دل میں تمناں کے یعنی تمھارے دل میں۔ ان پرانے لفظوں اور ترکیبوں پر نجایئے بلکہ اسکو دوسری نظر سے ملاحظہ فرمایئے اور بیان کی خوبی پر نظر ڈالیئے۔ کہاں تک ایک شعر میں درد بھر دیا ہے۔

صبح تیرا درس پایا تھا صنم شوق دل محتاج ہے تکرار کا

لطف یہاں قابل دید ہے۔ کہتا ہے کہ صبح تیرا درس پایا تھا یعنی تیرا دیدار ہوا تھا اب دِل کا تقاضا یہ ہے کہ پھر ہو۔ درس کا لفظ بمعنی سبق بھی ہے اور تکرار نہایت چسپاں لفظ واقع ہوا ہے۔

یوں شعر تیرا ای ولی مشہور ہے آفاق میں مشہور ہے جوں کر سخن اُس بلبل تبریز کا
جیسے

یہ اپنے ہمعصر صائب تبریزی کی طرف اشارہ ہے۔

محبت کے مرے دعوی پہ تا ہوئے سند مجکوں لکھا ہوں صفحۂ سینہ خچن دل سوں نام اُسکا
ہے
مجھکو

شغل بہتر ہے عشقبازی کا کیا حقیقی و کیا مجازی کا
آج تیری بھواں نے مجلس میں ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا
بھویں
ہر زباں پر ہے مثل شانہ مدام ذکر تجھ زلف کی درازی کا
تیری
گر نہیں راز عشق سوں آگاہ فخر بیجا ہے فخر رازی کا

یہ غمزۂ شوخ ساحری میں — اُستاد ہے سحرِ سامری کا
تجھ تل سوں ای آفتاب طلعت — ممنون ہوں ذرہ پروری کا
تیرا خط سبز رنگ اے شوخ — سلطان ہے خشکی وتری کا

"خضر رنگ" کا لفظ برعایت سلطان خشکی وتری کسقدر مناسب ہے۔

تو سر سوں قدم تلک جھلک میں — گویا ہے قصیدہ انوری کا

سبحان اللہ تشبیہ میں کیا زور پیدا کیا ہے۔ بالکل نئی مثال ہے۔

عیاں ہی ہر طرف عالم میں حسن بیحجاب اُسکا — بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اُسکا

ایسے مطلع پر تو ظہوری و شوکت کو ناز ہوتا

کتابت بھیجنی ہی شمع بزمِ دلکو ای کاتب — پر پروانہ اوپر لکھ سخن مجھ جانفشانی کا

"شمع بزم دل" کی جلوہ گری ملاحظہ ہو۔ رنگیں بیانی پر جب طبیعت مائل ہوتی ہے تو ایسے ہی پھول جھڑتے ہیں۔

ولی جن نے نہ باندھا دلکو اپنے نونہالاں سوں — نہ پایا پھل جہاں میں اُسنے ہر گز زندگانی کا

پریرویاں کے کوچے میں خبرداری سوں جا ای دل — کہ اطراف حرم میں ہے ہمیشہ ڈر حرامی کا
ولی لکھتا ہی تیری بیت ابرو دیکھ ای ساقی — بیاض گردن مینا اُپر دیوان جامی کا

گزر ہے تجھ طرف ہر بوالہوس کا — ہوا دھاوا مٹھائی پر مگس کا

کیا مزہ دار مطلع کہا ہے۔ نواب یوسف علیخاں ناظم مرحوم کا شعر بھی اس مضمون کا خوب ہے کہتے ہیں ؎ حلوا اور پھر لطیف دبے دود ۔ لب پر ترے دانت ہی بھی کا۔

موسیٰ کبھی جو دیکھے تجھ نور کا تماشا — اُسکو پہاڑ ہوئے پھر طور کا تماشا

دوسرا مصرع کتنا بے تکلف ہے۔

یہ غزل معلوم ہوتا ہی کسی زن ہندو کے عشق میں کہی ہی اور برخلاف رسوم شعراء ریختہ گو کے فعل مؤنث کا استعمال کیا ہے۔ غزل بہت پُر درد ہے کہتا ہے:۔

مت غصّے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا | ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا
تجھہ چال کی قیمت سوں دل نیں ہے مرا واقف | اے مان بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا
تجھہ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری | اے بت کی پوجن ہاری ٹک آس پوجاتی جا
تجھہ عشق میں جل جل کر سب تن کوں کیا کاجل | یہ روشنی افزا ہے انکھیاں کوں لگاتی جا
مجھہ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے | یہ کام دھرم کا ہے ٹک اسکو چھڑاتی جا
تجھہ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دایم | مشتاق درس کا ہے ٹک درس دکھاتی جا

ہے قد ترا سراپا معنیٔ ناز گویا | پوشیدہ دل میں میرے آتا ہے راز گویا

زبان۔ لطف بیاں۔ بندش ملاحظہ ہو۔ خصوصاً تشبیہ کی خوبی۔ اس سے بہتر اس زمین میں مطلع نہیں ہو سکتا۔

طاقت نہیں کہ حشر میں ہوئے وہ دادخواہ | جس بیگنہ پہ تری نگہہ سوں ستم ہوا

مولانا غنیمت کا بھی ایک شعر اسی رنگ کا ہے گو مضمون جدا ہے۔ فرماتے ہیں:-

مستم از آں نگاہ کہ آید بروز حشر | بوی شراب از دہن داد خواہ او

تجھہ مکھہ کے مصحف کے اندر آیت جو دیکھی قہر کی + ہیبت سوں جز زیروزبر دل ٹوٹ سیپارہ ہوا

سیپارہ کا لفظ کتنا مناسب مضمون ہے۔ "زیروزبر" بھی کم موزوں نہیں ہے۔

گلزار کے صحبت میں تھی راستی کی گفتگو | شمشاد کا تجھہ سرو پر اکثر سخن بالا ہوا
کاجل نین کا دیکھکر بولیں ہیں یوں دردگراں | عشاق کی تسخیر کوں یہ سحر بنگالا ہوا

بیکسی کے حال میں اک آن بھی ملتا نہیں | غم ترا سینے میں میرے ہمدم جانی ہوا

افسوس اے عزیزاں وہ سیمبر نہ آیا | مجھہ درد کی خبر سن وہ بیخبر نہ آیا
بیمار ہیں برہ کے نہیں کوئی مہرباں ہو | مجھہ دکھ کے پوچھنے کو جز دردِ سر نہ آیا
ہیں غم سوں گل سراپا جوں مو ہوا ہوں لیکن | مجھہ ناتواں کی جانب وہ موکمر نہ آیا
آزاد سوں سنا ہے یہ مصرعہ مناسب | جس سیتی یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

آزاد کوئی انکا ہمعصر ہو گا۔

ملاوہ گلبدن جسکوں اُسی گلشن سوں کیا مطلب + جو پایا وصل یوسف اُسکو پیراہن سوں کیا مطلب

بیوفائی نکر خدا سوں ڈر جگ ہنسائی نکر خدا سوں ڈر
ہے جُدائی میں زندگی مشکل آ۔ جُدائی نکر خدا سوں ڈر

"آ جدائی نکر" کسقدر بے تکلف اور پرلطف ہی۔ غالب کے ہاں بھی اسی قسم کا ایک حسرت انگیز شعر ہے۔ کہتا ہی ؎ آ۔ کہ مری جاں کو قرار نہیں ہے + طاقت بیداد انتظار نہیں ہے۔

چمن میں جب چلے با اِس حُسنِ عالمتاب سوں اُٹھکر کرے تعظیم خوشبو ہر گل سیراب سوں اُٹھکر

بُو کا گُل سے اُٹھکر تعظیم کرنا کسقدر رنگین خیالی ہی۔ شیخ علی حزیں کا شعر بھی ملاحظہ ہو

؎ چوں باد صبا بوئے ترا در چمن آورد برداشتہ ہر شاخ گلے دستِ دُعا را
تری باتوں کی نرمی کی اگر شہرت ہوئے عالم میں وہیں آوے قدمبوسی کو مخمل خواب سوں اُٹھکر
تری ابرو کی پہنچے گر خبر مسجد میں زاہد کوں تماشا دیکھنے آوے ترا محراب سوں اُٹھکر
کرے گر آرسی گھر میں لجا تجھہ مکھ کی مہمانی دُھلاوے ہاتھہ کوں تیری آپس کے آب سوں اُٹھکر

نازکخیالی کی انتہا ہے۔

جو آیا مست ساقی جام لیکر گیا اکبارگی آرام لیکر
نگہہ تیری سدا آتی ہی جوں تیر دلِ زخمی طرف پیغام لیکر
بجا نوں خط ترا کِس بیخطا پر چلا ہے آج فوج شام لیکر
بنائی ہے جہاں میں لیلۃ القدر سیاہی تجھہ زلف سوں دام لیکر
میں اُسکو جوں نگیں کرتا ہوں سجدہ جو کوئی آتا ہے تیرا نام لیکر

تشبیہ کی خوبی ولی پر ختم ہی۔ کسی ریختہ گو کے کلام میں یہ لطف تشبیہ کا نہ آئیگا۔

عاجزاں کے اُپر ستم مت کر اِسقدر سختی اے صنم مت کر
اِس ترقی کیوقت میں اے شوخ مہربانی آپس کی کم مت کر
رحم بیجا ستم برابر ہے یوں رقیباں اُپر کرم مت کر

میں تجھے آیا ہوں ایماں بوجھکر
باعثِ جمعیّتِ جاں بوجھکر
رحم کر اس پر کہ آیا ہے ولی
دردِ دل کا تجھکو درماں بوجھکر

ہر جھلک دیتی ہے تجھ رخسار کی
آرسی کو درسِ حیرانی ہنوز
یہ شعر ایک غزل کا ہی جو خسرو کی فارسی غزل کیطرح پر کہی گئی ہے جسکا ایک شعر ہے۔
قیمتِ خود ہر دو عالم گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز
راقم کا بھی اس زمین میں ایک مطلع ہے ؎
بہرِ دردِ غیر درمانی ہنوز
یعنی از حالم نمیدانی ہنوز!

لباس اپنا کیا وہ گلبدن سبز
ہوا سر تا قدم مثلِ چمن سبز
اگر اس سج سوں آوے انجمن میں (اس گلبدن بنے)
تو ہوئے بخت اہلِ انجمن سبز
فصاحت کیا کہوں اس خوش سخن کی
کسی کا واں نہیں ہوتا سخن سبز
ولی جو جیو دیا لو خط کو کر یاد
بجا ہے گر کریں اس کا کفن سبز

ہوں گرچہ خاکسار دلے از رہِ ادب
دامن کو تیرے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز
بیان کی صفائی بندش کی چستی اور مضمون کی خوبی سب اپنی اپنی جگہ ستایش
طلب ہیں۔ کون کہیگا کہ یہ شعر دو سو برس کا پرانا ہے۔

کہوں کس سے عزیزاں جا کے دردِ بے نشانِ دل
نہیں اک گوش محرم تا سنے آہ و فغانِ دل
کیا پاکیزہ مطلع کہا ہے۔ الفاظ مناسب۔ بندش چست۔ مضمون دردناک۔ اور کیا چاہیے؟
غبارِ خاطرِ غمناک سوں مجھپر ہوا ظاہر
کہ غیر از درد دوجا نہیں ہی بارِ کاروانِ دل
بیان سینہ چاکاں اہی ولی کیوں سن سکے ہر گز
کہ بوئے گل سے نازک تر ہے آہنگِ زبانِ دل (دوسرا ہر دو زن ہیں)
یہ دونوں شعر ہزاروں خوبیوں سے مملو ہیں۔

جوں گل شگفتہ رو ہیں سخن کے چمن میں ہم
جوں شمع سربلند ہیں ہر انجمن میں ہم
مطلع کی شگفتگی قابلِ دید ہے۔

ہم پاس آکے بات نظیری کی مت کہو   دکھتے نہیں نظیر اپس کے سخن میں ہم

ہمارے نزدیک تو یہ مبالغہ نہیں ہے۔ نظیری کے سے مضامین ولی نے ریختے میں پیدا کئے ہیں اور پھر اسوقت جب زبان کی ابتدا تھی۔

اکبار نفس کے ہوائی ہم نفس تو شتابک   بن برق بے قرار رہیں گے کفن میں ہم

اے نور چشم تجھ پر نامہ لکھا پلک سوں   کیتا ہوں مہر تس پر انکھیاں کے مردمک سوں

مضمون کی نزاکت دیدنی ہے۔ پلک سے نامہ لکھنا اور اسپر مردمک چشم سے مہر کرنی معمولی شاعری نہیں ہے۔

تیری نگاہ مست کہ ہے جام بیخودی   رکھتی ہے کیف وہ کہ نہیں ہے شراب میں

مضمون صاف ہے اور زبان زمانۂ حال کی۔

بزم ادا و ناز کوں وہ شوخ نازنین   خوشبو کیا ہے عنبر موج نگاہ سوں

عنبر موج نگاہ سے محفل ناز و ادا کو خوشبو کر دینا داد طلب مضمون ہے۔

ای ولی پیو کا دہن ہے غنچۂ گلزار حسن   بوئے گل آتی ہے اُسکی شوخئ تقریر سوں

ایک غزل ولی نے شاعری کی تعریف میں لکھی ہے وہ یہ ہے:-

دل ہوا ہے مرا خراب سخن   دیکھکر حسن بیحجاب سخن

راہ مضمون تازہ بند نہیں   تا قیامت کھلا ہے باب سخن

گوہر اُسکی نظر میں جا نکرے   جن نے دیکھا ہے آب و تاب سخن

شعر فہموں کی دیکھ کر گرمی   دل ہوا ہے مرا کباب سخن

عرفی و انوری و خاقانی   مجھکو دیتے ہیں سب حساب سخن

چھوٹی بحروں میں انکے اشعار پُر زور ہوتے ہیں چنانچہ ان شعروں کی بندشیں بہت چست ہیں۔

صدق ہے آب و رنگ گلشن دیں   پاکبازی ہے شمع راہ یقیں

قدسوں تیرے عیاں ہے ای جاناں   صورت ناز و معنی تمکیں

بسکہ رویا ہوں یاد کر کے تجھے — چشم میری ہے دامن مجھیں

قسمت تری ہی حق پہ ہو نا اُمیدیاں — نخیں اِس قفل کی بغیر توکل کلیدیاں
بروزن بر — بروزن کتب

یہ ناصر علی کے شعر کا ترجمہ ہے ملاحظہ ہو

در فیض است منشین از کشایش نا اُمید اینجا — برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا

سختی کے بعد عیش کا اُمیدوار رہ — آخر ہے روزہ دار کو اک روز عیدیاں

سب کام اپنے موذن کے حق کو غنیمت جان — یہ سب ہے تمام مقصد گفت و شنیدیاں

قرار نہیں ہے مرے دل کو اے سجن تجھ بن — برہ کی آگ ہوئی دل میں شعلہ زن تجھ بن
بروزن نہی — معشوق

یہ زمین اصل میں فارسی شعرا کی ہے اور اکثر اُستادوں نے طبع آزمائیاں کیں ہیں۔ "تجھ بن" کی جگہ فارسی میں "بیتو" ہے۔ صائب کا ایک شعر اس زمین میں لاجواب ہے ؎

صدف زدوری گوہر چمن زرفتن گل — جہاں بخاک برابر نشد کہ من بیتو

شتاب باغ میں آ ای گل بہشتی رو — کہ بلبلاں کو جہنم ہوا چمن تجھ بن

غلام مینا شاعر کا مطلع فارسی میں خوب واقع ہوا ہے۔

ز باغ رفتی وافسردہ شد چمن بیتو — قبائے گل شدہ بر دوش گل کفن بیتو

نکر تغافلی اے مصر حسن کے یوسف — مثال دیدۂ یعقوب ہیں نین تجھ بن

لفظ تغافلی خاص انہیں کی لغت میں ملیگا ع

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

میں سورۂ اخلاص ترے رو سوں لکھا ہوں — بسم اللہ دیوان تجھ ابرو سوں لکھا ہوں

کتنا پیارا مضمون ہے اور کیسے پیارے لفظوں میں ادا ہوا ہے۔

بغیر از نقد جان پاکبازاں — متاع حسن کا دوجا بہا نہیں
دوسرا — بروزن بر

ترا مکھ دیکھنا ہے واجب العین — ادائے فرض میں خوف و رجا نہیں

عجب ہے ای دُرِ دریائے خوبی — کہ تیرا دل مروت آشنا نہیں

ای قبلہ رو میں دیکھی محراب تجھ بھواں کی واجب ہوا انکھاں سوں اب جانماز کرناں

زبان موجودہ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ای قبلہ رو میں نے تیری ابرو کے محراب کو دیکھا ہے اب مجھپر آنکھوں کے بل جاکر نماز پڑھنی واجب ہوگئی ہے۔

ایسا بسا ہے آکر تیرا خیال جیو میں مشکل ہے جیو سوں تجھکو اب امتیاز کرناں

یہ مضمون مولانا نظیری کا ہے بلکہ انکے مشہور شعر کا ترجمہ ہے ؎

چناں گرفتہ جا بمیان جان شیریں کہ تواں ترا وجاں راز ہم امتیاز کردن

مشکل زمینوں میں بھی کبھی کبھی زور طبع دکھایا ہے مثلاً کہتا ہے۔

ہوا ہے جب سوں ترا دل سوار آتشِ حسن سپند وار ہے دِل بیقرار آتشِ حسن

یہ خط کو دُود نمط دیکھکر ہوا معلوم کہ گرم پھر کے ہوا روزگار آتشِ حسن

ہنوز حُسن کی گرمی بجا ہے اے گلرو خطِ سیاہ ہے تیرا حصار آتشِ حسن

ہوا ہے دنگ بنگالہ تری نرگس کے جادو سوں معطر ہے سوادِ ہند تیری زلف کی بو سوں

کیا ہے مصرعۂ برجستۂ قوسِ قزح موزوں فلک مضمونِ رنگین لے لیا تجھ بیت ابرو سوں

الفاظ کی شوکت ملاحظہ ہو۔ غالب کی ترکیبیں یاد آتی ہیں۔

سفرِ عشق کا اگر ہی خیال + ہمت دل کو زادِ راہ کرو + عاشقاں عاشقی کی دعوی ہے + آہ وزاری کو دو گواہ کرو

عجب کچھ لطف رکھتا ہی شبِ خلوت میں گلرو سوں خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

مرے دل کوں کیا بیخود تری انکھیاں نے ای ظالم کہ جوں بیہوش کرتی ہی شراب آہستہ آہستہ

ادا و ناز سوں آتا ہی وہ روشن جبیں گھر سوں کہ جوں مشرق سے نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

اللہ اللہ کیا زور کلام ہے۔ دو سو برس میں اُردو شاعری کا اس سے بہتر نتیجہ تو نہیں نکلا۔

ولی مجھ دل میں آتا ہے خیالِ یار بے پروا کہ جوں انکھیاں منے آتا ہی خواب آہستہ آہستہ

کیا نازک مثال پیدا کی ہے۔ قافیہ بدلکر پھر دوسری غزل کہی ہی جسکا مطلع ہے ؎

ہوا ظاہر خطِ روی نگار آہستہ آہستہ کہ جوں گلشن میں آتی ہے بہار آہستہ آہستہ

لیتا نہیں سلام ہمارا احباب سوں
اُس صاحب حیا کو ہمارا سلام ہے

اُس باج دل میں میرے نہیں اور مدعا
اُس دل کے مدعا کو ہمارا سلام ہے
بغیر

مجھے اُس شوخ سوں ملنے کا دایم شوق ہے دل میں
اگر اکبار مجھسے آکے ملجائے تو کیا ہووے

ولی رکھتا ہوں اُس موہن سوں ہر اک بات پر دل میں
اگر میرے سخن کے مغز کوں پائے تو کیا ہووے
دلبر

لکھا ہے تجھہ قد اوپر کاتب صنع
سراپا معنئ نازک ادائی

تو سر سوں پاؤں تک ہی بسکہ نازک
نگہہ کرتی ہی تجھہ پگ کو حنائی

یعنی نزاکت کی وجہ سے اُسکا پای نازک نگاہ کا بار بھی نہیں اُٹھا سکتا بلکہ حنائی ہوجاتا ہے طالب آملی کا بھی گرم مطلع داد طلب ہے ۔ کہتا ہے :-

کرشمہ نازک و لب نازک و سخن نازک
ز فرق تا بقدم ہمچو طبع من نازک

ولی نے ایک غزل لکھی ہے جسمیں معشوق کی تعریف کے ضمن میں شعراء کے نام موزوں کئے ہیں ۔ وہو ہذا :-

ترا نگہہ مشرقی[1] حسن انوری[2] جلوہ جمالی[3] ہے
نین جامی[4] جبیں فردوسی[5] و ابرو ہلالی[6] ہے

ریاضی[7] فہم گلشن[8] طبع دانا[9] دل علی[10] فطرت[11]
زبان تیری فصیحی[12] و سخن تیرا زلالی[13] ہے

نگہہ ہے فیضی[14] و قدسی[15] سرشت و طالب[16] و شیدا[17]
کمال[18] بدر[19] دل اہلی[20] و انکھیاں سوں غزالی[21] ہے

---

[1] میرزا ہد ملک مشہدی ۔ [2] شاعر قصیدہ طراز مشہور ۔ [3] شیخ فضل اللہ جمالی دہلوی ۔ [4] شاعر مشہور [5] شاعر مشہور [6] متوطن استراباد از اعیان اتراک چغتا ۹۳۶ھ میں بحکم عبداللہ خان قتل ہوا ۔ [7] ریاضی تو کئی ہیں مگر اشارہ غالباً احسن اللہ خان کشمیری مخاطب بہ فصاحت خان کی طرف ہی جو منصب داران محمد شاہ بادشاہ سے تھا اور ولی کا ہمعصر ۔ [8] شیخ سعد اللہ دہلوی ۔ [9] ملا فخر الدین کشمیری کی طرف اشارہ ہو یا محمد اکبر خان دہلوی کی جانب ۔ [10] ناصر علی سرہندی ۔ [11] میر معز مخاطب بہ موسوی خاں ۔ [12] فصیحی ہروی استاد میرزا جلال اسیر [13] مشہور مثنوی گو ۔ [14] شاعر مشہور ہند ۔ [15] حاجی محمد جان قدسی مشہدی ملک الشعراء عہد شاہجہانی ۔ [16] طالب آملی ملک الشعراء عہد جہانگیری ۔ [17] شاعر مشہور عہد جہانگیری و شاہجہانی ۔ [18] کمال خجندی یا کمال اصفہانی ملقب بہ خلاق المعانی ۔ [19] بدر جاجرمی یا بدر چاچی ۔ [20] شاعر مشہور شیراز مصنف مثنوی سحر حلال ۔ [21] غزالی مشہدی ملک الشعراء عہد اکبری ۱۲

توہی ہے خسرو[1] روشن ضمیر[2] و صائب[3] و شوکت[4] — تری ابرو پہ تجھہ بیدل[5] کو طغرائی[6] صفائی ہے

دلی تجھہ قدر[7] ابرو کا ہوا ہی شوقی[8] و مائل[9] — تو ہر اک بیت عالی[10] و ہر اک مصرع خیالی[11] ہے

ترا قد دیکھہ ای سید معالی — سخن فہموں کی ہوئی ہی قدر عالی

جسکو لذت ہے سخن کے دید کی — اُسکو خوشوقتی ہے صبح عید کی

تجھہ دہن کو دیکھکر بولا ولی — یہ کلی ہے گلشن امید کی

عالم میں تیرے ہوش کی تعریف کیا کہوں — ایسا تو نہ کر کام کہ تجھپہ سخن آوے

کہتا ہے کہ میں نے تو عالم میں یہ مشہور کر دیا کہ تو صاحب ہوش و تمیز ہے نصیحت ہے اگر تو رقیب بوالہوس سے ملے اور میری بات پر حرف آنے دے۔

آغوش میں آنیکی کہاں تاب ہے تجھکوں — کرتی ہے نگہ تجھہ قد نازک پہ گرانی

تجھہ پاس ہے مت دُور ہو یک لحظہ دگر آن — ای باعث جمعیت ایام جوانی

دوسرا مصرعہ کسقدر خوبصورت ہے۔

دل چھوڑ کے یار کیونکہ جاوے — زخمی ہے شکار کیونکہ جاوے

ممکن نہیں اب ولی کا جانا — ہے عاشق زار کیونکہ جاوے

گر تجھکو ہے عزم سیر گلشن — دروازہ آرسی کھلا ہے

سرخوشی حاصل ہوئی ہے آج گوناگوں مجھے — سبزہ خط نے دیا ہے نشہ افیوں مجھے

سرود عیش گاویں ہم اگر وہ مست ناز آوے — بجاویں طبل شادی کا اگر وہ دلنواز آوے

خمار ہجر نے جسکے دیا ہے درد سر مجھکو — رکھوں نشہ نمن انکھیاں میں گر وہ مست ناز آوے

[1] خسرو دہلوی استاد مشہور [2] میرزا روشن ضمیر دہلوی دیوان والے بندر سورت [3] استاد مشہور تبریز کے [4] محمد اسحق بخاری [5] میرزا عبدالقادر بیدل [6] طغرا مشہدی مصاحب شاہزادہ مراد بخش ابن شاہجہاں [7] قاضی محمود مال رازی شاید مراد ہو [8] میر محمد حسین شوقی ساد جی [9] میرزا قطب الدین دہلوی شاگرد میر معز فطرت [10] میرزا محمد نعمت خان عالی شیرازی [11] شاید خیالی بخاری مراد ہو [12] وحشت

کتنا عاشقانہ مضمون ہے اور اسلوب بیان کسقدر اچھوتا ہے

جنونِ عشق میں مجھکو نہیں زنجیر کی حاجت　　اگر میری خبر لینے کو وہ زلف دراز آوے
ولی اُس گوہر کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی　　مرے گھر اس طرح آتا ہی جوں سینے میں راز آوے

معشوق کے آنے کی تشبیہ اس سے بہتر ممکن نہ تھی۔

عشق میں صبر و رضا درکار ہے　　فکر و غم میں آشنا درکار ہے
عزم اُسکے وصل کا ہی اے ولی　　لیکن امدادِ خدا درکار ہے

فلاطوں ہوں زمانیکا سجن جب مجھ گلی آوے　　نہ پوچھوں طفل مکتب کر اگر واں بو علی آوے
سرودِ عشق مجھ دل میں لیا ہے اب عجب مستی　　اگر مجھ آہ کی نے سوں صدای بانسلی آوے
کروں کیا ای سجن تجھ پر مرا افسوں نہیں چلتا　　وگرنہ اک اشارت میں پری مجھ گھر چلی آوے
غرورِ حسن نے تجھکوں کیا ہی اسقدر سرکش　　کہ خاطر میں نہ لاوے تو اگر تجھ گھر ولی آوے

مرا دل مجھ سے کرکے بیوفائی　　پسندِ خاطر خوباں ہوا ہے
عزیزاں کیا ہی پروا نیکے دل میں　　کہ جیو دنیا اُسسے آساں ہوا ہے؟
ولی تصویر اُسکی جس نے دیکھی　　مثالِ آرسی حیراں ہوا ہے

تیرے نین کے عصر میں بیوقر ہے شراب　　میخانہ تجھ نگہ سوں دائم خراب ہے
مفلسی سب بہار کھوتی ہے　　مرد کا اعتبار کھوتی ہے

یہ مطلع زبانزد خاص و عام ہے۔

مو بمو میں تجھ غم سوں ضعف و ناتوانی ہی　　ٹک کرم کرو ساجن وقت مہربانی ہی

یہ پیاری بحر اکثر فارسی گویوں کے استعمال میں رہی ہے خصوصاً یہ زمین تو بالکل فارسی ہے۔ غالب کا مطلع ہے ؎

امشب آتشین رُوئے گرم زند خوانی ہاست　　گز لبش نوا ہر دم در شرر فشانی ہاست

دیکھنے سے خوباں کے منع مت کر ای زاہد　　موسم بزرگی نہیں عالم جوانی ہے

سُن حرفِ راستیاز کا مت بِل رقیب سوں ہر چند تیری طبع مخالف نواز ہے۔

اِس شعر پر غالب کا انداز بیاں یاد آتا ہے۔

نشۂ بخش عاشقاں وہ ساقیٔ گلفام ہے جسکی آنکھوں کا تصور بیخودی کا جام ہے
کھولنا زلفاں کا کچھہ درکار نہیں اے خوش نیت اک نگاہِ ناز تیری دوجہاں کا دام ہے
آفتاب آتا ہے محرم ہوکے تجھہ کوچے طرف (بروزن ہر) صبحِ صادق اُسکے برمہ جامۂ احرام ہے

صبح صادق کو جامۂ احرام سے یوں تشبیہ دینا ولی ہی کا کام تھا۔

دل کو جمعیت ہے جب جاتا ہوں دُنبالِ صنم آرسی کے ساتھہ میں سیماب کو آرام ہے۔

کہا مژگاں نے اُسکی صد زباں سوں کہ عاشق پر ستم کرنا روا ہے
زہے دولت کہ دایم سایۂ یار ہمارے سر پہ جو ظلِ ہُما ہے

نکال خاطرِ فاتر سے جامِ جم کا خیال صفا کر آرسی دل کی سکندری یہ ہے
بسا عزیز ہیں تجھہ مُکھ کے آفتاب پرست تو جلوہ گر ہو کہ اب ذرہ پروری یہ ہے
ٹک اک نقاب اُٹھا کر آپس کا مُنہ دکھلا کہ دلبروں نزک (نزدیک) حقِ دلبری یہ ہے
بسار (بجمال) دل سوں آپس (اپنا / اپنے) کے تو یادِ خاقانی ولی کو دیکھ کہ اب رشکِ انوری یہ ہے

مستزاد کے بھی کئی نمونے ولی کے ہاں ہیں جو آجکل کے شعراء کے کلام میں کم دکھائی دیتے ہیں۔ کہتا ہے:

عاشق کو ہے بیتابی و بیطاقتیٔ دل ــــ سرمایۂ بینش
بے عشق جو عالم میں فراغت سوں جیا ہے ــــ ہے بے بصراں میں
تنہا نہیں سرشار ولی شوق سوں تیرے ــــ اے ساقیٔ بدمست
تجھہ عشق کا اس بزم میں جو جام پیا ہے ــــ ہے بے خبراں میں

دوسری زمین میں کہتا ہے۔

کرتا ہے نظر جب ستی تجھہ رشک پری پر ــــ کھویا ہے چمن میں

باندھا ہے جنے جیوں کوں تجھ عشوہ گری پر - پھرتا ہی وہ بن بن

دیکھے سوں تری داغ کے جلوے کوں جگر پر - بولا مجھے یوں دل

کیا خوب اُٹھا نقش عقیق جگری پر - خورشید سوں روشن

چنچل نے نظر ناز سوں آہو پہ کیا نہیں - نرگس کی ہی سوگند

قربان ہوا اُس شوخ کی والا نظری پر - عشاق کا تن من

بوجھا ہے وکی تب ستی ہو ہن نے سُرج کوں - ذرہ سے بھی کمتر

کرتا ہے نظر جب ستی دستارِ زری پر - لے ہاتھ میں درپن

مخمس بھی کئی لکھے ہیں اِنمیں ایک نہایت پاکیزہ و لطیف ہے جسکے تین بند یہ ہیں:-

نکر تو آشنائی غیر سوں ای سیمتن ہرگز نہوای شمع رو ہر انجمن میں شعلہ زن ہرگز

نہ مِل مائل ہو ہر طوطی سوں ای شکر شکن ہرگز نہ مِل ہر بلبل مشتاق سوں ای گلبدن ہرگز

ہر اک گلشن میں جوں نرگس نہ کھول اپنے نین ہرگز

فصیحان خلق کے سارے تجھے شیریں بچن کہتے (ہیں) پیشانی روز روشن اور زلف کالی رین کہتے

مبصر ہر جواہر کے تجھے دُرِّ عدن کہتے جہاں کے گلرخاں سارے تجھے نازک بدن کہتے

تو ہر پلکاں کے کانٹوں پر نہ دھر اپنے چرن ہرگز

تو ہے محبوب عالم کا دلے عالم سوں ہو یکسو تو محبوباں میں عنقا ہی نہ دکھلانا کسی کو رُو

جو آتش دان کیا دل کوں لجا دان زلف عنبر بو بغیر از عید مت دکھلا کسی کو تو ہلال ابرو

نہ مِل اغیار سوں ای نازنیں چندر بدن ہرگز

ولی کے دیوان میں **قصیدہ** ایک بھی نہیں ہے - ایسے آزاد مزاج لوگ بھلا کس کی مدح و ثنا کرتے - **رباعیات** کچھ ہیں - کہتا ہے ؎

تجھ عشق سوں نت بے سر و ساماں ہوں میں تجھ زلف سوں بیتاب و پریشاں ہوں میں

تجھ مکھ کی صفائی کوں نظر میں رکھکر مدت ستی جوں آئینہ حیراں ہوں میں

کونین حسنؓ حسینؓ کا ممنون ہے　　اس یاد سوں عشرت کا سینہ محزوں ہے
ایسوں کے اُپر روا رکھا داغ فلک　　جس داغ سوں لالے کا جگر پرخوں ہے

رضا علی وحشت کلکتہ

کلام آسی

پوچھتے ہو کہ سرِ وحدت کیا　　ماسوا کی بھلا حقیقت کیا
ہم نہیں جانتے قیامت کیا　　آج اگر تم ملو قباحت کیا
واعظو اُس کو دیکھلو پہلے　　پھر کہو تم کہ حورِ جنت کیا
نہ گرے اُس نگاہ سے کوئی　　اور افتاد کیا مصیبت کیا
نقدِ ہستی نثار یار کرے　　یہ نہیں ہے تو پھر محبت کیا
عاشقی میں ہے محویت درکار　　راحتِ وصل و رنجِ فرقت کیا
جن میں چرچا نہ کچھ تمہارا ہوا　　ایسے احباب ایسی صحبت کیا
اب سمجھتا ہے منکرِ سجدہ　　آدمی کیا ہے آدمیت کیا
اُس سے مل جو ہمیشہ ساتھ رہے　　بیوفاؤں سے لطفِ صحبت کیا
باغِ رضواں بھی باغ ہے آخر　　سیرِ گل کے لئے ریاضت کیا
ملنے والوں سے راہ پیدا کر　　اُس کے ملنے کی اور صورت کیا
بس تمہاری طرف سے جو کچھ ہو　　میری سعی اور میری ہمت کیا
اُس کے حقدار ہم شرابی تھے　　اہلِ تقویٰ و ابرِ رحمت کیا
جانتے ہو جاؤ ہم بھی خصت ہیں　　ہجر میں زندگی کی مدت کیا
گوشہ گیری حدیثِ نفس کے ساتھ　　دل ہی مجمع میں ہے تو عزلت کیا
اور ہمت بلند کر اے شیخ　　طمع و خوف کی عبادت کیا
کوئی تیرے سوا کہیں ہے بھی　　بدگمانی کی مجھسے علت کیا
یوں ملوں تم سے میں کہ میں بھی نہ ہوں　　دوسرا جب ہوا تو خلوت کیا
آسی مست کا کلام سنو　　وعظ کیا پند کیا نصیحت کیا

شاہین و دُرّاج

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

تقاضائے انسانیت یہ تھا کہ شاہین ہاتھ سے سر اُٹھا کر بات پوچھتی!
خلاف شان تھا تو پاؤں پر گرنے ہی نہ دیتی! دلاسا تسلّی تشفّی تسکین! دل سے
نہیں دکھاوا! واقعی نہیں ظاہری! مدارا خاطر داری دکھاوا اظاہرداری دوپٹے سے
آنسو پونچھ دیتی تو کچھ شان کو بٹّہ نہ لگ جاتا! دُرّاج کون بڑا رئیس تھا ٹکے کا
آدمی بھیڑ کی لات گھٹنوں تک ادنےٰ سے اشارے میں باغ باغ ہو جاتا!
ملکہ تھی تو ہو مہماں نوازی تو فرض تھا دُرّاج کو راضی کر دینا نہ کچھ بڑا کام تھا
نہ کوئی عظیم الشان مہم! مگر خدا اس محبت کو غارت کرے وہ احسان اور جاں نثاری
سب گئی گذری ہوئی مزے سے بیٹھی دیکھتی اور چین سے بیٹھی ہنستی رہی!
کہیں پندرہ بیس منٹ کے بعد بولی تو یہ :-

خیر صلاح! کہو کہو کیا معاملہ ہے؟

(دُرّاج سر اُٹھا کر) معاملہ تو صاف ہے مگر انصاف کیجئے! سب سے بہتر فیصلہ
تو یہ ہے کہ اُس باغی کی طرح مجھکو بھی سولی کا حکم ہو!

(شاہین) کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا مطلب ہے! نگاہ ملا کر بات کرو ورنہ چشم زدن
میں آنکھیں کھُل جائینگی اس تنہائی میں جہاں لونڈی نہ ماما نوکر نہ چاکر تم کیا
سمجھکر میرے پاؤں پر گرے! سوچا یہ ہوگا شہزادی ہے تو کیا! ہے تو عورت
ذات بہلا پھسلا رنگ پر لے آؤنگا! بولو بولو! کھتے ہو تو کہو نہیں ایسا مزہ
چکھاؤنگی کہ چھٹی کا کھایا یاد آجائیگا! ڈرو مت جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو خدا معلوم

جان رہے یا جائے اور پھر کہنے کا وقت آئے یا نہ آئے۔
(دُراج) میں ہی منہ سے کہکر کیا نہال ہو جاؤنگا میری صورت سوال ہے!
میں نے نہ کہا میری حالت نے کہدیا! رہی جان اسکو میں پہلے ہی قربان
کر چکا بسم اللہ کیجئے ایسی موت تو خدا سب کو دے مٹ تو چکا ہی مرنا باقی
ہے سو میں خود تیار ہوں! آپکے احسانات کا شکریہ میرا فرض ہے
جب تک زندہ ہوں ادا کرونگا!
(شاہین) کیسا احسان اور کس بات کا شکریہ! عطاء خلعت نہ انوکھی چیز نہ
نرالی بات دن رات ملتے رہتے ہیں! احسان تو تمھارا ہے کہ تمنے جان
بچائی! زہے نصیب اُس سلطنت کے جس میں تم جیسے جاں نثار بستے ہوں
اور دھن بھاگ اُس والی سلطنت کے جسکی رعیت میں ایسے ایسے وفادار
موجود ہوں مگر تمھاری اس حرکت کا سبب کیا ہے؟
(درّاج) ملکۂ بلند اقبال! مجھ جیسا فقیر اور ان ہاتھوں سے دوشالہ! خدا
کی شان یہ مُنہ اور مصالحہ! رونگٹا رونگٹا دعا دے تو شکریہ محال اور کُنبہ بھر
قربان ہو جائے تو معاوضہ ناممکن! البتہ ایک ارمان ہے:۔
"سر آپ کے قدموں پہ ہو اور جان نکل جائے"
وفاداری شیوہ انسانیت اور جاں نثاری جوہر شرافت ہے! یہ ہی
زابلستان جسمیں رات بھر شیر اور ہاتھی دھاڑتے اور چنگھاڑتے رہتے تھے
آپ کے دم سے جنت نشان بنگیا! کونسا دن جاتا تھا کہ دس بیس فوجداریاں
دو چار ڈکیتیاں سر راہ نہ ہوتی ہوں! اور کونسی رات گذرتی تھی کہ دس پانچ
چوریاں ایک آدہ قتل سُننے میں نہ آئے! یہ آپ ہی کا اقبال ہے کہ شیر بکری
ایک گھاٹ پانی پی رہے ہیں! چار دانگ میں انصاف کا ڈنکا بج رہا ہے

سڑک پر سونا اوچھالتے چلے جاؤ کیا مجال جو کوئی آنکھ اُٹھا کر دیکھ لے! جو ساری ساری رات کھٹکوں اور دھڑکوں میں گذار دیتے تھے چین سے میٹھی نیند سوتے ہیں! محتاج یتیم رانڈیں دکھیاریاں جنکی عمریں فاقوں میں تیر ہوئیں دونو وقت مگن ہو کر ہزاروں دُعائیں دیتے ہیں! رحم دل شاہین! منصف مزاج ملکہ! میں نے جو کچھ کیا میرا فرض تھا احسان نہ تھا!

(شاہین) "اچھا تم اوٹھو اور میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

(مہماں نوازی)

شاہین جواہرات میں لدی عطر میں ڈوبی پھولوں میں لسی خوشبو سے مہک رہی تھی! اسپید براق گلے میں جڑاؤ چمپا کلی دگدگی کے پاس بچلڑا مالا کیساتھ ست لڑا آٹھ اُونگل چوڑا گلوبند بیچ میں دوہیرے! دھکتا ہوا سونا چمکتے ہوئے لعل چاندسی صورت بوٹا سا قد درّاج کو تو ایک ایک قدم اُٹھانا بھاری تھا! تھم تھم کر بڑھا بیٹھ بیٹھکر اُٹھا گرگر کر سنبھلا اور سنبھل سنبھل کر چلا! کمرۂ طعام میں پہونچے تو خدام دست بستہ موجود تھے! ہاتھ دُھوئے دھلوائے اور کھانا کھانے ساتھ بیٹھی! سونے چاندی کے برتن انواع واقسام کے کھانے! ایرانی پلاؤ شیرازی متنجن اصفہانی قورمہ انورخوانی کباب درّاج نے تو شاید خواب میں بھی یہ سامان نہ دیکھے ہونگے! دستر خوان دیکھتے ہی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں! شاہین کی میزبانی ضرور قابل شکریہ ہے مگر اِس کا کیا علاج کہ مہمان بدنصیب کی خود ہی جان پر بنی ہوئی تھی چولھے میں گیا کھانا اور بھاڑ میں گیا کھلانا بار بار اصرار سے ایک نوالہ مُنہ میں ڈالا مگر کہاں جاتا اور کس طرح اوترتا! آخر با اقبال شہزادی نے اپنے ہاتھ سے شیرمال کا ایک ٹکڑا

توڑ کر پیش کیا اور کہا :-

"ایسے لٹے کہ کھانا بھی بھول گئے"

آنکھوں سے لگا شکریہ ادا کیا اور جس طرح ہوا دو چار لقمہ زبردستی حلق سے اوتارے! کھانے سے فراغت پا کر ایک اور کمرے میں آئے! یہاں دیوار پر ایک تصویر تھی جسمیں شہزادۂ زنجبار اپنی محبوبہ کے پاس بیٹھا بصد حسرت و یاس اُسکے چہرہ کو تک رہا تھا۔

(شاہین) جانتے ہو یہ تصویر کس کی ہے؟

(دُرّاج) مجھے اپنا ہی ہوش نہیں تصویر کا پہچاننا تو بڑا کام ہے! مجھے تو صرف اتنی خبر ہے۔

از آتشم ز عشق شرارے بروں نہ جست
بنگر کہ سوختیم و چہ مردانہ سوختیم

(شاہین) ماشاءاللہ چند ہی گھنٹوں میں تمام مرحلے طے ہو گئے! کس کا عشق ہے؟ زبان نے جہانتک یاری دی اور دل نے جسقدر ہمت دلائی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا مگر جہاں حرف مطلب تک پونچا آپ تھم زبان بند! سوچتا تھا کہ اگر دل کڑا کر کے کہہ بھی دوں تو شہزادی ہے اور سچ مچ کی شہزادی صاحب سلطنت والی حکومت زبان ہلانے کی دیر ہے ایسا کھر کھوج کھوئیگی کہ نشان تک نہ رہیگا! مجبور یہ ہی کہتے بن پڑی کیا بتاؤں ملکہ میری صورت سوال ہے۔

(شاہین) میں تو ایسی چاتر نہیں ہوں کہ اوڑتی چڑیا کو پہچان لوں! بولو تم نہیں بتاؤ تم نہیں سمجھوں کیا خاک! یوں تو ماشاءاللہ زبان قینچی کی طرح چلتی ہے حال بیان کرنے میں صورت سوال ہو گئی!

اچھا اب آپ تشریف لے جائیے مجھکو کچھ کاغذ دیکھنے ہیں۔

(دُرّاج) اب کب حاضر ہوں۔

(شاہین) جب آپ کو فرصت ہو اور جی چاہے۔

(دُرّاج) میرا جی اب ہی کب اُٹھنے کو چاہتا ہے۔

(شاہین) بس تو تم بیٹھے رہو میں جاتی ہوں۔

(دُرّاج) اِس طرح تو ہر جگہ بیٹھ سکتا ہوں یہیں کیا خصوصیت رہی

(شاہین) کل شام کو آنا۔

(دُرّاج) خدا حافظ۔

(شاہین) اللہ بیلی۔

(غُسل شیر)

دروغ برگردن راوی سردار عبد الرحمن عثمانی کا بیان ہے کہ ایک دو نہیں اکھٹے چھ ساڑھے چھ مہینہ ایسے گذرے کہ دُرّاج دن رات میں تین تین چار چار پھیرے کرتا اور شاہین اُس سے بلا تکلف ملاقات کرتی! مہینہ بیس روز تو اتنا بھی رہا کہ کچھ دنیا کا خوف کچھ لوگوں کی شرم آبرو کا لحاظ عزت کا پاس دن کو برائے نام مُنہ پر نقاب ڈال لیتی اور پھر تو طبیعت کو ہوا لگ گئی آپ ٹھہری شہزادی نہ کوئی کہنے والا نہ سُننے والا روکنے والا نہ ٹوکنے والا وہ جھجک اور شرم سب گئی گذری ہوئی کُھلم کُھلا ملتی اور ہانکے پکارے بلواتی! ذرا دُرّاج کے آنے میں دیر ہوئی اور اُسنے آدمیوں کی ڈاک بٹھا دی اراکین سلطنت دیکھتے اور چپکے ہو رہتے کس کی مجال تھی کہ دم مار سکتا! آدھی رات کا وقت جاڑے کا موسم کوچوان غریب گاڑی پر بیٹھا سوں سوں کر رہا

سہے اور اُف نہیں کر سکتا پھر یہ بھی نہیں کہ کبھی کبھار بلکہ روزمرّہ اور بلا ناغہ!
نوکر پریشان، مامائیں حیران ایک دن کی مصیبت ہو تو بھگت لی جائے روز
کی آفت اور ہر وقت کی دقّت! رات کے بارہ بج گئے کھانا رکھا رکھا مٹی
ہو گیا مگر جو ہے وہ مجبور اور معذور آپسمیں سرگوشیاں کرتے اور دُرّاج کی
جان کو دعائیں دیتے! وہی شاہین جسکے کمرۂ خواب میں پرندہ پر نہ مار سکتا
تھا اب رات بھر دُرّاج کے ساتھ قہقہے مارتی! ضروری کاغذ پڑے
پڑے جھک مارتے اہلکار پیشی کھڑے کھڑے شل ہو جاتے اور وہ آنکھ
اُٹھا کر نہ دیکھتی! حکم احکام بند! مقدمات چوپٹ! غرض چار ہی دن میں
کچھ کا کچھ ہو گیا! جسکا انصاف عدل نوشیروانی کہلاتا تھا مہینوں تخت
عدالت پر بیٹھنے کا نام نہ لیتی!

شہباز خان وزیر اعظم شاہین کے دادا کے زمانہ کا آدمی بڈھا پھونس!
شاہین جیسی سیکڑوں ناخنوں میں بھری پڑی تھیں! یہ رنگ ڈھنگ
دیکھکر وہ شروع ہی میں کھٹک گیا تھا مگر جو بڑی ما گھٹنوں میں سر دئے اور
روئے چُپکا بیٹھا سارے سانگ دیکھتا اور اُف نہ کرتا! گو وزیر تھا مگر ایسا
نمک حلال نوکر تو سلطنت زابلستان کو قیامت تک نصیب نہ ہوگا شاہین
اُسکی گودوں کی کھلائی سامنے کی پلی پلائی بیٹیوں سے زیادہ سمجھتا تھا!
اپنی ٹانگ کھولے اور آپ لاجوں مرے خون کے سے گھونٹ پی کر چپکا
ہو جاتا! دُرّاج کا کام تمام کر دینا شہباز کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا شاہین
دو چار روز رو دھو کر ٹھیک ہو جاتی مگر سمجھدار آدمی زمانہ برتے ہوئے
سیکڑوں رنگ دیکھے ہوئے سوچتا تھا کہ عورت اور پھر شہزادی تریاہٹ
اور راج ہٹ دو دو مصیبتوں کا سامنا ہے خدا معلوم کیا ایڈا بینڈا حکم دے

بیٹھے سوچتے سوچتے یہ تدبیر سمجھ میں آئی کہ کسی طرح دُرّاج کو شیشہ میں اوتارو ں دو چار دفعہ یوں ہی ملا ایک آدھ دفعہ دعوت کی پھر تو رفتہ رفتہ وہ میل جول بڑھا کہ تمام زابلستاں دنگ ہو گیا! دُرّاج سمجھ کا کورا عقل کا اندھا شہباز کے پھندے سے بچکر کہاں جاتا دو ہی باتوں میں بنی بے دام ہو گیا! شاہین جیسی ملکہ طلبگار شہباز جیسا وزیر مددگار دُرّاج سے زیادہ خوش نصیب کون ہو گا! جاڑا ہو برسات ہو آندھی جائے مینہ جائے مگر شہباز کی ملاقات نہ جائے! شاہین کے پاس سے اُٹھا اور سیدھا شہباز کے ہاں پھر غضب یہ جو گذری وہ سُنا دی جو ہوئی وہ بتا دی!

نتیجہ یہ ہوا اور ہونا چاہیئے تھا کہ شاہین کے تمام راز ایک ایک کرکے شہباز کے قبضہ میں جا پہنچے! مان لیا کہ وزیر وفادار نمک حلال فرمانبردار جان نثار سب ہی کچھ تھا مگر تھا تو غیر دو میں تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا! اُس بیچاری کو کیا خبر تھی کہ یہ میری عنایتیں اور مہربانیاں میل کا بیل اور تل کا پہاڑ بن جائینگی! خدا کو جان دینی ہے اور شاہین کا پیٹھ پیچھا ہی علامۂ ابن نصر جو اِس واقعہ کا پہلا محقق اور زابلستاں کا معتبر مورّخ سمجھا گیا ہے لکھتا ہے۔

"گو ان تعلّقات کا چرچا بچے بچّے کی زبان پر تھا مگر تمام زابلستان چھان مارا اور ایک شہادت بھی ایسی نہ ملی جس سے شاہین کے دامن عصمت پر کوئی دھبّہ لگ سکتا"

محبّت مروّت عنایت شکایت سب کچھ سہی! اس تک سے انکار نہیں کہ ایک دو دفعہ کیا دنوں اور مہینوں متواتر لگاتار اور پھر گھنٹوں اور پہروں دونو بیٹھے باتیں کرتے! باتیں قہقہے بے تکلفی چھچھے سب کچھ ہوتا

اور دن دھاڑے ہوتا! مگر اس کے آگے دونوں میں سے ایک کی ہمت نہ پڑی! یہ اُسی مری ہوئی ماں کا فیض صحبت اور دودھ کا اثر تھا کہ شاہین خیال آتے ہی خوف خدا سے تھرّا اُٹھتی تھی ورنہ کس کی ننگ و ناموس اور کیسی عفت عصمت جو چاہا وہ کیا اور جو چاہتی وہ کرتی! بات صرف اتنی تھی کہ خود بینی اس کے مزاج میں معمول سے زیادہ گھسی ہوئی تھی اور اگر ہمارا خیال غلط نہیں تو یہی خود بینی معاوضہ احسان کے ساتھ سمند ناز پر ایک تازیانہ تھا جسنے یہانتک نوبت پونچادی! وہ سمجھتی تھی کہ جہاں اور طرح طرح کے جانور اور بن بن کے پکھیرو میرے دربار میں بولیاں بول رہے ہیں وہاں ایک دُرّاج بھی سبحان تیری قدرت کے نعرے لگا رہا ہے۔

دُرّاج اپنی حالت زار کا اظہار کرتا وہ دل میں خوش ہوتی! وہ روتا وہ ہنستی وہ ہائے ہائے کرتا وہ اہا ہا کرتی! اس سے انکار نہیں کہ دُرّاج کی محبت کا اسکی طبیعت پر ایک خاص اثر تھا جو رفتہ رفتہ خود بھی محبت کے ضمن میں داخل ہو گیا مگر اسکو کیا معلوم تھا کہ یہ دُرّاج پیٹ کا ہلکا کانونکا کچّا رتی رتی اور تل تل شہباز سے جا پرویگا اور یہ گھر کا بھیدی ایک دن لنکا ڈھا دے گا۔

بقر عید کے دن مغرب کے بعد زابلستان کی مشہور رسم "غسل شیر" ادا ہو رہی تھی سات قسم کی سات ہری ترکاریاں دائیں طرف رکھکر وزیر اعظم نے شہزادی کے پاؤں پر دودھ کے چھینٹے دیئے ارا کین سلطنت نے باری باری اُٹھکر پھول نچھاور کئے اور ترقی اقبال کی دُعائیں دیں! اب چھنگلی میں مہندی لگانیکا وقت تھا! سلطانہ باغ کی مہندی شاہین کی اپنے ہاتھ کی توڑی ہوئی عطر و گلاب سے گندھی سونے کی تھالی میں رکھی آگے آئی!

شہباز خاں کٹہرے کا کھڑا ہی رہا اور دُرّاج کو مہندی لگانے کا حکم عطا ہوا
چھوٹے سے بڑے تک سب سنّاٹے میں دم بخود تھے مہندی کی رسم ادا ہو
شاہین دُرّاج کو ساتھ لے محل پونچی! کھچڑی تو پہلے ہی پک رہی تھی
مہندی کے رنگ نے سب کو دنگ کر دیا۔

شاہین کا کمرۂ خوابگاہ یوں ہی ماشاءاللہ ایسا تھا کہ قدم رکھتے ہی نیند
آجائے آج تو برس کا برس دن تھا مومی بتیاں کافوری شمعیں جھاڑ فانوس
تمام کمرہ جگمگا رہا تھا دُرّاج کا کام تو مہندی ہی نے تمام کر دیا تھا کمرے
میں پونچا تو حالت ہی کچھ اور تھی ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور بے اختیار ہو کر
کہنے لگا:۔ "اللہ! کبھی میرا ارمان بھی پورا ہوگا"

(شاہین) معاوضۂ ارمان؟

(دُرّاج) جان۔

(شاہین) بس! یہ تو کافی نہ ہوا۔

(دُرّاج) اس سے زیادہ قیمتی چیز اور میرے پاس کچھ نہیں۔

(شاہین) یہ تمھاری تقدیر۔

(دُرّاج) تقدیر کا پھیر تو تھا ہی جو ایسا ارمان دل میں پیدا ہوا۔

(شاہین) تو کیا تم اپنے تئیں بدنصیب آدمی خیال کرتے ہو۔

(دُرّاج) ہرگز نہیں! مجھ سے زیادہ خوش نصیب اور کون ہوگا! جو چاہا
وہ ملا جو مانگا وہ لیا! تم جیسی ملکہ اور مجھ پر کرم اور پھر میں بدنصیب! میں
تو تم سے بھی زیادہ خوش نصیب ہوں!

(شاہین) تمکو معلوم ہے کہ میں کل رات کو دو مہینہ کے واسطے اصفہان
جاتی ہوں۔

(دُرّاج) جاتی ہو تو جانے سے پہلے میرا انتظام کرتی جاؤ دو مہینہ کیا میں تو دو لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

(شاہین) اسقدر مبالغہ سے کیا حاصل۔

(دُرّاج) یھ مبالغہ ہے۔

(شاہین) مبالغہ نہیں ہے تو تجربہ ہو جائیگا!

(دُرّاج) جو جو کچھ دکھاؤ گی سب دیکھونگا لیکن میں اس خیال سے ضرور خوش ہوں کہ انشاء اللہ بہت جلد قربان ہو جاؤنگا اور یہ ہی عین آرزو ہے! انصاف کرو جس شخص کا رات دن میں ایک گھنٹہ بھی ایسا نہ گذرتا ہو کہ تمھارے خیال سے مفارقت کر سکے وہ دو مہینہ کا فراق کس طرح جھیل سکیگا۔

(شاہین) خیال کے فراق کی تو اب بھی ضرورت نہیں!

(دُرّاج) اب تو ہر وقت یہ تسکین ہے کہ جو کچھ گذریگی جا کر سُنا دونگا جب یہ تسکین بھی گئی گذری ہو پھر کیا اُمید باقی رہے!

(شاہین) دُرّاج! یہ سب ڈھکوسلے ہیں! خیر! میں تمکو یہ ایک رومال دیتی ہوں جو پانچ چھ پشت سے میرے خاندان میں نسلاً بعد نسلاً امانت چلا آتا ہے میری پرنانی رابعہ ثانی نے اپنی ماں کی نشانی سمجھکر میری ماں کو دیا جو میری مرحومہ ماں نے نکاح کے بعد میرے باپ کو عطا کیا اور پھر میرے پاس آیا اسکو بطور یادگار اپنے پاس رکھنا! اگر کبھی میرا خیال آئے تو اُس کو دیکھ لیا کرنا!

(دُرّاج) آہ! شاہین! کیسی دل خراش گفتگو ہے! "اگر کبھی میرا خیال آئے" کیا میری زندگی میں ایسا کوئی لمحہ بھی گذر سکتا ہے کہ تمھارا خیال مجھکو نہ آئے۔

(شاہین) اب تم جاؤ میں کچھ لکھونگی آؤ ہاتھ ملا لو۔

(دُرّاج ہاتھ میں ہاتھ لیکر) کس طرح شکریہ ادا کروں! اس ہاتھ کو سر پہ رکھوں آنکھوں سے لگاؤں!

(شاہین) اچھا! رخصت -

(دُرّاج) فی امان اللہ -

(شاہین) سلام -

(باقی دارد)

راشد الخیری

ہائے رے دیوانگی کو سا کیا تاثیر کو ۔ میں فغاں اپنی ہی سمجھا نالہ زنجیر کو

دلکو ہونے دے ہدف ممکن نہیں دلکی تڑپ ۔ یہ اُڑاتی ہے ہمیشہ چٹکیوں میں تیر کو

مٹ چکی اُنکی ادا سی آچکی اُنکو ہنسی ۔ میرے گھر آئے ہیں رونے غیر کی تقدیر کو

عرش سے آئی کبھی تو آکے اُلٹی پھر گئی ۔ دور سے میرا سلام اس آہ کی تاثیر کو

کس مزے سے ہمنے کاٹی آجکی فرقت کی رات ۔ پیار کرتے رہ گئے اک چاند سی تصویر کو

ناز سے چلنا تو سکھلایا ہے دستِ ناز نے ۔ اپنے غمزے تم سکھا دو اب ذرا شمشیر کو

ناوک افگن دیکھ لے آکر ذرا تو دلکی پھانس ۔ یہ ذرا سی پھانس تو شرما رہی ہے تیر کو

منہ کُھلے خم کا نہ واعظ قلقل مینا کے بعد ۔ میکدے میں طول اتنا تو نہ دے تقریر کو

کیوں ہوا ناوک خطا ہی شرم سے نیچی نگاہ ۔ لاؤ ہم رکھ لیں کلیجے میں تمہارے تیر کو

شیخ کی دیکھی بزرگی آپ فرماتے تھے کل ۔ ہم نے دیکھا ہے جواں اس آسمانِ پیر کو

یادگار اسوقت ہم بھی ہیں زمانے میں ریاض

مانتے ہیں سب ہمیں ہم مانتے ہیں میر کو

دردِ جانستاں

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

دوسرا باب

اس رنج بیکسی کی یارب خبر نہ پہونچے
جائے نہ شام غربت سر پیٹتی وطن میں

صبح کی دُلہن نے شفق کا لال جوڑا پہنا آسمان کے نیلگوں رنگ سے مسی لگائی اور نور کے زیور سے آراستہ ہوئی ادھر سورج کے دولہا نے اپنی آفتابی چہرہ پر کرنوں کا سہرہ باندہ کر فلک کے تخت پر جلوس کیا تمام دنیا میں روشنی پھیل گئی دہلی کے کمپنی باغ میں پیڑ پیڑ اور درخت درخت نے پھول اور پتیوں کی پوشاک اور گہنے سے اپنے تئیں ایسا سجایا کہ گویا ان کو بھی کسی کی برات میں جانا ہے حافظ احمد علی کے زنانہ میں گو سمدھنوں اور مہمان عورتوں کی وجہ سے رونق اور گھما گھمی ہو رہی ہی مگر چونکہ لڑکیوں کی رخصت کا وقت قریب ہے اسلئے ایک سنّاٹا چھایا ہوا ہے ماں الگ رو رہی ہے۔ نانی جُدا آنسوؤں سے مُنہ دُھو رہی ہیں ایک تو صبح کا بھینا بھینا وقت پھر بھیرویں کے سروں میں ڈومنیوں نے منڈھا گا کے سب کے دِل ہلا دئے لڑکیاں بچیاں بوڑھیاں بڑھیاں روتی روتی تھکی جاتی ہیں دولہنوں کی آنکھیں روتی روتی سوج گئی ہیں دلوں میں یاس و حسرت چھا رہی ہے اس میں پینس دروازہ پر

آگئی ریت رسمیں ہوچکیں دولہ گھر میں آیا چھپنے والیاں چھپ گئیں دولہنے
دولہن کو گود میں لے پینس میں بٹھایا آپ گھوڑے پر سوار ہوا آگے آگے دولہن
کی پینس پیچھے پیچھے دولہ کا گھوڑا اُسکے پیچھے براتیوں کی پالکی گاڑیاں
سیدھی ریلوی اسٹیشن کو چلیں کیونکہ ہمنے آپکو پہلے سمجھا دیا ہے کہ یہ لوگ باہر
کے رہنے والے ہیں ریل میں سوار ہوکر اپنے وطن کو جائینگے بات کرنے میں
اسٹیشن آگیا اور سواریاں مسافر خانہ کے سامنے تھم گئیں اللہ اکبر دہلی کا
اسٹیشن عجب مقام ہے دیکھو تو کسقدر اژدحام ہے مسافر خانہ آدمیوں سے
کھچا کھچ بھر رہا ہے کوئی مسافر دری بچھائے بیٹھا ہی سامنے ایک بیگ رکھا ہی
ایک شخص اپنی گٹھڑی پر ہی چڑھے بیٹھے ہیں ایک صاحب گلے میں منی بیگ
ڈالے ٹہل رہے ہیں اور ہر دفعہ ٹکٹ گھر کی کھڑکی کو جا کر دیکھ آتے ہیں کہ کھلی
یا نہیں سینکڑوں گنوار دُھوتی بند اور سینکڑوں گنوارنیں لہنگے پہنے زمین پر پھسکڑا
مارے بیٹھی ہیں ایک طرف ڈولیاں رکھی ہیں اُن میں پردہ نشین عورتیں بیٹھی ہیں
مگر پردہ کی چاک میں سے تاک جھانک ہو رہی ہے ایک جانب ایک مرد درویش
جانماز بچھائے بیٹھے ہیں اور دو چار مُرید ساتھ ہیں اجمیر شریف کے عُرس کا
حال بیان فرما رہے ہیں ایک سمت مختصر سا فرش بچھا ہوا ہے اور اس پر ایک
رنڈی صاحبہ رونق افروز ہیں ہلکا کافوری دوپٹہ آب رواں کا چنا ہوا کچھ کمر پر کچھ
سینہ پر پڑا ہے سر بالکل کھلا ہوا ہے کان میں بالیاں تو نہیں ہیں مگر پھول
ضرور پہنے ہوئے ہیں سامنے حقہ رکھا ہوا ہے اور بڑی نزاکت کے ساتھ
نوش فرما رہی ہیں اُنکے پہلو میں دو تین ڈوم بھی تشریف رکھتے ہیں ایک کھارہ
کے بقچہ میں طبلہ بندھا ہوا دھرا ہے دُھوری سارنگیاں قند کے
غلاف میں بند اُسی بقچہ سے لگی رکھی ہیں اور اسکے علاوہ اور اسباب کی گٹھڑیاں

اوڑھچھونے بستر بند سے کسے کسائے بی صاحب کی کمر سے لگے رکھے ہیں
گاؤ تکیہ کا کام دے رہے ہیں سامنے حلوائی کی دوکان ہے حلوہ سوہن
قلاقند جلیبیاں باوشاہی حلوہ پوری تھالوں میں بھری رکھی ہیں دوسری
طرف گرم گرم پوریاں کچوریاں تل تل کر رکھتا جاتا ہے اُسکے پاس ہی
میوہ فروش کی دوکان پر کابلی اور کشمیری سیب بیدانہ انار قندھاری
انار۔ سردہ انگور کی قطیاں پستہ بادام کشمش خوبانی ولایتی بھی رکھی ہیں۔
بیچ میں خوانچہ والے بیٹھے ہیں ایک کہتا ہے دہی بڑے مصالحہ کے دوسرا
کہتا ہے لونگ چڑے مصالحہ کے ایک تنبولی زرد زرد پانوں کی دوکان
کھولے بیٹھا ہے بڑا سا آئینہ دوکان کے سامنے لگا رکھا ہے گاہکوں کو گلوریاں
بنا بنا کر دے رہا ہے اُسکے پاس ہی ایک خوانچہ میں سگرٹ اور چرٹ میچیس
وغیرہ رکھی ہیں دنیا کی ہمہ نعمت موجود ہیں ناگاہ ایک کانسٹبل نے آواز دی
ٹکٹ لینے والو ٹکٹ لو یہ ایک ایسی صدا تھی جسنے تمام مسافر خانہ میں ہلچل
ڈالدی اور ابھی جو صدہا آدمی بیٹھے تھے ایک دم سے سب کھڑے ہوگئے
اور ٹکٹ گھر کی طرف بھاگے اور ٹکٹ گھر کی کھڑکی سے دس قدم پیچھے تک
ٹھٹہ لگا کر کھڑے ہوگئے اب ہر ایک کی یہی کوشش ہے کہ کسی طرح میں پہلے
ٹکٹ لیلوں اسی کش مکش میں قاضی انوار حسین بھی ٹکٹ گھر کی کھڑکی تک
پہونچے اور تھرڈ کلاس کے ستّرہ ٹکٹ لیکر واپس ہوئے مگر ٹکٹ گھر کی کھڑکی
کے پاس سے مسافروں کو چیر پھاڑ کر نکلنا آسان کام نہ تھا یہ تو ادھر آنا چاہتے
تھے اور ادھر کے آدمی اُنکو آنے نہ دیتے تھے آخرکار جب عرق نکل لیا اور کپڑے
پھٹ گئے انگرکھے کے بند ٹوٹ گئے اُسوقت خدا خدا کرکے باہر آئے اور
اسباب تلوا کر اُسکی بلٹی بنوائے اور براتیوں کو ساتھ لیکر ریل میں سوار ہونے

اسٹیشن کے اندر چلے پینس دولہن کی دوسرے رستہ سے اسٹیشن کے اندر پہونچگئی
مگر جدھر سے قاضی صاحب کو جانا تھا وہ بہت تنگ تھا لوہے کا پھاٹک
لوہے کا دروازہ مسافروں کا ہجوم ٹکٹ کلکٹر لوہے کے کٹھرہ کے پاس جسکی
چکردار رستہ میں سے ہر آدمی کو نکلنا ہوتا تھا کھڑا تھا اور ایک ایک مسافر کا
ٹکٹ دیکھ دیکھ کر اندر اسٹیشن کے جانے دیتا تھا قاضی صاحب اور اُن کے
ساتھیوں کو یہاں بھی بہت تکلیف اُٹھانی پڑی اور بمشکل تمام اُس شکنجہ سے
نکل کر پلیٹ فارم پر پہونچے ٹرین تیار کھڑی تھی زنانہ گاڑی میں دولہن اور
عورتوں کو بٹھایا آپ سب ایک کمپارٹمنٹ سوار ہوئے چند منٹ کے بعد
گاڑی چلی اور سلیم گڑھ ہوتی ہوئی لوہے کے پل کو طے کرتی ہوئی شاہدرہ
پہونچگئی شاہدرہ سے غازی آباد دادری سکندر آباد پر ٹھہری اور وہاں سے
چلکر بلند شہر کے اسٹیشن پر تھمی قاضی انوار حسین اور خورشید حسین اور اُن کے
ہمراہی فوراً اوتر پڑے اور زنانہ گاڑی میں سے دولہن اور اپنی دونوں
بہنوں کو اور سب عورتوں کو جھٹ پٹ اوتار لیا ان چھوٹے اسٹیشنوں
پر ڈولی نہیں ملا کرتی اسلئے دولہن بیچاری کو پلیٹ فارم سے اسٹیشن کے
باہر سڑک تک جہاں یکہ اور دوپیہ کھڑے تھے پیدل جانا پڑا الغرض ایک
دوپیہ میں دولہن سوار کی گئی اور یکوں میں مرد بیٹھ کر روانہ ہوئے امتہ
بیچاری کو اس سے پہلے کبھی دوپیہ میں بیٹھنے کا اتفاق نہوا تھا اس لئے
اُس کو دوپیہ میں بیٹھکر بڑی تکلیف ہوئی ایک تو نئی نویلی دولہن شرم کی
ماری جھکی بیٹھی تھی اُس پر دوپیہ کی ناہموار بیٹھک وہ کسی طرح اُس میں
چین سے نہ بیٹھ سکی چونکہ قصبہ احمد آباد (دولہن کی سسرال کا نام ہی)
وہاں سے تقریباً ۱۰ میل تھا اسلئے راہ میں رات کے ۸ بجگئے اور جنگل ویران

میں گیدڑوں نے گلے بازی اور شام کلیان کی الاپ شروع کردی اندھیری رات جنگل بیابان سُنسان میدان ہوا کا سناٹا لومڑیوں کی کھاؤں کھاؤں سُنکر امتہ کا کلیجہ دہلا جاتا تھا غریب اور بدنصیب لڑکی دل میں کہتی تھی واہ رے نصیب کہاں پیدا ہوئی کہاں بڑھی پلی اور کہاں قسمت لائی ہے۔ رات کے ۹ بجے قصبہ میں برات پہونچی مکان ایسی تنگ گلی میں واقع ہوا تھا کہ زنانہ دوپیہ وہاں تک نہ پہونچ سکے اور ڈولی قصبہ میں تھی ہی نہیں دولہن کو پھر دوپیہ سے اوتار کر پیدل چلایا گیا اور وہ بڑی مشکل سے گلی کی منزل طے کر کے گھر میں داخل ہوئی قاضی جی کی بہن اری کلیا بھلا اسوقت گوشت تو کہاں ملیگا تھوڑے سے چانول اوبال لی اور کُٹھیہ میں سے گھی بورا نکالی شکرانہ ہوجائیگا اور منگوچیئں پکالی کلیا جولاہی اچھا بیوی پکاؤں ہوں۔ امتہ دولہن اور پھر دولہن بھی وہ دولہن جسکو اپنی سُسرال میں آئے چند منٹ گذرے تھے بول تو کیا سکتی تھی مگر وہ اپنے دلمیں کہتی تھی کہ الٰہی کُٹھیہ کیا چیز ہے اور منگوچیئں کس شئے کا نام ہے مگر اسکی تقدیر یہ کہتی تھی کہ اے نادان لڑکی باہر کی ان دو بولیوں پر کیا ہنستی ہے اور کیا تعجب کرتی ہے تمام عمر تجکو باہر رہنا پڑیگا اور گاؤں گنویں کی ساری مصیبتیں سہنی ہونگی دلی خواب و خیال ہوجائیگی اور وہاں کے تکلّفات اب تو کبھی خواب میں بھی نہ دیکھیگی الغرض تین گھنٹہ کے بعد دسترخوان بچھایا گیا اور کلیا جولاہی کے ہاتھ کا کھانا پکا ہوا امتہ کے سامنے رکھا گیا ایک بے قلعی تانبہ کے ڈبل طباق میں موٹے چانولوں کا خشکہ بھرا ہوا تھا اُس پر بہت سی لال کھانڈ بچھی ہوئی تھی اور کھانڈ پر بہت سا گھی پگلا کر ڈالا گیا تھا چاندی کے ورقوں کا کچھ ذکر نہ تھا خُورجہ کے چینی کے پیالہ میں منگوچیاں یعنی مونگ کی بڑیاں پکی ہوئی آئیں جو نیلہ تھوت شوربے میں

ڈوبی ہوئی تھیں اور چونکہ بہت پرانی تھیں اسواسطے اُن میں کیڑے پڑ گئے تھے اور پک کر شوربے پر تر آئے تھے اور بہت موٹی موٹی نیلے رنگ کی روٹیاں تھیں جو گھائی میں سینکنے کی وجہ سے راکھ میں بھری ہوئیں تھیں امتہ نے اُس کھانے میں سے شاید ایک دو نوالہ چڑیا کی طرح ننھے ننھے سے اُٹھا کر ہاتھ کھینچ لیا کیونکہ اوّل تو شرم دوسرے بڑیوں کے کیڑے اُسے چراغ کی روشنی میں بخوبی دکھائی دیرہے تھے چانول کچے رہگئے تھے اُس منحوس گاؤں میں امتہ کے واسطے پھولوں کا گہنا اور تکلف کی چیزیں کہاں سے میسّر آسکتی تھیں جو دہلی میں دولہن کیواسطے تخت کی رات کو مہیّا کی جاتی ہیں البتہ چند بیہودہ رسمیں ضرور ادا کی گئیں جنکو ہم لغو سمجھکر یہاں نہیں لکھتے ہیں صرف یہ کہنا کافی ہے کہ شعر

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

بہرحال وہ رات گذر گئی مگر امتہ کی آنکھ جسوقت کھُلی اور اُسکی نظر مکان کی چھت پر پڑی تو اُسنے دیکھا کہ کڑیوں کی جگھ اُس میں گول گول اُس صورت کے لکڑ ڈالے گئے ہیں جیسی ڈھاک کی لکڑیاں دہلی میں ایندھن کیواسطے گھروں میں آیا کرتی ہیں اور وہ بھی سیدھی نہیں ہیں ایک ایک لکڑ میں کئی کئی خم ہیں تختوں کے بدلے سرکنڈہ کے موٹے موٹے مُنجھے بان سے باندھ کر برابر برابر ڈالے گئے ہیں اور چونکہ بانوں کے بند گل کر کھُل گئے ہیں اور چھت میں لٹک رہے ہیں اسلئے اُنکے دیکھنے سے خفقان ہوتا ہی دیواروں کا نظارہ اُس سے بھی زیادہ وحشت خیز تھا نیلی نہ اُن پر سفیدی پھیری گئی تھی نہ گہریا سامنے دیوار میں مٹّی کا ایک چراغدان بنا یا گیا تھا جو نہایت بدشکل تھا اور

تو ہر روزگار سے پرانا ہو کر اور چراغ کے بہے ہوئے تیل سے چکنا ہو کر آبنوسی بنگیا تھا اور اُس پر خاک اوڑ اوڑ کر جم گئی تھی انگنائی دالان ایک ہی تھی دیوار پردہ کی گر گئی تھی اور چونکہ اُدھر جنگل تھا اسلئے کبھی کبھی رات کو گیدڑ اور کتے ہر روز گھس آتے تھے اور سارے گھر میں اُلٹے کُھلے پھرتے تھے امتہ کو اُس گھر میں راحت اگر ملی تو اس سبب سے کہ شوہر اُسکو دل سے چاہتا تھا اور اُسکی صورت کا پروانہ تھا خورشید حسین کی ما باپ اسکو چھوٹا سا چھوڑ کر مر گئے تھے اور بڑے بھائی نے اسکو پال پوس کر بڑا کیا تھا اسواسطے امتہ کے ساس سسرے یا جیٹھ جیٹھانی یہی انوار حسین اور اُسکی بیوی تھیں قاضی جی لاولد تھے اس لئے انکو خورشید حسین کے ساتھ بڑی محبت تھی کسی قدر زرعی جائداد انکے پاس تھی مگر زمانہ کی کشاکش اور تنگی کے وجہ سے اسکو بیچ کر کھا چکے تھے اب گذر اوقات صرف نوکری پر تھی اورنگ آباد میں مکتب پڑھاتے تھے اور خورشید حسین بیکار گھر بیٹھا رہتا تھا کیونکہ اُسنے کسی قدر فارسی پڑھی تھی مگر اردو میں مڈل پاس تک نہ تھا اسلئے سرکاری ملازمت سے اسکو بالکل مایوسی تھی خود وہ اور اُسکی بیوی قاضی جی کے محتاج تھے جو کچھ انہوں نے کھلا دیا وہ کھا لیا جو انہوں نے پہنا دیا وہ پہن لیا ایک تو معاش کی تنگی دوسرے قصبہ ویران اسلئے نازوں کی پلی ہوئی امتہ کو دال کے سوائے گوشت اور ترکاری کا مزہ بھی یاد نہ رہا اور سر میں چنبیلی کے تیل کے بدلہ کڑوا تیل ڈالنے لگی پہلے دن جب کڑوا تیل اُسنے ڈالا تو بہت گھبرائی سر میں جلن بھی ہوئی درد بھی ہوا مگر آخر کار عادت ہو گئی دہلی سے حافظ صاحب کے کئی کئی خط قاضی صاحب کے نام آئے کہ ہم لڑکی کو لینے آئیں مگر قاضی صاحب نے سبکا یہی جواب دیا کہ ابھی بہو کو آئے ہی ہوئے یہاں کے دن ہوئے ہیں دوسرے ہم غریب آدمی ہیں ایسی جلدی جلدی نہ بھیج سکتے ہیں نہ دہلی سے لا سکتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

اشکِ خوں

نواب محسن الملک مرحوم کی رحلت کے بعد مسلمانانِ ہندوستان کو اپنی قوم کے جن سرکردہ بزرگوں کے انتقال کا صدمہ اٹھانا پڑا ہے اُن میں مشیرالدولہ ممتاز الملک آنریبل خلیفہ سیّد محمد حسین صاحب سینیر ممبر کونسل پٹیالہ و ناموَر ٹرسٹی علیگڈھ کالج کا دنیا سے اُٹھ جانا ایک ایسا بڑا نقصان ہے جس کی تلافی محال ہے۔

ہمارے کرم فرما سیّد علمدار حسین صاحب نے ذیل کے ترکیب بند میں اس عام رنج و غم کا اظہار کیا ہے جو خلیفہ صاحب ممدوح کی وفات پر ملک بھر میں ہوا ہے خلیفہ صاحب کی تصویر بھی جو کراچی کانفرنس کے گروپ والی تصویر کے سوا شاید آپکی آخری تصویر ہے آج بطور یادگار درج مخزن کی جاتی ہے:۔

بپا محشر ہی پٹیالہ میں اکیوں شورِ فغاں کیوں ہے؟ بنا آہوں کا زیرِ آسماں اور آسماں کیوں ہے؟
محرّم کا تو ماتم تعزیہ خانوں میں ہوتا ہے یہ ہر گھر سے نکلتا آہ و نالہ کا دُھواں کیوں ہے؟
مسلماں پارسی انگریز ہندو کس کو روتے ہیں بلاتفریقِ مذہب آنکھ سب کی خوں چکاں کیوں ہے؟
یہ شاہانہ سواری کسکی قبرستاں کو جاتی ہے جلو میں یا دلِ بریاں ہر اک پیر و جواں کیوں ہے؟
بہاول پور سے پولیٹکل ایجنٹ پُرسے کو ہیں کس کے آئے؟ جو یہ اشک آنکھوں سے رواں کیوں ہے؟
حضورِ وایسرائے و جملہ حکّام اور رئیسوں کے چلے آتے ہیں تار۔ اب نوحہ خواں ہندوستاں کیوں ہے؟
کنور صاحب بہادر عمِّ ذی شان مہاراجہ ہیں آئے تعزیت کو کسکی؟ یہ غم کا سماں کیوں ہے؟

ہے یکساں رنج کس کا سلطنت اور ہر ریاست کو
نگاہیں ڈھونڈتی ہیں کس کی تدبیر و فراست کو

(۲)

بجا ہے جسقدر ماتم کرے دربار پٹیالہ! جہاں سے اُٹھ گیا بے مثل اک غمخوار پٹیالہ!!

خلیفہ صاحب نام آور دوراں نے رحلت کی!! پڑے ہیں بند یکسر دفتر و بازار پٹیالہ!!
ہزار افسوس وہ گل جا بسا جنت کے بستاں میں مہکتا جس کی خوشبو سے تھا یہ گلزار پٹیالہ!!
مشیر الدولہ سے بڑھ کر یقیناً اس زمانے میں نہ ہوگا خیر خواہ دولت و سرکار پٹیالہ!!
بزرگ قوم ۔ فخر ملک ۔ اہل درد ۔ اہل دل مشیر سلطنت اور طرۂ دستار پٹیالہ!!
ریاست کی ہر اک مشکل کو حل کرتے تھے دم بھر میں انھیں آسان تھا ہر عقدۂ دشوار پٹیالہ!!
پڑی جب کوئی گتھی ناخن تدبیر سے کھولی کہاں ملتے ہیں ایسے واقف اسرار پٹیالہ!!

مسایل ملک داری کے ہزاروں اُن کو تھے ازبر
(۳)
خزانہ تجربوں کا تھے تو معلومات کا دفتر

شرارت پر کمر باندھے رہے گو اہل کیں برسوں مگر بہر ریاست وہ رہے حصن حصین برسوں
غضب کی مستقل تھی رائے اور ہمت قیامت کی چلی جاتی تھی اُنکی ایک ہاں اور اک نہیں برسوں
حکومت شان و شوکت حق نے فرمایا عطا کیا رہے اقبال و دولت آپ کے زیر نگیں برسوں
بھلا کر کے بُرا سُنتے عجب ضبط و تحمل تھا نہ بل ابرو پہ پڑتا اور نہ پیشانی پہ چین برسوں
قلم جب دم اُٹھاتے مُلکی و قومی مسایل پر پہنچتا وقت سے پہلے خیال دوربین برسوں
دلوں سے محو ہو سکتا نہیں رنج و الم اُن کا رہیگی قوم اُن کے سوگ میں ماتم نشیں برسوں
رہیں گی یاد اُن کی خدمتیں مُلک و ریاست کو بیاں اوصاف ہونگے اُن کے بالائے زمیں برسوں

کروڑوں ہیں مسلماں اب بھی ۔ پر انساں کہاں ایسے!
(۴)
نہ باقی پیر ہیں ایسے ۔ نہ ملتے ہیں جواں ایسے!!

رواں ہر گفتگو میں اُنکی اک موج فصاحت تھی وہ مقناطیس کا جذبہ تھا یا بجلی کی طاقت تھی
زباں سے جو نکلتا تھا ۔ قلم سے جو ٹپکتا تھا ہویدا اُن کے اک اک لفظ سے سو سو بلاغت تھی
کوئی تدبیر ۔ کوئی رائے ۔ اور تجویز ہو کوئی انھیں مد نظر ہر اک میں بہبود ریاست تھی

لہ نظر بد بینوں کی گرچہ رہی وقف کمیں برسوں ۱۲

وزیر و میر منشی ایسے پٹیالے نے پائے تھے　　کہ جنکی ایشیا میں دھاک اور یورپ میں شہرت تھی
نہایت برتر و اعلیٰ تھا علم و فضل دونو کا　　خدا کے فضل سے موجود اُن میں ہر فضیلت تھی
صلاحیں قیصری و دولتِ نے لیں تدبیر تھی ایسی　　بدل دی رای سرسید کی جس نے وہ لیاقت تھی
بلندی پر دیا پہنچا ہر اک نظمِ ریاست کو　　طبیعت خوب اُنکی ماہر رمز سیاست تھی

گلیڈسٹن تھے اور بسمارک یا ابوالفضل و فیضی تھے
وہ اپنے وقت کے گویا نظام الملک و طوسی تھے

---

(۵)

وہ روشن رای و والاشان و عالی جاہ تھے دونو　　سپہرِ ملک کے تابندہ مہر و ماہ تھے دونو
وہ خود تھے اہلِ جوہر قدرداں تھے اہلِ جوہر کے　　وہ حق بیں۔ حق شنو حق دوست۔ حق آگاہ تھے دونو
عدو سرکارِ قیصر اور ریاست کا عدو اُن کا　　بجز اِسکے کسی کے بھی نہ وہ بدخواہ تھے دونو
گھلا کرتے تھے قوم و ملک کی فکر ترقی میں　　ترقی کی نکالا کرتے ہر دم راہ تھے دونو
وہ ملک و قوم کے خادم کو آنکھوں پر بٹھاتے تھے　　پئے خدمت کمربستہ بلا اکراہ تھے دونو
وہ ہر اک اہلِ علم و فضل کے ملجا و ماوا تھے　　ہنرمندوں میں آگاہوں کے تکیہ گاہ تھے دونو
رفاہِ ملت و دولت تھی اُن کے دم سے وابستہ　　رئیسِ وقت و قیصر کے وہ نیکوخواہ تھے دونو

ہر اک پہلو سے تھے ممتاز وہ روشن خیالوں میں
"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والوں میں"

(۶)

زمانے میں رہیگی تا قیامت یادگار اُن کی　　لیاقت یادگار اُن کی فضیلت یادگار اُنکی
وہ ملک و قوم کے مخدوم بھی تھے اور خادم بھی　　رہیگی سب کو مخدومی و خدمت یادگار اُنکی
کراچی۔ شملے ڈھاکے پہنچے خدمت قوم کی کرنے　　رہیگی ضعف پیری میں یہ ہمت یادگار اُنکی
وہ صلح کل تھے خیر محض تھے خلق مجسم تھے　　مروت یادگار اُنکی شرافت یادگار اُنکی

کبھی کچھ فرق کرتے تھے نہ وہ ہندو مسلماں ہیں رہیگی کیوں نہ یہ طرز حکومت یادگار اُن کی
وہ مسکیں پروری عاجز نوازی عام فیاضی غرض مندو نپہ شفقت خاص عادت یادگار انکی
قیامت تک خدا آباد رکھے اس گھرانے کو رہے باعزّت و اقبال و دولت یادگار انکی

خلیفہ صاحب "مغفور" کی فردوس میں جا ہو
۱۳۲۶ھ
الٰہی اُن کی تربت پر تری رحمت کا سایہ ہو

سیّد علمدار حسین واسطی

دربار بسنت

ذیل کے اشعار ہمارے مکرم چودھری خوشی محمد صاحب ناظر بی۔اے نے ہز ہائی نس مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ بہادر۔جی۔سی۔ایس۔آئی والئی ریاست جموں و کشمیر کی خدمت میں دربار بسنت کے موقعہ پر بطور تہنیت پیشکش کئے تھے۔آخری شعر کے پہلے مصرعہ میں سرکار حضور مہاراجہ صاحب بہادر کا نام کس خوبی سے کھپایا ہے اور دوسرے مصرعہ میں سرگباشی مہاراجہ سر رنبیر سنگھ کی طرف اشارہ ہے:۔

ہے عجب شان سے آراستہ دربار بسنت
آج سرکار کا دربار ہے گلزار بسنت

شہر جموں میں لگا آج ہے بازار بسنت
کوئے و برزن ہیں بسنتی در و دیوار بسنت

دشت و صحرا ہیں بسنتی تو ہے کوہسار بسنت
مطربا چھیڑ طرب ریز کوئی تار بسنت

ہیں سب اراکان ریاست کے بسنتی ملبوس
تن پہ زردوز عبا سر پہ ہے دستار بسنت

کثرت زر سے ہے سائل کا بسنتی دامن
اور کف شاہ ہے بخشش سے گہربار بسنت

کشت زار و نمیں ہی سرسونکا بسنتی تھا لباس | باغ میں نرگس مستانہ ہے بیمار بسنت
شہر جموں ہے بنام مرکز دربار شہی | سرحد تبت و تاتار ہے پر کار بسنت
گل و گلزار پہ گو چھائی ہی لداخ میں برف | ہے بخاری سے عیاں جلوۂ انوار بسنت
بند و بستی بھی ہیں دیہات میں سرگرم نشاط | جھنڈیاں شجرہ کشونکی ہیں علمدار بسنت
ہے ہر ایک بندۂ دولت کی زباں پہ جاری | ہو مبارک سری سرکار کو دربار بسنت
ہیں دعاگوی سرکار میں سب خورد و کلاں | باعث گرمی محفل ہی یہ گفتار بسنت
گرچہ دربار معلیٰ سے ہیں دور افتادہ | ہم بھی کر لیتے تصور میں ہیں دیدار بسنت
ہو مہاراج ترا نیر اقبال بلند | نور خورشید ہے تا مظہر انوار بسنت
ترے دیدار سے ہو دیدہ ناظر روشن | چشم نرگس میں ہی تا مستی میخوار بسنت

جلوۂ گل کا گلستاں میں ہے جبتک پرتاب
باغ رنبیر رہے غیرت گلزار بسنت

خوشی محمد مہتمم بندوبست و وزیر لداخ

بی بی اور لیڈی کا مکالمہ

کہا ایک بی بی سے لیڈی نے اکدن | کہ موجودہ تہذیب سے تم ہو عاری
نئی روشنی کا اثر کچھ نہیں ہے | پرانی ہیں جتنی ہیں باتیں تمھاری
سمجھتی ہو زیور کو زینت کا ساماں | خوشی سے اٹھاتی ہو یہ بوجھ بھاری
بناوٹ سے تم چاہتی ہو چمکنا | لگاتی ہو کپڑوں پہ گوٹا کناری
وہی کرتی انگیا وہی بند محرم | چلی جاتی ہے حسن کی پردہ داری

یہ سب کام باہر ہیں تہذیب سے اب | نشانِ جہالت ہیں باتیں یہ ساری
سلیقہ نہیں بات کرنے کا تم کو | سرِ بزم کیونکر نہ حاصل ہو خواری
لڑائی میں بڑھ کر ہو بھٹیاریوں سے | چلاتی ہو بےڈھب چھری اور کٹاری
کبھی گھاؤ بھرتا نہیں ہے زباں کا | کہ تلوار سے بھی ہے زخم اس کا کاری
نہ تہذیب تم میں نہ شایستگی ہے | نئی روشنی میں چلن ہیں گنواری
ہمیشہ سے مجبور و پابند ہو تم | نہیں ہے کوئی بات بھی اختیاری
مصیبت سے دن کاٹتی ہو جہاں میں | یہ جینا ہے یا نزع کی دم شماری
رہا کرتی ہو قید۔ گھر میں ہمیشہ | نہ سیر و سیاحت نہ شوقِ سواری
تمھیں اس سے کیا۔ تم اسیرِ قفس ہو | چلے باغ میں لاکھ بادِ بہاری
تمھیں جیتے جی مار رکھا ہے اس نے | پڑے بھاڑ چولھے میں یہ وضعداری

کہا سن کے بی بی نے اے میم صاحب | بس اب چپ ہو آئی ہے میری باری
نئی روشنی کے نئے گیت گائے | بہت تم نے بڑھ بڑھ کے شیخی بگھاری
تماشا تو دیکھو کہ پردہ اٹھا کر | بنی پھرتی ہے میم میری بچاری
نظر پڑتی ہے غیر لوگوں کی ہر دم | تمھارا یہ چہرہ ہے یا چاند ماری
کیا کرتی ہو غیر مردوں سے باتیں | پھٹکتی نہیں پاس تک شرمساری
ہوئی ڈولی اور بند گاڑی سے نفرت | پسند آئی بائی سکل کی سواری
نہیں تم کو سیر و سیاحت سے فرصت | بری طرح برباد ہے خانہ داری
نہ اتراؤ میموں کا سایا پہن کر | کہ صورت ہے کالی کلوٹی تمھاری
چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھولا | نہ کام آئی کوّے کی کچھ ہوشیاری
نہ بیگم ہے کوئی نہ رانی ہے کوئی | نہ زیب النسا ہے نہ چنچل کماری

مسز اور مس بن گئیں عورتیں سب | لقب ہے نہ بیاہی بچی ہے نہ کواری
ترقی کرو علم و شایستگی میں | نہ چھوڑو مگر اپنی تم وضعداری
اسے کہتے ہیں لوگ تقلید بیجا | بناوٹ ہے یہ سادگی بھی تمھاری
کوئی آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکتا | حکومت کا میموں کے سکّہ ہی جاری
ہمیں زیب دیتی نہیں ریس ان کی | خرابی ہے بے پردگی میں ہماری
نہیں ملک میں رعب داب اپنا کچھ بھی | حکومت سے پھبتی ہیں یا تیں یہ ساری

وجاہت مناسب ہے سب عورتوں کو
کریں ننگ و ناموس کی پاسداری

وجاہت جھنجھانوی

فریادِ احسن

ہمارے عنایت فرما سید مہدی حسن صاحب احسن کے سب دوست اس پُر افسوس خبر سے مغموم ہونگے کہ انہیں حال میں پھر وہی داغ دیکھنا پڑا ہے جسکا نوحہ ایک دفعہ پہلے مخزن میں چھپ چکا ہے۔ اشعار مندرجہ ذیل اُنکے درد بھرے دل کی آواز ہیں۔ خدا انہیں توفیق صبر دے:۔

پھر ہوئی ہی ہوس لذتِ فریاد مجھے | پھر رلاتا ہی غم فرقتِ اولاد مجھے
پھر ستاتا ہی یہ چرخ ستم ایجاد مجھے | وقت گزرا ہوا آنے لگا پھر یاد مجھے
پھر مرے کان میں آواز بُکا آتی ہے | پھر مرے سینہ سے ماتم کی صدا آتی ہے
پھر بلند آج مرا شور و فغاں ہوتا ہی | پھر مرا دردِ نہاں سب پہ عیاں ہوتا ہی

پھر مرا باغِ طرب صرفِ خزاں ہوتا ہے ۔ پھر بپا ماتمِ فرزندِ جواں ہوتا ہے
دل مرا جینے سے پھر سیر نظر آتا ہے ۔ پھر زمانہ مجھے اندھیر نظر آتا ہے

بیخبر ہوں نہیں کچھ اپنی خبر آٹھ پہر ۔ درد دل کے ہی سوا درد جگر آٹھ پہر
کسکے مشتاق ہیں یہ دیدۂ تر آٹھ پہر ۔ ڈھونڈھتی پھرتی ہے کسکو یہ نظر آٹھ پہر

ہے مرے سامنے تصویر جوانی کسکی ۔ دل کہا کرتا ہے ہر وقت کہانی کسکی
حسرتِ مرگ ہے جینے کی نہیں آس مجھے ۔ یہ ہوا چمنِ دہر نہیں راس مجھے

فرد بیکار ہوں ہر رنگ میں ہے یاس مجھے ۔ کثرتِ غم سے نہیں غم کا بھی احساس مجھے
گر کبھی درد جگر حد سے سوا ہوتا ہے ۔ سوچتا رہتا ہوں پہروں کہ یہ کیا ہوتا ہے

کچھ عجب ہیں مری عالمِ خلوت کے مزے ۔ لذتیں دردِ جگر کی ہیں اذیت کے مزے
مجھ سے پوچھے کوئی میری شبِ فرقت کے مزے ۔ دل سے سب بھولے ہوئے محفلِ عشرت کے مزے

کیا ضرورت ہے کہ ہمدرد کوئی پاس رہے ۔ خوش ہوں ہمیں کہ ہجومِ الم و یاس رہے
تمکو کیا جلد زمانے سے تھی جانیکی ہوس ۔ پورے ہونے نہ دیئے عمر کے انیس برس

یہ بھی پابندیِ قدرت تھی کہ ہو کر بیبس ۔ کر لئے گلشنِ ہستی میں بسر چند نفس
تھی وصیت جو دمِ مرگ جوانی تیری ۔ میں کلیجے سے لگائے ہوں نشانی تیری

قابلِ ذکر نہیں تلخیِ ایامِ حیات ۔ طائرِ روح ہے بیچین تہِ دامِ حیات
عمر کے ہاتھ سے گرنیکو ہے اب جامِ حیات ۔ روح فرسا ہے بہت تیرگیِ شامِ حیات

زندگی بھر کے لئے ساتھ ہے میرا اسکا ۔ قبر کی یاد دلاتا ہے اندھیرا اسکا
آہ نورِ نظر و راحتِ جانِ احسن ۔ کوئی سنتا نہیں آوازِ فغانِ احسن

اے مطیعِ پدر و مرتبہ دانِ احسن ۔ کچھ اثر کاش کرے حسنِ بیانِ احسن

دردکیوں دل میں رہے زینتِ پہلو ہو کر
ایک بار اور جو مل جائے خفا تو ہو کر

نابینا پھول والی کا گیت

گلہائے رنگا رنگ کا یہ گلدستہ جو ہمیں آج ہاتھ لگا ہے۔ اسکے لئے ہمیں اور ناظرین مخزن کو اصل میں منشی عنایت اللہ خاں صاحب بی۔ اے خلف شمس العلما منشی محمد ذکا اللہ خاں صاحب کا ممنون ہونا چاہئے خدا جانے انہوں نے کس قبول کی گھڑی میں لٹن کی دلپذیر نظم کا ترجمہ شہر میں کیا تھا فروری کے پرچے میں شایع ہو چکا ہے۔ کہ بہت سے شعرا اسے پڑھ کر بے چین ہو گئے اور "پھول والی کے گیت" کے متعدد منظوم ترجمے ہمارے پاس پہنچ گئے۔ انمیں سے چار ترجمے چھپنے کیلئے انتخاب کئے گئے ہیں اپنی اپنی جگہ سب داد کے قابل ہیں۔ مگر جس نظم کو ہم نے سب سے پہلے درج کیا ہے۔ اس کی یہ خوبی خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ اس میں فاضل مترجم کے سادہ الفاظ قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے:۔

(۱)

لوگو! میرے پھول خریدو — کہتی ہوں عجز سے پھول خریدو
پاؤں کے نیچے جو یہ زمیں ہے — سنتی ہوں لوگوں سے کہ حسیں ہے
ہیں یہ پھول اسی کے بچے — حسن ہے ماں کا ظاہر ان سے
اٹھکے ابھی ابھی یہ ہیں آئے — گود میں ماں کے پڑے سوتے تھے
سوتوں کو یو میں اٹھا لائی ہوں — اوس کے زد سے بچا لائی ہوں
چلتی تھیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں — ماں پڑھ پڑھکر گویا دعائیں
پھول سے بچوں پہ دم کرتی تھی — ہر دم ان کا دم بھرتی تھی
بچوں کے لب پر یہ جو عیاں ہیں — میٹھے پیار کے ماں کی نشاں ہیں
دیکھئے تو رخسار مادر — اشک محبت سے ہیں اب تر

دن رات انکی ہے وہ نگہباں — فکر میں بے چین اور ہے گریاں
گاہ بہاتی آنسو خوشی سے — بچے کیسے اچھے اٹھے
قطرۂ شبنم آنسو اس کا — مانکی محبت ہے سرچشمہ
لوگو! دنیا نور کا گھر ہے — جسمیں قلب یار بھی گھر ہے
زندہ رہتی ہے اسمیں محبّت — نام سے نفرت کے ہی نفرت
لیکن مجھ بیکس اندھی کا — گھر ہے اندھیری رات کا کالا
جسمیں فقط آوازیں ہیں بستی — اور نظر آتا نہیں کوئی
گویا کھڑی ہوں نیچے زمیں کے — آفت کی ندیوں کے کنارے
اچھی بُری پرچھائیاں ساری — پاس سے میرے جب ہیں گذرتی
انکی آوازیں سنتی ہوں — سوچ کے پھر یہ سر دھنتی ہوں
صورتیں ہونگی انکیں وہ بھی — کرتے ہیں عاشق پوجا جنکی
کیسی وہ شکلیں ہونگی الٰہی؟ — دیکھوں کیسے آنکھ ہے اندھی؟
دل میں جوش اٹھتا ہے جسدم — ہاتھ کو پھیلاتی ہوں پیہم
ہائے سوائے خالی خولی — آوازوں کے کچھ نہیں سنتی
زندہ چیز اک پرچھائیں ہے — جسمیں صدا ہی۔ جسم نہیں ہے
لوگو! میرے پھول خریدو — کہتی ہیں کیا یہ جانیں؟ سنو تو
انکو بھی دی ہے زبان اللہ نے — تاکہ کریں فریاد یہ تم سے
اس لڑکی کا سانس ہماری — مرجھا دیگا پنکھڑیاں ساری
ہم نازک ہیں پھول حسین ہیں — نور کے بچے چشم زمیں ہیں
تاریکی میں رہنے والی — لڑکی سے ہے جاں گھبراتی
نا بینا کے قید سے ہمکو — کیجئے آزاد اب اے لوگو

باندھا ہے جنّے جیوں کوں تجھ عشوہ گری پر۔ پھرتا ہی وہ بن بن
دیکھے سوں تری داغ کے جلوے کوں جگر پر۔ بولا مجھے یوں ل
کیا خوب اُٹھا نقش عقیق جگری پر ۔ خورشید سوں روشن
چنچل نے نظر ناز سوں آہو پہ کیا نہیں۔ نرگس کی ہے سوگند
قربان ہوا اُس شوخ کی والا نظری پر۔ عشاق کا تن من
بوجھا ہے وَلی تب ستی ہو ہن نے تبرج کوں۔ ذرے سے بھی کمتر
کرتا ہے نظر جب ستی دستار زری پر۔ لے ہاتھ میں ہر ہن

مخمس بھی کئی لکھے ہیں اِنمیں ایک نہایت پاکیزہ و لطیف ہے جسکے تین بند یہ ہیں:-

نکر تو آشنائی غیر سوں ای سیمتن ہر گز نہوا ای شمع رو ہر انجمن میں شعلہ زن ہر گز
نہ مل مائل ہو ہر طوطی سوں ای شکر شکن ہر گز نہ مل ہر بلبل مشتاق سوں ای گلبدن ہر گز
ہر اک گلشن میں جوں نرگس نکھول اپنے نین ہر گز

فصیحان خلق کے سارے تجھے شیریں بچن کہتے (ہیں) پیشانی روز روشن اور زلف کالی رین کہتے
مبصر ہر جواہر کے تجھے دُرِ عدن کہتے جہاں کے گلرخاں سارے تجھے ناز کبدن کہتے
تو ہر پلکاں کے کانٹوں پر نہ دھر اپنے چرن ہر گز

تو ہے محبوب عالم کا و لے عالم سوں ہو یکسو تو محبوباں میں عنقا ہی نہ دکھلانا کسی کو رو
جو آتش دان کیا دل کوں لجا وان زلف عنبر بو بغیر از عید مت دکھلا کسی کو تو ہلال ابرو
نہ مل اغیار سوں ای نازنیں چندر بدن ہر گز

ولی کے دیوان میں قصیدہ ایک بھی نہیں ہے۔ ایسے آزاد مزاج لوگ بھلا کس کی مدح وثنا کرتے۔ **رباعیات** کچھ ہیں۔ کہتا ہے ؎

تجھ عشق سوں نت بی سر و ساماں ہوں میں تجھ زلف سوں بیتاب و پریشاں ہوں میں
تجھ مکھ کی صفائی کوں نظر میں رکھکر مدت ستی جوں آئینہ حیراں ہوں میں

شبنم کی بوندیاں ہیں کہ آنسو یہاں کے ہیں — سرچشمۂ وفا ہیں۔ یہ قطرے کہاں کے ہیں
تصویر خانہ ہی تمھیں لوگو! فضائے دہر — اور میں غریب اندھی ہوں نا آشنائے دہر
تاریک ہے یہ بزم تماشا مرے لئے — ظلمت کدہ ہی محفل دنیا مرے لئے
آنکھوں بغیر سب ہیں مظاہر جہاں کے ہیچ — میرے لئے ہیں آہ مناظر یہاں کے ہیچ
دنیا کی صورتوں کو میں دکھیا ترستی ہوں — اجڑی ہوئی صداؤں کی منزل میں بستی ہوں
گویا قریب ساحل ظلمت کھڑی ہوئیں — محو تلاش جلوۂ صورت کھڑی ہوئیں
سائے ہیں خوب و زشت گزرتی قریب سے — پنہاں مگر ہیں دیدۂ حسرت نصیب سے
نکلینگی ان میں ایسی بھی دو چار صورتیں — صبر آزما حسین۔ طرحدار۔ صورتیں
صورت پہ جنکی خلق خدا ہی مٹی ہوئی — ناز و ادا پہ جنکے قضا ہی مٹی ہوئی
وہ کیسی ہوتی ہونگی ترستی ہوں میں غریب — دیکھوں نظر اٹھا کے یہ ایسی کہاں نصیب
میرا بجز صداؤں کے ہمراز کون ہے — ظلمت کدے میں مونس و دمساز کون ہے

لوگو! چلو! مرے گل رعنا خرید لو — اس اندھی پھولوں والی کا سودا خرید لو
کہتے ہیں کیا غریب یہ انکی فغاں سنو — فریاد کو انھیں بھی ملی ہے زباں سنو

اس اندھی پھولوں والی کا دم ہی ستم ہمیں — مرجھا کے رہ نجائیں کہیں ہے یہ غم ہمیں
نازک ہیں۔ دھان پان ہیں بچے ہیں نور کے — پروردۂ بہار ہیں ٹکڑے ہیں نور کے
ڈرتے ہیں اس دوشیزۂ ظلمت نشیں سے ہم — شور بکائے پیہم و آہ حزیں سے ہم
آزاد اسکی قید ستم سے کرے کوئی — دامان شوق میں ہمیں یا رب بھرے کوئی
ہم دایۂ بہار کے نور نگاہ ہیں — آنکھیں اس اندھی لڑکی کی بے نور آہ ہیں
مشتاق ہیں ان آنکھوں کے پروردگار ہم — جو ہم کو دیکھیں۔ جنکو دکھائیں بہار ہم
لوگو! چلو! مرے گل رعنا خرید لو — اس اندھی پھولوں والی کا سودا خرید لو

سرور جہان آبادی

(۳)

میں پھول بیچنے لائی ہوں - لو - پریزادو بن آنکھوں والی سے انکو نجات دلوا دو
جمال والو جمیلوں کی کچھ تو قدر کرو یہ میرے ہاتھوں میں کمھلاتے ہیں انہیں لیلو

خریدو - کوڑیوں میں نور کے خزانے ہیں
نہیں ہیں پھول یہ قدرت کے چور خانے ہیں

میں سنتی ہوں یہ زمیں حسن میں نرالی ہے تمہیں ہے عین یقیں - اور مجھے خیالی ہے
اگر یہ سچ ہے تو جو چیز جھولی والی ہے بڑی ہی لاڈ سے گودوں میں اس نے پالی ہے

خریدو - پھول ہیں تازہ ہیں آنکھ رکھتے ہو
پرکھ لو تم تو پرکھنے کی ساکھ رکھتے ہو

یہ ماں کی گود میں سوتے تھے میٹھی نیند ابھی نسیم کرتی تھی دم پڑھ کے آیۃ الکرسی
جگا کے لی جو چلی میں تو ماں بلک اوٹھی کلی کلی مجھے دیتی دعاء بد ہی رہی

زبان حال سے یوں کوستی رہی سوسن
کہ تیری آنکھوں میں دایم ہو پھول کا مسکن

چمن کے رشتہ سے یہ بچے ہیں عزیز بہم ہیں بعض ماں کے اکیلے تو شاذ ہیں توام
یہ ہنستے کھیلتے پروان چڑھتے تھے پیہم شباب رنگ پہ آیا تو ہے مگر کم کم

میں ماں کی گود سے انکو چھٹا کے لائی ہوں
بلک رہے تھے مگر یاں منا کے لائی ہوں

جہاں میں رہتی ہوں سنسان ساری بستی ہے عجیب دیس ہے دن کو بھی رات بستی ہے
تمہاری دید کو کیا کیا دکھی ترستی ہے غریب و بیکس و ناچار اپنی ہستی ہے

دکھی ہوں رنج و مصیبت کی کھینے والی ہوں
خدا کے ملک جلالی کی رہنے والی ہوں

مری ہے عالم تاریک میں شریک آواز یہی غریب ہے ہر حال میں فقط دمساز
اسی کو عالم حس میں ہی میرے سوز ساز نہ اور ناتہ کسی سے نہ کوئی محرم راز

حسب ضعیف۔ نسب بے نشاں۔ پریشاں نام
لقب اسیر دوام۔ اور کنیت ناکام

میں سنتی ہوں کہ کوئی شی ہی حسن و رنگ بشر کہ جسکے سامنے خیرہ ہے چشم شمس و قمر
کرشمہ اسکا غضب ہے، ستم خدنگ نظر چبھو دیا مرے دلمیں خیال نے نشتر

یہ حسن و عشق کے چرچے جو تم چلاتے ہو
یقین جانو کہ دل کو مرے جلاتے ہو

جگر کباب کی فریاد زار تو سن لو سکھی ہو تم تو دکھی کی پکار تو سن لو
لگا کے کان گلونکی گو ہار تو سن لو زبان گل سے صدای بہار تو سن لو

جو دل ہو سینے میں زندہ دلونکی بات سنو
سنو تو۔ آشک کی کچھ دل جلونکی بات سنو

سید محمد ابراہیم آشک

(۴)

خریدو پھول میرے لینے والو ذرا ان کی بہاروں کا مزا لو

یہ کہتی ہوں میں تم سے عاجزی سے خریدو پھول تم دریا دلی سے
نہایت خوبصورت یہ زمیں ہے سنا کرتی ہوں میں ہر آدمی سے
زمیں ہے خوبصورت گر یہ انکی تو یہ سب پھول ہیں پیدا اسی سے
عیاں ہے حسن ان سے انکی ماں کا پری پیدا ہوئی گویا پری سے
یہ سارے پھول ہیں بچے اسی کے نہیں کہتی ہوں تمسے دل لگی سے
یہ ماں کی گود میں سوتے تھے غافل ابھی آئے ہیں اٹھ کر دو گھڑی سے

یہ میٹھی نیندیوں سوئے پڑے تھے
غرض ان کو نہ تھی گویا کسی سے
اوڑھا لائی ہوں سوتوں کو یونہیں میں
جدا بچے ہیں ماں کی ہمدمی سے
نسیم صبح پنکھا جھل رہی تھی
ملی جاتی تھی شبنم ہر کلی سے
نسیم ہوتی تھی قربان چلتی کیا تھی
فدا یوں ہو رہی تھی لاکھ جی سے
دعا پڑھ پڑھ کے پھونکے جسطرح سے
کوئی ماں اپنے بچے پر خوشی سے

وہ ماں کی میٹھی میٹھی الفتوں کا
نشاں ہے ان کے ہونٹوں سے ہویدا
کھلی جاتی ہیں سب مارے خوشی کے
یہ ساری پنکھڑی پھولوں کی گویا
اُسی آنسو سے یہ تر ہیں ابھی تک
عذار الفت مادر پہ جو تھا
کیا کرتی ہے رکھوالی شب و روز
رہا کرتا ہے اُسکو فکر ان کا
دھڑکتا ہے کبھی دل انکے غم سے
بہاتی ہے کبھی رو رو کے دریا
نکلتے ہیں کبھی آنسو خوشی سے
کہ صدقے تری قدرت کے خدایا
میرے بچے چڑھے پروان سارے
ہوئے سب حسن میں بے مثل و یکتا
کبھی ہوتی ہے سرگرم محبت
کبھی الفت سے آجاتا ہے رونا
نمایاں ہیں جو یہ قطرات شبنم
انھیں اشکوں سے وہ ہوتی ہے شیدا
انھیں اشکوں کا سرچشمہ ہے الفت
وہ الفت جس کا ماں رکھتی ہے اخفا

سُنا ہے میں نے اے لوگو یہ اکثر
یہ دُنیا ہے تمھاری نور کا گھر
جہاں محبوب کے دل میں بھی گویا
محبت زندگی پاتی ہے آکر
شب دیجور کی صورت مگر ہاں
رہا مجھ اندھی بیکس کا سدا گھر
فقط ہیں جسمیں آوازوں کی گونجیں
نہ اس سے کچھ زیادہ اور نہ کمتر

اندھیرے میں زمیں کے نیچے گویا ۔۔۔ مصیبت اور غم کے اسے خردور
بہی جاتی ہیں کالی کالی ندیاں ۔۔۔ کھڑی ہوں میں کنارے کے برابر
گذرجاتی ہیں سب پرچھائیاں سی ۔۔۔ بُری اچھی یہاں سب پاس ہوکر
نظر آتی نہیں صورت کسی کی ۔۔۔ سُنا کرتی ہوں باتیں اُن کی اکثر
انھیں میں ہونگی ایسی صورتیں بھی ۔۔۔ انھیں میں ہونگے ایسے ماہ پیکر
کشش ہوتی ہے جنکی صورتوں میں ۔۔۔ ہوا کرتا ہے جن سے عشق اکثر
خدا جانے وہ کیسی ہوتی ہونگی ۔۔۔ تصور تک نہیں آتا ہے دل پر
ترستی ہوں میں اُن کے دیکھنے کو ۔۔۔ عیاں ہوتے ہیں جوش قلب مضطر
سدا پھیلائے مینے شوق میں ہاتھ ۔۔۔ کوئی پُرساں نہیں۔ اللہ اکبر!
وہی مجموعۂ اصوات دن رات ۔۔۔ وہی آواز خالی خولی اکثر
مرے نزدیک سب اشیا، جاندار ۔۔۔ نہیں آلودۂ جسمِ مکدر
نہیں رکھتیں یہ سب پرچھائیاں جسم ۔۔۔ فقط آواز کا ہے اِن میں جوہر

چلو! لوگو خریدو پھول میرے ۔۔۔ سجالو ٹوپیاں ہاتھوں میں ڈالو
سُنو لوگو یہ پیاری پیاری جانیں ۔۔۔ ذرا دیکھو کہ کیا کیا کہہ رہی ہیں
زبان انکو ملی ہے بہر فریاد ۔۔۔ جو یوں کرتے ہیں سب دلدوز آہیں

چلو لوگو خریدو پھول میرے ۔۔۔ بہرو چنگیریاں میزیں سجالو
سُنو اے دوستو غم کھا رہے ہیں ۔۔۔ ہم اپنی جان سے تنگ آرہے ہیں
تمھیں سب حالتیں دکھلا رہے ہیں ۔۔۔ سب آپ ہی آپ ہم مُرجھا رہے ہیں
یہ لڑکی سانس لیتی ہے برابر ۔۔۔ ہم اِس کے سانس سے کُملا رہے ہیں
ہم آخر پھول ہیں نازک ہیں اتنے ۔۔۔ کہ بچے تو زرکے کہلا رہے ہیں

زمیں کے ناز پروردہ ہمیں ہیں — ہم اس کی قید میں گھبرا رہے ہیں

یہ لڑکی ساکن ظلمت ہے لوگو — ہم اسکے ساتھ ہولیں کھا رہے ہیں

کیا ہے قید اس اندھی نے ہمکو — بڑی آفت میں ہم سب آ رہے ہیں

ہمیں آزاد کردو صاحبو تم — اندھیرے گھر میں ہم گھبرا رہے ہیں

اور اُن آنکھوں کی ہے ہم کو تمنا — حسیں جن کے لئے للچا رہے ہیں

اُنھیں لوگوں کے ہیں مشتاق ہم تو — جو ہم کو دیکھنے کو آ رہے ہیں

اندھیرے میں ہمارا حُسن یارو — نظر آتا نہیں گھبرا رہے ہیں

جمال وحسن کے شیدا تمھیں ہو — تمھیں ہم اسلئے پرچا رہے ہیں

تمہارے دیدۂ روشن عزیزو — فلک پر ماہ کو شرما رہے ہیں

بنے ہیں مطلع مہر درخشاں — جمال اپنا ہمیں دکھلا رہے ہیں"

چلو لوگو خریدو پھول سیرے — دکھا لو دیکھ لو گھنے بنا لو

آشک بلند شہری

تازہ غزلیں

مجھے اولجھا دیا ہے دل نے گھونگر والے بالوں سے — یہ سب چالاکیاں سیکھا ہے اٹکھیلی کی چالوں سے

قضا بیکار کرتی ہے بہانے مرنے والوں سے — سنبھلتے ہیں کہیں بیمار فرقت کے سنبھالوں سے

بڑے بیدرد ہیں یہ بت نہایت بیمروت ہیں — کہیں کیا شدت درد جگر خوش ہونے والوں سے

پلائے سب کو ساقی بزم میں ہم آنکھوں سے دیکھیں — ادھر دیکھے کہ کیا حسرت ٹپکتی تھی پیالوں سے

مرے دلکی تڑپ پر خود جگر کے زخم خنداں ہیں — توقع خاک ہمدردی کی ہو یوں ہنسنے والوں سے

کوئی دیکھے دل عاشق میں کر لیتے ہیں گھر کیونکر — کوئی سیکھے ذرا آنکھیں لڑانا خوش جمالوں سے

جُدا گل سے ہوئی کیا ایک بُلبل ہی گلستاں میں
گری ہیں ٹوٹ کر شاخوں سے گل شاخیں نہالوں سے

بھری ہی کس قیامت کی ادا بننے سنورنے میں
بگڑتے ہیں وہ کیا شانہ اُلجھتا ہے جو بالوں سے

یہ حالت ہوگئی رخ پر گلوں کے چھا گئی زردی
چمن کا رنگ اوڑ جاتا ہی بُلبُل تیرے نالوں سے

یہ بھولا پن ستم کا ہے کہ وہ شانہ سمجھتے ہیں
دلِ صد چاک کو اولجھا رہے ہیں اپنے بالوں سے

جو چونکائیں گے آہوں سے تو نالوں سے جگائینگے
کرینگے چھیڑ پیدا ہم بھی شب کو سونے والوں سے

نہ کیونکر روئیں آنکھیں پھوٹکر رکھتی ہیں یہ چشمک
کمالؔ اپنے جگر کے آبلوں سے دل کے چھالوں سے

سید محمد مہدی کمالؔ خلف الصدق حضرت جلالؔ

نہ سنگ راہِ عدو نہ غبار خاطر ہیں ہم
خفا نہو جو گلی میں تمہاری حاضر ہیں

بقا ہے ہمکو زمانے میں صعوبت شبِ وصل
ذرا جھپک کے کھُلی آنکھ اور آخر ہیں

ترے شباب نے جنسے کیا تھا وعدۂ قتل
کفن یہ پہنے ہوئے آج در پہ حاضر ہیں

یہ ڈر ہے غیر نہ سُن لیں کہ اُنکو ہوگی خوشی
کسی سے کہہ نہیں سکتا شکستہ خاطر ہیں

لڑی نگہ سے نگہ اور حواس ہوگئے گم
زمانہ بھر میں جتنے حسین وہ ساحر ہیں

اُنھیں ہی عذر نزاکت یہاں شکایت ضعیف
غرضکہ ملنے سے قسمت کے ہاتھوں قاصر ہیں

قسم نہ مانئے کا اُس سی جب کیا شکوہ
دیا جواب یہ جھنجھلا کے ہمتو کافر ہیں

اُنھیں کے دل سے کوئی پوچھے لذتِ غمِ ہجر
اُنھیں کا عشق کوئی شی ہی جو کہ صابر ہیں

نکلتے ہی نہیں ارمان دلمیں آئے ہوئے
تمام گھر کو یہ مہمان باکطر خاطر ہیں

کوئی چھُپے گا کہاں تک ادا شناسوں سے
نگاہِ شوق سے سب انکے حال ظاہر ہیں

یہ قول ہی ترے کوچے میں مرنیوالوں کا
چلے ہیں خلد کو اور خلد کے مسافر ہیں

مبارک اُنکو ہو محفل کی رونق ای محشرؔ
اُٹھے ہی جاتے ہیں ہم خود جو بار خاطر ہیں

مرزا کاظم حسین محشرؔ لکھنوی

مخزن

شیخ عبدالقادر

ایڈیٹر شیخ محمد اکرام

جون ۱۹۰۸ء

جلد ۱۵

نمبر ۳

پشاور
کشمیر
دہلی
لکھنؤ
کانپور
الہ آباد
بنارس
پٹنہ
کلکتہ
کراچی
بمبئی
حیدرآباد دکن
بنگلور
مدراس

تصویر

فرشتہ بابل کے تشکری

شذرات نظارے شیخ عبدالقادر ۱

ہمہ اوست - ع - ا - بی - اے - ۹

انسان کے دشمن - مولوی وحید الدین سلیم
ایڈیٹر انسٹیٹیوٹ گزٹ علیگڈہ ۱۲

دردِ جانستاں - سید ناصر نذیر صاحب دہلوی ۱۹

ملک مالوہ کی سیر - مولوی سعید احمد از آگرہ ۲۲

مآل زندگی - شیخ عبدالحق بی اے ایل ایل بی ۲۴

ظہور دہلوی - میر فیض الحسن بی اے ۳۰

شاہین و دُرّاج - مولوی محمد عبدالراشد الخیری ۴۲

کلام اکبر
خان بہادر سید اکبر حسین صاحب ۵۵

کوئل - منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی

قومی عمارت - پنڈت برجموہن ناتھ کیفی ۵۶

ریا - منشی نورالدین صاحب عنبر ۶۱

زمزمۂ توحید - لالہ تلوک چند صاحب محروم

اندھی پھول والی کا گیت - منشی
سید مہدی حسن صاحب
احسن لکھنوی

کلام آسی ....

تازہ غزلیں ....

دس کروڑ ہندوستانی اُردو بولتے اور اسی قدر اور ہندوستانی اُردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ▭ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊙ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

باہتمام شیخ محمد اکرام مخزن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا

قیمت سالانہ معہ محصول ڈاک قسم اول ۵ روپے فی پرچہ ۸ آنے

مسٹر ہارلن اوبر
مرزا محمود صاحب
جناب ابن ابہر صاحب
مسٹر ہوپر ہیرس

نتِ نئے نظارے

(سلسلے کے لئے دیکھو مخزن ماہ دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء)

(۲)

۱۹ جولائی سنہ ۱۹۰۶ء عجائب خانہ صلح جنگ لوسرن میں پہلی چیز جو ہم نے دیکھی وہ عجائب خانہ تھا۔ یہ مختلف حصوں میں منقسم ہے۔ اس میں آلات حرب اور طریق جنگ میں قدیم زمانوں سے لیکر آجتک جو تبدیلیاں ہوئی ہیں سلسلہ وار دکھائی گئی ہیں اور اس کا منشا تحریک صلح عام کی تائید ہے۔ داخل ہوتے ہی ایک بڑا ہال ہے جو اسلحہ جنگ سے پُر ہے۔ وسط میں توپیں رکھی ہیں۔ پرانی سے پرانی توپوں سے لیکر زمانہ حال کی کرپ توپیں تک یہاں موجود ہیں اور ہر ایک کے اوپر لکھا ہوا ہے کہ کون سی کس زمانے کی یادگار ہے۔ دیواروں پر ایک طرف نیزے۔ برچھیاں۔ تلواریں اور دوسری طرف طرح طرح کی بندوقیں سج رہی ہیں۔ ایک کمرہ اسلحہ روما کے لئے ہے اور ایک ازمنہ متوسطہ یورپ کے لئے۔ جنگ سی سالہ اور جنگ ہفت سالہ میں جو اسلحہ استعمال ہوئے تھے اُن کا علیحدہ مجموعہ ہے۔ پہاڑی لڑائی کا سین جدا ہے اور جنوبی افریقہ کی جدید لڑائی کا جدا۔ یہ نظارے تاریک

کمروں میں بڑی خوبی سے دکھائے گئے ہیں۔ کہ دیکھنے والا اندھیرے میں ہوتا
ہے اور سپاہیوں کی تصویروں اور اسلحہ پر روشنی پڑتی ہے۔ انکے گرد جنگل پہاڑ
اور لڑائی کے میدان کا نقشہ ہوبہو دکھائی دیتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی
ہم اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔ آخر میں جنگ روس وجاپان بھی موجود ہے
قلعہ بندی کے دستور کی ترقی کے مختلف مدارج۔ بیماروں اور زخمیوں کے اٹھانے
اور لیجانے کی تدابیر۔ جنگ میں عارضی پل بنانے اور توڑنے کے نمونے۔ بحری
لڑائی کی خصوصیات۔ سب کا ایک خاکہ ذہن میں آجاتا ہے۔ ان سب کے بعد
صلح کا محل آتا ہے۔ وہاں یورپ کے سب بڑے بڑے مدبروں کی تصویریں
رکھی ہیں جو صلح عام کے حامی ہیں اور جو مجالس صلح میں شریک ہو چکے ہیں۔ ان
تصویروں میں ایک ایرانی مدبر کی تصویر دیکھکر ہمیں خوشی ہوئی۔ اس تصویر کے
نیچے لکھا تھا "رفیع الدولہ مرزا رضا خاں دانش۔ پرنس صلح"۔ اہل یورپ نے آج کل
ایسی باتوں کا کچھ ایسا ٹھیکہ لے رکھا ہے کہ ہمیں کسی ایشیائی کا مدبروں کی صف
اول میں کھڑا ہونا غنیمت معلوم ہوا۔

اس کمرے میں جس پر صلح کا جھنڈا لہرا رہا تھا مختلف زبانوں میں صلح کے
متعلق کتابیں اور رسالے اور اخبارات رکھے تھے جنمیں سے اکثر مفت تقسیم ہونے
کے لئے تھے۔ اور ہر شخص مجاز تھا کہ اُن میں سے چند چن لے۔ ہم نے چند
پرچے وہاں سے لئے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ ترکی کے ارمنی وغیرہ باشندوں
کے بعض نہایت جوش دلانے والے رسالے فرانسیسی زبان میں جنمیں ترکوں کو یورپ
سے نکال لینے اور انکے خلاف اہل یورپ کو اکسانے کے مضمون مندرج تھے۔ وہ بھی
انہیں کاغذات صلح میں رکھے تھے۔ کیا مجالس صلح ایسی ہی تدابیر صلح پھیلانے کی
کر رہی ہے اور اُن کے قول وفعل میں ایسی ہی مطابقت چاہئے۔ بحقیقت یہ ہے

کہ صلح عام کی تحریک سے مدبرین یورپ کا مقصود اصلی فقط اسی قدر ہے کہ یورپ کی عیسائی سلطنتوں میں صلح رہے اور وہ سب ملکر باقی دنیا پر اپنا غلبہ اور اقتدار قائم رکھیں۔ لیکن حقیقی صلح ممکن نہیں۔ جب تک دول یورپ اور اُن کے مدبروں کے دماغ سے اپنے املاک کی توسیع کی ہوس اور ایشیائی ممالک اور اقوام و مذاہب کی حقارت کا خیال نکل نہ جائے۔ کیونکہ یہی دو خیال سب فسادات کی بنا اور جنگ وجدال کی جڑ ہیں۔ اس صلح وجنگ کے عجائب خانے میں آلاتِ حرب اور نمائش جنگ کو اسباب صلح سے جو نسبت ہے۔ غالباً وہی نسبت ابھی یورپ میں شوق جنگ وشوق صلح میں قائم ہے۔ صلح کے متعلق باتیں ہیں اور دوسروں کو نصیحتیں اور اپنے ہاں ہر قوم روز زیادہ زیادہ روپیہ سامان جنگ پر صرف کر رہی ہے اور یورپ کی ذہانت اور اُسکے علوم وفنون کی ترقی ایسی ایجادات کے کام آ رہی ہے کہ وقت جنگ زیادہ سے زیادہ انسان تھوڑے سے تھوڑے وقت میں کس طرح بے جان کئے جا سکتے ہیں۔ اور زمین سے گولے مارنے کی بجائے آسمان پر چڑھ کر کس طرح آہن وآتش کی بوچھاڑ ہو سکتی ہے۔

برفانی باغ ۔ اس عجائب خانۂ صنعت سے نکلکر ہم ایک عجائب خانۂ قدرت کی طرف گئے۔ جسے یہاں "گلیسیر گارڈن" یعنی تودہ ہائے برف کا باغ کہتے ہیں۔ برف کے یہ تودے اُس زمانہ کی یادگار ہیں جب سارا سوئٹزرلینڈ برف کے نیچے دبا ہوا تھا۔ یہ زمانہ تاریخی کتب سے بہت پہلے گزرا ہے ماہرانِ علم طبقات الارض نے اس کا پتہ چلایا ہے اور اب وہ یقینی طور پر ثابت کر سکتے ہیں۔ کہ ایک وقت میں روئے زمین کا سارا شمالی حصہ ایک سطح برفانی تھا۔ کہیں اتفاق سے کوئی جگہ خالی تھی تو وہاں بھی حضرت انسان کا وجود نہ تھا۔ البتہ کچھ حیوانات تھے مگر اب اُن حیوانات کی نسل بھی منقطع ہے۔ کہیں کہیں اُن کے پنجے اور ہڈیاں دستیاب ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے

کہ اُن کی ساخت کیا تھی اور موجودہ جانوروں سے کس قدر نرالی تھی - کہا جاتا ہے
کہ اس برفانی عہد سے قبل ایک زمانہ ایسا تھا کہ ساری زمین پر پانی ہی پانی تھا - مگر
اس وقت اس زمانہ سے بحث نہیں - بلکہ صرف عہد برف سے کام ہے جسکی یہ حیرت
انگیز نشانی لوسرن میں موجود ہے - برف کے پگھلنے سے جو سیلاب پہاڑوں کے
اندر رواں ہوا - اس میں کئی بڑے بڑے تودے برف کے جو پگھلنے سے بچ رہے بہتے
ہوئے آئے اور اپنے زور میں پتھروں کو تراشتے ہوئے آخر خود ایک جگہ میں آ پھنسے
یعنی ایسی جگہ پہونچے جہاں وہ چاروں طرف مضبوط چٹانوں سے گھر گئے - اب نہ
روئے ماندن نہ راہ رفتن" جائیں تو کہاں جائیں پانی ہے کہ اوپر سے برابر
آرہا ہے اور انہیں حرکت دیئے جاتا ہے - مگر یہ قلعہ بند ہیں - پہاڑوں کی چوٹیوں
پر آرام سے بیٹھے تھے - اپنی جگہ چھوڑ کر اس مصیبت میں ایسے آن پھنسے کہ رات دن ایک
مقام پر چکی کی طرح گھوم رہے ہیں - خود بھی گھستے ہیں - پتھروں کو بھی گھساتے
ہیں -

یہ خدمت صدیوں سے انکے سپرد ہے - نہ کبھی رخصت نہ تعطیل - اتنی خیریت
تھی کہ چشم مردم سے اُن کی یہ سزا پوشیدہ تھی - مگر آجکل انسان کو یہ جرأت ہوئی ہے
ہر جگہ کارخانۂ قدرت سے پردۂ راز اُٹھانا چاہتا ہے - چنانچہ بیچارے معتوب
تودہ ہائے برف کی پردہ دری بغیر بھی نہ رہا - ۱۸۷۲ء تک یہ قطعہ زمین جہاں اب یہ
عجیب برفانی باغ ہے - ایک چراگاہ تھا - اور اسکی ہری ہری گھاس کے نیچے یہ
برفانی کارخانہ جاری تھا - مگر کسی کو اسکی خبر نہ تھی - اتفاق سے ایک جگہ زمین میں
سوراخ ہوگیا اور وہاں سے اس برفانی چکی کی آواز آئی - کھودنے پر یہ عجوبہ نظر آیا اور
پھر ایک چکی کے دریافت ہونے سے اسی قرب میں کئی اور چکیاں نکل آئیں -
اور اس حصّہ کو تماشائیوں کو محوِ حیرت کرنے کے لئے آراستہ کر دیا گیا - اس کھدائی

کہ صلح عام کی تحریک سے مدبرین یورپ کا مقصود اصلی فقط اسی قدر ہے کہ یورپ
کی عیسائی سلطنتوں میں صلح رہے اور وہ سب ملکر باقی دنیا پر اپنا غلبہ اور اقتدار قائم
رکھیں۔ لیکن حقیقی صلح ممکن نہیں۔ جب تک دولِ یورپ اور اُن کے مدبروں کے
دماغ سے اپنے املاک کی توسیع کی ہوس اور ایشیائی ممالک اور اقوام و مذاہب
کی حقارت کا خیال نکل نہ جائے۔ کیونکہ یہی دو خیال سب فسادات کی بنا اور جنگ
وجدال کی جڑ ہیں۔ اس صلح و جنگ کے عجائب خانے میں آلاتِ حرب اور نمائش
جنگ کو اسباب صلح سے جو نسبت ہے۔ غالباً وہی نسبت ابھی یورپ میں شوق
جنگ و شوق صلح میں قائم ہے۔ صلح کے متعلق باتیں ہیں اور دوسروں کو نصیحتیں
اور اپنے ہاں ہر قوم روز زیادہ زیادہ روپیہ سامان جنگ پر صرف کر رہی ہے اور یورپ کی
ذہانت اور اُسکے علوم و فنون کی ترقی ایسی ایجادات کے کام آ رہی ہے کہ وقت جنگ زیادہ
سے زیادہ انسان تھوڑے سے تھوڑے وقت میں کس طرح بے جان کئے جا سکتے
ہیں۔ اور زمین سے گولے مارنے کی بجائے آسمان پر چڑھ کر کس طرح آہن و آتش
کی بوچھاڑ ہو سکتی ہے۔

برفانی باغ۔ اس عجائب خانۂ صنعت سے نکلکر ہم ایک عجائب خانۂ قدرت کی طرف
گئے۔ جسے یہاں "گلیسیر گارڈن" یعنی تودہ ہائے برف کا باغ کہتے ہیں۔ برف کے
یہ تودے اُس زمانہ کی یادگار ہیں جب سارا سوئزرلینڈ برف کے نیچے دبا ہوا تھا۔ یہ
زمانہ تاریخی کتب سے بہت پہلے گزرا ہے ماہرانِ علم طبقات الارض نے اس کا
پتہ چلایا ہے اور اب وہ یقینی طور پر ثابت کر سکتے ہیں۔ کہ ایک وقت میں روئے زمین
کا سارا شمالی حصہ ایک سطح برفانی تھا۔ کہیں اتفاق سے کوئی جگہ خالی تھی تو وہاں بھی
حضرت انسان کا وجود نہ تھا۔ البتہ کچھ حیوانات تھے مگر اب اُن حیوانات کی نسل بھی منقطع
ہے۔ کہیں کہیں اُن کے پنجے اور ہڈیاں دستیاب ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے

ہے۔ گالسلر نامی ایک اُستاد نے ۱۶۵۱ء میں بنایا تھا۔ اسکے بعد اس نامی ایک اور اُستاد نے ۱۶۶۲ء میں اسکی تجدید کی۔ ۱۹۰۸ء میں پھر اسکی مرمت ہوئی ہے۔ چار ہزار نوسو پچاس بنسریاں اس ارغنون میں ہیں۔ لوگ دور دور سے اس کا راگ سننے آتے ہیں۔ شام کے وقت ہر روز یہ ارغنون بجتا ہے اور اس وقت کا داخلہ ایک فرانک (دس آنے) ہوتا ہے

جھیل کی سیر جھیل لوسرن جس سے شہر لوسرن نے نام پایا ہے۔ اس ملک کی نہایت خوبصورت جھیلوں میں سے ہے اور بعض اعتبارات سے سب سے بڑھکر گنی جاتی ہے۔ اس کا طول ۲۳ میل ہے اور عرض آدھے میل سے لیکر تین میل تک ہے۔ چاروں طرف بلند پہاڑوں کی سرسبز چوٹیاں اور درمیان میں یہ جھیل عجب بہار دیتی ہے۔ جس سیاح کو فرصت ہو۔ وہ یہاں مہینوں رہے اور روز کشتی میں بیٹھکر سیر کو جائے۔ جہاں کہیں خشکی پر اترکر کوہستان کی سیر کرے گا۔ اسکے لئے کوئی نہ کوئی قابل دید منظر موجود ہوگا۔ ہمیں صرف ایک دن کی مہلت دی گئی تھی۔ اس لئے ہم گرجا سے واپس آتے ہی کشتی پر بیٹھکر جھیل کی سیر کو نکلے۔ مطلع صاف تھا۔ ہوا خوشگوار تھی۔ گردوپیش کے مناظر مزا دے رہے تھے۔ ابھی لطف سے سیری نہیں ہوئی تھی کہ وہ سٹیشن آگیا جہاں سے ہلکی پہاڑی ریل پر بیٹھکر کوہ الپس کی مشہور چوٹی "رِگی کلم" کی سیر کو جاتے ہیں۔ ہم وہیں اتر پڑے اور ریل پر سوار ہو لئے

رِگی کلم کا منظر۔ ریل سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پہاڑ پر چڑھنے لگی۔ ایسی ایسی ڈھلواں چوٹیوں پر چڑھتی ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ اب گری اب گری۔ مگر فن انجنیری کی خوبی دیکھئے۔ گاڑیوں اور آہنی سڑک دونو کی ساخت میں وہاں یہ خصوصیت پیدا کی ہے۔ کہ گاڑیاں لڑھکنے نہ پائیں۔ اور مزید احتیاط کے لئے اوپر جاتے وقت انجن نیچے سے اوپر کو دھکیلے لئے جاتا ہے۔ اور رِگی پر جاکے ٹھیر تا ہے۔

جو اُس سطح سے جہاں سے ریل ملی تھی - چار ہزار تین سو
ساٹھ فٹ اور سطح سمندر سے پانچ ہزار نو سو پانچ فٹ بلند ہے - صبح و شام سینکڑوں
تماشائی اس چوٹی پر موجود رہتے ہیں - اور جو تماشا وہاں انہیں نظر آتا ہے - الفاظ اسکے
بیان سے قاصر ہیں - تصور کیجئے کہ چودہ جھیلیں چھوٹی بڑی اور انکے گرد کے اشجار
و انہار - کوہ و ہاموں - شہر و قریہ سب وہاں سے نظر آتے ہیں اور یہیں اہل نظر کے
دل چھینے لیتا ہے - اسپر طرہ یہ کہ اس سے ذرا اونچی چوٹیاں اسی کے قریب برف سے
ڈھکی ہوئی نظر آتی ہیں - انگلستان اور امریکہ کی عورتیں جو مناظر قدرت کی شناسا آنکھ رکھتی
ہیں - اس جنتِ نگاہ کی داد دیتے دیتے دیوانہ ہوئی جاتی ہیں "آہا - ادہر دیکھنا کیسا
دلفریب سین ہے - اوہو - اُدہر دیکھو کتنا پیارا نظارہ ہے" ایشیائیوں میں اگر کوئی
حُسن قدرت کے مزا لینے کی قابلیت رکھتا ہو یا پیدا بھی کرے تو یہ جوش کہاں سے
لائے گا اور حسن قدرت کے روبرو یہ زبان آوری کہاں سے پائے گا - یاں تو
حُسن چپ لگا دیتا ہے - اور اس کا رعب مُہر لب بن جاتا ہے - ہم چپ چاپ
اِس عجیب نظارے کو دیکھا کئے - اور ارد گرد کے شور سے بے پروا شام
تک اسی محویت میں پڑے رہتے - اگر ریل کی سیٹی یہ یاد نہ دلا دیتی کہ شام
سے پہلے واپس جا کر جھیل کے کنارے چراغان کی سیر بھی دیکھنے کے لایق
ہے - اُٹھے مگر بادلِ ناخواستہ - اسی چوٹی پر ایک بڑا عالیشان ہوٹل مسافروں
اور تماشائیوں کے آرام اور تفریح کے لئے بنا ہوا ہے - وہ سامنے تھا - اسکی
صورت اور اُسکے خوشنما صحن میں میزوں کے ارد گرد لوگوں کے جمگھٹے دیکھکر
ہمیں بھی یاد آیا کہ چار کا وقت ہے - وہاں چا پی - تازہ دم ہوئے - اور
ریل پر پہونچے - واپسی پر ریل تیز تر چلی - کوئی آدہ گھنٹے میں جھیل کے کنارے
تھے - وہاں کشتی فوراً مل گئی اور ہم اپنے قیام گاہ کے قریب آ پہونچے - تھوڑی

دیر تک کنارِ آب سیر کرتے رہے۔ آخر تھک کر ہوٹل میں آئے۔ کھانا کھایا اور سو گئے۔ کیونکہ سفرِ اٹلی درپیش تھا۔

عبد القادر

اقوالِ یحییٰ برمکی

(۱) یحییٰ اپنی اولاد سے کہا کرتا تھا کہ جو اچھی بات سنو لکھ لو اور جو لکھو اُسکو حفظ کر لو جو حفظ ہیں اسکو بیان کرو۔

(۲) جب بادشاہ کی صحبت میسر ہو تو اسکے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاہیے جسطرح عاقل عورت اپنے بیوقوف شوہر کو راضی کرتی ہے۔

(۳) میں نے ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا ہے کہ گفتگو کرنے سے پہلے جسکی ہیبت مجھپر چھا گئی ہو البتہ اگر وہ شخص فصیح ہے تو میرے دل میں اُسکی عظمت ہوتی ہے ورنہ وہ میری نظروں سے گر جاتا ہے۔

(۴) غلاموں کی بے ادبی اُسکے مالک کے حلم پر دلیل ہے۔

(۵) جو لوگ ہم سے پہلے تھے وہ ہمارے واسطے قابلِ اقتدا ہیں اور جو ہمارے بعد آئینگے ہم اُنکے واسطے عبرت ہیں

(۶) اربابِ عقول کی شناخت ہدیہ کتاب رسول سے ہوتی ہے۔

(۷) جو لوگ دولت دنیا کے طالب ہیں اگر وہ زمانہ کی سختیاں نہ اُٹھا سکیں تو پھر اپنے مقصد میں کامیاب ہونیکی شکایت نکریں۔

(۸) جس شے کا دینا تجویز کر لیا گیا ہو پھر اُسکے دینے میں توقف کرنا غایت درجہ کی بخیلی ہے۔

(۹) جس راگنی سے طبیعت میں سرور یا رقت پیدا ہو یا رنج و غم کا اثر محسوس ہو تو وہ البتہ راگنی ہے باقی مصیبت اور دردِ سر

(۱۰) جس شخص میں فیاضی اور علم تکبر کے ساتھ ہو اس سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اسمیں بخل اور جہل تواضع کیساتھ ہو۔

(الیہ اکمہ)

ہمہ اوست

مخزن کے ایسے مضامین کو پڑھکر ضرور مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوتا ہے جن میں انگریزی لٹریچر سے خوشہ چینی کی جاتی ہے یا عبارت میں انوکھاپن پیدا کرنے کے لئے انگریزی طرز بیان کا پورا پورا تتبع کیا جاتا ہے اور بعض اوقات صاحبِ مضمون اردو کی رکاوٹوں سے بیزار ہوکر اکثر قیود سے آزاد ہو جاتے ہیں اور مروجہ طریقوں اور قواعد کی زنجیریں توڑکر بہ ہزار کشمکش مطلب کی کہ جاتے ہیں[۵]۔ واقعی جب ہر طرف آزادی ہی آزادی نظر آتی ہو اور اپنے اوپر قیدیں ہوں تو یہی ہونا بھی چاہیے۔ اسمیں چاہے انسان ہو یا انسان کی زبان ہو۔ مگر سوال یہ کہ مروجہ طریقوں اور قواعد سے کیوں تجاوز ہو اور نئے طرز و قماش کی عبارتیں کیوں لکھی جاویں۔ اسمیں دو زبانوں کی قوت کے اندازے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ جسکا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ اسمیں شبہ نہیں کہ انگریزی علم ادب کا وہ حصہ جسکو لطیف کہا جاتا ہے عجیب رنگ اور دل آویزی رکھتا ہے۔ نفس مضمون خواہ کیسا ہی عام ہو لیکن ادھر اُدھر کی گلکاریاں اور رنگ آمیزیاں نظر کے لئے دھوکے۔ عقل کے لئے فریب ایسے برمحل و بے محل شامل کر دیئے جاتے ہیں کہ

---

[۵] اس معاملہ میں سب سے بڑھے ہوئے اردو لٹریچر کے نامور نوجوان ایک نہایت لائق ذی علم پر جوش مضمون نگار ہیں جن سے مجکو بھی نیاز حاصل ہے۔ اچھا ہوا سبکسار ساحل بنکر سمندر پار چلے ہیں۔ جو چاہے لکھیں اور جس طرح چاہے لکھیں۔ مگر واہ رے رہ زن قلم۔ انکے اردو مضامین کی قدر کچھ انگریزی جاننے والے ہی کر سکتے ہیں۔ بات بات پر کہنا پڑتا ہے۔ سرکیوں و بیاں تو نہ ہوا مارا۔ آگے چلکر خدا جانے کیا قیامت ڈھاینگے۔ ع۔ ا

مضمون خواہ مخواہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ گو زیادہ چھاننے پر سوائے کرکرے کے کچھ نہیں رہتا پھر بھی تقلید کو ضرور جی چاہتا ہے۔ اگر ٹھیک ٹھیک ہوئی تو با اثر ہوئی۔ ورنہ نقالیوں میں اس سے بدتر کوئی نقالی نہیں۔

مثلاً "ہمہ اوست" کا مسئلہ یہ اگلے اور پچھلے اور سب وقتوں کا پرانا خیال کہ بت بھی خدا ہیں۔ خدا سب ہے اور سب خدا ہے۔ فارسی اور اُردو میں جسقدر اعلیٰ سے اعلیٰ طریقہ پر لکھا گیا ہے یورپ کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ لیکن عرصہ ہوا کہ چارلس کنگسلی کے ناول ہائی پی شیا نامی میں ایک بڑا طول طویل فقرہ اسی مضمون کا پڑھا تھا جسکا ترجمہ یا مطلب لکھنے کی یہاں جرأت کرتا ہوں جس سے انگریزی طرز بیان کی ندرت کا بھی کسیقدر ثبوت ملیگا۔

ہائی پے شیا یونانی نسل کی ایک شریف زادی بڑی عالم و فاضل تھی۔ اسکندریہ میں رہا کرتی تھی۔ باپ اسکا ایک مشہور مہندس تھا۔ خود فلاسفر تھی اور اسکندریہ کے کتب خانہ میں جدید فلسفہ افلاطونی (نیو پلے ٹونزم) پر لکچر دیا کرتی تھی۔ عیسوی مذہب اسوقت یونان اور روما کی اصنام پرستی کو دنیا سے مٹا رہا تھا۔ ہائی پے شیا کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح عیسوی مذہب کی تاخت و تاراج سے اپنے قدیم آبائی مذاہب کو تصوف کے پردہ میں بچا لے۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی اور مقدس بطرس اسکندریہ کے بطریق نے اُسکو نہایت بیرحمی سے راہ خدا میں قتل بلکہ ذبح کیا۔ ہائی پے شیا کے مرتے ہی یونانی مذاہب قدیمہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اور جو درسگاہ اُنکی تعلیم و تلقین کے باقی تھے وہ بھی سب بند ہو گئے۔

ایک جگہ اپنے لکچر میں کہتی ہے۔

.... لیکن بعض ساعتیں ایسی ہوتی ہیں اور بڑی برکت والے ہیں وہ لوگ جنکی آسمانی قرابت نے ازل سے ایسے اوقات کو

اُنکے مقدر میں لکھا کہ کمزور انسان کے دل پر رازِ قدرت کی بجلی دفعتاً کوندجاتی ہے۔ گرمی کے تاروں بھرے آسمان کی نورانی شوکت میں۔ سیلاب نیل کے شور میں جسکی ہر موج زمین کو شاداب کرتی جاتی ہے۔ پُرانے زمین دوز تہخانوں کی خوفناک ظلمت میں۔ قدیم مطربان آرفائی کے مستانہ ترانوں میں۔ یا اُن خداوٗں کی موروتوں کے سامنے جنکے حسنِ کامل کی اُڑتی سی جھلک یونان کے مقدس صوفیوں نے دیکھ لی اور جمال الہی کے کیف میں بیتاب ہو کر ساحر کے سحر کی طرح اُس نورِ حُسن کی جھلک کو برف سے اُجلی مرمر کی مورت بنا کر سرمدی خواب اوسپر طاری کر دیا۔ اِن سب میں چشم ایمان پر چمک اُٹھتی ہے وہ صورت جو حسین ہے اور خوفناک۔ طاقت والی ہے اور زور والی۔ روح ہے اور جان ایک ہے اور سو ہزار رنگی ایک ہے۔ جو کل موجودات عالم میں ایسی ہی سرعت سے پہونچی ہے جس طرح ہوا کہ مطرب کے ساز کو چھیڑ گئی ہے اور نازک تار لرز لرز کر اپنے ہی نغموں پر رقصاں ہیں۔ ایک خون ہے جو کائنات عالم کی صد ہزار ہزار شرائن میں رواں ہے۔ جسکا منبع ہے ایک دل جو نظر سے پوشیدہ ہے۔ جسکی دھڑکن سنائی دیتی ہے دور اور بہت دور۔ ہمیشہ کے لئے ان خاموش دنگ رہنے والی فضاؤں میں دور اور بہت دور آسمانوں کے اور کہکشاں کے بہت دور اور بہت دور مکان و زمان جو فقط چشمے ہیں اُسی بحر بے پایاں کے جن میں حیات کا پانی تڑپتی اور چمکتی لہروں میں چھلک چھلک کر بہ رہا ہے . . . .

افسوس ہے اسکے آگے ترجمہ نہ ہو سکا۔ اس فقرہ کے بعد ہائی سپے شیا پر خود غش طاری ہو گیا۔

ع - ۱

انسان کے دشمن

"میمتھ" ایک خوفناک وحشی درندہ تھا، جو بہت قدیم زمانے میں روئے زمین پر موجود تھا؛ مگر اب اسکی نسل دنیا سے ملیامیٹ ہوگئی ہے۔ اُس کا پنجر زمین کے نہایت گہرے طبقات میں پایا جاتا ہے اور علماء ارضیات نے اُسکو زمین کے جوف سے نکالکر عجائب خانوں میں رکھا ہے۔

اب سے پچاس ہزار سال پہلے یہ درندہ شمالی یورپ کی دلدلی زمینوں میں کثرت سے پایا جاتا تھا۔ اسکے جسم پر لمبے لمبے بال تھے۔ دانت بڑے بڑے اور نہایت تیز تھے۔ ہاتھی کی طرح ایک سونڈ آگے لٹکتا تھا۔ اُس میں بلا کی طاقت تھی۔ یہ خوفناک وحشی درندہ جب اپنے شکار پر حملہ کرتا تھا، تو اُسکے غصے کی کوئی انتہا نہ تھی۔

دم بھر کے لئے اُس زمانے کی تصویر آنکھوں کے سامنے لاؤ، جبکہ ان خوفناک درندوں کے غول سطح زمین پر پھرا کرتے تھے۔ وہ دیکھو! سامنے ایک جھیل ہے، جس میں ایک وحشی انسان کمر کمر تک پانی میں کھڑا ہے۔ اُسکے لمبے سرخ بال کمر تک لٹک رہے ہیں۔ اُسکے موٹے موٹے ہونٹ غصے سے ہل رہے ہیں۔ آنکھیں سرخ ہوگئی ہیں۔ وہ دیکھو دانت نکوستا ہے اور دایاں ہاتھ بائیں کندھے پر بار بار مارتا ہے۔

یہ کیوں؟

یہ اسلئے کہ جھیل کی سطح پر مچھروں کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں اور وہ بار بار اُسکے کندھوں اور جسم کے دیگر حصوں پر بیٹھتے اور کاٹتے ہیں۔ جب کوئی

مچھر اُسکو کاٹنا چاہتا ہے، تو وہ تاک کر ایک ایسا ہاتھ مارتا ہے کہ مچھر فوراً مرجاتا ہے۔

اگر تم حقیقت میں اُس زمانے میں ہوتے اور اُس زمانے کے سُرخ بالوں والے انسان اور خوفناک میمتھ اور مچھروں کو دیکھتے، تو اُس انسان سے خطاب کرکے ضرور یہ کہتے:۔

"میرے دوست! تم مچھر کو بہت آسانی سے مار سکتے ہو اور شاید کسی زمانے میں مچھروں کی نسل کو دنیا سے غارت کردو گے! مگر خوفناک میمتھ کے پنجے سے نجات پانا مشکل ہے۔ اسپر غالب آنا دشوار ہے۔ اگر تم نے فتح پائی بھی، تو اس کے لئے ہزاروں سال درکار ہیں۔

مگر تم حیران ہوگے اور دیکھوگے کہ تمہارا یہ خیال صحیح نہیں تھا۔ جو بات تم نے اُس زمانے کے وحشی انسان سے کہی تھی، وہ غلط تھی۔ میمتھ کی نسل دنیا سے معدوم ہو گئی اب ایک میمتھ بھی روئے زمین پر نہیں پایا جاتا میمتھ کی طرح اُس زمانے میں اور بھی بہت سے خوفناک درندے تھے۔ اُن کی نسلیں بھی غارت ہو گئیں۔ تند اور خونخوار تمیندوے جو یورپ کے شمال میں پھرا کرتے تھے، اب ناپید ہو گئے۔ بھیڑیوں کے غول کے غول تھے، جو برفانی منطقے سے نیچے تمام جنگلوں میں گھوما کرتے تھے۔ اب اُنکا نام ونشان بھی نہیں رہا؛ مگر مچھر بدستور موجود ہیں۔ وہ اُسی جوش وخروش کے ساتھ یورپ کی دلدلی زمینوں پر حکمراں ہیں۔ اُنکی نسلیں بیشمار ہیں۔ اُنکی فوجیں نہایت آزادی سے جھیلوں کے کناروں اور درختوں کے جھنڈوں پر منڈلاتی پھرتی ہیں۔

یہی مچھر ہیں، جو وبائی بخار اور زرد بخار اور طاعون کے زہریلے مادّوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتے ہیں اور اُن کو ایک جسم سے دوسرے جسم میں

داخل کرتے ہیں۔ کیسی حیرت انگیز بات ہے کہ انسان اُن تمام خوفناک درندوں پر غالب آ گیا۔ جو کسی زمانے میں روئے زمین کے بہت بڑے حصّے پر مسلط تھے۔ مگر وہ مچھر جیسی کمزور مخلوق کے مقابلے سے عاجز ہے۔

کیا یہ سچ ہے کہ عقل انسانی اکثر بڑی بڑی پیچیدہ مشکلوں کو حل کر ڈالتی ہے، مگر بعض چھوٹی چھوٹی مشکلوں کو حل کرنے سے عاجز رہتی ہے؟

ایک زمانہ ضرور ایسا آئے گا کہ ہم مچھروں، بھڑوں، مکھیوں اور تمام چھوٹے چھوٹے موذی جانوروں کو ہلاک کر ڈالیں گے اور اُنکی نسلوں کو روئے زمین سے ملیامیٹ کر دینگے، پھر اُن موذی جانوروں کے قتل کرنے کے بعد، جو آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں، ہم اُن ظالم جانوروں کے ہلاک کے درپے ہونگے، جو آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتے، مگر انسان کو سب سے زیادہ تکلیف اُنہیں سے پہنچتی ہے۔

بڑے بڑے خوفناک درندوں کو ہلاک کرنے کی کوشش ہماری پہلی جنگ تھی۔ اب دوسری جنگ اُن چھوٹے چھوٹے موذی جانوروں سے ہونے والی ہے، جو آنکھوں سے نظر آتے ہیں۔ پھر تیسری جنگ اُن خوردبینی جانوروں سے ہوگی، جو چپ چاپ ہمارے خون میں تیر جاتے ہیں اور ہماری زندگی کو غارت کر ڈالتے ہیں۔ یہ دو جنگیں بہت سخت ہونگی اور اسکے لئے زمانہ دراز درکار ہوگا؛ مگر کامیابی بنی آدم کے لئے یقینی ہے۔

اسکے بعد ذرا اُن جنگوں کا تصور کرو جو ہم کو بڑے بڑے جرائم سے کرنی پڑتی ہیں۔ اخلاق کے لحاظ سے ہم ابھی تک وحشیانہ حالت میں ہیں۔ قتل اور زنا اور چوری اور ڈاکہ زنی ایسے جرائم ہیں، جن کا ارتکاب برابر ہوتا رہتا ہے۔ ہم ان خوفناک جرائم سے اُسی طرح جنگ کر رہے ہیں، جس طرح قدیم زمانے

کے انسان سیتھہ وغیرہ جو خوفناک اور وحشی درندوں سے جنگ کرتے تھے۔

عنقریب ایسا زمانہ آئیگا کہ یہ بڑے بڑے انسانی جرائم معدوم ہو جائینگے۔ نہ لوگ ایک دوسرے کو قتل کرینگے۔ نہ عورتوں کی عصمت وعفت پر حملہ کیا جائے گا۔ نہ گھروں میں چوری ہوا کرے گی۔ نہ رہزنی اور ڈاکے کے ہولناک منظر دکھائی دینگے۔ اُس وقت کا انتظامِ تمدن مکمل ہوگا۔ اسلئے نہ چوری اور ڈاکے کی ضرورت پیش آئے گی، نہ قتل وغارت کی۔

مگر اسکے بعد ہی فوراً ہم اُن بُرائیوں سے جنگ کرنے پر کمربستہ ہونگے، جو ظاہر میں نہایت حقیر اور چھوٹی نظر آتی ہیں، تاہم اُن سے خطرے بہت ہیں، مثلاً ریاکاری۔ غرور۔ حسد۔ تعصب وغیرہ۔

یہ اخلاقی جنگ پہلی اخلاقی جنگ سے بہت زیادہ سخت اور طویل ہوگی، مگر اُمید کامل ہے کہ جسطرح ہم چھوٹے چھوٹے موذی جانوروں پر ایک دن غالب آئیں گے، اسی طرح ان چھوٹی چھوٹی خطرناک برائیوں پر بھی ضرور فتحیاب ہونگے۔

وحید الدین سلیم از علیگڑھ

دستۂ گل کہئے یا گلدستۂ خیال موزوں۔ یہ مولانا شبلی نعمانی کی رنگین نوائیوں کا نمونہ ہے یعنی مولانا موصوف کی فارسی غزلیات کا مختصر مجموعہ اس گئے گزرے زمانہ میں جبکہ عربی و فارسی ادب کا مذاق ہندوستان سے تقریباً معدوم ہوچکا ہے مولانا کا فارسی زبان سے شغف رکھنا مغتنمات سے ہے۔

مولانا کا فارسی کلام جس پایہ کا ہے وہ صاحبان مذاق سلیم سے مخفی نہیں ناظرین ادسی مخزن مین اکثر دیکھتے رہے ہیں۔ ان غزلیات کے علاوہ اور غزلیات بھی اس مجموعہ مین درج ہین جو دیگر رسائل میں چھپتی رہی ہیں۔

ضخامت ۴۴ صفحات تقطیع ۲۶×۲۰ لکھائی چھپائی صاف قیمت ۴ر

دفتر الندوہ سے طلب فرمائیں۔

درد جانستان

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

تیسرا باب

دل کی کلی نہ تجھسے کبھی اے صبا کھلی
چنپا کھلی گلاب کھلا موتیا کھلی

تین مہینے کے بعد امتہ کا بھائی قصبہ گیا اور اُسے دہلی لے آیا مگر اسکے ساتھ ہی قاضی جی کی بہن نے یہ پیغام بھی بھیجدیا تھا کہ ماشاء اللہ بہو کو کچھ اُمید ہے اور زچہ خانہ ہمارے گھر ہوگا اسلیئے ہم ایک مہینے سے زیادہ نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔ اُمتہ گھر ہونچکی ماں باپ بھائی بہن کنبہ والوں سے ملی مگر سسرال کی مصیبت کا اثر اُسکے کلیجے پر ایسا بیٹھ گیا تھا کہ میکہ میں آکر بھی اُسکے دل کی کلی نہ کھلی۔ اور وہ ونرات انٹوانٹی کھٹوائی لیئے پڑی رہتی تھی۔ بہن ہنبلیوں سات کی سہیلیوں نے بہتیری کریدکی اور چاہا کہ اُمتہ دل کا حال کہے اور جو کچھ سسرال میں گذری ہے وہ بیان کرے مگر اُس حیا کی پتلی نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ نانی ماں نے اس خیال سے کئی مہینے میں باہر سے آئی ہے اور پھر اللہ رکھے کچھ اس کو بہ دنیا کی نعمت اور میٹھی سلونی چیزیں اسکو بازار سے منگا کردیں مگر اس خدا کی بندی نے خوشی کی ساتھ کچھ مُنہ پر نہ کھا ایک مہینے کے بعد خورشید حسین لینے کو آگئے اُمتہ کی ماں نے چاہا کہ کچھ دنوں اور ٹھیرائیں مگر اُمتہ خود نہ ٹھیری اور اُسنے اپنی ماں سے کہا "سنو بی اماں جان جب اُنکی بھائی کی یہی خوشی ہے تو ناحق محبت کرنے سے کیا فائدہ ٹک جے تو پھر کیا اگر دس بیس روز

رہگئی تو پھر بھی جانا ہوگا اب چلی جاؤنگی تو سسرال والوں کا کہنا ہوجائیگا اور اپنی
میاں کے سات خوش خوش قصبے چلی گئی مگر قصبہ پہونچکر معلوم ہوا کہ قاضی جی
اور اُنکی بیوی اور بہنیں اورنگ آباد چلی گئی ہین اور گھر اکیلا ہے اب اسکا اور اِسکے
میاں کے سواے گھر میں کوئی تیسرا نہ تھا۔

گھرواری کے سارے کام اِسکو اپنے ہاتھ سے کرنے پڑے
اور خورشید حسین امتہ کے سلیقے کو دیکھکر حیران ہوگیا امتہ اول تو صورت
شکل کی اچھی تھی مگر اُسکی نیک خصلتیں اور سلیقے سے خورشید حسین اوس پر سوجان
سے فریفتہ ہوگیا اور اُسکا دم بھرنے لگا جب انکا مہینہ شروع ہوا تو اپنے میاں سے
کہا بھابی بہن اور آپا جان اورنگ آباد جاکر ایسی بیٹھی ہیں کہ آنے کا نام ہی نہیں
لیتیں اور میرا کیلے دم گھبراتا ہے عورت ذات کا دل تو عورتوں سے ہی بہلتا
ہے اور اب انکا گھر پر ہونا بھی ضرور ہے۔ میاں نے کہا تم سچ کہتی ہو مجھے تمہارے کہے
بغیر خیال تھا مگر اب تمہارے کہنے سے زیادہ ہوگیا۔ دیکھو میں کل ہی اورنگ آباد
جاؤنگا اور بھابی جان اور چھوٹی آپا بڑی آپا کو لے آؤں گا خورشید حسین دوسرے دن
صبح ہی اونگ آباد روانہ ہوگیا اور وہاں جاکر اوسنے بہن اور بھاوج سے کہا کہ آپ
کا اب گھر چلنا مناسب ہے اور بھائی سے بھی کہا کہ بھاوج کو اور بہنوں کو احمد آباد بھیجدیجئے
قاضی جی۔ ارے میاں ایسی جلدی کیا ہے کہیں آدمی کے ہاں آٹھ
مہینے میں بھی بچہ پیدا ہوا ہے اور اگر دلی میں اٹھوانسے ہی ہوتے ہوں
تو ہمیں خبر نہیں اسکا حال تمہاری گھر والی کو معلوم ہوگا ابھی سے تمہاری بھاوج
چلی جائینگی تو مجھے روٹی کی تکلیف ہوجائے گی اس لئے تم گھر کو سدھارو جب
دس پانچ دن جننے کے رہین گے تو میں آپ بھیجدونگا اور بہنی خرچ کی جو کہتے ہو
میرا حال تم سے چھپا ہوا نہیں ہے وہی کنواں کھودنا اور وہی پانی پینا تنخواہ

میں روٹی کا تو کام چلتا ہی نہیں یہ زچہ خانہ کا خرچ کہاں سے آئے اور آپ کی بیوی
صاحبہ ٹھیریں دلی کی اونکے خرچ کے واسطے تو سو پچاس بھی تھوڑے ہیں مگر خیر
سنگ آمد و سخت آمد میں فکر کرونگا اور دس پانچ روپے مجھ سے بن پڑینگے وہ کہیں
سے مانگ تانگ کر تم کو دیدونگا مگر اب تمہیں بھی کچھ سوچنا کرنا چاہئے جب تک تم اکیلے
تھے کچھ بھاری نہ تھے مگر اب خدا کے فضل سے جورو والے ہوئے مہینے ڈیڑھ
مہینے میں اولاد والے بھی ہو جاؤ گے میرے سر کب تک رہو گے اور میں تمہارے
اور تمہاری بیوی بچوں کی خبر گیری کیونکر کر سکونگا دس بیس کا روزگار نہ ملے تو دو
چار ہی کا کر لو۔ مجھ سے اب تمہارا بوجھ نہیں اوٹھ سکتا ہے۔

خورشید حسین بھائی کی یہ تقریر سنکر سُن ہو گیا اور اُسی روز اورنگ آباد سے پلٹ کر گھر آ گیا

امتہ (میاں کو پریشان دیکھکر) کیوں خیر تو ہے تمہارا چہرہ اوداس کیوں ہے

خورشید حسین کچھ نہیں رستہ کی تکان ہے سر میں درد ہو رہا ہے۔

امتہ واہ اسمیں دردِ تکان اور سر کا درد کیا چیز ہے غم اور پریشانی کچھ اور ہوتی ہے تم تو بھائی جان کے
کے پاس سے کچھ رنجیدہ آئے ہو۔

خورشید حسین نے دیکھا کہ عقلمند بیوی نے میری پریشانی کو تاڑ لیا ہے اسلئے
ناچار بھائی نے جو کچھ اوس سے کہا تھا رتی رتی امتہ سے کہدیا۔

امتہ بھائی جان نے سچ کہا پھر خود درآمدہ شکایت کس کی کریں دس روپئے کے
ذکر اُس میں آپ ایک بیوی دو بہنیں ایک برابر کا بھانجہ دو ہم تم ایک کا منہ تو کھانڈ
سے بھرا جا سکتا ہے مگر لاکھ کا مُنہ تو خاک سے بھی نہیں بھرا جا سکتا اللہ نے
تمہیں ہاتھ دیئے پاؤں دیئے دشمن اپاہج نہیں پھر گھر میں کیوں پڑے رہو۔
ماشاء اللہ پھرو چلو کہیں نہ کہیں تو نوکری لگ ہی جائے گی۔

خورشید حسین۔ نوکری ہو گی جب ہو گی خرچ تو آج ہی سے چاہئے۔

اُمتہ - تم مرد ہوکر گھبرائے جاتے ہو میں تو عورت ذات ہوں اور مجھے ذرا فکر نہیں
جس نے جان دی ہے وہ نان بھی دیگا اور اُس شریف اور نیک بی بی نے
میاں کو مغموم دیکھکر ایسی باتیں کیں جس سے خورشید کے ٹوٹے ہوئے دل پر مومیائی
بن گئیں اسی انتظار انتظار میں کہ قاضی جی کی بیوی اورنگ آباد سے آج آئیں گی
اور کل آئیں گی -
اُمتہ کو نواں مہینہ شروع ہوگیا اور قاضی جی کی بیوی نہ آنی تھیں نہ آئیں کی ہانڈی
کا کیا اعتبار اخیر ایک رات کو درد زہ شروع ہوگیا پہل پہلوں کی بات امتہ نا تجربہ کار
لڑکی اور باحیا اسلئے دردوں کو اُسنے بہت ضبط کیا اور چاہا کہ میاں کو خبر نہو مگر بقول
سعدی کہ ناچار رو زیاد خیزد زدرد -
اُسکے کراہنے سے خورشید کی آنکھ کھُل گئی اور وہ سمجھ گیا کہ بال بچہ ہونے والا ہے
مگر سخت حیران تھا کہ آدھے بجے بیوی کو تنہا چھوڑکر دائی کو بلانے کیونکر جاؤں
اور اگر دائی کو بلا لایا تو کیا ہے ایسے وقت میں دو چار اور عورتوں کا خدمت
کیواسطے ہونا ضروری ہے ہمسایہ میں مولوی عبدالرحیم صاحب رہتے تھے جو
اسم بامسمیٰ نہایت رحم دل اور باخدا آدمی تھے اور اون کی بیوی اُن سے
زیادہ نیکبخت اور بامروت محلہ میں مشہور تھیں -
خورشید نے مولوی صاحب کو جاکر جگایا اور سارا حال کہا کہ اس طرح میری بیوی
گھر میں اکیلی ہے اور بال بچہ گھڑی ساعت میں پیدا ہونے والا ہے مولوی
صاحب نے اُسی وقت اپنی بیوی اور دونوں بیٹیوں کو خورشید کے گھر بھیجدیا
اور خورشید دائی کو بلا لایا صبح کے قریب لڑکی پیدا ہوئی دائی نے نال کاٹ
نہلا دھلا زچہ کی خدمت کرکے اپنے جانے کا ارادہ کیا مگر خورشید یا امتہ کے پاس
روپیہ کے نام کوڑی بھی نہ تھی جو دائی کو دیتے اور اسکا خالی ہاتھ جانا بُرا تھا اسلئے

اُمتہ نے اپنے پاؤں کی ایک چاندی کی جوڑی اُسکے حوالے کی اور وہ جوڑی لے اپنے گھر گئی۔ اچھوانی کے واسطے گھی کھانڈ وغیرہ اور بچے کے واسطے گھٹی خورشید بازار سے قرض لے آیا دن کے آٹھ بجے مولویصاحب کی بیوی اور لڑکیاں بھی اپنے گھر گئیں اور خورشید حسین کو اپنے ہاتھ سے گھٹی بنا کر لڑکی کو پلانی پڑی کیونکہ چند گھنٹے کی زچہ میں اتنی طاقت کب ہوتی ہے جو بچے کو گھٹی پلائے کلو جولاہی بھی قصبے سے باہر گئی ہوئی تھی ورنہ اس موقع پر اُس سے ضرور مدد ملتی۔

خورشید کو بھائی کی اس بے پروائی اور اپنی ناداری اور لاچاری پر بہت افسوس تھا اور کئی بار اُسکی آنکھوں سے آنسو نکل نکل آئے جب قاضی جی کو لڑکی پیدا ہونے کی خبر پہونچی تو اُنھوں نے بہت ناک بھوں چڑھا کر اپنی بیوی کو احمد آباد بھیج دیا میوہ اور ستورہ کی جگہ امتہ کو غم اور خون جگر کھانا پڑا اور بڑی مصیبت اور تکلیف کے سات چلا کٹا۔ لڑکی کا نام حمیدہ بیگم رکھا گیا امتہ کا بھائی اُمتہ کو پھر دہلی لے گیا اور اُسکے والدین اُسے اور نواسی کو دیکھ کر پھولے نہ سمائے۔ چونکہ اُمتہ سوکھکر کانٹا ہو گئی تھی اور فاقوں نے اُس میں دم نہ چھوڑا تھا اس لئے اُمتہ کی ماں نے اُسے قسمیں دے دے کر حال پوچھا تو اب بھی کہتی تھی کہ امتہ کچھ نہ کہے گی مگر اُسکا غم کلیجے سے پک گیا تھا۔ شعر

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

ناچار چلہ اور چلے سے پہلے جو کچھ مصیبت اُسپر گذری تھی اُس نے ماں کے سامنے بیان کی جسکو سنکر ماں بیچاری کا کلیجہ منہ کو آگیا اور اُس نے اپنے میاں سے بیٹی کی ساری رام کہانی بیان کی اور دونوں نے ملکر یہ عہد کیا کہ

کہ اب امتہ کو سسرال نہ بھیجا جاوے۔ خورشید نے بیوی کے لیجانے کیواسطے حافظ احمد علی صاحب کو بار بار لکھا تو اُنھوں نے صاف جواب لکھدیا کہ امتہ میں اب اتنی تاب و طاقت نہیں ہے جو فاقہ کرے اور مصیبت سہے اسلئے وہ تو اب احمد آباد کیا آئے گی البتہ اگر تمہارا جی چاہے تو تم دہلی چلے آؤ تمہارا گھر ہے جبتک جی چاہے یہاں رہو اور اگر تمہارا روزگار کا ارادہ ہے تو یہاں روزگار بھی ممکن ہے کیونکہ شہر دہلی میں محنت کش آدمی کے واسطے قسم قسم کی نوکریاں موجود ہیں۔ باقی آیندہ

سید ناصر نذیر

موت سے مری اُن کو درد آشنا پایا
روح وہ جو نالہ تھی کج اُسے رسا پایا

سچ تو ہے نہ تھی قسمت کرسکیں جبیں سائی
بس یہی غنیمت ہے کچھ اسرا پایا

عشق میں بسر کردوں پاؤں گر حیات خضر
کیا کہوں جو الفت میں درد کا مزا پایا

خوشدلی ہجوم غم ضبط وحشت ناکامی
عشق کو مصیبت میں ہمت آزما پایا

خود ہوئی پشیمانی تیغ کی بڑی غفلت
آئے بھی سرِبالیں اب جو تم تو کیا پایا

اُف یہ کیسی اُلجھن تھی کیسی دل کی شورش تھی
آہ کی جو گھبرا کے دل جلا ہوا پایا

خوں کیا تو کیا پروا عشق کی مراد آئی
تیغ نے جس طرف دیکھا اُسنے خونبہا پایا

رات بھر کیا جس نے آہ میں اثر پیدا
صبح تک وہ ساز دل آوے صدا پایا

زندگی سے یہ کہدو جائے اب خدا حافظ
ہر طرح عزیز اُسکو دشمنِ وفا پایا

مالوہ کی سیر

(۳)

قلعہ شادی آباد مانڈو

ہندوستان کے قلعوں سے بلحاظ وسعت اور آثار قدیمہ کے کوئی قلعہ صوبہ مالوہ کے اس عظیم الشان قلعہ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جیسے اس کے ابتدائی تاریخی حالات دلچسپ ہیں اُس سے زیادہ اس کی بربادی کے حالات دردانگیز اور حسرت آمیز ہیں۔ شاہانِ غوری و سلاطین خلجی مالوہ کے عہد میں مانڈو شادی آباد تھا اور آبادی و خوبصورتی میں مصر و اصفہان سے بڑھ کر تھا آج عجیب عبرت خیز مقام ہے نہ اب وہ مجمع موجود ہے جو اس رفیع الشان شہر میں نظر آتا تھا نہ وہ لوگ باقی ہیں جو اُس کے پُر رونق بازاروں میں خرید و فروخت کیا کرتے تھے۔ نہ بادشاہ موجود ہیں نہ اُن کی رعایا اور لشکر۔ سب کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اب یہ مُردوں کا شہر ہے جسے دیکھ کر بابل و نینوا کے تاریخی کھنڈر یاد آتے ہیں۔ سرسبز باغات۔ خوبصورت چمن اور طرح طرح کے میوہ دار درختوں کے بجائے کوسوں تک گنجان جنگل اور خاردار جھاڑیاں نظر آتی ہیں جنہیں دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔ عالیشان اور خوبصورت عمارتیں۔ پُر لطف سیرگاہیں جو کبھی اشرف المخلوقات کا مسکن تھیں۔ آج نشیمن گاہ زاغ و زغن ہیں اور اُن کی خاموشی اور بیکسی پر لاکھوں حسرتیں اور آرزوئیں تڑپ رہی ہیں۔ ہاں ان عمارتوں کی بلند چوٹیوں اور میناروں پر بیٹھ کر

صبح کو طائرانِ خوش الحان   پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

کیسا ہی سخت دل آدمی کیوں نہ ہو یہاں کی عالیشان عمارتوں اور کھنڈروں کو دیکھکر اُس کی آنکھوں کے سامنے طلسم خانہ سرائے فانی کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ عجائبات قدرت اور آثار قدیمہ کے عاشق شہنشاہ جہانگیر نے یہاں کی عمارتوں کی تین چار لاکھ روپے صرف کر کے مرمت کرائی تھی۔ یا اب لارڈ کرزن بہادر کے صاحب کرم نے جن کی یاد ہندوستان کے ہر کہنہ آثار اور اُجڑے ہوئے کھنڈروں میں مسرور و شاد کام نظر آتی ہے یہاں کی خاص خاص عمارتوں کو سیراب کیا ہے لیکن ریاستوں کی گنگا ہمیشہ اُلٹی بہتی ہے۔ باوجود گورنمنٹ کی قابل قدر مالی امداد کے جیسی کہ چاہیے مرمت اور صفائی نہیں ہوئی اور اب تو کام بالکل بند ہو گیا۔

مجھے اس قلعہ کے دیکھنے کا عرصے سے اشتیاق تھا لیکن میری یہ آرزو اس وجہ سے کہ وہاں تک ریل نہیں نہ قیامگاہ کا کچھ ٹھیک ٹھکانہ تھا پوری نہ ہوتی تھی۔ مدت کے بعد اب یہ دیرینہ تمنا بر آئی اور ۱۸ نومبر ۱۹۰۱ء کو میں نے مانڈو پہنچکر دو تین دن میں اس کی سیر کی۔ قبل اس کے کہ یہاں کے عبرت افزا حالات کا فوٹو ناظرین مخزن کے روبرو پیش کروں مناسب سمجھتا ہوں کہ مختصر طور سے یہاں کے گذشتہ تاریخی حالات بھی ہدیۂ ناظرین کروں۔

راجہ جے چند پوار دیو سنگھ دیو کے زمانے میں جو راجہ بکرماجیت سے دو ہزار اور ۱۳۵ برس پہلے گذرا ہے مانڈو یا مانڈن ایک لوہار کا نام تھا ایک دن ایک بھیل اُس کے پاس آیا اور گھاس کاٹنے کی درانتی اُسے دیکر بولا کہ ایک پتھر سے اسے میں نے تیز کرنا چاہا تھا یہ پیتل کی ہو گئی میرے کس کام کی ہے مجھے لوہے کی درانتی دیدے مانڈو یہ حال سنکر اور درانتی کو دیکھکر سمجھ گیا کہ اس جنگلی نے جس پتھر پر اسے گھسا ہے وہ سنگ پارس ہے۔ چپ چاپ دوسری درانتی اُس کے حوالہ کی اور کہا کہ وہ کونسا پتھر ہے اُس نے ساتھ لیجا کر پتھر بتا دیا

لوہار پتھر اُٹھا لایا۔ اور راجہ کے پاس جاکر تنہائی میں یہ حال بیان کیا اور کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی ریاست میں میں ایک شہر اپنے نام سے آباد کروں تاکہ میرا نام دنیا میں باقی رہے۔ راجہ نے لوہار کو اجازت دی اُس نے بالائے کوہ پر قلعہ کی بنیاد ڈالی اور بارہ برس کے عرصے میں یہ قلعہ معہ شہر کے جس میں ایک لاکھ مکان تھے تیار ہوا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ لوہار نے سنگ پارس راجہ کے نذر کر دیا اور اُس نے لوہار کے نام پر یہ قلعہ تعمیر کرایا پھر اس نے آخیر وقت میں دریائے نربدا کے کنارے پر ایک جشن عظیم منعقد کیا اور اپنا کل مال و اسباب برہمنوں کو بانٹ دیا راجہ کا خاص پروہت باقی رہ گیا سنگ پارس راجہ نے اسکے حوالہ کیا وہ پتھر کو دیکھکر جل گیا اور فوراً اسے نربدہ میں پھینک دیا جب سنگ پارس کا حال معلوم ہوا بہت رویا چلایا۔ ہر چند دریا میں تلاش کیا مگر پتہ نہ چلا۔ یہ بعید از عقل روایت سماعی ہے جو نقل ہوتی چلی آتی ہے۔ لیکن یہ تاریخی روایت ہے کہ ۱۰۰۸ھ میں جب اکبر آسیر کے مہم پر خود لشکر لیکر چلا۔ فوج اسی نربدہ سے عبور کر رہی تھی۔ ہاتھیوں کا حلقہ کہ سواری کا جزو اعظم تھا۔ دریا اُترا فیلبانوں نے دیکھا کہ خاصہ کے ہاتھی کی زنجیر سونے کی ہوگئی۔ داروغہ فیلخانہ کو خبر کی۔ اُس نے خود جاکر دیکھا۔ پھر بادشاہ کو اطلاع دی۔ زنجیر منگاکر بادشاہ نے خود ملاحظہ کی۔ لوگوں کو دکھایا۔ چاشنی لی۔ سونا ہی نکلا۔ سنگ پارس کا خیال ہوا ہاتھیوں کو پھر اُسی گھاٹ اور راستہ پر عبور کرایا مگر کچھ نہ ہوا۔

اسلامی عہد میں غیاث الدین بلبن نے (۶۶۴ھ ۱۲۶۵ء لغایۃ ۶۸۵ھ ۱۲۸۶ء) مالوہ کو فتح کیا اُس زمانے سے ناصر الدین محمد شاہ ابن فیروز شاہ تغلق لغایۃ ۷۸۴ھ ۱۳۸۲ء) کے عہد تک یہ ملک سلاطین دہلی کے قبضہ میں رہا اُس وقت دہار حاکم نشین مقام تھا دلاور خاں غوری حاکم مالوہ نے جس کا اصلی نام حسین اور سلطان شہاب الدین

بنام غوری کے نواسوں میں تھا سلطنت دہلی کے ضعف کے زمانہ میں خودمختاری
اختیار کی اور ۸۰۴ھ میں سکہ اور خطبہ بھی اپنے نام کا جاری کیا اُس کے خاندان
میں دو بادشاہ اور ہوئے۔ سلطان دلاور خان غوری سنہ ۷۸۴ھ ۱۳۸۲ء لغایۃ سنہ ۸۰۸ھ (یا سنہ ۸۰۹ھ) ۱۴۰۵ء

سلطان ہوشنگ پسر دلاور خاں سنہ ۸۰۸ھ ۱۴۰۵ء " سنہ ۸۳۸ھ ۱۴۳۴ء

سلطان محمد شاہ بن ہوشنگ سنہ ۸۳۸ھ ۱۴۳۴ء " سنہ ۸۳۹ھ ۱۴۳۵ء

اِسکے بعد سلطان علاءالدین محمود خلجی تخت نشین ہوا جو سلطان ہوشنگ کے پھوپھی زاد
بھائی ملک مغیث الدین کا بیٹا تھا۔ خلجی خاندان میں حسب ذیل سلطنت رہی۔

سلطان محمود شاہ خلجی سنہ ۸۳۹ھ ۱۴۳۵ء لغایۃ سنہ ۸۷۲ھ ۱۴۶۷ء

سلطان غیاث الدین پسر محمود سنہ ۸۷۲ھ ۱۴۶۷ء " سنہ ۹۰۵ھ ۱۴۹۹ء

سلطان ناصرالدین بن غیاث الدین سنہ ۹۰۵ھ ۱۴۹۹ء " سنہ ۹۱۶ھ ۱۵۱۰ء

سلطان محمود ثانی پسر ناصرالدین سنہ ۹۱۶ھ ۱۵۱۰ء لغایۃ سنہ ۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء

سنہ ۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء میں سلطان بہادر شاہ گجراتی نے مالوہ کو فتح کیا سنہ ۹۴۱ھ ۱۵۳۴ء تک اُسکی حکومت رہی اُس سے ہمایوں نے
فتح کیا۔ ہمایوں کے واپس جانیکے بعد سنہ ۹۴۲ھ میں ملو خاں بن ملو خاں جو خاندان خلجی کا ایک غلام تھا کل مالوہ پر قابض
ہو گیا اور سلطان قادر اپنا خطاب مقرر کر کے تخت پر بیٹھا۔ سنہ ۹۴۹ھ ۱۵۴۲ء میں شیر شاہ سوری
نے اُس سے مالوہ فتح کیا اور شجاع خاں اپنے ایک امیر کو وہاں کا حاکم مقرر کیا۔
سلیم شاہ کے بعد جب خاندان سوری میں ضعف پیدا ہوا شجاع خاں نے طرز
شاہانہ اختیار کی لیکن سکہ اور خطبہ جاری نہ کرنے پایا تھا کہ ۱۲ برس کی حکومت کے
بعد سنہ ۹۶۲ھ ۱۵۵۴ء میں اس دار فانی سے رحلت کر گیا۔ اُس کے بعد اُسکا بیٹا
ملک بایزید جو باز بہادر کے نام سے مشہور ہے تخت پر بیٹھا۔ سنہ ۹۶۷ھ ۱۵۶۰ء تک اُس
کی حکومت رہی ازاں بعد یہ صوبہ اکبر کے عہد میں سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گیا
اور محمد شاہ کے عہد تک سلطنت مغلیہ کا جزو رہا۔ اس کے بعد مرہٹوں کا قبضہ

ہوا۔ اب یہ حسب ذیل ریاستوں میں منقسم ہے۔

اندور۔ اُجین وگوالیار۔ دھار۔ دیواس۔ جھابوہ۔ علی راجپور۔ بڑوانی۔ رتلام۔ سیلانہ۔ سیتامئو۔ جاورہ۔ خلجی پور۔ راجگڈھ۔ نرسنگہ گڈھ۔ بھوپال۔ باسودہ۔ محمدگڈھ۔ کوروائی۔ جوبٹ۔

دلاور خاں غوری نے خودمختار ہو کر مانڈو کو جو اُس وقت بالکل ویران تھا اپنا دارالسلطنت مقرر کرنا چاہا تھا اور وہاں کچھ تعمیر بھی شروع کرا دی تھی چنانچہ اوسکی بنائی ہوئی ایک مسجد اور دروازہ وہاں اب تک موجود ہے۔ سلطان ہوشنگ نے اپنے باپ کے عہد میں تین برس کے عرصے میں اس قلعہ کو از سر نو تعمیر کرایا اور جب بادشاہ ہوا شادی آباد نام رکھکر اپنا دارالسلطنت مقرر کر کے اُس کی آبادی میں کوشش کی۔ اُسکے بعد خلجیوں کے آخیر عہد تک یہ مالوہ کا دارالسلطنت رہا۔

ہمایوں نے بھی فتح کر کے یہیں مقام کیا۔ سب سے زیادہ رونق اسے سلطان محمود خلجی کے عہد میں حاصل ہوئی جس نے مانڈو کو نہ صرف بہت سی خوبصورت اور عالیشان عمارتوں ہی سے آراستہ کیا بلکہ دور دور سے علمار فضلا اور ہر قسم کے اہل کمال کو لاکھوں کروروں روپیہ صرف کر کے بلایا اور اس شہر میں آباد کیا مانڈو اور تمام ملک میں مدرسے تعمیر کرا کر علما، فضلا۔ طلبار کے وظائف مقرر کئے ۸۴۵ھ ۱۴۴۲ء میں ایک عظیم الشان شفاخانہ بنوا کر کئی گاؤں اُس کے اخراجات کے واسطے وقف کئے اور حکیم فضل اللہ کو جو حکیم الحکما کے خطاب سے موصوف اور بہت بڑا فاضل طبیب تھا اُس کا مہتمم مقرر کیا اس شفاخانہ میں عام بیماریوں کے علاوہ پاگلوں کا بھی علاج ہوتا تھا اور دوا اور خوراک سب مفت دی جاتی تھی ملک کا انتظام ایسا عمدہ تھا کہ چور اور ٹھگ کا کوئی نام بھی نہ جانتا تھا اگر اتفاقیہ کسی کا

مال چوری جاتا تو بعد ثبوت اُس کی قیمت خزانہ سے دیدی جاتی تھی۔ پھر پولیس کو حکم ہوتا کہ یا تو چور کو معمال کے گرفتار کریں ورنہ قیمت مال مسروقہ کی داخل خزانہ کرے۔ ایک مسافر کو دریا کے کنارے پر ایک شیر نے مار ڈالا اُس کے وارث دربار میں دادخواہ ہوئے بادشاہ نے اس پر تمام ممالک محروسہ کے درندوں کو ہلاک کروا دیا اور اُس کے عہد سعدلت مہد اور اُس کے بعد بھی برسوں تک مالوہ میں کوئی درندہ نظر نہ آیا تھا۔ ۸۵۹ھ ۱۴۵۵ء میں اسی بادشاہ نے اجمیر کے قلعہ کو گجادہر راجپوت سے فتح کر کے حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح کے روضہ کی عمارت اور مسجد تعمیر کرائی۔ ۸۶۶ھ ۱۴۶۱ء میں خلیفہ یوسف بن محمد عباسی نے مصر سے فرمان سلطنت اور خلعت اس کے پاس بھیجا۔ ۸۷۲ھ ۱۴۶۷ء میں میرزا سلطان ابوسعید نے خواجہ جمال الدین استرآبادی کو معہ تحفہ اور سوغات کے برسم سفارت اس کے دربار میں روانہ کیا۔

محمود خلجی خواجہ کے آنے سے بہت خوش ہوا اور اُسے نوازشہائے خسروانہ سے خوشدل کیا اور شیخ علاؤالدین کے ہاتھ سلطان ابوسعید کے پاس بہت سی ہندوستان کی سوغاتیں ہاتھی گھوڑے وغیرہ روانہ کئے اور سلطان کی مدح میں اپنا طبعزاد قصیدہ بھی جو ہندی زبان میں تھا بھیجا۔

سلطان ابوسعید سب سے زیادہ اس قصیدے سے خوش ہوا۔

سلطان محمود خلجی کے بیٹے سلطان غیاث الدین نے پندرہ سولہ ہزار لونڈیاں فراہم کر کے قلعہ کے اندر ایک زنانہ شہر آباد کیا تھا جس میں وکیل۔ وزیر۔ بخشی خزانچی۔ داروغہ توشک خانہ۔ امیرالامرا۔ منشی۔ مخبر۔ منجم۔ صدر۔ مدرس۔ حکیم ندیم۔ محتسب۔ موذن۔ مفتی۔ حافظ۔ وغیرہ سب عورتیں ہی عورتیں تھیں بہت سی لونڈیاں کو زرگری۔ آہنگری۔ نجاری۔ سادہ کاری۔ مخمل بافی۔ شالبافی۔ میرانجی

کمان گری - کوزہ گری - جامہ بافی - خیاطی - کفش دوزی وغیرہ انواع واقسام کی دستکاریوں اور ہنر کی تعلیم دلاکر اس شہر میں آباد کیا تھا اس شہر کی فوج بھی علیحدہ تھی پانسو لونڈیوں کو تیر اندازی اور برچھی بازی اور پانسو کو برق اندازی اور شمشیر بازی سکھا کر مردانہ وردی پہنائی گئی تھی - بازار وغیرہ سب اس شہر کا علیحدہ تھا جس میں ہر قسم کی خرید و فروخت ہوتی تھی - ان سب عورتوں کا وظیفہ خواہ وہ ادنی یا اعلیٰ کسی کام پر مامور ہوں برابر تھا - اور ہر ایک کو دو تنگہ نقد اور دو من غلہ روزانہ ملتا تھا - ایک بہت بڑا آہو خانہ تعمیر کرایا تھا جس میں ہزار دں لاکھوں قسم کے چرند و پرند جمع کئے تھے اسی میں اکثر عورتوں کے ساتھ شکار کھیلا کرتا تھا - ۳۲ برس اسی عیش و عشرت کے ساتھ زندگی بسر کی اور کوئی فتور ملک میں پیدا نہ ہوا -

سلطان ناصر الدین خلجی کو عمارت کا بہت شوق تھا - مانڈو - کالیاوہ (اجین) سعدلپور آگرہ وغیرہ میں اس نے نہایت عالیشان - خوبصورت اور فرح بخش عمارتیں اور سیرگاہیں بنوائیں منجملہ اکرو ڑ کل آمدنی کے وہ پانچ کروڑ روپیہ سالانہ عمارت کی تعمیر میں صرف کرتا تھا -

اُس زمانہ میں قلعہ کے اندر اور بیرون قلعہ تا موضع نعلچہ جو اُس زمانہ میں ظفر آباد نعلچہ لکھا جاتا تھا اور اب قلعہ سے سات میل کے فاصلہ پر واقع ہے شہر کی آبادی تھی ۸۴۵ھ ۱۴۴۱ء میں محمود خلجی نے ظفر آباد مذکور میں ایک عالیشان باغ مع قصر رفیع اور گنبد ہائے عالی تعمیر کرایا تھا جس کے شکستہ آثار اب تک باقی ہیں اس مقام سے قلعہ تک گذشتہ آبادی کے کھنڈر سیکڑوں یعنی مسجدوں - مقبروں اور محلات کے نشان اب تک موجود ہیں -

سلاطین مغلیہ کے زمانہ سے پہلے ہی آبادی نہ رہی تھی اور بہت سے مقامات ویران ہوچکے تھے مگر جہاں تک تاریخ سے پتہ چلتا ہے قلعہ کے اندر آبادی کا موجود ہونا

پایا جاتا ہے۔ اکبر جہانگیر۔ شاہجہاں کئی مرتبہ یہاں آئے جہانگیر تو معہ کل اہل حرم کے سنہ جلوس میں کئی مہینے یہاں مقیم رہا اُس نے یہاں کی آب وہوا اور عمارت کی بہت تعریف لکھی ہے۔ ایک موقع پر لکھتا ہے "از کثرت سبزہ و ریاحین خودرو چہ نویسد درہ ودشت وکوہ وصحرا فرو گرفتہ است۔ در معمورہ عالم معلوم نیست کہ مثل مانڈو جائے از حیثیت خوبی ہوا ولطافت جا وصحرا بودہ باشد بہ تخصیص در فصل برسات دریں فصل کہ از ماہائے متبرتابستان ست شبہا در درون خانہ بے لحاف نمیتواں خوابید وروزہا بنوعے کہ مطلق بہ بادزن وتغیر جا ومنزل احتیاج نمی افتد انچہ ازیں عالم نوشتہ شود ہنوز اندکے از بسیاری خوبیہائے آن جاست" اس زمانہ میں مانڈو صوبہ مالوہ کی بارہ سرکاروں میں سے ایک سرکار کا صدر مقام تھا جس کی آمدنی ایک کروڑ ۳۹ لاکھ دام (۴۰ دام = عہ) تھی اور علاوہ حکام مال کے ایک امیر معہ فوج کے قلعدار کے نام سے رہتا تھا۔ غالباً مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد مرہٹوں کی لوٹ کھسوٹ کے زمانہ میں یہ شہر بالکل ویران ہوگیا۔ اب یہ ویران قلعہ مالوہ کی ایک چھوٹی سی ریاست دھار کے متعلق ہے جو قصبہ دھار سے ۲۱ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ قرب وجوار کی چھاؤنیوں سے انگریزی حکام تبدیل آب وہوا اور شکار کے واسطے یا آثار قدیمہ کے شایق عمارتوں کے دیکھنے کے واسطے مانڈو جایا کرتے ہیں لہذا دھار سے قلعہ کے اندر تک پختہ سڑک بنی ہوئی ہے۔ باہر سے آنے والے مئو چھاؤنی کے اسٹیشن پر اُتر کر ۳۳ میل تانگے میں دھار آتے ہیں پھر وہاں سے مانڈو جاتے ہیں۔ اب مانڈو چند خس پوش مکانوں کا ایک موضع ہے جہاں ریاست کے محکمہ جنگلات کا ایک افسر رہتا ہے صرف دو کامیں بنیوں کی ہیں جن کی دوکان پر آٹا دال کے سوائے اور کوئی چیز نہیں ملتی اس آبادی کے علاوہ مختلف مقامات پر کاشتکار بھیلوں کے ٹاپرے یعنی گھر جنگل

میں بنے ہیں اور قلعہ کے اندر ہر قسم کی کاشت ہوتی ہے۔
یہ قلعہ ایک بلند پہاڑ پر واقع ہے جس کے چاروں طرف ایسے عمیق پہاڑ کے غار ہیں جو کوسوں تک گھرے ہیں اور کسی طرح اُس میں اُترنے یا چڑھنے کی مجال نہیں ہے نہ کسی جانب سے توپ بم وبیل کا گولہ قلعہ تک پہنچ سکتا ہے صرف موضع نعلچہ کی طرف سے ایک راستہ قلعہ پر چڑھنے کے واسطے بنا ہوا ہے۔ اکبر نامہ میں قلعہ کا دور ۱۲ کوس اور تزک جہانگیری میں ۱۰ کوس لکھا ہے۔ اب انگریزی پیمائش کے مطابق جو کمپاس سے کی گئی ہے ۱۹ میل کا دور ہے۔ قلعہ میں حسب ذیل بارہ دروازے ہیں۔
دہلی دروازہ۔ تاراپور دروازہ۔ لوحانی دروازہ۔ ہاتی پول۔ رام پول۔ جہانگیر پور دروازہ گلوانا دروازہ۔ نوتی دروازہ۔ نالچہ دروازہ۔ گاڑی دروازہ۔ بنگی دروازہ۔ گوجری دروازہ۔ دہلی دروازہ عالمگیر کے عہد میں تعمیر ہوا ہے اور دروازہ پر یہ قطعہ کندہ ہے ؎

در زمانِ شاہِ عالمگیر خاقانِ جہاں	از سر نو گشت پایاں ایں درِ گردوں نشاں
در ہزار و ہفتاد و نہ آغاز و ہم انجام یافت	ز اہتمامِ خانِ عالیشاں محمد بیگ خاں
از جلوسِ ایں شہنشاہِ جہاں اورنگ زیب	بود سالِ یازدہ از روئے تحریر و بیاں

تاراپور دروازہ۔ دلاور خاں غوری کے عہد میں تعمیر ہوا ہے اُس پر یہ کتبہ ہے ؎

مدار ملتِ اسلام و زبدۂ اعیاں	سپہر مجد و معالی و معدن احساں
جہاں کشا دو جواں بخت آسمان زینت	قضا تواں و قدر قدرتِ ظہیر جہاں
پناہ شرع پیمبر معین دین ہدیٰ	سحاب جود و سخا و کرم دلاور خاں
بہ شہر شادی آباد دروازہ مرتب کرد	کہ در رخ ...... کس نداد نشاں

گذشتہ بود ز تاریخ و سال ہفتد و نہ
کہ شد تمام ز اقبال خاصہ یزداں

درزمان دولت وسلطنت بندگان حضرت ظل الٰہی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ این فقیر حقیر طاہر محمد حسن عماد الدین بن سلطان علی سبزواری بہ عنایت سبحانی باصلاح شارہ توفیق یافت - تحریر فی التاریخ ۲۰ شہر محرم الحرام سنہ ۱۰۱۴ھ ہزار و چہارده (۱۶۰۵ء)

بگوانا دروازے پر یہ عبارت کندہ ہے "در عمل سیادت ونقابت پناہ مرزا محمد بدیع الزماں مشہدی باہتمام بندہ باخلاص محمد حسن مشہدی تعمیر یافت - واقع تاریخ جمادی الثانی سنہ ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء)۔

ہاتی پول دروازے کے آگے دو بڑے بڑے پتھر کے ہاتھی کھڑے تھے جن کے اب صرف پاؤں وغیرہ نیچے کے حصے باقی رہ گئے ہیں۔ جہانگیر پور دروازہ جہانگیر بادشاہ کا بنوایا ہوا بتلایا جاتا ہے۔ اندر کی خاص عمارتیں یہ ہیں۔

جامع مسجد

اس عظیم الشان مسجد کی بنیاد سلطان ہوشنگ غوری نے ڈالی تھی لیکن اُس کی زندگی میں عمارت تکمیل کو نہ پہنچی - مرحوم کی وصیت کے بموجب سلطان محمود خلجی نے سنہ ۸۵۸ھ (۱۴۵۴ء) میں مسجد کو تکمیل پر پہونچایا - یہ سنگ سرخ وسفید کی مسجد ہے اور کہیں کہیں سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ بھی لگا ہے۔ بعض بعض جگہ چینی کا کام ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے ۳۷۲ گنبد اور ۴۸۰ ستون تھے اب شمال وجنوب اور مشرق کے دالان گر گئے ہیں لیکن قریب ۱۷۵ ستون اور سو گنبدوں کے اب بھی باقی ہیں۔ مسجد کی عمارت کی کرسی بلند ہے جس کے نیچے دالان اور اُن کے اندر حجرے بنے ہوئے ہیں۔ ۳۲ سیڑھیاں چڑھکر صدر دروازہ ملتا ہے جس کی بیرونی پیشانی پر یہ کتبہ کندہ تھا اب اس کتبہ کا نصف پتھر غائب ہے۔

مسجدِ عالی بنا و معبدِ گردوں مقام — ہست ہر رکنِ حطیمش ہمسر بیت الحرام
از دوِ تعظیم قدرش چوں کبوتر در حرم — قدسیاں اندر طوافِ او بعز و احترام
بانئے ایں بیت اقدس خسرو غوری موشنگ — ثانیِ محمود و مسعود و شہاب الدین سام
و اقتضائے حادثاتِ دہر زاد ضاعِ فلک — چوں برآمد آفتابِ عمرِ او بالائے بام
گفت با محمود خلجی نورِ عینین مغیث — از رہِ روشن دلی آں شاہ دارا احتشام
در ترقیہائے عمرانات و دفعِ دشمناں — میکنم بر تو وصیت من بجہد و اہتمام
ہم برائے اختتامِ مسجدِ جامع کہ من — طرح آں افگندہ ام چوں مسجدِ والا شام
صورتِ الطافِ حق سلطان علاؤ الدیں کہ ہست — مظہرِ انوارِ دیں مرآت حاجاتِ انام

کرد در تاریخ سالِ ہشصد و پنجاہ و ہشت

ہم بحکم ایں وصیت ایں عمارت را تمام

یہ دروازہ نہایت عالیشان ہے۔ جس کے نیچے کا حصہ مربع (۴۹ فیٹ × ۴۹ فیٹ) اور اوپر کا ہشت پہل ہے۔ چھت لداؤ کی خوبصورت ہے جس پر بڑا گنبد ہے۔ اس دروازے کے علاوہ دو دروازے شمالی جانب ہیں جن میں سے ایک گنبد دار ہے۔ مسجد سترہ درکی ہے جس کا اندرونی طول و عرض ۲۶۱ فیٹ × ۴۰ فیٹ ہے۔ طول میں دونوں جانب ۵ فیٹ ۵ انچ - ۵ فیٹ ۵ انچ چوڑے دروازوں کا اُتار اور عرض میں ۹ ½ فیٹ امام کے کھڑے ہونے کی جگہ اس کے علاوہ ہے۔ ستون بلند اور اس ترتیب سے نصب ہیں کہ مسجد برابر کے پانچ درجوں یعنی والان در والان میں منقسم ہو گئی ہے۔ چھت چار چار ستونوں کے درمیان میں لداؤ ہے جس پر تین بڑے اور ہر پٹاؤ پر ایک ایک چھوٹا گنبد ہے۔ شمال و جنوب میں ۴۸ - ۴۸ فیٹ طول میں چھوٹے چھوٹے ستون نصب کر کے دو منزلہ کر دیا ہے غالباً یہ خاص جگہ بادشاہ اور امرا کے واسطے مخصوص

کی گئی تھی۔ ۱۱ سیڑھی کا خوبصورت ممبر ہے جس کے اوپر گنبد بنا ہے۔ ممبر کے سامنے ۲ فیٹ ۸۔ انچہ بلند مربع چبوترہ ہے جس کا ہر ضلع ۱۰فیٹ ۴۔ انچہ ہے درمیانی محراب کے علاوہ دونوں طرف خوبصورت محرابیں ہیں سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ لگا ہوا ہے۔

شمال وجنوب میں ۱۳-۱۳ درا ور تین تین درجے کے ۸ ۴ فیٹ ۸۔ انچہ چوڑے اور مشرق ۳۳ فیٹ ۴۔ انچہ چوڑا دالان بنا تھا جن کی چھتیں مسجد کی طرح لداؤ کی پٹی تھیں اور ہر پٹاؤ پر ایک گنبد تھا۔ ان کا اب حسب ذیل حصہ باقی رہگیا ہے۔ شمالی جانب تینوں درجہ کے دو در۔ دو درجہ کا ایک در اور ایک درجے کے پانچ در۔ جنوبی جانب دو درجے کے ۸ در۔ مشرقی جانب گوشے میں تین درجوں کے دو ا ور ایک درجہ کا صرف ایک در۔ صحن کا طول وعرض ۱۶۰ × ۱۶۰ فیٹ مربع ہے۔ یہ مسجد اب ویران ہے صرف غلام حسین نام ایک دیندار سپاہی پانچوں وقت کی اذان دیکر نماز پڑھ لیتا ہے۔ (باقی آیندہ)

سعید احمد

دیا ضیا بسط نامی ایک مجموعہ نظم ہمارے پاس ریویو کے لئے پہنچا ہے۔ جو جناب مولوی باسط علی صاحب رئیس متھرا کی نازک خیالیوں کا خاکہ ہے۔ یہ نہ صرف عام عاشقانہ غزلیات کا مجموعہ ہے بلکہ حمدیہ نعتیہ قصائد۔ مناقب اہل بیت رسول۔ سلام۔ مراثی۔ مناجات۔ قطعات۔ تاریخ۔ رقعات۔ تہنیت وتعزیت وغیرہم اقسام نظم کا ۲۰۴ صفحات کا مجموعہ ہے۔

ایسے بہت کم شاعر ہیں جنکے طبایع غزل کے سوا دوسری اصناف کلام میں بھی پھل پھول سکتے ہیں مگر ہم مولوی صاحب موصوف کی طبیعت کو نظم کی مذکورہ تمام شقوں پر حاوی دیکھتے ہیں۔ اور یہ بہت غنیمت ہے کتاب کی لکھائی۔ چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے۔ سرورق رنگین بقیمت ایک روپیہ مصنف سے مل سکتی ہے۔

مآل زندگی

اگرچہ اہل سائنس نے بہت سی پیچیدگیاں حل کر دی ہیں بلکہ اپنے پر اعجاز شعبدات سے بعض دنیاوی معاملات کو پُراسرار مسائل کے پہلو بہ پہلو کر کے دونو میں عجیب قسم کی یگانگت پیدا کر دی ہے تاہم کوئی صورت اس ابتدائی مشکل سے رہائی کی نظر نہیں آئی کہ یہ دنیا کیوں بنی تھی اور اسکا مرجع کدھر ہے۔
سوال اول سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کسی نے طبع آزمائی صحیح طور پر شروع نہیں کی۔ ممکن ہے کہ سوال ثانی کے طے پانے پر اسکا بھی حصر ہو اور وہ لوگ جو اپنی دنیا کو چھوڑ کر مریخ سے باتیں کرنے کی فکر میں ہیں یا عالم ثبات سے روگرداں ہو کر عالم دیگر کی طرف متوجہ ہیں کچھ کام کر جائیں۔ ہمیں اُن لوگوں سے کوئی تنازعہ نہیں۔ بلکہ ہم ان کی محنت کی داد دیتے ہیں۔ ہمیں حق ہے بحیثیت مشترکہ دنیادار ہونے کے کہ اُن کے پیدا کردہ نتائج سے مستفید ہوں لیکن یہ ضرور ہے۔ کہ ہم بھی اُن کی مساعی میں لگ جائیں غالباً اچھی خاصی چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دینگے

ع ہر کسے را بہر کارے ساختند

ہم ایسے کام میں پھنسے تو بس تارے گننے لگ جائینگے۔ یہ سچ ہے کہ

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

لیکن اب آنے والے آ گئے ہیں جب تک یہاں ہیں کوئی صورت خوش رہنے کی پیدا کرنی ناگزیر ہے۔ قانونِ قدرت جو سب سے زیادہ اشد ہے وہ اپنی حیات کا قائم رکھنا ہے اسی کے لئے محنت مزدوری کرنا کسی پر منت نہیں ہے۔ کل

حیوانات اس میں مصروف ہیں مگر انسان میں ایک خاص قوت تمیز ہے جس
پہ لمکر غرق کرنے کی کوشش کیجاتی ہے کہ۔

عاقبت کی خبر خدا جانے

اب تو آرام سے گذرتی ہے

ایک وہ ہیں کہ بجائے مصروفیت اختیار کرنے کے پکار رہے ہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

لیکن اس تمام شور و شغب سے حاصل کیا ہے۔ استدلال سے اگر کچھ ملتا ہے
تو یہی کہ دنیا کی آفرینش کا کچھ منشا ضرور ہے اور کچھ نہ کچھ انجام بھی ہوگا۔ دنیا
کام کی جگہ ہے نہ آرام کی۔ مثلاً بعد مثلاً کام کیا ہوا رائیگاں نہیں جاتا۔ انگلستان
کی صدہا سال کی محنتِ شاقہ اب کام آرہی ہے۔ ہمارے احباب سوالات
لاینحل کے درپے ہیں مگر ہم لوگ جو اُن سائنفیس دماغ نہیں رکھتے عمل کو اپنا
مذہب بنائیں تو خوب ہے۔ اگر ہر شخص اپنے تئیں کسی نہ کسی کام کے سلجھانے کے
لئے مامور سمجھے تو عجب رنگ جم جائے۔ چند اشخاص کی کمائی یہ بہار لائی ہے
اگر ایشیا اور افریقہ کے لوگ بھی دنیا کی ترقی میں دلچسپی لینے لگیں تو دنیا کی ترقی حدِ
وہم و قیاس سے آگے بڑھ جائے۔

فرض کرو کہ میں آج خودکشی کرلوں۔ بس! میں ان تمام مرحلوں سے منہ موڑتا
ہوں جو اس دنیا میں رکھ کر مجھے طے کرنے تھے میں خود اپنے اختیارات سے دنیا
کے ایک کارکن کو کم کرتا ہوں مجھے معلوم نہیں کہ کہاں جا رہا ہوں اور پھر اپنی خوشی
سے ایک مقام موجود کو چھوڑ کر گرداب میں پھنستا ہوں۔ یقیناً انسان میں بزدلی
و کوتاہ اندیشی ہے۔ جیسا کہ میرے پیدا ہونے میں مجھ سے مشورہ نہیں لیا گیا مجھے

کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی موت میں "تو کون میں خواہ مخواہ" کا مصداق بنوں۔ پس جب تک ہو سکے زندہ رہنا ٹھیرا تو زندگی کو مفید بناؤ۔ کیا عجب ہے کہ قدرے قلیل کوشش ان کمزور بازوؤں کی دنیا کے بوجھ کو کچھ ہلکا کر سکے قرین قیاس ہے کہ بنی نوع انسان میں سے کوئی ایسی ضعیف آواز پر آگے بڑھ سکے اور یہ یقینی ہے کہ ایک جان ترقی دنیا کی زنجیر میں ایک کڑی ہو۔

دنیا بہ فراق وطن اصلی اے دل ۔۔۔ پژمردہ و افسردہ ہے اور ہے بسمل
کچھ کر کے دکھاؤ اے غمخوار و تم ۔۔۔ تا حشر کے روز جائیں بچھڑے سب مل

عبدالحق

مری بالیں پر انکو بھی اجل میری لگالائی ۔۔۔ کہاں سے رحم کی خو یہ کرم نا آشنا لائی
شب غم کیا کہوں یاد خرام ناز کیا لائی ۔۔۔ مری تقدیر کے سوتے ہوئے فتنے جگا لائی
ہمارے خون ناحق پر نہ آیا رحم کس کس کو ۔۔۔ تری تلوار بھی سفاک آنکھیں ڈبڈبا لائی
کھلے گی اُنکے فتنوں کی دکان بازار محشر میں ۔۔۔ خدا ہے گر کہیں سے کچھ رقم ملجائی بالائی
صبا وہ بھی تو پہنچا دے نگاہ پیر کنعاں تک ۔۔۔ جو کلیاں دامن یوسف کی بھولو نمیں بسا لائی
اثر کی آس پر غربت زدہ بیکار جیتے ہیں ۔۔۔ تہیدستی ازل ہی سے مقدر میں دعا لائی
یوہیں کیا کم تھی میری آہ سوزاں جی جلانیکو ۔۔۔ وہاں جا کر لگی میں اور یہ ظالم لگا لائی
صبا کچھ خاک میری بھی پڑی تھی کوئی قاتل میں ۔۔۔ ادھر لا ہاتھ مٹھی کھول دیکھوں کیا اڑا لائی
اسی دن کے لئے تھی محبت ابتک مرے سن ۔۔۔ تری اٹھتی جوانی میرا پیغام قضا لائی
گیا بے آبرو دامن چشم تر سے اے دل نالاں ۔۔۔ مری کشتی تباہی میں سمجھے اسے ناخدا لائی

کہاں یہ عرصۂ محشر کہاں میں ناتواں ثاقب
کسی پردہ نشیں کے چاک داماں کی ہوا لائی

ظہور دہلوی

اُجڑے دیار کی یادگاریں

نپولین بونا پارٹ ایک نہایت الوالعزم بادشاہ اور مشہور جرنیل ہو گزرا ہے۔ لیکن اس نامور اور مشہور شخص کی فتوحات اور جنگی کارناموں کو پڑھکر اتنا تعجب نہیں ہوتا تھا جتنا اس کی جودت طبع اور رسائی ذہن کا حال معلوم کرکے حیرت ہوتی ہے کہ اس شخص کا دماغ ایک ہی وقت میں مختلف مضامین کو اپنے متعدد سکریٹریوں کو لکھوانے پر کس طرح قادر ہوتا تھا۔

لیکن ناظرین کو بہت حیرت ہوگی کہ اس اُجڑے دیار دہلی میں بھی ایسے اہل کمال اب سے ۴۰۔۵۰ سال پہلے ہو گزرے ہیں۔ کہ اگر ہزار سال زمیں چکر کھائے تو پیدا نہ ہونگے۔ کسی صاحب کا مقولہ ہے کہ بہادر شاہ مرحوم ایک بے اختیار بادشاہ تھے مگر ان کے زمانے کو اہل کمال کے مجموعہ کی حیثیت سے شاہ اکبر کے زمانے سے اگر فایق کہا جاوے تو مبالغہ نہیں کیونکہ اکبر نے لاکھوں روپے صرف کرکے اہل کمال کو جمع کیا تھا اور بہادر شاہ کے وقت میں بے دام درم سینکڑوں ارباب کمال خدا کی قدرت سے خود بخود جمع ہو گئے۔ فی الحقیقت یہ زمانہ ارباب دانش کا مخزن تھا۔

میں اس موقعہ پر مولوی محمد ظہور علی المتخلص بہ ظہور دہلوی۔ المخاطب بہ شمس الشعرا کے ذہن رسا کا ایک واقعہ جو اُن کے فرزند نے لکھا ہے خاص طور پر قابل بیان سمجھتا ہوں۔

کرنال کا ذکر ہے۔ وہاں مشاعرے میں ایک مرتبہ غزلیں مختلف زمین کی طرح میں ہوئی تھیں اور مولانا مرحوم نے مشاعرے کے دن تک دونوں غزلوں میں سے ایک شعر بھی تصنیف نہ فرمایا تھا۔ عبدالرحمن خاں صاحب دہلوی تلمیذ خاص حضرت ظہور اس دن موجود تھے انہوں نے عرض کیا کہ جناب اقدس آج کے دن مشاعرے میں آپ کو دو غزلیں پڑھنی ہونگی ظہر کا وقت بھی گزر گیا اور آپ کو کچھ فکر بھی نہیں ہے۔ آپنے بکمال فروتنی ارشاد کیا کہ مشاعرے میں میرا حاضر ہونا صرف اس نظر سے ہوا کرتا ہے کہ اہل مشاعرہ میری غیر حاضری سے رنجیدہ خاطر نہوں ورنہ میرا کلام اس قابل نہیں ہے کہ کسی کو سناؤں۔ بلکہ خوب ہوا جو آج مجکو فرصت ہی نہ ملی۔ انہوں نے عرض کیا کہ واہ حضرت جب آپ ہی ایسا ارشاد فرمائینگے تو مشاعرے کا خاتمہ ہے۔ جب امر حد کو پہنچا تب مولانا اس وقت مدرسہ کرنال کے کمرے میں ٹہل رہے تھے اور کمرہ کی ایک دیوار کی جانب عبدالرحمن خانصاحب ملو اُن کے مقابل میں یہ عاصی بیٹھا تھا جناب مصنف مرحوم نے ہنسکر اول عبدالرحمن خانصاحب سے فرمایا کہ لکھو:۔

کس کو کہتے ہیں وفا نام ہے کسکا اخلاص ہمنے دنیا میں وفا دیکھی نہ دیکھا اخلاص

اسکے بعد پھر متصل اور دو مطلع لکھوائے اور پھر مجھ سے فرمایا کہ تو لکھ۔

جزبہ خونابۂ غم اسمیں کہیں آب نہیں گردشِ چرخ ہے یہ گردشِ دولاب نہیں

پھر تو یہ صورت ہوئی کہ ایک دو شعر ایک جانب اور ایک دو دوسری جانب اس سرعت سے لکھوانے شروع کئے کہ ہر دو جانب لکھنا دشوار ہو گیا۔

اول غزل کے دیگر اشعار یہ ہیں۔

پر لگا کر جو اُڑا صورت عنقا اخلاص پھر زمی سے نہ ملا تا بہ ثریا اخلاص
زلف سے اُسکی نہ رکھ تو دلِ شیدا اخلاص سانپ موذی کا ہے اے یار بھلا کیا اخلاص

ہم سے نے احباب میں اتنا بھی نہ دیکھا اخلاص
جیسے رکھتے ہیں ہم ساغر و مینا اخلاص

اور پڑھ سورۂ اخلاص دلا کچھ دیکھا
دشمنی سے وہ مبدل ہوا اُن کا اخلاص

فاتحہ پڑھنے کو بھی آئے نہ اخلاص سے تم
دل سے کیا مخلص صادق کا بھلایا اخلاص

دوستی کرنے سے ہوتی ہے عداوت پیدا
کیا ہی اس لئے زمانہ کا ہے اُلٹا اخلاص

ہم نے کیوں دامِ محبت میں پھنسایا دلکو
چار دن کا ہے ترا اے بُتِ رعنا اخلاص

مطلع تازہ سُنا بزمِ سخن میں تو ظہور
جس سے ہووے دلِ احباب میں پیدا اخلاص

دوسری غزل کے دیگر اشعار یہ ہیں۔

بحرِ خوں سے ہے یہ مرا دیدۂ بیخواب نہیں
برق سے ہے پہلو میں میرے دلِ بیتاب نہیں

کون سا یاں سر و سامان نہیں ہے اے قیس
چشم بے خواب نہیں یا دلِ بیتاب نہیں

گھر ترا کیونکہ بچا آج تک اے مردمِ چشم
ٹھیرنا ورنہ کبھی خانۂ سیلاب نہیں

موج سے آج یہ کہتا تھا سرِ جُو یہ حباب
اپنی یہ ہستی موہوم کم از خواب نہیں

کس طرح ترکِ ملاقات بتوں سے کیجے
اپنے قابو میں ہمارا دلِ بیتاب نہیں

بزمِ رنداں کی ذرا دیکھ کرامت اے شیخ
بہتر پی واں بطِ مے ہی کہ جہاں آب نہیں

اس کو یکساں ہے دلا فصلِ بہار و خزاں
مثلِ مژگاں کے یہاں سبزۂ سیراب نہیں

شورشِ عشق سے ٹھیرے دلِ بیتاب کہاں
آگ پر یار ٹھہرتا کبھی سیماب نہیں

جس نے یاں کوئے قناعت میں قدم کو گاڑا
وہ امیرانِ جہاں کا کسِ قاب نہیں

طالعِ خفتہ کو روتا ہے سدا اپنے ظہور
جب سے اے دولتِ بیدار تو ہمخواب نہیں

مختصر سوانح عمری۔ مولوی محمد ظہور علی۔ ظہور دہلوی۔ ابن مولوی محمد فتح علیخاں بمقام دہلی پیدا ہوئے ۔ ان کا سلسلۂ نسب ابابکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے

ابتدا سے عمر سے نماز اور روزہ کا بڑا شوق تھا علما، و فضلا اور فقیروں درویشوں کی خدمت میں بکمال ارادت حاضر رہتے تھے۔ عربی کی درسی کتابیں مولوی رشید الدین صاحب اور مولوی فضل حق صاحب و مولانا مولوی محمد حیات صاحب اور بعض کتب عربیہ و فارسی مفتی صدر الدین خاں صاحب اور اپنے والد بزرگوار سے پڑھیں۔

نہایت ذہین و ذکی تھے۔ ۱۵-۱۶ سال کی عمر میں علم کی تکمیل پوری کر لی تھی دلی کے تھانہ دار ہو گئے تھے۔ بہت سے معزز انگریز مولانا کے شاگرد تھے اور معزز عہدوں پر دہلی سے باہر لیجانا چاہتے تھے لیکن انھوں نے جانا پسند نہ کیا۔

طبیعت میں ظرافت اس قدر تھی کہ کوئی وقت بے لطیفہ یا ضلع و معنی کے نہیں گذرتا تھا۔

ذکر ہے ایک روز جناب ظہور اپنے ایک دوست کے ہاں تشریف لے گئے اور دروازے پر دستک دی۔ صاحب خانہ موجود نہ تھے اور ماما بے التفاتی سے پیش آئی۔ ناچار واپس ہوئے۔ رستہ میں وہ بزرگوار بھی ملاقاتی ہوئے فرمانے لگے واہ حضرت آپ مکان پر نہ ٹھیرے آپ نے فرمایا کہ حضرت میں تو حاضر رہتا مگر آپ کی نفری نے مجھے جمنے نہ دیا۔ وہ سنکر بہت ہنسے۔

ایک دوسرے موقعہ کا ذکر ہے۔ کہ آپ معہ نواب حسن علیخاں صاحب مقیم دہلی کے ہاں تشریف رکھتے تھے۔ ایک امیر صاحب اثنائے گفتگو میں نواب صاحب سے کہنے لگے کہ جیسا میرے مُہر میں یاقوت کا نگینہ سینکڑوں میں انتخاب ہے ویسا ہی اس پر ایک سجع ہے ایک لکھنوی شاعر کی تصنیف اور کاشمیری مُہر کَن کا کندہ لاجواب ہے یعنی مو عدو سخت لرزد ز شیر علی" اس وقت آپنے فرمایا کہ اس مصرعۂ ثانی بھی بدر الدین علی خاں مُہر کن دہلوی سے کندہ

کروا لیجئے۔ امیر صاحب نے پوچھا کونسا۔ آپ نے فرمایا۔

مگر زوجہ اش بے شمار دللی

اس پر نواب صاحب قہقہا مار کر ہنسنے لگے۔

۲۲ سال تک تھانہ دار رہے ۱۲۸۶ھ ہجری ۱۸ شعبان کو بمقام پاٹودی انتقال ہوا کسی نے تاریخ وفات کہی ہے۔

تھا واصل حق جو وہ ظہور مغفور

ہے سالِ وفات بھی ہم اعدادِ غفور

فیض الحسن

جوانی خوبرویوں میں ادا لائی حیا لائی
ادھر کمبخت آئی بھی تو پیغام قضا لائی

نکلکر آہ دل سے اِک نہ اِک فتنہ اٹھا لائی
مرے سر کچھ نہ کچھ طوفان کعبے کی گھٹا لائی

قیامت پر یقیں ہر کچھ اجل پہ کچھ بھروسا تھا
وہ آئیگی تو کیا لائیگی یہ لائی تو کیا لائی

یہ کچھ آنے میں آناہی یہ کچھ لانے میں لاناہی
طبیعت آئینہ کیا آئی محبت زنگ کیا لائی

وہ خود پردہ میں کب بیٹھے وہ خود پردے سے کب نکلے
نظر تک شوخیاں لائیں مگر دل تک حیا لائی

ادا تجھکو قضا مجھکو جفا تجھ میں وفا مجھ میں
جو وہ آئی تو کیا لائی جو یہ آئی تو کیا لائی

ہماری پائمالی کی نہ پائی داد یا پائی
ہمارے خون کی مہندی نہ لائی رنگ یا لائی

فلک نے کچھ اڑایا رنگ میری تیرہ روزی کا
زمیں پر کچھ مری قسمت کی گردش آسیا لائی

نہ چھوڑا کچھ قیامت کے لئے رفتار نے تیری
یہ فتنہ بھی اٹھا لائی وہ فتنہ بھی اٹھا لائی

ابھی دل تھا ابھی پہلو میں ہر کچھ درد سا یارب
نگاہِ شوخ کیا لیکر گئی تھی اور کیا لائی

کبھی دل سے جگر تاکا نگاہِ فتنہ زا اچھا
یہ پہلو دوسرا بدلا یہ ناوک دوسرا لائی

نگاہ خشمگیں انکی ادائے شرمگیں انکی
کوئی فتنہ اٹھا لائی کوئی جادو جگا لائی

سہارا ہو گیا کچھ مرنے جینے کا شب وعدہ
دعا دل سے گئی بابِ اثر سے مدعا لائی

ترے در تک فغانِ بے اثر پہونچی تو کیا پہونچی
ترے در سے دعائے نارسا لائی تو کیا لائی

خبر کچھ انتہائے منزلِ مقصود کی ثاقب
نہ بخت نارسا لایا نہ عمر بے وفا لائی

شاہین و دراج

گذشتہ اشاعت سے آگے

فراق اور دھوکا

تارے چمکنے اور چھپے! چاند گھٹا اور بڑھا! دن نکلے اور ڈھلے! راتیں آئیں اور گئیں! نظامِ عالم کے تغیرات! کیا جاڑا کیا برسات کیا دن اور کیا رات! ہوئے اور کھلم کھلا ہوئے! رتیں پھریں موسم پلٹے زمانہ بدلا! کلیاں پھول ہو ہو کر مُرجھائیں! پھول کھل کھل کر کملائے! ہری بھری شاخیں سرسبز و شاداب پودے دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈ ہو گئے اور سوکھی کھڑ کھڑ ڈالیاں آناً فاناً میووں سے لد گئیں!!

کارخانۂ قدرت کا ہر ذرہ متحرک اور حیاتِ انسانی کا ہر حال متغیر مگر قیام تھا تو غریب دراج کی مصیبت میں! ہر چند کوشش کرتا کہ کسی طرح دلِ نوگرفتار کو تسکین ہو لیکن شاہین کا فراق "بلاے بے درماں"! ایسا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا کہ چند ہی روز میں مُردوں کی سی صورت ہو گئی! دیوانہ وار ادھر اودھر پھرتا مضطرب و بیقرار ہر طرف جاتا مگر خدا بھلا کرے جشنِ نوروز کا کچھ ایسی گھڑی کی آگ لگی کہ جتنا بجھاتا تھا اتنی ہی زیادہ بھڑکتی تھی۔! اہنیں! دوست آشنا! عزیز اقارب! اپنی اپنی جگہ سب ہی نے سمجھایا مگر کیسی درستی اور کس کی اصلاح کہاں کی بھن اور کدھر کا بھائی وہ اسکو ایسے تھے جیسے گائے کو قصائی۔ محل کے نیچے جاتا ٹھنڈے ٹھنڈے سانس بھرتا! جنگلوں کی سیر کرتا! بیدانوں کی خاک اوڑاتا وحشیوں کی طرح رہتا

دیوانگی کی طرح پھرتا ! زابلستان کا وحشت خیز جنگل ! دوپہر کا سنسان وقت ! نصف النہار کا سورج سر پر ! ببولوں کے زرد زرد پھول دائیں بائیں ! دریائے زلال جہاں آدمی نہ آدم زاد آنکھ کے سامنے ! اور شاہین کا شیدائی دیوانہ و سودائی وراج خانہ برباد اپنی محبوبہ کی یاد میں صبح کو دوپہر اور دوپہر کو شام کرتا ! آخری مہینے کی اندھیری راتیں اُن ہولناک دروں میں بسر ہو جاتیں جہاں دن دہاڑے جاتے کلیجے دہلتے تھے ! دوسرے تیسرے دن گھنٹہ آدھ گھنٹہ کو گھر جاتا تھوڑا بہت کھا پی جدھر منہ اٹھا چمپت ہوا۔ وہی وراج جو کسی وقت پکا سیر بھر اناج اس طرح نمٹاتا کہ بھورا تک نہ بچے دو دو تین تین دن کے بعد آدھ پا تین چھٹانک کھا لیتا ہوگا وہ بھی کچھ عزیزوں کی زبردستی کچھ محبنوں کا کہنا سُننا ! انجام یہ ہوا کھانے سے کی لاپروائی غم سے پڑا پالا تسکین ہوئی نہیں طاقت تھی کہ دن بدن گھٹنے لگی سکت و توانائی رفو چکر کس بل غائب غلہ۔ ہاتھی جیسا ڈیل سوکھ کر کانٹا ہو گیا ! انگوٹھی پر نثار رومال پر قربان خیال پر فدا دو مہینے کا فراق قیامت کا سامنا تھا جسنے ہوش و حواس سب کھو دیئے ! ایک دفعہ رات کے وقت کنار دریا پر بیٹھا شاہین کے خیال میں غرقاب تھا نگاہ آسمان پر جا پہونچی چاند مدّہم پڑ چکا تھا ! تارے ٹوٹ ٹوٹ کر جھڑ رہے تھے ! کچھ دیر تک دیکھتا رہا اور پھر بے ساختہ چلا اوٹھا

ہاں ہاں سات سہیلی کے گچھے "نکل نکل" "چھپ چھپ کے نکل" اور ماندہو ہو کے چمک" مگر شاہین کی صورت نہ دکھائیو" ابھی یہ الفاظ ختم نہ ہوئے تھے کہ ایک سانڈنی سوار روشنی ہاتھ میں لئے قریب آیا اور کہا۔

مرزا صاحب ! میں صبح سے تلاش کر رہا ہوں یہ ملکہ بلند اقبال کا خط ہے"

سانڈنی سوار خط دیکر رخصت ہوا ! رات کا پچھلا پہر ! اندھیرا گھپ چاروں طرف

خیال دوڑایا مگر شہباز خاں کے سوا کوئی اور ایسا سمجھ میں نہ آیا جو اس راز میں شریک ہوتا! نہال نہال بشاش بشاش اوچھلتا کودتا وہیں پہونچا! شہباز خاں ایک چلتا ہوا آدمی چھوٹوں کا بادشاہ! مکّار ونکا پیر! اوس نے پہلے ہی اصلی خط جو طلبی کا تھا تیر کر دیا اور فرضی خط کہ

"میں آج کے چوتھے روز زابلستان آتی ہوں" درّاج کو پہنچو ادیا

خط کھولا پڑھا! خوشی کے مارے اوچھلنے لگا! شاہین کے خط کا یقین ایک ایسی زبردست تسکین تھی جس نے اُس تمام رنج والم کو فرحت وانبساط سے بدل دیا! جان میں جان آگئی! کبھی سر پر رکھتا کبھی آنکھوں سے لگاتا! کھولتا بند کرتا! رکھتا اوٹھاتا! خدا معلوم اُس کاغذ کے پرزہ میں کیا جادو تھا کہ وہ افسردگی اور خموشی سب جاتی رہی! آمد کا انتظار! امید دیدار! اشتیاق ملاقات! چار دن اور چار رات کاٹنے قیامت تھے! ایک ایک لمحہ ایک ایک سال زندگی اجیرن جان وبال غرض خدا خدا کر کے تین دن گذرے۔

شہباز خاں وزیر اعظم شروع ہی سے تاک میں تھا موقعہ کو غنیمت اور فرصت کو نعمت سمجھ ویسی ہی انگوٹھی اوس ہی جیسا رومال تیار کرا کر چپ چاپ ہو بیٹھا!

چوتھے روز صبح کے وقت درّاج اونگلی میں انگوٹھی ہاتھ میں رومال شہباز کے جال میں پھنسا بیٹھا تھا کہ ایک خادم نے آکر کہا پانی طیار ہے۔

(شہباز) مرزا صاحب۔ اب آپ غسل فرما کر پوشاک تبدیل کیجئے انگشتری اور رومال میرے پاس رکھ جائیے۔

شہباز! چالاک عیار فیلسوف! درّاج اگیگلا مسکین بیوقوف! زبردست کمزور کا مقابلہ کیا! شہباز اور درّاج کی جوڑ کیسی! دو باتوں کا مہمان دو چلکوں کا

محتاج! درّاج بیچارے کی ہستی ہی کیا تھی! بڑے بڑے مدبر اور اچھے اچھے دوراندیش شہباز کے آگے کانونہر ہاتھ دھرتے تھے درّاج توکس گنتی میں تھا آغا کا لال باڑہ پر چڑہ! انگوٹھی اور رومال دہ لو بدلو ابیٹھا!

دوپہر ہوئی شام ہوئی! کیسی گاڑی کسکا گھوڑا کہاں کی ملکہ کدہر کی شاہین! سواری نہ شکاری! وہ تو شہباز کا حاشیہ تھا جسکی درّاج کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی وہ اُس تحریر کو نوشتۂ تقدیر سمجھ رہا تھا ساری رات محل کے نیچے اس امید پر گذار دی شہزادی آئے اب آئے۔"

عقل کا اندہا اتنا نہ سمجھا! زابلستان کی مالک اتنی بڑی سلطنت کی شہزادی لاکھ چپ چپاتے آئے! فوج نہیں ہمراہی! ہمراہی نہیں اردلی! اردلی نہیں نوکر! سو پچاس دس بیس کچھ تو ہونگے! صبح ہوئی تو جلا بھنا چین بر جبین کھسیانی مورت رونی صورت شہباز کے پاس پہونچا! تقدیر سے صلاح کار بھی ملا تو ایسا کہ اوس نے ایک ہی وار میں تسمہ بھی نہ لگا رکھا بہ ظاہر تو ہاں میں ہاں ملا تا رہا اور اندر خانے دراج کا اوٹھکر جانا تھا! دس آدمی ہمراہ انگوٹھی رومال قبضہ میں کر معمولی سامان ساتھ لے اصفہان جا دھمکا۔ شاہین کیسی ہی ہوشیار کتنی ہی سمجھدار لاکھ دوراندیش ہزار منتظم و سلیقہ شعار کچھ ہی تھی مگر تھی تو عورت اور اگر عورت نہ بھی ہوتی تو شیطان نہیں فرشتہ نہیں ولی نہیں خدا نہیں اوسکو ان چتروں کی کیا خبر کہ یہ بڑا چنڈال ٹُھس میں جنگی ڈال جما لو دور کھڑی کی مثل کو اصل کر رہا ہے سیدہے سبھاؤ دراج کا حال پوچھنے بیٹھ گئی

(شہباز) شہزادی! وہ زابلستان کا مشہور بدچلن اوباش! چھٹا ہوا بدمعاش آپ نے پیٹھ پھیری اوسنے دوسرا شکار جا پہاں جمعدار شیر افگن سے تو سرکار واقف ہیں دن رات اوسکی سالی کے ہاں پڑا رہتا ہے۔ سنتا ہوں نکاح بھی ہوگیا! اُس

نمک حرام نے جو جو کچھ مشہور کیا میری تو زبان بھی نہیں اولٹ سکتی سیر کی ہنڈیا میں
سوا سیر پڑا اوبل گئی! آپ نے تو معاوضہ احسان کیا وہ سمجھا ملکہ کی نیت ہی کچھ اور
ہے! بھلا وہ ذلیل شرافت سے کورا مزاج کا چھچھورا آپ کی عنایتوں کے قابل
تھا اُس کمبخت کی وجہ سے تو تمام شہر میں ڈھنڈورا پٹ رہا ہے اور بستی بھر میں
ناک کٹ رہی ہے ایسا شخص تو صورت دیکھنے کے قابل نہیں۔ (انگوٹھی اور
رومال آگے ڈالکر) یہ عطیہ شاہی اور جمعدار کی سالی جیسی واہی تباہی عورت! گستاخی
معاف! آپ نے بھی کمال کیا! ایک معمولی آدمی کو یہ کچھ اعزاز بخشا! موری کی
اینٹ چوبارے چڑھی! وہ تو جو کچھ نہ کرتا وہ تھوڑا وظیفہ تنخواہ سالانہ ماہانہ جو جی چاہتا
مقرر فرماتیں یہ روز کی کراچھی لگائی! باپ دادا کی عزت بڑوں کی لاج سب دراج
کی نظر ہوگئی! بچے سے لیکر بڈھے تک کیا مرد اور کیا عورت جدھر جاؤ یہی مذکور
اور جہاں دیکھو یہی چرچا سنتے سنتے کان تھک گئے اور دیکھتے دیکھتے کلیجہ
پک گیا!

شہباز اپنا دام تزویر بچھائے کھڑا تقریر کر رہا تھا اور شاہین کی یہ کیفیت کہ ایک
رنگ آرہا تھا اور ایک جا رہا تھا انگوٹھی رومال دیکھتے ہی آگ بگولا ہوگئی شہباز
جھوٹا تھا خواہ سچا مگر وزراج سامنے ہوتا تو وہ کچا کھا جاتی! منہ سے بات نہ نکلتی
تھی بدن تھر تھر کانپ رہا تھا اصفہان کا ایک ایک لمحہ وبال ہوگیا کہتی تھی کسی
طرح پر لگ جائیں اوڑکر پہونچوں اور اس نابکار کا سر اوڑا کر کلیجہ ٹھنڈا کروں! منتظر
تھی اُوسکے آنے کی یہاں جو دیکھا تو معاملہ ہی اولٹ پلٹ۔ کہاں کی تعمیل اور کسکا
آنا رنگ ہی دوسرا تھا تلووں سے جو لگی تو مغز تک پہونچی آؤ دیکھا نہ تاؤ سب جھگڑے
چھوڑ چھاڑ وزیر کو ساتھ لے جھٹ پٹ زابلستان روانہ ہوگئی!

مرضِ متعدی

شہباز کی روانگی لاکھ پوشیدہ ہو مگر اتنا بڑا آدمی وزیر سلطنت! جانے کی دیر تھی تمام شہر میں مشہور ہو گئی! دُرّاج کا ماتھا تو سُنتے ہی ٹھنکا تھا مگر سیدھا آدمی دل آئینہ۔ حسد یہ کینہ بات کا پورا قول کا سچا بہتیری ہی عقل لڑائی لیکن بات کی تہ کو نہ پہونچا، انتظار کی حد صبر کی انتہا ایک آدھ روز تو بہت ہی سخت مصیبت میں رہا دیواروں سے ٹکریں ماریں پہاڑوں سے سر پھوڑے مگر خدا کی شان دیکھو کوڑھ میں کھاج مفلسی میں آٹا گیلا ابھی وہ مصیبت ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک اور آفت کا سامنا ہوا۔

جمعہ کی صبح کو سیدھے ہاتھ میں سپید سپید ہلکے ہلکے دھبتے دکھائی دیئے دھبے دیکھنے میں تو معمولی تھے مگر جلن اور کھولن کس غضب کی کہ الامان الحفیظ شام تک تو سارا ہاتھ سوجکر کپّا ہو گیا! رات کس مصیبت کی کٹی ہے کہ خدا دشمن کی بھی ایسی نہ کاٹے۔ صبح کو تو مرض کی حالت ہی کچھ اور تھی! جسم بھر میں پھپولے اور اُسمیں سوزش! اِدھر فراق کی چھریاں اودھر مرض کے نشتر مجبور معذور علاج کا قصد کیا! سلطنت کا طبیب حاذق اسفندریار کچھ دیر تک تو غور سے دیکھتا رہا اور پھر تو اس طور سے بھاگا کہ سب متعجب ہو گئے دور جا کر کھڑا ہوا اور وہیں سے للکارا۔

بہتر ہوگا کہ آپ چلے جائیں یہ ایک ایسے مرض متعدی کی ابتدا ہے جسکا علاج خدا کے ہاں بھی نہیں مجکو اندیشہ ہے کہ آپ کی وجہ سے یہ بیماری تمام سلطنت میں نہ پھیل جائے جسکو آپ کی ہوا بھی لگے گی وہ اِس آزار میں گرفتار ہوگا! دراج بدنصیب کے واسطے اِس سے زیادہ مصیبت کا وقت اور کون سا ہوتا

طبیب کے الفاظ نے ساری ہی امیدوں کا خاتمہ کر دیا آسمان کی طرف دیکھکر خدا کا شکر کیا اور کہنے لگا

"آہ! خالق الموجودات ایک بھی ارمان پورا نہ ہوا"

مرض کی تکلیف لمحہ بہ لمحہ زیادہ ہو رہی تھی مگر شاہین کا خیال دم بھر کو بھی پیچھا نہ چھوڑتا تھا! گو جسمانی تکالیف نے جان پر بنادی تھی لیکن روحانی تکالیف سے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر آپ ہی آپ کہنے لگا۔

"اب گل اندام شاہین کے قریب جانا! ایسی محسنہ اور ایسی حسینہ کو جان بوجھکر آزار لگانا تقاضائے محبت نہیں ہے"۔

آمنا سامنا

شام کا وقت قریب تھا! درّاج حسرت نصیب پژمردہ و نڈھال لوگوں سے بچا سڑک کے کنارے چلا جا رہا تھا کہ شاہین کی سواری نظر آئی! کیسا دردانگیز سماں تھا یہی درّاج جسکے دل میں ہزاروں ارمان بھرے تھے بصد حسرت و یاس شاہین کو دیکھنے لگا! درّاج کی صورت دیکھتے ہی شاہین کی آنکھوں میں خون اتر آیا حکم دیا

"فوراً محل پر حاضر ہو"

حسرت بھرا دل یہ حکم سنکر گم سم رہ گیا آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے کلیجہ کسمسانے لگا مگر سچی محبت نے تعمیل کی اجازت نہ دی!

شاہین آگ بگولہ محل پونچی! جوں جوں درّاج کے آنے میں دیر ہو رہی تھی غصہ اور زیادہ بھڑک رہا تھا! جو آدمی گیا وہ واپس جو پیغامبر بھیجا وہ ناکام!

بات دل میں بیٹھ ہی چکی تھی دیر اور پھر دیر پر انکار! حق الیقین ہوگیا جلتی بھلستی
سانپ کی طرح سرد غنقی باہر آئی اور شہباز کو طلبی کے واسطے روانہ کیا! اندھا
کیا چاہے دو آنکھیں اس سے بہتر موقعہ اور کونسا ملتا ادھر اودھر پھر آن
موجود ہوا اور کہنے لگا۔

وہ اُسی جمعدار کے ہاں بیٹھا بنکار رہا ہے! مجھسے بات بھی نہیں کی اندر
ہی سے کہدیا! ملنے کو جی چاہتا ہے تو شہزادی خود کیوں نہیں آجاتی!

نمکحرام شہباز ایسا ہاتھ دھوکر پیچھے پڑا کہ آخر غریب دراج کی جان لے کر
چھوڑی! اب کیا کسر رکھی! لال پیلی پہلے ہی ہو رہی تھی اتنا سنتے ہی آنکھوں میں
اندھیرا چھا گیا! وزیر کو دیکھا اور حکم دیا

"گرفتار کرو اور علی الصباح سر بازار سولی دو"

قتل

شہباز تو خدا سے چاہتے تھے آرزو تھی تو یہ! ورارمان تھا تو یہ حکم سنتے ہی
جان میں جان آگئی! کوتوال کو ساتھ لے چشم زدن میں گرفتار کر جیلخانہ بھیجدیا!
حکم شاہی سوئی نہ تھا کہ چھپ جاتا چھ گھڑی کی توپ چلے تک تو بچہ بچہ کی زبان
پر دراج کا چرچا تھا! صبح ہوتے ہی ادہر شہباز خاں ایک طرف جنگی جوان دوسری
طرف برق انداز دراج کو مقتل میں لیکر حاضر ہوا ! ادھر شعبانہ دراج کی چھوٹی بچی
ننگے سر ننگے پاؤں مقتل میں آئی! حسرت بھری نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا
کچھ دیر تک تو حیران پریشان چپ کھڑی رہی پھر فرط محبت سے بیقرار
ہوکر چلا اوٹھی۔

"بابا میں بھی آؤں"

بیٹی کی اس صدائے جگرخراش نے باپ پر ایک عجیب حالت طاری کردی! گردن میں طوق تھا بمشکل پھیر کر دیکھا! دراج کی نگاہ کا پڑنا تھا کہ شعبانہ بے تابانہ آگے بڑھی اور باپ کے پاؤں میں جا لپٹی اور منہ اٹھا کر اسکے چہرے کو تکنے لگی! زنجیر کا کانٹا جو ہاتھ میں پڑا تھا اپنے ہاتھ سے ہٹا کر پوچھنے لگی۔

"بابا! ہاتھ مڑ گیا! حلقہ چبھ رہا ہوگا؟

معصوم بچی کی بھولی بھولی باتوں نے مظلوم باپ کے کلیجے کے ٹکڑے اڑا دیئے ہتھکڑی بندھی ہوئی تھیں نیچے بیٹھ گیا اور بچی کو چھاتی سے لگالیا! محبت نے جوش کیا آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے باپ کو روتا دیکھ شعبانہ چیخیں مارنے لگی۔

باپ بیٹیوں کی آخری ملاقات کا منظر کچھ ایسا موثر تھا کہ شہباز جیسا سنگدل آدمی بھی دم بخود رہ گیا۔ طوق کے ساتھ ہی ساتھ ننھے ننھے ہاتھ باپ کی گردن میں پڑے تھے! محبت بھری نگاہ ہونے چہرے کو تک رہی تھی اور ننھا سا حسرت بھرا دل دھکڑ دھکڑ کر رہا تھا! چار پانچ برس کی بچی کی بساط ہی کیا! باپ چند لمحہ کا مہمان تھا اور وہ پانچ برس کی جان کچھ ایسی باتیں ملکا رہی تھی کہ سب گم سم تھے باپ کے منھ پر منھ رکھدیا اور نہایت خوشامد سے کہنے لگی۔

"اچھا بابا! اب گھر چلو!

بیٹی کی یہ درخواست ایک تیر تھا جو باپ کے کلیجے کے پار ہوگیا پیار کیا چمکارا سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

بس! میری جان اب باپ کو خیرباد کہہ"

خاتمہ

گرمی کا موسم صبح کا سہانا وقت! ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھوکے! مقتل

زابلستان سے ملا ہوا ایلغاری قبرستان "دنیائے ناپائیدار کی بلند صدائیں لگا رہا تھا! سنگ مرمر کے سپید مزار حیات انسان کی بے ثباتی کا پیش خیمہ تھے! کچی پکی قبروں کے بسانیوالے جو اپنے گھر بار کو چھوڑ پیاروں سے منہ موڑ بے خبر سوتے تھے جسدِ خاکی کے استقبال کو صف بستہ کھڑے وتراح بے گناہ کے عبرتناک قتل کو چشم افسوس سے دیکھ رہے تھے! ان مٹ جانیوالی صورتوں میں بہت سے ایسے تھے جو عمر بھر اپنی غرض کے بندے رہے۔

فاتحہ نہ درود بھیجئے تو فضول، مرے تو مردود! تن پروری کو مقصدِ حیات سمجھکر وقت پورا کر آئے اور خود غرضی کو سب سے بہتر اصول سمجھکر زندگی ختم کر دی!!! جسد ناپائیدار کی جھوٹی سچی نشانیو! آج کوئی اتنا نہیں کہ تمہارے مٹی کے ڈھیر و نیز دو پھول چڑھا دے! تمہارے ارادوں کے ساتھ تمہارے نام مٹ چکے اور تمہاری جان کے ساتھ تمہارے کام پورے ہوئے! مگر ہاں! بدنامی کے چھپّر تمہاری قبروں پر چھائے ہوئے ہیں! تمہارے مشیر و صلاح کار خود غرضی و دل آزاری ابھی زندہ ہیں اور بزم دنیا میں تمہارے اوپر ٹھٹے لگا رہے ہیں!!!

اِن ہی اینٹ پتھروں کے ساتھ بڑی بڑی سلوں کے نیچے ایسی صورتیں چھپی ہیں جن کی خاک کا ایک ایک ذرہ گوہر آبدار کی طرح چمک رہا ہے! کارخانۂ قدرت کے پکے اصول انکا سلسلہ حیات منقطع کر چکے مگر ان کے مبارک نام چمنستانِ حیات میں شاداب پھولوں کی طرح لہلہا رہے ہیں! عالم امکان انکی خوشبو سے معطر ہے! خلوص و صداقت کے ٹھنڈے اور میٹھے چشمے ان بار آور پودوں کو سینچ رہے ہیں:

اے منزلِ مقصود پر پہونچ جانیوالو! تم دنیائے ناپائیدار سے رخصت ہوئے تمہارا نام صفحۂ ہستی سے مٹ چکا تمہاری ہڈیاں خاک ہو چکیں مگر اے پردیسی مسافرو تمہارا زمانۂ قیام نعمت و برکت تھا تمہاری زندگی ایسے گلہائے رنگیں سے

آراستہ تھی جو قیامت تک نہ مرجھائینگے! تمہارا نام چمنستان قدرت میں گل خوشرنگ ہوکر کھلا اور بساطِ زندگانی میں بقائے جاودانی کی خوشبو سے ممتاز ہوا! تمہارے ٹوٹے پھوٹے مزار اُن ذرّوں کی خوابگاہ ہیں جنکے آگے قرص بار دہم ماند ہے۔

آج بلغاری قبرستان میں بزم شہدا ازجی ہوئی ہے وضعداری کے ہار گلے میں پڑے ہیں سچی محبت کے طرّے سروں پر ہیں! ایک کشتی زرنگار خون ناحق کے خوان پوش سے ڈھکی بیچ میں رکھی ہے جسمیں اخلاق و محبت کا سہرا چنا ہے بڑے بڑے وفادار اچھے اچھے وضعدار آغا کے لال درّاج بدنصیب کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں!!!

سولی کا تمام سامان تیار ہوگیا درّاج بدنصیب بچی کو کلیجے سے لگائے بیٹھا تھا! شہباز کے حکم سے ایک شقی القلب محافظ نے شعبانہ کو باپ کی گود سے چھینا اور زبردستی پکڑ کر علیحدہ کرنے لگا! وہ نہایت ستم انگیز وقت اور دردناک سماں تھا! بچی باپ کو چمٹی ہوئی چیخ رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

بابا! بابا! تم میرے ساتھ گھر چلو

لیکن وہ سنگدل محافظ گھسیٹ کر الگ کر رہا تھا آخرکار زبردستی اور بہ زور وظلم جھٹکا دے کر الگ کھڑا کر دیا۔ بچی مجبور، باپ معذور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے! شعبانہ بلک رہی تھی اور محافظ سے بہ منت کہہ رہی تھی!

"مجھکو میرے باپکے پاس رہنے دو تمہارا کیا ہرج ہے"

ایسے عبرتناک موقعہ پر جہاں بچہ اور بڈھا سب کی آنکھ سے آنسو جاری تھے درّاج نے شہباز کی طرف دیکھ کر کہا!

"وزیر اعظم! چھ بچوں میں یہ ایک بچی بچی تھی جو آپ کے ہاتھوں آج ہمیشہ کے واسطے جدا ہوتی ہے"

سواری شاہین کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا شعبانہ چیختی چلاتی رہی اور شہباز دراج کو سولی پر لے گیا!

شہزادی نے مقتل میں داخل ہوتے ہی وزیر کو حکم دیا۔

"دُرّاج سے پوچھو کوئی آخری درخواست ہے"

وزیر نے آگے بڑھکر دُرّاج کو حکم سنایا جس کے جواب میں اوسنے باواز بلند کہا۔

"ہاں ہے! اور وہ یہ کہ اس وقت بھی شہزادی کی صورت نہ دیکھوں"

اب کیا باقی تھا! اوسی حالت غیظ و غضب میں اجازت دی اور چشم زدن میں مظلوم دُرّاج کا خاتمہ ہو گیا۔

دُرّاج کا کام تمام ہونے کے بعد شاہین واپس جانے کو تھی کہ جلاد نے حاضر ہو کر ایک پرچہ دیا اور کہا۔

"یہ مقتول کی وصیت ہے"

وہیں کھڑے کھڑے کھولکر پڑھنے لگی لکھا تھا کہ

آہ! ملکہ گل اندام! دراج بدنصیب اب اس قابل نہ رہا کہ شہزادی کے پہلو میں جگہ پائے! دل کے ارمان دل ہی میں رہے اور تقدیر نے تمام خواہشوں کا خاتمہ کر دیا! شاہین! ہائے شاہین!! مرض متعدی نے جیتے جی مردہ بنادیا اور اس لایق نہ رکھا کہ تیرے حکم کی تعمیل کر سکوں!

خوبیوں بھری ملکہ! دل گوارا نہیں کرتا کہ دُرّاج کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور شاہین کو آزار ہو میری بیگناہی کا یقین کرنا بے قصور ہوں اور دل سے مجبور! خدا اُس وقت سے پہلے مجھکو موت دے کہ میں سامنے آکر کھڑا ہوں اور میری ہوا تجھ تک پہونچے! دل تڑپ رہا ہے جان نکل رہی ہے کلیجے پر چھریاں چل رہی ہیں، ارمان ہے کہ کسی طرح ایکدفعہ صورت اور دیکھ لوں مگر

نہیں! نہیں! شاہین گل اندام یہ تقاضائے محبت نہیں ہے۔!

الحمد للہ دعویٰ محبت پورا ہوا اور دُرّاج بدنصیب اپنی شہزادی پر قربان! ملکہ دنیا کی خوبیاں تیرے ساتھ ترقی اقبال روز افزوں! میرا غم نہ کیجیو۔ سچا فرمانبردار تھا جان نثار کر دی۔

شاہین! دنیا فانی ہے کوئی چیز قائم رہنے والی نہیں! میں مرچکا ہونگا جسدِ خاکی گل چکا ہوگا مگر چشم پامال سے دیکھنے والے پرکھ لیں گے کہ دُرّاج بدنصیب محبت کی کسوٹی پر بارہ رس کی طرح چمکا اور کندن کی طرح نکلا۔ تقدیر کی خوبی تھی کہ شہباز نے دوستی کے پردے میں دشمنی کی ہمراز بنا جعلساز نکلا! بہر حال میں خوش نصیب ہوں کہ ارمان پورا ہو گیا اور آج دُرّاج اپنی محبوبہ پر فدا ہوا

دکھیاری ماجس نے پال پوس کر اتنا بڑا کیا اور جسکی تقدیر میں جوان بیٹے کا داغ لکھا تھا ماتا کی ماری مقتل میں آئے گی اگر قتل کے بعد غصہ فرو ہو جائے تو یہ بیکار جسم جو اُوسکی تیس اکتیس برس کی امانت ہے اُسکو دیدیا جائے کہ زندہ دیکھکر خوش ہوتی تھی مردہ دیکھکر تسکین ہو اور دراج بیگناہ کی لاش پیوند زمین ہو جائے

آہ ملکہ! آہ شاہین ہائے شہزادی اب کلیجہ اُمڈا چلا آتا ہے میری خطا معاف میرے قصور سے درگذر۔ میری غلطی سے چشم پوشی، میری تابعداری کا یقین، میری وفاداری کا اعتبار! بس ملکہ فی امان اللہ! خدا تیرا نگہبان اور حافظ۔ باقی دارد

راشد الخیری

کلام اکبر

جناب سید اکبر حسین صاحب جو خاص عنایت مخزن کے حال پر فرماتے رہے ہیں اسکا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا حال میں جب ہم نے اُن سے درخواست کی کہ کچھ کلام ارسال فرمادیں۔ کیونکہ جو موجود تھا چھپ چکا۔ تو اُنہوں نے باوجود نازکی طبع اور مصروفیت کاروبار ذاتی کے ہماری درخواست پر توجہ فرمائی ناظرین مخزن یہ سنکر خوش ہونگے کہ رباعیات اکبر کا ایک نہایت عمدہ مجلد ایڈیشن تیار ہوا ہے جسمیں مصنف کی اخلاقی رباعیات ایک مناسب ترتیب سے جمع کیگئی ہیں

وقتِ طلوع دیکھا وقتِ غروب دیکھا ۔۔۔ اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا
اُسنے خدا کو مانا وہ ہو رہا بتوں کا ۔۔۔ یا اُسنے خوب سمجھا یا اُسنے خوب دیکھا
نامِ خدا کو اکثر زیبِ زباں تو پایا ۔۔۔ عشقِ بتاں کو لیکن نقشِ قلوب دیکھا
اوروں پہ معترض تھے لیکن جو آنکھ کھولی ۔۔۔ اپنے ہی دل کو ہمنے گنجِ عیوب دیکھا

مشکل ہے دوستی کا اُس سے نباہ اکبر
جس نے ہنر نہ دیکھا سوئے عیوب دیکھا

شیطان ہے دل جو نورِ ایماں نہ رہے ۔۔۔ دشمن ہے زباں جو وردِ قرآں نہ رہے
کہتی ہے یہ ہسٹری بآوازِ بلند ۔۔۔ تم کچھ نہ رہے اگر مسلماں نہ رہے

چلکر آیا اِک ایسا جھولا جھولے ۔۔۔ قومی عزت کی ہسٹری کو بھولے
جنت کا خیال ہے نہ باغِ دل کا ۔۔۔ گملوں ہی پہ اب تو رہتے ہیں ہم پھولے

یہ جلوۂ حق سبحان اللہ یہ نورِ ہدایت کیا کہنا ۔۔۔ جبریل بھی ہیں شیدا اُنکے یہ شانِ نبوت کیا کہنا
وہ کفر کی ظلمت دور ہوئی اور محفل دیں پُر نور ہوئی ۔۔۔ یہ مہر ہدیٰ سبحان اللہ یہ صبح سعادت کیا کہنا

جس دل میں ہو پرتو کرسی عرش اس دل کی بلندی صلِ علیٰ جس سینے میں قرآں اترا ہو اس سینے کی عظمت کیا کہنا

تسبیح سے دنیا گونج اٹھی تکبیر کا غل تا عرش گیا تاثیر ہدایت صلِ علیٰ یہ جوشِ عبادت کیا کہنا

نغمہ ہے ترا دلکش اکبر مضمون ہے ترا پاکیزہ و تر

بلبل کے ترانے صلِ علیٰ پھولوں کی لطافت کیا کہنا

کوئل

او چمن کی اجنبی چڑیا! کہاں تھی آہ تو کیا کسی صحرا کے دامن میں نہاں تھی آہ! تو

تیرے دلکش زمزمے تھے سبزہ زاروں میں خموش آشیانہ تھا ترا گلشن میں بزمِ بیخروش

کھینچتی وقتِ سحر دلکو تری کوکو نہ تھی چھاؤں میں تاروں کی محوِ نغمۂ دلجو نہ تھی

موسمِ سرما میں اے سرمایۂ صبر و شکیب بے صدا تیرا لبِ پردہ تھا سازِ دلفریب

مرحبا اے پیکرِ پیکِ سبک گامِ بہار لے کے پھر تو گرمیوں میں آئی پیغامِ بہار

تو ادھر آئی فضائے گل کا دور آیا ادھر تو نے گائے گیت۔ اور آموں پہ بور آیا ادھر

طائرانِ باغ نے چھیڑا ہے سازِ انبساط تیرے مقدم میں ہیں شاخوں پہ ہم آہنگِ نشاط

پہنی ننھی ننھی کلیوں نے قبائے شبنمیں آ رہی ہے کان میں تیری صدائے دلنشیں

کوئی انجم آسماں کا او سبک پروازِ شوق رہنما ہے کیا ترا۔ دلدادۂ اندازِ شوق

تو جو آئی والیِ موسم کا نشاں باقی ہوئی اپنی منزل پر پہنچ جاتی ہے یوں گاتی ہوئی

تیرے مقدم میں شکیبِ خاطرِ ناشاد ہیں موسمِ گل کو بھی دیتا ہوں مبارکباد میں

تو چمن میں اڑ کے کیا آئی کہ آ پہنچی بہار گا رہی ہیں چھوٹی چڑیاں سبز کنجوں میں ملار

دامنِ رنگیں میں اک دوشیزۂ ناکتخدا چن رہی ہے ننھی ننھی سرخ کلیاں خوشنما

اور تجھ سے ہم سرودِ نغمۂ اعجاز ہے
بزمِ قدرت میں تری گویا شریک ساز ہے

میٹھے نغمے گانیوالی او چمن کی نازنیں
ہے تر و تازہ ہمیشہ تیرا گنجِ دل نشیں

اور مصفا ہے فضائے آسماں تیرے لئے
ہے شفق جامِ شرابِ ارغواں تیرے لئے

تیرے نغموں میں اثر اندوہ و حرماں کا نہیں
سال میں تیرے گزر فصلِ زمستاں کا نہیں

مجکو قسامِ ازل دیتا اگر دو بال و پر
اُڑ کے ہوتا میں بھی تیرے ساتھ سرگرمِ سفر

بن کے ہم دونوں رفیقِ موسمِ جوشِ بہار
کرتے خوش خوش ہر برس گلگشت دشت و کوہسار

سرور جہان آبادی

قومی عمارت

وفائے گل کی دیتے ہیں شہادت غنچے سو منہ سے
جہاں بو ہے شکایت کی نہ بلبل کے ترانوں میں

نہیں ہے جسکے کاشانوں میں قید مذہب و ملت
گزر شیخ و برہمن کا ہے جسکے آستانوں میں

مکیں ہے اسکی کل خلقت بلاتخصیص رنگ و دیں
جہاں سنتے ہیں اک ہی شبد ناقوس اور اذانوں میں

کلیسا اور مندر دیر و حرم سب جسکے سایہ میں
نہیں ہے اختلاف اس قصرِ عالیشان کی شانوں میں

یہ قومیت وہاں کے ساکنوں کی ہر کہ ہندی ہے
وہ چاہے راجپوتوں میں ہوں اور چاہے پٹھانوں میں

تعصب اور غیریت ہیں کوسوں دور اس گھر سے
جہاں بیگانہ بھی آئے تو شامل ہو یگانوں میں

یہی اے ساکنانِ ہند وہ قومی عمارت ہے
کہ جسکی ساخت کی اہلِ وطن کو اب ضرورت ہے

اگر قومی حمیت کی ہے کچھ بھی حس ہندوالوں میں
زمانے نے سکھایا ہے اگر کچھ اپنے سالوں میں

بھڑکتا واقعی حبِ وطن کا سوز ہے دلمیں
عمل کی ہو اگر نیت بھی کچھ ان کہنے والوں میں

جو خونِ دل کے قطرے چند ہیں اس عرق ریزی میں
اگر کچھ دل کے ٹکڑے بھی ہیں ان آہ و نالوں میں

محبانِ وطن کا ایک ہے گر ظاہر و باطن
اگر کچھ کر دکھا لے بھی ہیں اتنے کہنے والوں میں

کسی کو ہی عمل کرنیکی استعداد اگر اس پر
پڑھا ہے تمنے جو جو کچھ تمدن کے رسالوں میں

اگر ہے اک زباں میں بھی یہ گرمی نو شتوں کی
جو اک بھی عاملِ کامل ہے اتنے باکمالوں میں

کسی دلمیں اگر حبِ وطن کی آگ جلتی ہے
ہے یوسف ایک بھی گر ان بزرگوں نونہالوں میں

جو ہے مردہ دلوں میں ایک بھی جانِ عمل کنندہ
جو اک مُرلی منوہر بھی ہو ان سب خوش جمالوں میں

تو پھر قومی عمارت کا ہے بننا حدِ امکاں میں
خدا توفیق دیتا ہے اگر ہو عزم انساں میں

یہ وہ قومی مکاں ہوگا جو کہ محسودِ جہاں ہوگا
ترقی کا یہیں سے ہند کی سکہ رواں ہوگا

یہ وہ گلزار ہے کانٹا بھی جسکا گل کھلائیگا
مشامِ دہر جس کی بو سے صدقے بیگماں ہوگا

کھلیگا داغِ الفت لالہ ساں ہر پھول کے دلمیں
یہاں بلبل کا ہر اک گل کی دلمیں آشیاں ہوگا

یہاں ہر گز نہ ہوگی سبزہ کی بیگانگی گل سے
اُٹھیگا اس زمیں سے جو وہ یکرنگی کی جاں ہوگا

نظر میں اپنی عالم ہوگا۔ عالم میں سخن اپنا
یہاں ہر پھول نرگس۔ اور ہر غنچہ دہاں ہوگا

خزاں کا اس چمن میں ڈر۔ نہ دھڑکا ہوگا صرصر کا
یہاں آزاد مثلِ سرو سارا گلستاں ہوگا

پھریرا اُسکا چھیدیگا جگر کو چرخِ اخضر کے
بلندی میں مکاں یہ اسقدر عالی نشاں ہوگا

یہ وہ حصنِ حصیں ہے مار جسکی ہوگی قطبوں تک
اسی سے ہوگا۔ گر محفوظ یہ ہندوستاں ہوگا

یہی ملجا و ماوا ہوگا ہر گبر و مسلماں کا
جہاں میں قاضی الحاجات اسکا آستاں ہوگا

جو ہوگا اتفاقِ باہمی ہندی رعایا میں
تو اس سے شاہ کی شاہی کا پلہ بھی گراں ہوگا

رفاہِ ہند۔ قیصر کی وفا جس سے عبارت ہے
یہیں رہتے ہیں وہ۔ اور انکا گھر قومی عمارت ہے

اگر ہے عشق دل میں جذب کی وہ شان پیدا کر
بدن پر ہر بن مو سے تو سو پیکان پیدا کر

اگر قومی محبت جوش زن سینے میں ہے تیرے
تو دل میں نفس کے ایثار کی تو شان پیدا کر

پڑا ہے کفر و دیں کے کیا جھمیلوں میں تو ناداں
خدا جس سے ملے وہ دین اور ایمان پیدا کر

تو خود غرضی کو چھوڑ - اور جان خلقت میں عالی کو
تو یہ زیر اک پیدا کر - تو ایسا گیان اکر

شہادت کیلئے آیا ہے کس بر تے پہ مقتل میں
تو ہر ہر رگ میں اپنی پہلے سو سو جان پیدا کر

حیات جاودانی کی تمنا ہے اگر تجکو
فنا فی القوم ہو جانیکا تو سامان پیدا کر

اگر مخدوم بننا چاہتا ہے - پہلے بن خادم
کہ ہے خدمت ہی عظمت - یہ یقین نادان پیدا کر

سراپا سوز دل تو شمع ساں پہلے دکھا بنکر
تو پھر دل میں تو بزم آرائی کا ارمان پیدا کر

مجسم بن دل صد چاک تو شانہ صفت اول
اُلجھنے کا تو پھر زلف صنم سے دھیان پیدا کر

رفاہ ملک میں تیری مساعی کارگر ہونگی
تو اپنی ذات میں سنتوش و اطمینان پیدا کر

ہو پیدا اتحاد اضداد - نیرنگی میں یکرنگی
ظہور وحدت اس کثرت میں ہو وہ شان پیدا کر

غریقان جفا کے پیچھے ڈوبے بحر عالم میں
وفا با آشناؤں کی ذرا پہچان پیدا کر

وہی جیتے ہیں دنیا میں کہ جو اوروں پہ مرتے ہیں
وہی مخدوم عالم ہیں - جو خدمت اُسکی کرتے ہیں

اگر چشم بصیرت کثرت نظارہ میں وا ہو
تو - سر جزرو مد و ہر سب نظروں میں افشا ہو

اگر ہر رنگ میں اک رنگ ہی ہم کو نظر آئے
تو پھر وحدت کا جلوہ کثرت عالم میں پیدا ہو

جو ہر مخلوق میں ہم نور خالق جلوہ گر دیکھیں
تو پھر کیوں اختلافوں کی یہاں یہ جنگ بپا ہو

جو ہو حب وطن دلمیں تو مایوسی کا کیا موقع
ہو ہمت آزما کتنا ہی غم - اور روح فرسا ہو

وہ پھوٹے دیدۂ آنکھ جسمیں ہو نہ اشک رحم و ہمدردی
وہ دل جل جائے خار غم نہیں جسمیں کھٹکتا ہو

کسی بھائی کو دکھ میں دیکھ ہو جائیں دکھی خود ہم
کہیں حب وطن کا جذب یہ دلمیں تو پیدا ہو

ارے ناداں وطن پر جان دینا ہی تو جینا ہے
نہ کیوں مرنے پہ جاں نکلے بغل میں حب بیجا ہو

نہیں وہ خادمِ قومی جو آزردہ ہوں بے دل ہوں
یہ شرطِ عشق ہے - دل پر نہ میل آئے نہ شکوا ہو

یہی گر جاں نثاری ہے، تو پھر کیا شے ہے خود غرضی
جو گم کر دے خودی کو تو - تو خود پھر شے نہیں پیدا ہو

یہ حالت حبِ قومی میں نہ جب تک آپ کی ہوگی
نہ یہ قومی عمارت اے مرے بھائی کھڑی ہوگی

کسی کو دیکھ کر کوئی وطن کا نوحہ خواں کیوں ہو
نہ جب ور دی ہی لیں - تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

نہ دو گے جان جب تک جان و تن میں کیسے ڈالو گے
نہ قرباں ہو جو خلقت پر مسیحائی زباں کیوں ہو

جو ہو اولاد میں اسکی بہم ایثار و ہمدردی
تو حرفِ رنج و ماتم مادرِ ہندوستاں کیوں ہو

وطن کی آگ میں جھکنا اگر طاقت سے باہر ہے
تو دعویٰ حبِ قومی کا یہ کیوں؟ کبھی تو امتحاں کیوں ہو

زبانی داخلہ تعمیرِ قومی میں نہیں چلتا
نہیں سر گر نثارِ قوم تو منہ میں زباں کیوں ہو

جو نالہ دل سے اٹھے کیوں نہ گھر جا کر کہی دیں
جو سچا حبِ قومی ہو تو کوئی بدگماں کیوں ہو

یہ کیا ہے گر نہیں ہے خلق کو گمراہ کر دینا
ہو جسکا سرد دل - اُسکی زباں آتش فشاں کیوں ہو

نہیں سر بیچنا منظور تو آؤ نہ میداں میں
نہیں سودا محبت کا تو اس صف میں دکاں کیوں ہو

وطن کو کر دیا بدنام ان یارانِ ناداں نے
نہ لب پر میر کے شعرِ غالبِ آتش بیاں کیوں ہو

دیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو

نہیں اک دن میں بن سکتی عمارت قوم کی ناداں
ہو جس دل میں محبت صبر سے وہ بدگماں کیوں ہو

منازل رفتہ رفتہ ہی بنینگی قصرِ قومی میں
نہ جس میں تاب ہو اسکی وہ صرفِ امتحاں کیوں ہو

ہے خوشنودیِ شہ - خوشنودیِ حکام فی الواقع
ہے صاحبخانہ جب راضی تو ناخوش پاسباں کیوں ہو

ہوا ہے یہ بھی نیکوں کو کہا ہے بدزمانی میں
جفائیں سہنی پڑتی ہیں بہت دل کے لگانے میں

ہے وقت اب کام کرنیکا امید ہیں آؤ
دلوں میں حوصلہ رکھو - ہم محنت سے جی کڑاؤ

کرو جی توڑ کر محنت - کرو سر جوڑ کر کوشش
تو ناممکن ہے پھل سکا نہ تم اللہ سے پاؤ

جو شرطِ عشق حق ہی۔ ہی وہی عشق وطن کی بھی
مٹا کر آپ کو تم۔ آپ میں وہ نور چمکاؤ

تمھیں کیا خوف ہی سر کا۔ تمھیں کیا جان کا ڈر ہی
تمھیں تو جان ہو عالم کی۔ ای میرے مسیحاؤ

بناؤ مل سکے یہ قومی عمارت قوم کی خاطر
جو مسجد اور مندر اسکی راہ میں ہوں انہیں ڈھاؤ

سکھایا ہی ہمیں یہ دینِ حق نے اسکو سن رکھو
خودی کو تم جو کھو دو۔ آپ کو ہر چیز میں پاؤ

نہیں ہے جان اور سر کے یہاں تو ذکر کی حاجت
ملے خو محتسب سے ئے۔ صفائی دل جو دکھلاؤ

نہیں دیکھا کہ جو ہیں قید رسم و رہ سے عاری
انہیں سر پر بٹھاتے ہو تم ای رسموں کے شیداؤ

جو کہنا تھا وہ سب کچھ کہہ چکا ہی آپکا کیفی
جگہ دو اُس کو دل میں ای عزیزو غور فرماؤ

اسی قومی عمارت سے بلند اپنا نشاں ہوگا
بناؤ اسکو یارانِ وطن! اٹھو بھی یار آؤ!

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

برجموہن

ریا

دیکھا ہمنے جو زشت روئے ریا
تو دوبارہ نہ دیکھا سوئے ریا

سہل اور صاف ہے طریقِ صفا
تنگ اور پیچدار کوئے ریا

خاکساری کچھ اور ہے زاہد
آتی ہے بوریا سے بوئے ریا

نفس کا تزکیہ ہے جس کا نام
اصل میں ہے وہ شست شوئے ریا

چشمۂ سادگی کا صاف زلال — تیرا پانی ہے کھاری جوئے ریا
کیوں نہ تکلیف ہو تکلف میں — وہ بھی آخر ہے ایک خوئے ریا
خم ملے کوئی گر تو ہم بھی پئیں — جام پر کردیں ترک خوئے ریا
اے ہنر ہاتھ دو برکف دست — ق — ہاتھ پھیلائے روبروئے ریا
مانگتا کیا ہے جھوٹی سے سرکار — ہیچ ہے قدر و آبروئے ریا
یار ہوتے ہیں وہ متدار وہی — دل ہی دل ہوئے ہیں جو عدوئے ریا
چمن دہر کی ہے بدلی ہوا — ہے ہر اک گل میں رنگ بوئے ریا
راکھ پروانہ ہو گیا اے شمع — آنسوؤں کی بہانہ جوئے ریا
ہو تیمم جو حسن کساری کا — اسپہ واجب نہیں وضوئے ریا
جب کہ ہو چاک زیب عریانی — اسکو کیا حاجت رفوئے ریا

گرچہ رنگیں سخن نہیں عنبر
پر نہ پاؤ گے اس میں بوئے ریا

نورالدین عنبر

زمزمۂ توحید

ہر ذرہ میں ہے ظہور تیرا — ہے برق و شرر میں نور تیرا
افسانہ ترا جہاں تہاں ہے — چرچا ہے قریب و دور تیرا
ہر ذرۂ خاک میں ہے لمعاں — مخصوص نہیں ہے طور تیرا
محتاج شراب و جام کب ہے — جس دل کو ہوا سرور تیرا

گاتے ہیں سحر ہوا میں کیا کیا دم بھرتے ہیں سب طیورِ شیدا

تو جلوہ فگن کہاں نہیں ہے
وہ جا نہیں تو جہاں نہیں ہے

تاروں میں چمک دمک تری ہے جو رعد میں ہے کڑک تری ہے
اے باعثِ رونقِ گلستاں شاخوں میں ہے جو لہک۔ تری ہے
ہر غنچے میں ہے ترا تبسم ہر گل میں بھری مہک۔ تری ہے
نغمے مرغانِ خوش گلو کے کہتے ہیں یہ سب چہک۔ تری ہے
کہتی ہے کلی کلی زباں سے میری یہ نہیں چٹک۔ تری ہے

بشگفتہ ہے تو چمن چمن میں
خنداں ہے گلاب و یاسمن میں

خوبوں میں ہے تیرا حسنِ رعنا ہر ایک حسیں ادا کا پتلا
نوک مژہ میں تیری خلش ہے عشاق کے دل میں ہے جو کانٹا
تیکھی چتوں۔ کٹیلی آنکھیں گر ان میں نہو تو کارفرما
ہیں صورتِ تیغ زنگ آلود جس کا نہ اثر ہو دل پہ اصلا
اس چہرے میں سادگی ہے تیری چہرہ جو کوئی ہے بھولا بھالا

یکتائے زمانہ حسن تیرا
عالم میں فسانہ حسن تیرا

اے معنئے نازِ نازنیناں وے نورِ جبینِ مہ جبیناں
عالم ہے نگارخانہ تجھ سے اے مایۂ خوبیِ حسیناں
تیرے ہی یہ ولولے ہیں دل میں اے ذوقِ دلِ جمال بیناں
ہیں صبر و قرار تجھ سے قائم اے مرہمِ زخمِ غم قریناں

او! وجہ تسلیٔ دلِ زار! | او! موجبِ راحتِ حزیناں

پروانے کو تیری ہی لگن ہے
اور شمع میں تیری ہی جلن ہے

ناقوس میں تو اذاں میں تو ہے | ہر شور میں ہر فغاں میں تو ہے
گنگا میں ہیں اُٹھتی تیری لہریں | زمزم کی صفائے جاں میں تو ہے
ہر قافلے میں تری صدا ہے | ہر منزلِ رہرو ہر نشاں میں تو ہے
ہے تیرے بغیر کون موجود | ہے کوئی اگر جہاں میں تو ہے
ہے دیر و حرم میں تیرا جلوہ | القصہ مکاں مکاں میں تو ہے

سجدہ ہے ترا ہر اک کا مقصود
خالق تو ہے سب کا اور معبود

یہ کشمکشِ حیات کیا ہے | تیرا ہو کرم تو بات کیا ہے
اے رہبرِ کاروانِ ہستی! | راہِ غم مشکلات کیا ہے
تو جب کو دکھا دے اک تجلی | کیا جانے وہ غم کی رات کیا ہے
جو مل گئے تجھ میں اُنکے آگے | تمیزِ صفات و ذات کیا ہے
ہاں مل گئی جنکو تیری ہستی | پھر انکو غمِ ممات کیا ہے

ہر ذرّے میں تیری جستجو ہے
محروم کو بھی اب آرزو ہے

تلوک چند محروم

اندھی پھول والی کا گیت

گزشتہ پرچے میں ذکر ہو چکا ہے کہ "پھول والی کا گیت" کے ترجمۂ نثر کو بہت سے سخنوروں نے نظم کیا۔ ہمارے پاس جو نظمیں آئیں اُن میں سے چار شایع ہونے کیلئے منتخب ہوئیں اور ماہ مئی میں ہدیۂ ناظرین ہو چکی ہیں۔ مگر اس مرتبہ ایک اور نظم اُسی مضمون پر ایسی آئی ہے کہ اسے درج کرنا نہایت ضروری ہے۔ ہمارے مکرم جناب سید مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی نے اس نظم میں حق شاعری ادا کر دیا ہے اور مغربی خیالات کو مشرقی طرز ادا کا جامہ نہایت خوبی سے پہنایا ہے۔ ہمیں نہایت مسرت ہے کہ جناب احسن اب اپنا سارا وقت اردو علم ادب کی خدمت میں صرف کر رہے ہیں۔ اور اُن کی کتاب سوانح عمری آنیس جس کے لوگ مدت سے مشتاق ہیں۔ اب تیار ہے۔ اور عنقریب شایع ہو گی۔ اور جس محنت سے لکھی گئی ہے اسکی داد پائے گی۔

گود میں مالن کے ہیں ٹوٹے ہوئے ڈالی کے پھول
لو خریدار و یہ اندھی بیچنے والی کے پھول

تم ہو جس دنیا کے ساکن نور کی دنیا ہے وہ
عالم ظلمات ۔ مجھ مجبور کی دنیا ہے وہ

ہو مبارک تمکو دنیا کے نظارے دیکھنا
دنکو نور مہر شبکو چاند تارے دیکھنا

میں وہاں ہوں ہے اندھیرا گھٹ جہاں چھایا ہوا
ہے تصور اس سیہ خانہ میں گھبرایا ہوا

تمکو قدرت نے عطا کی قوت نظارگی
اور میں محروم قدرت بندگی بیچارگی

نظم دنیا کا ہے جام جم تمہارے واسطے
تم ہو عالم کے لئے عالم تمہارے واسطے

فلسفۂ قدرت کا ان پھولوں میں کھلاتی ہوئیں
انمیں جو جو خوبیاں ہیں تمکو سمجھاتی ہوئیں

طفل غنچہ ہر کے یہ آزاد گل بوٹے ہوئے
آ گئے ہیں اپنی ماں کی گود سے چھوٹے ہوئے

وہم ہے نقش و نگار گل غلط ہے یہ گماں
عارضِ گل پر ہیں پیاری ماں کے بوسونکی نشاں

باعثِ عبرت ہے انکا عالمِ افسردگی
مادرِ گیتی سے چھٹ کر پائی ہے پژمردگی

نازپرورد چمن ہیں یہ جوانانِ چمن
حسن کی دنیا کے ساکن ہیں یہ یارانِ چمن

کل کے دن تک تھی یہی سب طرہ و دستار باغ
اِن کی رونق دیکھی تھی نرگسِ بیمار باغ

دستِ گلچیں سے حفاظت دلیں تھی کرتا تھا نہ بنے
خار گلشن ہر طرف تھے برچھیاں تانے ہوئے

جب ہوئے پرورش جواں تو ہو گئے عاشق مزاج
اب خود انکو صاحبانِ حسن کی ہے احتیاج

آرزو یہ ہے کسی کی طرۂ دستار ہوں
خواہشیں یہ ہیں حسینوں کے گلے کا ہار ہوں

باوفا خوبیں اور ہر حالت میں یہ دلسوز ہیں
اور حسینوں کو اتالیقِ وفا آموز ہیں

ہمدمِ راحت بھی ہیں اور غمگسارِ غم بھی ہیں
رونقِ شادی شریکِ محفلِ ماتم بھی ہیں

صرفِ بزمِ عیشِ معشوقِ ستم ایجاد بھی
اور کبھی زیبِ مزارِ عاشقِ ناشاد بھی

لو خریدار و چلو یہ بے رخی اچھی نہیں
رات بھر کی ہے یہ رونق صبح کو کچھ بھی نہیں

خندہ زن ہیں ایک شب کی زندگانی کیلئے
اپنے گھر لیجاؤ انکو میہمانی کے لیے

کلام آسی

پوچھتے ہو کہ سرِ وحدت کیا
ما سوا کی بھلا حقیقت کیا

ہم نہیں جانتے قیامت کیا
آج اگر تم ملو قباحت کیا

واعظو اوسکو دیکھ لو پہلے
پھر کہو حور کیا ہے جنت کیا

نہ گرے اُس نگاہ سے کوئی
اور افتاد کیا مصیبت کیا

نقدِ ہستی نثار یار کرے
یہ نہیں ہے تو پھر محبت کیا

عاشقی میں ہے محویت درکار
راحتِ وصل و رنجِ فرقت کیا

جن میں چرچا نہ کچھ تمہارا ہو — ایسے احباب انیسی صحبت کیا
اب سمجھتا ہے منکر سجدہ — آدمی کیا ہے آدمیت کیا
اُس سے مل جو ہمیشہ شاہد رہے — بیوفاؤں سے لطف صحبت کیا
باغ رضواں بھی باغ ہے آخر — سیر گل کے لئے ریاضت کیا
ملنے والوں سے راہ پیدا کر — اُسکے ملنے کی اور صورت کیا
بس تمہاری طرف سے جو کچھ ہو — میری سعی اور میری ہمت کیا
اُسکے حقدار ہم شرابی تھے — اہل تقویٰ دابر رحمت کیا
جاتے ہو جاؤ ہم بھی رخصت ہیں — ہجر میں زندگی کی مدت کیا
گوشہ گیری حدیث نفس کے ساتھ — دل ہی مجمع میں ہے تو عزلت کیا
اور ہمت بلند کر اے شیخ — طمع و خوف کی عبادت کیا
کوئی تیرے سوا کہیں ہے بھی — بدگمانی کی مجھ سے علت کیا
یوں ملوں تم سے میں کہ میں بھی نہوں — دوسرا جب ہوا تو خلوت کیا

آسی مست کا کلام سنو
وعظ کیا پند کیا نصیحت کیا

دیگر

خاک کیا کم ہے اصل طینت کی — دل میں کیوں پوٹ ہو کدورت کی
خوف دوزخ نہ حرص جنت کی — بیغرض میں نے تجھسے الفت کی
نہ کھلی کچھ حقیقت معراج — رہی پردے میں بات خلوت کی
بھری محفل میں بے نقاب اے دوست — حشر تم نے کیا قیامت کی
کیوں نہ مٹجائے جستجو میں ہم — تھا وہ کسوت میں اپنی صورت کی
نہوا جو وطن سے آوارہ — یو نہیں اُسمیں آدمیت کی

پھر کہوگے کہ ہم نہیں بے رحم — آج دشمن نے بھی شکایت کی
یا خدا اب تو جانِ زار کی خیر — آج پھر دردِ دل نے شدت کی
حشر میں کون پوچھتا ہے کسے — قہر ہے دید خوبصورت کی
عشق کا روگ ہے محبت خیز — غیر نے بھی مجھے نصیحت کی
دیکھو دل پہ کوئی سپر رکھ لو — یہ نگاہیں ہیں یا چشمِ حسرت کی
سجدۂ آستانِ جاناں میں — خانۂ کعبہ نے امامت کی
شبِ وصل و نگار و ہوش و حواس — صبح ہے آج سب کی رخصت کی
تم کہوگے فلک رقیب نہیں — وجہ ہے مجھسے کوئی عداوت کی

نہ غزل ہے نہ اسمیں عرضِ ہنر
بڑ ہے آسی یہ جوشِ وحشت کی

دیگر

لب بلب ہے آج تجھسے تیری مستانیکی خاک — خوب پہچانے ہے آبِ نوش پیمانیکی خاک
حشر و نشر و حسرت و اندوہ دکھلائے دن — کیا قیامت خیز نکلی تیرے دیوانیکی خاک
اک ذرا دامن اٹھالے آنکھ اے شمعرو — شعلہ زارِ سوز و غم ہے تیرے پروانیکی خاک
گردشِ صد جامِ وحشت ایک اک ذرہ میں ہے — بزمِ صہبائے جنوں ہے تیرے دیوانیکی خاک
ایکہ گوئی تابشِ ہر ذرہ از تابِ خور است — مطلعِ نورِ خدا ہے ہر صنمخانے کی خاک
ہائے اُن قسمت زدونکے سینۂ و قلب و جگر — جنکے قالب میں پڑی ہو میرے خمخانیکی خاک
ذوقِ اہلِ مکر و زہدِ خشک سے اول ہائے ہائے — صرفِ جامِ بادہ کر سبحہ کے ہر دانیکی خاک
تیرے ہی جلوے ہیں جب تو طاعتِ پندار کو — لاکھ کعبے کا ہیولا ایک بتخانیکی خاک
ایک اک ذرہ ہے فردِ دفترِ صد سوزِ غم — داستان سنجِ دلِ عاشق ہے پروانیکی خاک
بوالہوس مجھکو اگر تھی گنجِ مخفی کی تلاش — چھانی تھی مثلِ آسی دلکے ویرانیکی خاک

تازہ غزلیں

وفا کر مجھ پہ تو شہید و نمیں رکھے تو میرا
دکھا نہ غیر کو کھولا ہوا لہو میرا

یہی نہیں ہے کہ ساقی سے چھڑ گیاں مجھ ان نصیب
ہزاروں کام بگاڑے گی آرزو میرا

وہ ذبح کر کے مری لاش سے یہ کہتے ہیں
تڑپ رہا ہے کہ منہ دیکھتا ہی تو میرا

کرا ہنے میں تامل نہیں مگر اے درد
گلا دبا تی ہے کمبخت آبرو میرا

کیا لحاظ نہ بخت الحناک کا قاتل کی
کہاں سے آڑ کے کہاں جا پڑا لہو میرا

میں اشک ریزی کو مانع نہیں مگر اے چشم
خدا کے واسطے پانی نہ کر لہو میرا

مٹنا رہا ہے یہ پیری میں اپنا جامۂ تن
چھپائے عیب کہاں تک کوئی رفو میرا

ٹھہر ٹھہر کے پھر انکچھ مزا تو لینے دے
چھری کہاں تری قاتل کہاں گلو میرا

نہ راس آئے گی توبہ سمجھ لے اے ناداں
مجھی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے کہیں وضو میرا

میں اپنے مرنے کو سمجھا ہوں نعمت اے شب غم
میں اور شخص ہوں کیا کر سکے گی تو میرا

کہا یہ روح نے تن سے وداع ہوتے وقت
مرا سلام ہے اب میں تری نہ تو میرا

خزاں سے پھول یہ کہتے ہیں کیا خطا تیری
کہ خود بگاڑ گئی کھیل رنگ و بو میرا

مآل کار سے اے شاد اسکے واقف ہوں
خدا کرے کہ نہ شہدہ ہو چار سو میرا

شاد عظیم آبادی

اتنا ہے کون خستہ درد جگر کہ ہم
بلبل بھی نالہ کش ہے مگر اس قدر کہ ہم

بے جوہروں کا دعوی توقیر ہے عبث
دنیا میں قدر پاتے ہیں اہل ہنر کہ ہم

بالائے بام آپکے سونے سے ہمکو کیا
اس سے فروغ یاب ہے چشم قمر کہ ہم

جادو سے چشم کے ہمیں دیوانہ کر دیا — اس میں قصور وار ہے تو فتنہ گر کہ ہم
تیری گلی میں اے مہ تاباں شب فراق — سرگرم نالہ غیر رہا رات بھر کہ ہم
آنکھوں میں جا کے اشک لہو میں بھرے ہوئے — رکھتا نہیں ہے ابر بھی وہ چشم تر کہ ہم
اُس گل کے کوئے زلف میں تیرا گذر نہیں — پھرتی ہے اے نسیم تو آشفتہ سر کہ ہم
میری شب فراق ذرا باغباں سے پوچھ — بلبل رہی ہے نالہ کناں تا سحر کہ ہم
آئے کرم سے پیش ستم کے جواب میں — کرتا ہے یوں عدو سے کوئی درگذر کہ ہم
مژگان و چشم و ابرو و گیسو کے عشق سے — اے دل بلائیں لایا ہے تو جان پر کہ ہم
رو رو کے سخن کا ہے سے گلا کیوں ہے غیر کو — رکھتے ہو بات چیت میں تم منہ اُدھر کہ ہم
دشمن کی موت کا ہمیں الزام دیتے ہو — رکھتے ہیں ہمیں دخل قضا و قدر کہ ہم
اسکے مزے سے ہے رگ مجنوں کو کیا خبر — کھاتے ہیں دل کے زخم پہ جو نیشتر کہ ہم
کوئی گل دمیدہ ہے گلزار میں کہ تو — فریاد کش ہے بلبل شوریدہ سر کہ ہم
حال دل شکستہ جو میں نے بیاں کیا — بولے کہ اسکے واسطے ہے شیشہ گر کہ ہم
کیا اُن نگاہ شوخ سے اے یار پوچھئے — دشمن رہا ہے آپ کا مد نظر کہ ہم
دل غیر کو سپرد نہ کرنا تھا جان من — اب آپ سر بہ زانو ہیں دو دو پہر کہ ہم

کہتے نہ تھے کہ دل کا لگانا عذاب ہے
اب بیقرار ہجر میں تو ہے اثر کہ ہم

مولوی سید امداد امام اثر عظیم آبادی

اک جہاں آئیگا یاں اُنکے پریشاں ہونگے — ہائے اک روز مرے گھر میں یہ ساماں ہونگے
قصر تھے اہل محبت کے کسی وقت یہاں — کیا ہمیشہ سے بیاباں یونہی ویراں ہونگے
کھلکے یہ دفن کے ساماں اسیروں نے کئے — زندگی میں نہ کبھی وا در زنداں ہونگے
خاک ہے میرے دل سوختہ کی قابل سیر — اسکے ہر ذرہ میں لاکھوں ہی بیاباں ہونگے

کہتے ہیں دیکھکے ارباب جنوں گھر میرا
اس خرابے میں کبھی اور ہی ساماں ہونگے

اور آثار عیاں چہرۂ بیمار سے ہیں
جائیے جائیے اب آپ پریشاں ہونگے

سعی بیجا ہے مداوای مریضان فراق
چارہ سازوں سے یہ کہدو کہ پشیماں ہونگے

ہمنے مانا کہ نہ پھر ہوگی کوئی گردش چرخ
ہم کہاں صبح تک اب اے شب ہجراں ہونگے

سچ ہے جسدن میں مرونگا تو قیامت ہوگی
میرے گھر میں نئی دنیا نئے ساماں ہونگے

آگئی ایڑیوں تک زلف رسا اُن کے عزیز
اب تو وہ قائل طول شب ہجراں ہوں گے

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

ظالم نے ہاتھ اُٹھایا اعجاز دلبری سے
خنجر گلے پہ رکھا جب ناز دلبری سے

تاریخ مرگ ارماں یاد آئے کیونکر اونکو
ہوش اُڑ گئے ہوں جنکے آغاز دلبری سے

بیتابی جگر بھی کچھ دیر دیکھ لینا
فرصت کبھی جو پانا تم ناز دلبری سے

روز شباب سے وہ بجلی بنے ہوئے ہیں
شوخی ٹپک رہی ہے انداز دلبری سے

دنیائے عاشقی میں آجائے گی قیامت
اوٹھیں گے لاکھ فتنے اک ناز دلبری سے

کھلجائیں دونوں آنکھیں چل جائے سوطور واعظ
سرمہ ہوا ہے تیرا اعجاز دلبری سے

دیکھے ہوئے ہے چشم و گیسو کی سب ادائیں
آئینہ کیوں نہ واقف ہو راز دلبری سے

ذوق تپش میں اپنا اتنا ہی خوں بہا ہے
اور ایک ہاتھ قاتل انداز دلبری سے

آنکھوں سے تا بہ شہ رگ اور قلب سے جگر تک
پہونچا کہاں کہاں تو اعجاز دلبری سے

کسنے بتو نکو اپنا بندہ بنا لیا ہے
کعبے میں کون آیا یہ ناز دلبری سے

مرنے کی زندگی پر اُڑتے ہیں ہوش محشر
جاتی ہے جان ورنہ آواز دلبری سے

میرزا کاظم حسین محشر لکھنوی

لحد سے اُٹھکے ظالم دیکھ لوں میں تیری صورت بھی
جو آیا ہے تو کر دے چال سے برپا قیامت بھی

ترا غصہ بھی مجھکو یاد ہے تیری عنایت بھی
مری آنکھوں میں پھرتی ہے وہ صورت بھی وہ سیرت بھی

یہ ممکن ہے کہ رہجائے کوئی پُرزا سلامت بھی
سلامت چاہیے جوشِ جنوں بھی دستِ وحشت بھی

جب آئے ہجر کے دن گھر سے تو ساتھ ہی اُنکے
چلی آئی سمٹ کر ساری دنیا کی مصیبت بھی

مئے گلگوں بھی کیا شے ہے جہاں تہ حلق سے اُتری
نکھر جاتی ہے رنگت بھی بدلجاتی ہے صورت بھی

جنابِ شیخ کیا کچھ آڑ میں تقویٰ کے کرتے ہیں
کوئی کیا انکو جانے ایک ہی حضرت ہیں حضرت بھی

اٹھا ہے درد اُنکا جب کبھی نشتر لگانے کو
تو دلمیں پھانس بنکر چبھ گئی ہے اُنکی حسرت بھی

اب اُنسے سامنا ہوتا ہے تو منہ پھیر لیتے ہیں
کہاں کی رسمِ الفت چھوڑ دی صاحب سلامت بھی

تمھاری یاد جب چرکے لگاتی ہے مرے دل میں
کھٹک کرتا ہے پیدا کس مزے کی خارِ حسرت بھی

اگر صحرا نوردی میری آکر دیکھ لے مجنوں
بدلجائے یہ اندازِ جنوں بھی طرزِ وحشت بھی

ہزاروں بار توبہ کی ہے مینے بادہ نوشی سے
مگر بدلی کے آتے ہی بدلجاتی ہے نیت بھی

پشیمانی ذریعہ ہو گئی بخشش کا اے واعظ
بہے جب اشک تو بہنے لگا دریائے رحمت بھی

تری محشر خرامی نے لگائیں ٹھوکریں کیا کیا
بڑی مشکل سے سنبھلے آج فتنے بھی قیامت بھی

مصیبت کا کوئی ساتھی نہیں سب چھوڑ دیتے ہیں
زمانہ پھر گیا تو پھر گیا وہ بیمروت بھی

کہا قاصد سے کہنا عمر بھر یونہی بسر ہوگی
کہاں تک خط ہمارا پڑھ چکے وہ خطِ قسمت بھی

کیا چاہت کا میں نے ذکر تو بولے خفا ہوکر
ابھی دیکھی ہے تم نے چاہنے والوں کی صورت بھی

ہوا دریا سے واقف قطرہ دریا میں فنا ہوکر
وہ ملجائیگا تو کھل جائیگی اُسکی بھی حقیقت بھی

یہ کون آتا ہے وہ آتے ہیں شاید سیرِ گلشن کو
خبر کے ساتھ ساتھ اُڑنے لگی پھولوں کی رنگت بھی

ہمیں کیا حضرتِ عیسیٰ جلائیں اور سو مردے
مزا جب تھا اگر کرتے علاجِ دردِ الفت بھی

بسر ہوتی ہے اپنی زندگی کس لطف سے حامد
خدا رکھے مزے کی چیز ہے دردِ محبت بھی

حامد حسین قادری

مقام خلافت یعنی استنبول کا سفرنامہ

(از شیخ عبدالقادر صاحب بی اے بیرسٹر ایٹ لا)

جس کے شائقین مدت سے منتظر تھے بالکل مکمل ہو گیا ہے اور دھڑا دھڑ ہاتھوں ہاتھ بک رہا ہے۔ ملک کے ہر گوشے سے قبولیت عام کی سند اسے اتنے عرصے ہی میں حاصل ہو گئی ہے کیونکہ ملک ایسی چیزوں کی قدردانی کے لئے ہر وقت تیار ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ اس سے بہتر استنبول کے حالات آجتک اردو زبان میں نہیں لکھے گئے۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے جو خطوط استانبول سے لکھے تھے جن کا ترجمہ مختلف اخبارات میں شائع ہوا۔ وہ محض اس ضخیم کتاب کا ضمیمہ ہیں۔ اصل کتاب نئی نئی معلومات سے پر ہے۔ اور سلطان المعظم کے عالیشان دارالخلافت کی سچی تصویر ہے۔ اور پھر شیخ صاحب نے اول تو اپنے مشہور زور بیان کے جوہر اس کتاب میں اس خوبی سے دکھلائے ہیں کہ جس چیز کا حال لکھا ہے اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے ہو جاتا ہے پھر اس پر طرہ یہ کہ قریب قریب ہر باب کے ساتھ ایک بڑھیا عکسی تصویر ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ چھتیس تصویروں کا ایک مرقع گویا کتاب کے ساتھ مفت ہاتھ آتا ہے۔ پھر جس اہتمام سے کتاب چھپی ہے دیکھنے کے قابل ہے۔ کاغذ اعلیٰ قسم کا چکنا ولایتی تصویریں تفصیل ذیل ہیں سرورق جو اپنی جگہ عکسی چھپائی کے نادر نمونے میں ایک پر سنہری روپہلی ہیں مع طغرائے شاہی اور دوسرے پر خوشرنگ انگوری ہیں نہایت پسندیدہ ضخامت مع تصاویر تین سو صفحے سے زیادہ ہوتی ہے۔ آپ منگا کر دیکھئے ممکن نہیں کہ کتاب کی خوبیاں آپ کو گرویدہ نہ کر لیں۔ باوجود ان خوبیوں کے قیمت زیادہ نہیں

مقامِ خلافت پر ملک کے ممتاز اخباراتِ جو ریویو

فرماتے ہیں

وہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے

سول ملٹری گزٹ لاہور۔ شیخ عبدالقادر بی۔ اے۔ بیرسٹر ایٹ لاء نے اپنی تازہ تصنیف مقامِ خلافت میں اپنی سیر استانبول کے مشاہدات بیان کئے ہیں۔ اور وہاں کے بعض تاریخی مناظر کی دلکش تصویر کھینچی ہے۔ یہ کتاب ان کے مشہور طرز تحریر کا ایک عمدہ نمونہ ہے کتاب کی چھپائی صاف ہے اور اس میں تصاویر کثرت سے دی گئی ہیں اور اس لئے اردو کی عام کتاب سے نہایت ممتاز ہے۔ مصنف نے استانبول میں اپنے مختصر زمانہ قیام سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور وہاں کی چیزوں کو غور سے دیکھا ہے۔

انڈین ڈیلی ٹیلیگراف۔ حال میں شیخ عبدالقادر صاحب نے مقامِ خلافت یعنی اپنے سفر استانبول کے تاثرات نہایت خوبی سے قلمبند کر کے نفیس تصاویر سے مزین کر کے چھپائے ہیں۔ جس میں استانبول کے تمام دلچسپ مقامات کے حالات لکھے ہیں۔ اور وہاں کی سوشل اور پولیٹیکل حالت بھی دکھائی ہے۔ فاضل مصنف نے نہایت قابلیت سے ٹرکی کی بعض انتظامی کمزوریوں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اس کے مستقبل کی بحث کی ہے۔ مصنف کی رائے میں مستقبل

کی حالت تاریک یا مایوس کرنے والی نہیں۔ کتاب کے آخیر میں آپ نے
سفر کا روزنامچہ بھی درج کر دیا ہے۔ جو بہت دلچسپ ہے۔ بحیثیت
مجموعی یہ کتاب نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ مفید بھی ہے۔ اور مسلمانوں کو
بالخصوص اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

اوبزرور لاہور ۔ ۲۰۰ صفحوں کی اس خوبصورت کتاب میں جو نہایت قیمتی کاغذ پر
چھپی ہے اور جس میں ۲۶ دلکش تصویریں ہیں۔ شیخ عبدالقادر صاحب
نے استانبول کے تمام مشہور مناظر و مقامات کی تفصیل لکھی ہے
اور ترکوں کی سوشل پولیٹکل اقتصادی ہر قسم کی حالت کو وضاحت سے
بیان کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ اور تصاویر سے ہر شخص کے
دل میں یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ تو اس مقام خلافت کو اپنی
آنکھوں سے بھی دیکھ لوں۔ کتاب بحیثیت مجموعی بہت مفید ہے اور
اس کے مطالعہ کے لئے ہر مسلمان سے ہم نہایت شدومد سے سفارش
کرتے ہیں۔ صورت ظاہری بھی ایسی ہی خوشنما اور دلکش ہے جیسی
معنوی طور پر کتاب دلچسپ اور مفید ہے۔ جس اہتمام اور محنت سے
مقام خلافت تیار ہوئی ہے قیمت ہے کچھ گراں نہیں ہے۔

اخبار وکیل امرتسر ۔ مقام خلافت شیخ عبدالقادر صاحب کے سفر استانبول کے مشاہدات و
تاثرات کا نتیجہ ہے اس کتاب میں عنوان جتنے ہیں ضروری اور دلچسپ ہیں عبارت
صاف اور سلیس ہے۔ اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترکوں کی سوسائٹی نئی تہذیب و شائستگی کے
لحاظ سے مشرق میں خاص حیثیت رکھتی ہے حسن ظاہری کے لحاظ سے کچھ بیجا نہیں ہے اگر یہ کتاب ہوگی ممتاز
کتابوں میں شمار کیا جائے ٹائیٹل پیج مطلا اور رنگین ہے۔ قسطنطنیہ کے قابل دید
مقامات اور مناظر کی ۲۶ نفیس تصویریں بھی جا بجا لگائی ہیں۔

علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ - کتاب کی ظاہری شکل صورت نہایت دلفریب ہے۔ دونو مروق نہایت خوبصورت ہیں کتاب کے اندر ۲۶ عکسی تصویریں اشخاص و مقامات کی شامل کیگئی ہیں صفحات کی تعداد بھی معقول ہے اور قیمت صرف ہے سے بحیثیت مجموعی اس سفرنامہ میں بہت سی دلچسپ باتیں درج کیگئی ہیں۔ اور دارالخلافہ عثمانیہ کے بہت سے دلربا مناظر کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

شیخ صاحب نے اس مقام کو ایک قوم پرست مسلمان اخبار نویس کی نظر سے دیکھا ہے۔ اسلئے جو کچھ انہوں نے لکھا ہے ہر مسلمان کے پڑھنے کے لائق ہے۔

مشرق گورکھپور - یہ کتاب مضامین کی خوبی اور چھپائی کی خوش سلوبی میں اپنی آپ نظیر ہے شیخ عبدالقادر صاحب نے اپنے سفر استانبول کے حالات جس دلچسپ پیرایہ میں زیب قلم کئے ہیں دیکھنے پر انکی خوبی ظاہر ہوسکتی ہے چیدہ چیدہ مقامات کے مفصل تاریخی حالات اور عکسی تصاویر سے کتاب کی عمدگی میں انتہا افزائش ہوئی ہے۔ زبان شستہ اور صاف ہے۔ ہم شیخ صاحب کو اس نمایاں کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ قیمت ہے بہت مناسب رکھی گئی ہے اور ۲۶ عکسی اعلیٰ قسم کی تصویروں کے اعتبار سے یہ قیمت کچھ بھی نہیں۔

تہذیب العنواں - نہایت بسیط ریویو لکھنے کے بعد لکھتا ہے کہ یہ کتاب نہایت دلچسپ ہے اور مستورات کیلئے بھی اسکا مطالعہ مفید ہے۔ یہ کتاب عمدہ اعلیٰ کاغذ پر نہایت صفائی اور خوشنمائی سے چھاپی گئی ہے۔

علیگڈھ منتھلی شیخ عبدالقادر صاحب نے نہ صرف غور سے وہاں کی عمارتوں کو دیکھا ہے بلکہ ان جذبات اور محسوسات کے ساتھ دیکھا ہے جنکا ان جیسے روشن خیال اور تعلیم یافتہ مسلمان کے دل میں ایسے مواقع پر پیدا ہونا لازمی ہے۔

کتاب کی معنوی خوبیوں سے قطع نظر کر کے ظاہری خوبیاں بھی نہایت دلفریب

ہیں۔ سب سے اول کتاب کا مطلا و مذہب سبز اٹلس پیچ دل کو لبھاتا ہے اور ذرا
آگے چلکے لوح ثانی کی مختلف الانواع بیل بوٹوں پر نگاہ لوٹ جاتی ہے۔ اور
اس سے بھی زیادہ کثیر التعداد عکسی تصویریں توجہ کو مسخر کر لیتی ہیں جو جگہ جگہ
موقع و محل کے لحاظ سے چسپاں کی گئی ہیں۔ کتاب کیا ہے دار الخلافہ کے
مناظر کا ایک اچھا خاصہ البم ہے۔ جو ہر ایک مطالعہ کی میز کو زینت دے سکتا ہے۔

دکن ریویو۔ یہ کتاب جو [illegible] واقعات کی دلاویز شرح
ہے پڑھنے والے کو تباہی ہر کرسات پہاڑیوں والے اس شہر کو جو یورپ کی ناامیدی
اور ایشیا کی منتہائے امیر المومنین عبدالحمید خان سے عثمانی جاہ و جلال
مغربی تمدن اور اسلامی معاشرت کی گوناگوں دلفریبیوں کا ایسا نظر افروز
مرکز بنا دیا ہے طرز تحریر سادہ دلکش اور دلنشین ہے جس میں شیخ
محمد اکرام صاحب کے اس غیر معمولی اہتمام نے جو انہوں نے اس کتاب
کی چھپائی اور لکھائی میں صرف کیا ہے جس میں اعلیٰ درجے کی عکسی تصویروں
کے ساتھ ملکر چار چاند لگا دیئے ہیں۔

الندوہ۔ اس کتاب میں استانبول کے متعلق تمام ضروری معلومات بہم پہنچائے
گئے ہیں۔ اردو زبان میں اب تک قسطنطنیہ کی جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں مقام [illegible]
ان سب سے زیادہ دلچسپ اور بہتر ہے۔ کتاب کی لکھائی چھپائی کاغذ
نہایت اعلیٰ ہے جا بجا ۲۶ عکسی فوٹو ہیں۔

منیجر مخزن پبلشنگ ایجنسی دہلی سے طلب فرمائیے

مخزن پبلشنگ ایجنسی کی مشہور کتابیں

رسوم دہلی مسلمانان

از تالیف مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ۔ اس کتاب کی خوبی کے لئے اسکے مولف کا نام ہی کافی ضمانت ہے۔ فرہنگ آصفیہ کے مرتب کرنے مولوی سید احمد صاحب نے جو احسان اُردو زبان پر کیا ہے اسکی کافی داد نہیں دیجا سکتی۔ مولوی صاحب کی معلومات رسوم قدیمہ کے متعلق حیرت انگیز ہیں۔ اس کتاب میں مولوی صاحب نے بچہ کی پیدایش کی رسومات سے لیکر شادی اور میت کی تمام رسومات نہایت شرح و بسط سے لکھی ہیں۔ زبان عورتوں کی لکھی ہے جو اسقدر پیاری اور دلچسپ ہے کہ کتاب چھوڑنیکو دل نہیں چاہتا اور بے اختیار داد منہ سے نکلتی ہے۔ مستورات کے لئے یہ کتاب زیادہ باعث دلچسپی ہے اور اسکا مطالعہ انکے لئے زیادہ مفید ہے۔
قیمت فی جلد ۱۲ علاوہ محصولڈاک۔

مثنوی میر حسن

میرحسن کی مثنوی سحرالبیان بدر منیر کا جو پایہ اردو زبان میں ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اور یہ بے بہا چیز جس طرح غلط سلط بری بھلی چھپکر بازار میں ملتی ہے وہ اس قابل نہ تھی کہ با مذاق اصحاب کی الماریوں کے لئے باعث زینت ہو۔ اسلئے ضروری تھا کہ سلیس اردو کے اس استاد کامل کی کتاب اچھے لباس اور صحت کے ساتھ چھپی ہوئی شائقین کے روبرو جلوہ گر ہو۔ چنانچہ یہ کوشش بار آور ہوئی اور بہت تلاش سے میرحسن کی دوسری غیر مطبوعہ مثنوی گلزار ارم بھی ایک مستند قلمی نسخے سے نقل کردی ہے۔ اور ایک نہایت فاضلانہ اور بسیط دیباچہ جناب مولوی سید اشرف حسین صاحب بی۔ اے۔ نے لکھکر اس مثنوی منظیر کی جلوہ دی ہے۔ اور اسکی خوبیاں اور دیگر لطیف نکات جو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا نہایت خوبی اور قابلیت سے بیان کئے ہیں۔ قیمت عہ علاوہ محصولڈاک

[illegible]

مصنفہ پروفیسر میرزا محمد سعید دہلوی۔ ایم۔ اے۔ پروفیسر ایم۔ اے۔ او کالج علیگڈھ ہم یقیناً عام بازاری مخرب اخلاق ناولوں کی اشاعت کے خلاف ہیں۔ اسلئے آپ کو یہ یقین کرنا چاہیے کہ بصورت اس احتیاط کے جو ناول ہمارے ہاں سے شایع ہوگا وہ کیسا ہوگا۔ خواب ہستی کہنے کو تو ناول ہے لیکن دراصل جدید طرز معاشرت کا ایک سرقع اور رسم و رواج کا آئینہ طلباء کی تعلیمی حالت کی اور ضلالتی زندگی کا بائسکوپ ہے جس میں روزمرہ کے واقعات

کوائف کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں لائق مصنف نے ناول کے اس دلکش پیرائے میں زندگی کے ایسے ایسے اہم مسائل بیان کئے ہیں کہ اس سے پیشتر کسی ناول نویس نے توجہ نہ کی تھی اور اسی پیرایہ میں دکھایا ہے کہ مغربی تعلیم کا اثر ان نوجوانوں کی طبیعت پر کیا ہوتا ہے جو اپنے مذہب کی ضروری باتوں سے ناواقف رہتے ہیں

اس ناول میں اور بھی چند خوبیاں ایسی ہیں جو اسکو دوسرے ناولوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ملک کے تمام اخبارات نے اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

اس ناول میں علاوہ لکھائی چھپائی کے نفیس ہونے کے فسانہ کے متعلق ہی تین ہاف ٹون تصویریں ہیں جو اس کتاب کی زینت کو دوبالا کرتی ہیں حجم بھی دو ڈھائی سو صفحے ہے۔ قیمت ۱۲ علاوہ محصولڈاک۔

یہ مخزن ایجنسی کا دوسرا ناول ہے۔ رسالہ الہلال مصری کے فاضل یڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے۔ اس عجیب وغریب ناول میں قرون وسطی کی تدبیر ملک داری سلطنت بنی امیہ کی تباہی اور حکومت عباسیہ کی بنیاد کا حال مفصل بیان کیا ہے۔

ابو مسلم۔ وہ نامور مسلمان پالیٹیشن اور مدبر تھا جس نے ایک صدی تک زور شور کے ساتھ حکمراں رہنے والے خاندان بنو امیہ کو غارت کرکے بنی عباس کی خلافت قائم کردی افسوس ایسے نامور مدبر کی اردو زبان میں کوئی مسلسل سوانح عمری نہیں جس سے اس کے اخلاق و عادت و تدبیر ملک داری کا پورا پتہ چل سکے۔

فاضل مصنف نے ابو مسلم کی سوانح عمری حسن و عشق کے نمک کے ساتھ اس غور و تعمق سے تحریر کی ہے کہ قرون وسطی کے حالات کا نقشہ آنکھوں میں کھینچ جاتا ہے۔ ابو مسلم کی چاہنے والی گلنار کی حسرت بھری داستان اس ماندوہناک حسرت خیز قصے کی جان ہے۔

وہ وہ کیرکٹر اس ناول میں دکھائے گئے ہیں کہ مصنف کے فن ناول نویسی میں کمال کی داد دینی پڑتی ہے۔ مولوی محمد حلیم صاحب ردولوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمایش پر اسے عربی سے سلیس اردو میں ایسی خوبی اور قابلیت سے ترجمہ کیا ہے کہ ترجمہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔

اسلامی تاریخ کے شیدائیو یہ ناول ضرور پڑھو۔ حجم چار سو صفحے کے قریب

ابو مسلم خراسانی

	اور قیمت صرف عہ علاوہ محصولڈاک
تصویر آزاد	اُردو زبان کے محسن شمس العلما مولینا آزاد کی تصویر کیا آپ اس قابل نہیں سمجھتے کہ آپ کے کتب خانے کے لئے زینت ہو۔ مولینا آزاد کی گھر بیٹھے زیارت کیا آپ کو ۶ روپیہ گراں رہے گی۔ اور پھر صرف تصویر ہی نہیں بلکہ اُن کے خطوط کا مختصر مجموعہ بھی ایک بیش بہا ولادیز اور خوشنما سرورق میں محفوظ ہو کر اسی قیمت میں آپ کو ملتا ہے۔ اس علمی تبرک کو اس قیمت میں مفت سمجھئے۔ قیمت ۶ روپیہ علاوہ محصولڈاک۔
نوائے نیرنگ	سید غلام بھیک نیرنگ بی۔اے۔ وکیل کا تمام کلام جو مخزن میں چھپتا رہا ہے۔ اسکو جمع کر کے نہایت خوشنما ایڈیشن چھاپ دیا ہے۔ اس مجموعے میں ذیل کی نظموں کے علاوہ غزلیات بہت سی ہیں۔ مُرجھایا ہوا پھول۔ خواب یتیم۔ راحتِ یاس۔ ایک آنسو سے دو دو باتیں۔ خواب ناز حسن و عشق۔ کسی کا دھیان۔ بادل۔ انسان کی فریاد۔ راگ۔ خارِ محبت۔ سودائے خام تلاشِ محبت۔ بھونرا۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ دلکش نظمیں ہیں جنکو ملک نے نہایت قدر اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ یہ مختصر مجموعہ ۶ روپیہ کو کیا مہنگا ہے
انتخاب مخزن	مخزن کی گزشتہ نو جلدوں میں سے تمام چوٹی کے مضامین نظم و نثر اس میں آگئے ہیں جن کے پاس مخزن کا فائل نہیں ان کے لئے تو یہ کتاب بہت ضروری ہے مختصراً یہ کہ انتخاب لاجواب چند یگانۂ روزگار مشہور اہل قلم۔ شعرا اور اعلےٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مغربی مشرقی خیالات کا لب لباب ہے۔ اس مجموعے کے ساتھ عالی جناب ڈاکٹر نذیر احمد۔ شمس العلما مولانا شبلی۔ شمس العلما مولانا حالی۔ نواب محسن الملک مرحوم نواب وقار الملک۔ مسٹر ازلد کی ولایت کی چھپی ہوئی تصویریں ہیں۔ اس انمول کتاب کی قیمت صرف عہ ہے۔ خریداران مخزن سے صرف ۸

جملہ کتب مخزن پبلشنگ ایجنسی سے طلب فرمائیے

جوہر عشبہ مرکب چوب چینی

گذشتہ پچاس سال کے تجربے نے بیباک ثابت کر دیا ہے۔ کہ ہمارا طیار کردہ عشبہ مرکب ازالہ امراض کے لئے جادو کا اثر رکھتا ہے۔ ہمارا طیار کردہ عشبہ تمام مصفی خون ادویات پر فوقیت لے گیا ہے۔ کیونکہ یہ اپنے ملک کے مزاجوں کے مطابق سرد و تر ادویہ کے ملانے سے طیار کیا جاتا ہے۔ جہاں انگریزی ساختہ عشبے ناکارہ و نقصان رساں ثابت ہوئے ہیں۔ وہاں اس نے ایسے ایسے سریع العمل فوائد دکھلائے ہیں۔ کہ مریض دنگ رہ گئے ہیں۔ اور مان لیا ہے۔ کہ عشبہ مرکب چوب چینی ازالہ امراض فساد خون کے لئے بے نظیر ہے۔

عشبہ مرکب چوب چینی کے فوائد و خواص۔ تمام پھوڑے۔ پھنسیاں۔ چہرے کے بدنما داغ و کیل۔ لاغری۔ زردی چہرہ۔ داد۔ چنبل۔ چمڑوں کا چمڑہ موٹا۔ سیاہ ہونا۔ چھائیاں۔ خارش۔ خنازیر۔ بھگندر۔ وجع مفاصل کے دفعیہ کے لئے عدیم المثل ہے۔ خون کو صاف و پاکیزہ بنا کر چہرہ کا رنگ گلاب کی پتیوں کی طرح سرخ اور بدن کو فربہ بناتا ہے۔ خوش مزہ اور خوشبودار ہے۔ غذا اور دوا کا کام دیتا ہے۔ عورتوں۔ مردوں۔ بچوں اور بوڑھوں۔ نوجوانوں کو یکساں مفید ہے جو لوگ دائم المرض بوجہ کمی اشتہا و کمی خون مغموم رہتے ہوں۔ وہ آزما دیکھیں پورا پورا معاون صحت مضامین و مددگار تندرستی۔ تجربے سے ثابت ہوا ہے۔ خون فاسد گندہ کو چند روز میں صاف کر دیتا ہے۔ کمی بھوک دائمی۔ قبض۔ کمزوری۔ رنگین بادی۔ وغیرہ دور ہو جاتی ہے۔ گویا مرض دور ہونے سے غربت و عسرت دور۔ نکبت کی جگہ عشرت۔ دولت اور فراغت آجاتی ہے۔

یہ جوہر اعضائے اندرونی پر عمدہ اثر کرتا ہے۔ اور جلد پر سب سے زیادہ اچھا اثر اسی جوہر کا ہوتا ہے۔ جس سے تمام چمڑے کی بیماریاں ناسور وغیرہ جاتی رہتی ہے۔ ہندوستان وغیرہ ممالک میں اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ اور یہ ہمیشہ مفید و موثر علاج ثابت ہوا ہے۔ ہندوستان کے نامی گرامی طبیب و ڈاکٹر اس کے فوائد کی تصدیق کرتے ہیں۔ پس اگر مندرجہ بالا بیماریوں میں سے آپ کسی میں مبتلا ہوں۔ اور دکھ اٹھاتے ہوں۔ تو اس کا ایک دفعہ تجربہ کریں۔ جبکہ تندرستی کا لطف صاف خون پر ہے۔ تو خون کو صاف و پاکیزہ بنانے کے لئے اس سے بہتر کوئی دوا آپ کو نہیں مل سکتی۔

قیمت شیشی کلاں (ستے،) خورد ہر

پتہ۔ حکیم ڈاکٹر حاجی غلام نبی زبدۃ الحکماء۔ لاہور

روغن مقوی

خارجی استعمال سے مردہ عضلات زندہ ہو کر سخت ہو کر ان سے طاقت پیدا ہوتی ہے۔ ا رسے

نہ منہ آتا ہے اور نہ قے زخم خود بخود خشک ہو کر آئندہ پھوڑے پھنسی کا اندیشہ نہیں رہتا ہے۔ سے

سرمہ ممیرا

مقوی بصر۔ محافظ بینائی دافع دھند۔ غبار۔ جالا۔ سرخی۔ رتوند آبروانی تو سفید رستے سیاہ رہتا ہے

روغن اعجاز

برسوں کا زخم دنوں میں ہو جاتا ہے۔ سوزاک۔ خنازیر کا لگاؤ بہتر علاج ہے۔ ۱۲ر

حب بواسیر

خونی ہو یا سادی۔ ریحی ہو یا بادی۔ دو ہفتہ میں۔ اور خون جاتا رہے قیمت ۲ ہفتہ ۵ر

آدھ گھنٹے میں ریم جلن تمام تکلیف دہ علامات کافور۔ قیمت درجہ اول صر درجہ دوم ستے

مفت

۱۵۰ صفحوں کی با تصویر کتاب درخواست آنے پر روانہ کیجاتی ہے

لغات المدارس

یعنی

اُردو زبان کی سکول ڈکشنری

مصنفہ منشی سید احمد صاحب دہلوی مصنفِ فرہنگ آصفیہ وغیرہ چھپنی شروع ہوگئی ہے گو یہ لغات دراصل فرہنگ مذکور کا مستند لبِ لباب اور بظاہر نظائر و امثال کے بغیر بھی از حد کارآمد انتخاب ہے مگر چونکہ مصنف متواتر بارہ سال سے پنجاب یونیورسٹی کے پانچ چھہ امتحانوں کا اردو ممتحن چلا آتا ہے لہذا اُس نے اپنے دوازدہ سالہ تجربہ کی بنا پر اس لغات میں یہ امر سب سے زیادہ ملحوظ رکھا ہے کہ پنجاب کے طلبا جو محاورات و مصطلحات کے سوالات میں کثرت سے ناکام رہتے اور مجموعہ یعنی جواب **مضمون و قواعد اُردو** میں زائد نمبر لیکر مشکل پاس ہوتے ہیں اُنہیں اس نقصان سے بھی بچا دیا جائے اور اس لغات کو ابتدائی امتحانوں سے لیکر اعلیٰ امتحانوں تک کافی و کارآمد بنایا جائے۔

اول تو ابھی تک کوئی ایسی ڈکشنری لکھی ہی نہیں گئی اور اگر ایک دو کتابیں برائے نام شایع بھی ہوئیں تو وہ کسی مسلم الثبوت اہلِ زبان کی تالیف یا تصنیف نہ ہونیکے باعث تذکیر و تانیث. پارٹ آف سپیچ. صحیح معانی و تلفظ کو ادا کرنے سے بالکل معرا ہیں اور لغات نگاروں نے اپنے معانی کی تصدیق کیواسطے اساتذہ کی اسناد و شواہدات کے اندراج کی ضرورت پوری نہیں کی ایسے برخلاف لغات ہذا ان عیوب سے بالکل مبرا ہے بلکہ اسکے اخیر میں "روزمرۂ دہلی" کا ایک نہایت مفید ضمیمہ شامل کردیا گیا ہے۔

اسکے علاوہ ایک اور ضروری اضافہ کیا گیا ہے جس سے اردو زبان کے شائقین مصنفین و طلبا کو بہت بڑی مدد ملیگی. مگر اسکا اظہار قبل از اشاعت اس خیال سے مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ اس زمانہ کے یار لوگ جنکا کوئی فعل عیاری سے خالی نہیں ایسی باتوں کی گھات لگائے دوسروں کی محنت ہتھیانے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اگرچہ اس قسم کی نقالی منہ چڑانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی مگر ابتدا ہی میں قبل از مقابلہ و مطالعہ انہیں لوگوں کی جیبیں کترنیکا موقع ضرور ملجاتا ہے پس احتیاط شرط ہے ہمنے بنظرِ رفاہِ عام اس لغات کی قیمت معقول ضخامت پر بھی بالفعل عہ ۱۲ سے زیادہ نہیں رکھی ہے مگر شرط یہ ہے کہ چھہ مہینے کے اندر خریداروں کے نام درج رجسٹر ہوجائیں تاکہ ہمیں تعداد شائقین معلوم کرنے میں سہولت ہو اور سب سے پہلے رجسٹر شدہ قدر دانوں کی خدمت میں کتابیں روانہ کیجائیں ورنہ بصورتِ دیگر اشاعت کے بعد جو قیمت تجویز ہوگی وہ لیجائیگی اور بشرط گنجائش تعمیل ارشاد کیجائے گی اور اگر تعداد مقررہ میں کمی ہوگئی تو طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑے گا۔ محصولڈاک بذمہ خریدار ہے۔ فقط

مینیجر دفتر فرہنگ آصفیہ - کوچہ پنڈت دہلی سے درخواست کرنی چاہیے

ممیرے کا سرمہ

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل ایگزامینر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں میڈیکل کالج کے پروفیسروں نامور ڈاکٹروں والیان ریاست اور ولایت کی یونیورسٹی کے سند یافتہ ڈاکٹروں نے بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ یہ سرمہ امراض ذیل کے لئے اکسیر ہے۔ ضعف بصارت۔ تاریکی چشم۔ دھندجالا۔ پڑوال۔ غبار۔ پھولا سیل سرخی۔ ابتدائی موتیا بند۔ ناخنہ۔ پانی جانا۔ خارش وغیرہ۔ معزز ڈاکٹر اعلیٰ تعلیم بجائے اور ادویہ کے آنکھوں کے مریضوں پر اس سرمہ کا استعمال کرتے ہیں۔ چند روز کے استعمال سے بینائی بہت بڑھجاتی ہے اور عینک کی بھی حاجت نہیں رہتی۔ بچے سے لیکر بوڑھے تک کو یہ سرمہ یکساں مفید ہے قیمت اسلئے کم رکھی ہے کہ خاص و عام اس سرمہ سے فائدہ اٹھا سکیں۔ قیمت فی تولہ جو سال بھر کیلئے کافی ہے۔ ممیرے کا سفید سرمہ اعلیٰ قسم فی تولہ ہے رخالص ممیرے کا ماشہ عہ معری سرمہ فی تولہ ؎ رخرچ ڈاک ذمہ خریدار۔ خط و کتابت کے وقت اخبار کا حوالہ ضرور دیں۔ المشتہر پروفیسر بیا سنگھ اہلو والیہ مقام بٹالہ ضلع گورداسپور

ان سے بڑھکر اور کیا معتبر شہادت ہوسکتی ہے

(۱) میں بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ ممیرے کا سرمہ جو سردار بیا سنگھ اہلو والیہ نے ایجاد کیا ہے بڑی کشش قیمت اور مفید دوا ہے بالخصوص مندرجہ ذیل امراض کے لئے بمنزلہ اکسیر ہے۔ آنکھوں سے پانی کا بہتے جانا۔ وغیرہ۔ سوزش ہر قسم جیکو آنکھ آنا کہتے ہیں جلن اور کمزوری نظر۔ ناخنہ باہر اور اندر کی جھلی کا زخم اور ان سے پیدا ہونا۔ چونکہ اس سرمہ میں کوئی مضر کیمیاوی شے نہیں ہے اسلئے ہر کسی کے لئے اس کا استعمال مفید ہے مفصلات میں جہاں لائق ڈاکٹروں کا ملنا مشکل ہے وہاں ایسی مفید دوا کو ضرور پاس رکھنا چاہیے۔ اس سے میں بلا شک شبہ کہتا ہوں کہ مذکورہ بالا امراض کیلئے ممیرے کا سرمہ ضروری ہی مفید ہے راقم ڈاکٹر ایم۔ بی سانگلی صاحب بہادر ایم ڈی ایم ایس سند یافتہ یونیورسٹی اڈنبرگ انگلینڈ بھٹ

(۲) جناب سردار صاحب تسلیم میں نے آپکا ممیرے کا سرمہ استعمال میں تصدیق کرتا ہوں کہ بیشک یہ سرمہ کمزوری چشم کیلئے بہت مفید ہے۔ میری آنکھیں بالکل کمزور تھیں۔ لگاتار ایک پہر کام کرنے سے معذور ہو جاتا تھا۔ اب میری یہ کیفیت ہے کہ صرف ۲ روز کے استعمال سے تین تین پہر بلکہ تمام اچھی طرح کام کرسکتا ہوں۔ راقم میاں خورشید محمد خان صاحب نواب سر محمد خان صاحب بہادر منیجر ریاست بہاولپور

پانچ ہزار روپیہ انعام } اگر کوئی شخص ممیرے کے سرمہ کی سندات میں سے جو چھپ چکیں ہزاروں ہیں ایک کو بھی فرضی ثابت کر دے اسکو مبلغ پانچ ہزار روپیہ انعام دیا جائیگا۔ جو لاہور کے بنک میں اسی مطلب کیلئے ۱۴ اپریل ۱۹۰۸ء سے جمع کیا گیا ہے۔

جولائی سنہ ۱۹۰۸ء
جلد ۱۵ - نمبر ۴

مخزن

اڈیٹر شیخ عبدالقادر
شیخ محمد اکرام

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

نثر

تصویر گوسائیں تلسی داس مصنف رامائن
مراسم و عادات - مولوی سید مقبول احمد بی-اے - ۱
نت نئی نظارے - شیخ عبدالقادر - ۱۲
مالوہ کی سیر - مولوی سعید احمد صاحب از آگرہ - ۱۹
غرناطہ - سید نذیر حسین صاحب بی-اے - ۳۳
گل کی فریاد - پنڈت شیو نرائن شمیم وکیل چیف کورٹ - ۳۷
علم غذا - منشی دُرگا لال نگم بی-اے - ۴۰
قدیم و جدید عنصر - سید ہاشمی از فرید آباد - ۴۴
موت - سید محمد حسن عابد از آگرہ - ۴۸
شاہین و دراج - مولوی عبدالراشد الخیری - ۵۶

نظم

کلام اکبر - خان بہادر سید اکبر حسین پنشنر جج - ۵۷
دیر و حرم - مولوی حمید الدین حمید - ۵۸
عہد ہارون الرشید - قاضی عبدالعزیز صاحب بی-اے - ۶۱
ماتم جاناں - محمد صفی الدین صاحب آشفتہ از حیدرآباد دکن - ۶۶
کلام آزاد - شمس العلما مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد - ۶۸
تازہ غزلیں
مفتون دہلوی - ۷۰
فصیح دہلوی - ؍؍
منشی افتخار علی جگر بسوانی - ؍؍
سید نذیر احمد اخلاق بنارسی - ؍؍
حامد حسن قادری بچھرایونی - ؍؍

دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

باہتمام شیخ محمد اکرام مخزن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے
● ان شہروں میں اردو مروج ہے
● ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

شبیہ سری گسائین تلسی داس صاحب

مراسم و عادات

مولوی سید مقبول احمد صاحب بی - اے نے ایک تازہ مصری تصنیف سے ذیل کا عجیب مضمون اخذ کیا ہے - جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جدید یورپ کی بہت سی چیزیں کسی نہ کسی صورت میں پرانے عربوں کے ہاں موجود تھیں - جس کتاب سے یہ مضمون لیا گیا ہے - اس کا نام الوفاقات فی العادات ہے اور یہ مصر کے نامور مگر جواں سال ادیب سید محمد توفیق آفندی کی لکھی ہوئی ہے :

(۱) تھیٹر[له] - عربوں میں تمثیلِ واقعات کا طریق رائج تھا - جو اصول میں موجودہ زمانے کے تھیٹر سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے -

ابو عبد الرحمٰن بشر کہتے ہیں کہ خلیفہ مہدی کے عہد میں ایک صوفی مذاق صافی منش عالم تھا جو کار ہائے نیک کی رہنمائی اور شور و شر سے باز رکھنے کا کوئی پہلو ترک نہ کرتا - تہذیبِ اخلاق و تربیتِ نفوس کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو عمل میں لانے سے باقی رہ جاتا ہو - ہر دوشنبہ و پنجشنبہ کو بغداد کی آبادی سے باہر ایک سمت کو چلا جاتا اس کے پیچھے انبوہ کثیر ہوتا - مرد عورتیں اور بچے اس کو گھیر لیتے

له اسے مصر میں تیاترو کہتے ہیں -

اور علقہ کر لیتے۔ ایک بلند ٹیلہ پر چڑھ کر مہیب آواز سے پکارتا۔ "انبیا و مرسلین نے کیا کیا کیا۔ کیا اُنکو خُلدِ بریں میں جگہ نہیں ملی"۔ لوگ کہتے کہ "ضرور بیشک"۔ وُہ کہتا کہ "اچھا ابو بکر صدیق کو پیش کرو"۔ ایک شخص آگے بڑھتا اور سامنے بیٹھ جاتا۔ شیخ کہتا کہ "اے ابا بکر آپ کو خدائے پاک و برتر جزائے خیر دے جو آپ نے رعیت و مخلوق میں عدل فرمایا۔ فرائض و اوامر کو قائم رکھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آپ خلیفہ ہُوئے اور خلافت کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ بعد حلِ و نزاعِ دین کی رسیوں کو ملا کر نہایت مستحکم و اُستوار بنا دیا۔ اور فلاں فلاں کام کئے"۔ اسی طور پر آپ کے دیگر اعمالِ جلیلہ کو بیان کرتا۔ پھر کہتا کہ "انہیں اعلیٰ علیین کو لے جاؤ"۔ بار دوم آواز دیتا کہ "عمرؓ کو بُلاؤ"۔ اِس پر بھی ایک شخص روبرو آجاتا۔ اُس سے خطاب ہوتا کہ "اے ابا حفص آپ کو اسلام کی طرف سے اللہ جل جلالہٗ نیک بدلہ عطا فرمائے۔ آپ نے بڑی بڑی فتوحات کیں اور قلمرو اسلام میں وسعت دی۔ صالحین کی راہ پر چلے۔ ان کو بھی اعلیٰ علیین کو لے جاؤ۔ اور ابو بکرؓ کے برابر جگہ دو"۔ پھر کہتا کہ "اب عثمانؓ کی باری ہے"۔ تو کوئی تیسرا شخص آکر سامنے بیٹھ جاتا۔ اُس سے اس طرح کہتا کہ "اے ذوالنورین آپ نے ان برسوں میں ملے جُلے کام کئے۔ لیکن باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے خلطوا عملاً صالحاً واخر سیئاً عسی اللہ ان یتوب علیھم[1]۔ خیر ان کو بھی ان کے یارانِ ہمدم کے پاس لے جاؤ"۔ پھر پکارتا کہ "علی ابن ابی طالب کہاں ہیں سامنے لاؤ"۔ اس پر بھی ایک آدمی روبرو آتا اس سے وُہ کہتا کہ "اے ابا الحسن جُملہ آپ کو اُمت کی جانب سے جزائے خیر دے۔ آپ نے عدل و انصاف کو فروغ دیا۔ دُنیا میں زُہد اختیار فرمایا۔

[1] (انہوں نے) ملے جُلے عمل کئے کچھ بھلے کچھ بُرے۔ سو عجب نہیں کہ اللہ اُنکی (بھی) توبہ قبول کرلے (پارہ ۱۱۔ سورۂ توبہ رکوع ۱۲)

بندگانِ الٰہی میں کچھ ایسی یکسوئی پیدا کر دی جس پر نہ کسی فتح و ظفر سے نہ کسی شورش و انقلاب سے کوئی اثر پڑا - آپ زکیہ طاہرہ کے زوج اور ذریۃ مبارکہ کے باپ ہیں - اچھا آپ کو بھی اعلٰی علیین میں جگہ دو"۔ پھر کہتا کہ اب معاویہ کو بلاؤ - اس پر ایک شخص سامنے آبیٹھتا - خواجہ اس سے کہتا - تم تو عمار بن یاسر و خذیمہ بن ثابت ذی الشہادتین اور حجر کندی کے قاتل ہو جو محض عبادۃ الٰہی کے لیے خلق کیا گیا تھا - تم نے ہی خلافت کو سلطنت و جہانداری بنا دیا - مخلوقِ ایزدی کو اپنے کام پر لگایا - نعمہائے خداوندی سے دادِ عشرت و عیش دی - سب سے پہلے تم ہی نے سُنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کو بدلا - جنابِ ختمیت مآب کے احکام کی نافرمانی کی اور فلاں فلاں افعالِ ناسزا کیے"۔ مختصراً ان کے بعض اعمال کو شمار کراتا - پھر کہتا کہ "انکو لے جاؤ بہتر ہو کہ تاریکی میں ٹھہرا رکھو"۔ بعد ازاں آواز دیتا کہ "یزید کو بلاؤ"۔ اس پر ایک شخص سامنے آکر بیٹھ جاتا - اس سے متوجہ ہوتا کہ "اے عصیان کار ستم شعار تو نے تو تشنہ دہن اہلِ حرۃ کو قتل کرایا اور تین روز تک مدینۃ الرسول میں محرمات کو مُباح رکھا ہے - حرمِ نبی محترم شفیع اکرم صلعم کی پردہ دری کی - ملحدین منکرین کو پناہ دی اور زبانِ سرورِ کائنات علیہ السلام والتحیات سے لعنتی و مردود ٹھہرنے پر فخر و تکبر کیا - تجھ ہی نے حسین بضعِ بتول سبطِ رسول کو قتل کرایا اور ختم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والثنا کی بیٹیوں کو سبیہ و کنیز بنا کر اونٹوں کے جوال و جوحبین پر لے گیا - اس کو جہنم کے طبقہ اسفل میں پہنچاؤ"۔ اسی طرح ہر ایک والی کا یکے بعد دیگرے تذکرہ کرتا - حتٰی کہ جب عمر ابن عبد العزیز کی نوبت آتی تو کہتا کہ "ہاں عمر کو بلاؤ"۔ ایک متنفس سامنے جا کھڑا ہوتا اُس سے یہ ارشاد ہوتا کہ "تجھ کو اسلام کی جانب سے جزائے خیر ملے - تو نے عدل کو موت کے بعد پھر زندہ کیا۔

اور پتھر دلوں کو نرم بنایا۔ دین کے ستون کو بڑے جد وجہد سے پھر استوار وقائم فرمایا۔ منبروں پر کھڑے ہو کر لعنت بھیجنا ممنوع کر دیا۔ اچھا اس کو لیجاؤ اور صدیقین میں داخل کرو"۔ اس کے بعد جو جو خلفا گذرے ہیں انکا تذکرہ کرتے کرتے دولت بنی عباس پر جب پہنچتا تو خاموش ہو جاتا۔ لوگ عرض کرتے "دیکھئے یہ ابو العباس السفاح امیر المومنین ہے" تو کہتا "کہ ہاں اب بنی ہاشم کی باری آگئی ہے۔ ان سب کا حساب ہٹاؤ اور ان سب کو لے جا کر آتش دوزخ میں جھونک دو"۔

(۲) ہاں۔ یا اسی سے ملتی جلتی رسم مصر کے ترک وچرکس فرمانروایان اسلام میں پائی جاتی تھی۔ البتہ ان کے ہاں ناچ میں عورتیں شریک نہ ہوتی تھیں۔ چنانچہ علامہ مقریزی کی روایت ہے کہ جب اشرف خلیل کے رفیع الشان محل اشرفی کی تعمیر ۶۹۲ھ میں ختم ہوئی تو خلیل نے بہ آئین بہین جشن شاہانہ کیا۔ بزم عشرت اسی قصر جدید میں منعقد ہوئی۔ جملہ امرا و ملوک عظام کو پیام دعوت دے گئے۔ جلیل القدر مہمان مجتمع ہوئے۔ دادِ نشاط دی مستانہ رقص کو کھڑے ہوئے۔ عالم سرور میں سلطان نے خازن دار کو جو سر مجلس حاضر تھا اشارہ فرمایا اس ادا شناس نے اشرفیوں کے توڑے کھول دیئے۔ اہل بزم کے سر پر بے شمار زر و دینار نثار ہوئے۔ علامہ موصوف کا بیان ہے کہ یہ مسلک اس راحت آشنا قوم نے مغلوں سے اختیار کیا تھا۔

(۳) کبھی کبھی یہ لوگ واقعات تاریخی کی صورت بھی اُتارتے تھے جیسا کہ اس زمانہ میں اہل فرنگ کا شیوہ ہے۔ مقریزی اپنے خطط کے جزو ثانی کے صفحہ ۳۱۸ میں تحریر کرتے ہیں کہ بازروی جو وزرا میں نہایت معظم وممتاز گذرا ہے۔ ایک بار اس کے دربار میں قصیر اور ابن عزیز دو حریف مقتور

حاضر ہوئے۔ ابن عزیز بولا میں ایسی تصویر کھینچتا ہوں کہ جو کوئی دیکھے تو یہی سمجھیگا کہ
دیوار سے باہر ہے۔ (شوکت پسند صناعان یورپ کو اس طرز خاص پر بڑا ناز ہے
اور اس فن کو خاص طور پر منسوب و موسوم کیا ہے) قصیر نے جواب دیا مگر میں ایسی
تصویر بناتا ہوں کہ اُس کو دیکھنے والا یہی گمان کریگا کہ دیوار کے اندر ہے"۔
حاضرین بے ساختہ کہنے لگے کہ یہ اور بھی حیرت انگیز ہوگی اور دونوں سے اپنا
اپنا کمال دکھانے کی فرمایش کی۔ دونوں نے دو زنان رقاصہ کی روغنی
تصویریں دو کمانوں کے اندر آمنے سامنے بنائیں۔ ایک ایسی نظر آتی تھی
گویا داخل دیوار ہے۔ دُوسری خارج از دیوار محسوس ہوتی تھی۔ قصیر نے
رقاصہ کی صُورت سفید لباس میں ایک کمان کے اندر بنائی تھی جس پر
سیاہ روغن تھا۔ بعینہ جیسے کمان کی تصویر کے اندر داخل ہو۔ مگر ابن عزیز
نے تو ستم کیا کہ رقاصہ کی بہت سُرخ پوشاک میں زرد رنگ کی کمان کی صُورت
میں بنائی تھی۔ جس کی جھلک کمان سے باہر عیاں تھی۔ اسی کو قدر شناس
بازوری نے بھی زیادہ پسند کیا۔ دونوں کو گراں بہا خلعت پہنائے اور زر و
جواہر انعام دیا۔ قرافہ میں دار النعمان میں یکتائے فن مصور کتامی کی تیار کی
ہُوئی حضرت یوسف علیہ السلام کی کنوے کے اندر والی تصویر تھی۔ تن مُبارک
عریاں تھا۔ کنواں سیاہ رنگ میں دکھایا گیا تھا جب انسان کی نظر اُس پر پڑتی
تو یہی گمان ہوتا کہ پیکر یوسفی کنوے کے روغنی رنگ کا دروازہ ہے۔ (اسی
صنعت کے مشابہ اہل فرنگ کی موجودہ دستکاری ہے جو ملائکہ اور مقدسین کی
صُورت کشی یُونہی کرتے ہیں)۔

مصنف موصُوف کی تحریر سے یہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ اُن کا ارادہ اس بارہ
میں شرح و بسط کے ساتھ لکھنے کا اپنی کتاب ضوء النبراس و انس الجلاس

فی اخبار المزوقین من الناس میں تھا جو محض طبقات مصورین کے تذکرہ میں زیر تالیف تھی"۔ برکۃ الجبش کے منظر" کے عنوان سے علامہ مقریزی لکھتے ہیں کہ اس نظر فریب روغنی نیرنگ کا نظارہ عجب دل کش ہے۔ اس میں طاق اُسی خوبی وصفائی سے دکھائے گئے ہیں۔ جیسے کہ بلندی پر بالائے حوض بنے ہُوئے ہیں۔ سخنورانِ عصر میں سے ہر ایک شاعر اور اس کے شہر کی تصویر بھی اسی میں موجود ہے اور ہر ایک کا ایک ایک مقبولِ عام قطعہ نمونہ کلام کے طور پر درج ہے۔

(۴)۔ وقتِ ضرورت کاغذ اور چمڑے کا استعمال بھی زرِ نقد کے عوض ہوتا تھا۔ جیسا کہ ہمارے زمانہ میں ہُنڈی و نوٹ کا رواج ممالک و دول نے کر رکھا ہے۔ ابو تمام کا قول ہے:-

لو یتنذب عمر للابل یجعل من جلودھا النقد حین غرة الذھب[۱]

تنظیمات مالی میں یہ پہلی ایجاد عہد خلافت امیر المومنین فاروقِ اعظم کی یادگار ہے۔

(۵) عید۔ تیوہار اور دیگر ایام موسم وغیرہ پر وفا اندیش دوستوں کو پھل پھول اور کلیوں کا ہدیۃً بھیجنا بھی معمول تھا جیسا کہ اس وقت اہل فرنگ کی روش ہے۔ نابغہ کا شعر شاہدِ حال ہے ؎

رقاق النعال طیب حجزاتھم یحیون بالریحان یوم السباسب

یوم السباسب ان کے ہاں ایک عید تھی۔

(۶) جب کوئی بات (چیت) بیساختہ پسند آجاتی تو اس کے اظہار یا تعظیم کے لئے دستار یا سر پر جو کچھ ہوتا اُسکو اُٹھا لینا آداب میں داخل تھا۔ کسی محوِ لذت کا کیا خوب قول ہے ؎

---

[۱] شتر مُردہ پر عمر نے ہرگز گریہ نہیں کیا بلکہ اس کے پوست سے روپیہ بنا لیتے تھے جب سونا کمیاب ہو جاتا تھا

ولمّا اتانا بعید الکری خضعنا لہ ورفعنا العمارا

عمارۃ لباس سر سے مراد ہے مگر یہاں بروایتہ دیگر عمار سے مقصود گل و ریحان ہیں۔

(۷) کسی مشہور بڑے آدمی یا کسی صالح و متقی کی یادگار میں مورتیں کھڑی کر دیجاتی تھیں۔ کلمہ یعوق کی تفسیر اس کی دلیل ہے۔ جو قبیلہ کنانہ کا ایک بت تھا۔ یہ شخص اپنے معاصر صلحا میں ممتاز تھا جب مرا تو اس کی تمثال قائم ہوئی۔ لوگ جوق جوق زیارت کو آنے لگے۔ اس کے بعد اسی طرح اسکی سات مورتیں اور تراشی گئیں۔ رفتہ رفتہ جس قدر زمانہ گذرتا گیا لوگ اس کی پرستش کرنے لگے اور انہیں کو بت قرار دے لیا۔

(۸) گھوڑوں کی دُم کاٹنا نو آیندانِ حجاز کا ہنجار قدیم ہے۔ امرؤ القیس کہتا ہے ؎

علےٰ کل مقصوص الذنابا معاود بریدالسری باللیل من خیل بربرا

(۹) عورتیں اپنے لباس کا دامن بہت لٹکاتی تھیں بالخصوص جب نفیس جواہر نگار زیور و پوشاک کسی عید یا تیوہار پر زیب بر ہوتی۔ شمع حسن کا پروانہ پیکر ناز کا دیوانہ وہی امرؤ القیس اس مضمون کو بھی ولولۂ شوق میں بے تکلف ادا کر گیا ہے:-

خرجت بہا امشی تجر وراثنا [1] علےٰ اثرینا ذیل مرط مرحل

(۱۰) سلام کے وقت جھکنا یہ بھی پرانا شیوہ ہے بعض قبائل عرب مثل غسان وغیرہ کے تو اس ادائے خاص کے بڑے دلدادہ تھے۔ باب المصافحہ کی شرح میں امام قسطلانی فرماتے ہیں قیل یارسول اللہ الرجل یلقی اخاہ اینحنی لہ قال لا۔ قال فیاخذ بیدہ ویصافحہ عرض کیا گیا کہ "یارسول اللہ کوئی شخص اپنے بھائی سے ملے تو کیا اس کے لئے جھک جائے؟ فرمایا کہ "نہیں" صرف اسکا ہاتھ پکڑ کر اس سے مصافحہ کرے"۔

(۱۱) یہ دستور جو آج تاجدارانِ فرنگ میں عموماً جاری ہے بعض ملوکِ عرب بھی

[1] یعنی معشوقہ کے ساتھ نکلا جا رہا تھا اور وہ ہمارے نقش قدم پر تصویردار ریشمی ازار کے دامن گھسیٹتی جاتی تھی۔

اس کے پابند تھے۔ یعنی دینار و درم یا سکہ جات مضروبہ پر بادشاہِ وقت کی ہیئت کا ہونا۔ الیتیمہ میں ثعالبی لکھتے ہیں ابی الفرج الببغا کے غلام کا بیان ہے کہ سیف الدولہ کے حکم سے اشرفیاں ڈھالی گئی تھیں جو بطور صلہ و موہبت نہ کہ بہ عوض خدمت دیجاتی تھیں۔ ہر اشرفی کا وزن دس مثقال رکھا گیا تھا اور خود جدت طراز سیف الدولہ کا نام و چہرہ ان پر منقوش تھا۔ ایک روز ابی الفرج کو بھی انہیں میں سے دس مُہریں مرحمت ہوئی تھیں"۔ اور اُس نے علی سبیل الارتجال یہ اشعار کہے تھے:-

نحن بجود الامیر فی حرم ۔ نرتع بین السعود والنعم
ابدع من ھذہ الدنانیر لم ۔ یجر قدیماً فی خاطر الکرم[سلہ]
فقد غدت باسمہ وصورتہ ۔ فی دھرنا عوذۃ من العدم

(۱۲) **سلطنت اور حکمران کا اَمرہ** - جسکو یورپ میں آرموری کہتے ہیں۔ یہ کسی جاندار یا نبات وغیرہ کی تصویر ہوتی تھی۔ یا تاج و نگین کی جس کو فرمانروائے وقت اپنا نشان قرار دیتا اور یہی نشان مختص اشیا مثلاً سکہ۔ علم یا دیگر آثار و مصنوعات سرکاری پر بھی لگایا جاتا تھا۔ چنانچہ ملک الظاہر بیبرس خاقانِ مصر جس کی شہرت حدِ ذکر سے مستغنی ہے۔ شیر کی شکل کو اپنا نشان مقرر کیا تھا اُس کے عہد کے سونے چاندی کے سکوں پر ہمیشہ شیر کی تصویر مضروب ہوتی تھی۔ یہ التفاتِ خسروانہ یہیں تک محدود نہ رہا بلکہ جو عمارات یا رفاہ خلائق کے کام اس کے زمانہ میں تیار ہوئے اُن پر بھی یہی صورت جلوہ گر ہے مثلاً قناطر ابی المنجا۔ قلیوبیہ میں اب تک یہ یادگار پُل باقی ہے جس پر شیر کی ہیئت

سلہ امیر کی بخشش و کرم سے ہم حفاظت میں ہیں۔ نعمت و خوش نصیبی سے بسر کرتے ہیں۔ ان اشرفیوں سے زیادہ نادر کبھی کرم کے خیال میں بھی نہ گذری تھیں۔ امیر کے نام و صورت سے ہمارے زمانہ میں مفلسی سے پناہ مل گئی ہے

نمودار ہے اور جو اسی ملک الظاہر کے حکم سے بنائی گئی تھی۔

(۲۵) **بیوت الامتعہ**- جو میوزیہ (میوزیم) اور انتقیانہ کے نام سے زبان زدِ عام ہیں- جہاں اشیائے قدیمہ اور بادشاہانِ سلف کے پیراہن اُن کے اسلحہ و آثار محفوظ رکھے جاتے تھے۔ ایک قصہ تو نہایت مشہور اور کتب تاریخی میں بہ تواتر منقول ہے۔ امام اصمعی کی نسبت تحریر ہے کہ ایک بار ہارون الرشید اُن سے ملوکِ بنی اُمیہ کے حالات و تذکرے بیان کر رہا تھا۔ جب سلیمان ابن عبدالملک کی نوبت آئی تو اس سے امام صاحب فرمانے لگے "امیرالمومنین مَیں نے تو یہ سُنا ہے کہ وُہ بڑا جلد باز اور کھانے کے لئے بیقرار ہو جانے والا شخص تھا گوسفند بریاں جب روبرو آتا تو سرد ہونے سے پیشتر اُس کے دونوں گردوں کے لئے بے چین ہو جاتا۔ جبہ ہاتھ پر لپیٹ کر گرمی و سوزش سے محفوظ کر کے گردوں کو بے محابا نکال لیتا"۔ رشید بولا خدا تمہارا بُرا کرے تم نے اس قوم کی سیرت و خصائل کو کیسے جانا" اور اسی وقت ناظر توشہ خانہ سے تمام ملوک امویہ کے رخت و لباس منگائے۔ جب سلیمان کے جبّے دیکھے گئے تو اُن کی دونوں آستینیں چکنی اور میلی تھیں۔ اسی طرح قصہ کاسہ ام حکیم دختر یحیی بن الحکم ابن ابی العاص کا ہے جو ہشام بن عبدالملک کی بیگم تھی۔ یعنی ایک مرتبہ کوئی خوش نوا مُطرب کسی خلیفہ بنی عباس کے پاس جو گمان غالب واثق باللہ تھا کچھ اشعار گا رہا تھا جن میں اس کاسہ ام حکیم کا ذکر تھا۔ یہ پیالہ مشہور و معروف تھا خلیفہ ان ترانہ ہائے دلکش سے نہایت محظوظ ہوا۔ فرطِ سرور میں حکم دیا کہ وُہ ساغر ابھی پیش کیا جائے۔ چنانچہ متاع خانہ سے فوراً برآمد کیا گیا اور حکم ملا کہ آج کی شب اسی جام میں مَے گلفام کا دَور ہو۔

(۲۶) مکانات میں داخل ہونے سے پیشتر اجازت لے لینا۔ خواہ دروازہ پر دستک

دیکر یا اور کسی طرح - قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝ احادیث میں بھی اس کے متعلق بہت سے دلائل و احکام موجود ہیں۔

(۱۵) کھانے سے پہلے ورق طعام کا پیش کیا جانا - جس میں کھانوں کے نام جو دسترخوان پر آئینگے مندرج ہوں یا ان کا شمار - تاکہ مہمانوں کو علم ہو جائے کتب اسلامیہ میں اس قسم کی اکثر مثالیں پائی جاتی ہیں - کتاب الاحیاء میں منقول ہے - ایک روز امام ابوحنیفہؒ کی کسی نے دعوت کی - جس وقت کھانا چُنا گیا تو ایک نقشہ پر سب کھانوں کے نام بھی لکھ کر رکھے گئے تھے - ایسا ہی واقعہ عبدالاعلیٰ بن عبداللہ بن عامر بن کریز کا بھی ہی - بلال بن ابی بردہ نے عبدالاعلیٰ کے کسی مصاحب سے پوچھا کہ جب کھانا روبرو لایا جاتا ہی تو یہ بزرگوار آپ کی کس طرح مدارات فرماتے ہیں"۔ اُس نے جواب دیا کہ ہاں جب ہم شریک بزم ہوتے ہیں اور وقتِ طعام آجاتا ہی تو بکاول اوّل حاضر ہوتا ہی - اس سے دریافت کیا جاتا ہی کیا کیا تیار ہی؟ وہ ایک ایک کر کے سب قسم کے کھانے گنتا ہی"- بلال نے پوچھا اس کی وجہ کیا ہی اور کیا حاصل ہی"- جواب دیا "تاکہ حاضرین آگاہ ہو جاویں اور خود تجویز کر سکیں کہ کس کس چیز کی انکو ضرورت نہوگی اور جس چیز کی خواہش ہو اسی کو لیں"۔

(۱۶) جاحظ کی کتاب الحیوان کے اوائل میں یہ عبارت ہی"- یہ مقالہ ان اشخاص کے بیان میں ہی جنکو وجوب امامۃ سے انکار ہی اور جو ائمہ کی اطاعت سے باز رہنا اور باز رکھنا چاہتے ہیں - جن کا گمان یہ ہی کہ عوام الناس کو بلا کسی نگہبان کے چھوڑنا اور بلا سردار کے فوج کا آزاد رہنا زیادہ مناسب ہی اور کچھ اسی میں انکی فلاح دنیوی

لہ مسلمانو اپنے گھروں کے سوا (دوسرے) گھروں میں گھر والوں سے پوچھے اور ان سے سلام علیک کئے بدون نہ جایا کرو - یہ تمہاری حق میں بہتر ہے کہ تم خیال رکھو (پارہ ۱۸ - سورۂ نور - رکوع ۴) ∴

اور سلامت اُخروی متصور ہو۔ اُنکی بدنظمی و پریشانی انکو شور و شر سے دور اور ہمیشہ راست روی پر مجبور رکھے گی"۔ اس عنوان سے پتہ چلتا ہو کہ خواہ مخواہ اُسوقت بھی کوئی ایسا ہی فرقہ تھا جیسے اس زمانہ میں فوضوی اور نہلسٹ ہیں اور جن کے اقوال انکے اقوال کے مطابق اور جنکے خیالات اُنکے خیالات کے موافق تھے۔

ان کے علاوہ بیشتر الفاظ بھی متحد المعنی والمطلب پائے جاتے ہیں۔ مثلاً کلمۂ حمادِ جو یورپ کے کلمہ مرسی کے مترادف ہو یعنی آپ کا شکریہ بجالاتا ہوں دوسرا الکلمۃ المسمعۃ جس سے ٹیلیفون مراد ہو (شرح قاموس ملاحظہ ہو) تیسرا لفظ مرحی ہو۔ یہ اسوقت بولتے تھے جب کسی کا نشانہ درست لگے۔ ممکن ہو کہ یہ لفظ یورپ کے "براوو" کا قائمقام سمجھا جاوے۔ بہرحال جس قدر حضراتِ عرب کی تمکین و شوکت اُنکے تمدن و معاشرت پر غور کیا جائیگا اسی قدر زیادہ اُن میں ایسے دستور و عادات ملینگے جو آج فرزانگانِ یورپ کے مایہ ناز ہیں + مقبول

شب کوئی مثالِ شبِ فرقت نہیں دیکھی | دیکھی ہو مگر ایسی مصیبت نہیں دیکھی
کمبخت مرا دل ہے کہ زندانِ بلا ہے | ابتک تو نکلتی کوئی حسرت نہیں دیکھی
جو دیکھنے والے ہیں تیرے ان کا بیان ہو | تل بھر تیری آنکھوں میں مروت نہیں دیکھی
کھلا گئے وہ میں نے کہا پھول جو اُن کو | دیکھے تو ہیں نازک یہ نزاکت نہیں دیکھی
آؤ تپشِ دل کی تمہیں سیر دکھاویں۔ | چتون کی اگر تم نے شرارت نہیں دیکھی
آئینے میں کیا چیز ابھی دیکھ رہے تھے | پھر کہتے ہو اللہ کی قدرت نہیں دیکھی
جاڑوں کا زمانہ ہو کہ گرمی کا زمانہ | ہمنے کبھی چھوٹی شب فرقت نہیں دیکھی
اللہ ری تاریکی شبہائے جدائی | آنکھوں نے کبھی خواب کی صورت نہیں دیکھی
کیا جانئے کیا آج وہ ہیں مانگنے والے | ایسی تو کبھی اُنکی عنایت نہیں دیکھی
دیکھے ہیں طرحدار چھبیلے آنکھ سے لاکھوں | دل جس کا ہے آئینہ وہ صورت نہیں دیکھی

نت نئے نظارے

*

(۳)

۲۰ جولائی ۱۹۰۶ء - لوسرن میں ایک دن اور ایک رات ٹھہر کر ہم اٹلی کی طرف روانہ ہوئے۔ دن کے دس بجے جو گاڑی چلی اُس نے ۵ بجے کے قریب ہمیں اٹلی کے مشہور شہر میلان میں پہنچا دیا۔ دن بھر سوٹ زرلینڈ کے نظر فریب سین آنکھوں کے سامنے رہے۔ اس سے زیادہ دلچسپ اور پُرلطف سفر کیا ہوتا۔ مگر یہ پھول کے ساتھ کانٹا لگا ہوا ہے۔ راستے میں اس قدر ٹنل پڑے کہ دھوئیں کے مارے بار بار دم گھٹتا تھا اور روح کو جو تازگی اور فرحت سبز پوش پہاڑوں انکی سفید چوٹیوں اور اُنکے آبشاروں کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ وہ سب اس دھوئیں سے مبدل بہ پریشانی ہو جاتی تھی۔ کبھی صنعت اور اہل صنعت پر غصہ آتا تھا۔ کہ اُنہوں نے اپنے طمع کی خاطر قدرت کے پاکیزہ اور شاندار مناظر کے ساتھ کس قدر زیادتی کی ہے۔ اور انکی عمدگی اور پہاڑوں کے سکون میں کتنا خلل ڈالا ہے مگر ساتھ ہی انصاف یہ کہتا تھا۔ کہ اُن کی کوکنی کی داد دیجائے اور چونکہ ان کا منشا اُن کارناموں سے محض ذاتی فائدہ یا ذاتی نمود نہ تھا۔ بلکہ اُن کی یہ کوشش تھی کہ ہزاروں بندگان خدا جو ویسے ان نظاروں سے بالکل محروم رہتے۔ انہیں ان سے بہرہ ور کیا جائے۔ اس لیے انکی محنتیں شکریہ کی مستحق ہیں نہ کہ شکایت کی۔ یہ ٹنل ہی ہیں جن کی بدولت گویا زمین کی طنابیں کھینچکر عصر جدید کے ان فرہادوں نے سوٹ زرلینڈ اور اٹلی کو ملا دیا ہے۔ سب سے بڑا

* اس سلسلہ کا دوسرا نمبر ماہ جون ۱۹۱۱ء کے مخزن میں چھپا ہے

ٹنل جو ہمارے راستے میں پڑا وُہ سنٹ گا تھرڈ کا مشہور ٹنل تھا جس کے اندر ریل آدھ گھنٹے کے قریب رہی۔ اس سے دُوسری طرف مُلک کا نقشہ بدلنے لگا۔ بلند پہاڑوں کی جگہ میدان نظر آنے لگے۔ مگر یہ میدان سرسبزی میں رشکِ گلزار تھے۔ تھوڑی دیر بعد آسمان کے صاف نیلگوں رنگ اور آفتاب کی تیز چمک نے خبر دی کہ اٹلی کی تاریخی سرزمین شروع ہوئی۔ اسٹیشنوں کے ناموں نے اس خبر کی تصدیق کی۔ لوگانو۔ کیاسو۔ کامو۔ جس نام کو پڑھو واو پر ختم ہوتا ہی۔ یہ احساس کہ ہم اٹلی میں ہیں ایک عجب کیفیت رکھتا تھا۔ انگلستان اور فرانس کے مصنّفین نے نظم و نثر میں اٹلی کی اس قدر تعریف کی ہی اور اتنے فسانے اور ڈرامے یہاں کے قصّوں پر مبنی ہیں۔ یہاں کی تاریخ کا تاریخ یورپ پر بالخصوص اور تاریخ عالم پر بالعموم اتنا اثر پڑا ہی۔ کہ اس میں داخل ہوتے ہی خود بخود طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی سرزمین بُت پرست روما کی شاہنشہی دیکھ چکی ہے۔ یہی پاپائے اعظم کے خود مختارانہ تسلط سے پامال ہو چکی ہی۔ اور یہی کچھ عرصہ ہُوا اپنے میزینی اور گیریبالڈی کے ذریعہ دُنیا کو سبق آموزِ آزادی رہی ہے۔ یہی وُہ مُلک ہی جس نے فنِ تصویر و بُت تراشی کو کمال پر پہنچا دیا ہی اور جہاں اب بھی ان فنون کے طالب مشقِ فن بہم پہنچانے اور اساتذہ کی صحبت سے مستفید ہونے آتے ہیں اور یہی مُلک ہی جہاں کے باشندوں کو حسنِ صُورت میں یورپ کے شمالی ممالک سے امتیاز حاصل ہی۔ صباحت اور ملاحت یہیں یہاں آشتی ہے۔ اور بہت سی صُورتیں ایسی نظر آتی ہیں جن میں حسینانِ انگلستان کا سُرخ و سپید رنگ۔ خوبانِ فرانس کی نزاکت اور ماہ رویانِ مشرق کی سی سیاہ آنکھیں۔ سب خوبیاں یکجا پائی جاتی ہیں۔ جوں جوں ریل میلان کے قریب ہوتی جاتی تھی شوق بڑھتا جاتا تھا۔ یہ غنیمت

ہوا کہ ریل شام سے پہلے پہنچ گئی۔ سٹیشن پر لکھا دیکھا۔ میلانو اور جی خوش ہوگیا۔ اُترتے ہی ایک ہوٹل میں اسباب رکھ بازار کا رُخ کیا۔ اور شام کے وقت کو یوں استعمال کرلیا۔ سفر کی کوفت نے شب گردی کی قابلیت باقی نہ چھوڑی تھی۔ اِس لئے رات کو بیہوش لیٹ گئے اور دُوسرے دن صبح سے باقاعدہ سیر شروع ہُوئی۔ باوجود اجنبیت کچھ مانوس سی معلوم ہوتی تھی

۲۱۔ جولائی | اٹلی میں ایک عجیب بات یہ تھی کہ کہیں خوبصورت صاف اور کھلی سڑکوں اور ایسی سربہ فلک عمارات کو چھوڑکر جو ہندوستان کے بڑے شہروں کلکتہ اور بمبئی میں بھی کمیاب ہیں۔ وہاں کئی باتیں ہمارے ملک سے ملتی جُلتی ہیں۔ سب سے پہلے تو آب وہوا ہے۔ گرمی کے موسم میں گرمی خاصی پڑتی ہے۔ اور شام کیوقت لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر باہر بیٹھتے ہیں کہ ذرا ہوا لگے مکانوں میں بھی ایک مشرقی رنگ موجود ہے۔ مثلاً بہت سے مکان امرا کے ایسے نظر آئے جن کے بہت بڑے بڑے دروازے ہیں۔ اور ان دروازوں کے اندر صحن اور صحن میں چھوٹے چھوٹے باغیچے ہیں۔ بجائے اس کے باغیچہ مکان کے گرد ہو جیسے انگریزوں میں رواج ہے۔ امرا اور شرفا کی عورتیں سوائے اس کے کہ گاڑیوں میں شام کے وقت سیر کو نکلیں بازار میں بہت کم نکلتی ہیں۔ دوپہر کے وقت کاروبار بہت کچھ سُست رہتا ہے۔ اور لوگ دوپہر کی نیند کے مزے سے آشنا ہیں۔ مقامِ غور ہے کہ آب وہوا کسی ملک اور اہلِ مُلک کی عادات پر کتنا زبردست اثر رکھتی ہے۔ بازاروں اور کوچوں میں شور بھی اٹلی میں انگلستان اور فرانس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ کئی لوگ جو ٹوکریوں میں رکھ کر یا چھکڑوں میں لاد کر ترکاری یا پھل پھول بیچتے ہیں۔ وُہ تو اس طرح آواز لگاتے ہیں جیسے ہمارے ہاں کے دوکاندار۔

یہاں تک کہ میں نے میلان میں ایک صبح ایک فقیر کو بھی صدا دیتے سُنا اور یورپ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایسی صدا میرے کان میں پڑی - اٹلی کا ٹھیک اندازہ کرنے کے لئے رَوما کو دیکھنا ضرور ہے - مگر افسوس تنگیٔ وقت نے ہمیں میلان و وینس صرف دو مشہور مقامات کی سیر پر قناعت کرنے پر مجبور کیا - اور انہیں بھی جی بھر کر دیکھنے کا موقعہ نہ دیا -

میلان میں ایک بڑی نمائش انہی دنوں میں ہو رہی تھی - اور یہ نمائش انٹرنیشنل یعنی بین الاقوام تھی - ہمارا بہت سا وقت اس نمائش میں صرف ہوا لیکن اس کے تفصیلی حالات لکھنے کی ضرورت نہیں وُہ صرف اسی صورت میں دلچسپ ہوتے کہ اُنہی دنوں میں لکھے جاتے جب نمائش جاری تھی - اُس زمین کا رقبہ جس میں یہ نمائش ہو رہی تھی - دس لاکھ مربع گز یعنی پیرس کی مشہور نمائش کے قریب قریب تھا اور اس سارے رقبہ کا تیسرا حصہ نمائش کی عمارات سے گھرا ہُوا تھا - آسٹریا بلجیم - بلگیریا - کنیڈا - چین - کیوبا - ڈنمارک فرانس - جرمنی - جاپان - انگلستان - ہالینڈ - پرتگال سوٹزرلینڈ - ٹرکی اور ایران یہ سب ممالک اس نمائش میں شریک تھے - اور سب نے اپنی اپنی مصنوعات کے نمونے ان میں بھیجے تھے - ایک ہال میں بحری سامان کی نمائش تھی - ایک میں ریل کے انجنوں اور گاڑیوں کے عمدہ ترین نمونے رکھے گئے تھے اور اس صیغے میں جرمنی - آسٹریا اور ہنگری میدان مقابلہ میں اُترے تھے - زراعت کے صیغے میں کینیڈا کا حصہ نہایت خوبصورت اور شاندار تھا - بازار مصر کا نمونہ لوگوں کی تفریح کے لئے وہاں رکھا گیا تھا - جس میں قاہرہ کی زندگی کے خراب پہلو دکھلانے کی کوشش غالب نظر آتی تھی - اہل یورپ مشرقی زندگی کی تصویر جب کبھی کھینچتے اور اپنے ابنائے وطن کو دکھلاتے ہیں تو اس کے تاریک پہلو کو ہی لیتے ہیں - ٹرکی اور ایران کے قالین

عمدگی میں لاجواب تھے۔ مگر افسوس کہ اور کوئی مصنوعات وہاں سے قابل نمائش نہ نکلیں۔ ہماری آنکھیں نمائش میں ہندوستان کو ڈھونڈھتی تھیں۔ کہ کہیں اس کا بھی شمار بین الاقوام ہی یا نہیں۔ آخر بہت تلاش سے خیمۂ انگلستان کے سایۂ عاطفت میں کچھ جے پور کے ظروف اور کچھ بنارس کے دوپٹے ایک الماری میں سجے ہُوئے نظر آئے۔ معلوم نہیں کس وجہ سے خود انگلستان کا حصہ اس نمائش میں بہت خفیف تھا۔ پس اس حصے میں سے ہندوستان کے حصہ میں کیا آتا۔ ہاں جو موجود ہوگیا یہی غنیمت تھا۔ لیکن ہمارے ملک کو آیندہ ایسے مواقع سے فائدہ اُٹھانے اور ہندوستان کی مصنوعات کو دُنیا کی منڈیوں میں پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہندوستان کی بہت سی صنعتیں مٹ گئیں اور مٹتی جاتی ہیں تاہم بھی ابھی یورپ و امریکا کے خوش مذاق اور انصاف پسند قدردانوں سے باجِ تعریف لینے کے لئے دستکاری کے کافی نمونے ہم جمع کر سکتے ہیں۔ اگر اطرافِ ہند سے بہترین مصنوعات جمع کرنے کی ہم کوشش کریں۔

۲۲- جولائی | نمائش میں کام کی چیزوں کے علاوہ جن سے تجارت اور صنعت کی ترقی کا حال دکھلانا مقصود ہوتا ہے۔ ہمیشہ بہت سے کھیل تماشے لوگوں کو کھینچنے کے لئے لگے ہوتے ہیں۔ چونکہ ان دنوں میں نمائش کے سبب لوگوں کا مجمع زیادہ نمائش میں ہی ہوتا اور شہر کی سڑکیں سوائے شام کے وقت کے سونی پڑی رہتی تھیں۔ اس لئے ہم نے ۲۲- جولائی کا بھی بیشتر حصہ نمائش میں ہی کاٹا۔ اور وہاں کے عجیب تماشوں میں سے بعض تماشے دیکھے۔

۲۳- جولائی | شہر میلان میں سب سے بڑھ کر قابلِ دید چیز وہاں کا گرجا ہے۔ جس کا شمار دنیا کی مشہور ترین عمارتوں میں ہے۔ باہر سے تو ہم نے اُسے آتے ہی دیکھ لیا تھا۔ آج اندر سے بھی دیکھا اور اس کی چھت پر بھی چڑھے۔ یہ شہر کے مرکز میں واقع ہے۔ ہمارا

بھی اس کے قریب تھا - اور جب ہم باہر نکلتے تھے تو راستہ کا پتہ لگانے میں ہمیں اس سے بہت مدد ملتی تھی اور کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی - ورنہ زبان نہ جاننے کے سبب بہت مشکل ہوتی - اس گرجا کو یہاں ڈوموکہتے ہیں - اور کہا جاتا ہے کہ شاید اس سے زیادہ خوبصورت گرجا دُنیا میں نہیں ہے - ۱۳۸۶ء میں اس کی بنیاد رکھی گئی - عجیب بات ہے کہ گرجا بننے سے پہلے بھی یہ زمین معبد کے طور پر ہی استعمال ہوتی تھی - اور یہاں منروا دیبی کی پرستش کے لئے ایک مندر تھا - بنا ہونے کے وقت سے آج تک کم و بیش زیر تعمیر ہی رہا ہے - نپولین اول نے اس کے جلد مکمل کرنے میں بہت کوشش کی مگر جلدی کا کام ویسا نفیس نہ بنا جیسا باقی حصے کا کام ہے جو پہلے سے تیار ہو چکا تھا - اندر باہر اسکی آرائش میں جو محنت صرف ہوئی ہے وہ دیکھنے والے کو حیرت میں ڈالتی ہے - ہزاروں چھوٹے چھوٹے میناروں اور کنگروں کے ساتھ ساتھ چھ ہزار قد آدم بُت استادہ ہیں جو آسمان سے باتیں کر رہے ہیں - جس کونے سے اس عمارت کو دیکھو ایک نیا حُسن نظر آتا ہے اور ہر در و دیوار سنگ مرمر کے عمدہ کام کا ایک نمونہ ہے - اِس کی عمارت جیسی باہر سے خوشنما ہے اُسی قدر اندر سے شاندار ہے - ہم نے جس دن اسے دیکھا اُس دن ایک بہت بڑا مجمع کتھولک مردوں اور عورتوں کا اس میں مصروف عبادت تھا - مگر عمارت کا فقط ایک گوشہ اُن سے آباد تھا اور باقی جگہ خالی تھی -

ڈوموکے علاوہ اور بھی شاندار عمارتیں اس شہر میں ہیں - مگر ایسی اہمیت نہیں رکھتیں - شہر کے ہر چوک میں یا اور نمایاں مواقع پر بہت سے رُوئیں اور سنگین بُت استادہ ہیں - جو اہلِ ملک کے مذاق بت تراشی اور قدر دانی

بزرگانِ ملک وملّت پر دلالت کرتے ہیں یہاں لوگوں کی عادات اور چلنے پھرنے میں وہ چستی اور چالاکی جو شمالی یورپ کی اقوام کا خاصّہ ہے نظر نہیں آتی - اور آرام طلبی کی طرف زیادہ مائل ہیں - فرانس کی طرح یہاں کے لوگ بھی باتیں کرتے وقت اپنے شانے ہلاتے ہیں - کھانے کا طریق گو سارے یورپ میں ایک ہے پھر بھی اہل اٹلی کے کئی کھانے ہمارے ہاں کے کھانوں سے ملتے ہیں - خصوصاً سوّیوں کا یہاں بہت رواج ہے - شوربے میں ڈال کر کھائی جاتی ہیں - حلوے یا کھیر کی صورت میں میٹھی پکائی جاتی ہیں - تلی ہوئی بھی کہیں کہیں بکتی ہیں - گانے کا شوق ان لوگوں کو بہت ہے اور اب تک یورپ کے بہت سے مشہور گوّیے اٹلی سے آتے ہیں - لباس میں بھی رنگینی یہاں زیادہ پائی جاتی ہے - فرانسیسی کی طرح اہل اطالیہ کی زبان بھی شیریں ہے اور ایک خاص نرمی اور ملائمت اُن کے لہجے میں ہے جو انہی کا حصّہ ہے - اطالی زبان فرانسیسی زبان سے بہت کچھ ملتی جلتی بھی ہے - ایک جگہ اس مشابہت سے خوب کام نکلا - فرانسیسی میں "توت" "کُل" کو کہتے ہیں - مجھے معلوم نہ تھا کہ اطالی میں بھی اس کے لیے یہی لفظ ہے - صرف تلفّظ میں ذرا فرق ہے - ایک ریسٹوران میں ہم بیٹھے تھے وہاں کے ملازم سے کھانا مانگا مگر گونگوں کی طرح فہرست لیکر ایک چیز پر انگلی دھرتے تھے تو کہتی تھی کہ یہ لاؤ وہ جاتا تھا اور آ کر کہتا تھا "ترمینا" تو یعنی ختم ہو گیا - اب نہیں جانتے تھے کہ اسے کیونکر کہیں کہ کچھ باقی بھی ہے یا نہیں جب دو تین دفعہ اُس نے یہی جواب دیا میں تنگ آگیا اور میں نے فرانسیسی لفظ کو اطالی صورت دی اور خفا ہو کر اُس سے کہا "توتو ترمیناتو؟" یعنی سب کچھ ختم ہو گیا ؟ اتّفاق سے یہ فقرہ درست تھا وہ چونکا ہوا اور اس نے وہ چیزیں گن دیں جو اس کے پاس موجود تھیں اور اُن سے انتخاب کر کے ہم نے اپنا پیٹ بھر لیا +

عبد القادر

سلہ یہی لفظ ہے جو انگریزی میں بھی مستعمل ہے - "ٹرمی نیٹ" یعنی ختم ہو گیا

مالوہ کی سیر

قلعہ شادی آباد مانڈو

(۴)

اشرفی محل

جامع مسجد کے محاذ میں ایک عالیشان اور خوبصورت عمارت کے منہدمہ نشان ہیں جو اشرفی محل کے نام سے موسوم ہے۔ منقول ہے کہ اس میں لاکھوں طلائی اشرفیاں جڑی ہوئی تھیں۔ تھوڑا عرصہ ہوا کہ ایک اشرفی وہاں ایک شخص کو ملی تھی اُس نے اندر اَور راجہ دربار کو جا کر بطریق تحفہ نذر کی۔ تیس ماشہ اس کا وزن تھا اور کلمہ طیبہ منقوش تھا۔ اس عمارت کی کُرسی کے نیچے دالان اور حجرے بنے ہیں۔ گوشہ شمال و مغرب اور جنوب و مغرب میں کے وسیع بُرجوں کا کچھ حصہ بھی باقی ہے۔ عالیشان دروازہ جامع مسجد کے صدر دروازہ کے ٹھیک سامنے سنگ مرمر کا تھا جس کا گنبد گر گیا صرف دیواریں باقی ہیں اس کے اندر بہت سی پختہ اور سنگین قبریں بنی ہوئی ہیں۔ وسط میں جو خوبصورت سنگ مرمر کی عمارت تھی اس کی بھی چھت گر گئی۔ صرف اندر کا فرش اور کچھ دیواریں باقی رہ گئی ہیں جو اس شکستگی کے عالم میں بھی ایسی شان رکھتی ہیں کہ وہاں سے ہٹنے کو دل نہیں چاہتا۔ یہ عمارت مربع شکل کی تھی جس کا ہر ضلع ۶۳ فیٹ ۵ انچہ ہے۔ چاروں طرف تین تین دروں کے نشان ہیں جن کے اطراف میں آیات قرآنی کے کتبے سنگ مرمر کے اندر مختلف خوبصورت پتھروں کی پچیکاری سے تحریر تھے جن کا کچھ حصہ اب تک باقی ہے اور بہت سے ٹوٹے ہوئے کتبہ کے پتھر

رکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہی کہ پوری سورۂ یٰسین کندہ تھی اس کتبہ کے حروف بہت بڑے بڑے اور خوش خط ہیں۔ چنانچہ کتبہ کے پتھر کی چوڑائی ایک فیٹ ۵۔ انچہ ہی۔ درمیان میں تین قبروں کا نشان اور ایک ٹوٹا ہوا نہایت نفیس و خوبصورت اور صاف و شفاف سنگ مرمر کا زنانہ تعویذ رکھا ہی جس کی مینت کاری اور نازک و نفیس بیلوں اور مولسری کے ہار کی تراش خراش نہایت دلفریب ہی۔ اس کے اوپر کلمۂ طیبہ اور محراب کے اندر اللہ اکبر خوشخط لکھا ہی۔ کمرہ کے اطراف میں بہت سے سنگ مرمر کے منقش خوبصورت ٹکڑے پڑے ہیں کسی میں نفیس بیل ہی کسی میں گلدستہ اور طرح طرح کی پھول پتیاں بنی ہیں۔ ایک بچہ کا چھوٹا سا سنگ مرمر کا نفیس تعویذ بھی پڑا ہی خیال کرو کہ اس کے غمزدہ باپ نے کس شوق و محبت سے اُسے بنوایا ہوگا اور آج کہاں سے کہاں پڑا ہے۔ دروں کے اطراف میں کہیں کہیں دلفریب مینت کاری باقی رہ گئی ہی جو عمارت کی گذشتہ خوبصورتی کا زبانِ حال سے اظہار کر رہی ہی۔ اس کمرہ کے درمیان میں کھڑے ہو کر مغرب کی طرف دیکھیں تو مسجد کی اندرونی درمیانی محراب صاف دکھائی دیتی ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس صاحب قسمت کی آخری آرامگاہ ہی صرف کتبہ ذیل سے جو مشرقی جانب کے درمیانی بڑے در کی جنوبی دیوار پر کندہ ہی بانی کا نام معلوم ہوتا ہی۔ "بر تماشائیان فیروزہ رواق پوشیدہ نماند کہ در زمان دولت و سلطنت حضرت خلافت پناہی ظل الٰہی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی فقیر حقیر محمد طاہر ابن عماد الدین حسین ابن سلطان علی سبزواری تعمیر این بنائے عالی یافت۔ در ماہ محرم سال ہزار و چہار (۱۰۰۴ھ ۱۵۹۵ء) لیکن یہ کل عمارت محمد طاہر کے عہد کی تعمیر نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ اس کمرہ کے باہر جو قبریں ہیں وہ پرانی معلوم ہوتی ہیں خصوصاً حضرت عبداللہ شطاری رح کا مزار جس کا حال آگے بیان ہوتا ہی۔ ضرور ہی پرانا ہے۔ میرے قیاس میں اسی جگہ

منارہ ہفت منظری تھا جس کا حال مناسب موقع پر بیان ہوگا +

درگاہ حضرت عبداللہ شطاریؒ

شیخ عبداللہ شطاریؒ کا نسب پانچ واسطہ سے حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ تک پہنچتا ہے اور ارادت میں سات واسطہ سے بابا بایزید بسطامیؒ سے سلسلہ ملتا ہے۔ اخبار الاخیار میں ہے کہ آپ کا سلسلہ پانچ واسطہ سے شیخ نجم الدین کبریٰؒ تک پہنچتا ہے۔ آپ شطاریہ خاندان کے پہلے بزرگ ہیں کہ ایران سے سلطان محمود خلجی یا غیاث الدین خلجی کے عہد میں ہندوستان میں وارد ہوکر مانڈو میں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ کے مدفن کے باعث سے مانڈو کو خاص روحانی عظمت حاصل ہے۔ ۸۹۰ھ (۱۴۸۵ء) میں آپ کا وصال ہوا۔ ہندوستان میں آپ کے بہت سے مشہور خلیفہ صاحب کمال بزرگ ہوئے۔ حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری حاجی حمید غزنوی گوالیاری کے اور شیخ قاضی بنگالی کے اور وہ شیخ عبداللہ شطاریؒ کے خلیفہ تھے۔

اشرفی محل کے گوشہ جنوب و مغرب میں ایک چہار دیواری کے اندر آپ کا مزار پُرانوار ہے جس کے اوپر چنبیلی کا جھاڑ سایہ کیے ہوئے ہے۔ یہاں کے جنگلی لوگ آپ کو ستارے پلنگؒ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ بزرگی کی اب تک یہ شہرت ہے کہ ریاست کی طرف سے ایک فقیر تین روپیہ ماہوار کا جاروب کشی کے واسطے مقرر ہے۔ اشرفی محل اور جامع مسجد کے درمیان میں ترپولیہ کا نشان ہے اور اسی کے قریب مانڈو کی موجودہ آبادی ہے +

مقبرہ ہوشنگ شاہ غوری

جامع مسجد کی مغربی دیوار سے ملحق یہ مقبرہ واقع ہی جسے ۸۴۳ھ / ۱۴۳۹ء میں سلطان محمود خلجی نے تعمیر کرایا تھا اس کی چہار دیواری کے دروازہ پر گنبد ہے۔ مغرب کی جانب لنگر خانہ کا وسیع دالان در دالان اور احاطہ کے اندر سیکڑوں سنگین قبریں ہیں۔ درمیان میں چھ فیٹ بلند چبوترہ پر سنگ مرمر کا نہایت وسیع اور خوبصورت گنبد ہے۔ گنبد کے نیچے کا حصہ مربع ہے جس کا ہر ضلع ۴۹ ۱/۳ فیٹ ہے۔ درمیان میں ایک چبوترہ پر ہوشنگ شاہ کے مزار کا خوبصورت تعویذ ہے جسکے اوپر کلمہ طیبہ اور یا غفور کندہ ہی۔ اس گنبد کے اندر پانچ قبریں اور بھی ہیں مگر کتبہ کسی پر نہیں۔ لیکن معتمد خاں کے اقبالنامہ جہانگیری سے واضح ہوتا ہی کہ یہ قبریں خانجہاں پدر سلطان محمود۔ سلطان محمود۔ سلطان غیاث الدین۔ سلطان محمود ثانی کی ہیں۔ پانچویں قبر سلطان ناصر الدین کی تھی لیکن اُسے جہانگیر نے اس الزام پر کہ اُس نے اپنے باپ کو زہر دیا تھا۔ کھُدوا کر ہڈیاں دریائے نربدہ میں پھینکوادی تھیں۔ شاید کسی نے پھر تعویذ رکھدیا ہوگا یا کسی اور کی قبر ہوگی۔ ہوشنگ کا انتقال ۸۳۸ھ / ۱۴۳۴ء میں ہُوا تھا۔ جس کی تاریخ "آہ ہوشنگ شاہ نماند" ہے۔ اندر ہی مشرقی دیوار میں زینہ ہے جس کی ۳۷ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچتے ہیں۔ درمیانی گنبد کے علاوہ چاروں گوشوں پر چھوٹے چھوٹے گنبد ہیں۔ دروازہ کی بیرونی پیشانی پر کتبہ کے پتھر کا نشان پایا جاتا ہی جواب موجود نہیں رہا۔ ریاست کی طرف سے ۱۲ ماہوار ایک ضعیفہ کو ملتا ہی جو اس روضہ کی مجاور ہے۔

اس گنبد کے لداؤ اور دیواروں میں بحساب ہندسہ قواعد علم ریاضی باریک سوراخ بنے ہیں ہوا اُس میں سرایت کرتی تھی اور ہمیشہ قطرات آب اُن

سوراخوں سے ٹپکا کرتے تھے ۔ عوام الناس اسے ہوشنگ کی کرامت تصوّر کرتے تھے ۔ بہت سے قدیم مورخوں اور جدید سیاحوں نے اس کا چشمدید حال لکھا ہی ۔ نہ معلوم کسی مصالح کا اثر تھا جو ختم ہوگیا یا کیا کہ اب دو تین برس سے پانی کا ٹپکنا بند ہو گیا ہی لیکن پرانے نشانات اب تک موجود ہیں ۔ یہاں کے لوگوں کا بیان ہی کہ چھت پر ایک چروا (سبوچہ گِلی) لٹکتا تھا ایک صاحب بہادر نے جو سیر کو تشریف لائے تھے اُس پر بندوق کا نشانہ مارا گولی لگنے سے چروا ٹوٹ گیا اور اس کے اندر کوئلہ سے نکلے ۔ اُس وقت سے پانی کا ٹپکنا بند ہو گیا۔

محلّاتِ شاہی

دہلی دروازہ سے شاہانِ غوری اور خلجی کے قصور کے کھنڈر شروع ہو جاتے ہیں جو تخمیناً ایک میل تک بنے ہوئے تھے ان میں بہت سے گر کر پتھر اور چونے کے ڈھیر ہو گئے اور اُن پر ہزاروں بڑے چھوٹے جنگلی درخت کھڑے ہیں ۔ یہاں کی عمارتوں کو جنگلی درختوں نے سخت نقصان پہنچایا یہ جنگلی درخت پتھر کی درازوں میں اپنی جڑیں جما کر تمام عمارت کو ہلا دیتے ہیں ۔ صدیوں یہاں کی عمارت کس مپرسی کی حالت میں رہی اگر یہ درخت کٹتے رہتے تو یہ عمارت صدہا سال تک قائم رہتی ۔ خاص عمارتیں جن کی چند سال سے کچھ نگہداشت اور صفائی ہوئی ہے یہ ہیں :۔

جہاز محل ۔ یہ ایک وسیع پختہ تالاب کے کنارہ پر جہاز کی شکل کا بنایا گیا تھا ۔ مغربی جانب درمیان میں ایک ہوادار نشستگاہ آگے کو نکلی ہوئی بنی ہی ۔ جس کی چھت پر کسیقدر رنگ آمیزی باقی ہی ۔ درمیان میں کئی درجہ ہیں جن کا کچھ حصہ گر گیا ہی ۔ جنوبی جانب ایک سیڑھی دار پختہ کنواں اور شمالی جانب ایک

خوبصورت حوض جس میں اُترنے کو سیڑھیاں بنی ہیں اور ایک کنواں اور پانی کا خزانہ بنا ہوا ہے۔ یہ سب عمارتیں حال ہی کی صفائی میں نکلی ہیں۔ ورنہ اس جگہ بہت بڑا ملبہ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جہاز محل کے اوپر کا حصہ خاصکر دلکش اور فرح بخش ہے جس تک ۴۸ سیڑھیاں چڑھ کر پہنچتے ہیں۔ یہاں درمیان میں کھلی ہوئی چھت یعنی صحن ہے۔ لیکن چاروں طرف وسط میں ایک ایک خوبصورت اور ہوادار نشیمن گاہ بنی ہے۔ بعض کی چھت اونچی بنا ہے اور بعض کی چھت پر گنبد ہیں۔ کہیں کہیں چینی کی پچیکاری بھی باقی رہ گئی ہے۔ شمالی نشیمن گاہ کے سامنے ایک خوبصورت ہشت پہل حوض بنا ہے جو ۷ فٹ گہرا ہے۔ حوض کے اوپر پیچدار نالیاں بنی ہیں۔ نیچے تالاب سے پانی اُوپر چڑھتا تھا پھر تمام چھت پر نالیوں کے ذریعہ سے گھومتا ہوا اس حوض میں گرتا تھا۔ یہ جگہ نہایت پُر فضا ہے۔ مشرق و مغرب دونوں جانب وسیع تالاب ہیں جن کے اطراف میں بہت سی عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ اب اگرچہ مشرقی تالاب اور اس محل کے درمیان میں راستہ ہو گیا ہے لیکن شاہی عہد میں دونوں تالاب ایک تھے جن کے درمیان میں شاہی محلات بنے ہوئے تھے اور ان میں جانے کے واسطے پختہ پُل بنا ہوا تھا۔

ہنڈولا محل یا جھولا محل۔ جہاز محل سے ملا ہوا شمال جانب واقع ہے اس میں خاص صنعت یہ رکھی ہے کہ چاروں سمت میں جدھر سے دیکھو یہی معلوم ہوتا ہے کہ دوسری طرف کو جھکا ہوا ہے اور گرا پڑتا ہے اس کے درمیان میں ایک مستطیل کمرہ ہے جس کا طول و عرض ۲۲ ½ × ۸۸ ⅔ فیٹ ہے۔ مشرق و مغرب میں ۶-۶ اور شمال و جنوب میں ایک ایک دروازہ ہے۔ چھت بہت بلندی پر پٹی تھی جو گر گئی۔ تالاب کے شمالی اور مغربی کنارہ پر بہشت منزل اور تکّی محل کی شکستہ عمارتیں اور ایک زنانہ حمام کسی قدر اچھی حالت میں باقی ہے۔ محلات کے گوشہ شمال و مغرب میں جو دروازہ ہے وہ

ہاتی پول کہلاتا ہی کیونکہ اس کے ستون بشکل فیل پا ہیں +

چمپا باؤلی

محلّات کے درمیان چمپا باؤلی ہی جس کے چاروں طرف کی زمین پر سہ منزلہ اور چہار منزلہ وسیع عمارت بنی ہوئی تھی جس میں سے کچھ منہدم ہوگئی اور کچھ باقی ہی اس میں اُترنے کو سیڑھیاں بنی ہیں ۔ خاص باؤلی مربع شکل کی ہی جس کا ہر ضلع ½ ۲۶ فیٹ ہی ۔ شمالی جانب اس میں ایک سرنگ بنی ہی جس کی نسبت بیان کیا جاتا ہی کہ دہار تک گئی ہی لیکن یہ مبالغہ معلوم ہوتا ہی ۔ غالباً قلعہ کے باہر کسی مقام تک ہوگی ۔ یہ چور رستہ ہوگا جو خاص ضرورت کے وقت کے لئے بنایا گیا ہوگا اس کا مُنہہ بہت چھوٹا ہی یہ معلوم ہوتا ہی کہ پتھر کی چھوٹی سی پٹیا اس جگہ سے ہٹ گئی ہے ۔ اندر راستہ اتنا چوڑا اور بلند ہے کہ سوار اچھی طرح جاسکتا ہی ۔ حال میں اجین کے ایک رئیس مشعلیں جلاکر تھوڑی دُور تک اندر گئے تھے +

مسجد دلاور خاں غوری

یہ مسجد اس وجہ سے کہ اس پر چینی کا روغن پھرا ہوا تھا چینی مسجد کے نام سے مشہور ہی ۔ یہ بہت شکستہ ہوگئی تھی ۔ حال میں اس کی کچھ مرمت ہوئی ہے ۔ جہاز محل اور چمپا باؤلی کے قریب واقع ہی ۔ چار درجہ یعنی والان در دالان کی وسیع مسجد ہی ۔ چھت پتھر کی پٹیوں سے پٹی ہے ۔ شمال وجنوب اور مشرق میں دالان تھا اب مشرقی دالان بالکل نادار د ہے ۔ تاریخ تعمیر یہ ہے سے

مدارِ شرع پیغمبر پناہِ عرصہ گیہاں ۔ فلک رفعت ملک طلعت نصیر دیں دلاور خاں
مُمد افعال محمود ش ممد اقبال موصوفش ۔ ہمہ اوقات معمورش بخیر و طاعت یزداں
بکرد ایں مسجد جامع بنا در قلعہ مانڈو ۔ کہ بیشک ہست معمورت فرود ایں گنبد گرداں

مرتب شد بسالِ ہشصد و ہشت این بنا عالی بوقتِ سعد و میمون و بعونِ قادرِ رحمٰن
بعدل شہ حافظ و ناصر معین باد ہر کارے بحقِ عیسیٰ و مریم بحقِ موسیٰ و عمران

ان عمارتوں کے علاوہ اس جانب بہت سے کارخانجات شاہی کے مکانات نقارخانہ۔ بادل محل۔ لدا شاہ یا کوکا بقال کی حویلی۔ دو عالیشان باولیاں اور سیکڑوں غیر معروف ٹوٹی پھوٹی عمارتیں جن کے قرب و جوار میں ایسا گنجان جنگل ہوگیا ہے کہ راستہ بھی باقی نہیں رہا واقع ہیں۔ صرف اصطبل کا دو منزلہ وسیع مکان کسی قدر اچھی حالت میں ہے۔

ساگرتال

قلعہ کے جنوبی حصہ میں یہ بہت بڑا اور پختہ تالاب واقع ہے جو ساغرتال سے اب ساگرتال ہوگیا ہے۔ انگریز اسی تالاب پر خیمہ لگا کر فروکش ہوتے ہیں اسکے کناروں اور قرب و جوار میں کوسوں تک شہر آباد تھا۔ جہانگیر نے لکھا ہے۔ "نوزدہم گذشتہ بامردم محل بقصد سیر و تماشائے محلہا و عمارت ساگرتالاب کہ از احداث یا فتہائے حکام سابق مالوہ است سوار شدم و تا شام در آں عمارتِ دلکش بسر بردہ از خرمی و سبزی صحراہائے اطراف بغایت محظوظ گشتم و بعد از ادائے عبادت و تسبیح شام متوجہ مستقر دولت گردیدیم"۔ اب بھی یہاں کا نظارہ بہت دلفریب ہے۔ قریب میں جو عمارتیں ہیں اُن میں ایک دائی کا محل اور مقبرہ بھی مشہور ہے جو خوبصورت اور عالیشان ہیں۔ دو مقبرہ فیلبانوں کے نام سے موسوم ہیں۔ قریب ہی ایک امام باڑہ تھا جس کا ایک دالان باقی ہے اُس پر دمِ آبے بخور بہ یادِ حسین کندہ ہے۔ تھوڑی دُور پر دو تالاب اور ہیں جن میں ایک موتی جھیل اور دوسرا رنگ راؤ کے نام سے موسوم ہے۔ رنگ راؤ کے کنارہ پر اکبر خاں کا مقبرہ ہے جس کے ستون بشکلِ پائے فیل ہیں +

مسجد ملک مغیث الدین

ساگر تال سے تھوڑے ہی فاصلے پر یہ مسجد واقع ہی جسے سُلطان محمود خلجی کے باپ ملک مغیث الدین المخاطب مسند عالی اعظم ہمایوں شاہ عالم خاں نے سُلطان ہوشنگ کے زمانہ یعنی ۸۳۵ھ ۱۴۳۱ء میں تعمیر کرایا تھا - یہ بارہ در اور تین درجہ کی مسجد ہی جس کی چھت پر تین گنبد ہیں - دالان کچھ منہدم ہو گئے کچھ باقی ہیں - اِس کے نیچے دالان اور حجرے بنے ہیں - دروازہ عالیشان گنبددار تھا جس کا گنبد گر گیا - بیرونی پیشانی پر خطِ نسخ میں یہ کتبہ کندہ ہے ؎

بفالِ خوب وقتِ سعد و فرخ سال و مہِ انور	چہارم ماہ شہر القدر روز جمعہ سعد اکبر
سنین سی و پنج و ہشتصد سال من ہجرت	شمردہ بود روز و ماہ در حکم عرب یکسر
کہ شد این مسجدِ اسلام را بُنیاد در عالم	کہ سقف و گنبدِ او سود سر با گنبدِ اخضر
بنائے مسجدِ عالی مغیث الدین والدنیا	الغ اعظم ہمایوں خاں ہفت اقلیم و ہفت کشور
ز دستِ ہمتِ او شد مرتب این چنین مسجد	کہ کس دار الاماں خواند کسے کعبہ کند باور
مرتب شد بسلخ ماہ شوال این بنائے خیر	کہ باد این خیر اندر نامہ اعمال خاں مضمر
مزین کرد شان خطبہ محمود شہ والا	بود این بر زمین کوہ تا ماند بہ چرخ اختر

اِس مسجد کے برابر ایک بہت بڑی پختہ سرائے بنی ہوئی ہی جو اب گوکوٹ کہلاتی ہے

سموتی محل

جامع مسجد سے جنوب کی جانب جو سڑک آئی ہی اُسکے مشرقی کنارے پر تھوڑے فاصلہ پر چہار دیواری کے اندر ایک عظیم الشان مقبرہ واقع ہی جس کا نام سموتی محل بتلایا گیا - اِس کے اندر ایک نہایت عالیشان گنبد بنا ہی جس میں تین خوبصورت تعویذ ہیں

بڑے گنبد کے گوشوں پر ایک ایک چھوٹا گنبد ہے۔ اس سے ملحق شمالی جانب پانچ گنبد کی ایک عمارت ہے مگر اس کے اندر کوئی قبر نہیں ہے۔ مغربی جانب تین گنبد کی شکستہ مسجد اور بیچ میں پختہ تالاب ہے۔ کسی امیر کبیر یا بادشاہ کا مقبرہ معلوم ہوتا ہے +

چھپّن محل

موضع مانڈو کی آبادی سے تھوڑی دور جنوب کی جانب ایک پختہ تالاب کے کنارہ پر ایک خوبصورت وسیع مقبرہ ہے جو چھپّن محل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس کی مسجد اور گنبد کے دروازے بند کر کے ڈاک بنگلہ بنا لیا ہے اس میں اب انگریز ٹھہرتے ہیں۔ مسجد کی پیشانی پر انگریزی میں۔ برنس کوٹھی ۱۹۰۴ء تحریر ہے۔ غالباً یہ برنس صاحب دھار کے رزیڈنٹ تھے +

نیل کنٹھ

یہ دلچسپ اور پرفضا عمارت قلعہ کے جنوبی حصہ اور پہاڑ کے نشیب میں واقع ہے۔ اسے شاہ بداغ خاں نے جو اکبر کے عہد میں منصب سہ ہزاری پر سرفراز اور مانڈو کا حاکم تھا تعمیر کرایا تھا۔ اب اس میں مندر ہے اور نیل کنٹھ مہادیو براجمان ہیں۔ خاص عمارت کے اندر ملیچھوں (مسلمان) کو جانے کا حکم نہیں۔ ایک بیراگی صاحب نے جو وہاں کے مہتمم ہیں نہایت فخر سے فرمایا کہ جناب اس کی تاریخ مجھ سے سُنیئے۔ جہاں مہادیو کا استھان ہے یہ اورنگ زیب کے رہنے کی جگہ ہے۔ مغربی دالان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر بولے یہ مسجد تھی اس میں ولیوں کے نام لکھے تھے جو ہم نے مٹا دیئے۔ حوض کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس میں اورنگ زیب وضو کر کے اس مسجد میں نماز پڑھا کرتا تھا۔ مجھے ان بیراگی صاحب کے

لقب پر تو کوئی تعجب نہیں ہوا مگر اُنکی اس تاریخ دانی اور صاف گوئی کا ضرور افسوس ہوا -
اُوپر سے ساٹھ سیڑھیاں نیچے اُتر کر اس عمارت کے دروازہ پر پہنچتے
ہیں جہاں پر پہاڑ سے پانی کا جھرنا دِکھائی دیتا ہی - جابجا سے پانی جھرتا ہی
اور اوپر سے گر کر عمارت کے اندر جو حوض ہی اُس میں فراہم ہوتا ہی - پھر اس
حوض سے بذریعہ ایک جھرنے کے نیچے اُتر کر صحن کے حوض میں آتا ہی -
صحن کے فرش سے مکان کی کُرسی ۶ فیٹ ۵ انچہ بلند ہے - اوپر محرابدار
در ہے جس کی پیشانی پر خطِ نسخ میں یہ کتبہ کندہ ہی :" امر بنائے ھذہ
العمارت الدلکشائے بعہد السُّلطان الاعظم الخاقان الاعدل و الاکرم
مولیٰ ملوک العرب والعجم ظل اللہ فی الارضین ..... ابوالفتح
جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ
کتبہ فرید ون حسین ابن خاتمی الہروی ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء " اس کے نیچے
یہ بیت تحریر ہے ؎

توان کردن تمامی عمر را مصرف آب و گل
کہ شاید یکدمے صاحب دلے اینجا کند منزل

راقمہ و قائلہ شاہ بداغ خاں سنہ ۹۸۲ھ - ستون پر ایک جانب سنہ ۴۴ مطابق سنہ ۱۰۰۸ھ
اعلیٰ حضرت جہاں پناہ فلک بارگاہ ظل اللہ اکبر شاہ متوجہ فتح دکن بودند باینجا
عبُور افتاد ؎

تا کے گوئی بہ چرخ شد خانۂ ما
خندند ہمہ بر دلِ دیوانۂ ما

زافسانۂ دیگراں بیا عبرت گیر
زاں پیش کہ بشنوند افسانۂ ما

اور دُوسری جانب یہ عبارت کندہ ہے :" بتاریخ سنہ ۱۰۰۹ھ حضرت اکبر بادشاہ
فتح دکن و خاندیس نمودہ عازمِ ہند شدند ؎

دیدم چندے نشستہ وقتِ پگاہ
بر کنگرۂ مقبرۂ نوشیرواں شاہ

فریاد کناں زروئے عبرت میگفت کو آں ہمہ حشمت و کجا آں ہمہ جاہ

حررہ محمد معصوم نامی

۱۰۲۶ھ ۱۶۱۶ء میں جہانگیر نے اس عمارت کی سیر کی اور یہاں کی نزہت و لطافت سے بہت خوش ہوا۔ اس عمارت کے نیچے پہاڑ کے غار میں بیرم دیو کی سرا اور شیریں بیگم دختر سلطان محمود خلجی ثانی کا سنگ مرمر کا مقبرہ جالی دار نہایت عمدہ بنا ہوا ہے اسکے پاس دو مقبرہ اور ایک مسجد اور ایک شکارگاہ کے نشان اور ہیں +

قلعہ سون گڈھ

نیل کنٹھ سے شمال رویہ ایک بہت بلند پہاڑی ٹیلہ ہے جس کے اوپر یہ چھوٹا سا قلعہ علیحدہ بنا ہوا ہے۔ اس کے اندر ایک سنگین تالاب دو حوض دو حمام کلان باقی ہیں۔ باقی عمارت منہدم پڑی ہے اور ایک بلند ٹیلہ پر ایک مسجد اور ایک بزرگ کا مزار واقع ہے۔ پہلے اس قلعہ میں پرانی توپیں پڑی ہوئی تھیں جو اب دہار بھیجدی گئیں +

محل ناصر الدین خلجی

مانڈو سے دو ڈھائی کوس کے فاصلے پر قلعہ کے جنوبی حصہ میں ناصر الدین خلجی کے محل ہیں۔ محلات کے نیچے ایک وسیع سنگین تالاب بنا ہے جو ریوا کنڈ کے نام سے موسوم ہے اس کے اندر سیڑھیاں بنی ہیں۔ محل کے باب کبیر کی پیشانی پر یہ کتبہ کندہ ہے "بزمان السلطان الاعدل الاعظم والخاقان الاعلم الاکرم ناصر الدین شاہ الخلجی۔ کتبہ یوسف سنہ ۹۱۴ھ" محل میں دو وسیع صحن ہیں مشرقی جانب مشرق و مغرب میں دالان در دالان اور درمیان میں

پختہ حوض ہے۔ مشرقی دالان کے آگے مشرقی جانب ایک خوبصورت ہوا دار سنگ مرمر کی نشیمن گاہ ہے جہاں سے کوسوں تک کا نظارہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ دُوسرے مغربی صحن کے چاروں طرف دالان بنے ہیں۔ چھت پر دو بارہ دریاں خوبصورت بنی ہیں اِس محل کی حال میں کچھ مرمت بھی ہوئی ہے۔

چھتری باز بہادر یا بھان متی کا محل

جس طرح باز بہادر مالوہ کا آخری خود مختار بادشاہ تھا اسی طرح اسکی یہ یادگار عمارتِ قلعہ کے جنوب و مغربی گوشے میں سب سے اخیر اور سب سے بلند جگہ پر واقع ہے جو چھتری باز بہادر اور بھان متی کا محل دونوں نام سے مشہور ہے۔ باز بہادر فنِ موسیقی کا بہت بڑا ماہر اور صاحب کمال تھا۔ روپ متی ایک خوبصورت پاتر اُس کی معشوقہ تھی جس کی عاشقی کے فسانے اب تک مشہور ہیں۔ شاید روپ متی کو بھان متی بھی کہتے ہونگے۔ یا روپ متی سے بھان متی کا محل مشہور ہو گیا ہوگا یہ دو منزلہ عمارت ہے۔ نیچے دالان وغیرہ ہیں۔ چھت پر دو گنبد دار بارہ دریاں بنی ہوئی ہیں جس میں مشرقی بارہ دری اچھی حالت میں ہے خاصکر اس کی لداؤ کی چھت خوبصورت ہے۔ اس بارہ دری سے کوسوں تک کے پہاڑ اور جنگل نظر آتے ہیں اور دریائے نربدہ بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ بہت ہوادار۔ خوش منظر اور دِل کش عمارت ہے۔ اِن خاص عمارتوں کے علاوہ گاڈری دروازہ کے پاس سنہ ۸۲۰ھ کی مرزا علیخاں کی تعمیر کردہ مسجد اور دہلی دروازہ کے پاس نظام الدین اور بجلی شاہ کے مقابر اور مساجد۔ صوفی خاں کی مسجد۔ موسیٰ خاں کا محل۔ ہوشنگ جلال خاں کا مقبرہ اور تارا پور دروازہ کے پاس تالاب کے کنارہ تارا شاہ کی مسجد اور مقبرہ اور مختلف مقامات پر سیکڑوں گنبد۔ بیسیوں باولیاں

بہت سے پختہ تالاب واقع ہیں اور سیکڑوں عمارتیں ایسے مقامات پر ہیں جہاں اب انسان کا گذر نہیں ہوتا۔ ایک طرف پہاڑ کی ترائی میں اُترنے کے واسطے سات سو سنگین سیڑھیاں بنی ہیں۔ دو ندیاں بھی قلعہ کے اندر سے باہر نکلی ہیں۔

مانڈو میں شاہ عبداللہ شطاریؒ کے علاوہ شاہ باجنؒ۔ شیخ بہاء الدینؒ۔ شیخ جلال الدین قریشیؒ۔ میانجی۔ شیخ عبداللہ بیابانیؒ۔ شیخ نورالدینؒ۔ مولانا عمادالدینؒ۔ شیخ علاءالدینؒ اور شیخ المحدثین شیخ سعداللہ لاری مانڈوی بزرگانِ دین علیہ الرحمۃ کے مزارات واقع ہیں مگر افسوس کہ اس ویرانہ میں کوئی ان مزارات کا بتانے والا نہیں رہا صرف شیخ عبداللہ بیابانیؒ کا مزار مشہور ہے جو دہن کھہ مانڈو میں قلعہ سے کوس ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر واقع ہے اس پر سالانہ عرس بھی ہوتا ہے اور قرب وجوار کے مسلمان آجاتے ہیں شیخ سعداللہ لاری مانڈو کے بہت بڑے عالم اور محدث تھے سلطان غیاث الدین خلجی کے عہد میں ۱۱ رجادی الثانی ۹۰۲ھ کو فوت ہوئے اور سلطان محمود خلجی کے گنبد میں دفن ہوئے۔

مانڈو کے مشہور قصر جہان نما۔ شفاخانہ۔ مدرسہ محمود خلجی اور منارہ ہفت منظر کا جنکے حالات تواریخ میں موجود ہیں اب کچھ پتہ نہیں چلتا۔ مدرسہ اور منارہ کی بنیاد آخر ماہ ذوالحجہ ۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء میں ہوشنگ شاہ کے روضہ اور جامع مسجد کے پاس رکھی گئی تھی دارالشفا بھی ۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ تینوں بینظیر عمارتیں سلطان محمود خلجی نے لاکھوں روپیہ کے صرف سے تعمیر کرائی تھیں۔ منارہ جہانگیر کے عہد تک موجود تھا چنانچہ اس نے اپنی تزک میں لکھا ہے:-

”آخرہائے روز با مردم محل بسیر عمارت ہفت منظر متوجہ شدم و ابتدائے شام بدولت خانہ باز گشتم ایں عمارت از احداث یافتہائے حکامِ سابق مالوہ است کہ سلطان محمود خلجی باشد ہفت طبقہ قرار دادہ و در ہر طبقہ چہار صفہ ساختہ مشتمل بر چہار دریچہ بلندی ایں مینار پنجاہ و چہار ۵۴½ درعہ و نیم است و دو پنجاہ گز۔ زینہ از سطح زمین تا طبقہ ہفتم یکصد و ہفتاد و یک ۱۷۱ درفتن و آمدن یک ہزار و چہار صد ۱۴۰۰ روپیہ نثار شد“۔

جہانگیر نے بغداد کے نامہ بر کبوتروں کا حال سنکر جو بنی عباس کے عہد میں سکھائے گئے تھے مانڈو کے قیام کے زمانہ میں دس پندرہ نامہ بر کبوتر تیار کرائے تھے جو مانڈو سے برہان پور تک جہاں شاہزادہ خورم (شاہجہان) مقیم تھا ایک یا ڈیڑھ پہر میں نامہ لیکر پہنچ جاتے تھے۔

(سعید احمد مارہروی)

غرناطہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کے عروج اور زوال کا ایک وقت مقرر ہی جس طرح یونان کو زوال ہوا جس طرح روما تباہ ہوا - اسی طرح ہسپانیہ میں بھی مسلمانوں پر زوال آیا۔ سلطنتِ غرناطہ مسلمانوں کی آخری یادگار ہسپانیہ میں باقی رہ گئی تھی - ہر طرف سے دشمنوں کا نرغہ تھا - مگر وہ اوسے شجاعت سب کو برابر جواب دیتے رہے۔ آخر یہ ہوا کہ ابن احمر سلطان کے زمانہ میں صرف غرناطہ اور اس کا قرب و جوار مسلمانوں کے قبضہ میں رہگیا ۔

قرطبہ کے عوض اب غرناطہ اسلامی علم و ہنر کا گھر ہوا - اسکی عمارت کی دھوم پڑگئی - خود غرناطہ ایک نہایت خوبصورت شہر تھا - شہر کی بلند عماروں پر چڑھ کر نظر دوڑائی جاتی تو دور تک ایک سرسبز و شاداب میدان دکھائی دیتا تھا - جس میں ندیاں انگورستان باغات اور نارنج کے جھنڈ نظر آتے تھے ۔ اندلس بھر میں کوئی اور شہر اس وضع اور آب و ہوا کا نہ تھا - برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں سے جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں تو سخت سے سخت گرمی میں جاڑے کا لطف پیدا ہو جاتا تھا ۔

قصر الحمرا ایک سطح مرتفع پر قائم ہی جس کے چاروں طرف کھڈ اور نالے ہیں اور شمال کی طرف دامن میں دریاے ڈارو بہتا ہی - پتھر کی مضبوط دیواریں چاروں طرف سے قصر کو گھیرے ہوئے ہیں - ایک نہایت سنگین اور مضبوط برج کے نیچے قصر کا بیرونی دروازہ ہی جس میں دربِ عدالت نصب ہی - اس دروازہ میں سلطان مسندِ عدالت پر بیٹھ کر دادِ انصاف دیتے تھے - اندر داخل ہوتے ہی

ایک چوک نظر پڑتا ہے جس کی ایک طرف چارلس پنجم شاہ ہسپانیہ کا تیار کردہ محل نامکمل حالت میں پڑا ہوا ہے ۔ آگے چل کر ایک برآمدہ ملتا ہے جس سے گذر کر صحن حنا میں جا داخل ہوتے ہیں ۔ اس صحن میں حنا کے بیشمار پودے ہیں ۔ اس کے بعد ایک تنگ راستہ سے نکلکر ایک اور صحن ۱۴۰ فٹ لمبا اور ۷۰ فٹ چوڑا ملتا ہے اس کے عین وسط میں ایک تالاب ہے جس میں سنہری مچھلیاں تیرتی رہتی ہیں ۔ دھوپ کا عکس جب مچھلیوں اور پانی پر پڑتا ہے تو عجب بہار ہوتی ہے ۔ چاروں طرف کونوں پر ستون اور بھول بھلیاں ہیں ۔ ہر وقت ایک سکوت کا عالم چھایا رہتا ہے ۔ اس سے آگے بڑھ کر دیوان وکلا میں جاتے ہیں ۔ سلاطین بنی اُمیہ اسی دیوان میں مسندِ خلافت پر متمکن ہوتے تھے ۔ اوپر کا ایک بلند گنبد ہے ۔ چاروں طرف عربی خط اور عربی زبان کے کتبے دیواروں پر ایک کیفیت پیدا کرتے ہیں ۔ مناسب مناسب موقعوں پر بیل بوٹے بھی ہیں ۔ چھت پر دائرے تاج اور ستارے بنے ہوئے ہیں جس سے گنبد میں گنبدِ نیلوفری کی شان پیدا ہے ۔

مینار کی بھول بھلیوں کو طے کر کے ہم مینار کی چوٹی پر پہنچتے ہیں ۔ یہاں سے میدان ویگا صاف نظر آتا ہے ۔ سلطانہ کا کمرہ انہی بھول بھلیوں میں ہے جس کی کھڑکیاں میدان ویگا کی طرف ہیں ۔ دروازہ کے نزدیک ہی سفید سنگ مرمر کے فرش میں متعدد سوراخ نظر آتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ اس فرش کے نیچے بخورات جلائے جاتے تھے اور خوشبو ان سوراخوں سے نکل نکل کر کمرہ کو معطر کرتی تھی ۔ نیچے پائیں باغ ہے جس میں ایک مختصر سا چمن ہے ۔ اس کے قریب ہی شاہی حمام ہیں جن پر پچیکاری اور گلکاری کا کام دیکھنے اور تعریف کرنے کے قابل ہے ۔ حمام کے بیچوں بیچ حوض ہے جس کا پانی لہروں کے باعث

آہستہ آہستہ گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے۔ سامنے اوپر کی طرف بالاخانہ کے طرز کی کھڑکیاں ہیں جن میں حمام کرنے کے وقت نغمہ و سرود سے کام لیا جاتا تھا۔

سب سے زیادہ مشہور و معروف قصر کا وہ حصہ ہے جو بیت الاُسد یا شیروں کے صحن سے موسوم ہے۔ ایک سو اٹھائیس سفید سنگ مرمر کے ستون تین تین چار چار کے قطاروں میں نصب ہیں اُن پر بارہ دریاں بنی ہوئی ہیں جن کے ستونوں کی خوبی - باریک گلکاری کی شان - سنہری اور روپہلی رنگ کی بہار - تاریخ نما گنبد والی خوبصورت میناروں اور محرابوں کی دلربایانہ کیفیت شاعرانہ مزاج کے لیئے تازیانہ کا کام دیتے ہیں۔ نیچے ایک خالی حوض ہے جس میں بارہ ہیبت ناک شیر کھڑے ہیں - ان کے مونہوں سے کسی زمانہ میں پانی نکل نکل کر حوض کو بھرتا رہتا تھا۔

اس خوبصورت صحن سے آگے بڑھ کر دیوان بنی نصر ہے۔ کہتے ہیں کہ بنی نصر کے سردار اسی جگہ سلطان بوعبداللہ کے حکم سے تہ تیغ کیئے گئے تھے

قصر زنلیف ایک اور محل ہے جس کو قصر الحمرا کا تابستانی مقام کہنا چاہیئے۔ ایک سادہ سا محل ہے۔ دیواریں چبوترے بارہ دریاں اور محرابیں سب کھنڈر پڑے ہیں عربی گلکاری پر سفیدی کی پائدار تہیں۔ ابھی تک قائم ہیں۔ مگر سنگ تراشی کے عجیب دلفریب نمونے ضائع ہو چکے ہیں - اور عمارت کی اندرونی خوبی عرصہ ہوا معدوم ہو گئی ہے۔ ہاں باغوں اور نہروں کا لطف ضرور قائم ہے ایک سبک رفتار نہر سنگ مرمر کی نالی سے ہو کر صحن میں اس طرف سے اُس طرف کو نکلی ہے جس پر تاریخ اور سرو کی گھنیری چھاؤں کا عکس پڑتا رہتا ہے - فوارے - ننھے ننھے نلکیاں - چھوٹے چھوٹے پانی کے برتن - نہر کے بیچ در بیچ راستے - نہروں کے اندر چھوٹی چھوٹی اور نہریں - یہ سب

اس خوبی اور نفاست کے ساتھ باہم جمع کئے گئے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور دل بے قابو ہو جاتا ہے۔

دو صدیوں تک مسلمانوں نے غرناطہ میں امن چین کے ساتھ حکومت کی مگر آخر کہانتک۔ شاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازبیلا کی شادی ہوتے ہی ہسپانیہ کی قوت یکجا مجتمع ہو گئی۔ یہی شگون مسلمانوں کے لئے بُرا ثابت ہوا۔ سلطان ابوالحسن نے اپنی سی بہتیری کوشش کی اور مسیحیوں کا مقابلہ خوب خوب کیا۔ مگر پھر بھی سارے کے سارے مقبوضات یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلتے گئے۔ مدینۃ الزہرا کا محاصرہ کر لیا گیا۔ اور وہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ پھر یہانتک ہوا کہ آخر غرناطہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ محاصرۂ غرناطہ کے بعد جب مسلمان میدان چھوڑ کر شہر غرناطہ میں پناہ گزین ہوئے تو در و دیوار سے نالہ و بکا کی آواز بلند تھی۔

خوبصورت غرناطہ۔ حسین غرناطہ! تیرے نارنج اور حنا کی خوشبو اب بھی اُسی طرح عیش خانوں اور آرامگاہوں کو معطر کرتی ہے۔ بلبل کا نغمہ اب بھی تیرے دل کشا باغوں میں سُنائی دیتا ہے۔ تیرے سنگ مرمر کے کشادہ ایوانوں میں اب بھی فواروں اور نہروں کی چہل پہل نظر آتی ہے۔ مگر الحمراء کی جوت اور تیرے بادشاہوں کی شان و شوکت اب کہاں!

(ماخوذ) ناشاد

گُل کی فریاد

اَے! حضرتِ انسان تو اشرف المخلوقات ہونے کا مدعی ہے میری نسبت میں تو سخت خودغرض اور نفس پرور ہے اور میرے لحاظ سے تو تو سخت ظالم ہے۔ تجھ کو یہ غرّہ ہے کہ کائنات میں جو شے موجود ہے وہ سب تیری آسائش و استعمال کے لئے ہے۔ یہ خیال دراصل غلط ہے۔ فی الحقیقت نیچر میں ہر شے کے لئے اپنا اپنا کام مقرر ہے اور اُس کی ہستی اپنے لئے ہے۔ زبردستی یا ظلم سے کسی کا استحقاق زائل کرنا اشرف المخلوقی کے رُتبہ سے تجھے گرا دیتا ہے۔ میں بلبل کو تجھ سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ دیکھ! وہ میرے رنگ و بو پر کیسی دلدادہ ہے۔ صبح و شام میرے گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ میری بہار حسن سے اپنے دل و جان کو تازہ کرتی رہتی ہے فی الواقعہ وہ اربابِ معنی سے ہے اس کی شرافت دیکھ کہ وہ مجھے ٹہنی سے جدا نہیں کرتی۔ میرا جوبن لوٹتی ہے لیکن کس خوش اسلوبی سے۔ اُس حبشی کالے کلوٹے بھنگے کو دیکھ جسے لوگ بھونرا کہتے ہیں۔ کس طرح وہ میرے اردگرد دیوانہ وار گردش کرتا ہے۔ مجھے صانع قدرت کی ایک حسین مخلوق سمجھ کر میرے طواف میں مصروف رہتا ہے۔ اپنی حالت میں مست ہے موسیقار کے مانند گنگناتا ہر وقت وجد میں رہتا ہے میری ایذا کے درپے ہوتا تو درکنار میرے گُن گاتا رہتا ہے۔ تو اس سے ہی سبق لے۔

او ظالم! نیچر نے تجھے جتلا دیا ہے کہ میرے خار میری حفاظت کیلئے بنائے گئے تھے تو اُنہیں بھی توڑ دیتا ہے۔ تیرا جیا تو بے زبان جانوروں کی جان لینے سے نہ ٹلا تو میں کس گنتی میں ہوں۔ کیا یہ حظ تیرے لئے کافی نہیں کہ تو میری بو باس

سے فردوس زاغ بنا میری خوش رنگی سے جنت نگاہ بنا لیکن مجھے ٹہنی سے جدا نکر۔
او ظالم! میری شکایتیں بیشمار ہیں۔ کاش میری فریاد سننے والا کوئی ہوتا تو درد دل سناتا اور انصاف پاتا۔ تاہم تجھے ہی سناتا ہوں تاکہ شاید تیرا سنگین دل نرم ہو۔ ممکن ہو کہ تو اپنی زبردستی سے باز آ جائے۔ آخر میری زندگی نہایت مختصر ہے۔ عمر طبعی چند گھنٹے ہے۔ کاش تو مجھے چند گھنٹے جینے دے۔ اب میری فریاد سن :-

۱- جب تجھے کسی دیوتا، پیر، فقیر، مرقد سے التجا کرنی ہوتی ہو، انکی خوشنودی مزاج مطلوب ہوتی ہو۔ مجھ غریب کی جان پر بن آتی ہو۔ میں چڑھاوے کا کام دیتا ہوں۔

۲- جب تجھے وارفتگان کی تربت پر جانے کا موقع ہوتا ہو مجھ بیکس کو مردوں کے سینے پر چھوڑ آتا ہو میری بھی وہیں ہوا کی تربت بنجاتی ہو۔

۳- جب تجھے کسی اپنے سے بزرگ بنی نوع انسان کی تکریم و تحسین منظور ہوتی ہو مجھ پر آفت آنے لگتی ہو۔ میرا ہی دل جانتا ہو جس طرح سے میرے سینے میں سوئیاں چبھو چبھو کر ہار بنائے جاتے ہیں۔ او ظالمان درجہ اولی کے زیب گلو ہوتے ہیں۔

۴- جب آدمی زاد بیاہ شادی کرتے ہیں تو باران گلاب و بارش گل شروع ہو جاتی ہو اور مجھ کس مپرس کی شامت آتی ہو۔ کہیں سہرے پر لٹک رہا ہوں کہیں گجرے میں جکڑا ہوا ہوں کہیں سیج میں پائمال ہو رہا ہوں۔

۵- واہ رے تیری آسائش پسندی! تجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ تو میرے پاس آکر میرے حسن و جمال سے حظ حاصل کرے۔ نہیں۔ مجھے ٹہنی سے توڑ گلدستہ بنا گول کمروں اور کھانے کے کمروں میں کھدیتا ہو۔ جہاں مجھے مرگ مفاجات جلد آ جاتی ہو۔ تیری خود غرضی یہاں تک ہو کہ دستبو بنا کر مجھے بٹن ہول میں لگاکر مجھ نیم مردہ کو سینے سے لگائے رکھتا ہو۔ واہ رے تیری فرط محبت!

۶- تو کن کن غیر جنسوں کے ساتھ مجھے ہم آغوش کرتا ہو کبھی ملون میں، مجھے

ہم خواب کرتا ہی کبھی سرسوں سے میری صحبت ہوتی ہی۔ تاکہ میرے جوہر ان میں منتقل ہوں۔ میری روح اُن کے جسم میں داخل ہو۔ اور بقول تیرے وُہ بس جائیں اور میں خانہ برباد ہو جاؤں۔

۷۔ کبھی تو مجھے روغنوں میں حل کرتا ہی۔ میرا رنگ زائل کر دیتا ہے۔ بلبل کی بد دعائیں تجھ پر اثر نہیں کرتیں۔ میری رُوح تن سے جُدا کر کے مجھے روغن میں مقید کر دیتا ہی۔ اس فسرطِ الفت کا نام تو نے عطر رکھ چھوڑا ہی۔

۸۔ کبھی تیری رحم دلی اس درجہ تک پہنچتی ہے کہ مجھے قرع انبیق میں ڈال آتش سوزاں پر رکھ کر جوش دیتا ہی۔ اس پر بھی صبر نہیں۔ پھر دو آتشہ کرتا ہے۔ اس پیار کے اظہار کا نام عرق ہے۔ او ظالم! تیری جبین پر کاش عرقِ انفعال آتا۔ مگر کہاں۔

۹۔ او ظالم! تو مجھے میری موت کے بعد بھی نہیں چھوڑتا۔ تجھے یقین نہیں آتا کہ میں کما حقہ مرا ہوں۔ میری پتیاں سکھاتا ہی۔ پھر مجھے نسخوں اور معجونوں میں ڈالتا ہی اور اُن معدوں کی امداد کرتا ہے جن میں تیرے خنجر نے اَور ذی رُوح ہلاک کر کے داخل کئے ہوئے ہیں۔

۱۰۔ او بے رحم آدمی زاد۔ تو تو انسان بھی کہلانے کا مستحق نہیں۔ اشرف المخلوقی تو تیری لغات میں نہ ہونا چاہئیے۔ حق تو یہ ہی کہ تیرا کیا قصور ہے۔ یہ معمہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیوں کسی کی اذیت میں دُوسرے کا عیش ہو۔ اور مجھے تو ذوق کا یہ شعر پڑھنا کافی ہے۔

اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑینگے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

شمیم

علمِ غذا

علمِ غذا کے ذیل میں ہم اُس طریقہ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جس کی پابندی کرنے سے انسان کی بگڑی ہوئی صحت درستی پر آتی ہو۔ علمِ غذا سے ہماری یہ مراد نہیں کہ اُن خوردنی اشیاء کا ذکر کریں جو انسان کی صحت کے لئے مفید ہیں۔ کیونکہ اب مضرِ صحت اور مفیدِ صحت غذاؤں پر بحث کرنی بے سود ہی۔ بہت سے مصنّف لکھ چکے ہیں کہ ہم کیا کھائیں؟ چنانچہ اُنہوں نے اُن کھانوں کے نام لکھدیئے ہیں جو اُن کے خیال کے موافق صحت کے لئے مفید ہیں۔ مگر ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ بہت سے لوگ مفید صحت غذائیں بھی کھاتے ہیں اور ہر طرح صحت کے اصُول کی پابندی کرتے ہیں لیکن پھر بھی بیمار ہی رہتے ہیں۔ اگر اُن سے سوال کیا جائے تو وُہ بتائینگے کہ باوجود ڈاکٹر صاحب یا حکیم صاحب کی ہدایتوں کے بموجب عملدرآمد کرنے کے بھی اُنکی بیماری میں فرق نہیں ہوتا۔ اس بیان سے صاف طور پر یہ بات مترشح ہوتی ہو کہ اگر وُہ صحت بخش غذائیں کھانے پر بھی بیمار ہی چلے جاتے ہیں تو ضرور غذاؤں کے کھانے کے طریقہ میں خرابی ہوگی۔ بیشک صحت کا دارومدار صرف مفیدِ صحت غذاؤں کے کھانے پر نہیں ہو بلکہ صحت اس طریقہ پر منحصر ہے جس طریقہ سے کھانا کھایا جاتا ہے۔ یہ سُنکر تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ اگر مضرِ صحت غذا بھی مسلّمہ طریقہ کے موافق کھائی جائیگی تو وُہ نقصان دہ غذا بھی فائدہ بخش ثابت ہوگی۔ چنانچہ ہم اپنے قول کی تصدیق کے لئے امریکہ کے باشندہ ہارسیس فیچر کو پیش کرتے ہیں۔ یہ شخص مدّت تک اندرونی امراض میں مبتلا رہا تھا۔ اس نے لاکھوں ڈاکٹروں

اور طبیبوں کا علاج کیا لیکن کچھ فائدہ کی صورت ظہور میں نہیں آئی۔ یہاں تک کمزور اور ناقص الصحت تھا کہ زندگی کا بیمہ کرنے والی کمپنیوں نے اس شخص کی زندگی کا بیمہ کرنے سے انکار کر دیا۔ بیماری کی علامات روز بروز ایسی خطرناک ہوتی جاتی تھیں۔ کہ اُس کو اپنی زندگی وبال ہو گئی تھی۔ آخر کار خوش قسمتی سے ہارس فیچر کو ایک جاپانی پروفیسر کی ملاقات کا شرف حاصل ہُوا اور اُس پروفیسر کی نصیحت پر عمل کرنے سے پانچ چھ سال کے اندر ہی اندر ہارس فیچر صحت اور فرحت کا نمونہ بنگیا۔ جاپانی پروفیسر نے اُس کو بتایا کہ تم بہت غصیلے شخص ہو اور اپنی نفسانی خواہشوں اور جذبات پر قابو نہیں رکھتے۔ اُس نے فیچر کو اس بات پر بھی آمادہ کیا کہ وُہ بُدھ مت کے اصُولوں کی پیروی کر کے اپنے جذبات اور نفسانی خواہشوں پر قابو حاصل کرے۔ اگرچہ یہ کام بہت مشکل تھا لیکن فیچر نے بہت مشق کرنے کے بعد غصّہ کرنا چھوڑ دیا۔ اُس کو معلوم ہو گیا کہ اس کا غصّہ ہی دراصل اسکی بیماری تھا۔ اب وُہ دن بدن بھلا چنگا ہوتا گیا۔

خود تندرست ہونے کے بعد اب فیچر کے دِل میں یہ سمائی کہ اپنے اس تجربہ سے عامۂ خلائق کو بھی فائدہ پہنچائے۔ اُس نے غور کیا اور وُہ سمجھا کہ بُدھ مت کے اصُول بہت سخت ہیں اور نفس کُشی کا طریقہ جو اس مذہب میں جاری ہے نہایت ہی ظالمانہ ہے۔ عام لوگ اُس طریقہ کو ہرگز پسند نہیں کر سکتے۔ اور اگر پسند بھی کریں تو اس پر عمل کرنا بہت دشوار ہے۔ اس کا یہ تجربہ تھا کہ بُدھ مت کے اصُول کی زیادہ پیروی کرنی فضول ہے۔ صرف یہ خیال رکھنا چاہیے۔ کہ تم جس وقت غصّہ میں یا رنجیدہ اور پریشان ہو اُس وقت کھانا نہ کھاؤ۔ بلکہ کھانا کھانے کے وقت ہمیشہ خوش و خورّم رہو۔

علاوہ ازیں فیچر کی یہ بھی رائے ہے کہ تم ہر لُقمہ کو اس قدر چباؤ کہ وہ لئی سا بنجاکر

جب تک لقمہ بالکل نہ پس جائے ہرگز نہ نگلو - چنانچہ اس کی لئے کا خلاصہ یہ ہو کہ کشادہ پیشانی سے کھانا کھاؤ اور جب تک لقمہ لعابِ دہن کے ساتھ ملکر سُرمہ نہ بن جائے حلق کے نیچے نہ اُتارو -

فلیچر کے طریقہ کو ڈاکٹر ہیری کیمبل نے کئی مریضوں پر آزمایا ہی اور فائدہ بخش نتائج کی نسبت طبّی اخبار لینسٹ میں کئی مضامین لکھ کر بحث کی ہی - ڈاکٹر موصوف کی رائے ہے کہ خوراک کو خوب چبانا چاہئے - کیونکہ جلدی جلدی کھانا کھانے سے دانت کمزور پڑجاتے ہیں اور آخرکار دانتوں میں درد ہونے کا مرض پیدا ہوجاتا ہی -

ڈاکٹر ڈیوی نے بھی اس طریقہ کا تجربہ اپنے مریضوں پر کیا اور پانچ سال کے تجربہ کے بعد اس نے یہ تحریر کیا کہ جن مریضوں نے اس طریقہ پر عمل کیا ہی اُن کو کبھی سوءِ ہضمی کی شکایت نہیں ہوئی - اور تندرست آدمیوں میں اس طریقہ سے بسیارخوری کی عادت جاتی رہتی ہے - بد ہضمی نہ ہونے کی ایک خاص وجہ یہ ہو کہ منہہ غذا کو ہلکا بنا کر معدہ میں بھیجتا ہی اور معدہ کو ہلکی غذا کے قبول کرنے میں کچھ بھی دقّت نہیں ہوتی - معدہ سے حد سے زیادہ کام لینا ہی سوءِ ہضمی کا سبب ہے - یہ صاف ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی طاقت سے زیادہ کام کرتا ہی وُہ دِن بدن کمزور ہوتا جاتا ہی - اور آخرکار اُس کے تمام اعضا جواب دیدیتے ہیں - یہی کیفیت معدہ کی ہی - اگر خوراک اچھی طرح چبائی ہوئی اور لعابِ دہن میں خوب تر کی ہوئی معدہ میں پہنچیگی تو اس خوراک کو ہضم کرنے کے لئے معدہ کو اپنی طاقت سے زیادہ کام کرنا پڑیگا اور انجام یہ ہوگا کہ معدہ کی تمام طاقت زائل ہوجائیگی اور انسان آخرکار خون کی قلت کی وجہ سے کمزور ہوکر انواع واقسام کے امراض کا شکار بنجائیگا - چنانچہ یہ لازمی بات ہو کہ انسان ہر کام قدرت کے موافق کرے - اور قدرت یہی چاہتی ہو کہ غذا قابلِ ہضم معدہ میں پہنچائی جائے -

امریکہ میں جنگی اسپتال کے ڈاکٹروں نے مریضوں کو اس نو ایجاد شدہ طریقے کے موافق سات مہینے تک کھانا کھلایا۔ اس عرصہ کے بعد انہوں نے دیکھا کہ خوراک پہلے کی نسبت ایک تہائی خرچ ہوتی ہے۔ مریضوں کے وزن میں پہلے کی نسبت بہت جلدی جلدی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اور دماغی اور جسمانی قوا بھی تعجب خیز سرعت کے ساتھ بڑھتے جاتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو شخص اس طریقہ کو عمل میں لاتا ہے اس کے فواید کو دیکھ کر اس کا غلام بنجاتا ہے۔

اس طریقہ کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ جو لوگ گوشت خور اور شراب خوار ہیں وہ گوشت اور شراب سے قطعی پرہیز کرتے ہیں۔ اس طریقہ کا ایک بہت ہی سخت قاعدہ یہ ہے کہ تمہیں پانی کے سوا اور کوئی پینے کی چیز جلدی جلدی نہیں پینی چاہیے پینے کی ہر چیز کو تھوڑی دیر منہہ میں رکھ کر آہستہ آہستہ حلق کے نیچے اتارنا چاہیے اس طرح سیال چیز کے ساتھ لعاب دہن کافی مقدار میں ملجاتا ہے۔ اور اس طریقہ سے شراب میں سے نشہ کی طاقت جاتی رہتی ہے۔ جب شراب خوار کو نشہ نہیں ہوتا تو وہ آخرکار شراب پینی چھوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ اس طریقہ سے شرابخوار شراب بھی بآسانی چھوڑ سکتا ہے۔

ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ اس طریقہ سے ہر شخص معمول کی نسبت ایک تہائی خوراک سے سیر ہو سکتا ہے اور اس کی جسمانی اور دماغی طاقت بھی اور لوگوں کی نسبت بہت بڑھ جاتی ہے۔ بس تو پھر جنگی محکمہ کو ہارسیس فلیچر اور خصوصاً جاپانی پروفیسر کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ اب اس طریقے سے جنگی محکمہ کو ہر سپاہی کے لئے صرف ایک تہائی خوراک بہم پہنچانے کی ضرورت ہوگی اور طاقت اور قوت ہر سپاہی میں امید سے زیادہ ہوسکیگی۔ اس اختراع سے بنی نوع انسان کو اتنا فائدہ پہنچنے کی امید ہے کہ اب ہر شخص کو یہ اپنا فرض سمجھنا چاہیئے کہ لوگوں میں اس طریقہ کو عام طور پر پھیلائے۔

فلیچر نے ایک کتاب اِس مضمون پر لکھی ہے۔ امریکہ میں بہت سے لوگوں نے اِس کتاب سے فلیچر کے طریقۂ خور و نوش کو معلوم کیا ہے۔ اور اس طریقہ پر عملدرآمد کرنے سے اُن کو بہت فائدہ حاصل ہوا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ ہم نے بھی یہ چاہا کہ اپنے ملک کے باشندوں کو اس صحت بخش طریقہ سے مطلع کریں۔ کیا عجب کہ بہت سے لوگ اپنی زائل شدہ صحت کو اِس طریقہ سے دوبارہ حاصل کرلیں۔ اِس طریقہ کی نسبت جو باتیں ہمیں نئی معلوم ہونگی اُن سے بھی ہم وقتاً فوقتاً ناظرین کو مطلع کرتے رہینگے +

ڈپٹی لال نگم۔ بی۔ اے دہلوی
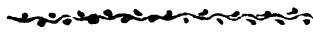
کیوں اے فلک جو ہم سے جوانی جدا ہوئی ۔۔۔ اک خود بخود جو دل میں خوشی تھی وہ کیا ہوئی

گستاخ بلبلوں سے بھی بڑھ کر صبا ہوئی ۔۔۔ کچھ جھک کے گوشِ گُل میں کہا اور ہوا ہوئی

مایوس دل نے ایک نہ مانی اُمید کی ۔۔۔ کہہ سن کے یہ غریب بھی حق سے ادا ہوئی

چھوٹا یہ جسمِ زار پر ارماں نے شکر ہے ۔۔۔ عرضی مری لفافۂ خط سے جُدا ہوئی

دل اُن کے اختیار میں میں اُنکے ہاتھ میں ۔۔۔ اب تک نہ کچھ کھلا کہ مری کیا خطا ہوئی

دنیا کی فکر موت کا ڈر آبرو کا دھیان ۔۔۔ دو دن کی زندگی مرے حق میں بلا ہوئی

موتی تمہارے کان کے تھرا رہے ہیں کیوں ۔۔۔ فریاد کس غریب کی گوش آشنا ہوئی

اِس عمر کا عدم میں کہیں سامنا نہ ہو ۔۔۔ مر جاؤنگا وہاں بھی جو یہ بیحیا ہوئی

صد شکر بعد مرگ بھی ضائع گیا نہیں ۔۔۔ مٹی مری زمینِ لحد کی غذا ہوئی

بیگانہ وار ملتے تھے برسوں سے یوں تو وہ ۔۔۔ حد ہے کہ اب نگاہ بھی نا آشنا ہوئی

برسا جو ابرِ رحمتِ خالق بروزِ حشر ۔۔۔ سبزہ کی طرح پھر مری نشو و نما ہوئی

بیماریوں سے چھُٹ گئے اے شاد حشر تک ۔۔۔ قربان اِس علاج کے اچھی دوا ہوئی

جدید اور قدیم عنصر

دُنیا ترقی کے زینے پر کیسی جلد چڑھ رہی ہی۔ اللہ اللہ کیا انقلاب ہی۔ طبیعتیں بدل گئیں فطرتوں میں فرق آگیا قصّہ مختصر ساری خدائی ہی اور ہو گئی۔ میں اس وقت کچھ جدید و قدیم عناصر کی بابت کہونگا۔ یار لوگوں نے عناصر کو بھی نہیں چھوڑا۔ چنانچہ ۴ سے ۶۲ اور ۶۲ سے اب چہتر ہو گئے ہیں۔ نئے روشن خیالوں سے خیال تو کیجئے مانند ذرّوں تک کو درخشاں سیارے ثابت کر دیا ہے پھر بھلا یہ عنصر بیچارے کیسے بچتے۔

ان ایجادات کی دستارِ فضیلت اہلِ مغرب ہی کے سر ہی لیکن انصاف یہ ہی کہ ایشیا نے یورپ کو کچھ کم مدد نہیں دی ہی۔ اگرچہ مغرب نے مشرقی شکستہ عمارت کو ایجادوں کی اینٹوں سے بنایا ہے اور مغربی تعلیم کی پچی کاری اس میں دن بہ دن مضبوطی سے پکی ہوتی جاتی ہی مگر ایشیائی تعلق اگر دیکھنا چاہو تو آج سے بہت پہلے اس زمانے کو مشاہدہ کرو جس کو آسمان کی چکّی نے پیس کر خاک کر دیا ہی۔ آہ۔ یہی وہ خاک پاک ہی جس سے مغربی مصالحہ بنا یہی ایشیا ہی جس کے سطوح مرتفع کے پژاودوں سے یہ اینٹیں حاصل کی گئی ہیں۔ بحرِ ہند اور بحرِ عرب کا پانی تھا جس سے اس کا گارا بنا۔ انہی کو مغربی خیالات نے پکایا اسی میں بحیرۂ روم کے پانی نے جان ڈالی اور کچھ سے کچھ ہو گیا۔ یہ سب صحیح مگر انصاف پسند ایشیائی خاک پاک کا تعلق بالکل ملیامیٹ نہیں کر دیتے۔ جانتے ہیں کہ

نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اوّل

وُہ بات تو رہ ہی گئی۔ ہاں تو اگرچہ زمانے نے تحقیق کے آروں سے پُرانے

عناصر کو چیر ڈالا ہے اور جدت کی تیزی نے جلا کر فنا کر دیا ہے۔ پھر بھی پرانی کہانیاں
تقویمِ پارینہ کی طرح طاقِ نسیان پر نہیں رکھدی ہیں۔ جو لوگ جانتے ہیں سمجھتے
ہیں وہ بھی پچھلی باتوں کو ترک نہیں کرتے۔ تعجب ہے لوگوں کی طرزِ معاشرت
میں زمین آسمان کا فرق ہو جائے اور عنصر وہی چار بولے جائیں۔
شاید پرانے چاول سمجھ کر اُن کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ میرے
نزدیک پرانے عناصر کی زندگی اردو لٹریچر کی زیست سے وابستہ ہے۔
زبان کے چٹخارے نے نئی چاشنی نہیں چکھی اور نہ مزا چکھنا چاہیے۔
اچھا اب یہ دیکھنا چاہیے کہ واقعی بھی پرانے دھرانے عناصر دہرانے
موزوں ہیں یا نہیں؟
تفصیل کو قطع کیجئے اجمالاً سمجھئے۔ مثلاً ہوا ہے۔ موجدوں نے اسکو تین
گیسوں سے مرکب بتایا ہے اور مرکب کبھی عنصر نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح
پانی وغیرہ۔ یہ بالکل درست ہے کہ مرکب عنصر نہیں کہا جا سکتا یعنی مرکب مفرد
نہیں کہا سکتا۔ لیکن اردو لٹریچر کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مرکب کو مفرد بولنا
ناجائز نہیں۔ مطلب یہ کہ بہت سے مرکب مفرد بولے جاتے ہیں اور زبان دانی
کے خلاف ہے اگر ہم اس کو الٹ پلٹ کر کے بولیں۔ اب جیسے پان اصطلاحاً
اس گلوری کو کہتے ہیں جو پان کتھا چونا چھالیہ وغیرہ سے مرکب ہو اب اگر بجائے
اس کے کہ "پان کھایا" کہیں "کتھا چونا چھالیہ اور پان کھایا" کوئی کہدے تو
کیسا بُرا معلوم ہو۔ یا شربت کی بجائے اولا اور پانی کہنا کیسا اُوپری اُوپری ہے
بلکہ غلط ہے۔
ظاہر ہے کہ زبان کی سلاست کو کھو کر ایک دوسرے رنگ میں رنگ کر
بے رنگ بنانا لطافت اور فصاحت کا خون کرنا ہے۔

روٹی لباس وغیرہ بہت سے مرکب ہیں جو مفرد بولے جاتے ہیں اور اسی طرح صحیح بھی ہیں - آگ بیچاری تو آپ ہی جل کر خاک ہو گئی ہے - نئے مخترعین کی آتش بیانی نے غریب کو بالکل افسردہ کر ڈالا ہے - اُردو کے تشنہ کاموں نے اپنے لب و زبان کے تیل سے اُس کو قائم رکھنے کی کچھ سبیل نکالی ہے - مگر کیا؟ ایجادوں کی اگر ایسی ہی تیزی سے بوچھاڑ رہی تو غریب جل بجھیگی - اب بھی کوئی کچھ ہی کہے ہم تو وُہی پُرانے دھرانے راگ دہرائینگے - اور

آتش و آب و باد و خاک

کا مضمون دِل سے نہیں بھلائینگے +

سید ہاشمی از فریدآباد

غزل فارسی

در دلم حسرت دیدار ہماں ہست کہ بود
ہمچناں چشم براہت نگراں ہست کہ بود

تاب زلف تو بداں سیر مشاں ہست کہ بود
آنچناں باد صبا مشک فشاں ہست کہ بود

دل من خاک شد از گردش افلاک و لے
آنقدر مہر تو جا کردہ بجانست کہ بود

چمنستان دلم رنگ مرادے نگرفت
اندریں باغ ہماں جور خزان ہست کہ بود

در ازل کرد چو بر گلشن روئے تو نظر
ہمچناں دیدۂ نرگس نگراں ہست کہ بود

گرمیٔ شوق طلب نیست در عالم ورنہ
آتش طور ہماں شعلہ فشاں ہست کہ بود

اثرِ خستہ جگر را بہ ترحم دریاب -
حال زارش بفراقِ تو ہماں ہست کہ بود

شمس العلماء مولوی سید امداد امام اثر عظیم آبادی

موت

انسان موت کے خیال سے اسی طرح گھبراتا ہی جیسے ایک چھوٹا بچہ تاریکی سے اور جس طرح سے کہ اس کا نرم و نازک دل قصہ کہانیوں سے متاثر ہو کر سہم جاتا ہی اُس (انسان) کا دل بھی اسی طرح موت کے ذکر و اذکار سے خوف زدہ و کبیدہ خاطر ہو جاتا ہے اگر موت کا تصور کفّارہ گناہ اور سفرِ آخرت کے خیال سے ہی تو حقیقتاً حق بینی و خدا ترسی پر مبنی ہی۔ اور اگر محض بخیالِ بشریّت ہی تو حد درجہ کی بزدلی پر دلالت کرتا ہی کیونکہ پاک خیال جن کا تعلق مذہب سے ہی بعض اوقات خود نمائی اور وہم سے ملو ہوتے ہیں۔ اہلِ زہد و ورع کی مقدس کتابوں میں جن میں کہ اصولِ ریاضت و نفس کُشی مستنبط ہیں مسطور ہی کہ جب سر انگشت کے دبنے یا چھلنے سے ناقابلِ برداشت تکلیف اُٹھانی پڑتی ہی تو اُسوقت کیسی بلا کی تکلیف ہوتی ہوگی جبکہ جسمِ انسانی کا ایک ایک جوڑ علیحدہ ہوتا ہوگا۔ اور رُوح جسم سے مفارقت کرتی ہوگی"۔

حالانکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہی کہ جان نکل جاتی ہی اور ایک عضو کے چھلنے کی برابر بھی تکلیف نہیں ہوتی۔ کیونکہ سب سے زیادہ رُوح پرور اعضا زیادہ ذکی الحس نہیں ہوتے۔

ایک قدرت شناس فلاسفر کا قول ہی کہ لوازمات موت بجائے خود موت سے زیادہ خوفناک و ہیبت ناک ہوتے ہیں۔ حالتِ نزع میں سانس کا پھولنا۔ رگ رگ کی کشاکش چہرہ کے رنگ کا فوری تغیّر۔ اعزہ و احباب کی آہ وزاری ماتمیوں کی سیاہ پوشاکیں۔ تجہیز و تکفین کی پُر رعب و خاموش رسوم وغیرہ۔ انسان کی نظروں میں موت کو نہایت کریہہ المنظر اور خوفناک صورت میں دکھاتی ہیں۔

لیکن خیال کرنے کی بات ہے کہ جذباتِ انسانی میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو موت کے خوف پر نہ غالب آجائے۔ لہٰذا اس صورت میں جبکہ انسان کے بہت سے ایسے معین و مددگار موجود ہیں جو موت پر غالب آسکتے ہیں تو واقعی موت کوئی قوی دشمن شمار نہیں کیجا سکتی۔ انتقام موت پر فتحمند ہے۔ عشق اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ عزت اِس کی آرزو کرتی ہے۔ غم اس کی طرف بڑھتا ہے اور خوف و ہراس اس کو پہلے ہی گھیر لیتے ہیں۔ چنانچہ جب شاہ اوتھو نے خودکشی کرلی تو اس کے بیشمار ہمراہیوں کو جوشِ ہمدردی نے جو ایک لطیف و نفیس جذبۂ انسانی ہے ایسا بھڑکایا کہ وُہ اپنے متوفی شاہ کی غمخواری میں مثل سچے رفقا کے اپنی جانوں سے درگذرے۔ حکیم سینیکا تو نازک خیالی او آسودگی کو بھی اسی اعلیٰ جذبہ میں شامل کرتا ہے اور لکھتا ہے۔ جب ہم اپنی زندگی کے ایام میں ایک ہی کام کو بار بار کرتے ہیں (تو اُکتا جاتے ہیں) اور موت کی آرزو صرف صبر اختیار کرنے یا رنج و غم سہنے سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ کسی چیز سے متنفر ہونے میں بھی یہ پائی جاتی ہے۔ اور قاعدہ کی بات ہے کہ انسان ایک ہی کام کو بار بار کرکے تھک جاتا ہے اور اس وردسری کی وجہ سے (چاہے وُہ ستم رسیدہ یا بیمار نہ ہو) موت کا خواہشمند ہو جاتا ہے۔

دیکھو موت کی نزدیکی نیک دلوں پر بہت کم اثر رکھتی ہے کیونکہ ایسے لوگ اخیر دم تک ایک ہی حالت میں پائے گئے ہیں۔ آگسٹس قیصر کے طائرِ رُوح نے اُسوقت پرواز کی جبکہ وُہ سلام و نیاز میں مشغول تھا۔ "لوالیویا۔ خدا حافظ و ناصر! دیکھ اس عقد نکاح کو ہمیشہ یاد رکھیو" کہتا ہوا اس دُنیا سے رخصت ہوا۔ ٹبریس ریاکاری و مکرسازی میں لقمۂ اجل ہوا۔ چنانچہ بقول ٹیسٹس ٹبریس کی طاقتِ جسمانی تو اُس سے علیحدہ ہوگئی تھی لیکن اُس کی ریاکاری اس کی اخیر دم تک قائم بنی رہی۔ وسپیشن شہنشاہِ روم [illegible] پر بیٹھا ہوا مسخرے پن میں کہہ رہا تھا کہ "میرے خیال میں میں دیوتا ہوتا ہوں" مر گیا۔

گلبا (اپنے قاتلوں کی طرف متوجہ ہو کر) یہ کہتا ہوا کہ "یہ میری گردن اگر تمہارے اہلِ روم کے کسی فائدہ کی ہو سکتی ہے تو شوق سے کاٹ ڈالو" اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا۔

سپٹمس سیورس خریطہ ارسال کرنے وقت یہ الفاظ نکالتے نکالتے کہ "اگر میری ضرورت ہو تو جلد واپس آنا" راہیِ ملکِ بقا ہوا۔ غرضکہ اسی قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ اسٹوئک فرقہ کے حکما نے موت پر بیحد زور دیا ہے اور انکی لمبی چوڑی تحریروں نے اسے نہایت خوفناک اور بھدی شکل میں دکھایا ہے۔ کسی کا یہ نہایت سچا تخیل ہے کہ "موت قدرت کی ایک اعلیٰ نعمت ہے" جس طرح سے کہ پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔ اسی طرح مرنا بھی وجہ یہ کہ اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک شیر خوار بچہ کیلئے تو پیدا ہونا اور مرجانا یکساں ہے کیونکہ اسے دونوں میں برابر درجہ کی تکلیف پہنچتی ہے لیکن اگر کوئی شخص کسی بڑے کام کو انجام دیتے وقت مرتا ہے تو اُس پر موت کی تکلیف نہایت خفیف ہوجاتی ہے اور اسکی مثال بجنسہ ایسی ہوتی ہے کہ جب انسان پورے جوش و خروش یا حالت غیظ و غضب میں مجروح ہوتا ہے تو حدتِ خون کی وجہ سے وہ شدتِ زخم محسوس نہیں کرتا۔

یہ بات بھی اچھی طرح سے ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ آرام سے مرنا اسیوقت ممکن ہے جبکہ انسان اپنے ارادوں میں پورے طور پر کامیاب ہو گیا ہو اور اپنی اعلیٰ اُمیدیں حاصل کر چکا ہو اور بس یہ عالم ہو کہ دُنیا سے سیر ہو گیا۔ تمام کام اختتام کو پہنچ چکے ہوں اب صرف اپنے رخصت ہونیکی دیر ہے۔

موت کا یہ عجیب قاعدہ ہے کہ وہ شہرت کے دروازہ کو کھول دیتی ہے اور دنیاوی بُرائی یعنی حسد کو صفحہ دُنیا سے معدوم کر دیتی ہے۔

وہی شخص جو زندگی میں لوگوں کی نظروں میں خار بنکر کھٹکا مرنے کے بعد لوگونکی منتظر آنکھوں کا پہناں گلدستہ بنا اور باعثِ لُطف و کرم ثابت ہوا +

(ترجمہ) سید محمد حسن عابد جعفری

دردِ جانستان

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

چوتھا باب

کہوں کیا دِل کی کیا حالت ہی ہجر یار میں غالب
کہ بیتابی سے ہر اِک تارِ بستر خار بستر ہے

ساون کا مہینہ اور رات اندھیری ہی ابر آسمان پر چھا رہا ہی مینہہ کی جھڑی لگ رہی ہی بجلی چمک رہی ہی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں جن کے دل شاد اور پہلو آباد ہیں اُن کا کیا کہنا ہی۔ دُنیا بہشتِ بریں بن رہی ہی۔ دلوں کے کنول کھِل رہے ہیں عطر کی مہک اور زلفِ عنبریں کی مستانہ خوشبو سے دماغ معطر ہو رہے ہیں۔ اور جو بدنصیب عُشّاق یار سے جُدا اور جُدائی میں مُبتلا ہیں اُن کے واسطے بوندیوں کی پھُوار تیروں کی بوچھاڑ ہے۔ ایک پُرانے مکان میں جو غمزدہ دل کے دِل کی طرح جابجا سے ٹوٹا ہُوا ہی۔ خورشید ایک پلنگ کے جھلنگے میں جُدائی اور فراق میں مُبتلا پڑا ایسا تڑپ رہا ہی جیسے مچھلی جال میں پھنسکر تلملاتی ہی ساون کی گھٹا پانی برسا رہی ہی تو اُس کی آنکھیں خون کی نہریں بہا رہی ہیں۔ رات کی اندھیری اُسکو کسی کی کالی کالی زلفیں یاد دلا دیتی ہی اور اس کی چھاتی پر سانپ لوٹ جاتا ہی اور بجلی کی چمک سے اسکو کسی کے عارضِ تاباں کا خیال بندھ جاتا ہے جو اُس کے جگر میں آگ لگا دیتا ہی اور بے اختیار اُس کے مُنھہ سے آہ نکل جاتی ہی۔ اسی بیقراری اور آہ و زاری میں صبح ہو گئی۔ ساون کے

موسلا دھار مینہہ نے پتھروں میں آگ کو ٹھنڈا کر دیا مگر خورشید کے دل کی لگی نہ بجھی اور دلی اور اہلِ دہلی کی مقناطیسی جذبِ محبت نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ دل میں کہتا تھا کہ سسرال کے ٹکڑوں پر جا کر پڑنا بڑی بے غیرتی ہے مگر بقولِ مومن خاں ع کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کرینگے۔

عشق اور محبت کے سامنے غیرت اور حیا کی ایک نہ چلی اور وہ دہلی پہنچ گیا اور اپنی بیوی اور پیاری بچی کو دیکھ کر باغ باغ ہو گیا اور ہجر کی ساری کلفتیں ایک آن میں دُور ہو گئیں۔ ساس سسرے نے اس کی خاطر مدارات میں کمی نہیں کی اور چھ مہینے تک جسطرح ممکن ہوا اپنے حوصلہ سے بڑھ کر اس کی مہمانداری کرتے رہے اس چھ مہینے میں خورشید حسین کو دہلی کی تمدن اور معاشرت کی سوسائٹی کی خوبیاں معلوم ہوئیں اور مولانا کے اس شعر کے معنے اس کی سمجھ میں خوب آ گئے ؎

عقل را بے نور و بے رونق کند دہ مرو دہ مرد را احمق کند

جامع مسجد کی پنج وقتہ نماز اور خصوصاً جمعہ کا دوگانہ رمضان عید بقرعید کی چہل پہل علما کی وعظ و نصیحت کی مجلسیں۔ عرسوں کے ہنگامے چاوڑی اور چاندنی چوک کی صبح و شام کی سیر مشاعروں کی دھوم دھام مذہبی جلسے اور مختلف میلے ٹھیلے اہلِ ہنر اور اہلِ فن کی عجائبات دیکھ کر اس کی عقل دنگ ہو گئی اور سمجھا کہ دین اور دُنیا کے مدارج کی ترقی کی یونیورسٹی دہلی ہی ہے حافظ جی نے بہت کوشش کی کہ خورشید حسین کا شہر میں روزگار ہو جائے مگر یہ خدا کا بندہ تقدیر کا ایسا ہیٹا تھا کہ نوکری نہ ملنی تھی نہ ملی اور اسی باعث سے یہ بہت مغموم اور اُداس رہنے لگا ایک دن شام کو کمپنی باغ چلا گیا اور ایک بنچ پر بیٹھ کر سیر کرنے لگا سیکڑوں آدمی تو پا پیادہ چل پھر رہے تھے اور گل و لالہ سنبل و نرگس کی

انواع و اقسام کی رنگینی اور خوشنما پھولوں کی نزاکت درختوں اور سبزہ کی طراوت دیکھ کر خوش ہونے تھے اور بہت سے گاڑی گھی ٹمٹم فٹن حیرٹ لینڈ وہیں سوار باغ کی بہار کا مزہ لوٹ رہے تھے ناگاہ خورشید حسین نے دیکھا کہ ایک شخص سُرخ و سپید خوبصورت آنکھوں اُونچی ناک والا جس کی ڈاڑھی زمانہ کے فیشن کے موافق منڈی ہوئی اور مونچھیں بڑی بڑی تھیں انگریزی لباس پہنے ترکی ٹوپی اوڑھے بائسکل پر سوار چلا آتا ہے جس کے نوجوان چہرہ سے امارت اور لیاقت دونوں عیاں ہیں حُسنِ اتفاق سے اسکی بائسکل خورشید کے بنچ کے پاس سے نکلی اور خورشید نے اُسے بنظرِ غور دیکھا اور خورشید کے بغور دیکھنے سے اُس بائسکل سوار نے بھی خورشید کی طرف دیکھا مگر چونکہ بائسکل اس بہت تیز جارہی تھی سوا سے ایک لمحہ میں وُہ آگے بڑھ گیا مگر اس بائسکل سوار کے نکل جانے کے بعد خورشید کو خیال آیا کہ یہ صُورت باشوکت میں نے کبھی دیکھی کہ مگر حافظہ نے اس قدر مدد نہ دی جو اس کے خیال کی تصدیق ہوجاتی۔ اتفاقیہ وُہ روش سڑک نما جس کے کنارہ پر بنچ بچھی ہُوئی تھے اور خورشید بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا گول واقع ہُوئی تھی اس سبب سے وُہ بائسکل سوار اس کے دایرہ کو طے کرکے پھر اُسی طرف آگیا جہاں خورشید خاموش اور متحیر بیٹھا تھا اور دونوں کا آمنا سامنا ہوگیا اور خدا جانے خورشید حسین کی صورت دیکھ کر اُس پر کیا اثر پڑا کہ اُس نے بائسکل کو روکا اور خورشید حسین سے کہا شاید تمہارا نام خورشید حسین ہے اور تم قاضی شرافت حسین کے بیٹے ہو جو احمد آباد کے رہنے والے تھے۔

خورشید حسین (بنچ سے اُٹھ کر اور سلام کرکے) اس خاکسار کا نام خورشید ہی ہے اور والد کا نام بھی میرے یہی ہے جو آپ نے اپنی زبانِ مبارک

سے لیا حضور کا اسم مبارک ۔

بائیسکل سوار۔ میرا نام محمد عظیم خاں ہے اور میں شاہجہان پور کا رہنے والا ہوں تمہارے والد ماجد سے (خدا اُنکو غریق رحمت کرے) میری خصوصیت سے دلی محبت تھی اور جس زمانہ میں وُہ شاہجہان پور کی پولیس میں انسپکٹر تھے تو میں نے تم کو بچہ سا اُن کے پاس دیکھا تھا تمہارے باپ بڑے خوبیوں کے آدمی تھے ۔ اُنہوں نے ایک نازک موقع پر میرے ساتھ احسان کیا تھا وُہ مجھے ابتک یاد ہے ۔ افسوس ہے اُنکی عمر نے وفا نہ کی ورنہ ابتک وُہ کسی معزز عہدہ پر پہنچگئے ہوتے ۔

خورشید حسین۔ مجھے بھی حضور کی صُورت دیکھ کر شبہہ ہوا تھا کہ میں نے آپکی کبھی زیارت کی ہے ۔ مگر اچھی طرح یاد نہ آیا اور نہ اتنی ہمت تھی جو پتہ نشان دریافت کرتا حضور نے خود ہی نوازش فرمائی ۔

محمد عظیم۔ اچھا اب تم یہ بتاؤ کہ دہلی میں کب سے ہو اور کیوں ہو اور گذر اوقات کی کیا صُورت ہے ؟ خورشید حسین ایک تو نوعمر آدمی تھا دُوسرے دن رات کی مصیبتوں سے اُس کا کلیجہ خون ہو رہا تھا محمد عظیم خانصاحب نے جو محبت کے ساتھ اُس کا حال دریافت کیا تو اُسکے مُنہہ سے کچھ نہ نکلا مگر آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ گیا ۔ اُس کو اپنے باپ کی شان و شوکت ۔ شاہجہان پور کا رہنا اپنا لڑکپن ناز اور اللہ آمین سے اپنا پلنا بڑھنا یاد آگیا ۔ محمد عظیم صاحب نے اُسکو روتا دیکھ کر اپنی بائیسکل تو ایک درخت سے لگا کر کھڑی کر دی اور آپ خورشید کے پاس بیٹھ گئے ۔ تاکہ اس مصیبت زدہ کی داستانِ غم اچھی طرح سُن لیں ۔

خورشید نے اپنے باپ کی وفات انگریزی تعلیم سے اپنی محرومی دہلی میں شادی کا ہونا بڑے بھائی کی بے مہری اپنا سُسرال میں آپڑنا نوکری کا نہ ملنا ایسے پُر درد لہجہ میں سُنایا کہ خانصاحب کا دِل بھر آیا اور اُنہوں نے فرمایا میاں خورشید حسین !

گھبراؤ نہیں میں انشاءاللہ تمہاری کل ہی ناخن بندی کروائے دیتا ہوں۔ نواب شیدا کا دوسرے تیسرے دن میرے پاس آدمی آتا ہو کہ آپ نے کوئی معتمد منشی تجویز فرما لیا ہو تو میرے پاس بھیجد بجئے۔ بے منشی کے مجھے سخت تکلیف ہو۔ بات یہ ہو کہ نواب شیدا فیض آباد کے رئیس زادہ ہیں۔ وطن سے جو پرانا منشی ساتھ آیا تھا وُہ یہاں آکر مرگیا اب دہلی کا آدمی رکھتے ہوئے ہچکچاتے ہیں اور دوسرے اُنکی واقفیت بھی یہاں والوں سے کم ہو۔ اس لئے مجھ سے فرمایش ہے کہ آپ کوئی معتمد منشی مجھے تجویز کر دیجئے۔ اب تمہیں دیکھکر اور بے روزگاری کی شکایت سُنکر مجھے خیال آیا کہ یہ خداساز بات ہو نواب شیدا کی سرکار میں تم کو رکھوا دوں اللہ چاہے تو تمہاری وہاں خوب گذریگی اور اُن کی فرمایش بھی پوری ہو جائیگی

خورشید حسین۔ خانصاحب! آپ یہاں کس تقریب سے رونق افروز ہیں

خانصاحب۔ میں یہاں تحصیلدار ہوں اور مجھے یہاں تین برس ہوگئے۔ خیر اب تو شام ہوئی تم گھر کو جاؤ اور میں بھی ایک ضرورت سے موری دروازہ جاتا ہوں۔ کل تم کچہری کے وقت سے پہلے قابل عطار کے کوچہ میں میرے مکان پر آجانا۔ میں تمہیں چند ضروری باتیں سمجھا دونگا اور نواب شیدا صاحب کے پاس لے جاکر ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے آؤنگا ✦ (باقی وارد)

سید ناصر نذیر دہلوی

آج کے پرچہ میں گوسوامی تلسی داس جی مشہور معروف مولف بھاشا رامائن کی تصویر ہدیہ ناظرین کی جاتی ہے۔ گوسوامی موصوف اور اُن کی نادر تالیف رامائن پر ایک مفصل مضمون انشاءاللہ اگلے پرچہ میں درج ہوگا۔ افسوس کہ اس نمبر میں اس کے لئے گنجایش نہ نکلی ✦

شاہین و درّاج

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

صرف اس نمکحلالی کے کارن درّاج بدنصیب پر جو گذرنی تھی سب گذر گئی۔ وہی درّاج جو کل تک شاہین کے گلے کا ہار تھا آج اسکے ہاتھوں ہمیشہ کے واسطے ختم ہو گیا! اس میں کلام نہیں کہ بات کے دھنی نے وہ کام کیا کہ سچی محبت مدت العمر اسکے نام پر آنسو بہائیگی۔ اور گو شاہین نے شعبانہ اور اسکے خاندان کو زر جواہر سے مالا مال کر دیا لیکن اتنا افسوس ضرور ہے کہ ملکہ کے دامن عصمت پر اس بے گناہ کے خون کا دھبہ بہت برا لگا۔ دل لیا تھا تو قدر کرتی اور ہاتھ پکڑا تھا تو لاج رکھتی۔ مگر عورت ذات دل کی بودی ارادے کی کچی! اچھی قدردانی کی کہ جان ہی سے کھویا۔ درّاج کی موت کیسی ہی عبرتناک کیوں نہ ہو مگر پھر بھی اس لحاظ سے ضرور بہتر تھی کہ وہ خاک میں ملکر تمام مصیبتوں سے چھوٹ گیا! اس بدنصیب کو کیا خبر تھی کہ یہ اتنی بڑی آدمی آخر وقت طوطے کی طرح دیدے بدل جائیگی! کسوٹی پر رکھا تھا تو پرکھ کر دیکھتی اور ایسی بدگمان نہ ہوتی کہ جان ہی سے کھویا۔ تاہم درّاج کی محبوبہ تھی اب بھی ہمارا دل نہیں چاہتا کہ شاہین کو برا کہیں! شہزادی تھی تو ہو، ناقص العقل تھی اعتبار نہ کیا اور بغلی گھونسے کا وار چل جانے دیا! محبت کا فدائی شہزادی سے ملنے کا ارمان جی میں لے گیا دعا ہے کہ خدا اسکی حالت پر رحم کرے اور امید سے کے ساتھ یقین ہے کہ منصف حقیقی اسکی آرزو پوری کریگا اور حوروں کے بدلے شاہین اس کی مطلوبہ اس کی ملکیت ہوگی!

بکرے کی ماں کب تک خیر منائے جبتک شاہین کی آنکھوں پر غفلت کا پردہ پڑا رہا شہباز چکموں پر چکمے دیتا رہا اور داؤں پر داؤں کرتا رہا مگر جلاد کا پرچہ لا کر دینا تھا چور کی ڈاڑھی میں تنکا شہباز کا خون خشک ہو گیا۔ لاش کو جا کر دیکھا انگوٹھی ہاتھ میں رومال جیب میں وزیر کو ساتھ لیکر درّاج کے گھر پر آئی مرض کی مفصل کیفیت دریافت کی طبیب کو بلوایا تو معلوم ہوا وہ بھی شہباز کی عیاری تھی جیتی بیٹھی روئی چلائی مگر اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت! اس نمکحرام وزیر کو گرفتار کیا اور آناً فاناً سولی دیکر اسکے ٹکڑے کوّے اور چیلوں کے حوالے کئے! آغا قندہاری اور شعبانہ دونوں دادی پوتیوں کو اشرفیوں سے تول دیا اور ایک ہزار روپیہ ماہوار کا وظیفہ دائمی تمام خاندان کے واسطے مقرر کر دیا! درّاج کو غسل دیا اور برہنہ سر قبرستان لے چلی۔ شعبانہ آغا قندہاری دونوں ساتھ تھے اور ہزاروں آدمیوں کا ہجوم تھا اس مجمع میں علی الاعلان درّاج کی وفاداری اور نمکحلالی پر خون کے آنسوؤں سے روئی منہ پیٹے تڑپی اس محبت کے بندے کو ہمیشہ کے واسطے زمین کے سپرد کر دیا۔

(راشد الخیری)

کلامِ اکبر

نہ رُوحِ مذہب نہ قلبِ عارف نہ شاعرانہ زبان باقی
زمیں ہماری بدل گئی ہے اگرچہ ہے آسمان باقی

شبِ گذشتہ کے سازوساماں کے اب کہاں ہیں نشان باقی
زبانِ شمعِ سحر پہ حسرت کی رہ گئی داستان باقی

جو ذکر آتا ہے آخرت کا تو آپ ہوتے ہیں صاف منکر
خدا کی نسبت بھی دیکھتا ہوں یقین رخصت گمان باقی

فضول ہے اُن کی بد دماغی کہاں ہے فریاد اب لبوں پر
یہ وار پر وار اب عبث ہیں کہاں تن میں ہے جان باقی

میں اپنے مٹنے کے غم میں نالاں اُدھر زمانہ ہے شاد و خنداں
اشارہ کرتی ہے چشمِ دوراں جو آن باقی جہان باقی

اِسی لئے رہ گئی ہیں آنکھیں کہ میرے مٹنے کا رنگ دیکھیں
سُنوں وُہ باتیں جو ہوش اُڑائیں اسی لئے ہیں یہ کان باقی

تعجب آتا ہے طفلِ دل پر کہ ہو گیا مستِ نظمِ اکبر
ابھی مڈل ہی تک نہیں ہے بہت سے ہیں امتحان باقی

ہنگامہ کیوں ہے برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکا تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہے

ناتجربہ کاری سے واعظ کی ہیں یہ باتیں
اِس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے

اُس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اُس مے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے

اے شوق وہی مے پی اے ہوش ذرا سو جا — مہمانِ نظر اس دم اک برقِ تجلی ہے
واں دل میں کہ بس کھد وہاں جی میں کہ سب پہلو — ان کا بھی عجب دل ہے میرا بھی عجب جی ہے
ہر ذرہ چمکتا ہے انوارِ الٰہی سے — ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے
سورج میں لگے دھبا فطرت کے کرشمے ہیں — بت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے
ہم جان سے یوں جائیں تم یوں ہو منہ پھیرے — یہ بات تمہیں سمجھو بیجا ہے کہ اچھی ہے
تعلیم کا شور ایسا تہذیب کا غل اتنا — برکت جو نہیں ہوتی نیت کی خرابی ہے
سچ کہتے ہیں شیخ اکبر ہے طاعتِ حق لازم — ہاں ترکِ مے و شاہد - یہ انکی بزرگی ہے

دیر و حرم

ذوقِ دیدارِ صنم جب آشنائے جاں ہوا — اضطرابِ دل کشائے دیدۂ پنہاں ہوا
ہر طرف آیا نظر عالم میں جلوہ نور کا — ذرہ ذرہ میں نہاں نقشہ تھا کوہِ طور کا
دل نے لیں اٹھ اٹھ کے ہر جا پر بلائیں حسن کی — بھا گئیں اس حسن والے کو ادائیں حسن کی
سارے عالم پر مسلط ہے نمودِ شانِ حسن — ہر طرف آفاق میں دیکھے گئے حیرانِ حسن
برہمن نے اسکو دیکھا صورتِ اصنام میں — زاہدِ کعبہ نشیں نے بندشِ احرام میں
رند نے پائی جھلک اس کی مئے انگور میں — شیخ نے دیکھے وہی جلوے خیالِ حور میں
شائقانِ شانِ محبوبی کا ہے ایمان حسن — عاشقانِ حسنِ جاناں کیلئے ہے جانِ حسن
حسن ہے آبِ رواں میں حسن ہے کہسار میں — حسن ہے اظہارِ قدرت کے ہر اک آثار میں
حسن ہر شام و سحر کے رنگ میں مسنود ہے — ایک ہی مہرِ درخشاں سے جہاں پُر نور ہے
دشت و صحرا میں ہے وہ حسنِ مقدس آشکار — ہے اسی محبوب کی ہر ایک شے آئینہ دار
اے نمودِ حسن ہاں تیرا ہی سودائی ہوں میں — تیری اس محفل میں محوِ محفل آرائی ہوں میں

میں تو مرتا ہوں اسی پر خوش نما ہو کوئی ہو — جس طرف دیکھوں ادائے دلربا ہو کوئی ہو
آگئی آخر کو میرے کام رسوائی مری — بزمِ جاناں کے مزے دیتی ہے تنہائی مری
ملّت و مذہب کے جھگڑے دوستو بے سود ہیں — سب کسی کے حسنِ یکرنگی پہ عشق آلود ہیں

امتیازِ مومن و کافر بھی اک آزار ہے
سچ اگر پوچھو حجابِ چہرۂ دلدار ہے

ذوقِ جنّت دردِ سر ہے بیمِ دوزخ بھی الم — فارغ ان دونوں سے ہو کر بیٹھ اے پیرِ حرم
آرزوئے خلد سے بہتر ہے فکرِ وصلِ دوست — ورنہ یہ دل ہی نہ بن جائے کہیں بیت الصنم
ہے حرم اور بتکدہ میں دو قدم کا فاصلہ — ہوش آ جائے تجھے دونوں کو گر دیکھے بہم
نالۂ ناقوس بھی کرتا ہے کچھ جاں پروری — نغمۂ نے کا اثر رکھتی ہے ہر اک زیر و بم
برہمن ہے داس اُس کا شیخ جس کا معترف — چھیڑتا رہتا ہے اُس کا درد سب کو بیش و کم
مظہرِ انوارِ قدرت ہے یہ بزمِ کائنات — ہیں اُسی شاہد کی زلفوں کے یہ سلسلے پیچ و خم
کون ہو سکتا ہے ایسے میں بھلا کافر یہاں — کھولتا ہے کفر کے فتووں سے تو اپنا بھرم
عشقِ صادق ہو تری دل میں تو ہیں محبوب — ہے وہی حسنِ مقدّس رونقِ دیر و حرم
کیا عجب ہے گر کبھی تو جان لے اس راز کو — سارے عالم میں یہی کہتا پھرے با چشمِ نم

عاشقِ یارم مرا با کفر و با ایماں چہ کار
با بہشت و دوزخ و با حور و با غلماں چہ کار (حافظ)

ہے خدا کی سلطنت میں ذرّہ ذرّہ کا حساب — بارہا ہے اپنے کاموں کا صلا ہر شیخ و شاب
بارگاہِ حق میں کوئی بھی بڑا چھوٹا نہیں — سب کو دی ہے اُس صنم نے ایک ہی خُم سے شراب
اب بھی فیاضانِ قدرت کا وہی جاری ہے فیض — ہر بشر ہر وقت ہو سکتا ہے جس سے فیضیاب
کر رہا ہے بارشیں وہ ابرِ رحمت ہر جگہ — پاک اور ناپاک پر روشن ہے روئے آفتاب
کس کا یہ حق ہے کہ سمجھے خود کو اوروں سے بزرگ — ناروا ہوگا یہ کہنا یہ ہے اچھا وہ خراب

واعظِ شیریں بیاں یہ وعظ نیک انجام ہو
مجھ کو ڈر ہے ہو نہ جائے مفت میں تو بھی خراب

صوفیِ صافی منش گھر چھوڑ کر پھرتا ہے کیوں؟
کر رہا ہے بہرِ شہرت کونسی شے انتخاب

ہم نے مانا تجھ کو حاصل ہیں سبھی آسائشیں
جابجا ملتا ہے تجھ کو شربتِ قند و گلاب

یہ نہیں لیکن شناسانِ حقیقت کا طریق
ہاں مگر دیکھی نہیں ہے تو نے شاید وہ کتاب

مت دکھا دامن کسی کو دامنِ دل کو سنبھال
بات سچی ہے یہی اے سالکِ فرقت مآب

بیٹھ کر اپنی جگہ پر گھر میں اپنا کام کر
ورنہ بہتر تجھ سے ہے وہ رندِ رسوا و خراب

کاں بکنجِ میکدہ فارغ ازینہا بودہ است
در خمارِ بادہ از فکرِ جہاں آسودہ است

اے عزیزو ہے یہ عالم اک مقامِ کارزار
کس میں یہ دم ہے کہ ہو یاں دوسروں کا ذمہ دار

اپنی اپنی جان کی فکروں میں ہے ہر ایک شخص
مشکلوں میں گھر رہا ہے ہر پیادہ اور سوار

فوجِ دشمن کے سپاہی لگ رہے ہیں گھات میں
جو ذرا چوکا یہاں جائیگا بازی اپنی ہار

جو گریگا نفس کے حملوں سے ہمت ہار کر
ہار پھر ہو جائیگی اُس شخص کے اوپر سوار

حسنِ جاناں کے نظارے پھر نہ آئینگے نظر
چل گیا گر نفسِ نافرجام کے خنجر کا وار

یہ وہ دشمن ہے بہت باریک ہیں جس کے فریب
ہے یہ وہ چالاک رہزن ہو جو بیحد ہوشیار

مشورے اسکے انوکھے خواہشیں اسکی عجیب
اسکے پھندوں سے بچائے رحمتِ پروردگار

دین میں ڈالے اسی خودسر نے رخنے سیکڑوں
اور نکالے ہر طرح سے خلق پر اُس نے بخار

اُسنے مارا ہے کئی وارفتگانِ دیر کو
اور مردانِ حرم کے بھی لئے کپڑے اتار

اس سے آسائش میں رہنے کا طریقہ ہے یہی
خود کو ہر حالت میں سمجھے آدمی بااختیار

بار اپنی زندگی کا خود اٹھائے اور چلے
اپنی ہر حاجت کا اپنی ذات پر ہو انحصار

ورنہ دینداری پہ اے زاہد نہ کرنا ناز کچھ
اور کسی انسان کو کافر نہ کہنا زینہار

کفر سے بھی بڑھ کے ہے یہ نفس کا سودائے خام
ندر کا لوگوں کی یعنی ٹوٹنے پائے نہ تار

بندہ و آقا خدا کے سامنے سب ایک ہیں ہی عبث آفاق میں نام و نسب کا افتخار
حق ہمیشہ حق کا حامی ہی وہ جس کے پاس ہو خواہ ہو صوفی کوئی اور خواہ رندِ بادہ خوار
الغرض سچ ہی یہی جبتک نہ ہو دل میں خلوص کوئی ہو سکتا نہیں دیر و حرم کا رازدار

این سخن از رازِ قولِ مصطفےٰ دانستہ ام
بوالہوس را در پئے جور و جفا دانستہ ام

جب تلک کوئی اسی کے حسن کا مائل نہ ہو عشق کی جاں پروری مشکلکشائے دل نہ ہو
کام کی ہی تیری ہر اک موج اے دریائے عشق میری کشتی کے لئے پیدا لبِ ساحل نہ ہو
حضرتِ واعظ نہ کر دیر و حرم میں انفصال میں تو ڈرتا ہوں کہیں یہ سعی بیحاصل نہ ہو
کفر بھی اچھا ہی اک حدِ مناسب تک مگر آدمی آفاق میں کافر تو ہو جاہل نہ ہو
کفر و بیدینی سہی بھی بڑھ کر جہالت ہی حجاب دیکھنا ۔ بچنا ۔ کہیں لکھا پڑھا زائل نہ ہو
میں نے کل زاہد کو لیکر سیر کی جب دیر کی وہ یہی کہتا رہا یہ غیر کی محفل نہ ہو
غیریت یاں ہی کدھر یاں تو نہ ہو جائے غیر یہ وہ نکتہ ہی کوئی جسکے سوا کامل نہ ہو
دیکھ لے دل کو ذرا اچھی طرح اے قیس تو لیلئِ مقصود کا شاید یہی محمل نہ ہو
مرحلے طے کر کے پہنچا ہوں میں نرم راز تک یا الٰہی اس سے آگے اب کوئی منزل نہ ہو
ان بتوں میں حضرتِ دل کیوں ہی جاتے ہیں آپ کچھ سمجھ لو سوچ لو رہنا کہیں مشکل نہ ہو

کارِ آساں نیست ذوق و حشتِ سودائے عشق
از حمیدِ خستہ دل پرس از مصیبتہائے عشق

[illegible]

عہدِ ہارون الرشید

ملک الشعرا لارڈ ٹنی سن کی ایک مشہور اور مقبول نظم ہی جس میں انہوں نے تخیل کے زور سے
خلیفہ ہارون الرشید کا زمانہ اور بغداد کی تصویر کھینچی ہی ۔ قاضی عبدالعزیز صاحب خاں

نے اس نظم کا ترجمۂ منظوم عنایت کیا ہے جسے ہم نہایت خوشی سے شائع کرتے ہیں

بحرِ ہستی میں تخیّل کی چلی اک دن صبا | بادبان زورقِ طفلی ہوا سے بھر گیا
سیلِ دوراں جو کہ مستقبل کی جانب ہو رواں | قوتِ متخیلہ سے سوئے ماضی ہٹ چلا
دیکھتا کیا ہوں کہ گرما کی ہے صبحِ نور خیز | سیرِ دجلہ بیٹھ کر کشتی میں ہوں میں کر رہا
اونچے اونچے ہیں نظر آتے گلستانِ قدیم | ہیں مذہّب اور مرصّع مسجدیں رونق فزا
میں تو ہوں اک صادق و مخلص مسلماں اور یہ | اک پرانے مشرقی کا سایہ نظّارہ مرا

زانکہ ایں نظّارہ ام بود ست از بختِ سعید
در شبابِ عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

رات ہے اور سر راتی ہو گئی کشتی رواں | جھک رہی ہیں آبِ صافی پر شگفتہ جھاڑیاں
ساحلِ ہم باغ اور بستاں سرا ہیں سربلند | چشم بر در جنکے دروازے ہیں بہرِ میہماں
نیلگوں لہروں پہ ہے سایہ فگن نخلِ ترنج | بادلوں سے ہے سیہ گویا کبودی آسماں
جھلملاتا ہے طلائی ساز و سامانِ باغ میں | دھیمی دھیمی جل رہی کافور کی ہیں بتیاں
دجلہ کے دونوں کنارے پہ رکھی ہیں صف بصف | کچھ منقش کوچ - آرامی منبّت کرسیاں

فی الحقیقت بس مبارک بود ایں وقتِ سعید
در شبابِ عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

ساحلِ یم سے کہ شادابی ہے روشن نام تھا | نہر اک نکلی تھی جس سے شہرِ شیریں کام تھا
نہر کی جانب بکوشش ناؤ کو میں لے گیا | نخل کا جسکے کنارے پاسبانی کام تھا
چاندنی چٹکی ہوئی تھی سبزہ گلزار پر | نازنینانِ چمن کا خاص جلسہ عام تھا
ہائے وہ دوشیزگانِ باغ کی سرگوشیاں | ہر طرف گلکاریوں نے اک بچھایا دام تھا
سیر کو ان کا لبِ جو اس جگہ آنا - جہاں | آبِ دجلہ نے بچھایا بسترِ آرام تھا

بس مکانِ دلپذیر و بس زماں پر نوید

در شبابِ عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

نہر پر تھا آبِ دجلہ کے تموّج کا اثر　　یعنی لہریں اُٹھ رہی تھیں اسکی سطحِ صاف پر
صاف اور شفاف پانی میں کواکب کا تھا عکس　　رات تھی سنسان کشتی چل رہی تھی بیخطر
نور کے چشمہ سے آخر بحرِ ظلمت میں گرا　　یعنی آیا سایۂ اشجار کا تاریک گھر
چند خودرو پھول سوئے آسماں تھے بڑھ رہے　　نخل نے انکی ترقی روک دی چھت پاٹ کر
نخلِ باسق تھے کنارِ آبجو مثلِ ستون　　جنکی شاخیں بنگئی تھیں اُن کے گنبد سربسر
خوش تریں وقتے کہ ایں منظر بدیں ساماں رسید

در شبابِ عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

بن گئی یہ نہر صافی اک مصفا جھیل تھی　　میری کشتی تھی برابر آگے آگے بڑھ رہی
نہر کے سرسبز ساحل سے جو دھاریں تھیں رواں　　گرتی تھیں الماس گوں نالوں سے کیسی سُر بھری
صدکے چشمہ سے جو دھاریں تھیں نیچے بہہ رہیں　　کرتی تھیں جھنکار پیدا جوں ظروفِ نقرئی
چھوٹی چھوٹی پست جو پلوں کی محرابیں تھیں　　ان سے دھاریں چھٹ رہی تھیں جیسی کہ زریں جالی
سنگریزے جو چمکتے تھے سفینہ کے تلے　　نہر کی لہروں نے کردی ان میں پیدا کھلبلی
بس مکانِ دلپذیر و بس زمانِ پُر نوید

در شبابِ عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

سایۂ اشجار میں پیچیدہ رہ اک تھی رواں　　مختلف الوان کی اُس پر بچھی تھیں سیپیاں
راستہ کے ہر دو جانب مشک بیز و دلکشا　　مشرقی گلہائے زنگارنگ تھے جنکے زباں
کچھ صراحی دار گلدانوں میں دُرّ یتیم تھے بہا　　اور کچھ خوش رنگ گلدستوں میں تھے نکہت فشاں
تھے گلِ رنگیں کھڑے سر کو جھکائے عجز سے　　غنچے تھے خاموش سینہ میں لئے رازِ نہاں
بعض تختوں میں کھلے تھے پھول ایسی شان سے　　تاج پہنائے ہوئے تھیں انکو گویا کلغیاں
مشکبار و عنبر افشاں۔ ہر گلِ نو شد پدید

در شبابِ عہد صالح شاہ ہارون الرشید

اب تصور نے دکھائی ایسے منظر کی بہار — جھنڈ لیموں کے جہاں چھائے ہوئے تھے بیشمار
آخرِ شب رقص تھا شاخوں کا کیسا نغمہ خیز — انکو مدھم کر رہی تھی نغمہ سنجیِ ہزار
راگ بلبل کا نہ تھا - تھی یہ صدا کچھ اور ہی — دلکش و جاں آفریں تھی اور نہایت خوشگوار
وُہ صدا جادو بھری جس پر ہمہ تن گوش تھے — عشقِ سرمد - جانِ شیریں - مرگ و شادیِ ضطرار
جس نے تاریکیِ عالم کو مسخر کر لیا — قیدِ ہستی سے نہ جسکو علتِ دوراں سے کار

ہیں! کہ دوراں آرزوئے خود ہمہ در بر کشید
در شبابِ عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

سرد خانے اور جلو خانے چمن میں تھے کہن — سایۂ اشجار میں سوتے تھے وُہ گویا مگن
نخلِ خرما انتظارِ موسمِ گرما میں تھے — انکی صف بستہ ادا سے تھی عیاں شاہی پھبن
دفعتًہ اِک نور مثلِ مہرِ عالمتاب نے — اپنے پرتو سے بنایا نُور کا بُقعہ چمن
جس نے پتوں کے خلا کو روشنی سے بھر دیا — برگِ کاہی کو بنایا زرِ خالص کا لگن
روشنی پڑتی تھی پتوں میں سے سطحِ آب پہ — نقشِ شب در روز گویا ہو رہا تھا منہ زن

عیش و عشرت را نیامد بر زباں ہَل مِن مزید
در شبابِ عہد صالح شاہ ہارون الرشید

سر پہ لے رکھی تھی شب نے چادرِ ہم رنگِ قیر — تھے ستارے اسمیں سلمہ کی طرح واضح منیر
نور کا عالم تھا زیرِ آسمانِ شاہی محل — ہو رہے انجم تھے جس کو دیکھ کر ظلمت پذیر
لنگرِ بیمنِ کشتی ڈالکر پہنچا میں واں — جانبِ ساحل کہ دامنگیر تھا جنّت نظیر
سخت حیرت ہے کدھر سے نور چمکا یک بیک — نیند کے غلبہ میں گویا کہہ رہا تھا یوں ضمیر
اس قدر آرام و راحت اس گھڑی اس جا عجب — اور یہ دلکش ملایم گھاس نزدِ آبگیر

حبذا دوراں جنہیں الوانِ نعمت برگزید

در شباب عہد صالح شاہ ہارون الرشید

ساحلِ دریا پہ تھا گلزار اک مہکا ہوا — منظر دلکش نے جسکے مجھ کو اپنا کر لیا
منظرِ دلکش تھا یا تھی کشورِ امن و نشاط — تھی جگہ گلگشت کی یا شہر کا طبقہ جدا
تھیں سطوحِ مرتفع زیبِ چمن اور ہر طرف — سبزہ و سایہ نے بازی زرد کی دی تھی بچھا
تھے چمن میں بودار گلبن و نخل و ثمر — گرد اُنکے تھے مہکتے ترد ریحاں جانفزا
مشرقی نجم و شجر تھے۔ تھے منارے سر بلند — اُن پہ آثارِ زمانہ کا تھا کتبہ کھد رہا

ایں ہمہ اسباب رونق بہتر زیں شد پدید
در شبابِ عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

بیخودی تھی مجھ پہ گویا۔ خواب تھا میں دیکھتا — ہر روش پر کام تھا زنجیر بندی کا بنا
نور و سایہ چھن رہے تھے اور آتے تھے نظر — قصر و ایوانِ خلیفہ - افسرِ عباسیا
عین آنکھوں کے محاذی تھی کھلے ابوابِ قصر — وہ صنوبر کے بنے تھے اُن پہ کندہ کام تھا
چوڑی چوڑی سیڑھیاں تھیں سنگ مرمر کی بنی — فرش اُن کا تھا منقش مختلف احجار کا
سیڑھیوں کے متصل ہی تھی عمودِ زرِ ناب — ساز و ساماں یہ بناتے تھے زمانہ کی ادا

برمذاق وقت چرخ ایں ساز و ساماں برشید
در شبابِ عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

اس قدر ایواں کی روشن تھیں اتنی کھڑکیاں — تابداں سورج تھا گویا اور محل تھا آسماں
ایک شب کی زندگی او حسرتیں دل میں بہت — اس لئے جلتی تھیں دل سوزی سے لاکھوں بتیاں
اُف رے ذوقِ دلبری جو نزع میں بھی تھا یہی — شمع پروانے سے رُخ کرتی رہی اپنا نہاں
بُقعۂ نور اس ضیا سے شہر بھر کے تھے محل — تھے فنا ظلمات کو کرتے روپہلی شمعدان
تھے مجلا گنبدوں پہ بسکہ آویزاں ہلال — سقفِ شب پہ سینکڑوں قائم تھے اسلامی نشاں

روزگار آں عہد نعمت خیز خوش خوش پرورید

در شبابِ عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

پھر خلیفہ کے حرم میں مَیں دبے پاؤں گیا — حُسنِ فِتنہ[ملہ] میں تھا مَیں اس رِدیا میں نہا دیکھتا
اُس کی کالی شوخ آنکھوں میں چمک تھی نور کی — دل میں اسرارِ محبت کا خزینہ تھا چھپا
آبنوسی زُلفیں موتی سے رُخِ پُر نور پر — کالی کالی رات کی مانند پلکیں مشک سا
مُوئے رخشاں تھے لٹکتے اسکے سر سے تا کمر — یعنے گیسوئے معنبر پیچدار و جانفزا
زُلف تھی پتلی کمر کے گرد پیٹی کی طرح — حسنِ زیبا میں تھی لاثانی وُہ شکلِ دلرُبا

آسماں ایں صُورتِ رعنا و مہوش آفرید

در شبابِ عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

چھ ستون نقرئی تھے زینتِ شاہی محل — تین ہر جانب کھڑے تھے خوبصورت بے بدل
اُن پہ قائم تھا سریرِ پادشاہِ دادگر — جو مکلف اور منقش تھا مطلّا پُر حلل
وُہ زبرجد اور یشب سے تھا مرصع تختِ شاہ — جسکے آگے سر جھکاتی تھیں زمانے کی دول
اس سریرِ خوشنما پر زیب و زینت بخش تھے — شاہ عالی مرتبہ اور نائبِ ختم الرسل
چشمِ زائر میں تبسم کہہ رہا تھا فخر سے — آپ ہی تو ہیں خلیفہ ہادیٔ ملک و ملل

ایں چنیں شانِ خلافت چشمِ دو قم خوش ندید
در شبابِ عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

غ ش منصور بدری

ماتمِ جاناں

مَیں اعتبارِ ہستیٔ بے اعتبار ہوں — مَیں اضطرابِ خاطرِ بے اختیار ہوں
مَیں نامرادیٔ دلِ امیدوار ہوں — یعنی فریبِ زندگیٔ مستعار ہوں

جاں دادۂ تغافلِ تیغِ قضا ہوں مَیں

ملہ مراد از انیس المجلس ۱۲

بھٹکا ہوا مسافر راہِ فنا ہُوں میں

دُنیا کے کاروبار سے اُلفت نہیں رہی اب دِل کو مہ جمالوں کی چاہت نہیں رہی
وُہ ولولے وہ جوش وُہ حسرت نہیں رہی ساقی کی جب سے چشمِ عنایت نہیں رہی

ہم وُہ ہیں اب نہ ہم میں جوانوں کی شان ہے
وُہ بانکپن ہے اور نہ وُہ آن بان ہے

احساں ہے چشمِ ترکا مِری جوئبار پر دامانِ کوہسار پر اور آبشار پر
دریا پہ اور دشت پہ۔ ابرِ بہار پر شادابیِ گُلِ چمن روزگار پر

گلکاریوں سے اِسکی ہر اِک شے بھری ہُوئی
لیکن نہ اپنی کشتِ تمنا ہری ہُوئی

اچھا ہُوا کہ حال ہمارا بُرا ہُوا محرومِ مدعا دلِ بے مُدعا ہُوا
تسکیں فزائے دل۔ المِ دلرُبا ہُوا وجہِ شفائے درد۔ غمِ لادوا ہُوا

ناکامیوں سے کام ہمارے نکل گئے
ہم زندگی میں گور کے سانچے میں ڈھل گئے

کیوں آج دل میں درد ہے کیوں اشکبار ہوں کیوں آج اپنے خاطرِ غمگیں پہ بار ہوں
کیوں آج پائمالِ غمِ روزگار ہوں کیوں آج اپنی زیست سے بھی شرمسار ہوں

صد حیف لُطفِ زیست کا پہلو نہیں رہا
آرامِ جان و مونسِ دلجو نہیں رہا

وُہ گلعذار جو کہ عروسِ بہار تھا جس سے شگفتہ میرا دلِ داغدار تھا
خجلت دہِ گُلِ چمنِ روزگار تھا وُہ پھول ہائے میرے گلے کا جو ہار تھا

باغِ جہاں میں طُرۂ تاجِ خزاں ہُوا
وُہ نونہالِ حُسن نگہ سے نہاں ہُوا

افسوس اے شباب وہ غنچہ دہاں گیا | افسوس اے شباب وہ سرو رواں گیا
افسوس اے شباب وہ آرامِ جاں گیا | افسوس اے شباب وہ جانِ جہاں گیا

دریائے خوں یہ دیدۂ نمناک ہو گئے
جو حوصلے تھے دل کے وہ سب خاک ہو گئے

[illegible]

کلامِ آزاد

لاہور میں علمی جلسوں اور شعر و سخن کے چرچوں کی ابتدا تھی تعلیم کا سلسلہ نیا نیا شروع ہوا تھا۔ ڈاکٹر لیٹنر سا ماہرِ علوم مشرقی پنجاب یونیورسٹی کی بنیاد ڈال رہا تھا جب مولوی محمد حسین آزاد کی کوششوں اور ڈاکٹر صاحب موصوف کی سرپرستی سے انجمن مشاعرہ قائم ہوئی۔ اس مشاعرے کے جلسوں کے لئے جو غزلیں مولانا آزاد نے لکھی تھیں۔ اُن میں سے بعض کے مسودے ہمیں آغا محمد ابراہیم صاحب خلف مولانا ممدوح سے مل گئے تھے کچھ غزلیں پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ چند مکمل غزلیں اور چند متفرق اشعار باقی ہیں جو اب درج کئے جاتے ہیں

ہم نہ کہتے تھے کہ کھو دیگا دلِ زار آنکھیں | یاں تلک رویا کہ آخر ہوئیں بیکار آنکھیں
چشم کافر میں نشے کے جو ہیں ڈورے ساقی | کیا بھلی لگتی ہیں پہنے ہوئے زنار آنکھیں
آمد آمد ہے یہ کس یوسفِ مصری کی کہ آج | سرِ بازار بچھاتے ہیں خریدار آنکھیں
بند ہو جائیگی پھر مملکتِ دل کی خبر | کہہ دو توڑیں نہ کہیں آنسوؤں کا تار آنکھیں
آنکھ کی خوش نظری ہے کہ ہو تو نورِ نظر | جب نظر ہی نہیں ان میں تو ہیں بیکار آنکھیں
چشمِ نرگس کو بھی گلشن میں بڑے دعوے ہیں | تم ذرا چل کے دکھا دو سرِ گلزار آنکھیں
دلِ مُرغ اڑا نا ترا اور ان کا مار جانا صاف | کرتی آنکھوں ہی میں ہیں گھر کیا زر عیار آنکھیں
آبرِ نیساں کہیں او حُسن کے نیساں یاں بھی | مدتوں سے ہیں کھلی تشنۂ دیدار آنکھیں
جامِ سرشار سے اس بزم کو کر دے سرشار | تو بھی سرشار ہو ساقی تری سرشار آنکھیں

نہیں کرتے جو مسیحائی ہماری نہ کرو پر تم اپنی تو خبر لو کہ ہیں بیمار آنکھیں

ہائے حسرت نہ بر آئی کبھی دل کی آزاد
ساتھ ہی لے کے چلیں حسرت دیدار آنکھیں

طلوع اوج پہ ہے آج اختر مینا کہ دست ساقی مہوش ہے افسر مینا
مجھے یہ ڈر ہے پری بنکے اُڑ نہ جائے کہیں کہ موج بادہ مینا ہے شہپر مینا
چراغ حسن پہ ساقی کے ہیں یہ پروانے کہ گرتے آن کے مینا ہیں بر سر مینا
حباب دیکھ کے شیشے میں مست حیران ہیں اتارا کیونکہ ہے مینا میں ساغر مینا
کہو یہ اہل نظر سے کہ آنکھیں کھولیں ذرا کھلینگے آج سر بزم جوہر مینا
جو میکشی کا مزا ہے تو میکشو یہ ہے کہ پائے خم پہ دھرا سر ہو ہاتھ پر مینا

نہ سنگ حادثہ محتسب سے ڈر آزاد
شمول ہمت مرداں ہے یاور مینا

سمجھتے جسکو تھے ہم یار مہرباں اپنا غضب ہے آج وہی ہے وبال جاں اپنا
کھلے جو دیدۂ غفلت تو یہ ہوا روشن کہ نفع جسکو تھے سمجھے وہ تھا زیاں اپنا
پھرے ہے وادیٔ غفلت میں دیکھنا کیا تھا نشاں جو ڈھونڈے ہے اسکا مٹا نشاں اپنا
ہمارے دل کی تو دلدار تک ہے دلداری جو وہ نہ دل کو سنبھالے تو دل کہاں اپنا
جو تیغ ناز کی فکر اب کریں تو غیر کریں کہ ہم تو دے چکے پہلے ہی امتحاں اپنا
میں ضبط دل کا ہوں قائل کہ خون ہو کے بہا یہ حرف شکوہ نہ لایا سر زباں اپنا

ہم بیکسوں کا زور اگر ہے تو بس یہ ہے جب جی سے تنگ آئے تو رو رو کے مر رہے
ہیں خانہ ہائے چشم جو خالی پڑے ہوئے یوں اُن میں آ سما کہ نہ جائے نظر رہے
سمجھے تھا تیرے در کو ٹھکانا دل خراب تو در سے دے اُٹھا تو یہ بے گھر کدھر رہے
جو مرغ رکھتے تھے پر پرواز اُڑ گئے اُن کا خدا ہے اب کہ جو بے بال و پر رہے

یارب یہ برق ہے کہ دلِ بیقرار ہے ظالم زمیں پہ ٹھہرے نہ افلاک پر رہے

مُلکِ خودی میں دیکھتے ہیں سیرِ بےخودی

آزاد ہم وطن میں بھی کرتے سفر رہے

رُخ سے اُلٹا جو نقاب اُس نے ذرا آن کی آن خاک میں مل گئی سب مہر درخشاں کی شان

کونسا گل نہیں گلشن میں کہ اے بادِ صبا آج سُنتے نہیں ہم مرغِ گلستاں کی تان

دَورِ رندانِ خرابات میں آجا آزاد

تیغِ عقل اُن کے یہاں چڑھتی ہے انسان کی سان

بے قراری نے کیا کچھ نہ اثر ہم بھی اب صبر کئے بیٹھے ہیں

گو جنازے پہ نہیں قبر پہ آئے وُہ مرے شکوہ کیا کیجے غنیمت ہے کہ آئے تو سہی

یہاں تو آج تک اچھی ہی گذری مگر ہے فکر کل کی آبرو کی

زباں ہے پاک ہر دم نام حق سے نہیں عاشق کو کچھ حاجت وضو کی

تازہ غزلیں

تڑپنے کا دلِ مضطر۔ کبھی عقدہ کھلیگا بھی ارے ناداں مچلتا کیوں ہے۔ آخر کچھ کہیگا بھی

عدو نے بھی بڑہایا تو ہے تم سے ربط ضبط اپنا مگر میری طرح یہ میل جول اُس سے نبھیگا بھی

ہوا ہے شمع پر۔ پروانہ کے جلنے سے یہ روشن کسی کو جو جلائیگا۔ تو بیشک وہ جلیگا بھی

تری محفل میں اے واعظ۔ کسی کے کیا بنینگے؟ جہاں دلبستگی ہوگی۔ وہیں کچھ دل لگیگا بھی

سمجھ کر راہ میں سب اونچ نیچ انساں قدم رکھے چلے گا دوڑ کر جو بے تحاشا وہ گریگا بھی

بھلا روزِ شمار ان بے شمار اپنے گناہوں کو کہاں تک وہ گنے جائیگا جو کوئی گنے گا بھی

جو تم نے ظلم سیکھے ہیں مجھی پر آزماؤ گے مجھی پر ختم سب ہونگے۔ کوئی باقی رہیگا بھی

یُونہی کب تک رہیگا دور دورہ دردِ فرقت کا الٰہی یہ کسی کروٹ کسی پہلو تھمے گا بھی

مرا دل ہی تمہارا تو نہیں۔ مرتا ہی مرنے دو
تمہیں کیا مرنے جینے سے۔ مریگا بھی جئیگا بھی

عبث کرتے ہیں فکرِ رزق وہ رزاقِ مطلق ہے
کیا ہے اُس نے وعدہ تو دلائیگا بھی دیگا بھی

ہماری سی زباں میں اس زمیں میں ہو غزل کس سے
وُہ اپنی ہی سی اے مفتوں کہیگا جو کہیگا بھی

مفتون دہلوی

ہجر میں اس بُت کے تارِ اشکِ غم ٹوٹے نہیں
دم میں دم جبتک ہے دامانِ وفا چھوٹے نہیں

عہد پر قائم رہینگے آپ کیونکر مان لوں
کیا یہ پیمانِ وفا میرا ہے جو ٹوٹے نہیں

وُہ تو سننے کے لئے تیار تھے احوالِ دل
کیا علاج اس کا کہ ہم ہی منہ سے کچھ پھوٹے نہیں

یاد رکھنا آگئی پیری تو پھر پچتاؤ گے
گر جوانی میں جوانی کے مزے لوٹے نہیں

زندگی جب تک ہے یارب عیشِ دنیا کم نہ ہو
جامِ مے منہ سے صراحی ہاتھ سے چھوٹے نہیں

نوچ ڈالے بلبلِ بے خانماں کے بال و پر
یا الٰہی ہاتھ کیوں صیاد کے ٹوٹے نہیں

گر رہا کرنا ہے او صیاد اب کر دے رہا
قفلِ خاموشی کے تا بت ہی رہے ٹوٹے نہیں

راتدن اس فکر میں ہوں اے فصیح باوفا
رشتۂ الفت جہاں تک ہو سکے ٹوٹے نہیں

فصیح دہلوی

چٹکیاں لے رہے ہو تم دل میں
پیار کر لے کوئی نہ محفل میں

درد ہو داغ ہو غرض کچھ ہو
اک تری آرزو نہ ہو دل میں

جیتے جی اے غبارِ ناکامی
ہو گئے دفن کوئے قاتل میں

تم نے ترکش میں اُن کو رکھا تھا
ہمنے تیروں کو دی جگہہ دل میں

مے سے کرلے وضو تو چل زاہد
میرے پیرِ مغان کی محفل میں

ہم اُسے عرض کر نہیں سکتے
ہے اک ایسی ہی آرزو دل میں

بسملوں کی دعا ہے اور یہ ہے
بارہ خنجر میں نوک قاتل میں

انتہا ہے یہ سوزِ الفت کی
خون کے بدلے آگ ہے دل میں

کیا بگڑتا ہے کیوں رسائی ہو
دُور بیٹھے رہیں گے محفل میں

تم نہا کر چلے جو دریا سے
اشک بھر آئے چشم ساحل میں

تم جگر صاف کر گذرتے ہو
ٹھان لیتے ہو بات جو دل میں

جناب جگر بسوانی

کہہ سرد آہ بھر کر جل کے میرے گرم نالوں سے
خدا سمجھے سنانیوالوں سے دُکھ دینے والوں سے

ابھی کیا ہے ستمگر روبروئے داورِ محشر
خجل ہوگا کوئی گھبرائیگا میرے سوالوں سے

بُلا کر مجھ کو خلوت میں کسی کا نازسے کہنا
یہ کیوں بدنام کرتے ہو کسی کو اپنے نالوں سے

مزا فریاد کا جب ہے کہ وہ کہتے ہوئے آئیں
کلیجا جل گیا ظالم ترے پُر درد نالوں سے

کسی کی جان جائیگی کسی پر دل جو آئیگا
کہے دیتے ہیں ہم دل دینے والوں لینے والوں سے

مرا مشرب ہے رندانہ نصیحت سُنی دے ناصح
نہ مجھ کو کام مسجد سے نہ مطلب ہے شوالوں سے

نہ کیوں اخلاق ہوں پیرو فروغِ نظم کے شہرے
شرف ہم پا رہے ہیں لکھنؤ کے باکمالوں سے

سید نذیر احمد اخلاق بنارسی

ہوتی رہتی ہے خلش درد کی اکثر دل میں
رہگیا ہو نہ کہیں ٹوٹ کے نشتر دل میں

آتا رہتا ہے تصور تری مست آنکھوں کا
چلتے رہتے ہیں مے ناب کے ساغر دل میں

خواب میں خوب لئے ہم نے تصور کے مزے
آج مہمان رہا ہے کوئی شب بھر دل میں

جو مزا تیری جفا میں ہے کسی شے میں نہیں
گھر بنا لیتے ہیں یہ خنجر و نشتر دل میں

کبھی ہنستا ہوں تیری یاس میں کبھی روتا ہوں
یاس رہتی ہے تمنا کے برابر دل میں

غم نہیں شوق نہیں درد نہیں کچھ بھی نہیں
جھوٹ گر جانتے ہو دیکھ لو آکر دل میں

تو سہی آگ لگا دوں میں قیامت کر دوں
دل جلے رکھتے ہیں سرمایہ محشر دل میں

اب کھلا راز قریب رگ جاں کا عقدہ
جسکو ہم ڈھونڈھتے پھرتے ہیں وہ ہے ہر دل میں

یہ بڑا حسن ہے تصویر میں اس کی حامد
گھر بنا لیتی ہے آنکھوں سے اتر کر دل میں

حامد حسن قادری بچھرایونی

دیش اپکارک

ہندوستان بھر میں
اکیلا ہفتہ وار
طبی اخبار
ہے جو ہر بدھ وار کو لاہور سے شایع ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ تین روپیہ ششماہی عہ سہ ماہی ۱۲ سال بھر کی قیمت پیشگی ادا کرنے پر عقاقیر کی دوائی نذر کی جاتی ہے اگر آپ نے نمونہ ابھی تک نہیں دیکھا۔ تو کارڈ میں یہ بھی لکھ دیجیے۔
نمونہ مفت بھیجا جاویگا۔ دیش اپکارک دیکھکر آپ خوش ہونگے ✢

اے ضعف و دیگر امراض پیچ کے مریضو

اگر تم مختلف علاج کراکے مایوس بھی ہو چکے ہو تو بھی تم مجھکو صرف ایک کارڈ لکھو میں تمکو وہ وہ نصیحتیں کرونگا اور ترکیب بتاؤں گا کہ تم پھر سے مرد تندرست اور جوان بن سکوگے!

صرف نام مرض اور اپنا نام اور مفصل پتہ خوش خط لکھدیں

پتہ امرت دھارا لاہور
ٹھاکر دت شرما ویدا پکارک کارخانہ امرت دھارا چوک متی لاہور

اگر

آپ نے رسالہ آب حیات (رجسٹرڈ) جو امرت دھارا (رجسٹرڈ) کی تعریف میں ہے ابھی تک نہ دیکھا ہو تو اس کے بھیجنے کے واسطے بھی لکھ دیجیے گا۔

ہم بم کے گولے فروخت کرتے ہیں

ان لوگوں نے آگاہی کے لئے جو ملک میں انقلاب حکومت کے طلبگار ہیں اعلان کیا جاتا ہے کہ ہمارے نوایجاد بم کے گولے خریدیں اور کام میں لائیں انگریز اور پولیس مزاحمت نہ کرے ذرا نہ ڈریں وہ ہمارے گولوں کی خرید و فروخت کو ناجائز نہیں سمجھتے انسانی جسم ایک ملک ہے جس میں سل حقیقی کی حکومت ہو جائے تو بیچارہ وہ ملک تباہ برباد ہو جاتا ہے یعنی پھیپھڑہ سے خواہ کسی وجہ سے زخم ہو کر اول تر کھانسی خون پھر پیپ بلغم کی صورت میں آنے لگے۔ اگر بلغم میں پیپ میں تمیز کرنی ہو تو لوٹے بھر کر بلغم ملا کر دیکھو اگر پیپ ہوگی تو پانی میں گوشت جیسی بو دیگا۔ ایسی حالت ہو تو ہمارا نوایجاد سفوف دجو سل کے اور تمام اندرونی زخموں کے اندمال میں نہایت سریع الاثر ہے۔ فیصدی ۹۹ مریض اچھے ہوئے ہیں) تیر بہدف ثابت ہوگا۔ واقعی سل حقیقی کو نیست و نابود کرنے کے لئے ہمارا اسفوف بم کا گولہ ثابت ہوا ہے۔ یہی نہیں کہ ہندوستان میں اسکی سریع التاثیری کا غل ہے بلکہ یورپ تک اسکی صحت بخشی کا چرچا پہونچ گیا ہے۔ منگا کر امتحان کر لیجئے قیمت فی تولہ علاوہ محصولڈاک (چار روپے للعہ)

سفوف مغلظ

عام اعصاب۔ اور قوی کو قوت بخشتا ہے۔ قوت دماغ۔ اور قوت منی پیدا کرنے کے لئے بیحد نافع ہے تقطیر البول اور سلس البول رطوبی اور معدے اور آنتوں کے دسلوں میں کثرت نار کا طور عام اور وجع مفاصل میں۔ استرخا۔ اور خدر۔ اور فالج۔ اور رعشہ میں ایک ہی دوا مختلف ترکیبوں اور مفردات میں ملا کر دینے سے اپنا سریع الاثر ہونا منوا دیتی ہے۔ مردوں کو مفید ہونے کے علاوہ عورتوں کے مخصوص امراض میں بمنزلہ اکسیر ہے خصوصاً سیلان رحم میں دوسرے ہی روز سے نفع محسوس ہونے لگتا ہے کسی معجون یا مرکب دوا میں ملاؤ تو اسکی قوت کو دوبالا کر دیتا ہے۔ قیمت فی تولہ علاوہ محصول ڈاک (تین روپے) (سے)

حبوب وجع مفاصل

بدن کے تمام جوڑوں خصوصاً درد کمر کے لئے بیحد نافع ہیں دو چار گولیوں میں ان کا برقی اثر معلوم ہو کر مریض کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہیں۔ سو گولیوں کی قیمت علاوہ محصولڈاک صرف (تین روپے) (سے)

المشتہر۔ حافظ محمد یعقوب گنگوہ ضلع سہارنپور

جوہر عشبہ مرکب چوب چینی

گذشتہ پچاس سال کے تجربے نے پبلک پر ثابت کر دیا ہے۔ کہ ہمارا طیار کردہ عشبہ مرکب ازالۂ امراض کے لئے جادو کا اثر رکھتا ہے۔ ہمارا طیار کردہ عشبہ تمام مصفی خون ادویات پر فوقیت لے گیا ہے۔ کیونکہ یہ اپنے ملک کے مزاجوں کے مطابق سرد و تر ادویہ کے ملانے سے طیار کیا جاتا ہے۔ جہاں انگریزی ساختہ عشبے ناکارہ در نقصان رساں ثابت ہوئے ہیں۔ وہاں اس نے لیلے لیلے سریع العمل فوائد کھلائے ہیں۔ کہ مریض دنگ رہ گئے ہیں۔ اور مان لیا ہے۔ کہ عشبہ مرکب چوب چینی ازالہ امراض فساد خون کے لئے بے نظیر ہے۔

عشبہ مرکب چوب چینی کے فوائد و خواص تمام پھوڑے۔ پھنسیاں۔ چہرے کے بدنما داغ دکیل۔ لاغری۔ زردی چہرا۔ داد۔ چنبل۔ چنڈوں کا پرژہ ہونا۔ سیاہ ہونا۔ چھائیاں۔ خارش۔ خنازیر۔ بھگندر۔ وجع مفاصل کے دفعیہ کے لئے عدیم المثل ہے۔ خون کو صاف و پاکیزہ بنا کر چہرہ کا رنگ گلاب کی پتیوں کی طرح سرخ اور بدن کو فربہ بناتا ہے۔ خوشنما اور خوشبودار ہے۔ عند الاستعمال دودھ کا کام دیتا ہے۔ عورتوں۔ مردوں۔ بچوں اور بوڑھوں۔ نوجوانوں کو یکساں مفید ہے جو لوگ دائم المرض بوجہ کمی استفادہ کی خون مسموم رہتے ہوں۔ وہ آزما کر دیکھیں پورا پورا معاون صحت ضامن و مددگار تندرستی۔ تجربے سے ثابت ہوا ہے۔ خون فاسد گندہ کو چند روز میں صاف کر دیتا ہے۔ کمی بھوک۔ دائمی قبض۔ کمزوری۔ رنگین بادی۔ وغیرہ دور ہو جاتی ہے۔ گویا مرض دور ہونے سے غربت و عسرت دور۔ نکبت کی جگہ عشرت۔ دولت اور فراغت آجاتی ہے۔

یہ جوہر اعضائے اندرونی پر عمدہ اثر کرتا ہے۔ اور جلد پر سب سے زیادہ اچھا اثر اسی جوہر کا ہوتا ہے۔ جس سے تمام چہرے کی بیماریاں ناسور وغیرہ جاتی رہتی ہے۔ ہندوستان وغیرہ ممالک میں اس کا تجربہ ہو چکا ہے اور ہمیشہ مفید و موثر علاج ثابت ہوا ہے۔ ہندوستان کے نامی گرامی طبیب و ڈاکٹر اس کے فوائد کی تصدیق کرتے ہیں۔ پس اگر مندرجہ بالا بیماریوں میں سے آپ کسی میں مبتلا ہوں۔ اور دکھ اٹھاتے ہوں۔ تو اس کا ایک دفعہ تجربہ کریں۔ چونکہ تندرستی کا لطف صاف خون پر ہے۔ تو خون کو صاف و پاکیزہ بنانے کے لئے اس سے بہتر کوئی دوا آپ کو نہیں مل سکتی۔

قیمت شیشی کلاں (عہ) خورد (۸)

پتہ۔ حکیم ڈاکٹر حاجی غلام نبی زبدۃ الحکما۔ لاہور

روغن مقوی

خلاف استعمال سے مردہ عضو ت زندہ ہو کر … طاقت پیدا ہو جاتی ہے (عہ)

دافع حرارت

… زخم ہو دہ … خشک ہو کر … جاتا ہے

سرمہ میرا

مقوی بصر۔ محافظ بینائی … جالا۔ سرخی نزول … (۸)

روغن اعجاز

… ناسور خنازیر کا … بے نظیر علاج ہے۔

حب بواسیر

… خون بند … قیمت (۸)

دافع سوزش

… تمام … درجہ اول مہر … دوم …

مفت

… صفحہ کی باتصویر کتاب درخواست آنے پر روانہ کی جاتی ہے

فریڈرک اسٹیرنس اینڈ کمپنی دواسازان ڈیٹرایٹ ملک امریکہ کی مشہور عالم ادویہ

اسٹیرنس ہیڈایک کیور

ہر قسم کے درد سر کے واسطے بلا ضرر۔ زود اثر اور یقینی فائدہ رساں دوا نقلی مت خریدو۔ صرف اسٹیرنس کی اصلی ہر ۲ قرص ۱۱

اسٹیرنس ٹیبلائڈس

کسی قسم کی اور کیسی ہی مثانے کی بیماری ہو اس کے پینے سے دور ہو جاتی ہے۔ اس سے بہتر ان بیماریوں کے لیئے کوئی اور دوا نہیں۔ آجتک کبھی ناکامیاب نہیں ہوئی سب دواؤں سے بہترین ہے۔ ۴۰ گولیوں کی شیشی ۱۲

اسٹیرنس زائیمول ٹوتھ پوڈر

دانتوں کو سفید مسوڑھوں کو مضبوط اور خوش رنگ سانس کو نہایت ٹھنڈا اور شیریں بناتا ہے اور دہن میں حیرت انگیز خوشبو پیدا کرتا ہے ۱۲

اسٹیرنس کارڈیل کیا ہے

یہ کاڈ مچھلی کے تازہ جگر کے تیل کا جوہر مفید ہے جس میں

پیپٹونیٹ آف آئرن معہ ہائپو فاسفائٹس آف کیلسیم۔ سوڈیم۔ پوٹاسیم۔ مینگانیز نشاستہ جو اور وائلڈ چیری جیسے مفید اور با اثر اجزا شامل کئے گئے ہیں۔

اس جدید اور نفیس مرکب میں خاص کیمیاوی طور سے کشید کر کے کاڈ مچھلی کے تازہ جگر کا جوہر شامل ہے۔ روغنی بدبودار اجزا سے پاک۔ خوش ذائقہ اور بلا شک جملہ مروجہ مرکبات مقویہ سے افضل و بہتر ہے۔ امراض صدر اور عام اور خاص کمزوری کے لیئے نہایت مفید ہے اب کسی مریض کو مناسب نہیں ہے کہ اس مرکب کے ہوتے دوسرے مچھلی کے تیل کے مرکبات استعمال کرے اس عجیب غریب اور سب پر حاوی نسخہ میں سب سے مفید تر موجود ہیں

اسٹیرنس کارڈیل

۱۔ کسی عطائی کا نسخہ نہیں ہے۔

۲۔ دوران ساخت میں ہاتھ نہیں لگایا جاتا۔

۳۔ قیمت بہت گراں نہیں غریب امیر سب استعمال کر سکتے ہیں

۴۔ کوئی شے جو مضر صحت یا کسی مذہب کے خلاف ہو نہیں ڈالی جاتی۔

گورنمنٹ امریکہ کے فوڈ اینڈ ڈرگس ایکٹ نمبر ۹۵۶ مورخہ ۳۰ جون سنہ ۱۹۰۶ء کے بموجب اس مرکب کے جملہ اجزا کی پاکیزگی اور نفاست کی ضمانت کی جاتی ہے۔

رسالہ رفیق مریضاں جس میں ان اور دیگر ادویہ تیار کردہ فریڈرک اسٹرنس اینڈ کمپنی ڈیٹرائٹ ملک امریکہ کے مشرح حالات ہیں۔ نائنٹس ایڈورٹائیزنگ ڈپو۔

کشمیری دروازہ دہلی سے مفت اور بلا محصول طلب کرو۔

اگست ۱۹۰۸ء

ایڈیٹر شیخ عبدالقادر
شیخ محمد اکرام

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

کشمیر
پشاور
لاہور
دہلی
آگرہ
لکھنؤ
کانپور
پٹنہ
بنارس
الہ آباد
کلکتہ
کراچی
بمبئی
رنگون
حیدرآباد دکن
بنگلور
مدراس

نثر

تصویر خاندانِ شریف
عوام ہند۔ حاجی موسیٰ خان صاحب نیمو تاولی جائنٹ سکرٹری مسلم لیگ ۱
قافلہ۔ مولوی سید مقبول احمد صاحب ۷
سودائے سنگین۔ سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے ... ۹
قوت بیانیہ کا زوال۔ نواب رائے صاحب کانپور ۲۱
مالوہ کی سیر۔ مولوی سعید احمد صاحب مارہروی ۲۸
لحباب ...... ا۔ ب۔ طیب۔ لاہور ۳۵
خاندانِ شریف۔ حافظ عبدالقدیر صاحب دہلوی ۴۱
گستائیں تلسی داس۔ مسٹر پیارے لعل شاکر میرٹھی ۵۱
شیر و شکر۔ حافظ عبدالقدوس صاحب قدسی
ریویوز ۶۱

نظم

ترانہ مسرت۔ سید غلام بھیک صاحب نیرنگ بی۔ اے ... ۶۲
جزیرہ سسلی۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی ۶۳
مقدم برشگال۔ منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی ۶۵
برسات۔ سید نذیر حسین صاحب ناشاد بی۔ اے ۶۶
عالم نزع۔ مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی ۶۷
تازہ غزلیں ....

دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں
○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ◐ ان شہروں میں اردو مروج ہے ● اردو سمجھی جاتی ہے

باہتمام شیخ محمد اکرام مخزن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا

قیمت سالانہ معہ محصولڈاک (قسم اول ...) فی پرچہ ...

ایک مفید عام قابلِ قدر و قابلِ دید تصنیف

کی نسبت

ہندوستان کے مشہور انگریزی و اُردو اخبارات و رسالجات کے قیمتی اقوال

(۱) سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۲۳۔ فروری سنہ ۰۸ء "**مخزنِ حکمت** جو طبِ خانگی پر ایک مفید تصنیف ہے ہر ایک تعلیم یافتہ ہندوستانی کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے"۔

(۲) ابزرور لاہور مورخہ ۲۔ اکتوبر سنہ ۰۸ء "**مخزنِ حکمت** اپنی طرز کی ایک نہایت مفید و بیش بہا تصنیف ہے۔ ہم اُردو دان پبلک کو اس کی قدر دانی کی بڑے زور سے سفارش کرتے ہیں"۔

(۳) ریویو آف ریلجنز قادیاں بابت اپریل سنہ ۰۸ء "**مخزنِ حکمت** اُردو لٹریچر میں ایک بے نظیر اضافہ ہے۔ ہم عام اُردو خوان حضرات کو اس کی قدر دانی کی سفارش کرتے ہیں"۔

(۴) روزانہ پیسہ اخبار لاہور مورخہ ۲ ستمبر سنہ ۰۸ء "**مخزنِ حکمت** واقعی ایسی مفید کتاب ہے کہ ہر ایک گھر میں موجود ہونی چاہیئے"۔

(۵) علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ ۲۲۔ جنوری سنہ ۰۸ء "**مخزنِ حکمت** کو ہم علم طب خانگی کا ایک بے مثل خزانہ کہہ سکتے ہیں ہمکو اُمید ہے کہ یہ کتاب عام لوگوں کے لئے ہی مفید اور کارآمد ثابت نہیں ہوگی بلکہ خواص بھی جو قدیم اور جدید طب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُس کو حسنِ قبول کے ہاتھوں پر لینگے"۔

(۶) الندوہ۔ لکھنو بابت جون سنہ ۰۸ء "**مخزنِ حکمت** طب اور الوپیتھی (ڈاکٹری) کی نہایت جامع کتاب ہے جس کے لئے ہندوستان کی طبی دنیا کو جناب شمس الاطبا کا مشکور ہونا چاہیئے"۔

(۷) مجلہ طبیہ دہلی بابت نومبر سنہ ۰۸ء "**مخزنِ حکمت** طبِ یونانی و ڈاکٹری کا کارآمد ذخیرہ ہے۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ ہندوستان کے ہر ایک گھر میں اس کی ایک جلد ہوگی"۔

حجم کتاب ۱۲۷۶ صفحات جنمیں بہت سی رنگین و سادہ تصاویر ہیں قیمت مجلد للعہ

کتاب کے ملنے کا پتہ:۔ دفتر جناب شمس الاطبا۔ لاہور

عوام ہند
اور
اُن کی جانب سے غفلت

جبکہ عام طور پر دعوے کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں کشمیر سے راس کماری تک اور اودہ سے سندھ تک ایک وسیع پیمانہ پر بیداری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں اور اس جزیرہ نما کی ہر قوم اور ہر گروہ میں اعلےٰ تعلیم نے بیچینی پیدا کر دی ہے تو حیرت ہو گی اگر یہ کہا جائے کہ ہنوز ہمارے مصلحان ملک وطنی ترقی کی طرف سے غافل ہیں۔

ہم آمادہ نہیں ہیں کہ صرف اُس کو ترقی کے آثار اور مبارک بیداری کی شان کہیں کہ ادھر اُدھر غل مچا دیا چند لوگ جمع ہو گئے اور انہوں نے کچھ تجویزیں پاس کر دیں اور بس ہماری رفتار ترقی کی جانب شروع ہو گئی۔ اتنے عظیم الشان جزیرہ نما میں جس کو بجا طور پر خود ایک براعظم کہا جا سکتا ہے اور جس کی مردم شماری تیس کروڑ سے زاید ہے صرف چند ہزار آدمی ملکی ترقی کا ادعا کرنے لگیں حالانکہ اپنے پیارے وطن کی جانب سے وہ خود غافل نہیں اچھی بیداری نہیں کہی جا سکتی۔ جبتک کہ بیداری کے آثار ملک کے

ہر طبقہ میں پیدا نہ ہو جائیں۔ جبتک کہ ہر گروہ اپنے ملک کی جانب سے پورے طور پر واقف نہ ہو جائے جبتک کہ تمام باشندے اپنی پستی کو محسوس نہ کرنے لگیں اور جبتک کہ ادنے مزدور سے اعلے طبقہ کے لوگوں تک میں باہمی ہمدردی نہ پیدا ہو جائے اور پورے اتفاق سے ملکی ترقی میں کوشش نہ کرنے لگیں اُس وقت تک یہ دعوےٰ نہیں کیا جاسکتا کہ ملک میں وسیع پیمانہ پر بیداری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں اور اہل ملک کی رفتار ترقی کی جانب ہے۔

ہندوستان چند صوبوں پر منقسم ہے صوبہ جات کمشنریوں سے مرکب ہیں کمشنری اضلاع سے اور اضلاع دیہات سے مرکب ہیں تاآنکہ صوبہ جات سے لیکر دیہات تک یکساں ہر فرد بشر کو ملکی ترقی کی فکر نہ پیدا ہو جائے اُس وقت تک ہم تو اُن کو" وسیع پیمانہ پر ملکی بیداری کے آثار" نہیں کہینگے۔ تم چھوٹے چھوٹے دیہات میں جاؤ اور وہاں کے نیم برہنہ باشندوں کی حالت دیکھکر جو ہندی آبادی کا سب سے بڑا حصّہ ہے اُن غریبوں کو شاید یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ لفظ ترقی کس جانور کا نام ہے اور ملک کس چڑیا کو کہتے ہیں۔ اگر کسی دیہاتی سے دریافت کیا جائے تو زیادہ سے زیادہ وہ ملک کا اطلاق اپنے گرد نواح کے دس یا پانچ دیہات پر کریگا اور بس۔ اس دیہی آبادی کا سب سے بڑا بوجھ بجھکڑ وہ ہوگا جو اُن دو دریاؤں کے نام سے واقف ہوگا۔ جنکے درمیان میں وہ قریہ واقع ہے، وہ جب کسی کی تعریف یا مذمت کریگا تو کہیگا" گنگا جمنا کے بیچ میں ایسا آدمی نہیں ہے" جس ملک میں عام طور پر زبان زد ہو کہ" گنگا سے آگے ویسی نہیں ہے" اُس ملک کا مبلغ معلومات معلوم۔ ہم ملکی مصلحوں سے دریافت کرتے ہیں کہ

انہوں نے اس کثیر آبادی کی اصلاح کی کیا کیا تدابیر اختیار کی ہیں؛ ان کی تربیت کے واسطے کتنی انجمنیں بنائی ہیں کتنے دیہاتی فری اسکول جاری کئے ہیں۔ جنمیں قریہ جات کے باشندوں کی اولاد تعلیم حاصل کرے کیا کیا ایسی تدابیر سوچی ہیں جن سے ان لوگوں کو نوشت و خواند کی جانب رغبت ہو اور کتنا ایسا کم قیمت لیٹریچر مہیا کیا ہے اور اخبار جاری کئے ہیں جنکے ذریعہ سے دیہاتی باشندوں کو دنیا کی حالت اپنے ملک کی حالت اور اپنے ادبار سے آگاہی حاصل ہو۔ اور آگے بڑھنے کا ان کو خیال پیدا ہو جائے۔ تمہارے ان سوالوں کا جواب ضرور تم کو نفی میں ملیگا۔ جب یہ حالت ہے کہ کسطرح کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں وسیع پیمانہ پر بیداری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں آپ ذرا ترقی یافتہ ممالک کی سیر کیجئے اور اٹلی ہی کو دیکھئے جو ترقی کے لحاظ سے یورپ میں کم درجہ پر سمجھا جاتا ہے۔ وہاں ہر جگہ آپ اخبارات کے کلب پائینگے اور کثرت سے سستا لٹریچر آپ کو وہاں نظر آئیگا جسکو ادنےٰ سے ادنےٰ باشندۂ ملک خرید سکے اور اس کے ذریعہ سے اپنی واقفیت بڑھا سکے، تم کوئی مزدور کوئی گاڑی بان اور کوئی خدمتگار ایسا کم دیکھوگے جو ذرا فرصت ملنے پر اس سلسلۂ لٹریچر سے فائدہ نہ اُٹھاتا ہو۔ آپ انگلستان جائیے اور کسی پورٹروں یا گاڑی بانوں کے کلب کو دیکھیئے اور ملاحظہ کیجئے کہ وہ مزدور جو ابھی ایک شلنگ مزدوری لیکر آپکا گلیڈسٹن بیگ دو فرلانگ تک لے گیا ہے۔ کس درجہ کی مضبوط دلائل کے ساتھ گورنمنٹ کی پالسی پر نکتہ چینی کرتا ہے اور اپنی قوم اور سلطنت نیز ملک سوائے اُس کو کس قدر واقفیت حاصل ہے۔ آپ دیکھیئے کہ یورپ میں اُن کی ہم قوموں سے لے اپنے ادنےٰ درجہ کے ہم قوموں کی تعلیم اور واقفیت

بڑہانے کا کیسا انتظام کر رکھا ہے - وہاں کی ادنےٰ آبادی کے واسطے جداگانہ سکول ہیں جداگانہ کلب ہیں جداگانہ لائبریریاں ہیں اور جداگانہ سلسلے اخبارات کے ہیں اس حالت پر بھی وہ لوگ مطمئن نہیں ہیں اور ابھی تک ذرایئع ترقی کی تلاش میں مصروف ہیں - یہ کہا جائیگا کہ یورپ میں تعلیم جبری ہے مگر ہم اُس کا یہ جواب دے سکتے ہیں - کہ وہاں جبری تعلیم تب ہی ہوئی جبکہ ملک میں تعلیم کی جانب عام فیلنگ پیدا ہو گیا ہم دریافت کرینگے کہ دیہی آبادی میں ایسا فیلنگ پیدا کرنے کی کس قدر کوشش کی جاتی ہے اور کتنے ہمارے لکچرار صاحبوں نے اپنے کو وقف کر رکھا ہے کہ چھوٹے چھوٹے دیہات میں جاکر اپنے برادرانِ وطن کو تلقین کرینگے اور تعلیم کی جانب اُن کو مائل کرینگے - شہروں اور قصبوں میں لکچربازی کرنا اور ایسے اخبارات میں مضامین لکھنا جنسے ہماری آبادی کا عظیم الشان حصہ بالکل ناواقف ہے ملکی ترقی کے واسطے ہرگز کافی نہیں کہا جا سکتا +

ہماری آبادی کا یہ ادنےٰ ترین حصہ جنکی طرف سے ہم اس درجہ غافل ہیں اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو ملک کا تمام دارمدار اور انتظام اسی ادنےٰ آبادی کے ہاتھوں میں ہے - یہاں نیم برہنہ کاشتکار اپنے خون پانی کی محنت سے زمین سے پیداوار کی کوشش کرتے ہیں - اور اس ذریعہ سے سلطنت کے خزانہ میں کروڑہا روپیہ داخل ہوتا ہے - انہی چھوٹے لوگوں میں اگر کوئی شخص تھوڑا بہت لکھ پڑھ جاتا ہے - تو ضرور چھوٹے چھوٹے امتحانات دیکر گورنمنٹ کی جانب سے کسی گاؤں کی نگرانی اُس کی سپرد ہو جاتی ہے جس کی زیادہ سے زیادہ دس پندرہ روپیہ ماہوار تنخواہ ہوتی ہے - یہی ایک شخص ہے جس کے قبضہ میں ملک کی مالی حالت دکھاتا ہے کہ جس طرح چاہے

اُس کو ظاہر کرے ملک کی مزروعہ یا غیر مزروعہ رقبہ کے اعداد اگر خدانخواستہ قحط ہو تو اُس کے اعداد اپنے قریہ سے یہی بنا کر افسران بالا کو بھیجتا ہے جن سے بڑے بڑے نقشہ جات مرتب کئے جاتے ہیں حکّام کی طلبیداشت پر یہی چھوٹا سا اہلکار ضروری معلومات مہیّا کرتا ہے غرض اگر غور کیجئے تو ہماری نظر سے قریہ سے لیکر گورنمنٹ آف انڈیا تک ایسی ایک چھوٹے سے اہلکار کا ظہور رہا ہے مگر ملک کا ایسا اہم اور ضروری جزو اگر اُس کی معلومات کی تحقیقات کی جائے تو کمشنری سے آگے نہیں بڑھتی اور ملکی حالت اور اُس کی ترقی یا تنزل کو نہ تو یہ شخص سمجھتا ہے اور نہ اُس کو اُس سے دلچسپی۔ کیا ایسے شخص سے یہ اُمید کیجا سکتی ہے کہ گورنمنٹ کو معلومات مہیّا کرتے وقت وہ ملکی حالت کا پوری ایمانداری کے ساتھ لحاظ کریگا اور جبکہ یہ کیفیت ہے تو کیا ہمارا یہ دعوےٰ کہ ملک میں وسیع پیمانہ پر بیداری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں ٹھیک ہو سکتا ہے +

ہمارے ہندوستان کے تو خمیر میں داخل ہے کہ باشندوں کی حیثیت میں فرق کیا جائے۔ یہاں اصولاً اہل ملک کو چار حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور غریب شودر صرف اس گناہ کی عوض کے وہ کم حیثیت گھر میں کیوں پیدا ہوا اس قابل بھی نہیں سمجھا جاتا کہ برہمن کے ہم حیثیّت ہونے کا دعوےٰ کرے۔ گو مسلمانوں کے اصول میں داخل تھا کہ وہ تمام بنی نوع انسان کو برابر سمجھیں، اُن کے قرآن میں صاف کہا گیا تھا کُلُّ مُؤمِنٍ اِخْوَۃٌ مگر ہندوستان میں آکر تفریق کا مرض اُن کو بھی چمٹ گیا اور مساوات کا مبارک اصول اُنسے بھی اُدھڑ گیا۔ جس ملک میں صدیوں کی مسلسل حقارت سے ایک عظیم الشان حصّہ آبادی اپنے کو پست سمجھنے لگے اور ذہن نشین کرلے کہ ہم اِن سے

زیادہ بڑھ ہی نہیں سکتے اور اس ملک کے مصلح اس گروہ کی جانب سے قطعاً غافل ہوں پھر کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اس ملک کی رفتار ترقی کی جانب ہے۔ آپ یورپ میں دیکھیں جہاں ایک چرواہا اور ایک مزدور سمجھتا ہے کہ اگر وہ کوشش کریگا تو جمیس واٹسن اور کیئر ہاروی ہو سکتا ہے اور جہاں مساوات کا اس قدر خیال ہے کہ اگر سیاہ ٹوپی مروّج ہوگی تو ہر ایک سر پر آپ سیاہ ہی ٹوپی دیکھیں گے خواہ وہ مسٹر اسکوئتھ کا ہو یا ایک مزدور کا۔ یہ علامات ہیں جن سے کسی ملک کو "وسیع بیدار" یا مائل ترقی کہا جا سکتا ہے۔ جبتک کہ ملک میں زور شور سے مساوات کے خیالات پیدا نہ ہو جائینگے، جبتک کہ ہر ایک ہندوستانی دوسرے کو مساوی نہ سمجھنے لگیگا، جبتک کہ نیچے کے درجہ کے لوگوں کی اصلاح کی جانب مصلحان ملک کی توجہ نہ مائل ہوگی اور شودروں تک کے خیالات میں یہ بات پیدا نہ کیجائیگی کہ ہم لوگ بھی برہمن ہی کی مثل حقوق حاصل کر سکتے ہیں۔ اس وقت تک یہ دعوے کرنا "کہ ملک میں وسیع پیمانہ پر بیداری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں" اور "ملک کی رفتار ترقی کی جانب ہے" بہت قبل از وقت ہے +

حاجی محمد موسیٰ خان علیگڈھ

امید وہ جوہر ہے جس کے بل پر دکھیا اور مصیبت زدہ اپنی زندگی کے دن کاٹتے ہیں۔ امید طوفان میں روح کا لنگر بنتی ہے اور مشک کی طرح سہارا دیکر انسان کو مایوسی کے گہرے پانی میں ڈوبنے سے بچاتی ہے اور جب موت کنڈی کھڑکھڑاتی ہو اس وقت بھی آدمی کی ہمت بندھا کر اسے زندہ رکھتی ہے +

قافلہ

شیوۂ رندان بے پروا خرام از من مپرس
این قدر دانم کہ دشوار است آسان زیستن

اللہ اللہ اس خاک پاک امریکہ کا کیا کہنا۔ اس سرزمین سے جو اُٹھتا ہے فرزانہ و نو آہنگ۔ آزادہ روی و نازک اندیشی میں یکتا "پرانی دنیا" اگر جدّت پرست تھی تو "نئی دنیا" جدّت پرستی کی سب سے اچھی مثال لاسکتی ہے۔ برازیل کا عربی اخبار المنار جو خاص پایہ تخت جمہوریہ سے شایع ہوتا ہے ناقل ہے کہ قافلہ کے نام سے وہاں جنوبی امریکہ میں جدید تحریک ہوکر ایک جماعت قایم ہوئی ہے جس نے عرب کی رسم و رواج پارینہ کا احیا اپنے ذمہ لازم کرلیا ہے۔ اس زندہ دل انجمن کے معینہ اوقات پر جلسے ہوتے ہیں اور یاران ہمدم باہم مل جل کر وہی مدارات و تواضع برتتے ہیں جو اہل عرب کا قدیم سے شیوہ ہے۔ وُہی انداز وہی اخلاق وہی مراسم اختیار کیے گئے ہیں جو اس طیلسان پوش قوم کے مایۂ ناز رہے ہیں +

اس شہر کے اکثر مشہور انشا پرداز اور نامور اہل قلم اس سلسلہ میں داخل ہیں جن کا مقصود اصلی نہ صرف تفکّہ و ظرافت طبع ہے بلکہ رُوح عربیت کا پھونکنا یہی وجہ "قافلہ" نام رکھنے کی ہے۔ اسکی مقدمۃ الجیش یا سرگرم کارکن کو الینتو اور آدولا فو بیلاک ہیں۔ پہلا اگر شیوا بیانی و سحر طرازی میں مشّاق زباندانی و علم لُغت میں یگانہ ہے تو دوسرا بھی اخلاق نگاری و تہذیب آموزی میں نظیر نہیں رکھتا۔ اس مجلس کا ایک کارخانہ ہماری نگاہ سے بھی گذرا جس کو دیکھکر عجب لطف و سرور حاصل ہوا۔ رُوح عربیّت نے اپنی جھلک دکھادی۔ تنہا مزے لینا

مروّت و محبت کے خلاف سمجھ کر احباب صافی مذاق کی تفریح و تفنّن کے لئے اُس کا اعادہ کیا جاتا ہے +

ہر شخص جو اس جماعت میں شامل ہو "بدوی" کہلاتا ہے اور اُس کو اس سوسائٹی کی صحبتوں میں اُسی بادیہ نشین و صحرا نورد گروہ کا طریقہ انجام دینا ہوتا ہے۔ پچھلی مرتبہ اس جمعیت کا تیسرا عشا (ڈنر) اوتل غلوبو (گلوب ہوٹل) میں دیا گیا تھا۔ سو بدوی شریک تھے منتظم و سر بزم اولافو بیلاک خود تھا۔ مٹی اور ٹھیکریوں کے ڈھیر سے اونٹ بنا کر اُن کی پشتوں پر نہایت خوش سلیقگی سے مائدہ (میزوں) کی آرائش و تزئین بنفشہ کی غنچوں سے کی گئی تھی۔ جس سے خوانہائے نعمت و عطایائے قدرت کی رونق و شان دوبالا ہو گئی تھی۔ ہر مہمان کے روبرو پیالہ کے پیچھے ایک ایک سربمہر لفافہ بھی رکھا ہوا تھا۔ لفافے کھولے گئے تو اُنمیں سے لائحہ طعام (مینو) نکلا۔ پر تکلف ورق پر بزرگ کو آلیونتو کی تصویر نمایاں تھی بدوؤں کے لباس میں ایک اونٹ کی نکیل تھامے ہوئے۔ پھر یہ عبارت تحریر تھی +

مقامہ سوم۔ زیر سایہ شبستان غلوبو۔ ماہ رمضان کی تیسری مبارک شب ۱۳۲۵ھ (۱۵ اکتوبر ۱۹۰۷ء) +

شوربۂ بلخ ہای بخد۔ ماہئی قلزم احمر کے کباب جو ریگ لیبیا پر سفیہائے ہنگ سے بریاں کی گئی۔ شتر سفید کم عمر کی ران بحیرۂ شاد (چاڈ) کے ساحل سے چھٹی والے شتر مرغ صنعاء کی ساگ و ترکاریاں جو ہیکل جوپیتر کے ویرانہ کے حوالی سے لیگئی ہیں۔ ایک یمنی میوہ ۔ شیر ناقہ کا پنیر۔ بادۂ بت پرستاں جسکا ایک جام بے تأمل پی لینا واجب بلکہ لازم ہے +

(مقبول)

اے اہل ارض رنگ ہمارا اسٹرایئو
تقلید میں بھی تاکہ ہو ایجاد کا مزا

سَوُدائے سنگین

فرامرز مرزبان جمشیدجی سے، بمبی کے قُتّلابہ اسٹیشن پر اتفاقاً ملاقات ہوئی اور اس ملاقات نے مجھے بہت حیرت میں ڈالا سال بھر سے میں نے اُسے نہیں دیکھا تھا - اس عرصہ میں، اسمیں کسقدر تغیّر ہوگیا تھا! اُس وقت، اُس کے ہلکے چہرے کے اوداس رنگ پر مسرتِ شباب کا غازۂ گلگوں پھرا ہوا تھا؛ آج ایک انجاد عنبرون ایک سانوئے لے پن کے ساتھ ساتھ چہرہ پیلا پڑگیا تھا. اُسکی ہلکی سُرخی مائل مونچھوں میں - جنہیں اُس وقت وہ کاسمیٹک لگا لگا کے فوجی ڈھنگ پر سیدہی اور نوکدار بنایا کرتا تھا، اور جنسے اُس کے چہرے کی زنانہ ملاحت پر ایک مردانہ وقار پیدا ہوجاتا تھا- آج ایک پریشانی تھی، اور اضطراب کی تکلیف دہ کیفیت کیساتھ کھلے ہوئے ہونٹوں پر ایک تھکن برس رہی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نوجوان پر بھی جو ہمیشہ بنے سنورے رہنے کے لئے مشہور تھا زندگی کی کسالت غم چھاگئی تھی - میں سمجھتا تھا کہ مجھے دیکھ کے خوش ہوگا. برخلاف اس کے میں نے دیکھا کہ اس اتفاقیہ ملاقات سے جسمیں اُسے مجھسے بات کرنی پڑیگی وہ بیزار معلوم ہوتا تھا. ذرا سا ہٹ کے، میرے بیٹھنے کے لئے اس نے بنچ پر جگہ دی، اس لئے کہ قواعد اخلاق کی مخالفت صریح نہو، اُسکے پتلے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پیدا ہوئی مگر پیدا ہوتے ہی مرگئی.

یہ پُراجتناب طرز قبول ایسی نہ تھی کہ مجھے اس بات کی ہمت دلاتی کہ میں

اپنی پرانی عادت کے موافق "تم" سے اُسے خطاب کرتا، اسلئے میں نے کہا:
"مدتیں ہوئیں "آپ" سے تو ملاقات ہی نہیں ہوتی۔"

"ہاں" کہا اور یہ کہکے اپنی بائیں کہنی کو بنچ کے ہتّے پر ٹیک کے بیٹھ گیا، نگاہ فرشکے پتھروں پر گاڑدی، اور سگرٹ کی راکھ گرانے کے لئے سگرٹ پر اپنی انگلی آہستہ آہستہ مارنے لگا۔

نگاہ تو اس کام پر، مگر خیال کہیں اور، اس حالت میں اُسنے اپنا فقرہ جاری رکھا:

"ہاں، پچھلے سال اُس واقعہ کے بعد، میں والدہ کے ساتھ بمبئی آیا تھا، اُس وقت سے ابتک بندورہ میں ہیں، کبھی یہاں آتے ہی نہیں آج کا آنا مستثنیٰ سمجھنا..."

کس واقعہ کا مجھ سے ذکر کر رہا تھا؟

ٹوٹے ٹوٹے فقرے کہتا تھا، آنکھیں سگرٹ سے نہ ہٹاتا تھا۔ پھر گویا اس بات سے متعجب ہوکر کہ ایک ہی دفعہ اس قدر باتیں کر گیا، وہ یکایک اپنے فقرے کو تمام کئے بغیر رُک گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ نوجوان جسکی تمام گذشتہ زندگی مجھے معلوم تھی، یاس کی ہوائے گراں سے بیتاب ہے۔

یہ نوجوان جو ہمیشہ متبسّم و ظریف رہتا تھا یہانتک کہ اپنے آلام عاشقانہ میں بھی کوئی ایسی حکایت ضرور کہتا جو تمہیں خوش کرتی، اپنی سب سے زیادہ یاس انگیز حسیات و کیفیات کی رقیق اور پُرتاثیر زبان سے تصویر کھینچتے ہوئے، یہ دیکھکر کہ اُس کی سرگذشت تمہارے دل میں رقت پیدا کرنے کو ہے، ایک نہایت ہی چھوٹا سا لطیفہ اپنی سرگذشت میں غیر معلوم طریقہ سے داخل کرکے، تمہارے مونہہ سے ضرور ہی قہقہہ نکال لیتا، غرضکہ یہ ہمیشہ لطیف و شوخ، ہمیشہ متاثر، لیکن ساتھ ہی ہمیشہ ہنسنے ہنسانے کے

بہانے ڈھونڈھنے والا نوجوان، اسوقت کے لکڑے اُکھڑے سنجیدہ خیالات میں مستغرق نوجوان سے اس قدر دُور نظر آتا تھا کہ ......

فرامرز کو میں برسوں سے جانتا تھا۔ یہ اک شاعر تھا حساً و فکراً شاعر اگرچہ لساناً نہو۔ اپنی تمام ہیئت معتوبہ کے ساتھ شاعر تھا کہ زندگی کو نورِ شعر میں دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ اُن بدبختوں میں سے تھا جو زندگی کی مادیات کے تھپیڑوں کے کھانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں حالانکہ اُن کا خستہ و مجروح اور ہائے ستم! شاعرانہ دل مثل ایک مریض بچے کے اُن تھپیڑوں کے کھانے کی طاقت نہیں رکھتا.... مگر اس کی طبیعت میں ایک میلان نشوؔہ تھا کہ سب سے زیادہ مکدر زمانے میں اپنے پُر ملال چہرے پر اک مسکراہٹ ضرور رکھتا تھا۔ اس تبسم سے میں یہ سمجھتا تھا کہ اسے زندگی کی مادیات سے جب پالا پڑتا ہے تو اُن کے یقین نہ کرنے میں ثابت قدم رہنا چاہتا ہے اور اس طرح اپنے تئیں دھوکا دیتا ہے۔ خود کہا بھی یہی کرتا تھا: "زندگی میں سے موسیقی اور شعر، پھول اور روشنی، اور پھر ان سب کا مجموعہ، ان سب کا ماحصل عورت کو نکال ڈالو، پھر دیکھیں کیونکر دنیا میں زندہ رہنے کی قوت اپنے میں پاتے ہو؟"

اگر زندگی انہیں چیزوں سے عبارت ہوتی اور اُن کی حقیقت بھی صرف تخیل سے مترکب ہوتی تو ہم سب کتنے خوش قسمت ہوتے۔ مگر یہ رنگین چیزیں ہوا ہیں اور رنگ، کہ اُڑ جاتی ہیں غائب ہوجاتی ہیں اور یہ عورتیں؟ کتابِ حیات کی اس جلد کو ایک جلد زر اندود کی شکل میں دُور ہی سے دیکھتا تھا۔ اُسے پڑھنے، اس کے بابوں اور صفحوں کو جو آنسوؤں سے لکھے گئے ہیں ابھی دیکھنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ ابھی اُسے یہ حقیقت

معلوم نہیں ہوئی تھی، کہ زندگی میں شعر، ایک نوحۂ ماتم، موسیقی، اک فغانِ یاس، پھول، ایک منجمد قطرۂ گریہ، روشنی، اک امیدِ گریزاں کے علاوہ اور کچھ نہیں اور ابھی اُسنے یہ نہیں معلوم کیا تھا کہ عورت بھی اس سراب کی مانند ہے کہ ڈھونڈھو مگر نہیں ملتا، دکھائی دیتا معلوم ہوتا ہے مگر ہاتھ نہیں آتا۔

پہلے اُس سے ہفتہ میں اک دفعہ تو ضرور ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ملاقات کا زمانہ گذرے ہوئے زمانے کی تلافی کر دینے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ اس ملاقات میں وہ اپنی زندگی کے - اپنی عاشقانہ زندگی کے، وہ کوئی دوسری زندگی سے واقف ہی نہ تھا - تمام صفحوں کو مجھے دکھاتا سات آٹھ مصرعوں میں اس ملاقات اور پچھلی ملاقات کے درمیان کے زمانہ کی تاریخ سنا دیتا۔ کبھی ایک لفظ ہی ایک ہفتہ کی رپورٹ سنانے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ یہانتک کہ بعض مرتبہ بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ مجھے دیکھکر اُس کا خوش خوش مسکرانا یا مُنہہ بنانا مجھے کل حال بتا دیتا تھا۔

یہ راز کہنا اور سُننا، کس طرح اور خاصکر کس لئے شروع ہوا تھا؟

مجھے یاد پڑتا ہے، کہ مجھے اپنا رازدار بنانے کی عادت کی ابتدا اُس نے اس طرح کی تھی:

ایک دن صبح - آج وکٹوریا ٹرمی نس کی ملاقات سے پانچ سال قبل - اپالو بندر پر میں نے اُسے دیکھا۔ اپالو بندر پر صبح کے وقت اُس کا ہونا اُسوقت کی زندگی کے لحاظ سے ذرا عجیب شے تھی۔ مجھے دیکھتے ہی مجھے اُسکی وجہ بتائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دن اُس کی طبیعت میں باتیں کرنے کا بہت جوش تھا، اور چونکہ اسے ایک ایسا آدمی مل گیا تھا جس سے وہ دل بھر کے باتیں کر سکتا تھا، اس لئے وہ خوش معلوم ہوتا تھا۔ مجھسے کہنے لگا:

بھائی کیا اچھا ہوا تم مل گئے، تم سے مشورہ کرونگا۔ مجھے ایک شادی
کے لئے ایک ہدیہ تیار کرنے کی ضرورت ہے (کہتے وقت ہنسنے اور اپنے
تئیں بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا) ہمارے عزیزوں میں
سے ایک لڑکی بیاہی جانے والی ہے۔ اس کے مناسب ایک ہدیہ تیار کرنے
کے لئے میں نے کس قدر اپنی طبعیت پر زور ڈالا، اور انتخاب کرنے تک
کن مشکلوں کا سامنا ہوا۔ پہلے میں نے چاہا کہ کوئی جڑاؤ زیور دوں مثلاً
ایک فیروزہ یا عقیق کی انگوٹھی یا ایک ننھی سی، سونے کی سینے پر لگائی جانے
والی گھڑی، مگر میں نے اس خیال کو چھوڑ دیا۔ کیوں کہ ان چیزوں کے
دینے میں کوئی نزاکت طبع ظاہر نہیں ہوتی۔ ان چیزوں کے دینے کے
یہ معنے ہوتے کہ میں اُس کے مذاق پر تحکّمانہ اثر ڈالنا چاہتا ہوں: "ایسی
انگوٹھی پہنو، ویسی گھڑی لگاؤ"، کے قبیل سے اسپر ایک دباؤ ڈالنا ہوا۔
اس کے علاوہ اس میں ایک خواہش نمائش بھی تو پائی ہوتی، گویا میں (میری
چیز وہ ایک ہی بات ہے) اس کی اُنگلیوں میں، اس کے سینے پر نظر آؤں۔
سچ پوچھو تو اس میں ایک گنوار پن کا پہلو بھی تو نکلتا ہے۔ ہے نا؟ یہ ایسا
ہی ہے جیسا ایک تحفہ دینا جس کی قیمت بھی اُسپر کھُدی ہو۔ یہ ایک ہاتھ سے
دوسرے ہاتھ میں جاتیں، دیکھنے والے آنکتے اس انگوٹھی کی لاگت پچاس
روپیہ کی ہوگی، یہ گھڑی ڈیڑھ سو کی ہوگی"۔

یہ فرامرز جمشید جی، جو اسدن اپولو بندر میں کھڑا، کبھی اس پاؤں پر
زور دے کے، کبھی اُس پاؤں پر، اس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کو نہایت
وضاحت سے بیان کر رہا تھا، اور فلسفۂ ہدایا پر لکچر دے رہا تھا، پانچ سال
بعد اُس بڈھے نوجوان سے کتنا الگ ـــ کس قدر دُور نظر آتا تھا جو سر نیچا کئے،

رنجیدہ شکل میں سگرٹ کی راکھ گرا رہا تھا اور مجھ سے آنکھیں نہ ملانی چاہتا تھا۔

غرضیکہ اُسدن فلسفۂ ہدایا پر لکچر دیتے ہوئے کہہ رہا تھا:

"میں نے پھر ایک اور چیز سوچی، انگریزی اور ہندوستانی مٹھائیوں کا اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی جو مل سکیں، تاج محل ہوٹل کی مٹھائیاں، خونڈانٹ وغیرہ کا ایک خوان بھیجوں۔ مگر ان کی صرف ایک دو دن کی زندگی ہوتی ہے چاہتا تھا کہ

.... فرامرز کی اصلی تمنا میں ان تمام باتوں سے سمجھ رہا تھا۔ اس کا بلا لزوم، مجھے اسقدر سمجھانا، ایک شادی کے تحفہ کے لئے اس قدر تفصیلات بیان کرنا، ان باتوں میں جو وہ بیان کر رہا تھا، وہ مطالب جو وہ بیان نہیں کر رہا صاف جھلک رہے تھے۔

کہنے لگا: "آخر کار انتخاب کر ہی لیا۔ آؤ دکھاؤں" یہ کہتا ہوا، مجھے گھسیٹ کر مارکس اینڈ کمپنی جوہریوں کے ہاں لے گیا۔ وہاں ایک کمرے میں لیجا کر، بیچنے والے سے پوچھنے لگا: سنگاردان تیار ہو گیا؟"

سنگاردان تیار ہو چکا تھا۔ وہ لایا گیا۔ یہ چاندی کا، (جسپر سونے کا پانی پھرا ہوا تھا) ایک جڑاؤ سنگاردان تھا، جو ایسی نزاکت و نفاست سے بنایا گیا تھا، کہ بنانے والے نے اپنی حسنِ طبیعت کو ایک ایک خط میں صرف کیا تھا۔ ڈھکنے پر چاندی کے مجسّم پھول اور پھل۔ مثلاً سیب اور نارنگی کے پھل اور گلاب کے پھول بنے ہوئے تھے، انمیں جابجا موتی ٹکے ہوئے تھے، اندر کے خانے، پوڈر اور عطروں کی شیشیوں، اور قیمتی صابونوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کے اوپر ایک چاندی کی کشتی تھی جسمیں مخمل بچھی ہوئی تھی۔

کہنے لگا "میں نے اس کو بنوایا۔ اس میں عطر ہونگے، عطر میں بسے ہوئے رومال ہونگے سنگار کی چیزیں ہونگی، خوشبوئیں ہونگی، اُبٹنے ہونگے پوڈر ہونگے،

وہ چیزیں ہونگی جو اُسکے مشامِ خیال میں برسوں تک کسی وقت بہارِ زندگی کی خوشبوئیں پہونچا ئینگی ....

غرضیکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے تئیں بھول گیا تھا، اور مجھے اپنا راز دار سمجھکے باتیں کر رہا تھا۔ یہانتک کہ مجھے یہ سمجھانے لگا کہ اس تحفہ کو کیوں انتخاب کیا۔ وہ باتیں جو اس کے قلب میں بھری پڑی تھیں، کسی کو سُنا کر خالی کرنا چاہتا تھا۔ شاید اُس دن میں نہ ہوتا اُسے کوئی دوسرا ملتا، اُسی سے یہ سب باتیں کہتا :

"سمجھتے ہو؟ اس تحفے کے مطلب، اس ہدیہ کے ماخذ، اس کی روح کو پورے طور پر محسوس کرتے ہو؟ اس طرح میں اُسکے کپڑوں تک میں حلول کر جاؤں گا، یہ چیزیں اُس تک ایک بوئے اصل پہونچائیں گی، اس کے خواب نوشین میں بھی میری کوئی چیز ہوگی، میں اس کے نہانے کے پانی تک میں نفوذ کر جاؤنگا، اُبٹنا ملکے، جب اپنی ہتھیلیوں میں چلو بھر بھر کے پانی لے گی، تو اُس کی پتلی انگلیوں کے بیچ میں سے آبشارِ مسرت بن بن کے، اُسے ایک لطیف اور معطر ٹھنڈک کی بہار دونگا۔ اور جب وہ نہاکے تولیہ سے بدن ملیگی تو اُس کے مونہہ، اس کی گردن اُس کے کندھوں سے، گویا میری روح کا ایک نفس خیال ایک غبار صاف و سفید بنکر، ایک معطر بوسہ پران کی طرح اُڑے گا۔ اُس کے بعد اپنے رومال کو وہ لونڈر کے دو قطروں سے ملیگی، اور جب وہ اُسے سونگھیگی تو گویا میں اُس کی تمام اعماق روح میں پہونچ جاؤنگا ....."

یہانتک پہونچ کے اُس نے یکایک معلوم کیا کہ وہ ضرورت سے زیادہ کہہ گیا اور وہاں تک بڑھ گیا کہ اب واپس ہونا ممکن نہیں، یہ دیکھکے اُس نے

میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے، اور اپنے تمام اضطراب قلب کو ایک چھوٹی سی آہ میں قید کر کے کہنے لگا: "آہ! اس قصہ کو میں تمہیں کسی اور دن سناؤنگا"

غرضیکہ فرامرز نے مجھسے اپنے فسانۂ دل کا کہنا اس طرح شروع کیا تھا؛ اوّل اوّل ہماری ملاقات محض ادبیات کے جلسے ہوا کرتے تھے، وہ بھی فارسی ادبیات کا عاشق، الفنسٹن کالج سے فارسی میں آنرز کا گریجوایٹ میں فارسی ادبیات کا دلدادہ، وہ قاآنی کے قصیدے اور پروفیسر مرزا حیرت اور حافظ کی غزلیں سناتا، سناتا، فسانۂ دل سنانے لگا۔ اُس دن کے بعد ہر ملاقات میں اس فسانۂ دل کے باب پڑھنے لگے، یہانتک کہ میں اُس کی تمام سرگذشت حیات سے واقف ہوگیا۔ گویا اُس کی عاشقانہ زندگی ایسی زندگی تھی کہ میں بھی اُسمیں شریک تھا، اور ہم دونوں مل کے اُس زندگی کو بسر کر رہے تھے۔ اسوقت میں نے یہ قطعی رائے اپنے دل میں قرار دے رکھی تھی کہ وہ فرامرز کا یہ عشق، اوّل اور آخری عشق ہوگا لیکن وہ اسے قبول نہ کرنا چاہتا تھا، اگر اُس کے ادعا پر اعتبار کیا جاتا تو یہ عشق محض ایک بچپن تھا، ایک لڑکپن کا کھیل کہ معلوم نہیں کب سے شروع ہوا، مگر شروع ہو کے جاری رہا۔ اس کے متعلق جو ایسے باتیں یا دتھیں ہنس ہنس کے (گویا انہیں اہمیت نہ دینی چاہتا) بیان کرتا اور بیان کرتے وقت اس لڑکپن پر تعجب کرتا نظر آتا تھا، لیکن نہ معلوم کیوں، ایک تاثیر عمیق، اس ہنسی، اس خندۂ استہزا کے پردے کو چیر کے، نوجوان آدمی کے دل میں ایک غیر قابل شفا زخم کو ظاہر کرتی تھی جو اس عشق سے پڑ گیا تھا۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ عشق کیا تھا، مذاق تھا، وہ کہتا: "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس تمام دورۂ عشق میں

بیاہ کرنا، یا سادہ عشق و محبت کی حد سے آگے بڑھنا، یا بڑھنے کی جرأت کرنا، ہم دونوں کے خیال میں بھی نہیں آتا تھا۔ ہم بس سادہ ایک دوسرے کو چاہنا، یا یہ خیال کرنا چاہتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے عاشق ہیں گویا ہم دونوں نے ایک وقت مقررہ کے لئے حسن و عشق کا ایک مضحک ناٹک کھیلنے کا ارادہ کیا تھا، اور ہم دونوں ایکٹر تھے۔ پردہ گرتا، تماشہ ختم ہوتا، اور ہم دونوں ایک دوسرے سے نہایت خوشی سے ہاتھ ملاتے، اور ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرتے کہ خوب پارٹ کیا، اور اس تماشے کو جسے ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا، وہیں چھوڑ کے، ہر اک اس راستے پر پڑ لیتا جو ہمارا طابع معیشت ہمارے لئے ہیں بتاتا۔ ہم دونوں اسے جانتے تھے، اور اس کے متعلق گفتگو کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ وہ اکثر اپنی شادی کے متعلق اپنے تصورات مجھسے بیان کیا کرتا، جن گھرانوں سے اس کے لئے پیغام آتے ان کے متعلق مجھ سے رائے پوچھتا، یہانتک کہ ایک دن ماں بیٹی کا ایک جوڑا اس کے گھر آنے والا تھا، اور یہ معلوم تھا کہ دونوں ماں بیٹی، اسے انتخاب کرنے کی نیت سے آرہی ہیں، اسدن، میں نے ہی اسے بتایا کہ کیا کپڑے پہنا چاہئیں اور کیا سنگار کرنا چاہیئے۔ ازدواج، حقیقتِ زندگی سے اس قدر متعلق ایک چیز تھی کہ اس کا سوچنا بھی ممکن نہ تھا، ہیں تو اس مناسبت (یا اگر آپ اسے اس لفظ سے یاد کرنا چاہیں تو) اس عشق کے جہتِ شعری کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی کو ایک خواب ابدی محبت میں رکھ کے، اپنی زندگی بھی اسی مدہوشی میں گذارنا چاہتا تھا۔ بس اس قدر اور کچھ نہیں ...، پھر گویا ان تمام محبتوں کی تائید کے لیئے اس کے لبوں پر ایک ایسا تبسم،

اور اس کی آنکھوں میں ایک ایسی نگاہ رچا ہوئی تھی جو مجھسے بھی ایک صدقۂ تصدیق مانگتی نظر آتی تھی کہ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کٹھ حجتوں سے خود اُسکا دل بھی مطمئن نہیں ہوا۔ اگر میں ایک لفظ بھی ایسا کہہ دیتا جس سے شبہ ہوتا کہ میں ان حجتوں پر یقین نہیں کرتا، یا ذرا سا بھی خیال ایسا ظاہر کرتا کہ میں اُس کی غفلت حسیات سے جنہیں وہ کوشش کرکے بڑھانا چاہتا تھا، ہٹانا چاہتا ہوں، تو میں یقین رکھتا ہوں کہ وہ ایک دم سارا اعتراف کرلیتا، رو پڑتا اور کہتا کہ میں اُس کے عشق میں مر رہا ہوں۔ لیکن اگر میں ایسا کرتا تو حقیقت میں گویا میں اُس کی موت لاتا۔ وہ اپنے دل کو دھوکا دینا چاہتا تھا، اور مجھے بھی لازم تھا کہ میں اس معاملہ میں اس کی تائید کروں، ورنہ اُس کے دل پر حقیقت ظاہر کرنے کی چوٹ لگاتا یعنی یہ کہنا کہ دراصل تم اُسے از جان و دل چاہتے ہو، گناہ تھا۔ مجھے یہی لازم تھا کہ میں اُس کی اس کوشش میں کہ وہ اپنے زخم دل کو ڈھانپنا، اور اُس سے نگاہ ہٹانا چاہتا تھا، اس کی مدد کروں اور اس طرح اُس کی سلامتی کی خدمت کروں۔

لیکن کبھی کبھی وہ مجھسے کھل جاتا، اور ایک دوسرے لہجہ میں کہتا:
"کہیں تمہیں خبر ہو کہ ان تمام حرکتوں سے جو لڑکپن سے زیادہ کچھ نہیں کبھی کبھی مجھ میں اک عجیب تاثیر حسرت پیدا ہوتی ہے۔ ہاں میں اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ کبھی کبھی ایک ایسی حسرت پیدا ہوتی ہے کہ میں رونے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ مگر ایسا کیوں ہے؟ جبکہ یہ لڑکپن، ہنسی کھیل سے آگے کے درجہ کی کوئی چیز نہیں، جب کہ اگر اس پر غور کیا جائے، تو اس کی قیمت ایک قہقہہ سے زیادہ نہیں، جب یہ حالت ہے تو یہ حسرت کیوں؟....

سوچا تو خود ہی اس کی حقیقت مجھ پر ظاہر ہوئی: ہمارا یہ کھیل ہمیشہ رہنا چاہیئے تھا، اُسے تا ابد ایک لڑکی رہنا چاہیئے تھا، اور مجھے تا ابد نوجوان لڑکا رہنا چاہیئے تھا۔ یہ حالت، بڑھنے والی کبھی نہ گھٹنے والے برسوں کی لا متناہی مدت کے ساتھ قایم رہنا، جاری رہنا چاہیئے تھی۔ یہ خواب بغیر اس کے کہ حقیقت کا ضربہ اسپر لگے، یہ افق گریزاں بغیر اس کے کہ حد پر پہونچے، یوں ہی دراز ہوتے رہنا چاہیئے تھا۔ مگر یہ ممکن نہ تھا۔ ضرور ایک نہ ایک وقت آتا کہ ضربۂ حقیقت اس شگوفۂ خیال پر پڑکر اسے بکھیر دیتا۔ آخر وہ وقت آیا۔ اس کے مقابلہ کے لئے ہم کیا کر سکتے تھے؟ بیاہ؟ اس کا نتیجہ عینی یہی نہ تھا؟ کیونکہ بیاہ کے بعد یہ خواب بالکل ملیامیٹ نہ ہوجاتا؟ مگر نہیں ملیامیٹ نہیں ہوا۔ ہمیں اس زندگی کے شعر کو یاد رکھنا مقصود تھا، سو وہ شعر اب بھی شعر ہے، تازہ ہے، اسکی یاد زندہ رہیگی اور زندہ ہے۔ اب ہم ایک دوسرے کا خیال کر کے، مگر زیادہ لاہوتی، زیادہ روحانی مناسبت کے ساتھ (یہانتک کہ اب اس کے متعلق باتیں بھی نہیں ہوتیں) زندگی بسر کر رہے ہیں۔ گویا دور سے، یاد ایام کے ساتھ ایک خاموش عاشقی معشوقی لیکن .... " لیکن کے بعد فقرے کو پورا نہیں کرتا، پھر اس تقریر کو جسے میں کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا ایک لمبے اور ٹھنڈے سانس سے جس میں بڑی کوشش سے وہ ایک قہقہہ بھی شامل کر سکا، ختم کر کے کہنے لگا: "کیا معلوم تم میری ان بے تکی باتوں پر دل میں کس قدر ہنستے ہوگے، اور میری حقارت کرتے ہوگے؛ اور اجی سچ پوچھو تو ساری اصل و حقیقت، سارا لطف شعر یہاں ہے،،" یہ کہکے اپنے چہرے پر شوخی اور شرارت کا رنگ لا کے، مثلاً سامنے

چوپاٹی پر سمندر کے کنارے بینچ پر کوئی حسین پارسن بیٹھی ہوتی ہ اُسکی ریشمی ساڑھی کو سمندر کی ہوا ہٹا کے، اُس کی گوری گردن، اور ہلکے کپڑے میں چھپے ہوئے سینے کی جھلک دکھاتی کن انکھیوں سے اس کی طرف اشارہ کرتا۔

میں اپنے دل میں کہتا: "بدقسمت بیمار، غیر قابل شفا بیماری میں بیمار"، لیکن کچھ دنوں بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اُسے اپنی بیماری کا علاج مل گیا تھا۔ اب ایک نشوۂ بے قید کے ساتھ، اُن لوگوں کی طرح جو زندگی میں مزہ ہی مزا کرنا چاہتے ہیں، اُس نے اپنے تئیں اندھا دھند عیش میں ڈال دیا۔ ایک جاڑے کا موسم متواتر گرانٹ روڈ کے تھیئٹروں ہی میں گذارا۔ مجھسے کہتا: "دن سو سو کے گذارنا بھی کیا مزے کی چیز ہے۔ انسان چونکہ سورج کو نہیں دیکھتا، اس لئے اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسری دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ رات کی زندگی گویا کرۂ ماہتاب میں جاکر زندگی بسر کرنیسی معلوم ہوتی ہے۔ چاہو تجربہ کرکے دیکھ لو۔" باقی دارد

(سجاد حیدر)

بیقراری ہے کس قرار کے ساتھ جبر دل پر ہے اختیار کے ساتھ

اب کہاں وہ نمود گلشن کی پھول رخصت ہوئے بہار کیساتھ

وہ یہاں آئیں یہ نصیب کہاں ملگئی یاس انتظار کے ساتھ

ہائے بیچینیاں میرے دل کی درد بھی تو نہیں قرار کیساتھ

دل سے ہے نوک جھونک مژگان کی کیسا کانٹا پڑا ہے خار کے ساتھ

نرگس نیم مست نے مارا بھر گیا جام اک خمار کے ساتھ

زندگی زندگی نہیں آزاد لاکھوں دکھڑے ہیں جان زار کیساتھ

(بندہ حسن آزاد دہلوی)

ہماری قوّت بیانیہ کا زوال

اس میں تو شاید ہی کسی کو کلام ہو گا کہ ہماری قوّت بیان میں اب وہ رنگینی اور رنگ آمیزی نہیں رہی جو پہلے تھی یا جو فارسی زبان کی خصوصیت ہو گئی ہے۔ کسی فارسی کتاب کو اُٹھا کر دیکھ لیجیئے زورِ بیان کا جلوہ اوّل سے آخر تک نظر آئیگا۔ جہاں جنگ کا تذکرہ آیا ہے وہاں صفحوں کے صفحے مردانہ اشعار سے مزیّن ہیں۔ اگر حسن و عشق کا ذکر چھڑ گیا تو اسی پر زورِ انشا صرف کیا گیا ہے۔ اور صفت و ثنا تو گویا انپر ختم تھی۔ ایک باغیچہ کی تعریف میں وہ کتاب کی کتاب دلچسپی سے لبریز اور نادر جذبات سے معمور لکھ سکتے تھے۔ آج وہ زور بیان کہیں نہیں نظر آتا۔ خیر فارسی تو رہی نہیں مگر فارسی کی جانشین اُردو میں بھی وہ بات نہیں ملتی۔ ابتدا میں بیشک اس نے بھی وہی رنگ اختیار کیا تھا۔ مگر چونکہ ابتدائی مشق تھی اس لئے بہت اچھی نہیں تھی۔ اگر مشق جاری رہتی تو شاید وہی خوبیاں پختہ ہو جاتیں۔ مگر مشق جاری کیونکر رہتی۔ زمانہ نے رنگ بدلا۔ اور زمانہ کے ساتھ ساتھ زبان نے بھی اپنا رنگ بدل ڈالا۔ اب ہم سلاست اور اختصار کے دلدادہ ہیں۔ ہماری کتابیں خواہ وہ مبتدیوں کے لئے لکھی جائیں۔ خواہ منتہیوں کے لئے سلیس ہونی چاہئیں۔ اور اس میں رنگ آمیزی کی ضرورت نہیں۔ اوّل تو رنگ آمیزی کے مسالے ہی نہیں باقی رہے۔ اور اگر مانگے تانگے کے خیالات سے تھوڑی بہت رنگینی پیدا بھی کیجاسکتی تھی

وہ اِن قیود کی وجہ سے رُک گئی - آج ناول اور تاریخ اور تذکرے اکثر شایع ہوتے رہتے ہیں مگر اُن کے واقعات کی تحقیق - اور سلاست زبان کی جاہے جتنی تعریف کیجیے انشا پردازی کے لحاظ سے وہ سب کی سب قریباً صفر کے برابر ہیں چنانچہ ہماری زبان کا روزمرہ تو صاف ہوتا جاتا ہے اور اُس کے علمی پہلو کی بھی تھوڑی بہت ترقی ہو رہی ہے مگر ادبی پہلو روز بروز زوال پذیر ہے +

اس قوت بیان کے زوال کا سب سے بڑا اور مہلک سبب ہمارا افلاس ہے - پُرانے زمانہ کے مصنفین شاہی درباروں اور امیرانہ شان وشکوہ کے جلوے دیکھتے تھے - بلکہ اکثر اوقات بادشاہوں اور امیروں کے دربار میں بالانشینی کا رتبہ رکھتے تھے - شیشہ وآلات نادرہ ہیرے وجواہرات ظروف بیش بہا - جلوس شاہانہ - فوجوں کا طمطراق اور تزک و احتشام - اور خدا جانے کتنی ہی اور باتیں جو اُن کی نظروں کے سامنے روزمرہ گذرا کرتی تھیں اُن کا آج ہم خواب بھی نہیں دیکھ سکتے - آج کے مصنفین میں ایسے بہت کم ہونگے جنھوں نے ہیرے جواہرات کی صورت دیکھی ہو - خدا جانے مغرق عماریاں کیسی ہوتی تھیں - ظروف بیش بہا کا ہیکو کسی نے دیکھے ہونگے - اور فوجی شوکت اور دلیرانہ جانبازیاں تو گویا ہمارے لئے افسانے ہو گئے - یہی سب قوت بیانیہ کو اُٹھانے والے اسباب تھے - جب مصنف کو نت نئے جلوے نظر آتے تھے تو زبان میں خود بخود روانی پیدا ہوتی تھی - اور خیالات نکل آتے تھے - اب تو یہ حال ہے کہ ہم تاریخوں یا قصہ کہانیوں میں بادشاہوں کا ذکر ہی نہیں کرتے - یا اگر ذکر کیا تو بس اتنا کہ وہ ایسا

مالدار تھا اور اتنی فوج رکھتا تھا۔ بس اس سے آگے قدم رکھنے کی ہم کو ہمت ہی نہیں ہوتی۔ شاید کسی اُردو ناول میں آجتک کسی مصنف نے شاہی دربار کا نقشہ نہیں کھینچا۔ اور نہ کسی بادشاہ یا ملکہ کو ہیروئن بنایا۔ جب ہم یہ جانتے ہی نہیں کہ بادشاہوں کے لئے عیش و عشرت اور کرّ و فر کے کیا کیا لوازمات ہیں تب تک ہم اسے ہیرو کیونکر بنا سکتے ہیں۔ یا اگر کسی نے ایسا کیا تو اُس کے بادشاہ ہیرو اور سوداگر ہیرو میں کوئی نمایاں فرق نہ نظر آئیگا۔ اسی سے ہمارے ناولوں کی ہیروئنس اور ہیرو سیدھے سادے معمولی اوقات کے لوگ ہوتے ہیں۔ تاکہ اُنکی زندگی کا مرقعہ کھینچنے میں ہمیں ٹھوکریں نہ کھانی پڑیں۔ اردو ہی میں پہلے فن موسیقی۔ فن شکار و بازیگری۔ فن شہسواری وغیرہ کی صدہا اصطلاحیں ہر خاص و عام کی زبانوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ اب ان فنون کے زوال کے ساتھ ساتھ وہ اصطلاحیں بھی فراموش ہوتی جاتی ہیں۔ کچھ دنوں میں ہم بجز کتابی زبان کے اور کسی زبان سے اُنہیں نہ سن سکیں گے۔ قومی افلاس کا اثر جسقدر زبان پر پڑتا ہے اتنا شاید اور کسی چیز پر نہیں پڑ سکتا +

(۲) دوسرا سبب اس زوال کا جسے ہم شاید افلاس ہی سے منسوب کر سکیں ہماری بدشوقی ہے۔ ہم میں اب بھی بفضل خدا ایسے بہت سے لوگ ہیں جو فراغت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور جنہیں سیر و تفریح کے بہت سے موقعے حاصل ہیں۔ مگر ہم کچھ ایسے آرام طلب اور اپاہج ہو گئے ہیں۔ ہم میں زندہ دلی اس قدر مفقود ہو گئی ہے۔ اور ہمارے دلوں پر کچھ ایسی اوس پڑ گئی ہے کہ کسی کام سے جسمیں غور و خوض اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے ہم جی چُراتے رہتے ہیں۔ بہت سے لوگ ہیں

جنہوں نے تاج محل اور فتحپور سیکری کی عمارتیں دیکھی ہونگی۔لیکن اگر اُن
سے ان عمارتوں کے ایک ایک جزو کا نام پوچھا جائے تو وہ شاید مشکل سے
بتلا سکیں۔فن معماری کے متعلق بیشمار اصطلاحیں تھیں۔اب ایک بھی
نہیں سُننے میں آتی۔ہندوستان میں انواع واقسام کے خوشرنگ طیور
نظر آتے ہیں۔افلاس نے ہماری آنکھیں تو نہیں بند کر دیں۔مگر ہم میں
سے کتنے ایسے لوگ ہیں جو ایک درجن سے زاید قسموں کے نام بتلا سکیں۔
شاید ہم میں چھیتر بلکہ نوّے فیصدی لوگ ایسے ہونگے جو قمری کو نہیں پہچان
سکتے بس طوطا مینا۔کوّا چیل یہی دس پانچ نام ہم کو یاد ہیں زیادہ نہیں باغیچے
اب بھی اکثر بڑے شہروں میں موجود ہیں۔انمیں رنگین مزاج لوگ تفنن
طبع کیلئے جاتے ہیں۔مگر ہم میں سے کتنے آدمی ایسے ہیں جو ایک درجن سے زاید
پھولوں کا نام بتا سکیں۔اُنکے خواص وغیرہ کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ہمارے
ہی ملک کے پھولونکے پودوں پر آج باغیچوں میں انگریزی نام کے ٹکٹ چسپاں
کئے جاتے ہیں۔اور ہمیں اُن کے انگریزی نام تو معلوم ہیں۔مگر اُردو یا
ہندی نہیں۔جب ہماری طبعیتیں ایسی مردہ و افسردہ ہوگئی ہیں تو بیان
کو کیسے فروغ ہو۔اور وہ رنگ آمیزی کرنے کے لئے کہاں سے مسالے
لائے۔جب آپ صحیفۂ فطرت کا مطالعہ ہی کرینگے۔جب آپ قدرت کی خوبیاں
ہی نہ دیکھیں گے۔جب آپ آنکھیں بند کئے روٹی کے دھندوں میں لگے
رہینگے تو آپ کہاں سے تشبیہات واستعارے لائیں گے۔کیونکر قلم
کی جودت دکھائیں گے۔اور کیونکر انشا پردازی اور زور بیان کے
کمال تک پہونچ سکیں گے۔اب تو ہم سے پُرانے لقمے بھی نہیں چبائے
جاتے۔نہ ہم اُنہیں ہضم ہی کر سکتے ہیں۔اور نہ اُن میں ہم کو مزہ ہی آتا ہے

افلاس اور مُردہ دلی دو بلائیں تو تھیں ہی۔ اُسپر مزید یہ کہ سستی شہرت پیدا کرنے کی ہوس ہر شخص کو دامنگیر ہے۔ جس نے دو چار کتابیں اُردو کی پڑھ لیں وہ لکھاڑا اور نثار بن بیٹھا۔ پہلا مضمون قلم سے نکلا۔ اور اس کے چھپ جانے کی کوشش ہونے لگی۔ بھلا کچھ نہیں تو ہزار دو ہزار صفحے تو رنگ لئے جائیں قبل اس کے کہ کسی مضمون یا تصنیف کو شایع کرانے کا خیال پیدا ہو۔ چونکہ ہمارے مضامین کسی باقاعدہ مطالعہ یا ریاضت کا نتیجہ نہیں ہوتے اس لئے ہم کسی ایک شق ادب پر قایم بھی نہیں رہ سکتے۔ جو کچھ خیال میں آیا ٹیڑھا سیدھا لکھدیا۔ آج کوئی قصہ لکھدیا۔ کل کسی قرب وجوار کے شہر کا تذکرہ۔ پرسوں ایک تاریخی واقعہ کا ترجمہ۔ بعد ازاں کسی اور طرف جھک گئے۔ اس میں شک نہیں ہر رنگ میں چمکنے کی کوشش کرنا بہت قابل تعریف بات ہے اور ایک ہی رنگ میں محدود ہو جانے سے ہمارا قلم من مانے طرارے نہیں بھر سکتا۔ مگر ایسے دماغ جو ہر رنگ میں چمک سکیں۔ ایسی طبیعتیں جو نظم ونثر کے ہر رنگ پر قادر ہوں ایسا ذہن جو ہمہ گیر ہو شاذ کسی کو ملتا ہے۔ اگر ہم ایک صیغہ ادب کو لے لیں اور پڑھنے کے لئے جو چاہیں پڑھیں۔ مگر لکھیں اُسی ایک صیغہ کے متعلق تو ہماری زبان کو بہت فایدہ پہونچے۔ اگر ہمارا رجحان تاریخ نگاری کی جانب ہے تو ہم اسی شق ادب کو اپنا حصہ بنالیں۔ کوئی فلسفہ کی طرف مخاطب ہو۔ اور اسی شق ادب میں چمکنے کی کوشش کرے۔ کچھ لوگ زراعت وفلاحت پر مضامین لکھیں۔ غرض اپنے قلم کو کسی ایک میدان میں دوڑائیں تب ہم اُس ایک صنعت کے کُل الفاظ اور اصطلاحوں پر حاوی ہو جائیں گے۔ اور قوت بیانیہ کے نشوونما میں اس سے بہت زیادہ مدد ملیگی۔ علاوہ بریں جوں جوں پرچے اور رسالے بڑھتے جارہے ہیں ہم میں زود نویسی کی عادت

پڑتی جاتی ہے۔ پُرانے زمانے کے لوگ جو کچھ لکھتے تھے اُسے پہلے دس پانچ
بار خود کاٹ چھانٹ کر اپنے دوستوں کو دکھاتے تھے۔ اب آجکل تیزنگاری
کا دور ہے ایک بار لکھکر اُسے دُہرانا مذموم سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اصل مسودہ کو
دوبارہ صاف کرنے کی محنت بھی نہیں برداشت کی جاسکتی۔ ایسی حالت
میں زور بیان یا کمالات انشا پردازی کا دکھانا غیر ممکن ہی نہیں بعید از
قیاس ہے۔ اور اس تیز نگاری کی شکایت کچھ اسی ملک میں نہیں ہے۔
انگلستان وغیرہ ممالک میں بھی لٹریچر کے ادبی پہلو کے زوال کی شکایت
سُننے میں آتی ہے۔ جو رنگینی اور لطف زبان اور زور بیان الزبتھ کے
عہد کے مصنفین میں موجود ہے وہ گذشتہ یا موجودہ صدی کے مصنفین
میں نہیں ملتی۔ مگر ہاں اس کمی کے ساتھ ساتھ سائنس صنعت وحرفت اور فلسفہ
میں انھوں نے اس مدت میں جو ترقیاں کی ہیں وہ اس کمی کی تلافی کر دیتی ہیں
ہمارے ہاں ان اصناف کا تو کہیں ذکر نہیں۔ جو کچھ بساط ہے وہ ادبی
مضامین اور کتابوں تک محدود۔ اور اُن کا بھی یہ حال ! نظم ہو یا نثر۔
زور بیان اُس کی جان ہے۔ جب یہی نہ ہوا تو وہ نظم یا نثر روکھی پھیکی ہوتی
ہے۔ اس زوال کے لئے ہمارے طرز تمدن کا انقلاب بھی ایک حد تک
جواب دہ ہے۔ اب نہ پُرانے مراسم اداب رہے نہ وہ عیش وعشرت کے
سامان۔ اور نہ اُمرا اور رُوسا میں وہ شوق۔ بجائے چوگان بازی کے اب کرکٹ
اور پولو کا زور شور ہے بجائے رنگین جلسوں کے اب گارڈن پارٹیاں
ہیں معاشرت میں جو ایک دلپذیر تکلف تھا اُس کی جگہ اب تکلیف دہ تصنع
ہے۔ ان باتوں کی تفصیل کے لئے نہ ہماری زبان میں الفاظ ہیں اور نہ
اصطلاحیں۔ اگر ہم کسی رئیس کے کمرہ کی آرائیش کا بیان کرنا چاہیں تو

ہمارے امکان سے باہر ہے۔ اُس کا تبن جو تھائی سامان بالکل انگریزی ہے جسکے لیئے ہماری لغت میں الفاظ ہی نہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ زور بیان دکھانے میں کسیقدر تکلف پیدا ہوجاتا ہے۔ مگر اسے قابل معافی سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ فن ادب کیلیئے تکلف (مگر تصنع نہیں) کی چاشنی ایک ضروری شے ہے + (نواب رائے)

زنانہ حسن ولباس۔ اس نام کی ایک کتاب مسٹر بدن گوپال صاحب ایم۔ اے۔ پلیڈر ساکن لاہور نے شایع کی ہے۔ اردو زبان کا علم ادب ابھی بہت محدود ہے۔ اور اس لحاظ سے جو کتاب کسی نئے مضمون پر تحریر کی جائے اس امر کی مستحق ہے کہ اسکی کافی قدر کیجائے تاکہ مصنف کی حوصلہ افزائی ہو۔ علم حسن پر انگریزی اور دیگر السنہ مغربی میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں۔ لیکن السنہ مشرقی اس شریف علم سے تقریباً بالکل معرا ہیں شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ مغربی اقوام مثل اہل یونان اہل روما۔ اہل اطالیہ وغیرہ نے سنگتراشی ومصوری کی جانب مشرقی اقوام سے زیادہ توجہ کی ہے خصوصاً انسان کی تصویر و بُت بنائیں تو وہ مشرقی اقوام سے گوئے سبقت لیگئی ہیں لسکا لازمی نتیجہ ہے کہ جسم انسانی کی ساخت اور اسکے محاسن و معائب کے مشاہدہ کا شوق پیدا ہو۔ اور علم حسن کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔ بہرحال مسٹر بدن گوپال نے اردو علم ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے اور ہم ہر ایک تعلیم یافتہ شخص کو مشورہ دیتے ہیں کہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرے مصنف کی بعض رائیں کسی قدر انوکھی ہیں۔ اور ہند کی اکثر لوگوں کو ناگوار گذریں گی۔ مگر اس سے کتاب کی دلچسپی میں فرق نہیں آتا۔ یہ کتاب بظاہر مستورات کی فایدہ کیلیئے لکھی گئی ہے۔ مگر ہمیں افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مصنف نے مستورات کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر کے ان اصولوں کو مدنظر نہیں رکھا جن کی تلقین مشرقی تہذیب و مغربی تہذیب دونوں کرتی ہیں صاف الفاظ میں ہمارا یہ مطلب ہے کہ مصنف نے بعض مقامات پر بیجا صداقت گوئی سے کام لیا ہے اور اس امر کو ملحوظ نہیں رکھا کہ صحیح مستورات سے خطاب کرتے ہوئے بہت سی باتوں کا تذکرہ خلاف تہذیب خیال کیا جاتا ہے یہ نقص اس قسم کا ہے جسکی وجہ سے ہمیں امید نہیں کہ یہ کتاب شمالی ہند کے معزز و پابند وضع گھرانوں میں کچھ زیادہ رواج پائے +

اس کتاب کی ظاہری خوبیاں بہت سی ہیں منجملہ انکی ایک یہ ہے کہ مختلف ممالک کے زنانہ حسن ولباس کی عکسی تصاویر چھاپی گئی ہیں۔ کتاب مجلد ہے قیمت قسم اول للعہ قسم دوم ۱۲ مصنف سے مل سکتی ہے +

مالوہ کی سیر

(۵)

برہان پور

بھوپال - اجین - اندور - دھار - اور مانڈو کی سیر سے فارغ ہوکر ہم صوبہ خاندیس کی پرانی دارالسلطنت برہان پور میں پہونچے یہ اب ممالک متوسط کا ایک آباد قصبہ ریلوے اسٹیشن سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے اس شہر نے بہت سے تاریخی انقلاب دیکھے ہیں سنہ ۸۰۲ھ - ۱۴۰۰ء میں نصیر خاں فاروقی نے جو خاندان فاروقیہ خاندیس کا پہلا خودمختار بادشاہ تھا اس کی بنیاد ڈالی تھی - نصیر خان مذکور کا باپ ملک راجہ حضرت مخدوم زین الدین اولیا دولت آبادی کا مرید اور خلیفہ تھا - جب نصیر خاں نے قلعہ آسیر کو فتح کیا تو شیخ زین الدین رح دولت آباد سے مبارکباد کے واسطے خاندیس تشریف لائے نصیر خاں مخدوم کے استقبال کے واسطے آگے بڑھا دریائے تاپتی کے کنارہ اس مقام پر جہاں اب زین آباد آباد ہے ملاقات ہوئی - نصیر خاں نے شیخ سے آسیر تشریف لے چلنے کے واسطے التماس کی - آپ نے فرمایا مجھے دریا سے عبور کرنے کا حکم نہیں ہے - نصیر خاں شیخ سے اجازت لیکر پلٹ آیا اور دریا کے دوسرے کنارہ پر جہاں اب برہان پور آباد ہے خیمہ اور خرگاہ لگا کر فروکش ہوا ہر روز پانچ مرتبہ شیخ کی ملازمت میں حاضر ہوکر فیض صحبت سے فیضیاب ہوتا تھا جب دو ہفتہ بعد شیخ نے دولت آباد کی واپسی کا قصد کیا نصیر خاں نے عرض کیا کہ اگر آپ فلاں قصبہ اور پرگنہ کو پسند فرمائیں تو نہایت سرفرازی ہوگی - شیخ نے باوجود بے حد اصرار کے

یہ امر قبول نہ فرمایا اور کہا کہ درویشوں کو قصبہ۔ پرگنہ۔ وظیفہ۔ سے کیا نسبت ہے۔ جب نصیر خاں نے بہت اصرار کیا تو شیخ نے فرمایا کہ دریا کے اُس پار کہ سلاطین اور غازیان اسلام کے نزول کا مقام ہے ایک شہر آباد کرکے میرے پیر شیخ برہان الدین غریبؒ کے نام پر موسوم کر اور اُسے اپنا دارالسلطنت مقرر کر اور دریا کے اس پار جہاں فقیر وارد ہے ایک قصبہ اور مسجد تعمیر کرکے اُس کا زین آباد نام رکھ اس تقریب سے اسلام ان دونوں قطعات میں رواج پائے اور اس درویش کا نام بھی باقی رہے۔ نصیر خان فاروقی شیخ کے اس ارشاد سے بہت خوش ہوا اور اسی وقت دونوں مقام کی آبادی کا حکم دیا شیخ نے فاتحہ مبارکباد پڑھکر دولت آباد کی طرف واپسی فرمائی۔ عرصہ قلیل میں شہر اور قصبہ نہایت معموری اور آبادی کے ساتھ اختتام کو پہونچا اور برہان پور دو سو برس سے زائد یعنی ۱۰۰۸ھ تک سلاطین فاروقیہ کا دارالسلطنت رہا۔ اس کے بعد اکبر کے قبضہ میں آیا اور سلاطین مغلیہ کے عہد میں شاہجہاں کے زمانہ تک کل صوبہ خاندیس اور دکن کا صدر مقام اور بہت بڑا فوجی ہیڈ کوارٹر رہا۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے زمانہ میں نواب آصف جاہ اول (میر قمر الدین) کا قبضہ ہوا اور انہوں نے ۱۱۴۱ھ میں حصار شہر پناہ جو اب تک موجود ہے تعمیر کرائی۔ ۱۱۷۴ھ میں مرہٹوں کے قبضہ میں آیا۔ اب ۱۸۰۳ء سے سرکار کے قبضہ میں ہے۔ اس وقت یہ ضلع نماڑ کے متعلق ایک تحصیل کا صدر مقام ہے آبادی قریب تیس ہزار کے ہے ۱۶۱۴ء میں سر طامس رو کی جو انگلستان سے دربار مغلیہ میں سفیر بنکر آئے تھے اسی شہر میں شاہزادہ پرویز جہانگیر سے ملاقات ہوئی تھی

ٹیورنیر فرانسیسی سیاح نے ۱۶۴۱ء میں اسے دیکھا تھا۔ یہاں کے آثار قدیمہ میں سب سے مشہور کارخانۂ آبرسانی ہے جس کے ذریعہ سے تمام شہر میں کثرت سے مصفا پانی پہونچایا جاتا تھا گردنواح میں میں آٹھ رجاہوں اور آبادی کے اندر بہت سے پختہ نلوں کے جنکی ساخت میں اعلےٰ صنعت پائی جاتی ہے نشان اب تک موجود ہیں +
آبادی سے ملے ہوئے قلعہ کے کھنڈر ہیں کہیں کہیں برُج کا نشان اور چاردیواری باقی رہ گئی ہے قلعہ کے شمالی جانب دریا کے کنارہ پر محلات شاہی تھے جن کے کچھ کھنڈرات بھی موجود ہیں اور گذشتہ نقاشی اور رنگ آمیزی بھی کسیقدر باقی ہے دو تین پختہ حوض بھی نظر آتے ہیں۔ جنوب و مشرقی گوشہ میں ترکی وضع کا ایک زنانہ حمام سنگ مرمر کا کسیقدر اچھی حالت میں ہے جس میں اب ڈاک بنگلہ ہے اس کی چھتیں گنبددار مثمن ہیں درمیانی حوض اب بند کردئے گئے ہیں مگر جھرنے اور نالیاں وغیرہ موجود ہیں اس حمام کی کرسی دریا سے ۸۰ فیٹ بلند ہے جہاں سے دریائے تاپتی کا جو نیچے بہتی ہے بڑا دلکش نظارہ ہے۔ قلعہ کے اندر جو مسجد تھی اُس کے صرف مینار باقی رہ گئے ہیں
یہاں کی تمام مسجدیں علی العموم منارہ دار ہیں اور سب میں حوض موجود ہیں اور چونکہ مسجد اور مندر پانی کے ٹیکس سے بری ہیں اس وجہ سے ویران سے ویران مسجدمیں بھی نل لگے ہیں اور پانی موجود رہتا ہے بی بی کی مسجد۔ تانہ گوجری کی مسجد اور جامع مسجد کے مینار نہایت شاندار اور کوسوں سے نظر آتے ہیں۔ جامع مسجد کی عمارت نہایت خوبصورت اور شاندار ہے یہ سنگ سیاہ کی مسجد ہے جس کا رقبہ ۸۴ فیٹ ×

۵۱ ۳/۴ فیٹ ہے۔ اس میں پندرہ در اور چھیانوے ستون ہیں جو اس ترتیب سے نصب ہیں کہ مسجد پانچ درجوں میں منقسم ہوگئی ہے یہ ستون چوکور ہیں جن کا ہر ضلع ا فیٹ ۷ انچہ ہے۔ محرابوں پر اچھا کام ہے چھت لداؤ کی ہے۔ ستونوں کے درمیان ایک خاص اور جدید صنعت سے بنائی گئی ہے جس سے مسجد کی خوبصورتی دوبالا ہوگئی ہے۔ بیرونی محرابوں پر کنگورہ اور چار منزلہ عالیشان میناروں پر سنہرے کلس جگمگاتے ہیں صحن میں پختہ دو فرش ہیں پہلا فرش ۵۷ ۱/۲ فیٹ اور دوسرا ۳۹ ۱/۴ فیٹ چوڑا ہے اس کے آگے دو حوض ہیں پھر دوسرا صحن اور اردگرد حجرے بنے ہیں صدر دروازہ مشرقی جانب اور ایک ایک چھوٹا دروازہ شمال وجنوب میں ہے۔ مسجد کے اندر درمیانی محراب پر محمد مصطفےٰ خطاط کے ہاتھ کا لکھا ہوا عربی میں خوش خط خط نسخ میں کتبہ کندہ ہے جس سے واضح ہے کہ اس مسجد کو سلطان عادل شاہ ابن مبارک شاہ فاروقی نے ۹۹۷ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ اسی مضمون کا ایک کتبہ عربی اور ہندی زبان میں شمالی محراب پر بھی کندہ ہے۔ جنوبی مینار کے نیچے میر معصوم نامی کے ہاتھ کا کندہ کیا ہوا کتبہ ہے جس کے حروف مٹ گئے ہیں اور صاف پڑھنے میں نہیں آتے اس میں شہنشاہ اکبر کے خاندیس میں تشریف لانے اور قلعہ آسیر کو فتح کرنے اور رمضان ۱۰۰۹ھ میں واپس جانے کا ذکر ہے +

برہان پور میں بزرگان دین اور اولیاء اللہ کے بہت سے مزارات اور درگاہیں ہیں جن پر عرس اور میلے ہوتے ہیں میں شاہ منصور رح شاہ بہاء الدین رح ۔ شیخ عیسیٰ رح ۔ شاہ برہان الدین رازی اللہ ۔ شاہ جمال

قادری رح - شاہ ہیم رح - شیخ نظام الدین چشتی بہکاری رح کی درگاہوں پر حاضر ہوا - سب درگاہوں میں گنبد اور اکثروں میں بڑی بڑی مسجدیں اور خانقاہیں بنی ہوئی ہیں سب سے بڑا عرس شیخ نظام الدین چشتی رح کا ہوتا ہے جس میں باہر سے بھی آٹھ دس ہزار آدمی آتے ہیں آپ کی درگاہ شہر کے باہر اتوارہ دروازہ سے میل بھر کے فاصلہ پر ایک پہاڑی نالہ تولی کے کنارہ پر واقع ہے یہ نہایت بلند اور پُر فضا مقام ہے - حضرت شیخ کا وصال ۹۸۵ھ میں ہوا تھا اہل برہان پور کو سب سے زیادہ اس درگاہ سے عقیدت ہے +

اتوارہ کے دروازہ کے باہر سب سے زیادہ آثار قدیمہ ہیں بہت سے گنبد اور مقبرے نظر آتے ہیں ایک وسیع چہار دیواری کے اندر تین گنبد ہیں ان میں شاہان فاروقیہ کے مزار ہیں سب سے عالیشان گنبد میں عادل شاہ فاروقی کا مزار بنایا گیا ہے لیکن کسی پر کتبہ نہیں ہے اور ایک ایک گنبد میں کئی کئی قبریں ہیں - ایک چہار دیواری کے اندر سب سے زیادہ خوبصورت گنبد ہے جو شاہ سوزا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے گنبد کے نیچے کا حصہ ۱۲ پہل کا ہے - ہر پہل میں نہایت خوشنما در بنے ہیں اور بہت نفیس نقاشی اور گلکاری کی ہوئی ہے جو اب تک اچھی حالت میں اور قابل دید ہے - اوپر سے گنبد خربوزہ کی شکل کا ہے جس کے آس پاس چھوٹے چھوٹے گنبد اور مینار بنے ہیں جس چبوترہ پر یہ گنبد بنا ہوا ہے وہ بھی خوبصورت اور ۱۲ پہل کا ہے +

برہان پور سے ایک کوس کے فاصلے پر ایک خوبصورت عالیشان مقبرہ شاہنواز خان کے نام سے موسوم ہے یہ غالباً مرزا عبد الرحیم خان

خانخانان کے بڑے بیٹے مرزا ایرج کا مقبرہ ہے جو جہانگیر کے عہد میں منصب
پنجہزاری پر سرفراز اور شاہنواز خان کے خطاب سے موصوف تھا یہ نہایت
شجاع اور عالی ہمت امیر تھا برہان پور میں اب تک اُس کی شجاعت وبہادری
کی کہانیاں مشہور ہیں اس جگہ سالانہ میلہ لگتا ہے جو ایک ہفتہ تک رہتا ہے
گنبد کے نیچے کا حصہ فراخ ہے جس کا ہر ضلع ۲۶ فیٹ ۷ - انچہ ہے اصلی
قبریں تو تہ خانہ کے اندر ہیں لیکن درمیان میں بلند چبوترہ پر سنگ مرمر کے
دو تعویذ بنے ہیں - در و دیوار پر نہائت عمدہ اور قابل دید گلکاری کی ہوئی ہے -
گنبد کے اطراف میں ۳ - ۳ در کا برامدہ اور چاروں گوشوں میں ایک ایک
کوٹھری ہے - مقبرہ کی شمالی حد پر گوشوں میں ایک ایک گنبد ہے جس پر
کسیقدر چینی کا کام باقی ہے جنوبی سمت میں صدر دروازہ ہے +

اکبری وجہانگیری عہد میں خانخانان عبد الرحیم خان عرصہ تک برہانپور
میں مقیم رہے اُن کی یادگار سے ایک پختہ سرائے باقی ہے جس میں اب
بازار لگتا ہے دروازہ کی پیشانی پر یہ کتبہ کندہ ہے " درعہد سلطنت ظل اللہ
فی الارضین نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ وعدلہ.....
خانخانان سپہ سالار اخلد شوکتہ حسب الامر جہاں مطاع باہتمام خلیل اللہ پسر
بہادر خان در سنہ ہزار وبیست وہفت این سرای باتمام رسید" تاپتی
کے دوسرے کنارہ پر قصبہ زین آباد ہے جس کی مسجدیں قلعہ سے
دکھائی دیتی ہیں - شاہجہان ایام شاہزادگی میں بہت عرصہ تک برہان پور
میں رہا اُس نے زین آباد میں ایک وسیع باغ تعمیر کرایا تھا اس میں حوض
کے اندر ایک خوبصورت عمارت تھی ۱۷ ذیقعد ۱۰۴۰ھ کو ممتاز محل کا
انتقال برہان پور میں ہوا تھا مرحومہ کی نعش بطور امانت اسی عمارت میں

اوّل دفن کی گئی تھی یہاں سے ۱۷ر جمادی الاوّل سنہ ۱۰۴۱ھ کو منتقل کرکے آگرہ بھیجی گئی اس باغ کے نشانات اب بھی موجود ہیں +

سعید احمد مارہروی

غزل

از تصنیف جناب لالہ بہاری لال صاحب مشتاق دہلوی

عالمِ بالا کی سیریں شیشہ و ساغر میں ہیں — مستِ مے گویا کہ بزمِ ساقیِ کوثر میں ہیں

یہ قیامت کی ادائیں آپ کی ٹھوکر میں ہیں — رہگزر کے رہنے والے عرصۂ محشر میں ہیں

گو بظاہر چین سے بیٹھے ہوئے ہم گھر میں ہیں — گردشِ طالع سے گویا گھر میں بھی چکر میں ہیں

طفلِ گہوارہ نشیں کی طرح وہ بھی خیر سے — شوخیوں سے دست کش ہیں اور دلِ مضطر میں ہیں

وصل کی شب وہ چڑھانا تیوری کا ہجر میں — یوں لُٹاتا ہے کہ لاکھوں سلوٹیں بستر میں ہیں

پاسباں گویا ہمارے شوق سے آگاہ ہے — یہ نہیں کہتا کبھی ظالم کہ اِس دم گھر میں ہیں

رشتۂ الفت کا پھندا پڑ گیا سلجھائے کون — جس سے ہم الجھے ہوئے اپنے ہی بال و پر میں ہیں

ہے قفس میں ہمکو آزادی کا رونا ہمصفیر — غم نہیں ہے آب و دانہ کا کہ دونوں گھر میں ہیں

خونِ عاشق سے معاون سُرخیِ رخسار کا — توڑ کر آئینہ وہ مُنہ دیکھتے خنجر میں ہیں

چشمِ بینا ہو تو حاجت طورِ سینا کی نہیں — اُسکے جلوے ہر در و دیوار و ہر منظر میں ہیں

قدرتِ حق جس نے دیکھی ہو نہ محدود آج تک — دیکھ لے اُنکو کہ وہ بیٹھے ہوئے منظر میں ہیں

آستاں پر اُنکے کی پیکر تراشی ہم نے — محوِ حیرت ہوں کہ کیا کیا صورتیں پتھر میں ہیں

خرقِ عادت شعبدے اعجاز جادو اور طلسم — دیکھنے سارے تماشے کو چہ دلبر میں ہیں

تم تو اسے مشتاق ہو سر رنگ میں رنگے ہوئے — صوفی و صافی بڑے بھائی تمھارے گھر میں ہیں

احباب

آفرینش عالم کے بعد جب سے کہ بنی آدم کی تعداد بڑھنے لگی - قدرتاً یہی دستور چلا آتا ہے - کہ ہر ایک شخص کے ہزاروں آشنا اور واقف ہونگے - ہمیں مختلف جماعتوں - مختلف فرقوں - مختلف مذاہب کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے لیکن ان میں سے چند اشخاص ایسے ہوتے ہیں - جنکے ساتھ ہمارا تعلق باقیوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے - یہ وہ شخص ہیں جنکی صحبت سے ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے - جن سے ہم اپنے راز نہیں چھپاتے - جن سے ہمیں بوقت ضرورت امید امداد ہوتی ہے - جو ہماری خوشی و غم میں شریک ہوتے ہیں - اور یہی شخص ہیں جنہیں ہم دوست کہتے ہیں +

ہمارے باہمی تعلقات میں سے دوستی ایک بڑا بھاری رشتہ ہے کسی نے اسے ایک سنہری تار قرار دیا ہے - جو دلوں کو آپسمیں پیوستہ کرتا ہے - اڈیسن نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے - کہ " دوستی دو شخصوں کے درمیان ایک دوسرے کو فائدہ پہونچانے اور ایک دوسرے کی خوشی بڑھانے کی طرف دائمی میلان کا نام ہے " یہ ایک ایسا رشتہ ہے کہ ہماری زندگی پر ایام طفولیت سے لیکر اخیر عمر تک اس کا اثر ہوتا رہتا ہے - اسی سے ہماری ہوسیں بڑھتی یا فرو ہوتی ہیں - اسی کے سبب ہماری تکالیف بڑھتی گھٹتی ہیں - یہی ہمارے شکوک پیدا و رفع کراتی ہے - ہمارے دلوں کا بخل و کرم اسی پر منحصر ہے - اظہار و اخفائے خیالات اسی کے ماتحت ہے - غرضیکہ زندگی کے منازل کے راحت و رنج کا اکثر حصہ اسی پر منحصر ہے -

اوریہی وجہ ہے کہ اس رشتے کو مناسب و مضبوط رکھنا ایک نہایت ہی ضروری فرض انسانی ہے +

دوستی کا ایک اعلےٰ نمونہ دنیا کے حقیقی مذاہب کے بانیوں میں پایا جاتا ہے۔ اس پسندیدہ علاقہ میں ان کا طرز سلوک ایک آئینہ ہے۔ جسمیں تمام حقیقی محبت کا عکس دیکھنا چاہیئے۔ اس کی قدر ان لوگوں کو معلوم ہے۔ جنھیں ان برگزیدگان خدا کی زندگی کے حالات سے کماحقہ واقفیت ہے وہ ہر ایک شخص کے جواُن کے احکام کی تعمیل اور اُن کے طریق کی پیروی کرے دوست و معاون ہیں +

اس امر کی اہمیت کے ثبوت میں کہ اس رشتہ کے جوڑنے توڑنے میں نوجوانوں کو خاص توجہ چاہیئے ۔ دو امر قابل غور ہیں :-

(۱) اپنے بیگانے سب کے لئے ہمارا انتخاب احباب ہماری خصایل کا ایک صیحح معیار ہے۔ واقعی انسان کی قدر اس بات کے دیکھنے سے بخوبی معلوم ہوسکتی ہے کہ اس کے اصحاب و ہمنشین کیسے ہیں ۔ اگر ہمارے اصحاب اخلاق میں گرے ہوئے ہیں تو مشہور ضرب المثل "کند ہمجنس باہمجنس پرواز" لوگوں کو ضرور اس فیصلہ پر آمادہ کریگی ۔ کہ ہم میں بھی کوئی اخلاق نہیں ہیں۔ اس فیصلہ کی صحت ودرستی یقینی نہیں تو اغلب ضرور ہے۔ برعکس اس کے اگر ہماری صحبت خوش خلق معزز۔ ایماندار اور با اصول لوگوں سے ہے۔ تو خلق خدا ضرور ہمیں عزت کی نگاہ سے دیکھیگی ۔ اور ہم پر اعتبار کریگی۔ اس لئے ہم اگر چاہتے ہیں کہ ہماری نسبت عوام کی رائے نیک ہو تو دوست بنانے میں پرلے درجے کی احتیاط کو فرض سمجھیں اور اُس کی ادائگی میں تل بھر بھی کوتاہی نہ کریں +

(۲) ہمارے خصائل کے بنانے بگاڑنے میں جتنا اثر صحبت کا ہوتا ہے اور کسی تعلق کا نہیں ہوتا۔ کمینہ اشخاص کی صحبت میں بیٹھنا زندگی برباد کرنا ہے اور یہ کوشش کرنا کہ کسی سوسائٹی میں بیٹھکر بغیر اس سے متاثر ہونیکے اس سے نکل آئیں۔ رائگاں ہے صحبت کا اثر آہستہ آہستہ ہوتا ہے لیکن یہ اثر زہر قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ خواہ کسی کو محسوس نہ ہو۔ لیکن انسان کے نیک خیال وافعال کا خون کر دیتا ہے۔

اسپ وخر را گر بہ بندی مدتے یکجا بہم رنگ او برجا بماند خوئے او چوں خر شود

ہندوستان کے اکثر نوجوان دوست بنانے میں پرلے درجے کی بے پروائی برتتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ ملک وقوم کی ترقی خود اُن کی ذاتی ترقی پر منحصر ہے اور اُن کی ترقی اُن کے اخلاق پر اور پھر اخلاق ماتحت ہے صحبت کے۔ انکی یہ بے پروائی بربادی کی علامت ہے۔ وہ اپنی کشتی اپنی آنکھوں سے ڈوبتی دیکھکر بھی اتنی ہمت کے مالک نہیں ہیں کہ کمر کس کر اسے بچائیں واللہ اعلم وہ اپنی غفلت۔ خودغرضی نااتفاقی۔ بیدردی کو کب چھوڑینگے ہاں اتنا ہے کہ غیر اقوام کی دیکھا دیکھی فوری جوش تو دکھلانے لگے ہیں۔ مگر یہ نہیں دیکھتے کہ ترقی قوم کے اسرار کیا ہیں۔ وہ دیگر قوموں کے افراد کی ان باتوں میں تو تقلید کرتے ہیں۔ جو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچاتی ہیں۔ لیکن جان بوجھکر اُن امور سے غافل ہیں۔ جن پر فی الاصل اُن کے بچاؤ کا دارومدار ہے۔ ہزارہا تجربات کے بعد بھی اُن کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔

دوست بنانے کے لئے اصول وقواعد تیار کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ لیکن دو چار باتیں جنکی بنا تجربہ پر ہے رہبری کے لئے بشرط عمل مفید ثابت ہونگی +

ہمیں اول تو دوستی قایم کرنے ہیں اور پھر جب قایم کریں تو اس کے توڑنے میں ہرگز جلدی نہیں کرنی چاہیے - اکثر اشخاص کا قاعدہ ہے جونہی کسی سے آشنائی ہوئی - جھٹ اس کے آگے اپنے راز ظاہر کر دیئے - اور ایسی بے تکلفی پیدا کر لی - کہ گویا وہ کبھی غیر ہی نہ تھے - اور چشم زدن میں یار غار بن بیٹھے لیکن ایسے اشخاص کو اپنی اس جلدی کا ثمرہ بھی جلدی ہی ملتا ہے - اور پھر نقصان اُٹھا کر پچھتاتے ہیں - یاد رکھیں کہ جلدی کی پیدا کی ہوئی دوستی ٹوٹتی بھی جلدی ہے - ۶ - بزودرشتہ کشیدہ بزود مے گُسلد + مناسب ہے کہ ہمارے پاس اس شخص کے پرکھنے کے لئے جس کو ہم اپنا دوست بنانا چاہتے ہیں - چند اصول کسوٹی کی طرح تیار رہیں اور پھر جب دوستی ہو گئی - تو اُس کے قایم رکھنے میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ کرنا چاہیے - خدانخواستہ اگر دوست سے نزاع ہو کر تعلق شکستہ ہو جاوے - تو ایک تو دوست ہاتھ سے گیا دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ ایک دشمن اور بڑھ گیا - اور پھر کئی طرح سے تمہارا فایدہ نقصان اس کے ہاتھ میں ہے - تمہارے راز اس کے دل میں ہیں - ممکن ہے اس کا دل اس کی زبان کے سپرد کر دے - اور یہ یاد رہے - کہ یہ تاگا ٹوٹا پھر جوڑنا قریباً ناممکن ہے اور بالفرض اگر پھر گانٹھ بھی لیں تو یہ جوڑ ہمیشہ کے لئے ایک ناموافق زمانہ کی یادگار رہ کر کانٹے کی طرح چبھتا رہے گا - اور وہ باہمی صفائی جو اس شکست سے پہلے تھی پھر ہونی ناممکن ہے +

امریکہ کے ایک مشہور مصنف نے خیالات انسانی کو ایک مکان سے تشبیہہ دی ہے - جس کے انگریزی طرز عمارت کے موافق دو دروازے ہیں انہیں سے ایک دروازہ تو شارع عام کی طرف ہے - اور اس سے عام گشتا

ملاقات کے کمرہ میں جا سکتے ہیں - اور اس کمرہ سے پھر رستہ پرائیویٹ
کمرہ کو جاتا ہے اور شارع عام سے ایک پوشیدہ کوچہ مکان کے دوسرے
دروازے کی طرف جاتا ہے جس سے براہ راست آدمی پرائیویٹ کمرے
میں داخل ہوسکتا ہے اس خیالی مکان کا پہلا دروازہ بعض آدمی بالکل
کُھلا رکھتے ہیں - بعض اسے قفل لگا دیتے ہیں - بعض صرف زنجیر پر اکتفا
کرتے ہیں جس سے باہر کا آدمی جھانک کر اندر نگاہ ڈال سکتا ہے -
لیکن اندر نہیں جا سکتا اور بعض اُس دروازے کو بالکل مسدود ہی کر دیتے
ہیں تاکہ دہلیز کے اندر نگاہ کا قدم بھی نہ پڑ سکے +

اس دوسرے دروازے کی ایک چابی تو ضرور ہوتی ہے جو سالہا
سال تک ماں کے پاس مخفی رہتی ہے - بعض دفعہ زائد چابیاں بھی ہوتی ہیں
جو باپ - بھائی - بہن اور کسی دوست کو خاص موقعوں پر دیجاتی ہیں -
ہر لحظہ کے رفیق و ہمراز یعنی خاوند یا بیوی کا بھی حق ہے کہ اُسے اس
دروازے کی ایک چابی ملے - اگر نہ ملے تو زندگی طرفین کی یقینی طور پر
تلخ ہو گئی - اگر تقدیر نے یہ چابی تمہاری کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں
دیدی جس کے سینے میں کینہ اور دل میں ظلم بھرا ہوا ہے - تو تم واقعی
قابل رحم ہو - اور تمہارا مرض قریباً لاعلاج ہے - اس کا اختتام و انجام
یا تو سر شکنی اور خودکشی پر ہوتا ہے - یا اس کے ایام غمگینی اور کس مپرسی
کی حالت میں گذرتے ہیں - لہذا اس چابی کو کسی کے حوالے کرتے وقت
کمال درجے کی احتیاط چاہیئے - اغلباً انسان کی زندگی کے اکثر حصے
کا رفیق وہ شخص ہے - جس سے رابطۂ نکاح ہو - اس لئے اس رفیق
کے انتخاب پر انسان کی جملہ راحت و رنج کا فیصلہ ہے - خدا کے فضل سے

اگر ہمراز، ہمخیال اور موافق رفیق سے سابقہ پڑا تو ہزار ہزار شکر۔ اگر حالت دگر گوں ہے تو اے بیچارے قسمت کے مارے۔ جا اور قسمت کو روتا رہ خوشی سے ہاتھ دھو اور اپنی تقدیری مایوسی میں معمولی فرائض ادا کرتا ہوا وہ ایام جو تیرے لئے اس ناپائدار دنیا میں رہنے کے لکھے ہیں۔ گذار دے +

اُس شخص کی دوستی ہرگز قبول نہ کرو۔ جس کا میزان حق تمہارے درجہ تمیز حق سے ادنیٰ ہے۔ جس آدمی میں اخلاق کی قدر نہیں اُس کی صحبت سے بچتے رہو۔ جو انسان بے اصول زندگی بسر کرتا ہے اُس کی رفاقت ترک کر دو۔ اور یہ معلوم کرنا کہ کسی شخص میں تمیز حق اور قدر اخلاق ہے یا نہیں۔ اور آیا اُس کی زندگی کے اصول بھی ہیں یا نہیں۔ کوئی دشوار کام نہیں ہے۔ اُس کی گفتار سے تمہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ اسے دیانتداری۔ راستی بھلائی کا کہانتک پاس ہے اس کی رفتار سے تمہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس طبیعت کا بندہ ہے۔ کسی خائن آدمی کی بیجا تعریف کرنا اور جاندار کیڑے پر بے ضرورت وعمداً پاؤں دھرنا اُس کی طبیعت کی خیانت وظلم کو جھٹ ظاہر کر دیتا ہے۔ ایسے آدمی سے بھلائی کرو۔ خوش خلقی سے پیش آؤ۔ نصیحت کرو لیکن دوستی کے قابل نہیں +

دوستی بنانے میں ہمسری رتبہ کا خیال ضرور چاہیئے۔ اپنے سے زیادہ دولتمند سے دوستی رکھنا اپنے میں ضرورت وآمد کی نسبت زیادہ خرچ کرنے اور کر کے پچتانے کی عادت ڈالتا ہے۔ لوگ خوشامدی طامع سمجھتے ہیں اور خود اپنی فروتنی محسوس کر کے ہردم ملول رہتا ہے۔ اپنے سے زیادہ بد کی رفاقت زیور دل پر زنگار چڑھاتی ہے یوں تو از روئے انسانیت ہر فرد بشر تمہارا بھائی اور دوست ہے لیکن ہر ایک سے ایک ہی سلوک

برتنا خدا تعالےٰ کی منشا کے خلاف ہے۔ ہاں البتہ اپنے سے زیادہ نیک کی صحبت سونے پر سہاگے کا اور زنگ آلود دل پر صیقل کا کام دیتی ہے۔ اپنے سے کم رتبہ انسان سے دوستی اکثر باعث تکبر ہے۔ ہم ان سے خدمات لیکر اپنے سر و لب ہلا دینے کو کافی معاوضہ سمجھتے ہیں

جہاں تمھاری کسی بلند خیال و عالی ہمت شخص سے دوستی ہے وہاں ایک سادہ وضع و سادہ خیال انسان سے بھی اتحاد ضروری ہے۔ حاصل کردہ فیض اس ذریعہ سے بآسانی اوروں کو پہنچا سکتے ہو۔

ایسے شخص ایک لوح صفا کی مانند ہوتے ہیں۔ جو پسند آئے لکھو۔ اس لیے اگر تمھیں اپنے ایمان اور افعال پر پورا بھروسہ ہے تو ضرور ایسے انسان مہیا کرو۔ اور ان اشخاص کو اپنے ہاتھوں اپنی مرضی کے موافق اپنے ہمخیال دوست بنا سکتے ہو۔ مگر اسمیں مشق و صبر لازمی ہیں۔

اُس شخص کی دوستی سے دور رہو جسے اُن اشیا یا اشخاص کی قدر نہیں جو تمھارے نزدیک پاک۔ متبرک اور قابلِ ادب ہیں منکران خدا قابلِ رحم ہیں لیکن اُنکی دوستی قاتل ہے غیر مذہب کے افراد سے دوستی رکھنا نیکی ہے لیکن اگر وہ اسقدر تاریک ضمیر رکھتے ہیں کہ تمھارے خدا۔ تمھارے پیغمبر۔ تمھاری کتب مذہبی۔ تمھارے اوتار تمھارے بزرگانِ دین۔ تمھارے ملک و قوم کے بہادروں اور جاں نثاروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو بے شک اُنہیں چھوڑ دو۔

دوستی کے لیے عاقل و دانا بشر مہیا کرنا لازمی نہیں ہے۔ سادہ و پاکیزہ خیال انسان اچھا ہے۔ ایک معمولی دھات کی لیکن مضبوط پرزوں کی اور ٹھیک وقت دینے والی گھڑی رکھنا از بس مفید ہے سنہری کیس والی کی نزاکت تمھیں بجز تکلیفِ حفاظت و نگہبانی کے کوئی فائدہ نہیں دیسکتی۔ عقلمند دوست کا کام تو کتابوں سے بھی لے سکتے ہو۔

دنیا میں تین قسم کے دوست ملتے ہیں۔ جانی۔ زبانی۔ اور نانی۔ جانی دوست تو وہ شخص ہیں جو دل سے ہمارے خیر خواہ۔ ہر دم ہمارے ہمدرد۔ ہمیشہ ہماری امداد کو کمر بستہ۔ ہمارے سامنے ظاہر و باطن کے صفا۔ ہمارے دوستوں کے دوست ہمارے دشمنوں سے بیزار۔ غرضیکہ

ہمارے لیے بوقت ضرورت جان دینے کو تیار رہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھیں ہم دوست کہہ سکتے ہیں۔ اور جن کی محبت و قدر ہمارا عین فرض ہے ۰

زبانی۔ وہ لوگ ہیں جو مُنہ سے ہردم دوستی کا دم بھریں۔ جو اپنی نمکین لاف وگزاف اور سخنہائے شیریں و پُر الطاف کو ہمارے کانوں تک ہی محدود رکھیں۔ نہ کبھی ایفائے وعدہ کا ارادہ اور نہ کبھی امداد کو آمادہ۔ اِن بیچاروں کی برائے نام دوستی کا بس یہی عوض ہے کہ وہ اپنی میٹھی میٹھی باتیں سنائے جائیں اور سامعین موقع کے مناسب رو کر یا ہنس کر ہاں میں ہاں ملائے جائیں۔ اور قابل ہمدردی اِسلیئے ہیں کہ جس دن انہیں کوئی اِس قسم کا سامع نہ ملے تو اپنی زندگی کو تلخ سمجھتے ہیں ۰

دوستان ثانی! نعوذ باللہ! مجھے تو اِس جماعت کا نام لیتے بھی ڈر لگتا ہے۔ یہ وہ "خود پرست طبیعت کے بندے" ہیں جو اپنے دامِ تزویر میں پھنسائے ہوئے قسمت زدگان کو کھا جانے والے ہیں۔ اِنکی خودغرضی کا دہن بے انتہا کشادہ ہے۔ اِنکے ظلم کا شکم ایک غار ہے۔ اِنکی رہبری کنوئیں میں گرانے والی اِنکی نصیحت گمراہ کرنے والی۔ اِن کا وعظ دوزخ میں لے جانے والا۔ یہ ازسرتاپا خودغرضی کی پوجا کرتے ہیں۔ اِن کا ہر ایک کام اِسی کی عبادت و اطاعت میں ہوتا ہے اور اُنکی ہر ایک بات اسکی دعا میں ہوتی ہے۔ اپنی ضرورت کے وقت تمھارے حقیقی برادر۔ صادق دوست۔ خالص مددگار۔ جب تمھاری باری آئے تو نہ تو وہ تمھارے دوست ہیں نہ آشنا۔ نہ بھائی ہیں نہ یار۔ پس اسے ظاہر بینو! ان ظالم صیادوں اور کمینگی کے خانہ زادوں سے بچے رہو۔ اُنکی شیریں سخنی کے دانہ تلے سیہ دلی کا جال بچھا ہوا ہے"۰

استحکام دوستی کے لیئے چند باتیں مفید ثابت ہونگی

(۱) اپنے گھر کے راز دوستوں سے بھی بیان نہ کرو۰

(۲) دوستوں سے نہ قرض لو نہ اُنھیں قرض دو۔ حتی الامکان ایسے تعلقات سے بچو۰

(۳) ہمیشہ اُن کے آگے ظاہر باطن صفا رہو۔ میلا دل اور میلا بدن نفرت اور حقارت پیدا کرتے ہیں۔

(۴) اُنھیں کبھی آزردہ نہ کرو۔ ہمیشہ نرمی سے گفتگو کرو۔ کسی قسم کی بحث و مخالفت درمیان نہ لاؤ۔ غصّہ کے وقت تحمل سے کام لو۔

(۵) دوستوں کی شکایت غیر کے مُنہ سے سُننا یا غیر کے آگے کرنا کبھی پسند نہ کرو۔

(۶) دوستوں میں سے کسی کے روبرو ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دو۔

(۷) اگر باہم کچھ رنجش ہو گئی تو جا کے معافی مانگو۔

(۸) جملہ شکوک فوراً رفع کراؤ۔

(۹) اگر قول یا فعل میں وہ تمھارے موافق نہیں تو بُرا نہ مانو۔

(۱۰) اگر تمھیں کوئی تکلیف ہو تو بے شک دوستوں سے طالب امداد ہو لیکن معمولی یا بالکل وہمی تکالیف کے لیے انھیں تکلیف نہ دو۔

(۱۱) اپنے احباب کے لیے بصدق دل کے ساتھ خدا سے دعا طلبی کیا کرو۔

آزمائش کا ایک مجرب طریقہ۔

چند دوست ہمیشہ مجھے اپنے مکتوبات میں لکھتے رہے کہ "کار ہٰذا بارلاابقہ سے خورسند فرماویں۔ مشکور ہوں گا" میں بھی تنگ آ گیا۔ آخر ایک ایک کو مختلف "کار ہٰذا بارلاابقہ" لکھنے شروع کر دیئے۔ خواہ ضرورت ہوتی یا نہ ہوتی۔ کسی کو لکھ دیتا۔ اتنے روپے بھیجدو۔ مجھے ضرورت ہے۔ کسی سے کوئی اور چیز منگواتا۔ علیٰ ہذا القیاس مختلف فرمان بھیجدیئے۔ اس سے مجھے اتنا فائدہ ہوا کہ ان احباب میں سے اکثر کے اب خط تھوڑے آتے ہیں۔ جس پر مجھے بھی جواب تھوڑے دینے پڑتے ہیں۔ بعض نے خط و کتابت ہی ترک کر دی۔ اور بعض نے وہ رویّہ پُرریا کلمات لکھنے کا چھوڑ دیا۔ ریا اور ظاہر داری بہت بُری چیز ہے۔ خدا ہمیں راہ راست پر چلائے۔

ا۔ ب۔ طبیب۔ نیوٹن ہال لاہور

خاندانِ شریف

دلّی کانِ جواہر دلّی جو کبھی لعل اُگلتی تھی جس کی خاک پاک سے صاحب ِ ل ارباب کمال اُٹھتے اور اپنی رنگا رنگ لیاقتوں سے اس فضا میں قوس و قزح کی سی بہار دکھاتے تھے۔ جہاں علم و فضل کے چشمے اُبلتے اور مُردہ زمینیں سرسبز و شاداب ہوتیں۔ اب اُس کے یہ جلوے کہاں؟ رشک "قرطبہ و بغداد" جسے جہان آباد ہونے کا فخر حاصل تھا خراب آباد ہو گئی وہ چمن مٹ گیا وہ بہار لُٹ گئی۔ وہ نظارے جو کل نظر گرفتگی کرتے تھے آج خواب ہو گئے لیکن اس "جہان خراب" میں اب بھی ایک گھر ہے جسکی تعریف میں ایک دفعہ مولانا حالی نے مومن خاں مرحوم کے حسب ذیل شعر چسپاں کیا تھا ؎

رہتے ہیں جمع کوچہ جاناں میں خاص و عام　　آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

حکیم شریف خاں مرحوم کا خاندان جس میں ایک مدت سے علم، اعزاز اور امارت یہ امتیاز سہ گانہ متوارث چلے آتے ہیں۔ جو اب بھی بزرگوں کے خصائل، بزرگوں کے باقیات الصالحات بزرگوں کے طور و طریق سنبھالے بیٹھا ہے۔ ایک مقتدر اور نہایت عزیز خاندان ہے جس نے طبی خدمات کے سلسلے میں علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے مُلک کی مستقل اور بہت گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور "زندگی" اور "موت" کی ناگزیر مشکلات کم کرنے میں سلسلہ وار اور باقاعدہ جدوجہد یادگار چھوڑی ہے۔ ارسطو اور بو علی سینا کی بیت کو علم و عمل دونوں اعتبار سے اسی خاندان کی کوششوں نے حوادثات کے خُنگل سے بچایا۔ اور "اپنی مدد آپ" کا ایسا سدا بہار منظر دکھایا جو تمام عملی آدمیوں کی اُمیدوں کو شگفتہ اور ہمتوں کو مستحکم و استوار بناتا رہے گا۔ اُنھوں نے کوششیں صرف حفاظت و مدافعت کے پہلو تک محدود نہیں رکھیں بلکہ ترقی کو کامل وسعتِ مفہوم کے ساتھ مدِ نظر

رکھا۔ اور اس اعتبار سے جو ضرورتیں محسوس ہوئیں۔ اُن پر احاطہ کرتے رہے۔ طب ہندی سے پیمانِ وفا باندھا۔ اُسکے اثرات زندہ کرنے کو مبسوط کتابیں لکھیں۔ درس و تدریس کے سلسلہ سے اور بالآخر قیامِ درسگاہ سے ہمدردی کے حقوق ادا کیے۔ اور نسلاً بعد نسل اس قسم کی کوششوں کا تسلسل قائم رکھا۔ اور فرزندانِ وطن پر روشن کرتے رہے کہ عمرِ طبعی تک زندہ رہنے کی قدرتی خواہش کس طرح اپنے مرز و بوم کے وسائل سے اور اُن وسائل کے ترقی دینے سے پوری ہو سکتی ہے۔ اور کیونکر قدرت کی فیاضیاں اُس درجہ تک جس درجہ تک وہ ہمارے لیے عام اور سہل ہیں مفید اور سب ضرورتوں پر حاوی بنائی جا سکتی ہیں؟ اس خاندان کی تاریخ بلحاظ اِن خدمات کے جنہوں نے زندگی کے ایک سب سے اہم مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مُلک کے روبرو بڑے نمونے پیش کیے ہیں۔ بلحاظ تعزز اور منزلت کے جو دو مختلف طرز کی سلطنتوں میں یکے بعد دیگرے اُسے حاصل رہی بلحاظِ عام قدر و اعزاز کے جو بے غرضانہ خدمات کے صلہ میں مُلک کے ہر ملت و طبقہ کی طرف سے اُنھیں ملا ایثار کے لیے داعی اور محرک۔ فن کے لیے سبق اور ہدایت۔ اور ذاتی فضائل کو آراستہ کرنیکے لیے نمونہ ہو سکتی ہے اور اس لیے نہایت اہم اور مفید شے ہے۔ لیکن اُسے ایک علیحدہ رسالہ کے لیے اٹھایا گیا ہے ؎

ذیل میں صرف اس "گروپ" کے متعلق جو آج مخزن کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ اور جس میں تین چار مستثنیٰ اصحاب کے سوا باقی "خاندانِ شریف" کے موجودہ ممبر ہیں۔ چند سطریں لکھی جاتی ہیں تاکہ وہ حضرات جنھیں اس خاندان سے سابقہ تعارف نہیں معلوم کر سکیں کہ اس دَور میں یہ خاندان مُلک کی کیسی خدمات انجام دے رہا ہے اور آیندہ کن خدمات کے لیے تیار ہو رہا ہے؟۔

یہ "گروپ" فروری ۱۹۰۸ء میں حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں مرحوم کے صاحبزادوں کی شادی کی تقریب پر لیا گیا تھا۔ اگر حکیم غلام رضا خاں صاحب کی شبیہ اس میں ہوتی جو فضل و کمال اور ورع و اتقا اور "آئینِ شرافت" کے بدوِ شعور سے بڑھاپے تک پابند ہونیکے لحاظ سے اپنے

خاندان میں فرد کامل ہیں۔ تو جہاں تک موجودہ مشاہیر کا تعلق تھا یہ گروپ اس خاندان کی نسل موجودہ کا مکمل مرقع ہوجاتا۔ اس "گروپ" میں مقامِ صدر پر جو بزرگ نظر آتے ہیں حکیم حاجی غلام رسول خاں صاحب ان کا نام ہے۔ اب یہ اپنی دنیوی زندگی ختم کر چکے ہیں اور مہاجر ہیں۔ جب وطن کی کشش غالب ہوئی چلے آتے۔ ورنہ حجاز میں رہتے ہیں اور وہیں عمر بسر کرنی چاہتے ہیں۔ ان کے دائیں ہاتھ پر حکیم غلام نبی خاں صاحب ہیں کلکتہ جیسے مقام پر ہزارہا تعلیم یافتہ لوگوں کو طبِ یونانی کا گرویدہ بنا لینا جو بالکل اُس سے مانوس نہ ہوں۔ انہیں کی حذاقتِ فن کا کام تھا۔ انہوں نے ایک مدتِ دراز تک نہایت کامیابی اور اعلےٰ اعزاز و منزلت کے ساتھ کام کرنیکے بعد ۶۳ برس کی عمر میں ۷۔ رجب ۱۳۲۵ ہجری کو انتقال فرمایا۔ اور چار لائق و فائق صاحبزادے یادگار چھوڑے جن میں سے حکیم عبدالنبی خاں جو اب اُن کے جانشین ہیں اسی سمت صدر کی نشست سے تیسرے نمبر پر ہیں۔ اور دوسرے حکیم عبدالرشید خاں بائیں طرف صدر سے چوتھے نمبر پر۔ حکیم غلام بشیر خاں جو اُنکے چھوٹے فرزند ہیں بستعدی اور قابلیت کے ساتھ تعلیم پوری کر چکے ہیں۔ اور امید ہے کہ مثل اپنے والدِ مرحوم کے کامیابی حاصل کرینگے ؂

حکیم غلام نبی خاں مرحوم کے برابر حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں بہادر ہیں۔ یہ نہ صرف اپنے خاندان کے صدر نشین ہیں بلکہ طبِ ہندوستانی کی جو رونق اب نظر آتی ہے انہیں کے دم سے ہے اور آئندہ ملک کی اس سب سے اہم ضرورت کا سرانجام بہت کچھ انہیں کی ذات سے وابستہ ہے۔ ہندوستان میں اوّل درجہ کے طبیب ہونیکے علاوہ بہت بڑے فاضل اور ادیب ہیں۔ عربی اور فارسی میں بے تکلفی اور بے ساختہ پن سے تحریر و تقریر کرتے ہیں۔ اور نہ معمولی نوشت و خواند بلکہ اعلےٰ پایہ کی علمی تصنیفات کر سکتے ہیں چنانچہ اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر انہوں نے بھی طبی لٹریچر پر نہایت مفید اضافہ کیا ہے۔ ذہانت اور طباعی کے علاوہ بہت عرصہ تک علمی زندگی بسر کرنیکے سبب ان کی علمی حیثیت میں جو شان

پیدا ہوگئی ہے اُس نے اِنکی علمی قابلیت سے مِلکر اِنہیں مُلک کے لیے اِس درجہ مفید بنا دیا ہے کہ حالاتِ موجودہ کے لحاظ سے اُمید نہیں کہ قریب زمانہ میں اِن کی شان کا کوئی دوسرا شخص پیدا ہو۔ مدرسۂ طبیّہ جب اِن کے برادرِ بزرگ حاذق الملک حکیم عبد المجید خاں مرحوم نے قائم کیا۔ یہ اُسی وقت سے اِس کام میں اُن کا دستِ راست تھے اب یہ اُسکے سکرٹری ہیں۔ اور اُسکی قسمت کا حل و عقد انہیں سے وابستہ ہے۔ اِسکے علاوہ بے زبان اور کس مپرس طبقۂ نسوان کی حالتِ زار کے لحاظ سے یہ ایک "دائیوں کا مدرسہ" اور ایک "زنانہ شفاخانہ" قائم کرنے والے ہیں۔ تاکہ نسوانی امراض میں عمدہ طبّی امداد نہ ملنے سے جو دردناک حادثے ہوا کرتے ہیں موقوف ہوجائیں۔ اور زنانہ شفاخانہ میں غریب عورتوں کو وضع حمل کے زمانہ میں بلا معاوضہ مدد دی جائے۔ ہم نے خدا کے حکم اور تمدّن کے اقتضا سب کو بالائے طاق رکھکر اپنی عورتوں سے اِس درجہ سرد مہری بلکہ میں جوشِ انصاف سے کہوں گا اِس درجہ ظلم جائز رکھا ہے کہ اِس فرض کے متعلق جو اپنی "ماؤں" "بہنوں" "بیٹیوں" اور "بیویوں" کا ہمارے اوپر ہے ہماری حس مُردہ ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے مہینے میں نہیں بلکہ پہلے سال کے بعد بھی یہ ضرورت نظر آتی ہے کہ حاذق الملک ہماری "رحم دل" سرکار کے بھروسے پر تحریک کی رفتار نہ چھوڑ بیٹھیں بلکہ اپنے اثر اور اقتدار سے کام لیں۔ اطمینان یہ ہے کہ تحریک اُن کے ہاتھ میں ہے اور اِنکی پوری توجہ یہ بیڑا پار لگا کے رہے گی +

حاذق الملک نے حکیم شریف خاں مرحوم کا مقصد جو ویدک اور یونانی کے اتحاد پر مبنی تھا۔ اور جس نے مستقل کتاب اُن سے لکھوائی پورا کرنیکے لیے طبّی کانفرنس کی بنیاد ڈالی ہے اور ویدوں اور طبیبوں دونوں کے لیے ایک مشترکہ پلیٹ فارم پیدا کیا ہے تاکہ اِس مشترکہ جدّ و جہد سے وہ تمام ضرورتیں رفع ہوجائیں جو اہلِ وطن کو بقائے زندگی کے لیے پیش آتی ہیں۔ اور "دیسی طب" ہر حیثیت سے مکمّل اور مفید بن جائے +

یہ کام جن کا انہوں نے بیڑا اٹھایا ہے نہایت اہم اور ایثار طلب ہیں اور ہر ایک کا تقاضا یہ ہے کہ کوششوں کا مرکز اسی کو بنا دیا جائے۔ لیکن جب بہت سی ضرورتیں جمع ہو جائیں اور ان کا احساس بھی فقط ایک دل کا حصہ ہو۔ ناممکن ہے کہ دردمند طبیعت کو ان میں سے کسی کا نظر انداز ہونا گوارا ہو جائے۔ حاذق الملک باوجودیکہ ان کے پاس بہت تھوڑا ذاتی وقت رہ گیا ہے ان کاموں کو اپنے آرام پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔ اور انکے لیے بڑی محنت گوارا کرتے ہیں۔ جب انکی پوزیشن وقعت اور ہر دلعزیزی پر نظر کیجاتی ہے جو انہیں ہندوستان بھر میں ممتاز بناتی ہے تو یہ کام اہمیت کے باوجود اس قدر دشوار نہیں رہتے کہ ان میں سے کسی کو ملتوی کرنے اور کسی کے لیے پوری محنت وقف کیے جانے کا مشورہ ناگزیر ہو۔

حاذق الملک ان خدمات کے علاوہ اور قومی کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ نمونہ ہے وقت کو سلیقہ سے استعمال کرنے کا اور سچے ایثار علی النفس کا۔

صاحب صدر کے بائیں ہاتھ پر حکیم واصل خاں مرحوم ہیں۔ یہ فخر خاندان تھے اور اپنے وقت میں اتنا کام کر گئے ہیں جو ان کا نام ہمیشہ خاندان کے افق پر روشن رکھے گا۔ طرز علاج میں یہ بالکل اپنے والد حکیم محمود خاں مرحوم کا تتبع کرتے تھے اور جو شفا اس طبیب اعظم کے ہاتھوں میں تھی اُسی کا حصہ انہیں عطا ہوا تھا۔ افسوس ۸۔ فروری ۱۹۰۵ء کو بے مہری قضا نے ان کا چراغ زندگانی وقت سے پہلے گل کر دیا۔ ان کے برابر حکیم حاجی احمد سعید خاں صاحب ہیں۔ یہ آنریری مجسٹریٹ، میونسپل کمشنر اور دلی کے میونسپل بورڈ کے وائس پریسیڈنٹ ہیں۔ انہوں نے حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں مرحوم کے آگے زانوئے ادب تہ کیا اور بمبئی میں بہت کامیابی کے ساتھ فن شفا کا فیض جاری رکھا۔ صاف باطن۔ متواضع اور متدین آدمی ہیں۔ امسال بعض دوسرے ابنائے خاندان کے ساتھ فریضہ حج ادا کر کے آئے ہیں۔ اور اس موقع پر شہر نے بلا اختلاف مذہب و ملت ان کا اس دھوم سے استقبال کیا کہ لوگوں کا بیان ہے کہ گذشتہ نصف صدی کے بعد کسی قافلہ حجاج کا اس قدر شاندار

استقبال دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ اِن کی اور اِن کے خاندان کی وقعت اور ہردلعزیزی کا
فقط ایک نقارہ تھا۔ اِن کے قریب حکیم فاضل خاں صاحب بیٹھے ہیں۔ جنہوں نے طبی تعلیم حکیم
غلام رضا خاں صاحب کے حلقۂ درس میں تمام کی اور اپنے فن سے فطرتی مناسبت ہونے کے
باعث جو کچھ سیکھا اُسکا نہایت کامیابی سے استعمال کیا۔ اِن کی خدمات بہت اطراف کے تما
بعض ریاستوں سے متعلق رہیں۔ اِستادہ صف میں بائیں طرف سے چھٹے نمبر اور صدر کے
ٹھیک عقب میں حکیم حاجی محمد احمد خاں ابن حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں مرحوم ہیں
انہوں نے تعلیمی جدوجہد ختم کر لی ہے اور دوران تعلیم سے والد اور چچا کے زیر نگرانی فن
کے متعلق اسرار و نکات حاصل کر رہے ہیں۔ قابلیت کے ساتھ روشن خیالی اور جدت پسندی
اور وہ تمام اوصاف جو انہیں "الولد سرٌ لابیہ" کا مصداق ثابت کر رہے ہیں انہیں مبدأ
فیاض نے عطا کیے ہیں۔ طب ہندی کی وہ شاخ جو اِن کے خاندان کی طبابت کو پوری دیسی
طبابت ثابت کرتی رہی ہے اِس کی طرف انہیں ذاتی شغف ہے اور وہ اِس کے متعلق محنت
و استقلال سے تجربے اور علم کو وسعت دینے میں مصروفِ سعی ہیں۔ اِن کے خاندان اور
خصوصاً اِنکے والد کے (جو بلا شبہ آسمانِ طب کے آفتاب تھے) بے شمار دوستوں کو نہایت
مسرت ہے کہ انہوں نے وہ لیاقتیں جو دورِ آیندہ میں اِس خاندان کی ممتاز صفتوں کے
قائم رکھنے کی ضمانت ہو سکتی ہیں۔ توجہ محنت اور ذاتی دلچسپی سے پیدا کر لیں +

اِن کے برابر اِن کے چھوٹے بھائی حاجی ظفر حسین خاں ہیں۔ یہ ابھی تعلیم حاصل
کر رہے ہیں اور جو خصائل اِن سے ظاہر ہوئے۔ اُن سے اُمید ہوتی ہے کہ جس طرح یہ شباہت
اور کیرکٹر میں اپنے والد کی تصویر ہیں۔ اسیطرح علم و فضل اور خدمات خلق کے لحاظ سے اُن کے
خلف الرشید ثابت ہوں گے۔ اِن کے پیچھے غلام رسول انہار ہیں اور اِنکے برابر حکیم
غلام کبریا خاں ہیں۔ انہوں نے دورانِ تعلیم میں غیر معمولی ذہانت اور فراست ظاہر کی ہے
یہ حکیم حاجی احمد سعید خاں کے فرزند اور حکیم محمود خاں مرحوم کے نواسے ہیں۔ حاذق الملک

حکیم محمد اجمل خاں کی نگرانی میں انہیں نہایت اعلیٰ تعلیم دی گئی ہے۔ اور بدوِ شعور سے ہونہار دیکھکر اس اہتمام سے ان کی تربیت کا فرض پورا کیا گیا ہے کہ آئندہ بہتر فرائض خاندان جو انہیں ملنے والے ہیں پوری کامیابی کے ساتھ انجام دے سکیں حکیم محمد احمد خاں اور یہ نئے دَور کے لیے دو نوجوان ہیں۔ جن کی ذات سے طبِ ہندوستانی کی امیدیں ضمیموں اور حواشی کے ساتھ وابستہ ہوئی ہیں۔ یہ مطالعہ پسند اور معلومات میں ہمیشہ اضافہ کی کوشش کرنے والے ہیں۔ اور ممتاز خاندانی خصائل اور کمالات کی موجودگی نے ان کا مستقبل بہت صاف اور روشن بنا دیا ہے ۔

ان سے قریب حکیم محمد نصیر خاں صاحب ہیں جو بمبئی میں مطب کرتے ہیں اور قابلیت کے علاوہ مہر و فا میں اپنے خاندان کا ایک نمونہ ہیں۔ بچوں کی صف کے مین وسط میں جو چھوٹی شبیہ نظر آتی ہے یہ محمد جمیل خاں ابن حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں ہیں جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس اہتمام کے ساتھ جس کی سلسلہ تعلیم کے انکے والد جیسے مبصر سے اُمید ہو سکتی ہے ۔

عبد القدیر دہلوی

محبت فرزندی! اسکندر اعظم کی ماں اوجمپیا ایسی تند خو و تنک مزاج تھی کہ وہ معاملات سلطنت میں اس سے کسی طرح کام نہیں لے سکتا تھا۔ لیکن اوجمپیا دوسروں کی حرکات و سکنات کو تاڑتی رہتی تھی۔ اور اپنے بیٹے سے تمام آدمیوں کی شکایتیں کیا کرتی تھی۔ سکندر ماں کے مزاج سے بخوبی آگاہ تھا۔ مگر اُسکی شکایتوں کو خوب دل لگاکر سُنتا اور بلطائف الحیل اُسے ٹال دیتا تھا۔ ایک بار اینٹی پیٹر نامی نائب السلطنت یوروپ نے سکندر کو ایک طویل عرضداشت بھیجکر اوجمپیا کے دخل در معقولات کی شکایت کی مگر سکندر نے اُسکو جواب میں لکھا کہ "کیا تجھے خبر نہیں کہ میری والدہ کا ایک آنسو ایسی ہزار چٹھیوں کو دھو ڈالتا ہے" ۔

گسائیں تلسی داس جی

رامائن کے نامور مصنف کی تصویر جو گزشتہ پرچے میں شائع ہو چکی ہے وہ ہمیں جناب پیارے لال صاحب شاکر نے اس دلچسپ مضمون کے ساتھ عنایت کی تھی جو اس مرتبہ شائع ہوتا ہے۔ جناب شاکر کی تلاش داد کے قابل ہے۔ مضمون اور تصویر دونوں کے لیے ہم اُن کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

گسائیں تلسی داس جی ذات کے برہمن اور موضع راجپور ضلع باندہ کے متوطن تھے۔ انکے والد کا نام **آتمارام دویدی** اور والدہ کا نام **ہولاسی** تھا۔ آپ کی پیدائش سمت ۱۵۸۹ میں ہوئی چونکہ ہندو شاستروں کی رو سے آپکا وقت پیدائش ایک ایسی گھڑی تھی کہ مولود کو ہمیشہ کے لیے گھر سے نکال دیا جائے۔ لہٰذا آپکے والد نے جو اپنے مذہب کے ایک پکے معتقد تھے۔ اُن کو باہر پھنکوا دیا۔ مہاتما **نرسنگھ داس** نے انکو اُٹھا کر اپنی کُٹی میں منگوا لیا۔ اور اچھی طرح سے اُن کی پرورش کی۔ اور جب ذرا ہوشیار ہوئے تو "گرو دکشا" دیکر انکو اپنا شاگرد بنا لیا اور اُن کا نام **تلسی داس** رکھا۔ اس سے پیشتر وہ ہمیشہ انکو **رام بولا** کے نام سے پکارا کرتے تھے۔

اُن دنوں ایک مشہور پاٹھک **مہاتما دین بندھو** قریب ہی رہا کرتے تھے اُن کی بیٹی **رتناولی** نہایت خوبصورت اور نازک بدن تھی۔ باپ کی تعلیم و تلقین نے لڑکپن ہی سے اُسکے دلمیں ایک اچھا بیج بو دیا تھا۔ اس نیک تربیت کے باعث وہ ایک خدا پرست لڑکی بن گئی تھی۔ جب بالغ ہوئی تو باپ کو اُسکے شادی بیاہ کی فکر ہوئی۔ اودھر **گسائیں تلسی داس جی** بھی سن بلوغت کو پہنچ چکے تھے۔ ایک آدمی کو درمیان میں ڈالکر گسائیں جی نے اپنا عندیہ مہاتما **دین بندھو** پر ظاہر کیا۔ اُنھوں نے یہ درخواست منظور کرکے نہایت دھوم دھام کے ساتھ دونوں کی شادی کردی۔ حق یہ ہے کہ یہ جوڑا ایسا اچھا بندھا کہ اسکی نظیر بہت کم

دیکھنے میں آتی ہے۔ ایک عالم اور خدا پرست شخص کو جو خوشی ایک تربیت یافتہ اور نیک بیوی کے ملنے سے ہوتی ہے اُسکا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے مہاتما دین بندھو جی ہی ایک قابل داماد ملنے کے باعث از حد خوش تھے۔ نیک **رتناولی** ہمیشہ شوہر کی خدمت و پاسداری میں مشغول رہتی تھی۔ گسائیں جی کو بھی اُن سے اِسقدر الفت و محبت تھی کہ دم بھر کو بھی اُنہیں اپنے پاس سے جدا نہ کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد خدا تعالیٰ نے اُن کو اولاد نرینہ عنایت فرمائی کہ جسکا نام **تارک** رکھا گیا۔ اِس آلہی بخشش سے اُن دونوں کا رشتۂ اُلفت اور بھی زیادہ مضبوط ہوگیا۔ رتناولی کے والد نے کئی بار اُسکے بلانے کو آدمی بھیجا مگر گسائیں جی اُسکی جدائی کو منظور نہ کیا۔ آخر کار **رتناولی** کا بھائی اُسے اپنی ہمراہ گھر لے جانے کے لیے آیا۔ اِس دفعہ اُس نے خود بھی اپنے باپ کے گھر جانے میں زور لگایا مگر گسائیں جی بالکل راضی نہ ہوئے۔ اتفاقاً کسی کار ضروری کے لیے گسائیں جی کو باہر جانا پڑ گیا۔ **رتناولی** بلا اجازت اُنکی عدم موجودگی میں بھائی کی ہمراہ باپ کے گھر روانہ ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد گسائیں جی واپس آئے **رتناولی** کو وہاں موجود نہ پاکر سخت بیکل ہوئے۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈا۔ کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر آس پاس کے رہنے والوں سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے باپ کے گھر چلی گئی ہے۔ گسائیں جی تاب مفارقت نہ لاکر فوراً سُسرال کی طرف روانہ ہو پڑے۔ **رتناولی** ابھی رشتہ داروں سے اچھی طرح ملنے بھی نہ پائی تھی کہ گسائیں جی بھی جا پہنچے۔ اُن کو دیکھکر وہ بہت شرمندہ ہوئی۔ جھنجھلا کر خوشامدانہ لہجہ میں بولی :-

"پران ناتھ! جو محبت تمکو مجھسے اور میرے ناپایدار جسم سے ہے۔ اگر یہی محبت
شری رام چندر جی سے ہوتی تو دین و دنیا دونوں کو کما لیتے۔"

گسائیں جی ایک گیانی پنڈت تھے۔ اُنکے دل پر یہ بات تیر کی طرح لگی۔ اور کچھ عرصہ کی بجھی ہوئی آگ ایک دم چمک اُٹھی۔ فوراً تمام تعلقات دنیوی پر لات مار کر کاشی جی (بنارس) کی طرف روانہ

ہو گئے۔ اور وہاں پہنچکر دن رات یاد الٰہی میں مگن رہنے لگے ؁

گشائیں جی کی زندگی کا سب سے بڑا اور مشہور واقعہ یہی ہے کہ جس نے اُن کی آن میں اُنکی کایا پلٹ دی۔ عورت کی ایک ذراسی بات نے اُن کے دل کو ہمیشہ کے لیے دنیا سے موڑ دیا۔ اور رفتہ رفتہ اُسکا یہ نتیجہ نکلا کہ رامائن جیسی مشہور و معروف کتاب آج دنیا میں موجود ہے۔ یہ وہ نہ مٹنے والی یادگار ہے جو ہزاروں دلوں میں گھر کیے ہوئے ہے ؁

ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں جو ہر دلعزیزی اور شہرت رامائن کو حاصل ہے وہ کسی اور کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔ کہنے کو وہ ایک مہاراجہ کی سوانح عمری ہی مگر اسمیں فرائض کے ایسے بہترین نمونے پیش کیے گئے ہیں کہ جنکی نظیر مشکل سے ملیگی۔ اسمیں اُس زندگی کی تصویر کھینچی گئی ہے جو قدیم آریوں کی نگاہ میں مکمل کہلاتی تھی۔ کچھ شک نہیں کہ ہندو اس کتاب کے صدہا زیر بار احسان ہیں۔ کوئی ہندو خواہ کسی فرقہ یا گروہ کا ہو ایسا نہ ملیگا جسنے رامائن کو پڑھا یا سُنا نہو اور اُسکے دل پر اُسنے ایک نیک اثر نہ ڈالا ہو۔ یہ درست ہو کہ رامائن ایک قصہ ہی۔ مگر دراصل یہ وہ بے نظیر قصہ ہے کہ جسکے مطالعہ سے پڑھنے والے کے دلمیں ہو سچے خیالات سرایت کر جاتے ہیں۔ اور وہ اوصاف جو کمالاتِ انسانی کا زیور ہیں ہمارے سامنے آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ راستبازی۔ ایفائے عہد۔ فرزندانہ اطاعت۔ پدرانہ محبت و حلم۔ استقلال عفو غرضیکہ کوئی ایسی خوبی نہیں جسے جادو نگار شاعر نے نظرانداز کر دیا ہو

مگر وہ بات جسکے باعث دیگر اقوام و مذاہب کے لوگ بھی رامائن کو اپنے دلوں میں ایک اچھی اور ممتاز جگہ دیتے ہیں یہ ہے کہ اُسنے ہندو علم ادب کا ایک اعلیٰ نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہی۔ اور یہ کامیابی کچھ شاعرانہ بلند پروازی کی وجہ سے نہیں ہو بلکہ اُسکے مصنفوں کی غیر معمولی قابلیت اور دیگر خداداد عطیات کی بدولت ہی گر یفتھ صاحب کا یہ قول کہ "رامائن دنیا میں ہر وقت ہر ملک کے علم ادب کو برابر کامیابی کے ساتھ چیلنج دیتی رہیگی اور انسانی کمال کی یہ مکمل تصویر جو رام اور سیتا میں نظر آتی ہی کہیں اور نہ ملیگی" ایک حد تک درست ہی ؁

گسائیں تلسی داس جی کے باب میں مؤلف رہنمایان ہند نے لکھا ہے کہ وہ شروع شروع میں راجہ صاحب بنارس کے دیوان ہی رہے ہیں اور بعد ازاں فقر و زہد اختیار کر کے بندرابن کو چلے گئے۔ بہت سے مقامات کا سفر کیا اور پھر بنارس میں واپس آئے۔ اور یہیں پر رامائن لکھی۔ اور اواخر زندگی کا حصہ بھی اسی متبرک شہر میں گزارا۔

اگر گسائیں جی کے چہرے کو غور سے دیکھا جائے تو ماہرین علم فرنیالوجی کے قائم کردہ اصولوں کی رو سے معلوم ہوگا کہ آپ کی قوتِ ادراک بہت بڑھی ہوئی تھی اور یہ وہ نعمت ہے جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ شری رام چندر جی نے گسائیں جی کو خواب میں حکم دیا کہ وہ رامائن کو قلمبند کریں۔ چنانچہ انہوں نے سمت ۱۶۳۱ میں رامائن لکھنی شروع کی۔ بال کانڈ میں اسکے شروع کرنیکی تاریخ لکھتے ہیں۔

سمبت سولہ سو اکتیسا ۱۶۳۱ کروں کتھا ہری پد دھر سیسا نومی بھوم وار مدھو ماسا اودھ پوری یہ چرت پرکاشا

گسائیں جی بھاکا زبان کے شاعروں میں بہت ممتاز مانے جاتے ہیں۔ انکی لکھی ہوئی رامائن کی دو کتابیں اب بھی متبرک سمجھی جاتی ہیں۔ ایک تو انکے وطن راجپور میں ہے اور دوسری شری سیتا رام جی کے مندر بنارس میں۔ ایک اور بہت پرانی کتاب مہاراجہ کاشی کے پاس بتائی جاتی ہے۔ مگر اسکی نسبت یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ گسائیں جی کی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ انکی وفات کے چوبیس برس بعد یعنی سمت ۱۷۰۴ میں خود نوشتہ نسخے سے نقل کی گئی ہے۔ گسائیں جی کی تصانیف حسب ذیل ہیں (۱) کبت رامائن (۲) رام گیتاولی (۳) دوہاولی (۴) بنے پترکا (۵) کرشن گیتاولی (۶) رام ست سئی (۷) رام لتا (۸) نہلو (۹) بیراگ سندیپنی (۱۰) بروا رامائن (۱۱) کنڈلی رامائن (۱۲) رولا رامائن (۱۳) کرکھا رامائن (۱۴) جھولنا رامائن (۱۵) پاربتی منگل (۱۶) جانکی منگل (۱۷) سنکٹ موچن (۱۸) ہنومان باہک (۱۹) رام شگناولی

گسائیں جی نے اسی گھاٹ بنارس میں ۹۱ برس کی عمر میں یعنی سمت ۱۶۸۰ میں وفات پائی جیسا کہ اس دوہے سے معلوم ہوتا ہے دوہا سمبت سولہ سو اسی۔ اسی گنگ کے تیر۔ شراون شکلا سپتمی تلسی تجیو شریر۔

ہم نے بہت کوشش و تجسس سے کام لیا مگر افسوس کہ گسائیں جی کے کچھ اور حالات دریافت نہ ہو سکے دو ایک کتابیں تلاش کیں مگر وہ ایسے بیانات سے پر ملیں کہ ہمارے دل نے انہیں صحیح تسلیم نہیں کیا۔ ہیرو دشت

واعظِ خوش بیان، طوطیِ ہندوستان، مولانا مولوی حافظ محمد عبد الرحمن صاحب راسخ مرحوم دہلوی نے ایک صاحبِ دل کے خیالات جو سفید کاغذ پر سیاہ حروف دیکھکر اُن کے دل میں گزرے پُراز عرفان نثر میں لکھے ہیں۔ مولانا مرحوم کے حقیقی بھتیجی زاد بھائی حافظ محمد عبد القدوس صاحب قدسی وکیل ریاست بہاولپور نے ان پاکیزہ خیالات کو نظم کیا ہے اور اس مجموعہ کا نام شیر و شکر رکھا ہے۔ اسلیئے ہم اسی عنوان سے نثر و نظم دونوں کو شائع کرتے ہیں۔

ایک **صاحبدل** نے سفید کاغذ پر سیاہ حرف لکھے دیکھے۔ کاغذ سے پوچھا کہ تو کس بلاء مصیبت میں مبتلا ہو کر سیاہ پڑگیا ہے۔ تجھپر ایسی کیا بن گئی ہے؟ اچھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ **کاغذی** نے تجھپر ظلم کیا ہے۔ پہلے تجھکو کوٹا پیٹا۔ پھر پانی میں ڈبویا۔ پھر دیوار پر دے مارا بعدہٗ تیرا بند بند جدا کر دیا۔"

صاحبدل

ایک **صاحبدل** کا فرضی ماجرا لکھتا ہوں میں — چند اسرارِ نہاں کو آج کرتا ہوں عیاں

ہوتے ہیں ایسے فروتن ہی ذرا عالی خیال — خود زمیں پر۔ فکرِ عالی وقفِ سیرِ آسماں

دیکھا قرطاسِ سفید اک اُسپہ کچھ حرفِ سیاہ — دفعتہً اُٹھا میانِ قلبِ مضطر سے دھواں

پوچھا **کاغذ** سے کہ تجھپر کیا بنی اے سیمتن — ماہ رو! ابرِ سیہ میں تو ہوا کیوں کر نہاں

ہاں کیا ہی **کاغذی** نے تجھپہ شاید یہ ستم — کوٹا پیٹا پہلے۔ پھر دریا میں ڈالا ہے میاں!

پھر نکالا واں سے۔ اور دے مارا اک دیوار پہ — بند بند اُس نے جُدا کر کے بنایا نیم جاں

"کاغذ

بیشک کاغذی نے مجکو ستایا ہے تکلیف دی ہے۔ مگر میں یہ تکلیفیں نہ جھیلتا تو درباریوں میں داخل نہو سکتا۔ تکلیف ہی کی بدولت میں بادشاہ کا مصاحب بن گیا ہوں۔

پس تکلیف ہو جاتے ہیں حق آگاہ بے تکلیف ۔۔۔ گدائے شاہ رہتا ہے حضور شاہ بے تکلیف

یہ تکلیفات دیتی اہل دل کو راحت جاں ہیں ۔۔۔ مطیعان نبی رہتے نہیں واللہ بے تکلیف

الٰہی کس مزے کا عشق ہے تیرا کہ خود عالم ۔۔۔ کھنچا جاتا ہے تیری سمت بے اکراہ بے تکلیف"

کاغذ

بولا قرطاس مصفا سچ کہا اے نیک دل ۔۔۔ کاغذی نے کر دیا مجکو ضعیف و ناتواں

مجکو تکلیفیں بہت پہنچی ہیں اُسکے ہاتھ سے ۔۔۔ پر نہ سہتا انکو تو دربار میں ہوتا کہاں ؟

جا رہا ہوں ان مصائب کی بدولت شاہ تک ۔۔۔ بن گیا میں اب مشیر بادشاہ نکتہ داں

سچ تو یہ ہے بے تعب جھیلے نہیں ملتا ہے کچھ ۔۔۔ تاؤ کھا کھا کر ہوا ہے سکۂ شاہی رواں

صُحاجبل

شاید جلد گر نے تجھپر ستم کیا ہے کہ شکنجے سے تجکو کاٹا۔ اجزا جدا جدا کیئے۔ شکنجے میں کھینچا۔ بازاروں میں پھرایا۔ تو اِس رنج سے سیاہ ہو گیا ہے"

صاجبل

ہاں تو مارا جلد گر نے مجکو بے تقصیر آہ ۔۔۔ کاٹ کر سیتنے سے آجزا کر دیئے تیرے عیاں

پھر شکنجے میں کسا۔ کھینچے پھرا بازار میں ۔۔۔ اِسلیئے چہرے پہ تیرے ہے سیاہی کا نشاں

"کاغذ

مجھپر یہ ظلم نہ کاغذی نے کیا ہے نہ جلد گر نے۔ یہ سب مہربانی سیاہی یعنی روشنائی کی ہے۔ اُس سے پوچھو"

کاغذ

کاغذی نے کچھ کیا نے جلد گر نے کچھ کیا ۔۔۔ سب عنایت روشنائی کی ہے یہ اے مہرباں

پوچھنا ہے آپ کو گر کچھ تو اُس سے پوچھیے کردیا جس نے سوادالوجہ مجھکو ناگہاں

صاحبدل

"اے سیاہی تُو تو چراغ کی اولاد ہے۔ تجھکو نور پھیلانا چاہیئے نہ کہ سیاہی۔ اے سیاہی تُو تو گوشہ نشین دوات۔ اور صوفی (صوف والی) ہی۔ صوفی ہوکر ایسا ظلم۔ اور چراغ کی اولاد ہوکر ایسا اندھیر کہ کاغذ کو سیاہ کردیا۔ خدا کے روبرو جانے سے شرماتے ہیں ڈرتے ہیں + جو روشن دل ہیں وہ ایسا کہیں اندھیر کرتے ہیں" +

صاحبدل

اے سیاہی روشنائی بھی تو اولادِ چراغ نور کی جا تو نے کیوں باندھا ہی ظلمت کا سماں
آسمانِ رخ پہ تیرے چھاگئی کالی گھٹا ہوگئی صورت ہی مسخ اب الحفیظ و الاماں
حیف اے روشن ضمیر افسوس ہے اے برق وش مہر تاباں ہوکے تو کیوں بن گئی زلفِ بتاں
تھی تو اک گوشہ نشینِ خانۂ چشمِ مداد تو لباسِ صوف میں گویا تھی صوفیِ زماں
اے خدا ناترس کاغذ پر یہ جورِ ناروا کیوں جوشش میں اُسکو ڈال آئی تیرا کیا زیاں

سیاہی

"میں نے جب سے سیاہی سازکے ہاتھوں تکلیف پائی ہی گوشہ نشین ہوگئی ہوں۔ دوات کو اپنا حصار سمجھ لیا تھا میں نے نیت کرلی تھی کہ اپنا کالا مُنہ کسیکو نہ دکھاؤنگی۔ مگر کیا کروں قلم نے نیزے مار مار کر مجھے گوشۂ عافیت سے نکالا۔ اور کاغذ پر ظلم کرنے کی بابت کلنک کا ٹیکا میرے ماتھے لگا دیا۔ یہ گناہ قلم کا ہی اُس سے پوچھو" +

سیاہی

چھوٹ کر جورِ سیاہی گر سے ہوں عزلت گزیں جاتی ہوں ہے دوات اپنا حصارِ دو جہاں
میری نیت میں تھا کالا مُنہ نہ دکھلاؤں کہیں پر کروں کیا مار کر نیزے قلم لایا یہاں
گوشۂ امن و اماں سے کھینچ لایا ہے مجھے اور کلنک اپنا لگایا بے گناہ بے جرم ہاں
یہ گنہ سارا قلم کا ہے اُسی سے پوچھیے ورنہ میں ہوں ضعیف ایسی بھلا ہمت تھی کہاں

صاحبدل

اے قلم! "ن والقلم" کا تاج تیرے سر پہ رکھا گیا۔ "اور السیف و القلم توامان" کا پٹکا تیری کمر سے باندھا گیا۔ بااینہمہ تُو نے سیاہ پوش صوفی کو اُسکے حجرے سے نکالا۔ اُس کا اعتکاف توڑ دیا۔"

صاحب دل

اے قلم! ہی سر پہ تیرے تاج نونِ والقلم ۔۔۔ اور ہی سیف و قلم کا توأمان تجھ پہ نشاں

باوجود ایسے فضائل کے کیا تُو نے ستم ۔۔۔ ایک صوفیِ سیہ پوش اب ہے مصروفِ فغاں

تُو نے حجرے سے نکال اُسکو کیا آوارہ گرد ۔۔۔ توڑ ڈالا اعتکاف اُس کا یہ جورِ بیکراں؟

قلم

میں تو نہروں کے کنارے کھڑا نماز پڑھ رہا تھا مجھے اس صوفی کے آزار کا خیال نہ تھا۔ مگر افسوس کاٹنے والے کے ہاتھ نے مجھے کاٹا میری نوک کو نوکِ سناں بنایا۔ اور دوات پر ظلم کیا۔ ہاتھ سے پوچھیے۔"

قلم

میں لبِ جوئے چمن استادہ مصروفِ نماز ۔۔۔ ہر گھڑی رہتا تھا محوِ طاعتِ جانِ جہاں

دھیان بھی آتا نہ تھا اِس پاک طینت کا کبھی ۔۔۔ دفعتہً مجکو بنایا دستِ قاطع نے سناں

اور سناں بھی وہ کہ ہو جائے جگر کے آر پار ۔۔۔ بزم کی جاں۔ رزم میں نوکِ سنانِ جانستاں

ہاتھ سے حضرت اگر پوچھیں تو ہو کچھ واشگاف ۔۔۔ پوچھتے ہو مجھسے کیا اے سرگروہِ عارفاں

صاحب دل

اے ہاتھ تیری انگلی میں قوت و سلطنت کی انگشتری ہے۔ تمام اعضا میں تو زبردست ہے پھر زیردست (قلم) پر یہ ظلم؟"

صاحب دل

ہاتھ لا اے ہاتھ! میں ہیہات تجھسے کیا کہوں ۔۔۔ تُو نے اِک صحرا نشیں عابد کو پہنچایا زیاں

تیری انگشتِ قوی میں مُلک کی انگشتری ۔۔۔ وہ انگوٹھی جسکو کہیئے خاتمِ پیغمبراں

تھی وہی مُہرِ سلیماں۔ اور نگینِ سلطنت ۔۔۔ اُس کو رہنا چاہیئے تھا بن کے مثلِ سائباں

زیردستوں پر زبردستوں کے ہوتے ہیں کرم ۔۔۔ تُو نے کیوں برعکس اسکو کردیا اے پہلواں

سرِ قلم کا یک قلم کر ہی دیا تُو نے قلم اور ہے سِس فعلِ قبیحہ سے ہے پشیماں

ہاتھ

میں تو گوشت یا پوست ہوں۔ مجھ میں طاقتِ قطع و برید کہاں؟ یہ کام صاحبِ دست کی طاقت نے کیا ہی۔ طاقت سے پوچھیے"+

ہاتھ

پوچھیے گا صاحبِ سید جناب من یہ حال اور بازو سے بنا ہوں جسکے ہیں مُشکل کہاں

ورنہ میں خود کیا ہوں بس اک لوتھڑا سا گوشت کا ارتکاب جُرم میں طاقت کا لیجے امتحاں

صاحبِ دل

اے طاقت! تُونے ہاتھ کو تکلیف کیوں دی محتاج کو کیوں ستایا؟"

صاحبِ دل

طاقت! اے سرپنجۂ فولاد۔ ہاں جلدی سے بول دست کو بیدست پا تُونے بنایا کیوں یہاں؟

اُسکے پیچھے لیسی پنجے جھاڑکر تُو پڑ گئی حال پہ اسکے ہیں سب انگشت حیرت دہاں

طاقت

میری کیا مجال کہ کسیکو نفع یا نقصان پہنچا سکوں بلکہ مجھکو ارادہ نے مجبور کر رکھا ہی۔ میں نے ارادہ انسانی کا اتباع کیا ہی۔ یہ سوال ارادہ سے ہو"+

طاقت

میرا کیا مقدور جو ہل بھی سکوں میں خود بخود ہاں ارادہ نے کیا مجبور مجھکو مہرباں

عزمِ انسانی کی تابع رہتی ہوں آٹھوں پہر آپ ارادہ کا قلمبند آج کر لیجے بیاں

صاحبِ دل

اے ارادے! تُو نے طاقت کو کیوں اُبھارا کہ اُس نے ہاتھ پر اور ہاتھ نے قلم پر ظلم کیا"+

صاحبِ دل

اے ارادے! تُو نے طاقت کو اُبھارا کسلیے بیٹھے بیٹھے تیرے فتنوں نے اُٹھایا آسماں

جا پڑا تو ہاتھ پر اور ہاتھ پہنچا تا قلم — ہم کہیں کیونکر نہ تجھکو بانیٔ ظلم نہاں

اُرادہ

میرے رہنے کی جگہ دل ہے۔ بغیر دل کی تحریک کے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ دل سے پوچھو"

ارادہ

میرے رہنے کی جگہ ہے بارگاہِ قلب میں — منقلب ہیں انقلابِ دل سے ہوتا ہوں میاں

آپ دل سے پوچھئے بیدل نہ کیجئے اب مجھے — میں ہوں بے تقصیر ہی اسپر ہی سب بارِ گراں

صُاحبدل

اے دل! تونے ارادے کو قلم کاٹنے پر کیوں مجبور کیا۔ تو رئیس الاعضا ہے۔ امیر و رئیس انصاف کرتے ہیں۔ نہ کہ ظلم"

صاحبدل

تُو ہے اے قلبِ بشر! اعضا میں اک عضوِ رئیس — ہو کے عالیجاہ تُو نے کیا کیا یہ ناگہاں

ہوتے ہیں اہلِ ریاست معدلت گستر بہت — پر ترا شیوہ رعیت کو ہوا ایذا رساں

دُل

اے سلیم القلب! تجکو معلوم نہیں کہ میں قلب ہوں۔ مگر مقلب القلوب کوئی اور ہے ؎

اہلِ دل را خدائے بخشندہ — دادہ بود از کرم زبانِ مقال

بر کرم صد کرم زیادت کرد — داد او را چنیں لسان الحال"

دل

اے سلیم القلب! گو کہتے ہیں مجکو قلب سب — ہے مقلب میرا لیکن اَور ہی کوئی نہاں

آنکھوں ہی آنکھوں میں بس اُسکو سمجھ لیجے حضور — چپکے ہی چپکے اسے پہچان لیجے مہرباں

بات دل کی ہو لبِ دل ہی میں رہنے دیجئے — آگے عرضِ حال کی مجھ میں کہاں تاب و تواں

تھی زبانِ حال کی کچھ مختصر سی گفتگو — بات بڑھتے بڑھتے پہنچی ہی کہاں سے اب کہاں

عبدالقدوس قدسی

ریویوز

جناب مولوی عبید اللہ خاں صاحب سابق سیکنڈ ماسٹر سنٹرل موڈل سکول لاہور حال ممبر پنجاب ٹیکسٹ بک ریویژن کمیٹی لاہور اس بات پر اردو خواں حصہ آبادی کی طرف سے خاص تحسین و شکرگزاری کے مستحق ہیں کہ اپنی فرصت کا وقت اُنہوں نے ایسی کتابوں کی تالیف و اشاعت میں صرف کیا ہے جو تعلیم کے مختلف مضامین پر مشتمل اور بچوں کے لیے بہت کچھ کارآمد و دلچسپ ہیں۔ حال میں ماسٹر صاحب ممدوح نے اپنی چند کتابیں بغرض اظہار رائے دفتر مخزن میں ارسال کی ہیں۔ اُن میں سے (۱) **حساب کا قاعدہ** ہے جس میں ایک سے سو تک گنتی سکھانے اور ہندسے لکھنے اور پڑھنے کا ایسا سہل طریق بتایا گیا ہے کہ پانچ چھ سال کی عمر کے بچے تمام اعداد و اعداد اُنکے اجزائے ترکیبی کو بخوبی ذہن نشین کر سکتے ہیں۔ ہر عدد کے ساتھ جمع تفریق ضرب تقسیم کے آسان و ضروری عمل بھی درج کیے گئے ہیں اور بڑے بڑے نقطوں اور مربع خانوں کے نقشے دیے گئے ہیں تاکہ بچے ہر ایک ہندسے کی مقررہ مقدار کو ہر پہلو سے سمجھ سکیں اور حساب کے ابتدائی و بنیادی اصول میں کبھی غلطی نہ کریں۔ اس قاعدہ حساب کی ضخامت مع سرورق و دیباچہ وغیرہ تین جزو ہے قیمت ۲ ر + (۲) **عجیب و غریب لطیفے حصہ اول**۔ اس میں بچوں کی تفریح طبع کے لیے ۵۴ دلچسپ لطیفے مندرج ہیں۔ لطیفے اکثر وہی ہیں جو عام زبانوں پر مذکور ہیں مگر اُنکے جمع کرنے میں اس امر کی پوری احتیاط رکھی گئی ہے کہ کوئی لفظ یا فقرہ یا کنایہ ایسا نہ آنے پائے جس سے معصوم بچوں کا ذہن کسی منافیٔ اخلاق یا خلاف تہذیب بات کی طرف منتقل ہونے کا اندیشہ ہو۔ عبارت بھی سلیس و آسان ہے۔ تقطیع۔ لکھائی۔ چھپائی سب بچوں کے لیے موزوں اور قیمت صرف ڈیڑھ آنہ (۳) **حکایات عجیب**۔ ۲۹ دلچسپ و نتیجہ خیز حکایات پر مشتمل ہے۔ جن میں اکثر اردو و ہندی اور معدودے چند عربی و انگریزی سے لی گئی ہیں۔ سوائے دو چار کے باقی تمام حکایتیں ایسی ہیں جنہیں پڑھکر دماغ کو فرحت پہنچتی اور لبوں پر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ دیباچہ میں تالیف کتاب کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ "جو طالب علم اسکو پڑھیں اُنکو اردو زبان دانی کا فائدہ بھی حاصل ہو اور طبیعت بھی اکتائے" باوجود اِن خوبیوں کے قیمت صرف ۲ ر مقرر ہے +

ترانۂ مسرّت

یعنے

آمدِ اقبال

اقبال کا ولایت سے بخیریت واپس آنا اہلِ دل اور اہلِ سخن کے لیے کوئی معمولی خوشی کی بات نہیں ہی۔ یہی ایک شخص ہی جس کے دم سے اُردو زبان کی اعلےٰ اصلی اور سچّی شاعری کی تمام اُمیدیں آج وابستہ ہیں۔ اِن کے واپس تشریف لانے سے اہلِ علم۔ اربابِ ذوق اور اصحابِ سخن میں ایک خاص مسرّت پھیلی ہوئی ہے راقم عرصۂ دراز سے دنیا کے دھندوں میں اسقدر گرفتار ہی کہ شغلِ سخن سے قطعی محروم ہی۔ مگر اقبال کی آمد کی خوشی نے انبالہ سے دہلی جاتے ہوئے ریل میں مندرجۂ ذیل چند سطریں لکھوا ہی لیں۔ یہ چند سطریں ۲۶۔ جولائی ۱۹۰۸ء کو درگاہ حضرت محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ مقام دہلی میں ایک ایسی بزم میں پڑھی گئیں جس میں اقبال کی شمعِ کمال کے چند پروانے جمع تھے۔ اور جہاں دن بھر اقبال کی آمد کی خوشی میں بہ مہمان نوازی حضرت خواجہ سید حسن نظامی صاحب دام فیضہٗ مہتمم توشہ خانہ حضرت محبوبِ الٰہی بزمِ احباب منعقد رہی۔ اِس بزم کے حاضرین میں سے خواجہ صاحب موصوف شیخ عبد القادر صاحب بی۔ اے۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ شیخ محمد اکرام صاحب جائنٹ اڈیٹر "مخزن"۔ مولوی محمد عبد الراشد صاحب الخیری۔ سید جالب صاحب دہلوی خصوصیت سے

فصلِ بہار آئی پھر گلشنِ سخن میں　　اِک جشن ہو رہا ہے مرغانِ نغمہ زن میں

وہ مژدۂ مسرّت لائی صبا چمن میں　　پھولے نہیں سماتے پھول اپنے پیرہن میں

گلشن کے سبز پوشو جھٹ پٹ سنگار کر لو　　عطرِ عروس مل دو پھولوں کے پیرہن میں

ہاں ہو نئی ادا سے سنبل کی کنگھی چوٹی
نرگس لگائے سُرمہ چشمان سحر فن میں

غنچوں کو حکم دیدو دیں دادِ کجکلاہی
تیکھی ادائیں نکلیں نسرین و نسترن میں

ہر غنچہ مُسکرائے ہر پُھول کِھلکھلائے
ہر برگ لہلہائے رونق رہے چمن میں

ہو اہتمام ایسا آرائشِ چمن کا
باقی رہے دقیقہ کوئی نہ بانکپن میں

سرو سہی سے کہدو ناچے ذرا لبِ جُو
قمری ترانہ گائے جلسہ اُڑے چمن میں

یوروپ کی سیر کر کے **اقبال** واپس آئے
خوشیاں منائیں ملکر اہلِ وطن - وطن میں

ہے آمد مسرت **اقبال** تیری آمد
خوشیاں ہیں اہلِ دل میں عیدیں ہیں اہلِ فن میں

سر آنکھوں پر بٹھایا یوروپ میں تجکو سب نے
غربت میں بھی رہا تو گویا سدا وطن میں

پھر تیرے دم سے ہونگے تازہ سخن کے چرچے
پھر رونقیں رہیں گی یاروں کی انجمن میں

جزیرۂ سسلی

ہمارے نہایت پیارے دوست ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے - پی - ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا خیر و خوبی سے بہزار کامیابی ولایت سے واپس آئے - اور آتے ہوئے مخزن اور قدر دانانِ مخزن کے لیے ایک قابل قدر تحفہ لائے - جزیرۂ سسلی روئے زمین کے اُن حصوں میں سے ہے - جہاں اہل عرب نے اپنی فتوحات کا جھنڈا بلند کیا اور اپنی تہذیب کی روشنی پھیلائی - اور جو انقلاب دوراں کے ہاتھوں اب اِس حالت میں ہیں کہ تاریخ داں لوگوں کے سوا اور کسی کو اُن میں اسلام کی عظمت کا کوئی نشان نظر نہیں آتا ہمارے دوست فرماتے ہیں کہ وہ رات کے وقت جہاز میں اس جزیرہ کے پاس سے گزرے اور اُسکی روشنیوں کو دیکھکر بعض خیالات اور جذبات نے یکایک اُن کی طبیعت پر ہجوم کیا - یہ نالۂ موزوں اُن ہی خیالات اور جذبات کا نتیجہ ہے *

روسے اب دل کھولکر اے دیدۂ خوننا بہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

یہ محل خیمہ تھا اُن صحرا نشینوں کا کبھی   بحر بازیگاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے   شعلۂ جانسوز پنہاں جنکی تلواروں میں تھے
آفرینش جن کی دنیائے کہن کی تھی اجل   جن کی ہیبت سے لرز جاتے تھے باطل کے محل
زندگی دنیا کو جن کی شورشِ قُم سے ملی   مخلصی انساں کو زنجیرِ توہم سے ملی

جسکے آوازے سے لذت گیر اب تک گوش ہے
وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لیئے خاموش ہے؟

آہ! اے سسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو   رہنما کی طرح اِس پانی کے صحرا میں ہے تو
زیب تیرے خال سے رخسارِ دریا کو رہے   تیری شمعوں سے تسلی بحر پیما کو رہے
ہو سبک چشمِ مسافر پر ترا منظر مدام   موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام

تو کبھی اُس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسنِ عالم سوز جس کا آتشِ نظارہ تھا

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر   داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر
آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی   ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

مرثیہ تیری تباہی کا مری قسمت میں تھا
یہ تڑپنا اور تڑپانا مری قسمت میں تھا

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں   تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں   جس کی تُو منزل تھا میں اُس کارواں کی گرد ہوں
رنگ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے   قصہ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لیجاؤنگا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رُلواؤنگا

(اقبال)

مقدم برشگال

آہ! اے ساون کے جھالو! اے فضائے برشگال
آہ! اے صحرا کے نالو! اے ہوائے برشگال

او دے اودے بادلو! آغوشِ رحمت کی قسم
تھے کہاں اگلے برس تم۔ جوشِ رحمت کی قسم

تیرے اشکوں کا کہاں تھا ابرِ گریاں سلسلہ
آنسوؤں کا خلق کے تھا تا بداماں سلسلہ

یوں نہ اُڑتے تھے ہوا میں لکۂ ابرِ سیاہ
تھی نہانے کیلئے بارانِ رحمت! تیری چاہ

سبزۂ صحرا میں یہ شانِ دل آویزی نہ تھی
جوشِ بارانِ کرم میں یہ گہر ریزی نہ تھی

لالہ و گل سے تھی خالی موجِ آغوشِ زمیں
یوں نہ تھیں پھولوں کی بیلیں دوشِ مہوشِ زمیں

لاجوردی تھیں نہ سبزو سے زمیں کی ڈھیریاں
نیلگوں تھیں خیمۂ عرشِ بریں کی ڈوریاں

جوش پر آئی ہوئی ساون کی او! کالی گھٹا
تو کہاں تھی لمبے لمبے گیسوؤں والی گھٹا

تیری جھڑیاں تھیں کہاں اے ابرِ بارانِ کرم
خلق تھی تشنہ لب سرجوشِ نیسانِ کرم

تجھکو اے ابرِ سیہ! امساکِ باراں کی قسم
نالہائے خلق کے دودِ پریشاں کی قسم

اے بہارِ عالمِ نیرنگِ پہنائے زمیں
تو کہاں اتنے دنوں سے آہ! تھا خلوت نشیں

تیری جھڑیوں کی ضرورت آہ! دہقانوں کو تھی
پیاس تیرے شوق کی سوکھے ہوئے دھانوں کو تھی

دیکھتے تھے راہ تیری سرو و ریحانِ چمن
تیرے مقدم کے تمنائی تھے مرغانِ چمن

لب پہ قمری کے صدائے نغمۂ دلجو نہ تھی
کنگرہ پر فاختہ کی صبحدم کوکو نہ تھی

بزمِ قدرت میں نہ تھی رعنائیِ رنگِ نشاط
بے صدا تھا تیرے غم میں سازِ آہنگِ نشاط

کھیلتی کالی گھٹائیں سبزہ زاروں میں نہ تھیں
آہ! یہ عالم فریبی آبشاروں میں نہ تھی

ذرہ ذرہ آہ! وقفِ بارشِ خوناب تھا
قطرہ قطرہ آہ! تیرا گوہرِ نایاب تھا

قحط کا بارِ گراں تھا بارِ عصیاں دوش پر
بارے آیا۔ شکر ہے۔ دریائے رحمت جوش پر

پھر سہانی رُت تری اے ابرِ باراں آگئی
ٹھنڈی ٹھنڈی مینہ کی پھر لیکے جھڑیاں آگئی

ڈال دی پھر تُو نے دہقانوں کے ارمانوں میں جان
پڑ گئی قدرت کے پھر زرخیز میدانوں میں جان

زندگی تھی شدتِ امساکِ باراں سے محال
تیرے آنے سے ہوئی ابرِ کرم! خلقت نہال

پھر نکالیں کونپلیں۔ پھر روپ پر آئے شجر
پھر چمن کا رنگ بدلا۔ پھر نکھر آئے شجر

لوٹتا ہے دل اداے سبزۂ کہسار پر
کردیا قدرت نے مینا وادیٔ پرخار پر

لاکھ جائیں تیرے صدقے! ابرِ نیسانِ کرم
ڈال دی مٹی میں تُو نے جان بارانِ کرم

سرور جہان آبادی

برسات

غربت میں اب کے آئے ہیں پھر دن بہار کے
قدرت نے پھینکا جامۂ کہنہ اُتار کے

پھر رنگ ڈھنگ بدلے ہیں لیل و نہار کے
پھر آئے دن بہار کے اور پھر نکھار کے

صحرا و باغ و راغ کے مقسوم کھل گئے
اب لطف دیکھنا کوئی دن میں کچھار کے

دشت و جبل ہیں فرشِ زمرد ہوا تمام
منظر عجیب ہو گئے قرب و جوار کے

جوبن پہ ان دنوں ہے عروسِ چمن کا رنگ
قرباں اس آن بان کے اور اس سنگار کے

صحنِ چمن سے اب اُٹھائے کوئی ہمیں
ہو نگے یہیں نشان ہمارے مزار کے

کوئل کی کوکو اور پپیہے کی پی کہاں!
نالے سنائی دینے لگے پھر ہزار کے

کس درجہ دلفریب ہے طاؤس کی صدا
جنگل تمام سر پہ اُٹھایا پکار کے

چمکی گھٹا میں بجلی تو جی لوٹ ہو گیا
انداز یاد آئے کسی گلعذار کے

فصلِ بہار آتے ہی فرقت ہوئی نصیب
دن تھے یہی تو لطف کے ملنے کے یار کے

اے شاد کام ہستیٔ ناپائدارِ زیست
ہم دل جلوں سے پوچھ مزے اس پھوار کے

ناکامِ آرزو ہوں میں۔ حرماں نصیب ہوں
مطرب سنائے جا مجھے نغمے ملار کے

برباد گر کیا ہے فلک نے تو یہ بھی ہو
نشتر چبھیں دل سے نقش محبت کے پیار کے

ناشاد غم نے زیست سے بیزار کر دیا
اب ہم ہیں اور قدم شہِ دلدل سوار کے

ناشاد

عالمِ نزع

نزع کا حال نہ پوچھ اے ہمدم
کیا بتاؤں کہ ہے کیسا عالم

ہوتی جاتی ہے جہاں سے دوری
اُف رے یہ بے کسی و مجبوری

بے وفا روح یہ کیا تجھکو ہوا
عمر بھر کا تھا سہارا ساتھ ترا

آج سختی ہے یہ مجھ سے تیری
ٹوٹی جاتی ہے ہر اِک رگ میری

ختم ہیں طولِ امل کی باتیں
اب نہ وہ دن ہیں نہ ہیں وہ راتیں

آج ہوتی ہے وداعِ مہمل
روح کرتی ہے سفر کا ساماں

جھلملاتا ہے چراغِ دنیا
اب لئے جاتا ہوں داغِ دنیا

فاش ہوتا ہے یہ رازِ ہستی
بے صدا ہوتا ہے سازِ ہستی

ہو گیا آئینہ حالِ دنیا
آج سُوجھا ہے مآلِ دنیا

وقت اب وہ ہے کہ مختل ہیں حواس
عقل ہے کار معطل ہیں حواس

ہے نگاہوں کی عجب کیفیت
کس قیامت کی بھری ہی حسرت

شکل موہوم ہے یہ دارِ خراب
سب طلسمات جہاں نقش بر آب

سیمیا ہے یہ نمودِ دنیا
شعبدا ہے یہ نمودِ دنیا

عبرت آگیں ہے بہارِ ہستی
کیا ہے یہ نقش و نگارِ ہستی

قصر ہیں وہ نہ طلائی ایواں
کیا بتاؤں کہ یہ کیسا تھا سماں

چاندنی ہے نہ وہ حسرتِ دل کی　　　نہ ہوا ہے نہ وہ فرحت دل کی
نہ وہ گلگشت رہی اور نہ چمن　　　نہ وہ بلبل ہے نہ وہ بوئے سمن
نہ شجر ہیں نہ گلِ تازہ و تر　　　نخلِ تابوت ہے اب پیشِ نظر
نہ وہ نہریں ہیں نہ وہ فوارے　　　نہ فلک ہے نہ فلک پر تارے
نہ وہ سیار و ثوابت کا نظام　　　نہ وہ گردش نہ وہ دورِ ایام
نہ عناصر کا زمانے میں پتا　　　آب و آتش ہے نہ ہی خاک و ہوا
نہ ہے حیوان کوئی اور نہ زمیں　　　نہ جمادات و نباتات کہیں
اب کہاں نفس نباتی کا اثر　　　اب کہاں نامیہ اور برگ و ثمر
مہر و مہ ہیں نہ بروجِ افلاک　　　نہ وہ ذرے ہیں نہ وہ طبقۂ خاک
نہ وہ لشکر نہ حصارِ سنگیں　　　نہ عمارات نہ وہ حصنِ حصیں
نہ اقالیم نہ ربع مسکوں　　　نہ سمندر ہی نہ آبِ جیحوں
ہفت جوش اب نہ معادن ہیں کہیں　　　نہ فلزات و جواہر ہیں کہیں
نہ وہ دریا ہیں نہ وہ دشت و جبال　　　نہ وہ فصلیں ہیں نہ ہیں وہ مہ و سال
نہ وہ صحرائے پر از ہول و خطر　　　نہ ہے وہ ذوق تماشائے نظر
وہ فضا ہے نہ وہ چٹیل میدان　　　وہ مناظر ہیں نہ ہیں وہ ساماں
روشیں ہیں نہ ہیں اب وہ گلزار　　　نہ وہ گنجان درختوں کی بہار
نہ وہ دل ہے نہ تماشا طلبی　　　نہ رجز ہے نہ وہ فخرِ نسبی
نہ وہ ہم ہیں نہ وہ اسبابِ نشاط　　　نہ وہ محفل ہے نہ اربابِ نشاط
نہ کلیسا ہے نہ بت خانہ ہے　　　نہ کہیں محفلِ رندانہ ہے
اب نہ وہ منطقِ اربابِ کمال　　　نہ وہ صوفی ہیں نہ وہ صحبتِ حال
حافظہ ہے نہ تصور ہے کہیں　　　واہمہ ہے نہ تخیل ہے کہیں

ہجر ہے اب نہ وہ فریاد کا غل — رات ہے اور نہ خیالِ کاکل
نہ وہ کسک بکی ہے نہ وہ زورِ شباب — عشق ہے اور نہ دلِ خانہ خراب
اب نہ پہلو میں بُتِ نو آئیں — اب نہ وہ شب ہے نہ خوابِ نوشیں
جستجوئے دلِ گم گشتہ کہاں — اب نہ میں خود ہوں نہ اُس دل کا نشاں
دو گھڑی تک تھی مری شانِ وفا — اب وفا ہے نہ وہ پیمانِ وفا
نہ خیال اب دلِ سودائی کا — نہ میں قائل ہوں مسیحائی کا
کوچہ گردی ہے نہ وہ جوشِ جنوں — اب نہ رگ رگ میں ہے وہ گردشِ خوں
ہوں نہ خمیازہ کشِ لذتِ دید — نہ سمجھتا ہوں میں نظارۂ عید
دل جو اک وحشیِ رم خوردہ تھا — کیا عجب پاس ہمارے ہوگا
میں کہاں اور کہاں طولِ امل — اب تو ہے فکر مکافاتِ عمل
اپنی حالت پہ میں روؤں کیونکر — اپنی غفلت پہ میں روؤں کیونکر
میں ہوں اور عاقبت کار کی فکر — گوشۂ تارِ لحد کے کچھ ذکر
دیکھیے دیکھیے ہے کیا ہونا — ہے مجھے جان کا اپنی رونا

کچھ یونہی سا مجھے آتا تھا نظر
دیکھتا تھا یہ طلسمی منظر

دفعتہً نور ہوا سب زائل — اک حجاب آ کے ہوا ہے حائل
سب یہ نقشہ مری آنکھوں سے چھپا — پردۂ عالمِ تصویر اُٹھا
ہیچ سے ہیچ تھے سب یہ ساماں — ہم نہیں جب تو ہی کیا خاک جہاں
دیکھ لو دیکھنے والو صورت — آج تو میں ہمہ تن ہوں عبرت
محفلِ عیش ہے درہم برہم — اب ہے آرایشِ بزمِ ماتم
گھیرے بیٹھے ہیں احبا سارے — روتے جاتے ہیں اعزا سارے

اب دعاؤں کی فراوانی ہے — مشغلہ سب کا مگس رانی ہے
دیکھتے جاتے ہیں صورت میری — زیر تجویز ہے تربت میری
شور گریہ مرے سر پر ہے بپا — ایک ہنگامۂ محشر ہے بپا
غور سے دیکھ ذرا اے غافل — زور تدبیر یہیں ہے باطل
سر بالیں ہے ہجوم حسرت — دم بخود چارہ گروں کی صحبت
ہیں اسی فکر میں احباب اکثر — ڈوبیں نبضیں مری ابھریں کیونکر
کھولا جاتا ہے وصیت نامہ — کوئی لکھتا ہے شہادت نامہ
فکر کا فور و کفن میں کوئی — نالہ کش بیت حزن میں کوئی
کوئی کہتا ہے بصد آہ و فغاں — اسکی مشکل ہو الٰہی آسان
روح کا قول ہے یہ وقت اخیر — خواب ہستی کی یہی ہے تعبیر
پوچھتے کیا ہو مرا حال خراب — میں ہوں اور داغ فراق احباب
سر بالیں ہے مرے اک صحبت — دیکھوں کس طرح میں سب کی صورت
نور تھا آنکھ میں اب وہ بھی نہیں — زلف آراستہ کھلتی ہے کہیں
کہہ دو زلفوں کو نہ کھولیں للہ — میری نظروں میں زمانہ ہے سیاہ
شرح بے ربطی اجزائے حواس — اب لگا ہوں کہ مری کرے قیاس
دامن اشکوں سے بھگونیوالے — اے مرے حال پہ رونیوالے
کیا کہا میں نے بتاؤں کیونکر — سرگزشت اپنی سناؤں کیونکر

قوت نطق گئی سب میری
بند ہوتی ہے زباں اب میری

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

تازہ غزلیں

دخل ہے ہر دلمیں ابتک ذوقِ غم پیچیدہ ہے
بُلبلا ہے عین دریا میں مگر نم دیدہ ہے

دیجئے کس چیز سے تشبیہ تیرے حسن کو
ایک تو ہی دیدہ ہے تیرے سوا نادیدہ ہے

بے حجابی یہ کہ ہر صورت میں جلوہ آشکار
گھونگھٹ اُسپر یہ کہ صورت آجتک نا دیدہ ہے

فتنۂ زارِ حشر سب سمجھے تھے تیرے حسن کو
دامنِ تارِ نگہ کا گوشۂ جنبیدہ ہے

حشر میں مُنہ پھیر کر کہنا کسی کا ہائے ہائے
آسیؔ گستاخ کا ہر جرم نابخشیدہ ہے

آسی

مانا تمام خلق سے تو بے نیاز ہے
تیرا نیاز مند ہوں یہ مجکو ناز ہے

اُٹھ جائے بزمِ مَے سے جو بے امتیاز ہے
خلوت پسند صحبتِ افشائے راز ہے

تیرے فقیر دولتِ طاعت سے ہیں غنی
داغِ سجود درہم اہلِ نماز ہے

شاید یہ نردبان ہو بامِ وصال کا
عالم تمام کوہِ نشیب و فراز ہے

سرمایۂ غنا ہے ترقی احتیاج
جو فقر میں فنا ہو وہی بے نیاز ہے

وہ محوِ رنگ خندہ ہی یہ محوِ ذاتِ گل
بلبل میں اور غنچہ میں یہ امتیاز ہے

کیوں سدِ راہ میکدہ ہوتا ہی محتسب
پوچھو کہ بند ہی کہ درِ توبہ باز ہے

تکلیف ہی وطن میں زیادہ سفر میں کم
نکلو تو عینِ راہ میں قصرِ نماز ہے

قائل ہی نیک و بد میں تجلیِ حسن کا
کاشف کی کیا سند کہ وہ بی امتیاز ہے

کاشف غازیپوری

رکھنا خمِ گیسو میں یا دل کو رہا کرنا
کچھ کہہ تو سہی ظالم آخر تجھے کیا کرنا

آتا ہے سوا اسکے اور آپکو کیا کرنا
اپنوں کو بُرا کہنا غیروں کا بھلا کرنا

مجھ سے ہی جدا رہنا مجکو ہی جُدا کرنا
پھر اُس پہ یہ طُرّہ ہے میری ہی گلا کرنا

اب قتل مجھے کرنا - یا عفوِ خطا کرنا
منظور ہی جو کرنا پھر سوچ ہی کیا کرنا

آئینہ میں عکس اپنا دیکھا تو کہا مجھ سے
دونوں میں ہی کون اچھا انصاف ذرا کرنا

بوسہ بھی مجھے دینا ہونٹوں میں ہی کچھ کہنا
جینے کی دوا دینا مرنے کی دعا کرنا

دل تو نہ مرا توڑو - وعدہ تو ذرا کر دو
چاہو تو وفا کرنا - چاہو نہ وفا کرنا

کیوں ہوتے ہو میرے اوروں سے غرض رکھو
مجھ پر ہی ستم ڈھانا مجھ سے ہی وفا کرنا

ہم سے بھی یہی وعدے تھے ہم سے بھی یہ پیماں تھے
یوں ملکے دغا دینا یوں ملکے دغا کرنا

کیا مجھ سے زیادہ ہے پابندِ وفا کوئی
ایمان سے تم کہنا - انصاف ذرا کرنا

جلتے ہو جو گھر جاؤ پر وعدہ یہ کر جاؤ
میں یاد جب آجاؤں مرنیکی دعا کرنا

ہے غیر کے ماتم میں یہ آہ و فغاں ناحق
اب مجھ پہ کرم کرنا اب مجھ سے وفا کرنا

رک رک کے یہ ملنا کیا مل مل کے یہ رکنا کیا
کیوں کھل کے نہیں کہتے آخر تمہیں کیا کرنا

وہ ہم سے جو کھنچ بیٹھے قسمت کی یہ خوبی ہے
بیکار ہے غم کھانا بیجا ہے گلا کرنا

انکو ہی ادھر یہ ہٹ پامال کریں اسکو
دل کو ہی ادھر یہ ضد - ان کا ہی کہا کرنا

میں وہ کہ مجھے مشکل دل دیکے جو پھر مانگوں
تم وہ کہ تمہیں آساں دل لیکے دغا کرنا

ترچھی تری چتون نے لاکھوں ہی کئے بسمل
اے ترک ترا ناوک کیا جانے خطا کرنا

دل تم کو یونہیں دینگے کیا عہدِ وفا لیں گے
تم جور و جفا کرنا یا مہر و وفا کرنا

ہے وصل کی شب تم کو افسوس حجاب اتنا
کس شرع میں جائز ہے خلوت میں حیا کرنا

صیاد تو مرا یارب پھندے میں پھنسا کر کے
ہر ایک سے کہتا ہے اب چاہیئے کیا کرنا

یاں وعدہ وفا ہوگا یا حشر پہ رکھو گے
میں بھی تو سنوں تم کو منظور ہے کیا کرنا

دشوار ہے اتنا ہی دل کا مجھے سمجھانا
جتنا تمہیں مشکل ہے وعدے کا وفا کرنا

نعش اُٹھتی ہے دشمن کی آؤ دوستی
پھر آکے کیا کرنا پھر ہاتھ ملا کرنا

سہتے بھی جفا انکی کرتے بھی وفا ان سے
دل کی بھی خوشی کرنی انکا بھی کہا کرنا

قرباں میں عصیاں کے بخشش کی ملی دولت + صد شکر کہ محشر میں کام آیا خطا کرنا + بیداد کا اب شکوہ بیجا ہے نسیم اُن سے + تھا تم کو محبت کا اظہار ہی کیا کرنا + نسیم بھرتپوری

رسالہ عصمت

پر ملک کے متقدر اخبارات کی رائوں کا اقتباس

ہندوستانی خواتین کا ایک نیا رسالہ! عصمت - بقول

ایک معصر کے - ایک نئے رسالہ کا نام ہے جو شیخ محمدؐ اکرام صاحب کی ایڈیٹری میں مخزن پریس دہلی سے نکالا ہے - یہ جدید ماہوار رسالہ خاتون علیگڑھ و تہذیب نسواں لاہور کی مانند مستورات کے لئے جاری ہوا ہے اور پہلا پرچہ بہت اچھا نکلا ہے - سرورق ہلکے گلابی رنگ کا ہے جس کی جدول میں سنہری بیل بنی ہوئی ہے - عنوان پر "عصمت" نام روپہلی حرفوں میں لکھا ہے اور رنگین باریک کاغذ کی نقر فریب نقاب پورے سرورق کی پردہ دار ہے - سرورق کے بعد فہرست مضامین آتی ہے اور اس کے آگے روضۂ تاجگنج آگرہ کا نقشہ لگا ہوا ہے - مضامین میں مضمون زنانہ اہلِ قلم کے لکھے ہوئے ہیں - اُن کے بعد نظمیں ہیں جنمیں سے ایک ایڈیٹر صاحبہ تہذیب نسواں کی طبعزاد ہے - پھر کتنی ہی رائیں درج ہیں جو خواتین نے اس رسالہ کے باب میں ظاہر کی ہیں - سارے رسالے میں ۴۸ صفحے ہیں اور سالانہ قیمت صرف ؏ قرار دیگئی ہے - اڈیٹر صاحب کی اہلیہ بھی ترتیب رسالے میں اُنکی شریک ہیں - اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس نئے رسالے کو ہندی خواتین میں بہت بڑی کامیابی حاصل ہوگی - ہندوستان میں ایسے پرچوں کی بہت کچھ ضرورت ہے!

(پاونیر مورخہ ۲ - جولائی ۱۹۰۸ء)

عصمت - اُردو خوان پبلک جن احسانات کثیر کے متعلق مخزن پریس دہلی کی منت پذیر ہے - اونہیر رسالۂ مذکور کے منتظموں نے ایک اول درجے کا پرچہ خواتین نکالکر اندنوں ایک اور اضافہ کیا ہے - اس ملک کے اندر تعلیم نسواں ہنوز درماندہ حالت میں ہے اور زنانہ رسالے بہت تھوڑے نکلتے ہیں - یہ قلیل تعداد کے موقت الشیوع پرچے اپنے اپنے طریقے پر بہت مفید کام کر رہے ہیں اور تعلیم نسواں کے مقصد کو ہردل عزیز بنانے میں اُنہوں نے بہت کوشش کی ہے - لیکن عصمت یورپ کے اعلیٰ درجے کے رسالجات خواتین کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ مسٹر و مسز محمد اکرام کو اُن کی مشترکہ محنتوں کے نتایج پر داد و مبارکباد دینے میں ہم ایک ایسا فرض ادا کر رہے ہیں جو اُن کا پبلک کے ذمے ہے یہ ماہوار رسالہ اپنی عمدہ ترتیب - اچھے کاغذ اور پسندیدہ تصاویر سے عظیم الشان کامیابی کے آثار ظاہر کرتا ہے اور جو پہلا نمبر انہی روزوں شایع ہوا ہے اُس کا ریڈنگ میٹر (مضامین) بھی بہترین قسم کا ہے - سالانہ چندہ دستے ہے جو عصمت کی وضع کے ماہوار رسالے کی بہت ہی مناسب قیمت ہے - ہم مخزن پریس کی اس تازہ کوشش کے لئے یقیناً ہردلعزیزی و درازیٔ عمر کا حکم لگا سکتے ہیں -

(آبزرور لاہور مطبوعہ ۲۰ جون ۱۹۰۸ء)

عصمت - اِس مہینے میں شیخ محمد اکرام صاحب کے اہتمام سے ایک نیا ماہواری رسالہ اس نام سے مخزن پریس دہلی سے نہایت آب تاب کے ساتھ نکلنا شروع ہوا ہے یہ رسالہ خاتون اور تہذیب نسواں کی طرح عورتوں میں پاکیزہ خیالات - اور مفید معلومات شایع کرنے کے لئے نکالا گیا ہے - اس کا سرورق گلابی رنگ کا نہایت خوشنما اور نفیس ہے - جس کے گرد سنہری بیل کھینچی گئی ہے اس کی پیشانی پر عصمت - کا لفظ نقرئی روشنائی سے دکھائی دیتا ہے - سرورق

سے کے خوبصورت چہرے پر نہایت پتلے گلکار کاغذ کا پردہ ڈالا گیا ہے۔ سرورق کے بعد فہرست مضامین اور اس کے بعد روضۂ تاج محل آگرے کی عکسی تصویر نظر آتی ہے۔ پھر رسالے کے اصلی مضامین شروع ہوتے ہیں۔ منجملہ تمام مضامین کے آٹھ مضامین خود عورتوں کے قلم سے نکلے ہیں۔ پھر نظمیں درج کی گئی ہیں جن میں سے ایک نظم ایڈیٹر صاحبہ "تہذیب نسواں" کی ہے۔ اس کے بعد "بزم عصمت" کے عنوان سے بہت سی روشن خیال عورتوں کے خطوط کا اقتباس درج کیا گیا ہے۔ جو انہوں نے رسالے کے خیر مقدم میں لکھے ہیں۔ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ اور کاغذ نہایت لطیف ہے۔ تقریباً ۴۰ صفحات پر یہ کل مضامین پھیلتے ہیں۔ قیمت صرف ۳ روپے سالانہ معہ محصول ڈاک ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب کے ساتھ مسز محمد اکرام بھی اس رسالہ کے کام میں ان کی معاون ہیں۔ رسالے کی مجموعی حالت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ مخزن کی طرح خوب ترقی کریگا۔ اور جس طرح مخزن نے مردوں کی سوسائٹی میں شہرت حاصل کی ہے۔ اسی طرح یہ رسالہ عورتوں کی سبھا میں حسن قبول حاصل کریگا۔ عورتوں کی فائدہ رسانی کے لئے ابتک بہت کم اردو اخبار اور رسالے شایع ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ رسالہ یقیناً بہت مقبول ہوگا۔ اس میدان میں جسقدر رسالے اور اخبار کام کرتے نظر آئیں وہ ہر طرح مبارکباد کے لائق ہیں۔ کیونکہ عورتوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے اور ان میں مفید اور دلچسپ اور پاکیزہ معلومات کے شایع کرنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

(علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ)

عصمت - ہم نے مخزن میں اس اعلان کو بڑی مسرت سے پڑھا تھا کہ ہمارے نوجوان عزیز شیخ محمد اکرام صاحب اڈیٹر ثانی مخزن مسلمانان خواتین کے لئے ایک

رسالہ عصمت جاری کرنے والے ہیں گو تہذیب نسواں۔ خاتون۔ اور پردہ نشین
کی موجودگی میں فی الحال چوتھے رسالے کی ضرورت یا مقبولیت پر شبہ ہوتا تھا۔
کچھ تو اس لحاظ سے کہ اس طرح قوم کی قلیل قوتوں کو تقسیم کرنا مفید نہ ہو گا۔
اور کچھ اس خیال سے کہ تعلیم یافتہ مسلمانان خواتین جنکی تعداد بدقسمتی سے محدود ہے
عصمت کی معاونت بھی کرسکیں گی ؟ عصمت کا پہلا نمبر آخر ش نکلا اور اس وقت
ہمارے سامنے ہے۔ اس نے ہمارے پہلے خیالات کو بالکل بدل دیا اور یقین
دلا دیا کہ جس پر واز پر یہ اٹھایا گیا ہے۔ اگر اس کو ترقی دیگئی تو اس میں دوسرے
رسالوں کے مقابلہ پر ایک ممتاز درجہ حاصل کرنے کی استعداد موجود ہے۔
سب سے پہلے رسالوں کی جو چیز دیکھنے والے کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے
وہ اس کی لکھائی چھپائی کی نفاست اور کاغذ کی عمدگی ہے۔ جو کچھ دنوں سے
مخزن پریس کی امتیازی خصوصیت بنتی جاتی ہے۔ رسالہ سفید چکنے ولایتی کاغذ
کی $\frac{22 \times 18}{8}$ تقطیع کے ۵۶ صفحوں پر چھپکر شایع ہوا ہے۔ سرخ و سبز خالدار
کاغذ پر نازک سنہری بیل کے اندر روپہلی حرفوں میں "عصمت" لکھا ہوا ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ کسی چابکدست صناع نے قدرت کے فوق البھڑک دامن پر
ہلکی مرصع کاری کر دی ہے۔ غرض کہ ٹائٹل پیج کو دیکھکر آنکھوں کو فرحت
ہوتی ہے۔ اور ایڈیٹر عصمت کے اس دعوے میں کہ سرورق ایسا ہو گا جو
اُن ہاتھوں میں جانے کے لئے موزوں ہو جنکے لئے یہ رسالہ مقصود ہے۔
ذرہ بھر مبالغہ نہیں پایا جاتا۔ اب رہی ترتیب مضامین۔ گو اہمیت میں یہ سب
سے پہلے ہے مگر رسالے کی دلآویزی اور حسن نے ہمارے قلم کو اپنی طرف
متوجہ کر کے ترتیب میں پہلا درجہ حاصل کر لیا۔ مگر پھر بھی ہم ایسے ظاہر پرست
نہیں ہیں۔ کہ حسن سیرت جیسے مسلمہ اور زریں مسئلہ کو نظر انداز کر دیں۔

اس نمبر میں، اسرخیاں ہیں جنمیں بعض خاص قابلیت سے لکھی گئی ہیں۔ کچھ حصہ نظم ہے۔ اور نظمیں سب ایسی ہیں جو شریف خواتین کے مطالعے کے قابل ہوسکیں۔

(اخبار وکیل امرتسر)

عصمت - مخزن پریس دہلی سے اردو میں مستورات کے واسطے ماہوار بنام سے رسالہ نکلنا شروع ہوا ہے نہایت خوشنما کتابی تقطیع پر معہ ٹائیٹل و تصویر تاجگنج آگرے کے چار جز ضخیم ہے۔ مخزن پریس کی لکھائی چھپائی نے جو شہرت حاصل کی ہے اس رسالے کے شیوع نے اُس کو اور زیادہ کر دیا ہے حقیقتاً عصمت کے دیکھنے سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور پیدا ہوتا ہے۔ نثر۔ نظم اور بزم عصمت تین حصوں پر یہ رسالہ تقسیم ہے۔ معزز طبقے کی خواتین کے طبعزاد مضامین کے علاوہ مردوں کے مضامین میں سادہ نظمیں بھی ہیں۔ تمام مضامین قابل دید ہیں۔ ہاف ٹون تصویر ہے۔ رسالہ کی زبان نہایت سلیس اور سادہ ہے ٹائیٹل مطلا چھاپا گیا ہے حقیقت میں عورتوں کے واسطے یہ ایک بہترین رسالہ ہے۔ اور ملک کو ایسے رسالے کی قدر کرنی چاہئے۔ شیخ محمد اکرام صاحب اس کے ایڈیٹر و مسز محمد اکرام صاحب اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں قیمت سے رسالہ ہمارے خیال میں مناسب ہے۔ ہم اس رسالہ کو روزافزوں ترقی پر پہونچنے کے دل سے خواہاں ہیں۔ شریف بیبیوں اور کنواری لڑکیوں کو ضرور منگانا چاہئے۔

(نیر اعظم مراد آباد)

عصمت - یہ چار جزو کا وہ رسالہ ہے جو دفتر مخزن سے مستورات کے لئے ماہوار نکلنا شروع ہوا ہے جس کے ایڈیٹر شیخ محمد اکرام اور اسسٹنٹ ایڈیٹر مسز اکرام ہیں۔ پہلے نمبر میں جو جون ۱۹۰۸ء کا ہے علاوہ مردوں کے آٹھ مضامین صرف مستورات کے قلم سے نکلے ہوئے ہیں۔ تین نظموں میں سے ایک نظم ایک معزز خاتون

کی ہے۔

روضۂ تاج محل آگرے کی عکسی تصویر بھی رسالے کے ساتھ ہے جسکا حال شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر نے لکھا ہے۔ لکھائی چھپائی بہت عمدہ قیمت سالانہ تین روپے معہ محصول اور فی پرچہ چار آنے ہے۔

(پیسہ اخبار لاہور)

عصمت - مولوی شیخ محمد اکرام صاحب اور اُن کی معزز خاتون کے اہتمام سے یہ ماہوار رسالہ جون سے نکلنے لگا ہے۔ اس کا ٹائٹل پیج مخزن پریس کی اعلیٰ دستکاری کا نمونہ ہے اور لفظ عصمت کی سادگی اور پوری لوح کی نزاکت چاہتی ہے کہ ہم اس کے متعلق جو کچھ لکھیں خط نور ہیں پر جبرئیل کے قلم سے لکھیں۔ صنف نازک (عورت) کی رعایت سے جتنی نزاکت اس کی لوح میں صرف کی گئی ہے۔ اور جو رنگ آمیزی اور مینا کاری رنگین مزاج عصمت مآب خاتونانِ ہند کے دستِ نازک میں جانے کے واسطے صرف کی گئی ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ کم سے کم دو چار کالم اس کی تعریف میں ہم صرف کردیں مگر آجکل کی انشا پردازی کا کچھ اور ہی دعویٰ ہے۔ اسلئے ہم مختصر الفاظ میں یہ کہدینا چاہتے ہیں کہ ایسا خوشنما ایسا پیارا ایسا دلچسپ رسالہ جس میں اعلےٰ مضامین اور خاتونان ہند کی تعلیم و تربیت کے لٹریچر کے سوا ولایتی چکنا کاغذ لگایا جاتا ہے اور تمام ظاہری خوبیاں پیدا کرنے میں ایڈیٹری چوٹی کا زور صرف کردیا جاتا ہے۔ تین روپے میں بہت ہی ارزاں اور سستا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ رسالہ ترقی کے مراتب طے کرے اور ہندوستان میں بہت جلد پھلے پھولے اور صنف نازک کے سنوارنے میں مشاطہ قدرت کا کرشمہ ثابت ہو۔

(مشرق گورکھپور)

عصمت - ایک نیا رسالہ ہے جو کارپردازان مخزن پریس کی خوش سلیقگی اور
علمی مستعدی کا تازہ ثبوت ہے۔ اگرچہ ملک میں متعدد رسالے ایسے نکل رہے
ہیں جنکا موضوع عالم نسواں ہے اور انمیں سے اکثر لائق ہاتھوں میں ہین لیکن
ابھی ایک ایسے رسالے کی کمی تھی جو تمام ملک کی شریف عورتوں کی بڑھتی علمی
ضرورتوں کا کفیل ہو۔ اس کمی کو عصمت نے بوجہ احسن پورا کیا اور پہلا نمبر جو ہمارے
پاس پہونچا ہے صوری و معنوی ہر ایک اعتبار سے شریف اور صحیح المذاق خاتونوں
کے ہاتھوں میں جانے کے قابل ہے اور اس کامیابی پر جو اسکی ترتیب میں شیخ
محمد اکرام صاحب اور اُنکی اہلیہ محترمہ کو ہوئی ہے ہم دونوں کی خدمت میں تہ دل
سے مبارکباد عرض کرتے ہوئے امید کرتے ہیں کہ وہ آیندہ نمبروں کو اور
بھی زیادہ دلچسپ بنا سکیں گے۔

دکن ریویو ماہ جولائی سنہ ۱۹۰۸ء

عصمت - مخزن پریس دہلی نے جو سنہء سے یہ رسالہ عورتوں کے لئے
شایع کرنا شروع کیا ہے ایڈیٹر مسٹر محمد اکرام ہیں۔ رسالے کا آغاز بہت اچھا ہے
ملک کی معزز خاتونوں نے مالی اور قلمی امداد سے حوصلہ افزائی کرنے کا وعدہ کیا ہے
مضامین کے انتخاب میں عورتوں کے فائدہ اور مذاق کا لحاظ کیا جاتا ہے کاغذ
لکھائی اور چھپائی اعلےٰ درجے کی ہے۔ سالانہ قیمت سے ر

زمانہ کانپور
جولائی سنہء

رباعیاتِ اکبر

خان بہادر سید اکبر حسین صاحب پنشنر جج کی رباعیوں کی ایک خوشنما بیاض مخزن پریس دہلی سے ہمارے پاس آئی ہے۔ اس بیاض کا ظاہری حسن اوّل نظر میں جذبات کو بڑھا دیتا ہے۔ سادہ لوح پر خوشنما مگر نازک مینا کاری کا رنگ اور نستعلیق خط کی نوک پلک دل پر خاص اثر پیدا کرتی ہے - ۱۶۴ رباعیاں اور قطعے اس بیاض میں ہیں - اور شروع میں ایک مختصر دیباچہ مولوی عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا نے لکھا ہے -

(اخبار مشرق مورخہ ۱۲ جولائی ۱۹۰۸ء)

رباعیاتِ اکبر کے نام سے کارپردازانِ مخزن نے مولانا اکبر حسین صاحب کی رباعیات جلی خط میں جس کی پاکیزگی اور آب و تاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ایک چھوٹی سی خوشنما اور مجلد کتاب کی شکل میں شایع کی ہے - شروع میں مولوی شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا کا ایک جامع دیباچہ ہے - قیمت بارہ آنے جو اس کتاب کی خوبی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں -

(دکن ریویو - اگست ۱۹۰۸ء)

ستمبر ۱۹۰۸ء

ایڈیٹر شیخ عبدالقادر

پرنٹر شیخ محمد اکرام

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

نثر

تصویر شیخ الاسلام مسٹر عبداللہ کوئیلیم

رنگ و نیرنگی - مولوی اشرف حسین صاحب بی اے (دہلوی) ۱

سودائے سنگین - سید سجاد حیدر صاحب بی اے ازمنصوری ۸

مالوہ کی سیر - مولوی سعید احمد صاحب مارہروی ۲۳

کشمیری پنڈتوں کی رسم شادی - پنڈت شیو نرائن شمیم ۳۴

سرائے کا نقشہ برسات میں - میر باقر علی داستان گو دہلی ۳۸

روپیہ پیسہ کے معاملات - مسٹر نذر محمد صاحب بی اے ۴۲

چند گھنٹے لورپول میں - شیخ عبدالقادر بی اے ۵۵

نظم

پھولوں کی تعریف میں - نواب سراج الدین احمد خاں سائل (دہلوی) ۶۱

اقبال کا خیر مقدم - حامد حسن قادری

تصویر قناعت ۶۳

برکھارت - محمد مسلم عظیم آبادی ۶۴

سرجان مور کا جنازہ - مولوی محمد اسمعیل بی اے ۶۶

مرغابی - سرور جہان آبادی ۶۷

تازہ غزلیں - ہدف - عنبر - رونق - شیدا

دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ● ان شہروں میں اردو مروج ہے ◐ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے ○

باہتمام شیخ محمد اکرام مخزن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا

قیمت سالانہ معہ محصولڈاک قسم اول ۵ روپے فی پرچہ ۸؍

چیف کورٹ پنجاب کے سابق محترم جج

یعنی

آنریبل خان بہادر مولوی محمد شاہدین صاحب بیرسٹر ایٹ لا فیلو پنجاب یونیورسٹی و رئیس اعظم لاہور

فرماتے ہیں کہ

مخزن حکمت یا گھر کا ڈاکٹر و حکیم مصنفہ خانصاحب **حکیم و ڈاکٹر** غلام جیلانی "شمس الاطباء" فی الواقع اپنی طرز کی پہلی کتاب اور ایک بےنظیر تصنیف ہے۔ اس کتاب میں تمام ڈاکٹری و طبی اصطلاحات کو اردو مترادف الفاظ میں تحریر کیا گیا ہے اور اس میں جو ابواب تشریح جسم و افعال الاعضاء ہیں اور جنمیں بہت سی سادہ و رنگین تصاویر ہیں وہ نہایت دلچسپ و سبق آموز ہیں میری رائے میں

مخزن حکمت

مجموعی حیثیت سے ایک عجیب و غریب بیش قیمت اور قابل قدر کتاب ہے اور اگر وہ ہندوستان میں "طب خانگی و حفظ صحت" کی دیگر ہر دلعزیز کتابوں سے بہت جلد سبقت نہ لیجائے تو مجھے سخت تعجب ہوگا **مخزن حکمت** کی ایک جلد ہر تعلیم یافتہ ہندوستانی کے کتب خانہ میں ضرور ہونی چاہیئے۔" حجم کتاب ۱۲۷۶ صفحات

قیمت للعہ مجلد للعہ

ملنے کا پتہ:- دفتر جناب شمس الاطباء (گمٹی) لاہور
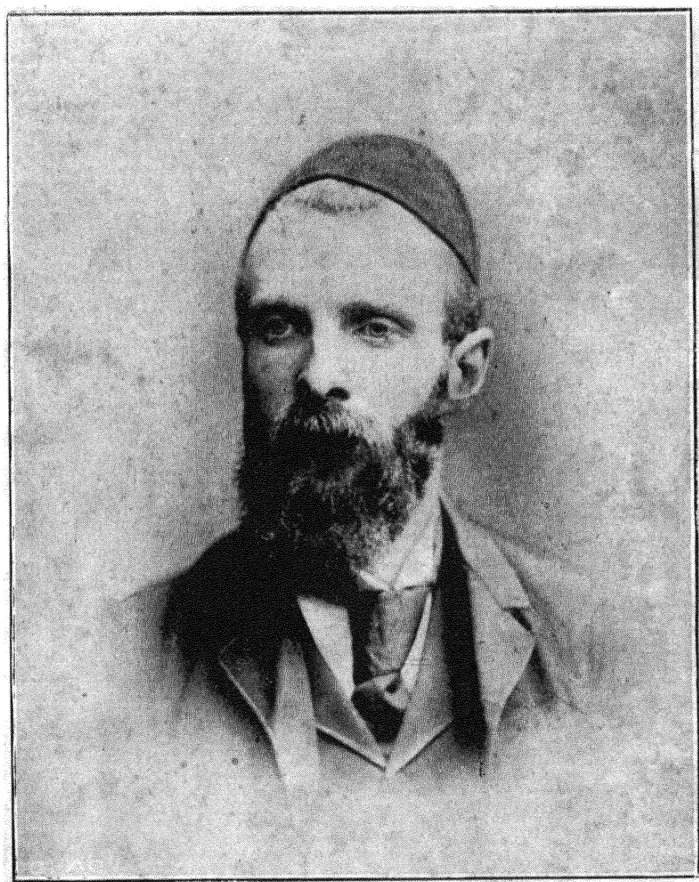
مسٹر عبداللہ کوئیلم شیخ الاسلام انگلستان

رنگ و بیرنگی

دنیا میں جتنے رنگ ہیں سب کا ظہور روشنی پر موقوف ہے۔ جتنے زور کی روشنی ہوگی اتنا ہی صاف ہر چیز کا رنگ نظر آئیگا۔ مدھم روشنی میں رنگ بھی ماند معلوم ہوتا ہے اور اندھیرے میں تو نیلا لال زرد کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ اس مناسبت سے خیال گذرتا ہے کہ رنگ کو روشنی سے کچھ نہ کچھ نسبت ضرور ہے۔ کسی بفکرے کے سامنے یہ گفتگو ہو تو چھوٹتے ہی کہیگا "میاں اندھیرے میں تو آدمی کو قلعہ نہیں سوجھتا تم رنگ کو لئے پھرتے ہو" لیکن اگر دنیا میں سب ایسے ہی آزاد اور عقل کے دشمن پیدا ہوتے تو خدا کی خدائی کبھی ایسی آباد نہ ہوتی۔ کارساز عالم نے دنیا کا انتظام ایسے اصول پر رکھا ہے کہ سرسری نگاہ سے دیکھئے تو ہر بات معمولی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جتنا عقل کو دخل دیجئے بات میں سے بات نکلتی آتی ہے یہانتک کہ رفتہ رفتہ بات کا دفتر بن جاتا ہے۔ ذراسی مشابہت یا مخالفت دو چیزوں میں ہونی شرط ہے پھر اُس میں جتنی غور و فکر کی جائے تھوڑی ہے جس قدر جس کے ذہن کی رسائی ہے قدرت کے کرشمے اُسی قدر اُس کو نظر

آنے لگتے ہیں۔ فلسفہ طبیعیات کے عالموں نے صدہا عملی و نظری دلایل سے پایۂ ثبوت کو پہونچایا ہے کہ رنگ کوئی مادّی شے نہیں بلکہ خود روشنی کا جزو ہے۔ طبیعیات کی کتابوں میں لائیٹ یعنی ضیا یا روشنی کے نام سے ایک باب الگ ہی ہوتا ہے بلکہ اکثر محققین نے کتابیں کی کتابیں اسی مضمون سے پر کر دی ہیں۔ یہاں روشنی کے چند خواص نہایت اختصار کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔

کسی روشن چیز کی طرف دیکھئے تو اُس میں سے باریک باریک روشنی کے خط جھاڑو کی تیلیوں کی طرح نکلتے معلوم ہوتے ہیں۔ ان خطوں کو شعاع یا کرن کہتے ہیں۔ ایک چیز کی روشنی دوسری چیزوں پر ان شعاعوں ہی کے ذریعے سے پہونچتی ہے۔ شعاعیں جب کسی شئے پر پڑتی ہیں تو کچھ اُس پر سے منعکس ہوکر دوسری چیزوں پر چلی جاتی ہیں کچھ اُسی شے کے اندر جذب ہو جاتی ہیں کچھ اُس کی سطح بیرونی پر پھیل کے رہ جاتی ہیں اور اگر وہ شئے لطیف و شفاف ہے تو کچھ شعاعیں پار بھی نکل جاتی ہیں اس تقسیم سے باری تعالیٰ کی ظاہری مصلحتیں یہ ہیں۔

۱۔ جہاں روشنی براہ راست نہیں پہنچ سکتی وہاں بھی خاصا اُجالا ہوتا ہے اگر آفتاب کی شعاعیں منعکس ہو کے نہ پہنچیں تو کمرے دالان سائبان میں دن کے وقت بھی اندھیرا گھُپ ہوا کرے +

۲۔ اگر جذب نہ ہوں تو کوئی چیز بغیر آگ کے اندر رکھے گرم ہی نہ ہو اور نہ بھی فقط بیرونی سطح۔ گلنا جلنا۔ پکنا۔ پگھلنا کچھ بھی نہ ہو۔ نہ بخارات بنیں نہ مینھ برسے۔ جو چیز ایک دفعہ تر ہو جائے وہ کبھی خشک ہونے کا نام نہ لے۔ بارہ مہینے جاڑا ہی رہے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ پاؤں کو

آگ سے بھی خاک اثر نہ ہو۔

۳۔ اگر سب شعاعیں جذب یا منعکس ہو جائیں اور سطح پر کچھ بھی نہ قائم رہیں تو واقعی دن کو قلعہ نہ دکھائی دے۔ بازار سب پٹ پڑے رہیں اور رستے میں ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھے۔

۴۔ اگر صاف شئے میں سے شعاعیں پار نہ نکلیں تو لمپ لالٹین جھاڑ فانوس سب بیکار۔ کمرے کے کواڑ الماری روشندان وغیرہ میں بھولے سے کوئی شیشے نہ لگائے اول تو آفتاب کی روشنی زمین تک پہونچنے ہی کیوں لگی زمین کے اوپر چالیس پچاس میل کے دَل کا خول ہوا اور بخارات وغیرہ کا چڑھا ہوا ہے +

یہ چند خاصتیں جو ابھی بیان کی گئیں آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔ نہ آلات کی ضرورت نہ علم کیمیا وطبیعیات کی کچھ ایسی واقفیت درکار ہے بعض خواص ایسے ہیں کہ بغیر کسی مدد اور ذریعے کے نہیں معلوم ہو سکتے۔

کبھی دیکھا ہوگا بچے جو صابن کے بلبلے اُٹھاتے ہیں اُن میں طرح طرح کے رنگ معلوم ہوتے ہیں حالانکہ صابن سفید پانی سفید شیشے کے ٹکڑے میں بھی اسی طرح کے رنگ نظر آتے ہیں۔ گھر میں پڑی پڑائی کہیں جھاڑ کی قلم ملجائے تو اُس میں سے دھوپ کی طرف دیکھیے۔ سات رنگ (لال۔ نارنجی۔ زرد۔ سبز۔ آبی۔ نیلا۔ بنفشئی) صاف دکھائی دینگے آخر یہ رنگ کہاں سے آئے۔ شیشہ اپنی ذات سے سفید۔ اندر سے ٹھوس۔ نہ رنگ بھرا ہوا نہ پیپر ویٹ[1] کی طرح بیچ میں تہ دی ہوئی۔ آس پاس کھونٹی الگنی پر رنگ

---

[1] پیپر ویٹ شیشے کا گلدستہ جو کاغذ دبانے کے واسطے رکھا جاتا ہے۔

برنگ کے کپڑے نہیں پڑے ہوئے نہ طاقوں میں گلدستے چُنے ہوے۔
جس چیز کے عکس کا شبہ ہو اُسے ہٹوا دیجے پھر دیکھئے تو وہی ساتوں رنگ
اور وہی ترتیب۔ قلم پر شبہ ہو تو توڑ کے دیکھ لیجے وہی رنگ اپنی اپنی
جگہ پر ہر ٹکڑے میں نظر آئینگے۔ آخر یہ طلسمات کیا ہے۔

اہلِ علم نے بچوّں کے کھلونوں سے ایک بات پا کر غور کرنا شروع کیا۔
ہر پہلو سے دیکھا طرح طرح کے آلات سے تجربہ کیا آخر یہ بات نکلی کہ یہی دھوپ
جو بہ ظاہر سفید اور بے رنگ معلوم ہوتی ہے سات رنگ کی شعاعوں سے
مرکّب ہے۔ رہی یہ بات کہ شیشے کے ذریعے سے رنگ دکھائی دیتے ہیں
یوں کیوں نہیں معلوم ہوتے۔ اس کے واسطے ایک اور مسئلہ حل کرنے کی ضرورت
ہے جسمیں انحراف شعاع کی بحث ہے۔ فی الحال یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ منشور
مثلث یعنی تکونے شیشے میں داخل ہو کر ایک ایک رنگ کی شعاعیں الگ
الگ ہو جاتی ہیں۔

سفیدی میں سب رنگ شامل ہیں اس کی جانچ ایک اور طریقے سے
ہو سکتی ہے جس کو عملِ معکوس کہتے ہیں۔ وہی بچوّں کے کھلونوں میں سے
ایک پھرکی لے لیجے اور اُس کا رہا سہا رنگ بھی چاقو سے کھرچ کے یا پانی
میں بھگو کے چھُٹا دیجے پھر اُس کے دَور میں اوپر کی طرف سات نقطے
ساتوں رنگ کے ایسی ترتیب سے لگا دیجے جیسی شیشے کی قلم میں نظر آتی
ہے۔ اس پھرکی کو پھرانے سے اُن نقطوں کی جگہ ایک لکیر بالکل سفید رنگ
کی نظر آئے گی جس کے یہ معنے ہوئے کہ ساتوں رنگ کے ملنے سے سفید
رنگ پیدا ہو گیا۔ قلم کے ذریعے سے ثابت ہوا تھا کہ سفید رنگ میں
سات رنگ شامل ہیں پھرکی سے یہ ظاہر ہُوا کہ وہی سات رنگ ملانے سے

سفید رنگ بن جاتا ہے۔ اب اس کے مان لینے میں کیا توقف ہے کہ جتنے رنگ ہیں سب کی اصلیّت سفیدی ہے۔ ہاں دریافت طلب یہ ہے کہ ہر شئے کا ایک خاص رنگ ہوتا ہے یہ کہاں سے آتا ہے اور اس اختلاف کی کیا وجہ ہے۔

مُحققین کی رائے ہے کہ رنگ کوئی مادّی شئے نہیں اور نہ کسی شئے کی ذات میں موجوُد ہے بلکہ جس رنگ کی شعاعیں سطح پر باقی رہ جاتی ہیں وہی نظر آتی ہیں اُن ہی کو اُس شئے کا رنگ کہتے ہیں۔ نیلے رنگ کی شعاعیں باقی رہ گئیں تو نیلا رنگ معلوم ہوتا ہے سُرخ شعاعیں باقی رہیں تو سُرخ رنگ کئی رنگ کی شعاعیں باقی رہیں تو وہ رنگ معلوم ہوتا ہے جو اُن کی ترکیب سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ امر کہ کیسی سطح پر کس رنگ کی شعاعیں باقی رہ جاتی ہیں ایک علیحدہ بحث ہے یہاں اُسکی گنجائش نہیں۔

غرض رنگ کے متعلق سائنس کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔ فی نفسہٖ کسی شئے کا کوئی رنگ نہیں۔

۲۔ جتنے رنگ ہیں سب روشنی کی شعاعوں سے پیدا ہوتے ہیں۔

۳۔ روشنی کی ذات میں سب رنگ موجود ہیں اور وہ خود سفید یعنی بے رنگ ہے۔ اسی مضمون کا ایک شعر ہے ؎

سارے رنگوں کی ہے بے رنگی میں راہ
ابر گر ہے رنگ بے رنگی ہے ماہ۔

پہلے مصرعے میں ادّعا ہے کہ سب رنگوں کی جڑ سفیدی یعنی بیرنگی ہے۔ دوسرے مصرعے میں تمثیل ہے کہ ابر میں ماہ سے رنگ آتا ہے۔

حالانکہ ماہ میں بظاہر کوئی رنگ نہیں ۔ چاندنی رات میں ہلکا سا ابر ہوتا ہے تو یہ سماں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بادل کا کوئی ٹکڑا چاند پر آجاتا ہے تو اُس کا رنگ نہایت خوشنما نارنجی معلوم ہوتا ہے اور جب ہٹ جاتا ہے تو وہ رنگ نہیں رہتا ۔

رنگ کے عام معنی یہی ہیں " پیلا ۔ نیلا ۔ زرد ۔ کبود " اصطلاحاً کثرت و اقسام کے معنے میں بھی بولا جاتا ہے ۔ الوانِ نعمت کے معنے ہیں طرح طرح کے کھانے نہ یہ کہ کسی کھانے کا رنگ نیلا ہے تو کسی کا اودا ۔ شوق ہر رنگ رقیبِ سر و سامان نکلا ۔ یہاں ہر رنگ کے معنے " ہر حال ۔ ہر موقع " ہیں نہ کہ تصویر کی رنگ آمیزی ۔ اُردو ہی میں نہیں غالباً ہر زبان میں رنگ کے یہ معنے بھی ہونگے +

تصوّف کی اصطلاح میں رنگ سے مراد کائنات ہے اور ہے بھی مناسب کتنی بیشمار صورتیں اور کیسی ایک دوسرے سے الگ ہیں ہر چیز کا نیا رنگ نیا ڈھنگ ۔ ع ۔ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست ۔ بخلاف اس کے ذاتِ باری تعالیٰ تقسیم و تنوّع سے مبّرا ہے اُسے ذات بیرنگی کہنا موزون ہے +

بہ ظاہر یہ اصطلاحیں کثرت و وحدت کے اعتبار سے مقرر کی گئی ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکن[1] اور واجب[2] کا تعلق جیسا ان دو لفظوں سے ادا ہو جاتا ہے ۔ دو صفحوں میں بھی بیان نہیں ہو سکتا ۔

---

[1] ۔ ممکن الوجود یعنی مخلوق ۔

[2] ۔ واجب الوجود یعنی باری تعالیٰ ۔

رنگ اور بیرنگی کا لگاؤ جیسا سائنس سے ثابت ہوا ہے کچھ ایسا ہی حساب مخلوق اور خالق کا ہے۔ رنگ اور روشنی کا تعلق نظر سے یا منشور مثلث اور پھرکی کے ذریعے سے معلوم ہو جاتا ہے لیکن کائنات اور ذات باری کا تعلق معلوم کرنے کے اور ذریعے ہیں۔ یعنی بجائے نظر کے چشم بصیرت منشورِ مثلث کے عوض قلب سلیم اور پھرکی کے بدلے روح مصفا کی ضرورت ہے۔ جن بزرگوں نے ان آلات کو درست کر لیا ہے اور استعمال کرنا سیکھ لیا ہے اُن کو خالق و مخلوق میں وہی تعلق نظر آتا ہے جو ہمیں رنگ اور روشنی ہیں۔ جو ہمارا قیاس ہے وہ اُن کا یقین۔ جو ہمارا تصور ہے وہ اُن کی تصدیق +

اتنا تو ہم بھی معلوم ہوتا ہے کہ کمرے دالان کی روشنی در و دیوار سے منعکس ہو کر آتی ہے۔ در و دیوار کی روشنی فرش زمین سے۔ زمین کی روشنی آفتاب سے لیکن آفتاب کا فی حد ذاتہ منور ہونا کب ثابت ہے۔ یوں تو ہماری دنیا بھی سیارات کے باشندوں کو روشن معلوم ہوتی ہو مگر یہاں دوپہر کو ذرا سی آندھی آ جاتی ہے تو رات ہو جاتی ہے +

سیارات کا نور آفتاب سے آتا ہے تو آفتاب کا نور کہیں اور سے آتا ہو گا۔ خواہ براہِ راست یا اور اجرام فلکی سے منعکس ہو کر۔ مختصر یہ کہ نور حقیقی کچھ اور ہی ہے۔ اُسی سے زمین و آسمان منوّر ہیں اور یہ سارا رنگ روپ اُسی کا ہے۔ ہمارا سائنس اُس کی تحقیقات سے قاصر ہے اسلئے اللہ تعالیٰ خود اس مسئلے کو حل کر کے جامع و مانع الفاظ میں فرماتا ہے۔

"اللہ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض"

اشرف حسین

سودائے سنگین

گذشتہ اشاعت سے آگے

اسی عرصہ میں اُس نے الفرڈ تھیئٹر کی ایکٹرسوں میں سے ایک سے دوستی پیدا کرلی، اور اس کے ایک واقعہ کو ایک مہم واقعہ کے طور پر مجھ سے بیان کرنے لگا۔ اُس کی عورت سے دوستی ہوتی، مجھسے چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔ اس ایکٹرس کے متعلق ایک دن مجھ سے کہنے لگا" گوہرجان کس قدر بھولی لڑکی ہے۔ ہرگز خیال میں نہیں آسکتا کہ کس طرح یہ بھولی بھالی لڑکی اسٹیج پر آکر شیطانی مسکراہٹ سے، مٹک مٹک کے، چمک چمک کے، سینہ کو ابھارا بھار کے، تمام تماشہ دیکھنے والی خلقت کی حریص نظروں کے سامنے عشوہ فروشی کرتی ہے۔ ایسی بچپن کی سی باتیں کرتی ہے، کہ دل بے اختیار قربان ہونے کو چاہتا ہے۔ کمپنی کے ساتھ ہندوستان کے سارے شہروں میں پھر آئی ہے، لیکن یہ خیال کرتی ہے کہ یہ سارے شہر ایک خط مستقیم میں، گویا ایک تار کے اوپر سلسلہ بسلسلہ بندھے ہوئے ہیں۔ ایک دن مجھسے پوچھنے لگی بمبئی کے بعد کونسا شہر آتا ہے۔ اول میں نے اس سوال کو سمجھا نہیں، لیکن اس نے خود ہی، ایک کے بعد ایک دیا سلائی رکھکے مجھے سمجھانا اور گننا شروع کیا: بمبئی کے بعد دلی، دلی سے لکھنؤ، پھر بنارس، پھر امرت سر، پھر لاہور، پھر حیدرآباد، پھر کلکتہ آتا ہے، اور اس بات سے جھلاکے کہ میں اتنی دیر میں سمجھتا ہوں، مجھی سے پوچھنے لگی، اسکے بعد؟

اس وقت میں بھی دیا سلائیاں رکھ کے گنانے لگا: مدراس، مدراس کے بعد پشاور، پھر بنگلور، پھر رنگون، پھر احمد آباد، پھر ٹمبکٹو. یہ آخری نام سنکے مارے خوشی کے اچھل پڑی، "ٹمبکٹو، ٹمبکٹو خوب نام ہے. وہاں ناٹک بھی ہوتا ہے کہ نہیں. اگر کہیں میں کہتا کہ ہاں ہوتا ہے تو وہ شاید وہاں تک جاتی، مگر کہیں دفع بھی ہو کیونکہ میری طبیعت اس لڑکی سے بھر گئی.

فرامرز کی طبیعت ہر کسی سے بھر جاتی تھی. یہ لڑکی بمبئی کو چلی گئی، شاید ٹمبکٹو کا ناٹک دیکھنے گئی ہوگی، کہ میں نے سنا کہ فرامرز نے کمیاٹاہل میں اک جرمن گورنس سے راہ و رسم پیدا کی ہے. اس زمانہ میں مجھسے اک دفعہ ملتے ہی اس گورنس کے متعلق اپنی رائے بیان کرنے لگا: "اس قدر کھاتی ہے، اس قدر کھاتی ہے کہ نفرت ہوگئی، اگر تم کہیں اسے اپنے ہونٹوں اور دانتوں سے ادھ کچے بیف سٹیک کا خون پونچھتے دیکھو تو.... اُف" حضرت کا عشق بہت سے بہت اک مہینہ رہتا تھا. اس ایک مہینہ میں نہایت بے پروا اور خوش خوش نظر آتا کہ یکایک پھر اس پر تھکن اور غمگینی چھاجاتی، مگر ہر وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک خیال، جو اس کے دل میں ایسا بیٹھ گیا ہے کہ ہٹائے نہیں ہٹتا، اسی کا تعاقب کرتا پھرتا ہے. مگر وہ ہاتھ نہیں لگتا.

اُس کے ان تمام کھیل تماشوں، ان تمام دل لگیوں، اور پھر ان تمام کسالتوں میں یہ صاف نظر آتا تھا کہ وہ اُس پہلے اُس سچے عشق کی جراحت کے لیئے ایک غیر قابل حصول دوا تلاش کرتا پھرتا ہے ہر نئی دل بستگی ختم ہونے کے بعد کسی نہ کسی بہانے سے اُس پہلے عشق کی بحث چھیڑ دیتا.

اک دن اتوار کا دن تھا، وہ گاڑی پر میرے ہاں آیا، اور باہر سے یہ کہلا کے بھیجا کہ "جلد کپڑے پہن کے آیئے، میں گاڑی میں انتظار کر رہا ہوں" مجھے چوپاٹی پر لیجانا چاہتا تھا، یہ بھی اک وہ دن تھا، جب کہ اُس کے نت نئے تعلقوں میں سے ایک تعلق ختم ہوا تھا، آجکل وہ تھیٹر کی مخلوق اور وہیں کی سڑکوں میں چکر لگایا کرتا تھا۔ گرانٹ روڈ چھوڑ کے چوپاٹی پر جانے کے ارادے پر میں نے تھوڑا سا مسرت آمیز تعجب ظاہر کیا۔ وہ کہنے لگا: "ہاں میں وہاں کی تمام ناپاکوں اور ناپاکیوں سے بیزار ہو گیا۔ اب میں ایک ایسی صورت دیکھنے کے لئے محتاج ہوں کہ کچھ تو مجھے پاک کرے، ایک ایسی صورت جو مجسّم آسمانی شعر ہو"

آج ایک پارسی تہوار تھا، سمندر کے کنارے شام کے قریب، پارسیوں کا نظر فریب مجمع تھا، اُنکی رنگا رنگ کی ساڑھیاں، جنہیں بنگالنین، مرہٹنین سب ہی پہنتی ہیں مگر جنہیں حسن طبیعت کے ساتھ پہننا صرف یہ ہی جانتی ہیں ہوا میں لہرا رہی تھیں، لڑکیاں، بال کھولے، باندھے طرح طرح کی پھولدار ٹوپیاں پہنے سمندر کے کنارے گھونگے اور سیپیاں جمع کرتی تھیں۔ آسمان پر قوس قزح نکلی ہوئی تھی جس کے کنارے سمندر سے آکر ملتے معلوم ہوتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قوس قزح کی اقلیم میں، قوس قزح کی پریاں پھر رہی ہیں، اور قوس قزح کی ملکہ کا یہ حکم ہے کہ جسے رنگ کی لطافت سے لگاؤ نہو وہ یہاں نہ آیئے: مسلمان عورتیں یہاں نہ تھیں۔ وہ پھولوں کے درمیان، سمندر کے کنارے آبشاروں کے قریب، سبزے کے اوپر موسیقی سے بھری فضا میں کب ہوتی ہیں؟

ہم دونوں نے تھوڑی دیر خاموش دو ایک چکر لگائے، وہ کبھی گہری نظریں ڈالتا، کبھی ایک طرف کو سر جھکاتا، گویا کسی خیال میں غرق تھا، یکا یک کہنے لگا: ہاں یہ چہرہ بیشک ایک لاہوتی شعر ہے، بشرطیکہ اس چہرے کا بھولا پن، فرشتہ پن قایم رہے اور اُس دوسری میں دیکھو پلکیں کس بلا کی ہیں۔ تم نے کبھی خیال کیا ہے بعض اوقات ایک مبہم سما نظر آتا ہے اور اک دم نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرا چہرہ نظر پڑتا ہے۔ اُس کے نقش جم رہے ہوتے ہیں، اُس کی تصویر لوح دل پر کھچتی ہوتی ہے، کہ یکا یک ایک خیال موہوم کی طرح وہ بھی نظر سے دور ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ یہ چہرے جو پورے نہیں دیکھے جاتے۔ پورے نہیں دیکھے جاتے سے میرا مطلب دل بھر کے نہیں دیکھے جاتے، ان باصرہ فریب مناظر میں دماغ کے اندر ایک خواب کی سی کیفیت لا کر گڑبڑ پیدا کر دیتے ہیں۔ یہانتک کہ یہ چہرے مل ملا کے ایک کا تبسم، دوسری کی نظر، تیسری کی ادا، چوتھی کے بال ایک پر لطف مجموعہ دماغ میں پیدا کر دیتے ہیں، پھر اس طرح سے بنا ہوا مجموعہ... یہانتک کہہ کے یکا یک ٹھٹکا، اور ٹھٹک کے ایک سامنے سے گذرنے والی فٹن پر نظر ڈالی۔ ہاں بیچارہ تمام اس طرح سے بنے ہوئے مجموعوں کے ذریعہ سے اُسے ہی، اُس پہلے عشق کی ہی جستجو کرتا تھا۔ جانے میرا دل میں یہ خیال کیسے آیا شاید اس امید پر کہ اُس بیماری کی جسے اس ملاقات میں اُس نے بصراحت ظاہر کیا تھا، یہ دوا ہوگی میں نے کہا: تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" اُس نے مجھ پر ایک ایسی نظر ڈالی گویا اُس سے کوئی بڑی حیرت انگیز بات کہی گئی، پھر ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا: "دیکھو یہ فکر فوراً قابل عمل فکر تو نہیں" میں نے اس ہنسی کے جواب کا کچھ جواب نہیں دیا تھا، وہ تھوڑی دیر چپ رہا اور سامنے

سے گذرنے والی گاڑیوں پر نظر ڈالتا رہا، پھر یکایک میری طرف سر پھیر کے کہنے لگا "لیکن بھائی جان، میں کس کے ساتھ شادی کروں؟"

میں اس عرصہ میں اس بات کو بھول بھی گیا تھا، نہ معلوم دفعتاً اُس کا خیال اس بات کی طرف کس طرح گیا، میں فوراً جواب نہ دے سکا، لیکن اُسنے جواب کی حاجت ہی نہ چھوڑی کہنے لگا: "اور کس لئے شادی کروں بیاہ شادی سے انسان ایک نہایت اچھی عورت اور شاید نہایت خوبصورت بچے حاصل کر سکتا ہے۔ مگر اس کے سوا؟"

"اس کے سوا اور کیا چاہتے ہو۔ اسمیں بھی ایک شعریت ہے، بلکہ اصلی شعرِ حیات اسی میں ہے۔ مگر اس کو محسوس کرنے کے لئے، اس کا لطف اُٹھانے کے لئے قلب کو بہت سی چیزوں سے خالی کرنا ضروری ہوگا"۔

وہ رُکا، پھر اُس نے جواب میں کہا: "میں اپنے دل کو خالی کرنا نہیں بلکہ مختلف چیزوں سے اسقدر بھر ناٹھونسنا چاہتا ہوں کہ آخر تاب نہ لاکر پھٹ جائے"۔ پھر رکا، تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا، اور پھر گذرنے والی گاڑیوں پر نظر ڈالتا رہا، اس کے بعد ایک شدید حرکت کے ساتھ میری طرف مڑ کے، اُس نے اول دفعہ مجھسے اعتراف کیا "کبھی یہ خیال کرتا ہوں کہ اس وقت میں نے بڑی غلطی کی، شاید اگر اُس کے ساتھ شادی کر لیتا، تو ممکن ہے کہ اس اضطراب دل کو سکون ملتا۔ آہ تم کیا جانو کہ مجھے کبھی کبھی کیسا سخت اضطراب ہوتا ہے"

آخر اس بدبخت شخص نے، جس کے منہہ سے یہ اظہارِ حقیقت نکل آیا تھا، پہلے آہستہ سے اپنے ہاتھوں میں میرے ہاتھ کو لے لیا، اور پھر گویا اپنے اضطراب کے درجۂ شدت کو جتانے کے لئے اپنی پوری قوت سے میری ہاتھ کو دبا ڈالا۔ اُس کے ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا

کہ کیوں ازدواج کا ذکر اُس سے کیا کیونکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس ذکر سے میں نے اُس کے کیسے حساس نقطۂ قلب کو ٹھیس لگائی، گویا میں نے اپنی انگلی تلاش کر کے اُس کے زخم پر رکھدی اور ایسی ٹھیس لگائی جس سے اُس کو جتنی تکلیف پہنچ سکتی تھی پہنچ گئی۔

غالباً یہ سیر آخری سیر تھی، اس کے بعد میں بمبئی سے چلا آیا، کہ قسمت نے اس مرتبہ پھر اس نوجوان کو، میری راہ میں، وکٹوریا ٹرمی نس پر، مگر کسیقدر تبدیل شدہ حالت میں لا ڈالا۔

آخر جب اُس نے سگرٹ کی راکھ گرا کے سر اُٹھایا تو میں نے "آپ" کو علیحدہ رکھ کے پوچھا: اُس واقعہ کے بعد بمبئی آنے کا ذکر تم نے کیا تھا، وہ کونسا واقعہ تھا؟"

اُس نے اس دفعہ گویا گہرائیوں میں سے، عالم اسرار کے اعماق میں سے نکلنے والی نظر سے مجھے ٹکٹکی باندھ کے دیکھا۔ اس نظر میں ایک ایسی غیر معمولی چیز تھی کہ اس نوجوان سے جسے میں برسوں سے جانتا اور جس سے محبت کرتا تھا، میرے دل میں ایک لرزۂ بارد پیدا ہو گیا۔ اس سیکنڈ میں اس شخص کے اور میرے درمیان۔ اس کا سبب، میں نہیں جانتا۔ ایک ہوائے بارد منجمد مجھے آ کے لگی، اور مجھے ٹھٹھرانے لگی۔ وہ اپنی عجب نظر سے ٹکٹکی باندھے رہا اور میرے سوال کا جواب تو نہ دیا، بلکہ خود مجھ سے پوچھنے لگا: "آج شام کو کہیں تمہیں کچھ کام تو نہیں، کسی سے وعدہ تو نہیں؟"

میرے جواب نفی پر اُس نے تھوڑا سا تردد کیا، آخر کہنے لگا:۔

تو آج شام میں تمہیں نہیں چھوڑنے کا، آج رات کھانا میرے ہی ساتھ کھانا"، اور جب اُس نے یہ دیکھا کہ مجھے جواب موافق کے دینے میں تھوڑا سا

تردد ہے، تو نہایت درجہ صمیمیت اور عاجزی کی آواز سے کہنے لگا: میں التجا کرتا ہوں"

آج کی شام جو وقت فرامرز کے ہاں گذرا وہ میری زندگی کے مستثنا گھنٹوں میں سے ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ بندورہ لے گیا، اور شام تک درختوں میں چپ چاپ کبھی کسی منظر کی طرف اشارہ کرکے کبھی کسی معمولی سے مضمون کے متعلق ایک آدھ بے ربط لفظ کہہ کے، مجھے اِدھر اُدھر ٹہلاتا رہا۔ میں بھی حقیقت یہ ہے کہ اس سکوت سے خوش تھا۔

آخر گھر لوٹ کے کہنے لگا: "بہت بھوک لگی ہے، کھانا کھانا چاہیئے" میں اک غیر معلوم سبب سے گھبرایا ہوا تھا۔ ہمنے کھانا کھایا جیسے کھایا گیا۔ کھانے کے بعد اپنے خاص کمرے میں لے گیا اور کہنے لگا: "یہ میرا کمرہ ہے"

یہاں تاریکی تھی۔ داخل ہوتے وقت، کثیف تاریکی کی وجہ سے مجھے کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اسوقت — شاید اس تاریکی کے سبب سے مجھپر اک ڈر طاری تھا کہ اسپر میں غالب نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر مجھے دیا سلائی کی رگڑ کی آواز آئی۔ اس روشنی میں جو یکایک میری آنکھوں میں آئی میں نے دیکھا کہ اس کی لرزہ دار شکل مبہم، ہاتھ بڑھا کے دیا سلائی سے موم بتی جلا رہی ہے۔ بتی سے اک سرخ غبار روشنی نکلنا شروع ہوا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بتی اس کمرے کے کثیف ظلمت کو زائل کرنے کے لئے اپنے میں کافی قوت نہیں پاتی، مگر اپنی کوشش کے پورے حملے کر رہی ہو اور اس وقت کچھ تاریک کچھ روشن حالت میں میں نے دنیا کا سب سے عجیب اک کمرہ دیکھا؛ ساری دیواروں پر سرخ کاغذ لپٹا ہوا تھا، اور ایک غیر منتظم ہوس کے ساتھ، دیواروں پر طرح طرح کے چوکھٹوں میں طرح طرح کی تصویریں،

چینی کی رکابیاں جڑی ہوئی تھیں، بریکٹوں پر کہیں تاج محل کی سنگ مرمر سے بنائی ہوئی نقل، کہیں سنگ مرمر کے یا پیتل کے بت، کہیں پنکھے غرضیکہ سیکڑوں طرح کی، اور سیکڑوں رنگوں کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بکھری ہوئی تھیں: مثلاً ایک چینی کی رکابی تھی جس پر ایک تصویر منقش تھی: ایک گھنے درختوں کا جنگل ہے، اس میں ایک بارہ سنگھا ہے جس کے سینگ ایک درخت کی شاخ میں الجھ گئے ہیں اور وہ انہیں چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے اس رکابی کے پاس ہی اک بریکٹ پر، ایک لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے سے مندر میں (جس کے اوپر سیپیاں چپکی ہوئی تھیں) وشنو مہاراج کا ڈراؤنا بت رکھا ہوا تھا۔ ایک اور تصویر تھی جس میں اک وحشی صورت لڑکی بیٹھی تھی جس کا آدھا دھڑ سیاہ زمین میں غائب تھا، اور بالوں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ تصویر کے نیچے دو جاپانی پنکھوں کو کھول کے اور دیوار میں گاڑ کے ایک عظیم تیتری کی شکل بنائی گئی تھی۔ غرضیکہ ان دیواروں میں کوئی کونا کھدرا ایسا نہ تھا کہ اس میں فرامرز کے فکر عجیب نے ایک ہوس مجنونانہ کے ساتھ اپنا آشیانہ نہ بنایا ہو۔ ان سب کے بعد ایک کونے میں لکھنے پڑھنے کی میز! اس کے پاس اک چھوٹی سی گول میز، اور ایک گھومنے والی کتابوں کی الماری۔ ان سب کے اوپر مختلف گلاس، کاسے، البم، کاغذ، کتابیں تھیں۔ زمین پر قالین کے اوپر بھی چھوٹی بڑی کتابیں کھلی اور بند پڑی ہوئی تھیں۔ پاس ہی اک چیتے کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ اور اس پر مختلف چیزیں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ میز پر ایک گلدان میں ایک عجیب سوکھا پودا لگا ہوا تھا جس کے پتے چھتری کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ اس تمام گڑ بڑ پر اگر سو دفعہ نظر ڈالی جائے تو

ہر دفعہ اک نئی چیز نظر آئے، چھوٹی چھوٹی لاتعداد چیزیں تھیں جنکے وہاں ہونے کا کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا تھا، اور پھر ان سب عجیب چیزوں کو ایک لرزش حیات دینے والی موم بتّی تھی جسمیں سے مختصر سی سرخی مائل روشنی نکل رہی تھی۔

میں ایک آرام کرسی میں بیٹھ گیا، وہ میرے مقابل مگر کچھ فاصلہ پر، کھڑکی کے پاس ایک چوکی پر بیٹھا، اور بلا کسی تمہید کے یکایک، چار گھنٹے اوّل کی گفتگو پر پلیٹ کے خشک آواز سے کہنے لگا: "اس واقعہ کی تمہیں خبر نہیں؟ لو میں تمہیں بتاتا ہوں، میرے ساتھ اُس نے بیوفائی کی"

میری زبان سے بے اختیار "کسنے" نکلا۔

فرامز نے فوراً جواب دیا "اُس نے"

اُس وقت میں اُسے دوُر سے، اس مختصر روشنی میں جس کے ساتھ، کھڑکی سے داخل ہوکر اب چاند کی روشنی بھی شامل ہوگئی تھی، ایک خیال، ایک شکل مبہم کی طرح دیکھ رہا تھا۔

اس وقت میں اُسے دور سے، اس مختصر روشنی میں جس کے ساتھ، کھڑکی سے داخل ہوکر اب چاند کی روشنی بھی شامل ہوگئی تھی، ایک خیال، ایک شکل مبہم کی طرح دیکھ رہا تھا۔ اس روشنی میں وہ زیادہ ضعیف، زیادہ زرد نظر آتا تھا۔ اور اس کی اسرار انگیز آنکھوں میں، جو مجھپر گویا برف باری کر رہی تھیں اور زیادہ وحشت معلوم ہوتی تھی۔ مجھپر اپنی باتوں کا اثر معلوم کرنے کے لئے نظر ڈال رہا تھا۔ یکایک اپنی جگہ سے اُٹھا، اور میرے سامنے آیا۔ میں پہلے ہی ہمدردی کے ساتھ سن رہا تھا، کہ اُس نے بھرّائی ہوئی آواز سے کہنا شروع کیا:-

میں سچ کہتا ہوں میں بس اس کی توقع نہ رکھتا تھا۔ اس شام کو جب کہ آخری دفعہ ہم تم دونوں چوپائی پر تھے، وہ بھی وہاں تھی۔ اور سچ کہوں؟ میں اُسے ہی دیکھنے وہاں گیا تھا۔ کیونکہ ایک دن خواہ مخواہ میرے دل میں اک شبہہ پیدا ہو گیا تھا؛ اگر کہیں بیوفائی کرتی ہو تو؟ میں نے ہر چیز کا تحمل کیا تھا، لیکن یہ خیال کہ وہ اُس پاکیزہ عشق کی یاد میں صادق نہیں ہے اور میرے علاوہ کسی اور کو دل میں رکھتی ہے، مجھے مارے ڈالتا تھا۔ اُسنے بیاہ کیا، یہ اُس کا حق تھا۔ ہے نا؟ مگر اُس عشق کی یاد سے بیوفائی کرنے کا وہ حق نہیں رکھتی تھی۔ اُس دن میں نے اُسے ہنستے دیکھا، ایک نوجوان کے ساتھ ہنس رہی تھی، یعنی کہ میرے ساتھ بیوفائی کر رہی تھی، اور مجھے یقین ہے کہ صرف مجھے مار ڈالنے کے لئے ایسا کر رہی تھی۔ تمہیں معلوم نہیں کہ اُسدن میں نے کیسی طاقت فرسا کوشش سے اپنی طبیعت کو روکا کہ دوڑ کے اُس کی گاڑی پر چڑھ کے اُس کا منہہ نہ نوچ لوں۔"

یہ کہتے وقت کانپ رہا ہے، گویا اس بیوفائی کے وہم خیال سے دست و گریبان ہونا چاہتا ہے۔

میں نے کہا،" لیکن صرف اُسے ہنستا دیکھنا کافی سند نہیں، خاصکر جبکہ تمہارا اور اُس کا بات چیت کا بھی تعلق نہیں رہا تھا۔ علاوہ ازیں تم بھی ....." اُسنے میری بات پوری نہ ہونے دی، میرے پاس آکر بیٹھ گیا، اور نرم آواز سے گویا مجھے اپنا ہم خیال بنانا چاہتا ہے کہنے لگا: " نہیں نہیں وہ میرے ساتھ بیوفائی کرتی ہے، یہ محقق ہے، تم بھی اُسے یقین کرتے ہو، تم بھی اُس کی دہشت تاثیر، مجھے مار ڈالنے والی قوت سے واقف ہو۔"

واقف ہی سمجھنا چاہیئے تھا۔ کیا بحث کرتا۔ لازم یہی تھا کہ اعتراض

نہ کروں۔

کہنے لگا: "ابھی تم میری ہنسی اُڑانا چاہتے تھے، یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے بھی تو اس کے ساتھ بیوفائی کی؟ ہے نا؟ مگر یقین مانو کہ وہ تمام عورتیں جن سے میں ملتا تھا، وہ دل بہلاوے تھے، وہ اُس عذاب اور اضطراب کے گھٹانے کے لئے کھلونے تھے جو اُسے نہ بھولنے کی وجہ سے میرے دل کو پریشان کئے ہوئے تھا۔ میری زندگی میں اگر کھلونا کوئی چیز نہ تھی، تو صرف وہ تھی۔ میں اُسے ہمیشہ صاف و پاک، ہمیشہ پُرشعر و خیال دیکھنا، اور ایک پاکیزہ افق سے اُٹھے ہوئے سحابپارہ میں دفن کرنا چاہتا تھا۔"

پھر ایک ٹھنڈا سانس بھر کے کہنے لگا: آہ یہ عورتیں! مجھے انکا کیسا تلخ تجربہ ہوا ہے جانتے ہو یہ کیا ہیں؟ یہ پھول ہیں جنکی دور ہی سے سیر کرنی چاہیئے! کیونکہ جو چیزیں انیں ڈھونڈی جاتی ہیں، وہ ان میں نہیں ہوتیں۔ عورت، ایک رنگ ہے کہ اُسے دیکھتے ہو تو تمہیں مست و مدہوش کرتا ہے۔ مگر یہ رنگ اس لئے بنا ہے کہ صرف دُور سے دیکھا جائے۔ اسے چھُونا مت، کیونکہ چھُوتے ہی اُڑ جائیگا، اور ایک پژمردہ داغ کے سوا کچھ باقی نہ رہیگا۔ یا عورت، ایک روشنی ہے نظر فریب و دلربا، ایک خندۂ ضیا ہے اس کی طرف ہاتھ نہ بڑھانا، کیونکہ روشنی غائب ہو جائیگی، اور خندۂ ضیا کے بدلے، تاریکی رہجائیگی اُف! عورت سے توقع ہوتی ہے قصیدہ کی، ملتا ہے مرثیہ، امید ہوتی ہے اُن ہاتھوں سے تھپک کی، دیتے ہیں زخم۔ غضب یہ کہ یہ زخم بالکل باریک خط سے ہوتے ہیں، فوراً بھر جاتے معلوم ہوتے ہیں، مگر جن

ناخنوں سے یہ زخم بنتے ہیں، اس میں ایک قطرہ زہر ہوتا ہے، وہ اُس زخم میں نفوذ کر جاتا ہے، اور آہستہ آہستہ، اُس آگ کی طرح جو کرۂ زمین کے پیٹ میں ہے، اور وہاں دھاتوں کو پگھلا رہی ہے، یہ بھی تمہارے خون میں گھس جاتا ہے، اور جہاں گھستا ہے، اُسے مسموم کرتا ہی ہے، ہر قطرہ خون میں ایک قطرہ مہلک اور بڑھاتا ہے، یہانتک کہ تمہاری زندگی زہریلی ہوجاتی ہے۔ تم ہنستے ہوتے ہو، تمہیں کچھ خبر نہیں ہوتی، وہ اپنے فرض تخریبیہ کو پورا کرتا ہوتا ہے۔ تم اس وہم میں ہو کہ تم زندگی بسر کر رہے ہو، وہ تمہیں مار رہا ہوتا ہے۔ ثانیہ ثانیہ تمہاری زندگی میں سے ایک ایک ذرہ لیکر تمہیں برباد کرتا ہے، اُکھاڑتا ہے، جلاتا ہے۔"

اب اُس کی آنکھوں کی ایک کیفیت۔ کس لفظ سے تعبیر دوں؟ ایک جانکنی کی سی کیفیت پیدا ہو رہی تھی، اور گویا اُس سے ایک بحرِ حزیں کی سیاہ موجیں جوشش مار رہی تھیں میں اس کی باتوں میں ذرا سا ہرج نہ کرنا چاہتا تھا، صاف تو یوں ہے کہ اس غیر معمولی زمین میں اس غیر معمولی آدمی کے ساتھ بحث کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا، اور ان آنکھوں کے مقابلہ میں میرے دل میں کبھی ڈر کبھی رحم پیدا ہوتا تھا، اور میں اپنے سگرٹ کے دھوئیں کی آڑ میں اُن آنکھوں سے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا، صرف اس کی باتیں سننا چاہتا تھا۔ وہ یکایک کھڑا ہوگیا۔ اب اُس کی طبیعت میں ایک ہیجان تھا؛ کہنے لگا:

تمسے ایک بات کہوں؟ صرف تمسے کہونگا، کیونکہ تم سے کسی قسم کا اندیشہ یا خوف نہیں ہے۔ اس وقت تک میرے نزدیک دنیا میں اگر ذی حیات کوئی چیز تھی تو صرف وہ تھی۔ اُس کے بعد وہ بھی مرگئی، میرے

نزدیک بالکل مرگئی۔ اب.... دیکھو میں تمہیں تبلاؤں،، یہ کہکے اس نے میرا بازو پکڑ لیا، پھر ذرا سا جھک کے، سامنے کمرے کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا؛ اور کہنے لگا دیکھتے ہو،،

مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ کس چیز کو دکھانا چاہتا تھا، میں نے پوچھا "کسے؟" وہ ہاں ہوں ہی سے اشارہ کرتا رہا، اور اس چیز کا نام لئے بغیر کہتا رہا: "اُسے،، آخر مجھے معلوم ہوا جو چیز مجھے دکھائی جارہی تھی، وہ سنگ مرمر کا ایک بت تھا۔ ایک عریاں لڑکی جو سنگ مرمر کے ایک کُرہ پر ایک پاؤں سے کھڑی تھی، اور گویا اپنے تئیں سنبھالنے کے لئے اپنے دونوں ہاتھوں کو اُٹھائے ہوئے تھی۔ بت تراشی کا ایک لطیف نمونہ!

فرامرز میرا شانہ پکڑے رہا، اور گویا اس لئے کہ کوئی اور نہ سُن لے، آہستہ آہستہ کہنے کے لئے مجھ سے اور آملا اور مجھے سمجھانے لگا۔ کندھا پکڑے جانیکی تضییق، میرے مونہہ پر اُس کے سانس کا لگنا مجھے گھرا رہے تھے، وہ سمجھا رہا تھا:

"ایک رات تھی، آج کی سی اُجالی رات نہیں۔ برسات کی گھپ اندھیری رات تھی۔ کتنا زمانہ ہوا مجھے یاد نہیں۔ اندھیری رات تھی۔ میں اسی کمرے میں تھا اور بتی نہیں جل رہی تھی۔ میں اس اندھیری رات میں بجلی کی سیر کر رہا تھا، مگر اُس کا خیال کر کر کے، تم نے تاڑوں پر کبھی بجلی کو بھی کوندتے دیکھا ہے۔ دیکھو اس کھڑکی سے وہ دکھائی دیتے ہیں۔ اُس رات یہ تاڑ اور سیاہ معلوم ہوتے تھے۔ ایک سیاہی طاری تھی کہ بجلی اُس سے جنگ کر رہی تھی، اور غائب ہو ہو جاتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اہرمن اپنے لمبے ہاتھوں کے لمبے ناخن بڑھا بڑھا کے، گاڑ گاڑ کے سینۂ ظلمت کو پھاڑ رہا ہے

اور اُس سے ایک لمحہ کے لئے ایک شلالۂ خون نکلتا ہے اور پھر سیاہی میں غایب ہو جاتا ہے۔ میں اُس کی سیر کر رہا تھا، مگر خیال میں وہی تھی۔ یکایک مجھے کمرے میں ایک حرکت سنائی دی، اور کوئی سانس لیتا ہوا معلوم ہوا میں مارے ڈر کے کانپا اور پھر جم کے رہ گیا۔"

اب میرے کندھوں کو اور دبا رہا ہے اور گویا کہیں وہ نہ سن لے، مجھسے اور آملا، اور ہاتھ سے اُسے دکھا کے اور آہستہ آہستہ کہنے لگا:

"یہ تھی، ہاں یہی۔ اس کرہ کو اپنے پاؤں تلے لڑکھاتی میرے پاس آئی، اور آتے وقت، اُس تاریکی میں لرزتی اور قدمیں بڑھتی جاتی تھی۔ اس کے بعد بجلی جو چمکی تو میں نے اُسے صاف اور واضح طور پر دیکھا۔ میرے پاس آئی "۔ میرے کندھوں کو اور دبا رہا تھا، مجھ سے اور ملتا جاتا تھا۔" میرے پاس آئی اور اپنے عریاں باہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ تاڑوں کی تاریکی پر اہرمن اپنے چمکدار جنگلوں سے خوں گرا رہا تھا، کہ ہم ایک لمحہ میں ایک بوسۂ محبت کے ساتھ ایک عمر بسر کر گئے۔ اب اُس رات کے بعد، ہر رات تاریکی میں، لرزتی لرزتی، اپنے کرہ کو لڑکھاتی لڑکھاتی اور آگے آتے وقت قدمیں بڑھتی بڑھتی آتی ہے اور اپنی عریاں باہیں میرے گلے میں ڈال دیتی ہے اور ایک لمحہ میں، اُس لمحہ میں جو ایک عمر کے طول کی برابر ہوتا ہے۔ مجھے وہ لطف زندگی دیتی ہے، جو کسی عورت میں نہیں، خاصکر اُس میں نہیں جس نے میرے ساتھ بیوفائی کی۔ اور یہ میرے ساتھ بیوفائی نہیں کرنے کی"

اس تقریر کو ختم کر کے، فرامرز نے میرے کندھے چھوڑ دے۔

دو تین قدم پیچھے ہٹ کے کرسی پر بیٹھ گیا، کہنی گھٹنوں پر رکھکے، سر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ کمرے کی نیم تاریکی میں مجھے ایسا نظر آیا کہ رو رہا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا۔ ہائے بیچارے کا دماغ!

میں بمبئی سے چلا آیا، مگر فرامرز سے پھر ملنے کو دل چاہتا ہے۔ خبر نہیں اُس نے اپنے اس پرستیدۂ سنگیں سے بھی کہیں بیوفائی تو نہ دیکھی +

سجاد حیدر

غزل

شوخی نہیں دیکھی کہ شرارت نہیں دیکھی
ہاں آپکی آنکھوں میں مروت نہیں دیکھی

اظہارِ محبت پہ ہنسی آتی ہے ہنس لو
تم نے ابھی تاثیر محبت نہیں دیکھی

جاتے ہوئے دیکھا نہیں کب تجکو سوِ غیر
آتی ہوئی کس روز قیامت نہیں دیکھی

مانا نہیں اُس نے کہ عاشق ہی یہ میرا
جب تک کسی ناشاد کی تربت نہیں دیکھی

وہ رنگ وہ روپ انکے کہاں صبحِ شبِ وصل
اسطرح کبھی لُٹتی کوئی دولت نہیں دیکھی

کیا آئے نظر میں کسی بیکس کی مصیبت
ظالم کبھی تو نے شبِ فرقت نہیں دیکھی

بلبل سے ہی چھیڑ انکی تو پھولوں سے ہنسی ہے
اس رنگ کی واللہ طبیعت نہیں دیکھی

یہ کیا کہ دبے جاتے ہو تم بارِ نظر سے
ایسی بھی کہیں ہمنے نزاکت نہیں دیکھی

خونِ دلِ بلبل نے عجب کام کیا ہے۔
پھولوں میں کبھی ہمنے یہ رنگت نہیں دیکھی

دیکھا ہی کہ آئی ہوئی ٹل جاتی ہی لیکن
ٹلتی ہوئی سر سے شبِ فرقت نہیں دیکھی

اتنا بھی نہ چاہو کسی مہ پارہ کو اختر
تمنے کبھی آئینے میں صورت نہیں دیکھی۔

مالوہ کی سیر

قلعہ دولت آباد

دکن میں سب سے قدیم۔ مضبوط اور عالیشان دولت آباد کا قلعہ سمجھا جاتا ہے۔ چھ سو برس سے اس پر اسلامی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ ۲۵ نومبر ۱۹۱۵ء کو میں نے اس مشہور قلعہ کی سیر کی۔ قبل اس کے کہ اس کی موجودہ حالت بیان کروں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کی مختصر تاریخ بھی سنا دوں ہندوؤں کے زمانہ میں قلعہ کا نام دیوگری اور آبادی یعنی شہر کا نام دیوگڈھ تھا جس کو غلطی سے اکثر مسلمان مورخین نے دیوگیر لکھا ہے چنانچہ بدر چاچ۔ محمد شاہ تغلق کے دربار کا مشہور شاعر اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے ؎

که دیوگیر مخوانش که دولت آباد ست
که چار طاق درا و ست ہشت باب جہاں

سب سے پہلے ۶۹۴ھ ۱۲۹۴ء میں جلال الدین خلجی کے عہد سلطنت میں اُس کے بھتیجے اور داماد علاؤالدین خلجی نے سات آٹھ ہزار سوار سے اس شہر پر حملہ کیا اُس وقت یہاں کا راجہ خاندان یدو سے رام دیو تھا وہ مقابلہ کی تاب نہ لایا اول قلعبند ہو گیا پھر ایک ہزار من سونا سات من مروارید دو من جواہرات۔ ایک ہزار من نقرہ۔ چار ہزار چادر ابریشم اور دیگر بیش قیمت اشیا رنذرانہ دیکر صلح کر لی اور سالانہ خراج دینا منظور کر لیا۔ مگر تھوڑی مدت بعد پھر بغاوت کی اور خراج بھیجنا بند کر دیا ۷۰۶ھ ۱۳۰۶ء میں علاؤالدین خلجی نے اپنے منظور نظر غلام ملک کافور کو ایک لاکھ سوار

کے ساتھ دکن کی تسخیر کے واسطے روانہ کیا۔ راجہ نے مقابلہ کی طاقت نہ دیکھی اپنے چھوٹے بیٹے کو قلعہ میں چھوڑ کر خود معہ تمام بال بچوں اور ساز و سامان کے ملک کافور کے پاس حاضر ہو گیا۔ ملک کافور ۷۰۶ھ ۱۳۰۷ء میں اُسے ساتھ لیکر بادشاہ کے پاس آیا۔ علاؤ الدین کو راجہ کا یہ طرز عمل بہت بھایا خطاب رائے رایاں چتر سفید ایک لاکھ تنگہ نقد کے علاوہ قصبہ نوساری (گجرات) بھی مرحمت کر کے اُسے واپس بھیج دیا یہ راجہ جب تک زندہ رہا شاہی اطاعت میں رہا اور ملک کافور کو مہم ورنگل وغیرہ میں قابل قدر امداد دی۔ ۷۱۱ھ ۱۳۱۱ء میں رام دیو کے مرنے کے بعد اُس کے بیٹے شنکر نے بغاوت کی ملک کافور نے دوبارہ وہاں پہنچکر قلعہ کو فتح کیا اور شنکر مارا گیا۔ اس کے بعد ملک کافور شاہی لشکر قلعہ میں چھوڑ کر واپس ہوا مبارک شاہ خلجی کے عہد میں ہرپال نے جو راجہ کا داماد تھا قرب وجوار کے راجاؤں کو متفق کر کے بغاوت کی اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا ۷۱۸ھ ۱۳۱۸ء میں مبارک شاہ نے اُس کو شکست دیکر قید کیا اور کھال کھچوا کر اُس کا سر قلعہ کے دروازہ پر لٹکوا دیا اور ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی جو اب تک قلعہ کے اندر موجود ہے ۷۲۹ھ ۱۳۲۸ء میں سلطان محمد شاہ تغلق نے دہلی کو ویران کر کے اس شہر کو آباد کیا اور اپنا دار السلطنت بنانا چاہا اور دہلی سے دولت آباد تک کہ آٹھ سو میل کا فاصلہ ہے منزل منزل پر سرائے بنوائی۔ اور سڑک پر دو رویہ درخت لگوائے قلعہ کے گرد عمیق خندق اور متعدد حصار اور قرب وجوار میں سنگین تالاب عالیشان عمارتیں۔ باغات تعمیر کرا کر شہر کا نام دولت آباد رکھا۔ چنانچہ قلعہ سے الورہ تک ۶-۷ میل کا فاصلہ ہے برابر اُس عہد کی

آبادی کے نشانات پائے جاتے ہیں مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اسے آبادی کی حالت میں دیکھا تھا وہ لکھتا ہے کہ یہ بہت بڑا شہر ہے دہلی کا مقابلہ کرتا ہے اس کے تین حصے ہیں ایک کو دولت آباد کہتے ہیں اس میں بادشاہ اور اس کا لشکر رہتا ہے دوسرے حصہ کو کتکتہ کہتے ہیں تیسرے حصہ کو جو قلعہ ہے دیوگیر کہتے ہیں یہ قلعہ مضبوطی میں بےنظیر ہے اعظم قتلو خاں بادشاہ کا اُستاد اس قلعہ میں رہتا ہے ساگر اور تلنگانہ بھی اُسی کے ماتحت ہے اس کا علاقہ تین مہینہ کی مسافت میں پھیلا ہوا ہے۔ قلعہ سطح زمین میں ایک چٹان پر واقع ہے اس چٹان کو کھود کر چوٹی پر قلعہ بنایا ہے۔ قلعہ کے اوپر چمڑے کے بنے ہوئے زینے سے چڑھتے ہیں۔ رات کے وقت اس زینہ کو اوپر اُٹھا لیتے ہیں اس میں بڑے بڑے غار ہیں جس میں مجرم قید رکھے جاتے ہیں۔ ان غاروں میں ایسے بڑے بڑے چوہے ہیں جن سے بلی بھی ڈرتی ہے۔ دولت آباد کے باشندے مرہٹہ ہیں ان کی عورتیں نہایت خوبصورت ہیں شہر کے ہندو جن کو ساہ کہتے ہیں جواہرات وغیرہ کی سوداگری کرتے ہیں۔ یہاں آم اور انار بہت ہوتے ہیں اور سال میں دو دفعہ پھلتے ہیں۔ یہاں اہل طرب کا ایک بازار ہے جس کو "طرب آباد" کہتے ہیں یہ بازار بہت خوبصورت وسیع ہے دوکانات بھی بہت ہیں الخ"

محمد شاہ تغلق ہی کی زندگی ہی میں ۷۴۸ھ ۱۳۴۷ء میں یہ قلعہ باغیوں نے چھین لیا اور دکن میں ایک جدید سلطنت بہمنیہ قایم ہوئی ۹۳۴ھ ۱۵۲۷ء تک سلاطین بہمینہ کا قبضہ رہا اُن کے بعد احمد نگر کے سلاطین نظام شاہی کے قبضہ میں آیا۔ ۱۹ ذالحجہ ۱۰۴۲ھ ۱۶۳۳ء کو شاہجہان کے زمانہ میں مہابت خان

نامی امیر نے اُن سے چھین کر خاندان مغلیہ کی سلطنت میں شامل کیا ۹ شعبان ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء کو سید محمد خان امیر الممالک خلف سوم نواب آصف جاہ کے زمانہ میں صلحنامہ کی رو سے مرہٹوں کے قبضہ میں گیا جس کی تاریخ کسی نے کہی ہے ؎

گرفتند کفّار احمد نگر را | دگر دولت آباد حصنِ علم رفت
خرد سال تاریخ بر لوحِ گیتی | چنیں زد رقم دولت آباد ہم رفت

سولہ برس آٹھ مہینے اور چودہ دن بعد ۶ جمادی الاول ۱۱۸۹ھ ۱۷۷۵ء کو نواب نظام الدولہ آصف جاہ ثانی نے پھر مرہٹوں سے فتح کر لیا جس کی امیر حیدر نے یہ تاریخ لکھی ہے ؎

نظام الدولہ آصف جاہ ثانی | بزور تیغ و بازو قلعہ بکشاد
امیر از بہر تاریخش رقم زد | نمودہ فتح حصنِ دولت آباد

میر سیّد کا نے "دولت آباد رفت و باز آمد" تاریخ کہی اُسوقت سے یہ ریاست نظام حیدر آباد کے قبضہ میں چلا آتا ہے اورنگ آباد سے ۱۰ میل اور بمبئی سے ۲۰۰ میل کے فاصلے پر واقع اور نظام ریلوے کا اسٹیشن ہے موجودہ آبادی صرف دو ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے جس پہاڑی پر دولت آباد کا قلعہ واقع ہے وہ زمین سے ۶۰۰ فیٹ بلند ہے۔ قلعہ کے نیچے تین فصلیں ہیں بیرونی فصیل کا حلقہ پونے تین میل کا ہے فصیل میں ۵۲ دروازے ہیں اور ۵۳ کھڑکیاں بتلائی جاتی ہے اکثر دروازوں پر شیروں اور ہاتھیوں کی مورتیں بنی ہوئی ہیں فصیلوں کے اندر داخل ہوکر سب سے پہلے ایک مینار ملتا ہے جو باہر سے بھی نظر آتا ہے یہ چار منزل کا مینار ۲۱۰ فیٹ بلند ہے۔ زمین سے ۲۳ سیڑھیاں چڑھکر ایک دروازہ لگا ہے

جس کی پیشانی پر "ایالت سلطان علاؤالدین" جلی قلم سے اور "مبارک باد این فرخندہ بنیاد" خفی قلم سے کندہ ہے۔ دروازے میں داخل ہوکر ایک تین در کی چھوٹی سی مسجد ملتی ہے جس کے اندر ایک پتھر پر اکیس شعر کا کتبہ کندہ ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ سلطان احمد شاہ بہمنی نے اپنے ایک ملازم پرویز نامی کو دولت آباد کی حکومت پر سرفراز کیا اس نے سلطان علاؤالدین پسر احمد شاہ بہمنی کے عہد حکومت میں تین برس کے عرصہ میں اس مینار کو تعمیر کرایا تاریخ کی بیت یہ ہے ؎

تاریخ مینار دولت آباد ۸۴۹ درہشتصد و چل و نہ شد آباد

تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۸۳۲ھ میں احمد شاہ بہمنی نے ملک التجار خلف حسن بصری کو دولت آباد کا سپہ سالار مقرر کیا غالباً پرویز ملک التجار کا اصلی نام ہوگا کیونکہ علاؤالدین کے عہد تک اس کا دولت آباد اور اطراف پر حاکم ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ مسجد کی چھت سے مینار کی سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں۔ مینار کے نیچے کی عمارت اور درمیان میں بھی چینی کا نفیس کام کہیں کہیں باقی ہے۔ مینار اوپر سے مرمت طلب ہے۔

مینار کے سامنے راستہ کے دوسری طرف عظیم الشان مسجد ہے۔ اس مسجد پر کوئی کتبہ نہیں لیکن طرز تعمیر سے وہی جامع مسجد معلوم ہوتی ہے جو مبارک شاہ خلجی نے تعمیر کرائی تھی یہ جامع مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ چھ درجہ کی مسجد ہے جس میں کل ۱۵۰ ستون ہیں درمیان میں گنبد باقی چھت ہے۔ ہر ستونوں کے درمیان میں پتھر سے پٹی ہے۔ نہایت وسیع صحن ہے جس میں دو چبوترے بھی بنے ہیں شمال و جنوب میں ایک ایک چھوٹا دروازہ اور مشرق میں گنبد دار صدر دروازہ ہے۔ دروازے کے

باہر ایک وسیع پختہ حوض مربع شکل کا ہے جس کا ہر ضلع ۱۵۰ فیٹ اور گہرائی ۲۵ فیٹ ہے۔ دولت آباد سے قریب ایک میل کے فاصلے پہ دو پہاڑوں کے درمیان میں ایک پختہ تالاب بنا ہوا ہے جو اب تالاب ایاز دورہ کے نام سے مشہور ہے اس تالاب سے قلعہ تک شاہی زمانہ کے نل لگے ہیں اُن کے ذریعہ سے اس حوض میں پانی آتا ہے اب تک یہ نل درست ہیں۔ محمد تغلق کے زمانہ میں قتلغخان یا قتلو خاں نے ایک پختہ حوض تعمیر کرایا تھا جو اُس زمانہ میں حوض قتلو کے نام سے مشہور تھا غالباً یہ وہی حوض ہے۔

خاص قلعہ کی چڑھائی پر نیچے سے اوپر تک تین چار دروازے ہیں۔ ایک آہنی توا رکھا ہے جو ضرورت کے وقت دروازہ پر ڈال کر اُس کے اوپر آگ جلادی جاتی تھی جس وقت توا دھک جاتا تھا نیچے سے کوئی شخص اوپر نہیں جا سکتا تھا کیونکہ سوا اُس ایک راستہ کے اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ راستہ میں کئی شکستہ عمارتیں۔ پہاڑ کے نیچے کئی تالاب جو کوڑی ٹانکہ ستی ٹانکہ۔ انگوٹی ٹانکہ وغیرہ کے نام سے موسوم ہیں ملتے ہیں۔ کئی تیرہ و تار غار ہیں جن میں پولٹیکل قیدی رکھے جاتے تھے۔ ایک گنبد کے نیچے کھڑکی کے اندر مزار ہے جو مینا گری سلطان کا مزار کہلاتا ہے علاوہ معمولی چڑھاؤ کے ۱۰۰ سیڑھیاں چڑھ کر سب سے بلندی پر ایک مثمن کمرہ ہے جس کے ہر ضلع میں ایک ایک دروازہ اور چاروں طرف برامدہ ہے درمیان میں چبوترہ اور اردگرد دالان بنے ہیں اسی جگہ حکام کا قیام ہوتا ہے لہذا یہ عمارت اچھی حالت میں ہے اور سفیدی وغیرہ ہو رہی ہے یہاں کے دلفریب اور خوشنما منظر کا سماں

کاغذ پر کھینچنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ معمولی طور سے کوسوں کا منظر پیش نظر ہو جاتا ہے اور ہمارے پاس تو دوربین موجود تھی کوسوں تک کا سبزہ پہاڑ۔ درخت غرضکہ گلستانِ قدرت کا نمونہ نگاہ کے سامنے تھا۔ اس بارہ دری سے سو سوا سو سیڑھیاں اوپر چڑھکر ایک چبوترہ بنا ہے جس پر گورنمنٹ نظام کا اسلامی جھنڈا اڑ رہا ہے۔ اور قدیم زمانہ کی سب سے بڑی توپ رکھی ہے اس کی لمبائی ۱۹ فیٹ ۴۔ انچ قطرہ ۵ فیٹ ہے توپ کے اوپر ہندی میں بھی کچھ لکھا ہے اور فارسی میں "دھول دہاں چور اکرہ" طول۔ ۲۰ ۔ عمل منگلجی ولد رگہنات ۔ کشنداس ولد لالجی۔ تحریر ہے۔ چبوترہ کے نیچے کا مقام "جنار دھن دیو کی بیٹھک" کے نام سے موسوم ہے جس پر ہر اکادشی کو میلہ لگتا ہے۔

گولکنڈہ کا آخری بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ اورنگ زیب کے عہد میں اسی قلعہ میں نظر بند تھا۔ پچاس ہزار روپیہ سالانہ اُس کا وظیفہ مقرر تھا قلعہ کے کھنڈرات میں ایک چھوٹا سا مکان ہے جس کے دروازہ پر نہایت نفیس خوبصورت اور باریک چینی کا کام کیا ہوا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تاناشاہ اس مکان میں قید تھا۔ انگریز اس چینی کے کام کو بہت پسند کرتے ہیں جو دیکھنے آتا ہے وہ تھوڑا بہت نمونہ ساتھ لے جاتا ہے۔ بقول شخصے شیخ کی ڈاڑھی تبرک ہی کی نذر ہوئی۔ نیچے کا کُل کام نمونہ کے نذر ہو گیا اوپر کچھ کام موجود ہے۔ قلعہ کے بُرجوں پر بہت سی چھوٹی بڑی قدیم زمانہ کی توپیں اب تک رکھی ہوئی ہیں جن میں سلیمانی توپ اور مینڈھا توپ بہت مشہور ہیں۔

مینڈھا توپ کے پشت کی جانب مینڈھے کی شکل اور اوپر دو چھوٹے چھوٹے شیر بنے ہیں اور نہایت نفیس جال کھنچا ہوا ہے۔ خطِ نستعلیق میں اوپر "ابو الظفر محی الدین محمدؐ اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی" بیچ میں "توپ قلعہ شکن" اور نیچے "عمل محمد حسین عرب" تحریر ہے۔ اِس کی لمبائی "۱۰ فیٹ ۱۰ انچ ہے اور بہت خوبصورت توپ ہے۔

شمالی جانب پہلی فصیل کے باہر چھوٹی سی خوبصورت مسجد اور ایک بزرگ برہان الدین رحؒ کی درگاہ ہے۔ اور بھی کئی حوض مسجدیں۔ باولی حمام۔ اور بہت سے کھنڈرات نظر آتے ہیں۔ محمدؐ تغلق اور اُس سے بھی پرانے زمانہ کی بارود۔ تمباکو اور دیگر اشیا اب تک کوٹھوں میں بھری ہوئی ہیں بارود وغیرہ کے کوٹھے مقفل ہیں تمباکو کی رسیاں خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ قلعہ کے باہر آبادی کے قریب ایک عظیم الشان حمام ٹوٹا پھوٹا باقی ہے جس کے درمیان میں ایک بڑا حوض ہے دروازہ پر "محب اہل بیت رسول اللہ محب خان کتبہ عبد القادر الحسینی ۹۹۰ھ" کندہ ہے۔

قلعہ کی فصیل کے اندر سے ہوکر جو سڑک الورہ کو گئی ہے اُس پر قلعہ سے تھوڑے فاصلے پر ایک میل کے قریب چڑھائی ہے۔ اوپر سڑک کے دونوں طرف ایک ایک چھوٹا سا منارہ بنا ہوا ہے۔ ایک منارہ پر یہ بیت کندہ ہے ؎

از سرِ نو مرمتِ این راہ کرد یعقوب بندۂ درگاہ ۱۱۹۴

دوسرے پر عبارت نثر ہے جس سے واضح ہے کہ ۱۲۹۲ھ میں حسب فرمان جناب نواب سالار جنگ بہادر مرمت ہوئی۔ انتہائے

بلندی کا منظر بہت خوشنما ہے نیچے دو پہاڑوں کے درمیان بین وہی
آباز درہ کا پختہ وسیع تالاب ہے جس کی ترائی کے سرسبز درخت سبزہ
زار نہایت بھلا معلوم ہوتا اور فرحت بخش ہے۔ کئی گنبد اور ٹوٹی پھوٹی
عمارتیں بھی نظر آتی ہیں۔

سعید احمدؔ مارہروی

زندگی ایک گھنٹہ ہے! ہمارے دماغ ہفتاد سالہ گھنٹے ہیں۔ زیست
کا فرشتہ اُن کو صرف ایک بار سب کے لئے کوک دیتا ہے اور پھر اُن کا دروازہ
بند کر کے کنجی اُس فرشتے کو دید یتا ہے۔ جو قیامت کے دن مردوں کو از سر نو زندہ کریگا
خیال کے پہیئے برابر ٹِک ٹِک چلے جاتے ہیں۔ ہماری مرضی انہیں ٹھہرا نہیں سکتی
البتہ دیوانگی اُنکی رفتار تیز کر دیتی ہے صرف موت گھنٹے کا دروازہ توڑ کر اندر جا سکتی
ہے۔ اور اُس ہمیشہ ہلنے والے لنگر کو جسے ہم دل کہتے ہیں پکڑ کر توڑ پھوڑ ڈالتی ہے اور
آخر اُس ہولناک بکس کی ٹِک ٹِک جسے ہم اپنے دردآلود پیشانیوں کے نیچے لیے پھرتے
ہیں بند کر دیتی ہے۔ ایکاش ہم صرف ونیز اسوقت قابو پا سکیں جبکہ ہم اپنے تکئے
پر سر رکھے لئے ہوتے ہیں اور خیال و تصور کی جنبش کو یکے بعد دیگرے شمار کرتے ہیں
کیا کوئی ایسا ہے جو اُن پہیوں کی چال روکے۔ اُنکی چولوں کو الگ الگ کرے
اور اُس زنجیر کو کاٹ دے جو یہ وزن سنبھالے ہوئے تھے۔ بعض اوقات ہم کسقدر
خاموشی و آرام کے خواہاں ہوتے ہیں اور کسطرح تہہ دل سے یہ چاہتے ہیں
کہ یہ خوفناک مشین جو وقت کے غیر منقسم پردوں کو کھول رہی ہے اور
جس پر موت و حیات کی خاص تصویریں کڑھی ہوئی ہیں۔ صرف تھوڑی
دیر کے لئے ٹھہرے۔ (ہالمز)

کشمیری پنڈتونکی رسم شادی

زمانہ ہر ایک پرانی رسم کو بدل رہا ہے - مغربی رنگ ہر ایک قدیم رسم پر چڑھتا جاتا ہے - زمانہ حال میں ازدواج کا وہ اثر جو خاندانوں کو دوسرے خاندانوں سے وابستہ کرتا تھا تنزل پر ہے - موجودہ زمانہ میں بیویوں کو اولاد بارگراں معلوم ہونے لگی ہے - ہر دُلہا اور دُلہن کو کبوتر اور کبوتری کے مثل زندگی بسر کرنے کی خواہش ہے - بہترے کہ قدیم رسوم کا حال تاریخ میں قایم رہے اس لئے ہم ایک قدامت پسند ہندو قوم یعنے کشمیری پنڈتوں کے رسم شادی کا حال بیان کرتے ہیں

برات کے پہنچتے ہی ایک ملازم پانی کا گھڑا اسمدھیانہ کے مکان کی دہلیز پہ لئے موجود ہوتا ہے پسر والے اس میں روپیہ دو روپیہ ڈالدیتے ہیں اُس کو اُپچ کہتے ہیں مکان میں داخل ہونے سے قبل دروازہ مکان پر ہر دو سمدھی ایک دوسرے کے سامنے ایک جائفل اور ایک روپیہ پیش کش کرتے ہیں پسر والا روپیہ اور جائفل قبول کرتا ہے دختر والا صرف جائفل لے لیتا ہے ہر دو بغلگیر ہوتے ہیں اور برات داخل ہوتی ہے ہم کو بہت دریافت کے بعد بھی یہ ٹھیک معلوم نہ ہو سکا کہ دیوگن کے موقعہ پر اور اس موقعہ پر جائفل کے تبادلہ سے کیا مراد لی گئی ہے -

ہم قیاس سے یہ کہتے ہیں کہ کشمیر جیسے ایک برفستانی ملک میں ایک حار تاثیر کا پھل خوش آیند ہونا چاہیئے اس لئے جائفل کو غالباً نمونہ

گر مجوشی ارتباط و اتحاد قایم کیا گیا ہے +

برات - بعد تبادلہ جا بُقل براتی اور نوشاہ اور اہل برادری سیدھے صفِ دعوت پر بٹھائے جاتے ہیں اور نوشہ کے سامنے دو پتریاں رکھی جاتی ہیں ایک اُس کے لئے ہوتی ہے اور دوسری میں سے وہ تھوڑا سا کھا لیتا ہے جھوٹی پتری یعنی پس خوردہ پھر دلھن کو کھائی جاتی ہے - دعوت کے تناول کے بعد براتی لگن کی ساعت کے منتظر پان خوری حقہ نوشی و محفل رقص و سرود میں مصروف رہتے ہیں - کچھ عرصہ ہوا کہ پسر والوں کے ہمراہیان کے نوجوان لڑکے ایک پارٹی اور دختر والوں کے نوجوان لڑکے دوسری پارٹی بنا کر بیت بازی کیا کرتے تھے اب یہ رواج پنجاب میں نہیں رہا ہے وقت معین پر پوجا شروع ہوتی ہے مٹی کی پیالیوں میں خشک گھاس جسے **کشا** بولتے ہیں پھول اور خشک چاول اور جو وغیرہ سے رسومات مذہبی شروع کرتے ہیں - پہلے گنیش کی پوجا ہوتی ہے پھر جگ شروع ہوتا ہے ایک آتشکدہ طیار ہوتا ہے اور آتشکدہ کے سامنے خوبصورتی سے کچھ نقش بنائے جاتے ہیں اور گورو صاحبان خوش الحانی سے سنسکرت کے پستک پڑھتے ہیں - افسوس ہماری قوم سنسکرت سے اس قدر بے بہرہ ہوگئی ہے کہ ایک لفظ بھی اُس ساری کارروائی کا اُن کی سمجھ میں نہیں آتا - یہ زیادہ افسوسناک ہے کہ اکثر گورو صاحبان بھی معنے سمجھنے سے بے بہرہ ہوتے ہیں اُس آتشکدہ کے اردگرد تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد سات "پھیرے" ہوتے ہیں یعنی دُولھا اور دُولہن ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے ہوئے سات بار گھومتے ہیں اُن کے پہلے قدم پر منجانب والدین پسر کچھ طلائی زیور پا رکھا جاتا ہے جو دختر کے گورو جی

مہاراج لیتے ہیں عموماً امیر اشرفی اور اوسط درجہ کے لوگ طلائی بُدکی رکھتے ہیں دختر کے گورو صاحب علاوہ بریں پسر والوں سے ایک دوشالہ یا دوشالہ کی قیمت پاتے ہیں اور علیٰ ہذا اور کئی رقوم انکو چھوٹی چھوٹی ملتی ہیں۔لگن کے کل اخراجات مثلاً ساگری روغن زرد وغیرہ بھی پسر والوں کے ذمہ ہوتے ہیں +

مستورات۔اب مستورات کا حال سنئے۔مستورات مردوں کے کھانا کھانے کے بعد کھانا کھاتی ہیں ان کی نشست مردوں سے کسی قدر جدا ہوتی ہے وہاں وہ چہ میگویاں کرتی ہیں اور وہ چہ میگویاں شادیوں کے **تانوں** اور رقوم کے ادار کے متعلق ہوتی ہیں اور عجیب عجیب فتوے شادی بیاہوں کے متعلق حاضر وغائب اہالی قوم پر دئے جاتے ہیں۔معمولی چہ میگویوں کے علاوہ مستورات کشمیری زبان میں راگ بھی گاتی ہیں جو دیگر ہندو اقوام کی طرح فحش نہیں ہوتے بلکہ پاک اور دعائیہ ہوتے ہیں +

پردہ۔اس ساری کارروائی میں کل مستوراتِ قوم کو مردوں سے پردہ نہیں ہوتا کل برادری کی عورتیں منہ کھلے موجود اور شریک شادی ہوتی ہیں۔ہماری قوم میں آپسمیں پردہ یعنی گھونگٹ نہیں ہے۔نہ بڑے اور چھوٹے دیوروں سے بھاوج اور نہ بہوا اپنے سسر سے اور نہ کوئی عورت کسی اہل قوم سے پردہ کرتی ہے۔البتہ گھروں میں غیر قوموں سے پردہ ضرور ہے آیا اس درجہ کا پردہ کہاں تک مناسب ہے ہم ہر ایک خاندان کے بزرگ کی اپنی رائے پر چھوڑتے ہیں یعنی جن کو اتنا پردہ بھی موقوف کرنے میں کوئی ہرج معلوم نہیں ہوتا وہ موقوف کردیں اور

جو کسی اندیشہ سے خائف ہیں وہ جاری رکھ سکتے ہیں۔ پردہ فی الحقیقت ایشیائی قوموں کی قدیمی رسم ہے اور ضروریات وقت سے اختیار کی گئی ہے اور غالباً ضرورت رفع ہونے پر روز بروز کمی پر ہے۔ مناسب درجہ تک شائد پردہ کی اب بھی ضرورت ہے۔ تناول طعام کے بعد عورتیں سب یکجا مردوں سے قدرے فاصلہ پر جمع ہو جاتی ہیں سمدھانہ کی عورتیں اُن اشیاء کی وصولی میں مصروف ہو جاتی ہیں جو دختر کے والدین لگن کی شب کو دیتے ہیں۔ شیرینی وغیرہ کی تقسیم معمولی ہوتی رہتی ہے جس کو **حاضری** کے نام سے پکارتے ہیں۔ شیرینی کے علاوہ کشنیز خشک جسمیں میوہ خشک یا دام پستہ وغیرہ آمیزش کیا جاتا ہے اور جسے **گوٹا** کہتے ہیں تقسیم ہوتا رہتا ہے لگن کے سات پھیروں کے بعد دولہا اور دلہن یکجا بیٹھے چاول اور دہی ایک ہی تھالی میں تناول کرتے ہیں اس موقعہ پر دختر والوں کے گھر کا خوش پز رسوئیدار اپنا حق الخدمت پاتا ہے دولہا کے والدین اس کو ۳۰ سے ۶۰ روپیہ تک عموماً دیتے ہیں۔ دولہا اور دلہن کے اس موقعہ پر باہم کھانے کے علاوہ صرف ایک اور موقعہ ایسا آتا ہے پھر ساری عمر اُن کو ایک تھالی میں باہم کھانا ممنوع ہے۔

پشپ پوجا۔ جب لگن ختم ہو جاتا ہے اُس کے بعد ایک نہائت دلاویز اور پر اثر رسم ہوتی ہے جسکو **پشپ پوجا** کہتے ہیں (یعنی پھولوں کی پوجا) یہ رسم اس طرح ہوتی ہے کہ دولہا اور دلہن کے سر پر ایک چادر ڈال دیتے ہیں اور ایک ٹوکری پھولوں کی والدہ دختر اور ایک والد دختر کے ہاتھ میں ہوتی ہے ہر دو دولہا اور دلہن کے قریب کھڑے ہو جاتے ہیں اور چند گور و صاحبان شامل ہو کر موسیقی کے لہجہ میں خوش

آوازی سے باہم صفیر ہوکر ایک پستک پڑھتے ہیں دریافت کرنے سے
معلوم ہوا ہے اور بعض ناموں کے ذکر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس
موقعہ پر اُن نیک بخت اور وفادار بیویوں اور اُن کے قدرداں خاوندوں
کا تذکرہ پڑھا جاتا ہے جو ہندوستان کے پُرانے زمانہ میں ضرب المثل
گذر چکے ہیں۔ دیوتاؤں سے دعائیہ درخواست کیجاتی ہے کہ وہ اپنی روحانی
موجودگی سے برکت دیں اور اُن کی بدولت دُلہا دلہن کے باہمی تعلق کو
قیام ہو اور وہ اُن خاوندوں اور بیویوں کی مانند کامران اور فایز مرام
ہوں جو سابقہ زمانہ میں قابل تعظیم ہو چکے ہیں ہر ایک بند کے اختتام
پر والدین دختر دُلہا اور دُلہن کے سر پر پھول ڈالتے جاتے ہیں۔ اس
رسم پر چند گھنٹے خرچ ہوتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ رسم کسی
اور ہنود کی قوم میں رایج نہیں اور کل شادی کی رسوم میں سے یہ رسم
مستحسن اور قابل پسند اور مؤثر ہے ہر ایک متنفس جو موجود ہوتا ہے اُس
سے متاثر ہوتا ہے اور دست بدعا ہوتا ہے کہ جوڑا سلامت رہے اور
خوش نصیب ہو۔ پشپ پُوجا کے بعد دولہن کے سنگھار پر بہت وقت
خرچ ہوتا ہے۔ جو سہاگ پٹارہ کے سامان سے کیا جاتا ہے۔

ویگو۔ اس کے بعد ایک مربع نقشہ رنگ آمیزی زمین پر مستورات
تیار کرتی ہیں۔ جسکو ویگو کہتے ہیں اُس پر دُولہا دُولہن کو کھڑا کر دیتے
ہیں۔ والدین دختر ایک دوسرے کے پس خوردہ مصری کے ٹکڑے دُولہا
دُولہن کو کھلاتے ہیں اور اُن پر سے ایک کبوتر کا جوڑا فدا کیا جاتا ہے۔
روپے پیسے کوڑیاں اُن کے سر پر سے قربان کئے جاتے ہیں دختر والوں
کے خاندان کی عورتیں نہایت مغموم اور چشم تر ہوتی ہیں۔ بعد ازاں برات

رخصت ہو جاتی ہے +

والد دختر کی حالت - برات کے رخصت ہو جانے پر والد دختر کی حالت رحم کے قابل ہوتی ہے اس پر اپنی قوم کے بے رحم نکتہ چینی کے صدمے - سمدھی کی رضامندی نا رضامندی کا فکر - لڑکی کی جدائی - خرچ کی زیر باری اور لڑکی کے ساتھ آئندہ برتاؤ کا فکر اور انتظام کا تکان اور شب بیداری سب ملکر ایک دردناک حالت سراسیمگی پیدا کر دیتی ہیں - وہ مجسم مایوسی معلوم ہوتا ہے + (پنڈت شیو نرائن شمیم)

تصویر قناعت

(انگریزی نظم کا ترجمہ)

شاد ہے وہ شخص جس سے دور ہیں رنج و محن
شاد ہے وہ شخص جسکے دل میں ہے حب وطن

ہے جو اس کی پاس اک تھوڑی سی موروثی زمین
ہے اسی میں خوش زیادہ کی اُسے حاجت نہیں

اپنے دودھ اور اپنی نان خشک میں خوشحال ہے
محنتوں کے فیض سے ہر وقت مالامال ہے

سایہ پیڑوں کا ہے گرمی سے بچانے کے لئے
آگ ہے سردی میں گرما کر سُلانے کے لئے

شاد ہے وہ شخص جو ہر فکر سے آزاد ہے
جسکو اندیشہ نہیں کچھ رات دن دلشاد ہے

کٹتے ہیں آرام سے راحت سے جسکی رات دن
جسم جس کا تندرست اور قلب جسکا مطمئن

جب وہ تھک جاتا ہے محنت کر کے دن کے کام سے
رات کو سوتا ہے کس راحت سے کس آرام سے

چھوڑ کر جب بیٹھتا ہے اپنے دن کے کام کو
دیکھتا ہے بیٹھ کر پھر وہ کتابیں شام کو

رات دن حاصل ہیں اُسکو رنج و راحت کے مزے
باری باری لیتا ہے آرام و محنت کے مزے

ہے میسر دولتِ آرام دل کا اس کو گنج
ہے اصول زندگی اُس کا مرنجان و مرنج

چاہتا ہوں زندگی ایسی ہی ہو میری بسر
رنج کی کچھ فکر ہو مجھکو نہ راحت کی خبر

یوں ہی خاموشی سے بے نام و نشان مر جاؤں میں
قبر بھی کوئی نہ ہو میری جہاں مر جاؤں میں

سرائے کا نقشہ برسات میں

دلّی کے مشہور داستان گو میر باقر علی صاحب جنکے دم سے داستان گوئی کے مٹتے ہوئے فن کا نام اس شہر میں باقی ہے۔ جس چیز کا بیان کرین اس خوبی سے کرتے ہیں۔ کہ کہا جا سکتا ہے وہ لفظوں میں مصوّری کرتے ہیں۔ ذیل کا مضمون ایک ظریفانہ کہانی کا جزو ہے ہماری درخواست پر اُنہوں نے اُسے قلمبند کر دیا ہے۔ اُس میں بھولے بھٹکے مسافر کی حالت کا خاکہ کھینچا ہے۔ جو کسی معمولی سرائے میں برسات کے موسم میں جا پھنستا ہے:۔

بارش ہو رہی ہے۔ شام کا وقت ہے۔ خدا خدا کرکے سرائے کی صورت نظر آئی۔ بے ڈول سنگ خارا کے ٹکڑے اور مٹّی سے پچتے ہوئے دروازے کے پاکھے بانس کے کواڑ۔ جو بان سے بندھے ہوئے ہوا کے جھونکے سے کبھی بسار یکے پیڑ سے ٹکرا آتے ہیں اور کبھی بھیگی ہوئی کچی گرنے والی دیوار کو صدمہ پہنچاتے ہیں بیلوں کے کھروں سے روندا ہوا گوبر سیاہ سڑی ہوئی مٹی سانیکی گھاس پھس کے تنکے ملگجے جھاگ کیچڑ سا کالا پانی دروازہ سے بہتا ہوا چلا آتا ہے اور ایک مٹی کی ٹونٹی اور کنارہ ٹوٹی ہوئی بدھنی کبھی اوندھی اور کبھی سیدھی ہو کر پانی کے ساتھ ساتھ لڑھکتی ہوئی چلی آتی ہے۔ مسافر بھیگا ہوا لباس پہنے ہوا کے سرد جھونکوں سے دل کانپ رہا تھا ہونٹ نیلے ہو گئے تھے مگر لوگوں کے ہنسنے کے خیال سے تھر تھری کو ضبط کر ٹٹو کو بڑھا اندر آیا تو

دیکھا کہ سرائے کے بیچ میں ایک کنواں ہے کہیں پانی سے بھر کر ادبل رہی ہے۔ سارے صحن میں ٹخنوں ٹخنوں کیچڑ بیسیوں چھکڑا کھڑا ہوا چھپر پرانی سرکیاں اور بھیگے ہوئے دولڑے پڑے ہیں۔ بیلوں پر ٹاٹ اور پرانی گدڑی کی جھولیں بھیگی ہوئی پڑی ہیں جنسے پانی کی بوندیں ٹپک رہی ہیں چھکڑے والے بھیگے ہوئے پتھروں کے چولہے بنائے تسیلے ہوئے ایندھن کو پھونک رہے ہیں دھواں اُٹھ رہا ہے چہرہ سُرخ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں بھرتیوں میں دال چڑھا رکھی ہے لوہے کی پراتوں میں چنے کا سا آٹا گوندھا ہوا ہے چار طرف گلے ہوئے سیاہ پھونس کے چھپر جس کا جگہ جگہ سے پھونس ہٹ گیا ہے اور دھوانس لگے ہوئے بانسوں کا ٹھاٹر اور پرانے بان کے بند نظر آرہے ہیں کسی پر مٹکے کا ٹھیکرا اور کہیں بیندا اٹکا ہوا کونڈا ڈھکا ہے کئی چھپروں پر نیم کے درخت کا سایہ ہے اُن پر زرد زرد پتیاں اور سوکھے ہوئے نیم کے تنکے کوؤں کی گرائی ہوئی ہڈیاں جو بارش سے سے پھول گئی ہیں کچھ کھمبیاں جنکو عام لوگ بلی کا موت کہتے ہیں چھپروں پر نکلی ہوئی ایک طرف کو بڑے چھپر کے نیچے بھٹیاری بیٹھی بیٹھی ہے جس کا کالا رنگ اوپلا سا چہرہ چینیاں سی آنکھیں چپٹی ناک گُردا سے ہونٹ اور موٹے موٹے ہاتھ پاؤں سر میں سرسوں کا تیل جو مسافروں کے چراغوں سے بچا ہے پڑا ہوا سیڈھیاں گوندھی ہوئیں جنمیں موباف کی جگہ دیسی سوت کا کلاوہ زرد و سرخ پڑا ہے بند ہوتے بلوں میں ہٹی اٹی ہوئی ہاتھ گلے میں پیتل کانسی چاندی کا زیور انوٹ بچھوے۔ چنگری۔ جنگی۔ پکیاں۔ بیلے۔ چھلے۔ چھبیا۔ گجری

بمتنی - چوکڑا - مُرکی - بندا - کنگن - پائل - اچری ڈہار ہار - جمیل - مالا کنٹھ مالا موہن مالا - پچلڑا - ستلڑا - چھندن بندن چھن - پچھیلی بازو ملنی ٹیکا ٹڑوا سر پر قند کا سرخ دوپٹہ لال تلک نیلی سوسی کا پاجامہ ادہوڑی کی جوتی جسپر ریشم کی ٹکڑیاں بنی ہوئیں داہنے ہاتھ کی طرف سوکھے ہوئے آم وجامن کے پتے دس بارہ گرہ کی دونوں طرف سے جھلسی ہوئی لکڑی جسے کوڑا جھونک رہی ہے آگے کے چولہے پر گلا ٹوٹے ہوئے مٹکے کا پیندا رکھا ہے جسپر کئی روٹیاں ڈال دی ہیں ہاتھ میں پیڑا ہے کسی ہانڈی میں ڈوئی چلاتی ہے کسی کا نمک چھکھا ایک مسافر چولہے کے راہے ہیں روٹیاں سینک رہا ہے کسی کا بچہ رو کر روٹی کا تقاضہ کر رہا ہے میاں بھٹیارے ایک طرف مٹی کا حقہ جسپر ارنی کا نیچہ بندھا ہوا کپڑے کی جگہ بان لپٹا ہوا مٹی کی چلم اونٹ کی مینگنی کی آگ سے بھری ہوئی کھانس کھانس کر دم لگا رہا ہے - ہم بھی پہونچے بی بھٹیاری ہم کو کوئی جگہ بتادو۔

بھٹیاری - میاں مسافر وہ سامنے کی کوٹھری خالی ہے۔

میں - ٹپکتی تو نہیں۔

بھٹیاری - ٹپکنے وپکنے کی تو خبر نہیں۔

میں - وہاں آیا تو دیکھا گیلی کوٹھری دو کڑیاں چھت کی جٹخی ہوئیں جگہ جگہ ٹپکا لگا ہے اور زمین میں چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ گئے ہیں دھوانس کا سرخی مائل بودار پانی جمع ہے جب بوند پڑتی ہے تو چاروں طرف پانی اُچھلتا ہے۔

مسافر - میاں مہتر جی یہاں آؤ۔

بھٹیارہ۔ میاں آیا۔

مسافر۔ بھائی یہاں تو ٹپکا لگا ہوا ہے۔

بھٹیارہ۔ میاں آجکل ٹپکے کی نہ کہو بڑے بڑے اسٹیشنوں میں لگا ہوا ہے +

مسافر۔ ایک چارپائی تو لاؤ۔

تھوڑی دیر میں ایک چارپائی آئی جس کے ٹوٹے پھوٹے بان بھیگ کر تن گئے ہیں کان نکلا ہوا دو پایہ اونچے دو نیچے بھٹیارہ نے لاکر بچھائی اور ایک ہاتھ سرہانے کے پایہ پر دوسرا پائنتی کے پایہ پر رکھ کر زور کیا تو ایک چراٹا ہوا اور پائے کھٹ سے بیٹھ گئے۔

بھٹیارہ۔ میاں دو پیسے ہونگے + بھئی اچھا آخر مجبور اسی پر سیلا ہوا بچھونا بچھا کر لیٹ رہا تھکا ہوا تھا کچھ نیند آگئی رات کے دو بجے ہونگے کہ گرجکی آواز سے آنکھ کھلی بجلی چمکی اور موسلا دھار پانی پڑنے لگا ٹپکا شروع ہوا۔ کبھی چارپائی کو ادھر کبھی ادھر کھینچا۔ عورتوں سے سنا کرتے تھے۔ تلے دھار اوپر دھار اور سوچتے تھے کہ یہ کیا محاورہ ہے آج معلوم ہوا کہ شاید اسی موقع کو کہتے ہونگے۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ بارش ذرا تھم گئی تھی۔ مسافر غریب نے اپنی راہ لی +

باقر علی داستان گو

اے تیر غمت را دل عشاق نشانہ	خلقے بتو مشغول و تو غایب ز میانہ
گہ معتکف دیرم و گہ ساکن مسجد	یعنی کہ ترا مے طلبم خانہ بخانہ

عمر خیام

روپیہ پیسہ کے معاملات

مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ انگلستان میں کفایت شعاری کی پوری طور پر قدر نہیں ہوتی - ہمارے ملک میں لوگ بڑی محنت کرتے ہیں اور معقول آمدنی پیدا کرتے ہیں لیکن غیر قومیں کفایت شعاری میں ہم سے بڑھکر ہیں - ایک عقلمند بوڑھے نصرانی کا قول ہے کہ "میرے بیٹا تیری امیری یا غریبی کا انحصار تیرے مدخل پر نہیں بلکہ تیرے مخرج پر ہے" انگریزی میں جو لفظ[۱] thrift ہے اس کے معنوں سے ہی پایا جاتا ہے کہ اس میں اقبال مندی مضمر ہے - پیشتر اس کے کہ ہم کوئی چیز خریدیں اس امر کا خیال کر لینا چاہئے کہ آیا اس چیز کے بغیر بھی گذارہ ہو سکتا ہے یا نہ

۲ - دولتمندی کا مسئلہ تو بالائے طاق رکھو - آئندہ کی ضروریات کے مہیا کرنے کے لئے کچھ جمع کرنا عقلمندی کا کام ہے اور مناسب ہے - ایک نکمی سی ضرب المثل ہے کہ "بوقت تنگدستی آشنا بیگانہ مے گردد" لیکن کیسے افسوس کی بات ہے کہ یہانتک نوبت آجائے کہ بیوی بچوں کو خوراک - پوشاک ڈاکٹر کی فیس یا تبدیل آب وہوا اور آرام کی ضرورت ہو اور ادھر یہ بات کھائے جائے کہ اگر ہم شرط عقل سے محنت کرتے یا کسی بے ضرر لیکن غیر ضروری خواہش کے پورا کرنے سے نفس کو باز رکھتے

سلہ - انگریزی میں thrive کے معنے سرسبز اور شاداب ہونا ہیں -

تو اپنے علایق کو مصیبت اور تشویش کا منہہ دیکھنا نہ پڑتا۔ محض بارِ گنج بنی کی خاطر تقتیر کرنا فی الحقیقت کمینہ پن ہے لیکن حوایج سے مستغنی ہونے کے لئے روپیہ جمع کرنا درست ہے اور جوانمردوں کا کام ہے۔

۳۔ ہمیشہ احتیاط سے حساب رکھو۔ میرا یہ مطلب نہیں کوڑی کوڑی کا حساب رکھنا چنداں مفید ہے۔ حساب اس طرح رکھنا چاہیئے کہ تمکو معلوم ہو سکے کہ روپیہ کہاں گیا اور کسی چیز پر کیا خرچ ہوا جس آدمی کو معلوم ہو کہ میری آمدنی اس قدر ہے اور خرچ اس قدر اور فضول خرچی نہیں کرے گا۔ مسرف پہلے تو آنکھوں پر پٹی باندھ لیتا ہے۔ بس پھر نظر کیا آئے۔ جس کو خدا نے دیدۂ بینا دیا ہو وہ سر کے بل گر کے تباہ کیوں ہو۔

۴۔ پس لازم ہے کہ انسان کچھ بھی کرے۔ اپنی آمدنی کی حد سے تجاوز نہ کرے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرض نہیں اُٹھانا چاہیئے۔ چارلس ڈکنس کے ایک ناول (فسانہ) موسومہ ڈیوڈ کاپرفیلڈ میں ایک شخص مکابر نامی اس طرح سے نصیحت کرتا ہے " اگر کسی شخص کی سالانہ آمدنی بیس پونڈ ہو اور خرچ اُنیس پونڈ ۱۹ شلنگ چھ پنس تو وہ بھی آسودگی سے دم لے سکتا ہے۔ لیکن اگر آمدنی تو ہو بیس پونڈ اور خرچ ہو بیس پونڈ چھ پنس۔ تو اس کا نتیجہ سوائے مصیبت کے اور کیا ہو سکتا ہے " گو یہ نصیحت ناول میں درج ہے لیکن اس کی معقولیت میں کوئی کلام نہیں۔ دونوں حالتوں میں فرق تو صرف ایک ہی شلنگ کا ہے +

۵۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرض ایک قسم کی غلامی ہے تو یہ کوئی حد سے زیادہ سخت کلمہ نہیں کہتے۔ جو شخص قرض لیتا ہے وہ اندوہ خریدتا ہے۔ دنیا میں نامرغوب اشیا کی کثرت ہے۔ ایک تجربہ کار آدمی مسمی

ہوریس گریلی نے صداقت سے کیا خوب کہا ہے کہ " مانا کہ فاقہ۔شدت سرما۔ پھٹے پرانے کپڑے۔محنت شاقہ۔مورد نفرین و اشتباہ ہونا۔ ناجایز ملامت سب نامطبوع ہیں لیکن قرض ان سب میں سے بدترین ہے + ہرگز قرض نہ اٹھاؤ۔ اگر ہفتہ بھر میں کسی کو آٹھ آنہ سے زیادہ میسر نہ ہو تو اسے لازم ہے کہ کسی قدر چنے بھنا کر رکھے اور چینہ پر گذارہ کرے لیکن کسی شخص کا ایک روپیہ کا مقروض نہ ہو " ۔

۶۔ بقول کاڈن دنیا میں دو قسم کے لوگ آباد ہیں جمع کرنے والے اور خرچ کرنے والے یعنی مقتصد اور مسرف ۔ یہ جو سب مکانات۔ کلیں ۔پل اور جہاز نظر آتے ہیں اوّل الذکر آدمیوں کے طفیل بنے ہیں اور انھیں کی بدولت کارہائے عظیم کا اتمام ہوا ہے جن سے انسان کو شائستگی اور ابتہاج حاصل ہوئی ہے۔جنھوں نے اپنے مال و دولت کو رائگان ضایع کر دیا ہے وہ ان لوگوں کے غلام ہو کر رہے ہیں۔فطرت میں خدائے حفیظ کا یہی قانون ہے کہ یہ امر اسی طرح سے ہو۔ اگر میں کسی طبقۂ ناس کو یہ امید دلاؤں کہ کوتہ اندیشی۔بے فکری اور کسالت پر ان کی ترقی کا مدار ہے تو اس سے زیادہ دغابازی اور کیا ہو سکتی ہے +

۷ ۔ : ۔ پلٹ آرک نے لکھا ہے کے افسس میں آرٹی مس کے مندر میں اگر کوئی مقروض پناہ گزین ہوتا تھا تو اسے اپنے قرضخواہوں کے ہاتھ سے امن اور پناہ ملتی تھی ۔لیکن اقتصاد کا معبد ہر جگہ متین النفس آدمیوں کے لئے کھلا رہتا ہے ۔اس میں وہ بطیب خاطر اس قدر جگہ لے کر آرام کر سکتے ہیں جس میں ان کو راحت اور

عزّت نصیب ہو۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ نہ تو قرض لینا چاہیئے نہ دینا ہی چاہیے ہاں معاملہ کے دوران میں لین دین کرنے کا کچھ مضائقہ نہیں۔ کسی کو قرض دیکر کوئی کرے کیا۔ نہ تو روپیہ وصول ہوتا ہے نہ آدمی ہی شکریہ کا مستحصل ہوتا ہے کیونکہ مدیون ہمیشہ اپنے آپ کو ماؤف خیال کرتا ہے جس قدر دے سکو نیاصنانہ دو لیکن واپس لینے کی توقع نہ رکھو۔

۸۔ اگر دولت ابتدا میں بتدریج حاصل ہو تو دل شکستہ نہ ہونا چاہیئے۔ اس کی مثال ایک طویل کوچے کی ہے جسمیں کوئی موڑ نہ ہو۔ اگر اتفاق سے ابتدا میں دولت کی بھرمار ہو تو سبکی سب خرچ نہ کر دینی چاہیئے بلکہ وقتِ حاجت کے لئے جمع بھی کرنی چاہیئے بدیں خیال کہ زمانہ میں ہمیشہ نشیب و فراز ہوتا ہے اور مرورِ دہور کے ساتھ غالباً روپیہ کی بھی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ کئی آدمی کاروبار میں فقط اس لئے تباہ ہوگئے کہ شروع سے ہی خوش قسمتی سے اُن کے ہاتھ بہت سا مال لگ گیا۔

۹۔ دولت مند بننے میں جلد بازی کا کوئی کام نہیں۔ بقول رسکن "اگر دام سے تصویر حاصل نہ ہو سکے تو وہ وقت بھی آجائیگا کہ خود تصویر اسی دام کو آجائے گی"

۱۰۔ حصول زر کے لئے تردد درست نہیں۔ گو امیر کبیر ہونا خال خال آدمیوں کے حصے میں ہے لیکن محنت اور اقتصاد سے ہر کوئی روزی کما سکتا ہے۔ اکثر یہ مذکور ہوتا ہے کہ فلاں آدمی کے پاس ناجایز وسایل سے روپیہ آیا ہے۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ افلاس بھی تو شاذ ہی کسی کے پاس جایز وسایل سے آتا ہے۔ افلاس دولت کی قلت کا نام نہیں بلکہ حوایج کی کثرت کا۔

۱۱۔ اپنی دلچسپ تقریروں میں سر جیمس پیگٹ نے ایک مرتبہ اپنے شاگردوں

کی نسبت جن کے حالات زندگی دیکھنے کا اُسے اتفاق ہوا تھا اس طرح حساب لگایا تھا۔ ایک ہزار میں سے دوسو نے یا طِب کا پیشہ چھوڑ دیا تھا یا کسی طرح بہت مالدار ہو گئے تھے یا اوائل عمر میں ہی مر گئے تھے۔ باقی آٹھ سو میں سے چھ سو کو خاصی کامیابی نصیب ہوئی اور بعض تو مالامال ہی ہو گئے۔ کل تعداد میں سے ۵۶ بالکل ہی ناکامیاب ہوئے۔ اِن میں سے ۱۵ تو ایسے تھے کہ کبھی انہوں نے امتحان پاس ہی نہیں کیا اور دس ایسے تھے جنکو بد اعتدالی یا بداعمالی کی وجہ سے صحت سے ہاتھ دھو بیٹھنا پڑا۔ کل تعداد ایک ہزار میں سے ۲۵ ایسے تھے جو ایسے اسباب کی وجہ سے ناکامیاب ہوئے جن پر اُن کو مقدرت نہیں تھی۔ اس سے بالضرور یہ امر منتج ہوتا ہے کہ طب کی طرح دیگر مشاغل زندگی میں بھی اگر کوئی اپنے تئیں مفید بنانے کی کوشش کرے تو دنیا اُس کی سعی سے بہرہ مند ہوتی ہے +

۱۲۔ اصل میں ضروریات زندگی کے لئے متردد ہونے کی کسی کو چنداں حاجت نہیں۔ انسان کو بالطبع شاذ ہی کسی چیز کی ضرورت پڑتی ہے اور فطرت اُسے بہت کچھ عطا کرتی ہے۔ سامان عشرت کا یہ حال ہے کہ اس پر خرچ بہت آتا ہے اور بقول فرینک لن "ایک بُرے کام پر جسقدر خرچ ہوتا ہے اُس قدر صرف سے دو بچے پرورش پاتے ہیں"

۱۳۔ ڈیوک آف ویلنگ ٹن کا مقولہ یاد رکھنے کے قابل ہے وہ کہتا ہے کہ جہاں سود کی شرح چڑھی ہوئی ہو سمجھ لینا چاہیے کہ مقروض کا اعتبار بہت کم ہے +

۱۴۔ سارا اثاثہ ایک ہی بیوپار میں نہیں لگا دینا چاہیے۔ بعض وقت

ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ہم ہر پہلو سے معاملہ کا بخوبی غور کے ساتھ حساب لگاتے ہیں اور نتیجہ اُلٹا نکلتا ہے۔ بڑے سے بڑے سوداگر اور ساہوکار جو عقل کے پتلے ہوتے ہیں غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ کسی ذی فہم کاروبار والے آدمی کو زیادہ سے زیادہ یہی توقع رکھنی چاہیئے کہ اُس کا حساب کتاب عموماً صحیح ہو۔ ابتدا میں ہم کو سکھایا جاتا ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں لیکن واضح ہو کہ ۲۲ بھی تو ہوتے ہیں۔ علم حساب کے رو سے تو بیشک درست ہے کہ دو میں دو جمع کریں تو چار بن جائیں گے۔ لیکن عملی زندگی میں یہ ایک دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اور اس اصول کی کم فہمی سے کئی ہونہار اشخاص کا ستیاناس ہو گیا ہے +

۱۵۔ جو کام کرو آرام سے کرو۔ کہتے ہیں کہ لارڈ ڈیروہم کی جب عکسی تصویر کھینچا کرتی تھی تو نچلا نہیں بیٹھ سکتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ تصویر میں دھبے پڑ جاتے تھے +

۱۶۔ بیگ ہاٹ کہا کرتا تھا کہ بہت سے آدمی ایسے ہیں جو کاروبار میں اس لئے برباد ہو گئے کہ ان کو کمرہ میں نچلا بیٹھنا نہ آیا +

۱۷۔ ہم مانیں یا نہ مانیں ہم میں سے ہر ایک کسی نہ کسی پہلو سے کاروباری ہے۔ ہر ایک کے کچھ نہ کچھ فرائض ہیں۔ کہیں گھر کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ کہیں مصارف کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ اور جس طرح بڑے بڑے کاموں میں اُلجھنیں ہوتی ہیں اور دقتیں پیش آتی ہیں اسی طرح چھوٹے چھوٹے کاموں کا بھی حال ہے +

۱۸۔ خوبیٔ قسمت سے کاروبار میں کامیابی کا دارمدار زیادہ تر معمولی عقل۔ احتیاط اور توجہ پر ہے نہ کہ ذہانت پر۔ ایک پرانی کہاوت ہے۔

"تم دوکان کی رکھوالی کرو دوکان تمہاری رکھوالی کرے گی"۔ (یعنی تم دوکان پر جم کر بیٹھو یا اپنے کار مفوضہ میں سرگرمی سے محنت کرو اور نتیجہ یہ ہوگا کہ تم مالا مال ہو جاؤ گے)۔ زینوفن نے بھی ایک کہانی اس قسم کی لکھی ہے وہ یہ ہے"۔ ایران کے بادشاہ نے اپنے خوش وضع گھوڑے کو حتی الامکان جلدی سے فربہ کرنے کے لئے واقف کاروں سے سوال کیا کہ کونسی چیز ایسی ہے جس سے کوئی گھوڑا بہت ہی جلدی فربہ ہو جائے اُنہوں نے جواب دیا کہ "مالک کی نظر" (یعنی توجہ یا خبر گیری)

۱۹- کاروباری آدمیوں کی عادات بنانا بہت ضروری ہے۔ تھوڑا ہی عرصہ گذرا ہے۔ میرے ایک ممتاز دوست نے مجھے اس امر کا یقین دلایا تھا کہ کئی بڑے قابل اور عالی خصائل اصحاب کی ناکامیوں پر غور کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ عموماً ناکامیابی کی وجہ یہ تھی کہ وہ منہاوں تھے پابند وقت نہ تھے الغرض کاروباری نہ تھے (یا مرد کاردان نہ تھے)

۲۰- جس طرح عظیم معاملات میں ترتیب اور نظام کی بہت ضرورت ہے چھوٹے امور میں بھی ہے۔ اشیاء کو قرینے سے رکھنا چاہئے۔ یہ قاعدہ سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ جب ہم کسی شئے کو کام میں لاچکیں اُسے ٹھیک جگہ پر رکھدینے میں ذرا تکلیف تو ہوتی ہے لیکن وقت ضرورت اُسے جھٹ آسانی سے نکال سکتے ہیں +

۲۱- زینوفن اپنی کتاب موسومہ بہ "علم خانہ داری" میں لکھتا ہے۔ "میری رائے میں بے ترتیبی کی مثال یہ ہے۔ ایک کسان اپنے کھتے میں جو۔ گیہوں اور مٹر اکٹھے ڈال دیتا ہے جب اُسے جَو کی روٹی یا گندم کی روٹی کی ضرورت ہوتی ہے یا مٹر کے شوربے کی حاجت ہوتی ہے۔

تو ایک ایک دانہ چن چن کر جدا کرتا ہے بجائے اس کے کہ وہ ہر جنس کو وقتِ حاجت کام آنے کے لئے جداگانہ رکھنا ،،

۲۲۔ ایک جہاز کی مثال دیکر زینوفن لکھتا ہے کہ "جب سمندر میں خدا طوفان برپا کردیتا ہے نہ تو کارآمد اشیا کے تجسس کا وقت ملتا ہے۔ نہ بے مصرف ہی چیزوں کے پرے پھینکنے کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتگان عذاب غافلوں کو مرعوب و مغضوب کرتے ہیں اگر وہ اُن اشخاص کو تلف کرنے سے باز رہیں جو کسی غلط کاری کے مرتکب نہیں ہوئے تو ہم کو اس پر قناعت کرنی چاہیئے یہانتک کہ اگر وہ اُن شخصوں کو محفوظ رکھیں جو ہر امر کو درستگی سے ادا کرتے ہیں تو بھی وہ بہت شکریہ کے مستحق ہیں،، پس لازم ہے کہ ہر شئے کو قرینہ سے رکھا جائے +

۲۳۔ اکثر حکیموں نے ارسطو سے لیکر کارلائل تک تجار بلکہ خود تجارت اور حرفت کو قابل نفرت اور باعث رذالت تصور کیا ہے افلاطون کے خیال کے بموجب جمہوری سلطنت میں تجار حقوقِ رعایا سے خارج تھے ایسا رذیل پیشہ اجنبیوں کے حوالے کیا جاتا تھا بشرطیکہ کوئی اُسے اختیار کرنا چاہے۔ چونکہ اکثر لوگ تجارت اور حرفت میں مشغول ہوتے ہیں۔ اگر اِن کا اثر عملی زندگی پر مضر ہوتا تو بڑی آفت آتی شکر کا مقام ہے کہ ایسا نہیں ہوتا اسمیں کلام نہیں کہ کاروباری آدمی دیگر مشاغل کے لئے فالتو وقت ہی دے سکتے ہیں لیکن صرف علم حقایق و قوانین مسلمہ مرتبہ (سائینس) اور علم ادب (لٹریچر) سے ہی مثالیں ڈھونڈیں تو سُن لیجے نیسنتھ ہیئت دان بھی تھا اور دستکار بھی تھا۔ گروٹ ساہوکار بھی تھا اور مورخ بھی تھا۔ سرجے۔ ایونس

کاغذ ساز تھا اور مجلس محققین آثار صنادید (کا ممبر مجلس بھی تھا)
علاوہ بریں۔ شاہی مجلس
کا خزانچی بھی تھا۔ پریسٹر بیج سوداگر تھا بعدہٗ آکسفورڈ میں علم
طبقات الارض کا پروفیسر بن گیا تھا رجبس اور پریڈ
ساہوکار بھی تھے اور شاعر بھی تھے۔ اگر اجازت ہو تو یہ بھی عرض کر دوں
کہ میرے والد صاحب ساہوکار بھی تھے اور ریاضی دان بھی اور کئی سال
تک رائل سوسائٹی کے خزانچی اور وائس پریسیڈنٹ (نائب میر مجلس) رہ چکے
ہیں۔ ان کے سوا اور کئی مثالیں موجود ہیں +

۴۴۔ کارلائل اس اصول کی سخت مخالفت کرتا تھا کہ اشیا
سستی سے سستی منڈی میں سے خریدنی چاہیئے اور جہاں انکی قیمت زیادہ
سے زیادہ دستیاب ہو وہاں فروخت کرنی چاہیئے۔ اس کی تجویز ہے
کہ ہم کو لازم ہے کہ اشیا کی اصل قیمت مقرر کر دیں۔ گو اس کے جواز میں
اس نے کچھ نہیں کہا۔ یعنے ہم یہ کہیں کہ بس اس چیز کی یہ قیمت ٹھیرے
گی۔ اس سے کم نہ ہوگی۔ وہ کہتا ہے کہ ہم کو چاہیئے کہ دوسری قوموں کی
بہ نسبت کم قیمت نہ لیں۔ اور ان کے برابر قیمت لینے پر قناعت کریں +
جائے غور ہے کہ یہ اصول نہ صرف محال بلکہ ناجائز ہے + اگر اشیاء کی بکری
کم ہوگی۔ اشیاء خوردنی کم ہاتھ آئیں گی + کارلائل اس بات کو مانتا ہے
کہ کم قیمت پر فروخت ہونے سے زیادہ مال بک سکتا ہے + پس اگر اس کے
دستور العمل کے موافق کام کیا جائے تو ایسے انسان بھی ہونگے جن کو کپڑے
کی ضرورت ہوگی لیکن مقررہ قیمت دینے کی توفیق نہ رکھتے ہونگے۔ گو ہم
کم قیمت لے سکتے ہوں لیکن وہ ہمیں ایسا نہیں کرنے دینگے۔ اس طرح سے

لوگوں کو کپڑا میسر نہ آیگا اور ہمارے لوگوں کو خوراک نہ ملے گی + تجارت کا اصل اصول یہ ہے کہ جو چیز تم کم قیمت سے پیدا کر سکو دیگر جس چیز کی اشد ضرورت ہو اُسے خرید لو + پس اشیا کا سستی سے سستی منڈی میں سے خریدنا اور جہاں اُن کی زیادہ سے زیادہ قیمت دستیاب ہو فروخت کرنا نہ صرف تجارت کا ضروری قاعدہ ہے بلکہ ہر شخص کے لئے ازبس مفید ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح عمل کرنے سے جن اشخاص کو اپنے مال کی بکری ازحد مطلوب ہوتی ہے اُن کا مال بک جاتا ہے اور جن کو اسباب کی نہایت ضرورت ہوتی ہے اُن کے ہاتھ مال فروخت ہو جاتا ہے + اس اصول کے خلاف عمل کرنا ایسا ہے جیسا کہ (انگریزی ضرب المثل کے موافق) نیوکاسل میں کوئلے لے جانا (اور مشرقی خیال کے بموجب باغ میں پھول لے جانا) +

۲۵ - ایسا اتفاق ہو چکا ہے کہ اکثر اصحاب جو رکن رکیں اور ازبس خوش اور وسیع خیال کئے جاتے تھے بہت غریب تھے - ورڈسورتھ اور اس کی ہمشیرہ کئی سال تک تیس شلنگ ہفتہ وار پر گزارہ کرتے رہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ زندگی میں یہ زمانہ اُن کے لئے انتہائے انبساط سے پر تھا -

۲۶ - اگر دولتمند ہونا تمہاری قسمت میں نہ ہو تو ارتباط خیالات اور ہمت کے ذریعہ سے کوئی جگہ جو اپنی سادگی لئے ہوئے ہو یا چھوٹی سی جھونپڑی یا کوئی خوش کن چہرہ تمہارے لئے دنیا بھر کی نعمت ہو سکتا ہے + زیادہ برین بقول بیکنسفیلڈ "گو دنیا کی سلطنتیں مفلوک الحال اشخاص کے لئے نہیں - آسمان کی بادشاہت تو ممکن ہے کہ اُن کا مال ہو سکے"

۲۷ - حقیقت میں بڑے تعجب کی بات ہے کہ کتنے جلیل القدر آدمی مفلس

تھے - اور حضرت محمدؐ صاحب کے فرمودہ کا تو کیا ذکر ہے کہ "خدائے تعالےٰ ہمیشہ رسولوں کا انتخاب بھیڑوں کے باڑے سے کرتا تھا"

۲۸- عام لوگ مبالغہ سے کہدیتے ہیں کہ جو کچھ ہے روپیہ ہی ہے (ہم یہ پوچھتے ہیں کہ) کیا روپیہ سے خوراک میں کشائش ہوتی ہے؟ سر رچرڈ ٹمپل کا مقولہ ہے کہ "اگر کسی آدمی کو صحت مطلوب ہو تو اُسے لازم ہے کہ غریبوں کی طرح زندگی بسر کرے" صبح کے ناشتہ کے لئے چاء یا کافی اور مکھن روٹی اور بقدر ضرورت انڈا یا مچھلی اور قدرے شہد کے سوا اور کیا ہو - تیسرے پہر کے ناشتہ کے لئے روٹی اور پنیر اور جو کی شراب کا ایک گلاس کافی ہے - سادہ وضع کا طعام اگر عمدگی سے پکایا ہوا ہو - اور اشتہا خوب ہو تو ایسی ہی خوشی حاصل ہوسکتی ہے جیسی کہ کسی لارڈ امیر (بڑے مجسٹریٹ یا امیر کبیر) کی ضیافت میں - جو اشیاء خوردنی عمدہ سے عمدہ اور نہایت خوشگوار ہوتی ہیں اپنے موسم میں نسبتاً کم قیمت کو میسر ہوسکتی ہیں - اور اگر بے موسم ہوں تو بدمزہ ہوتی ہیں بعض اوقات انڈے کی بھی کیا بات ہے - اس سے خاصی ضیافت ہوسکتی ہے - بلکہ اس سے بھی زیادہ + (اچھا اب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ) کیا روپیہ سے (مطالعہ کُتب میں مدد ملتی ہے؟ حقیقت میں وہ آدمی غریب ہے جس کو مطالعہ کے لئے اتنی کتابیں چاہئیں جنکی خرید کی اُسے مقدرت نہیں + اچھی سے اچھی کتابیں یعنی انجیل مقدس - تصانیف شکسپیر اور ملٹن وغیرہ تو اب بقول شخصے کوڑیوں کے مول بکتی ہیں -

۲۹- (تو پھر روپیہ کس مصرف کی چیز ہے؟) کیا اس سے صحت دستیاب ہوسکتی ہے یا ذکاوت مل جاتی ہے - احباب - خوش وضع یا منبسط گھرانہ

آخر اس سے کیا ملتا ہے؟) +

۳۰- کنیفوشش کہتا ہے کہ "ڈیوک آف سے بہت ہی مالدار تھا۔ لیکن کسی کو اُس سے محبت نہ تھی اور بائی - کے گو فاقہ سے مرگیا تھا۔ لوگ اب تک اس کا ماتم کرتے ہیں" +

۳۱- سب باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ بقول ایڈورڈ ینگ (شاعر) "کیا دولت سے خوشی حاصل ہو سکتی ہے؟ اپنے گرد نظر ڈالو اور دیکھو کہ کسقدر مصیبت پھیلی ہوئی ہے جو خوشی کی آڑ میں پوشیدہ ہے کس قدر تباہی آئی ہوئی ہے جو بظاہر شان وشکوہ کا رخ لئے ہوئے ہے۔ میں کسی ظاہری رونق پر رشک نہیں کرتا۔ نہ ہی میں دوسروں کی طرح ملمع کی خوشی چاہتا ہوں۔ جو درحقیقت افسردگی ہوتی ہے" +

۳۲- بیکن کہتا ہے کہ "اصحاب دول کو اپنی سدھ بدھ نہیں ہوتی جب وہ کاروبار کی سرگردانی میں ہوتے ہیں تو اپنی روحانی یا جسمانی صحت پر متوجہ ہونے کے لئے وقت نہیں نکال سکتے" + ایک پرانی لاطینی ضرب المثل ہے کہ "غریب گھر۔ بڑا آرام"

۳۳- بیڑیاں کبھی اچھی نہیں ہوتیں خواہ سونے کی ہوں + حقیقت میں روپیہ تردد کی جڑ ہے + جیسے افلاس میں تفکرات ہوتے ہیں تمول میں بھی ہوتے ہیں اور کئی مالداروں کا یہ حال ہے کہ وہ درحقیقت روپیہ کے مالک نہیں بلکہ غلام ہوتے ہیں + بقول بیشپ ورنس "دولت اکثر دولت مندوں کے لئے نہ صرف باعث فکر بلکہ عذاب ہو جاتا ہے"

۳۴- فی الحقیقت دولت نے کئی آدمیوں کا ناس کر دیا ہے۔ اور حاصل کلام یہ ہے کہ امیر غریبوں کی نسبت روپیہ کے معاملات میں غالباً زیادہ تر متردد

ہوتے ہیں۔ دولت سے عقلمندوں کے سوا کسی کو خوشی میسر نہیں ہو سکتی +
جو شخص دولتمند ہونے کے لئے ضرورت سے زیادہ کوشش کریگا وہ ہمیشہ ہی غریب
رہیگا۔ رسکن کہتا ہے کہ ایک چھوٹے سے مکان میں رہنا اور کسی عالیشان
مکان کو دیکھ کر متحیر ہوتا +

میرے خیال میں اس عالیشان مکان میں رہنے سے زیادہ تر باعث مسرت ہے۔ کیونکہ آخری صورت
میں کوئی شئے نہیں ہوتی جو ہمارے تحیر کے لئے غذا بن سکے +

۳۵۔ دولت کا لطف اُٹھانا ہو تو اُس سے دلبستگی پیدا نہیں کرنی چاہیئے +
شیخ سعدی نے کہا ہے "ھذا المقدار یحملک وما زاد علے ذالک فانت حاملہ"
(یعنی ایں قدر ترا بر پائے دارد و ہر چہ بریں زیادت کنی تو حمال آنی")

"نہ باشتر بر سوارم۔ نہ چو اشتر زیر بارم نہ خداوند رعیت نہ غلام شہریارم
غم موجود و پریشانی معدوم ندارم نفسے میزنم آسودہ و عمرے بسر آرم"

۳۶۔ بیکن کا قول ہے کہ اُس دل پر کسقدر مصیبت ہوتی ہے جس کی خواہشیں
تو بہت کم ہوں لیکن اُس کے خطرات کثیر ہوں" شکسپیر کہتا ہے "اگر تو دولتمند
ہے تو یہ جان لے کہ تو غریب ہے۔ کیونکہ تو گدھے کی طرح جسکی پشت سونے چاندی
کے بوجھ سے خمیدہ ہو گئی ہو تو صرف ایک منزل تک مال و دولت لیجائے گا۔
اور موت تیرا بوجھ ہلکا کر دیگی" انگریزی شاعر جونسن کہتا ہے "ہم کیوں فکر میں جان ماریں اور کیوں آئندہ کے لئے خزانے جمع کریں
کیا بیماری کی مصیبت میں یہ خزانے ہمارے ماندہ دل کو خوش کر سکتے ہیں؟
یا ان سے آرام کی صورت پیدا ہو سکتی ہے؟ کیا بستر مرگ پر روپیہ سے ایک لمحہ
زندگی بڑھ سکتی ہے؟ یا جان کنی کے اضطراب میں تخفیف ہو سکتی ہے؟"۔

(باقی آئندہ)

چند گھنٹے لورپول میں

سفر ٹرکی میں بہت سے اصحاب نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ یعنی انگلستان میں شیخ عبداللہ کوئیلم (شیخ الاسلام جزائر برطانیہ) سے بھی ملاقات کی یا نہیں اور اگر کی تو میری رائے اُن کی نسبت کیا قایم ہوئی۔ اور یہی سوال جب سے میں ہندوستان میں آیا ہوں دُہرایا گیا ہے۔ اس لئے اس مختصر سی ملاقات کا حال جو مجھے شیخ ممدوح سے ایک مرتبہ نصیب ہوئی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ میں نے لندن سے بعض معاملات کے متعلق شیخ عبداللہ کوئیلم سے خط وکتابت کی تھی اور انہوں نے مجھے دعوت دی تھی کہ لورپول جا کر ان کے ہاں ٹھیروں۔ لیکن اس کا موقعہ نہ ملا۔ ایک دفعہ میں اتفاق سے مانچسٹر میں مقیم تھا۔ کہ ایک دن فرصت کا نکل آیا اور یہ معلوم ہوا کہ لورپول وہاں سے قریب ہی اور گاڑیاں بکثرت جاتی ہیں۔ اس موقعہ کو غنیمت جان کر میں روانہ لورپول ہوا۔ اتنا تامل ضرور تھا کہ بے اطلاع جاتا ہوں۔ خدا جانے شیخ ممدوح وہاں ہوں یا نہ ہوں۔ یا انہیں فرصت ملاقات ہو یا نہ ہو۔ لیکن چونکہ دوسرے موقعہ کا ملنا غیر متیقن تھا۔ جانا ہی مناسب سمجھا۔ خوش قسمتی سے شیخ لورپول میں ہی تھے اور اپنے دفتر میں مل گئے اور جس اخلاق سے باوجود کم فرصتی کے اور باوجود کسی ملاقاتی کی آمد کے لئے تیار نہ ہونے کے وہ پیش آئے اس کا ایک گہرا نقش میرے دل پر ہے +

مجھے اُن کے کاروباری دفتر کا پتہ معلوم تھا۔ جہاں وہ سالسٹر کا کام

کرتے ہیں۔ شہر کے کامیاب سالسٹروں میں اُن کا شمار ہے۔ اور اُن کے
وقت کا بیشتر حصّہ اسی کام میں صرف ہوتا ہے۔ کام سے فرصت کا وقت
نکلتا ہے۔ اسے آپ اپنے مذہب کی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔ میں جب
گیا تو وہ ابھی دفتر میں تشریف نہیں لائے تھے۔ اُن کے آدمی نے مجھے وہاں
بٹھایا۔ اور کہا کہ ابھی آتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ تشریف لے آئے اور میرا
کارڈ دیکھتے ہی مجھے بلایا۔ نہایت خوش ہوکر ملے مگر شکائت کی کہ میں نے
اُنہیں پہلے سے مطلع کیوں نہیں کیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ میرا آنا اتفاقی ہوگیا
اور میں بہت تھوڑے سے وقت کے لئے آیا ہوں۔ اس لئے اسے اُس آنے
میں محسوب نہ کیا جاوے جس کا وعدہ تھا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے
اور کہنے لگے کہ میں اس وقت بھی خیر مقدم کہتا ہوں اور پھر آپ آئیں گے
تو پھر کہوں گا اور میری خوشی یہ ہے کہ آپ کم از کم دو تین دن کے لئے آئیں
اور کوئی تعطیل کا دن درمیان ہو تو میں آپ کو جزیرہ میں لے چلوں۔ جہاں
میرا گھر ہے اور جہاں اب لورپول کا مختصر سا اسلامی مدرسہ و یتیم خانہ بھی بغرض
سہولت منتقل کر دیا ہے۔ میں خود اکثر وہاں چلا جاتا ہوں۔ اور وہ جگہ بہ اعتبار
صحت بخش آب و ہوا کے اس کارخانوں سے بھرے ہوئے۔ اور دھوئیں
سے گھرے ہوئے لورپول پر قابل ترجیح ہے۔ میں نے بھی جزیرہ کو دیکھنے کا
شوق ظاہر کیا اور کہا میں کوشش کرونگا کہ پھر آؤں اور وہاں کی سیر کروں
لیکن آج یہاں دو غرض سے آیا تھا۔ ایک آپ کی ملاقات سو حاصل ہوگئی
دوسرے آپ کے اسلامی عشق کے کام کا جو حصّہ یہاں نظر آسکتا ہے اُسے
یا آپ کی معیت میں دیکھنا یا آپ کے کسی معتبر کے ساتھ جاکر دیکھنا۔ اُنہوں
نے کہا جو کچھ یہاں موجود ہے۔ وہ میں خود ساتھ چل کر آپ کو دکھلاؤں گا۔

اب یہاں صرف ہمارے مسلم انسٹی ٹیوٹ کی عمارت ہے۔ اس میں ایک بڑا کمرہ ہے۔ جو لکچروں کے لئے ہال کا کام دیتا ہے اور جمعہ کے دن مسجد کا کام۔ اگر آپ جمعہ کے دن تشریف لائیں تو پچاس ساٹھ نمازیوں کی جماعت آپ کو ملے گی۔ ہمارے رجسٹر پر نومسلموں کی تعداد کئی سو تک پہنچ چکی ہے۔ مگر ان میں سے بعض فوت ہو گئے۔ بعض کہیں دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ اب بھی کوئی تین سو کے قریب انگریز لورپول اور اس کے گرد و نواح میں ایسے ہیں جو ہماری جماعت میں شامل ہیں۔ ان میں سے جو جمعہ کے دن شہر میں ہوتے ہیں وہ نماز جمعہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ مگر لکچر کا دن اتوار کا ہے۔ اس دن زیادہ مجمع ہوتا ہے۔ اور لکچروں کے سننے کے لئے عیسائی بھی آتے ہیں۔ اور بارہا یہ ہوا ہے کہ وہ لکچروں سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ مائل بہ اسلام ہو گئے۔

میں نے سوال کیا: "یہ تو فرمائیے کہ آپ جب اشاعت اسلام کرتے ہیں یا فرائض اسلام ادا کرتے ہیں تو اب بھی لوگ آپ پر اینٹ پتھر پھینکتے ہیں یا نہیں جیسے پہلے دنوں میں کیا کرتے تھے۔"

جواب: "اب وہ نوبت نہیں لیکن پھر بھی کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ لوگوں کا تعصب ابھی دور نہیں ہوا۔ گو ابتدا میں جو ہجوم ہوتا تھا اور جو اذیتیں دی جاتی تھیں ان سے نسبتاً امن ہے۔ میں بھی حتی الوسع احتیاط سے کام لیتا ہوں اور انہیں خواہ مخواہ چھیڑ کا موقع نہیں دیتا۔ (اپنی انگریزی ٹوپی کی طرف اشارہ کر کے) دیکھئے میں عموماً یہی ٹوپی اوڑھتا ہوں۔ اور فوراً ان لاکھوں انگریزوں میں مل جاتا ہوں جو شہر کے کوچہ و بازار میں پھرتے ہیں اور جن سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ کون جانتا ہے کہ یہ کوئی مسلم جا رہا ہے اور بہت سے کوئلیم جاننے والے ایسے بھی ہونگے جو یہ نہیں جانتے کہ یہ عبداللہ

کوئیلم ہے۔ ابتدا میں لوگوں نے میرے کام میں خلل ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کہکر کہ اس شخص کے حواس میں خلل آگیا ہے جو اپنے آپ کو مسلمان بتاتا ہے۔ جب میں نے اُسے کوشش اور محنت سے یہ ثابت کر دکھایا کہ سالسٹری کے کام کے لئے میں وہی کوئیلم ہوں جو اسلام قبول کرنے سے پہلے تھا۔ تو کاروبار کی پہلے کی سی حالت قایم ہوئی۔ اب میں اپنی اسلامی وردی صرف جمعہ کے دن پہنتا ہوں اور باقی دنوں میں مثل اور لوگوں کے رہتا ہوں "

لورپول جانیسے پہلے مینے شیخ کی ایک تصویر ترکی علما کے لباس میں دیکھی تھی اور یہی اُن کی وقت نماز کی وردی ہے۔ شایداس لبنے اور کھلے لباس کی وجہ سے ہوگا۔ کہ وہ خاصے قدآور معلوم ہوتے تھے۔ مگر دیکھنے پر معلوم ہوا۔ کہ آپ کا قد چھوٹا ہے۔ اُن کی صورت زیادہ تیزی کا پتہ نہیں دیتی۔ مگر آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہے اُن کا روزمرہ کا لباس انگریزی مذاق کے اعتبار سے بھی بہت سادہ ہے۔ اور وہ باوجود خوشحالی کے قریب قریب درویشانہ زندگی بسر کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی گفتار میں بھی وہ بات نہیں جو اُن کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ گو طاقت زبان معمولی گفتگو میں بھی موجود ہے۔ اُن کا تلفظ اور لہجہ اس علاقہ کا تلفظ اور لہجہ ہے جس میں وہ رہتے ہیں یہ بات شاید عام طور پر معلوم نہیں کہ انگلستان جیسے چھوٹے سے ملک میں بھی مختلف حصّوں کے تلفظ اور لہجے میں فرق ہے چنانچہ مانچسٹر اور لورپول وغیرہ میں ایسے الفاظ کو جن میں حرف بالفتح پڑھا جاتا ہے۔ بالضم بولتے ہی ہیں۔ مثلاً "کپ" (پیالہ) کو "کُپ" اور "فن" (ہنسی۔ تماشا) کو "فُن" کہتے ہیں اور ہمارے شیخ کوئیلم بھی اس تلفظ

کے عادی ہیں +

دفتر میں کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد شیخ مجھے ایک ہوٹل میں کھانا کھلانے لے گئے۔ کھانے پر مختلف اسلامی مضامین کے متعلق باتیں ہوتی رہیں جن سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ شیخ کا دل حقیقت میں نورِ اسلام سے منوّر ہے۔ وہ جو خدمت اسلام کی وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں خلوص سے کرتے ہیں اگر ان کو سلطان المعظم کے ہاں سے کچھ امداد ملتی ہے۔ یا وہاں ان کی خدمات کی قدر کی گئی ہے۔ تو یہ ان کی خوش قسمتی اور سلطان کی بیدار مغزی ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ امداد یا قدردانی ان کی مساعی کا باعث نہیں ہے۔ بلکہ ان کی مساعی ان کے دلی عقیدے کا نتیجہ ہیں۔ اور یہی وہ رائے تھی جو میں نے ان لوگوں کو دی جنہوں نے جابجا شیخ کی نسبت مجھ سے استفسار کیا۔ یہ بھی بیان کیا کہ شیخ عبداللہ کوئیلم کے پکے مسلمان ہونے کی ایک اور شہادت بھی مجھے ملی ہے جو قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ مجھے لندن میں ان کے چھوٹے صاحبزادے مسٹر بلال کوئیلم سے ملنے کا اتفاق ہوا جو باپ کے پیشہ کی سند حاصل کرنے کے لئے لندن میں پڑھتے ہیں اوّل تو اس نام سے ہی پیغمبر اسلام کی محبت ٹپکتی ہے۔ دوسرے ان کی تقریر جو اسلام کے متعلق سنی تو جی خوش ہو گیا اور معلوم ہوا کہ باپ نے خاص توجہ سے بیٹے کو اپنے مذہب سے آگاہ کیا ہے۔ اور یہ بات بغیر خلوص کے ممکن نہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم پہلے مسلمانان لورپول کی قبور دیکھنے گئے۔ کوئی پچیس تیس قبریں ہونگی جو وہاں کے عیسائی قبرستان کے ایک گوشے میں بنی ہوئی ہیں اور دیگر قبور سے صاف نظر آرہی ہیں کیونکہ قبلہ کے لحاظ کی وجہ سے ذرا آڑی بنی ہیں اور دوسری قبروں کی

سیدھ میں نہیں۔ شیخ نے سنایا کہ وہاں مسلمانوں کو دفن کرنے کے متعلق بہت جدوجہد کا سامنا ہوا تھا اور بہت جھگڑے کے بعد وہ زمین جس میں انگلستان کے ان اوّلین مسلمانوں کی قبریں بنی ہیں۔ مسلمانوں نے مول لے لی تھی۔ یاد رفتگان سے شیخ کی آنکھیں پُرآب ہوگئیں۔ کیونکہ ان سونیوالوں میں بہت سے اُن کے رفیق و مونس تھے جنہوں نے ابتدائی تکالیف کے مقابلہ میں اُنکا ساتھ دیا تھا۔ اور ہم نے فاتحہ کیلئے ہاتھ اُٹھائے کہ خدا ان مبارک ارواح پر رحمت فرمائے۔

قبرستان سے ہم انسٹی ٹیوٹ کی طرف آئے۔ مختصر سی عمارت ہے جو موجودہ ضروریات کے لئے کافی ہے اس عمارت کا ایک حصہ سہ منزلہ ہے۔ داخل ہوتے ہی دفتر کا کمرہ ہے۔ اُس کے آگے ہال کا بڑا کمرہ۔ ہال میں کوئی تصویریں یا دیگر آرائش نہیں۔ صرف ایک چبوترہ تقریر کے لئے بنا ہے اور نیچے کرسیاں رکھیں ہیں۔ نماز کے وقت کرسیاں اُٹھا دی جاتی ہیں۔ چبوترہ کے ساتھ کی دیوار پر جلی حروف میں امیر عبدالرحمان خان مرحوم کے گران بہا عطیہ کا ذکر ہے جو پرنس نصر اللہ خان کے ہاتھ لورپول کی اسلامی جماعت کو دیا گیا تھا اوپر کے کمرے اسوقت خالی پڑے ہیں یا اُن میں نچیں کرسیاں وغیرہ رکھی ہیں۔ پہلے وہاں مدرسہ کی جماعتیں تھیں اور ایک کمرہ امام مسجد کو ملا ہوا تھا جو وہیں رہتا تھا۔ کچھ عرصہ تک بعض انگریزی دان ہندوستانی مسلمان اس خدمت پر مامور رہے۔ مگر آجکل کوئی آدمی اس مطلب کے لئے مقرر نہیں۔

انسٹی ٹیوٹ دیکھنے کے بعد میں شیخ سے رخصت ہونیکو تھا۔ مگر انکی مروت نے اجازت نہ دی۔ اُنہوں نے کہا کہ چند منٹ اور آپکی معیت میں گذار سکتا ہوں اور میرے ساتھ ریل تک مجھے پہنچانے آئے۔ رستے میں لورپول کا بڑا بازار اور ٹاؤن ہال بھی اُنہوں نے مجھے دکھایا۔ اور اسکے بعد پھر لورپول آنے اور اُنکے ہمراہ اُنکے مکان پر چلنے کی تاکید کر کے رخصت ہوئے۔

(عبدالقادر)

پھولوں کی تعریف میں

جناب نواب سراج الدین احمد خان صاحب سایل دہلوی کا یہ قطعہ شایع کرتے ہوئے یہ بیان کر دینا ضروری ہے۔ کہ نواب صاحب موصوف کو یہ قطعہ لکھنے کا خیال اُن نظموں کو دیکھ کر پیدا ہوا جو منشی محمد عنایت اللہ صاحب کے ترجمہ نظم لارڈ لٹن پر لکھی گئی تھیں اور مخزن میں شایع ہو چکی تاہم انہوں نے اس قطعہ میں اپنے خاص رنگ کی اتنی خصوصیات بھر دی ہیں۔ کہ یہ سب پہلی نظموں سے الگ ہو گیا ہے۔ اس میں پھولوں کی تعریف جس شرح و بسط کیساتھ کی گئی ہے وہ قابل ملاحظہ ہے۔ اشعار میں تغزل سے کام لیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے کہ مدح ممدوح کا سلسلہ اول سے آخر تک قایم رہا ہے اس نظم میں قصیدہ کی صفت پیدا ہو گئی ہے۔ تشبیہہ و استعارہ کی کثرت کے باوجود زبان کا پہلو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس پر مبالغہ سے بالکل بچے رہے ہیں۔ امید کہ اہل نظر ان سب باتوں کی داد دیں گے +

باغباں کی جا ئی جسکے دونوں دیدے ہیں پُرنم ۔۔۔ گھر سے نکلی پھول لے کر بیچنے بازار میں

ہاتھ میں لکڑی لئے سر پر سبد گل کا دھرا ۔۔۔ کہہ رہی ہے رہرؤں سے نالہائے زار میں

مجکو دیکھو رحم کے قابل ہے میرا حال زار ۔۔۔ ہو اگر حس بصارت دیدۂ بیدار میں

پھر مری محنت مری ہمت کو دیکھو روز روز ۔۔۔ گھر سے پھولوں کے لئے جاتی ہوں میں گلزار میں

اُنکا چننا سہل کچھ مجھسے اپاہج کو نہیں ۔۔۔ ٹہنیوں میں اُلجھ جاتی ہوں کپڑے خار میں

الغرض لاتی ہوں میں ان دقتوں سے جنکے پھول ۔۔۔ پھول بھی وہ جو شگفتہ تازہ تر گلزار میں

انکی دنیا باغ دولت خانہ ہے صحن چمن ۔۔۔ انکی گنجایش قلوب کا فرو دیندار میں

انکے شایق پیر و برنا انکی عاشق جن و انس
شوق سے رکھتی ہیں انکو طرۂ دستار میں

فال نیک انکی خریداری کی نیت کا ہے نام
یہ تمہیں پہنچا کے چھوڑیں خدمت دلدار میں

بیویونکی بالیوں میں بھر کے لوٹو گے بہار
ہاتھ کے گجرے ہیں ڈالو یا گلے کے ہار میں

سر پہ دولہا کے بنا کر انکا سہرا باندھ دو
دینے والے یہ نہیں ہیں سنگ گوہر بار میں

غنچۂ دلشگفتہ اُن کا ہے کلیدِ قفل عیش
انکا ہے فرمان جاری حسن کی سرکار میں

دخل ہے انکا حرم میں قبضہ انکا دیر پر
در میں آویزاں اگر ہیں نقش ہیں دیوار میں

لطف عشرت کرکرا ہو گر نہو انکا قدم
کار وہ کس کام کا ہے یہ نہوں جس کار میں

ہاتھ پھیلاتی ہیں ہنسکر انپہ بچے شیر خوار
اُن کی خواہش طبع ناہشیار میں ہشیار میں

شہد کی مکھی کو دیکھو انپہ دل سے ہے فدا
عندلیب خوشنوا لیکر پھرے منقار میں

تیتری لاکھوں طرح کی انپہ ہوتی ہے نثار
باغ میں صحن چمن میں دامن کہسار میں

آنکھ پر رکھئے تو زیبا سر پہ گر رکھئے بجا
بار انکا ہو نہیں سکتا ہے دخل بار میں

تندرستوں میں رہیں تو باعث سور و سرور
روح بخشیں ہو گذر گر صحبت بیمار میں

انکی صورت جام جم سے متحد ہے کسقدر
ملتے جلتے ہیں یہ گیتی ثابت و سیار میں

منہ لگا کر اُن کو دیکھو بشتر آتا ہے لطف
اس مزے سے جو ہو حاصل بوسۂ دلدار میں

اُن سے کھل جاتے ہیں کچھ رنگینیِ قدرت کے راز
چہرے انکے چڑھ چکے ہیں دفتر اسرار میں

پالتے ہیں ناز سے اُن کو نہالانِ چمن
حسن کی دیبی کہو تو ہیں شریک اقرار میں

ہے زبان قاصر اگر کچھ وصف سوسن ہو بیاں
چشم جاناں کی ادا ہے نرگسِ بیمار میں

عارض جاناں میں ہے رونق انہیں کے نام کی
لوگ کہدیتے ہیں گویا گل ہیں وہ رخسار میں

مسجدوں میں انکی خوشبو مندروں میں انکی بو
شیخ عمامہ میں رکھے برہمن زنار میں

یہ ہیں مطبوع خلایق اتنے اُن کی نقش بھی
دل لبھاتے ہیں لگا دو جس جگہ دیوار میں

ہر جگہ انکی ضرورت ہر جگہ ہے انکا دخل
میتوں پر مقبروں میں شادیوں کی کار میں

زیست میں دمساز یہ ہیں بعد مردن یار یہ — وہ صفت پوری ہے انمیں جو ہو کوئے یار میں
صورت انکی بھولی بھولی پیاری پیاری نرم نرم — ملتی جلتی ہے شباہت حسن روئے یار میں
سیرت اُن کی روح افزا خوش کن و صحت فزا — جو صفت انمیں ہے وہ ہے کب کسی دلدار میں
رنگ انمیں وہ نہیں ہیں جو جواہر کو نصیب — آنکھ میں چھپتے ہیں لیکن منبسط آثار میں
یو ہمیشہ اُنکی اُنکی خواستگار و ہمیں رہی — یار لیں یار و ہمیں ہے اغیار لیں لغیار میں
یا وفا اتنے کہ کر دیں جان تک کو بھی نثار — بار پائیں جب کسی سرکار میں دربار میں
تیل انکا گر نکالا تو نہیں اُن کو دریغ — عطر اُن کے دیکھ لیجے طبلۂ عطار میں
قعر انبیقوں کے اندر یہ رہیں بنکر عرق — یہ دوا بنکر ہوں داخل نسخۂ بیمار میں
خشک ہو کر انکی پتی جز مفرح کی بنے — نوش جان کرتے ہیں اکثر شکوہ ہائے خار میں
یوسفؑ کنعانِ گلشن انمیں ایک اک پھول ہے — ہاتھ خالی آکے کیا لیگا کوئی بازار میں
ہیں مشبہ بہ تمہاری نونہالوں کے یہی — جھوٹ کہتی ہوں تو کھولو تم زبان انکار میں
وصف جو ہیں انمیں وہ مجمل کئے میں نے بیاں — معل لینے کی ہو ہمت کیسۂ زردار میں
نظم سائل تو نے لکھی خوب کیا کہنا تیرا — لیکن احسنؔ سے[1] مزہ کم ہے تیری اشعار میں

اقبال کا خیر مقدم

ہو مبارک حضرت اقبال آنا ہند میں — ہو مبارک آپکو تشریف لانا ہند میں

---

[1] احسن سے مراد حکیم سید مہدی حسن صاحب احسن تخلص ہے جو متوطن لکھنؤ میں اور حکیم نواب مرزا شوق مرحوم کے نواسہ ہیں جنکو ہر قسم کی نظم و نثر لکھنے میں ید طولی حاصل ہے +

آئے ہوکر علم کی دولت سے مالا مال تم
ہوکے کامل فلسفہ کے علم میں آئے ہو تم

بنگئے اقبال سے اب ڈاکٹر اقبال تم
خوبیاں حکمت کی کیا کیا دلمیں بھر لائے ہو تم

اب یہ مرضی ہے تمہاری ہو کہ بیرسٹر بنو
ہند پر چھائی گھٹا ادبار کی نکبت کی ہے

یا کسی کالج میں جاکر تم پروفیسر بنو
اب ضرورت اس کو ایسے شخص کی خدمت کی ہے

جانتے ہو خوب ہی اقبال حالت اسکی تم
صرف اک پنجاب ہی تم پر نہیں نازش کناں

دیکھیں تم بھی کسطرح کرتے ہو خدمت اسکی تم
بلکہ ہو تم مایۂ صد فخر کل ہندوستاں

مدتوں سے نظم ہمنے آپکی دیکھی نہیں
آپکی نظموں کے اک مدت سے ہم مشتاق ہیں

سچ تو یہ ہے اسکی فرصت آپکو تھی بھی نہیں
آپ فن شاعری میں شہرۂ آفاق ہیں

ابتو فرصت آپکو تعلیم سے بھی ہوگئی
ہر مہینے ابتو ہم دیکھیں گے نظمیں آپکی

ابتو مخزن میں چھپیں گے آپکے اشعار بھی
دیکھیں گے ہم آپکے افکار گوہر بار بھی

[illegible]

برکھا رت

چھائی ہیں کالی کالی گھٹائیں
چلتی ہیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں

وجد میں بلبل جھوم رہے ہیں
کبک چمن میں گھوم رہے ہیں

سنتی ہے کس کی بادِ صبا اب
گل کو بتائے کیوں نہ ہوا اب

چلتی ہے اٹھلاتی ہر سو
پھرتی ہے اتراتی ہر سو

حسن برستا ہے گلشن پر
جوبن ہے خوبانِ چمن پر

پودوں نے پیلے پیلے کپڑے
پھینک کے بدلے دھانی جوڑے

سر پہ چھوٹے چھوٹے قطرے
کیسی بہاریں ہیں دکھلاتے

پہنی ہے لچھمی جی نے گویا موتیوں کی اک بھاری مالا
طوطے شریفے پر آ بیٹھے لو گرنے لگے ٹپ ٹپ قطرے
نیبو پر یوں فاختہ گائی "یا پاک تو ئی یا پاک تو ئی"
گاتی ہے بلبل ہنستی ہیں کلیاں کیک ہیں شاداں مور ہیں رقصاں

بیٹھ کے شاخ سرو پہ قمری
ہے یہ غزل کیا جھوم کے گاتی

ہجر کی ایذا کب تک اُٹھائیں؟ آکے گلے سے لگ جا پیارے
دل پر چوٹ کہاں تک کھائیں؟ آکے گلے سے لگ جا پیارے

ساون کی یہ کالی گھٹائیں اور یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں
آہ کہاں سے تجھ کو لائیں آکے گلے سے لگ جا پیارے

پہلے وہ شوخی اب یہ حیائیں پہلے وہ الطاف اب یہ جفائیں
بھاگئیں دل کو اُف یہ ادائیں آکے گلے سے لگ جا پیارے

خانۂ دل کو آج سجائیں۔ راہ میں تیری آنکھیں بچھائیں
پاؤں پہ گر کر تجھ کو منائیں۔ آکے گلے سے لگ جا پیارے

ہائے کہاں تجھ شوخ کو پائیں۔ دل کی حالت کس کو سنائیں
تاب کہاں سے ضبط کی لائیں؟ آکے گلے سے لگ جا پیارے

بوندیاں پڑتیں جھولا ہوتا۔ کوئی ملہری گاتا ہوتا
دل کی لگی کس طرح بجھائیں۔ آکے گلے سے لگ جا پیارے

وصل کی شب وہ تیرا بگڑنا۔ دم میں منانا اور ہنس دینا
یاد آتی ہیں ساری ادائیں۔ آکے گلے سے لگ جا پیارے

ظلم کی آخر حد بھی ہے کوئی۔ دیکھ کلیجہ ہو گیا چھلنی

ہو چکیں اب بہتیری جفائیں آ کے گلے سے لگ جا پیارے
تجھ بن سونی سیج پڑی ہے۔ من کی نگری اجڑی ہوئی ہے
تو جو بسائے دوں میں دعائیں۔ آ کے گلے سے لگ جا پیارے
سارا زمانہ خوشیاں منائے۔ غیرت سر پر خاک اڑائے
روتے کٹیں یوں ایسی فضائیں! آ کے گلے سے لگ جا پیارے

آہا آہا کیا سماں ہے — دیکھ کے جس کو دل شاداں ہے
چھوڑ کے صوفی اپنی خلوت — نکلا کہ دیکھے جشن قدرت بزم
رند بھی نکلے اپنے گھروں سے — آنکھیں ملتے۔ شور مچاتے
ایسی فضا برباد نہ جائے — ساقی کدھر ہے؟ جام پلائے
ساغر مے کو منہ سے لگائے — تشنہ لبوں کی پیاس بجھائے
کشتی مے لو دی وہ دکھائی — اور بط مے تیر کے آئی

ساقی خموں کو کھول رہا ہے
مستوں کا طوطی بول رہا ہے

لوٹنے لگیں بوندیں ہر سو — اڑ گئے سارے پنکھ پکھیرو
پانی برستا ہے چھم چھم چھم — چھت سے زمیں تک چھم چھم چھم
پانی کی دھاریں نور کی چھڑیاں — موتیوں کی ہیں سیکڑوں لڑیاں
دلکش ہیں جھرنوں کی صدائیں — بلبلیں جیسے مل کر گائیں
سارے گڑھے اور پل اور نالے — بھر بھر کے ہیں ابلے پڑتے
ندیاں جاری سڑکوں پہ ہر جا — وینس کا ہے ہو بہو نقشہ
بجلی کوندی۔ بادل کڑکے — لڑکیاں کانپیں۔ سہمے لڑکے
نالے ابلے۔ ندی چھلکی — بادل گرجے۔ بجلی چمکی

آہا آہا چہرۂ دہقاں ہو گیا دیکھو کیسا درخشاں
ہنس ہنس کے سب ہل ہیں چلاتے بوتے ہیں دھاں اور خوش ہیں گاتے
عیش کی دی جھرنوں نے منادی
دہقان سمجھے نغمۂ شادی

سر جون مور کا جنازہ

نہ بانگِ دُہل تھی نہ ماتم کا باجا چلا سوئے مدفن جب اُس کا جنازا
تلنگوں نے بھی قبر پر اُس جواں کی دداعی کوئی توپ اُس دم نہ داغی

کسی طرح سنگین سے گھاس ہٹا کر لٹایا اُسے کنج مرقد میں لا کر
اندھیرا تھا اور رات تھی سنسناتی کرن چاند کی تھی کبھی جھلملاتی
دمِ واپسین شمع بھی کھینچتی تھی عجب بیکسی تھی عجب بے بسی تھی

نہ تو اُس کا سینہ کفن سے چھپا تھا نہ جسم اُس کا چادر میں لپٹا ہوا تھا
مگر مثل شیرِ جواں وہ بچارا تھا بیجان جنگی لباسوں میں سوتا

پڑھا فاتحہ مختصر ہم نے اُس دم کوئی لفظ افسوس بولے نہ واں ہم
رہے غور سے دیکھتے اُس کی صورت یہ ڈر تھا کہ آتی ہے کل کون آفت

لحد کھودنے میں تھے مصروف جب ہم / سرہانے کو صاف اُسکے کرتے تھے جب ہم
خیال اپنے دل میں یہی تھا گزرتا / کوئی اجنبی خواہ دشمن مبادا
حقارت سے لات اُسکی سر پر نہ مارے / رہیں جب سمندر میں ہم لوگ سارے

اہانت کا لفظ اُس کی نسبت کہینگے / اُسے بالیقیں گالیاں بھی وہ دینگے
خیال اس جواں کو نہ ہو اِس کا اصلا / اُسے چھوڑ دیں قبر میں گر وہ سوتا

ہوا جبکہ کام اپنا انجام آدھا / بجا اُس گھڑی کوچ کرنیکا گھنٹا
صدا توپ کی دور سے آرہی تھی / عدو کی جماعت جسے چھوڑتی تھی

اُسے خون آلود میدان سے لاکر / رکھا ہم نے آہستہ مرقد کے اندر
نہ مصرع کوئی لوح تربت پہ کھودا / نہ سنگِ لحد قبر پر اُسکی رکھا
دیا چھوڑ تنہا وہاں سے چلے ہم / جہاں اُس کی نام آوری تھی بہم

(مولوی محمد اسمٰعیل بی اے آرہ)

مرغابی

ڈھل گیا دن، اور شبنم ہے زمیں پر قطرہ ریز / گوشہ مغرب میں گلگوں ہے شفق سے آسماں
پڑ رہی ہیں دور تک سورج کی کرنیں زرد زرد / جارہی ہے تو اکیلی شام کو اُڑتی کہاں؟

دیکھتا ہے کیوں عبث صیاد سوئے آسماں / یاس کی نظروں سے تیری شوکتِ پرواز کو

ارغواں زارِ فلک کی منظرِ خوش رنگ نے — کر دیا ہے اور دلکش تیری نقشِ ناز کو

ڈھونڈھتی پھرتی ہے کیا کوئی سُہانا آشیاں — یا کہ سرگرمِ تلاشِ دامنِ دریا ہے تو
یا کسی بحرِ تموّج خیز کی ہے جستجو — یوں سکوتِ شام میں کیوں آسماں پیما ہے تو

تو جو بے سنگِ نشانِ جادہ و بے مرحلہ — کر رہی ہے آسمان پر قطعِ طبقاتِ ہوا
اُڑ سکے بے بدرقہ تو - یہ کہاں تیری مجال — کوئی طاقت ہے - مگر تیری مقرر رہنما

اے سُبک پروازا تیری سُرعتِ پرواز نے — طے کیے کتنے ہی دن بھر سرد طبقاتِ نسیم
ہو کے وا ماندہ زمین پر گر نہ شہپر جوڑ کر — شب کی ظلمت کا ہے گرچہ سر پہ طوفانِ عظیم

ہو چکی تیری مشقّت ختم تجھکو عنقریب — گرمیوں کا اک سُہانا گھر ملیگا خوشگوار
گائیگی ہوگی چھوٹی چڑیوں میں ہم آہنگی سے تو — اور نشیمن پر ترے ہوگی نیستاں کی بہار

ہو گئی غائب فضائے آسماں میں گرچہ تو — اور اب آنکھوں میں ہے تیرا تصوّر یادگار
مینے سیکھا ہے سبق لیکن تیری پرواز سے — ہے طریقِ زندگی میں تو مری آموزگار

منطقہ سے منطقہ تک اے سُبک پروازِ شوق — وسعتِ اوجِ فلک پر ہے جو تیرا راہبر
مجھکو بھی لیجائیگا وہ منزلِ مقصود تک — جب کرونگا جادۂ ہستی سے میں تنہا سفر

(ترجمہ انگریزی) (سُرور جہان آبادی)

غزلیں

دردِ دل گاہ تو گہ دردِ جگر ہوتا ہے
انکا بیمار ادھر اور نہ اودھر ہوتا ہے

ہاتھ سینے سے ادھر اور نہ اودھر ہوتا ہے
بعد مرنیکے بھی کیا دردِ جگر ہوتا ہے

دل میں پھر حسرت و ارمانکا گذر ہوتا ہے
لو پھر آباد یہ اُجڑا ہوا گھر ہوتا ہے

دل پریشان ہے یاں بال جو بکھرے ہیں وہاں
سچ کہا ہے کہ محبت میں اثر ہوتا ہے

کروٹیں کون بدلتا ہے لحد میں اپنی
کس کے نالوں سے جہاں زیر و زبر ہوتا ہے

کیجئے بزم میں غیروں سے اشارے نہ حضور
ٹکڑے ٹکڑے انہیں۔ یا تو نسے جگر ہوتا ہے

زلف و رخ کی میں تصور سے نہیں باز آتا
ذکر اک شام کو اک وقت سحر ہوتا ہے

نزع میں ڈھونڈ رہی ہے ہمیں پھر پھر کے نگاہ
حال بیمار کا اب نوع دگر ہوتا ہے

صبح کو یاد تیری شب کو تصور تیرا
میہمان ایک نہ اک شام و سحر ہوتا ہے

بس یہی کہکے زباں بند ہوئی نزع کے وقت
تم بھی اب جاؤ کہ ہمارا بھی سفر ہوتا ہے

جھلملاتے ہیں ستارے بھی چراغوں کی طرح
مجھسے رخصت کوئی ہنگام سحر ہوتا ہے

ہاتھ رکھکر مری سینہ پہ وہ فرماتے ہیں
اب بتاؤ کہ کہاں دردِ جگر ہوتا ہے

مانتے کب ہیں کوئی بات محبت والے
سبکی سنتے ہیں مگر دھیان اودھر ہوتا ہے

ٹانکے زخموں کی جو ٹوٹینگے تو موت آئیگی
مجھکو ہنسنے میں بھی سو طرح کا ڈر ہوتا ہے

اے ہدفؔ جنبش مژگاں کے اشارے سے یہ کہہ
خیر اب جاتے ہیں دنیا سے سفر ہوتا ہے

سید کاظم حسین ہدفؔ لکھنوی

ماہ تیرا اگر جواب نہیں
مہر کو ہمسری کی تاب نہیں

کیا ہے ہستی اگر یہ خواب نہیں
کیا ہے عالم اگر سراب نہیں۔

انگبیں ہو۔ نبات ہو یا قند
تیری گفتار کا جواب نہیں۔

آتشِ داغِ لالہ جس سے بجھے
کوئی بوند ایسی اے سحاب نہیں؟

خامشی ہے ادائے گلرو ہی
میں ہی یا لائق خطاب نہیں؟

دیکھکر اس کی چال مستانہ
رہتی چلنے کی مجھ میں تاب نہیں

ہو گئے جھوٹے شکوے سچے مرے
تیری باتوں کا کچھ جواب نہیں

جب سے دیکھی ہے اُس کی پیاری شکل
چشمِ پُرنم میں اپنی خواب نہیں

عفو تقصیر کی ہے اُن سے اُمید
اور خطاؤں کا تو حساب نہیں

گذری ہیں مدتیں تڑپتے ہوئے
دل میں وہ جوشِ اضطراب نہیں

اپنی زلفیں سنگھاؤ عنبر کو
بے خودی کی دوا گلاب نہیں

ملکر لبوں سے نکلے جو دو حرف پیار کے
بوسے مری زبان نے لئے نطق یار کے

لایا شباب رنگ سِن آئی نکھار کے
گل باغ آرزو میں کھلے ہیں بہار کے

نکلے نہ حوصلے دلِ امیدوار کے
لوٹے لٹے تری گلی میں قدم اختیار کے

تاریک ہو گئی ہے مری صبح آرزو
پردے پڑے ہوئے ہیں شب انتظار کے

شعلے زمین پر ہیں۔ تڑپ آسمان پر
نالوں میں میرے رنگ ہیں برق و شرار کے

لائے جنوں میں رنگ ہرے ہی ہو کے زخم دل
کپڑے ملے خزاں کو بھی فصلِ بہار کے

ٹھکرا کے تم نے خاک کو رتبہ بڑھا دیا
گردوں پر اب دماغ ہیں مشتِ غبار کے

جوشِ جنوں میں تلوے ہیں نشتر بنے ہوئے
انداز میرے چھالوں میں ہیں نوکِ خار کے

کرتا ہوں ضبطِ گریہ۔ تو بڑھتا ہی سوزِ غم
جھگڑے پڑے ہوئے ہیں چڑھاؤ اُتار کے

خوں ہو کے رہ گئیں دلِ بلبل کی حسرتیں
کترے ہیں کس نے گل مری شمعِ مزار کے

لے چل صبا عدم میں تو ہی مجھ نحیف کو — احساں کیوں اُٹھاؤں پس مرگ چار کے

خوں پی گئی ہے شوخیٔ رنگ حنا مرا — خنجر جگر پہ چل گئے دستِ نگار کے

زاہد شراب پینے سے بھرتا نہیں ہے پیٹ — بھوکے ہیں ہم تو رحمتِ پروردگار کے

میری نظر کے سامنے دل ٹھہرے کس طرح — رہتے ہیں ہوش اُڑے ہوئے صبر و قرار کے

رنگِ سخن ہمارا ہے رونق یہ سرسری
لکھتے نہیں غزل کبھی ہم زور مار کے

(منشی پیارے لال رونق دہلوی
تلمیذ جناب راسخ صاحب مرحوم)

نگاہوں میں شب غم سرمۂ چشم حسیناں تھا — خیالِ آہوئے مشکین مراد و میل جولاں تھا

خیالِ خالِ مشکیں جلوہ فرما شاہ بجاں تھا — سر طاق خم ابروئے جاناں اپنا ایماں تھا

دل شیدا بھی کس رونق پر ایجا شام ہجراں تھا — ہجوم یاس کا بازار تھا سودے میں اسماں تھا

بری ہیں آتشی خو قید پیراہن سے عالم ہیں — کہ شعلہ شمع کا فانوس کے پردے میں عریاں تھا

نہ کیوں گرتے ہی گم ہو کوچۂ چاک گریباں میں — کہ ہر آنسو مرے دل کا کسی کا راز پنہاں تھا

تری آنکھوں نے خونریزی وہ کی ہے بزم عالم میں — نگاہیں جس طرف کو اُٹھ گئیں گنج شہیداں تھا

پس مردن کھلا احوال سب دھوکا ہی دھوکا تھا — خیال ہستیٔ ناچیز اک خواب پریشاں تھا

مری تردامنی سے بحر عصیاں پانی پانی ہے — کہ جو قطرہ گرا اشکِ ندامت کا وہ طوفاں تھا

شب غم کی بھی ساری ہی حکایت ہے عجب رنگیں — کہ ہر شاخ مژہ پر خون دل سے اک گلستاں تھا

کلیجے پر چلے کا بزم میں بیٹھی چھری بن کر — کہ غمزہ آنکھ کے پردے میں بھی شمشیر عریاں تھا

پری زادوں کا جھرمٹ ہے فقیری میں بھی اے شیدا
تمہارا بوریا بھی رَوِش تختِ سلیماں تھا

(بابو چندی پرشاد شیدا دہلوی تلمیذ جناب راسخ مرحوم)